مستشرقین کے افکار کے تناظر میں
برصغیر میں سیرت نگاری کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے

پی ایچ ڈی (علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

رضیہ شبانہ

پی ایچ ڈی سکالر

نگران مقالہ

ڈاکٹر نورالدین جامی

پروفیسر سیرت چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ

شعبہ علوم اسلامیہ

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

بسم الله الرحمن الرحيم

FORWARDING SHEET

The Thesis entitled:

مستشرقین کے افکار کے تناظر میں برصغیر میں سیرت نگاری کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ

Submitted by Ms. Razia Shabana (Research Associate, Islamic Research Centre, BZU Multan) in partial fulfilment of the requirement for the Ph.D. Degree in Islamic Studies. It has been completed under my guidance and supervision.

I am satisfied with the quality of her research work and allowed her to submit the Thesis.

Signature: ____________________

(Dr. Noor-ud-Din Jami)
Professor,
Department of Islamic Studies,
B. Z. University, Multan.

حلف نامہ

''میں حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ یہ مقالہ خدائے بزرگ و برتر کی توفیق خاص سے میری ذاتی کاوش اور محنت کا ثمر ہے۔اور یہ مقالہ کسی دوسری یونیورسٹی میں کسی ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا گیا''۔

''وکفی باللہ شہیدا''

مقالہ نگار

رضیہ شبانہ

شعبہ علوم اسلامیہ،

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

انتساب

رب کائنات اور رحمت کائنات کے نام

پیارے والدین کے نام

جن کی بے لوث محبت اور پُرخلوص دعائیں میرے لئے سرمایہ حیات ہیں۔

رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا ٥

اور

مخلص دوست سارہ اے چوہدری کے نام

اظہارتشکر

"الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبین محمدﷺ

علی آلہ واصحابہ الی یوم الدین"

تحقیق وتلاش کا مشغلہ بہت محنت کا کام ہے۔کسی شخص کے لئے اس وادی پر خار میں کسی سہارے کے بغیر تن تنہا گزارنے کا دعویٰ کرنا ناممکن ہے۔اب جب کہ اس مقالے کا تحقیق شدہ مواد ایک کتاب کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔وہ لمحات پردہ ذہن پر قطرہ ہائے شبنم بن کر چمک رہے ہیں۔جب اس تحقیق کے دوران مشکلات کے باعث امید کا سورج ناامیدی کے پردے میں چھپ جاتا تو رب العالمین کی بے شار رحمت وعنایت مجھے ان مشکل حالات میں سہارا دیتی اور میری ہمت بڑھا دیتی۔اس کیفیت کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے۔

میری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

لہٰذا سب سے پہلے میں اپنے رب کریم کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جس نے اپنی رحمت اور شفقت کے ساتھ مقالہ کی تیاری میں مجھے تنہا نہیں چھوڑا اور میری مشکل حالات میں مدد فرمائی۔سید المرسلین، خاتم النبیین، خیر البشر فخر کائنات حضرت محمدﷺ کی ذات اقدس پر ہزار بار درود وسلام۔جن کے صدقے ہمیں اسلام جیسا کامل اور روشن دین ملا۔

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی کے بورڈ آف ایڈوانس سٹڈی کی بھی شکر گزار ہوں جس نے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دی۔

اپنی اس تحقیقی کاوش کے لئے سب سے پہلے میں شکریہ ادا کروں گی اپنے نگران مقالہ (سپروائزر) جناب پروفیسر ڈاکٹر نورالدین جامی صاحب کا جن کی علمی رہنمائی میرے لئے مشعل راہ ہے۔جن کی قیمتی آراء نے میری بہت سی مشکلات کو آسان کر دیا۔میں صدر شعبہ علوم اسلامیہ، جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا صاحب کی خاص طور پر مشکور ہوں جن کی حوصلہ افزائی نے مجھے نئی جلا بخشی۔میں پروفیسر ڈاکٹر سعیدالرحمٰن صاحب کی خلوص دل سے شکر گزار ہوں کہ جب بھی کسی قسم کی مدد درکار ہوئی تو آپ نے بخوشی مدد و رہنمائی فرمائی۔میں ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ سنٹر، جناب ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون ہوں جن کی ہمیشہ بروقت رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے میرے لئے بہت سی مشکلات کو آسان کر دیا میں جناب ڈاکٹر ادریس لودھی صاحب کی کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔جن کی پرخلوص رہنمائی اور مدد نے میرے تحقیقی کام کو آسان کر دیا۔جناب ڈاکٹر علی اصغر سلیمی صاحب اور جناب ڈاکٹر سلطان محمود کھوکھر صاحب کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مواد کی رسائی میں میری مدد کی۔

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کے فیکلٹی شریعہ اینڈ لاء کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر ضیاءالحق صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں جن کی علمی رہنمائی میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ڈاکٹر حمیداللہ لائبریری اسلام آباد کے تمام سٹاف کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مواد کی فراہمی میں تعاون کیا۔میں ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس، چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، جی۔سی یونیورسٹی کالج لاہور، کی شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیقی مواد کی فراہمی میں مدد کی۔پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے چیئرمین، پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری صاحب کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے شعبہ کی لائبریری سے مستفید ہونے کی اجازت دی۔

میں پی۔ایچ۔ڈی سکالر جناب محبوب عالم صاحب کی مواد تک رسائی حاصل کرنے پر شکر گزار ہوں اور پی۔ایچ۔ڈی سکالر فیاض احمد کی ہر ممکن مدد اور مواد اکٹھا کرنے پر شکر گزار ہوں۔ میں مس آسیہ ذوالفقار کی مخلصانہ طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے مواد کی دستیابی کے لئے میرے ساتھ دوسرے شہروں کا سفر کیا اور مواد جمع کرنے میں مدد کی۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری کے ریاض صاحب، عامر صاحب اور فرید خان کے تعاون کی مشکور ہوں۔ تحقیق کمپوزر شفیق صاحب اور محمد ساجد انصاری کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحقیقی مشکلات کو آسان کیا طارق صاحب کی مدد کی بھی شکر گزار ہوں۔

اس تحقیقی کام کی تکمیل پر اپنی فیملی کا شکریہ ادا نہ کروں تو بڑی بے انصافی ہوگی۔ میں اپنے محترم شفیق والدین کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی محبت، شفقت اور دعائیں ہر دم میرے ساتھ رہیں۔ جن کی ہمت اور حوصلوں نے میرے ارادوں کو ایک نئی جلا بخشی۔ اللہ رب العزت اُنہیں صحت کاملہ عطا فرمائے اور اُن کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر قائم رہے۔ آمین! میں اپنی بہن مسز فرزانہ اسلم اور بھائی محمد اسلم کے تعاون اور پیار کی از حد شکر گزار ہوں۔

میرے گوشہ قلب ونظر میں میری سچی دوست مسز سارہ افضل جن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔ میں اس بے لوث محبت، خلوص اور مدد کے لئے بطور خاص ان کی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہر مشکل گھڑی میں خندہ پیشانی سے میرا ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم اور زندگی میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!

میں اپنے تمام دوستوں کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھا اور جن کو میری صحت اور میرے کام کی مجھ سے زیادہ فکر رہی۔ اللہ رب العزت اُن کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور خوشیاں نصیب کرے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام افراد کو جنہوں نے میرے اس تحقیقی کام میں میری مدد کی خیر کثیر عطا فرمائیں۔ آمین!

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ میرا یہ کام عوام الناس کے لئے فائدہ مند ثابت ہو۔ آمین!

رضیہ شبانہ

رموزواشارات

1۔	ؓ	رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے
2۔	ؒ	رحمۃ اللہ علیہ کے لئے
3۔	ﷺ	صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے
4۔	ج	جلد نمبر کے لئے
5۔	ص	صفحہ نمبر کے لئے
6۔	،	مختلف الفاظ کو آپس میں ملانے کے لئے
7۔	""	اقتباسات لکھنے کے لئے
8۔	()	حوالہ نمبر لکھنے کے لئے
9۔	ء	سن عیسوی کو ظاہر کرنے کے لئے
10۔	م	تاریخ وفات کے لئے
11۔	ھ	سن ہجری کے لئے
12۔	س ن	سن ندارد کے لئے
13۔	ق م	قبل مسیح کے لئے

مُقَدَّمَہ

اسلام دین رحمت ہے اور خالق کائنات نے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کو بجا طور پر رحمۃ اللعالمین کے خطاب سے نوازا ہے۔ بلاشبہ حضور اکرم ﷺ کی سیرت پاک کے مطالعہ سے عقل انسانی یہ دیکھ کر حیران ہو جاتی ہے کہ ایک شخص، انسان ہوتے ہوئے بھی اتنے صبر وتحمل، حوصلہ وضبط اور اتنی فراخ دلی و وسعت قلبی سے متصف ہو سکتا ہے کہ برائی کرنے والوں سے اعلیٰ درجہ کا نیک سلوک کرے۔ راہ میں کانٹے بچھانے والوں کی عیادت کرے، پتھروں سے زخمی کرنے والوں کے حق میں دعا کرے اور شدید کینہ پرور دشمنوں پر قابو پانے کے بعد ان کو معاف کر دے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہ کتابیں زیادہ تقدس کے جذبہ کے تحت لکھی گئی ہیں۔ یہ طریقہ عقیدت مندانہ مطالعہ کے اعتبار سے اہم ہو سکتا ہے۔ مگر علمی اعتبار سے اس طرز پر لکھی ہوئی کتابوں کی اہمیت زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابوں کی علمی قدر و قیمت مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے۔ مستشرقین اپنے موضوعی (Objective) مطالعہ کی بناء پر اکثر وہ تحقیقی نکتہ دریافت کر لیتے ہیں جس کو ہمارے سیرت نگار دریافت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ای۔ای کیلٹ (E.E. Kellet) ایک برطانوی مستشرق ہے اس نے اپنی ایک کتاب پیغمبر اسلام ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے دشواریوں کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ وہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔

ہمارے سیرت نگاروں کے نزدیک دنیا میں سب سے بڑا کارنامہ باطل سے ٹکرانا ہے۔ اس لئے پیغمبر کی وہی تصویر اعلیٰ ہے جس میں وہ لوگوں کے ساتھ برسر جنگ نظر آئے۔ مگر اصلی حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی حقیقی سیرت جنگ و جدال کی مثال نہیں ہے بلکہ امن پسندی اور صبر کی مثال ہے۔ پیغمبر اسلام کا مقصد لوگوں سے لڑنا یا ان کو ہلاک کرنا نہیں تھا بلکہ زندگی دینا تھا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

"یاایھا الذین امنو استجیبو اللہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم" (الانفال:23)

"اے ایمان والو اللہ اور رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تم کو اس چیز کی طرف بلا رہا ہے جو تم کو زندگی دینے والی ہے"۔

پیغمبر لوگوں کو اپنے حریف یا دشمن کے طور پر نہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ ان کو صرف انسان کے طور پر دیکھتا ہے وہ لوگوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ایک ماں اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔ اس قسم کا مقصد کبھی جنگ اور ٹکراؤ سے حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ لوگ بگڑے ہوئے ہوں تب بھی ان کے ساتھ یک طرفہ طور پر محبت کا معاملہ کیا جائے۔ اسی لئے قرآن میں پیغمبر کو بار بار صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

جدید دنیا کی غالب اور وسیع زبانوں میں اسلام کا تاریخی وثقافتی تعارف ایسے اہل علم کے قلم سے ہوتا رہا ہے جن کو نہ اسلام سے تعلق تھا نہ مسلمانوں سے اخلاص وحسن ظن، بلکہ ان کے ذہنوں میں صدیوں کی وہ نفرت وعداوت بیٹھی ہوئی تھی جو صلیبی جنگوں کا تعارف

کروانے والے مسیحی ادب وتاریخ میں پیوست رہی ہے۔ یہ اہل علم اصطلاحاً مستشرقین کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور یہ عام طور پر یہودی اور عیسائی رہے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے یہ غیر مخلص لوگ اپنی تحقیقی کاوشوں، علمی موشگافیوں اور طرز بیان میں اپنی ظاہری دیانت داریوں سے اپنے پڑھنے والوں کو خاصی حد اور خاصے وقت تک متاثر کرتے رہے۔ ان متاثر ہونے والوں میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے مستشرقین کی علمی بحث وتحقیق کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی کتابوں کو اسلام کے تعارف کا معتبر ذریعہ اور واحد ماخذ سمجھا، پھر اسی اعتبار سے ان سے استفادہ کیا اور ان کو اپنی تحقیق ومطالعہ اور اپنے علمی وفکری نقطہ ہائے نظر کی بنیاد بنایا، جس کی وجہ سے موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب کے متعلق تشکیک اور بے وقعتی پیدا ہوئی۔ مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والے اور مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے والے موجودہ عالم اسلام کے رہنما وحکمران طبقہ کے دماغ میں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی، بےزاری، مایوسی اور شکوک وشبہات پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ انہیں مستشرقین کا ہے، جنہوں نے اسلامیات کے مطالعے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور یہ اپنے علمی نتیجے، تحقیقی انہماک اور شرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب وشرق کے علمی وسیاسی حلقوں میں بڑی عظمت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

ان مستشرقین نے اسلام کے دینی افکار واقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی مغرب کے افکار واقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات واصول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہو جائے یا کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ نہیں چل سکتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ایک طرف انہوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت ودقیانوسیت کا مترادف قرار دیا اور دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انہوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی، جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سینکڑوں، ہزاروں برس سے مدفون ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلمان معاشرے میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب وعربی زبان کو نقصان پہنچانے اور جاہلیت قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے، جو واضح طور پر تیرہویں صدی مسیحی سے شروع ہو جاتی ہے، اس کے محرکات دینی بھی تھے، سیاسی بھی اور اقتصادی بھی، لیکن اس کا سب سے بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت وتبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لیے مسیحیت میں کشش پیدا ہو، اسلام کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنا کر مجروح کیا جائے، اس کی حسین ومعصوم تصویر کو بگاڑا جائے، اس کے حقائق میں تحریف ہو، بھولے بھالے عوام ان کی دینی بزرگی اور قیادت کے آگے سر ٹیک دیں، اسلام اس وقت مسیحیت وعیسائیت کا سخت دشمن ہے، وہ ایسا دین ہے جو نشر واشاعت کا مستحق نہیں، اسلام کے نام لیوا خونریز ڈاکوؤں اور اچکوں کی ٹولی ہے جن کا دین انہیں جسمانی عیش پرستی پر آمادہ کرتا ہے اور کسی بھی روحانی بلندی سے دور اور بے تعلق ہے۔

اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اور مستشرقین کے تخریبی اور تشکیکی اثرات کو روکنے کے لیے ان علمی موضوعات پر خود مسلمان

محققین اور اہل نظر نے قلم اٹھایا اور مستشرقین کی تمام قابل تعریف خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مستند اور صحت مند اسلامی معلومات اور نقطۂ نظر کو پیش کیا، دوسری طرف ان مستشرقین کا علمی محاسبہ کیا اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا، متن سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ واخذ مطلب میں ان کی غلط فہمیوں کو واضح کیا اور ان کی دعوت وتلقین میں جو بدنیتی، مذہبی اور سیاسی مقاصد شامل ہیں ان کو طشت از بام کیا اور یہ بتایا کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔

مستشرقین کی تاریخ کافی قدیم ہے۔انہوں نے اسلام کے آغاز سے ہی جب مسلمانوں نے کفار کو جنگوں میں شکست دی تو ان لوگوں نے ایسے لوگوں کے ساتھ مل کر جو عصری وسائل رکھتے تھے ان کو مسلمانوں کے ساتھ اکسایا اور اسلام اور مسلمانوں کو صرف تنقید کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ ابتدا میں استشراق کا بیڑہ عیسائی اور یہودی راہبوں، پادریوں، قصہ گو مناظر شعرا ہی نے اٹھایا تھا۔

عمل استشراق کئی ادوار سے گزرا ہے ابتدا میں اس کا انداز مشنری مبلغین جیسا تعصب پر مبنی تھا۔ اس کا مقصد اسلام اور پیغمبر اسلام پر بے بنیاد الزامات لگانا تھا اور اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت کا شاہکار رہوتا۔ مثلاً مشہور مستشرق اور عظیم عربی دان، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مرگولیس اپنی تصنیف لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ نعوذ باللہ رسول اللہؐ نبوت سے پہلے سوتے وقت لات وعزیٰ کی پوجا کیا کرتے تھے مشہور مؤرخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ آخری ایام میں نعوذ باللہ آپؐ شہوت، لالچ اور جاہ طلبی میں مبتلا ہو گئے تھے۔

بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ آپؐ (نعوذ باللہ) بت پرست تھے آپ نے خود کو مرکز پرستش قرار دیا تھا ہسپانوی، عیسائی فوجوں نے آپ کے اصنام توڑے تھے (گویا نعوذ باللہ آپ کے بت تھے تب ہی تو انہیں توڑا) آپ کی ایسی مورتی دیکھی گئی جو نقرئی اور طلائی تھی آپ شہوت پرست تھے۔ خود بھی شہوت پرستی میں مشغول رہے اور اپنے پیروکاروں کو بھی اس میں ملوث کیا دھوکہ باز، مکار، جھوٹے، خوفناک حد تک بے شرم تھے (نعوذ باللہ) آپؐ بداطوار، جادوگر اور لٹیرے تھے آپ اعصابی مریض، جنونی اور مرگی زدہ تھے محمدؐ نے شراب کی مستی میں جان دی۔ اس کے پیروکار نے اس کی لاش کوڑے کے ڈھیر پر پھنکوا دی۔ یہ نمونہ ہے ان ہزاروں من گھڑت افسانوں، بہتانوں اور افترا پردازیوں کا جن سے ان کے کذب وافترا کی قلعی کھل جاتی ہے اور جو صدیوں یورپین محققین کی تحقیقات کا شاہکار تصور کیے جاتے رہے اور جن پر یورپ کے مؤرخین، مصنفین، شعرا، خواص وعوام ''آمنا وصدقنا'' کہتے رہے اور تحریروں اور تقریروں میں ان کی سند دیا کرتے۔ مستشرقین کے اس گروہ میں مرگولیس، ایڈورڈ گبن، مارگولیتھ، بیڈویل وغیرہ شامل تھے۔ ان میں جان آف دمشق پیش پیش تھا جان بنیادی طور پر مذہبی عالم تھا وہ کیسا کا فارغ التحصیل راہب اور پادری تھا۔ متشدد عیسائی اور یہودی علما اور قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے اس کی پیروی کی۔

مسلمان علما اور دانشوروں کو جلد ہی اس حقیقت کا علم ہو گیا اور انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا اور حقیقت حال کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا۔ اس محاذ پر ناکامی کے بعد بھی مستشرقین نے ہمت نہیں ہاری اور ایک اور پیچیدہ جنگی حکمت عملی واضح کی۔ اس میں نہ پہلے مستشرقین کی طرح یہ کہا جاتا کہ آپ (نعوذ باللہ) راہزنوں، قزاقوں کے سردار تھے نہ یہ کہا جاتا کہ آپ بدکردار راہزن اور لٹیرے تھے۔ یا آپ پر مرگی کے دورے پڑتے تھے اور نہ دوسرے مستشرقین کی طرح اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے تھے اور پی جمالو کی طرح اس میں سند کیا چھوڑی جاتی تھی۔ مثلاً اسلام میں تمام خوبیاں موجود ہیں بس ذرا کنیزوں کا معاملہ محل نظر ہے یا رسول اللہ بڑے اچھے آدمی تھے بس ذرا شہوت پرست وغیرہ۔

اب مستشرقین نے اور زیادہ محتاط رویہ اختیار کیا۔ اب بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعریفوں میں کمی نہ آئی۔ اور یہ بھی ہوا کہ کوئی بہتان نہیں تراشا گیا۔ کوئی عیب نہیں لگایا گیا کوئی خرابی نہیں وضع کی گئی بلکہ اس کی جگہ الفاظ کی جادوگری سے ایسی فضا پیدا کر دی کہ کسی مسئلہ پر شک وشبہ پیدا کر دیا جائے تشکیک کی کیفیت پیدا ہو جائے اور تذبذب کا بیج بو دیا جائے۔ مثلاً ہنگری کے مشہور و معروف مستشرق گولڈ زیہر نے انکار حدیث کے اسکول کی داغ بیل ڈالی اور پھر آہستہ آہستہ گولڈ زیہر اور اس کے حواریوں نے دوسرے مصادر سیرت کو نشانہ بنایا۔

لیکن خالص کذب اور بہتان محض کہاں تک ساتھ دیتا۔ کہاں تک لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالی جاتی۔ اور کب تک لوگ عصبیت کا ساتھ دیتے اور حق اور صداقت سے آنکھیں موندے رہتے۔ علمی ترقی کے ساتھ اخلاقی اصلاح بھی صورت پذیر ہوئی اور مستشرقین نے حق وصداقت کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ چنانچہ روایتی قسم کے متشدد علمائے استشراق کے برعکس اعتدال پسند حقیقت بین، منصف مزاج، نرم خو مصنفین بھی پیدا ہوئے اس قبیل کے مصنفین میں apology for mohammad کے مصنف گاڈفرے ہگنز، کاسن دی سیوال، ویل، نیاں، گوئٹے اور کارلائل وغیرہ ہیں۔ ذیل میں چند مثبت انداز فکر کے حامل مستشرقین کی آراء درج کی جا رہی ہیں۔ The Messanger کا مصنف r.c.v. Bodley کہتا ہے کہ:

''تاریخ مذاہب وادیان میں محمدؐ کو ایک منفرد مقام حاصل ہے وہ نہ ولی تھے نہ فرشتہ اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کر کے دکھایا اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی۔ اور ان کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی جو عام حالات میں ان کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز کر سکے''۔

ڈاکٹر ایچ میخائل ہارٹ نے اپنی تصنیف اے رینکنگ آف دی موسٹ انفلوئنشل پرسنس ان ہسٹری میں دنیا بھر کی، ہر زمانے کی عظیم ترین شخصیات کے مطالعہ کے بعد آپ کو انسانیت کے بلند ترین درجہ پر فائز کیا ہے وہ کہتا ہے:

''پوری انسانی تاریخ میں صرف آپؐ ہی ایسے انسان نظر آتے ہیں جو دینی اور دنیاوی ہر دو اعتبار سے غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے ہیں''۔

کارلائل کہتا ہے کہ:

''عرب قوم کو یہی (آنحضرتؐ) نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا۔ عرب کو اسی کے ذریعہ پہلے پہل زندگی ملی بھیڑوں، بکریوں کے چرانے والے لوگ، جو ازل سے صحراؤں میں بے روک ٹوک پھرتے تھے۔ ایک ہیرو پیغمبر ان کی طرف بھیجا گیا ایک پیغام کے ساتھ جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابل اعتبار نہ تھے، دنیا بھر کے لئے قابل ذکر بن گئے''۔

جون ڈیون پورٹ اپنی کتاب ''اپولوجی فار محمد اینڈ دی قرآن'' میں آنحضرتؐ کے متعلق کہتا ہے کہ:

''محمد ﷺ کو بلا شک وشبہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا وہ اس پر مطمئن تھے کہ فرستادہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملک کی تعمیر واصلاح کی ہے ان کا اپنا مشن نہ تو بے بنیاد تھا اور نہ فریب دہی، جھوٹ وافتراء پر مبنی تھا بلکہ اپنے مشن کی تعلیم وتبلیغ کرنے میں کسی لالچ یا دھمکی کا اثر قبول نہ کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کی راہ کی رکاوٹ بن سکیں۔ وہ سچائی کی تبلیغ مسلسل کرتے رہے''۔

ولیم منٹگمری واٹ اپنی تصنیف ''محمد پروفٹ اینڈ اسٹیٹس مین'' میں آنحضرت ﷺ کے متعلق رقمطراز ہے کہ:

''حالات،مواقع اور وقت سب نے محمدؐ کا ساتھ دیا اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی زندگی میں کامیابیوں کی اور ان کے بعد اسلام کی توسیع وترقی کی راہ ہموار کی۔محمد ﷺ کی ذات میں صفات وکمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا اس کی تین جہتیں تھیں۔ایک نبوت کا فیضان،دوسرے سیاست وحکمرانی میں ان کی بصیرت،اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مہارت اور تمام منصب پر اہل ترین افراد کا انتخاب۔جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمدؐ پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے وہ اسی حد تک ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔حالات نے انہیں کس درجہ سازگاری عطا کی۔اس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذونادر حاصل ہوتے ہیں۔بالکل وقت کی آواز بن کر ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انہیں اگر حاصل نہ ہوتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انہیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا،اور اگر وہ اس یقین محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ انسانیت کا ایک اہم اور قابل ذکر باب رقم ہو جانے سے رہ جاتا''۔

مستشرقین کا ان مسیحیوں کی کُتب سے رجوع کرنا اتفاق اور قصد کے علاوہ فطری تقاضا بھی تھا۔بہر حال ان کتب کا سیرت نگاری کے ارفع واعلیٰ معیار سے فروتر ہونا مسلم ہے۔اس بات ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو عمارت اس میٹریل سے تیار ہوگی وہ کتنی بودی ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اس مقدمہ کی ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے کہ علم استشراق کی بنیاد ہی اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض وعناد پر رکھی گئی ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ گندم از گندم بروید جواز جو اس لئے اس سے کسی خیر کی توقع کرنا محال ہوگا۔یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ بھی بربنائے عصبیت نہیں نکالا گیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف اس کثرت اور فراوانی سے لٹریچر فراہم کیا ہے کہ جس کا جواب نہیں اور وہ تمام کا تمام شدید عصبی تعفن میں بسا ہوا ہے۔قدرتی طور پر مستشرقین اس سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اور وہ لاکھ احتیاط برتیں،ان کی نگارشات میں اس کے غیر شعوری اثرات نمودار ہو کر ان کی تمام تر ایماندارانہ کاوشوں کو داغدار کر جاتے ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی میں جبکہ عیسائی دنیا اسلام کے خلاف برپا کی ہوئی اپنی صلیبی جنگوں میں پے در پے ناکام ہونا شروع ہوئی تو اس کے مفکرین اور نظریہ سازوں کو یہ یقین ہوگیا کہ موجودہ حالات میں طاقت وقوت اور تشدد وجارحیت کے ذریعہ اسلام کو مذہبی وسیاسی اقتدار سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا ہے چنانچہ غور وفکر کے بعد انھوں نے طے کیا کہ سر دست اپنی جارحانہ مہم کو ملتوی کر کے علم وتحقیق کے عنوان سے اسلام کو نشانہ بنانا چاہئے اور تلوار کی بجائے قلم سے اسلام کی بیخ کنی کی جائے۔اسلام دشمن مغربی مفکرین کا یہی پرفریب منفی نظریہ ''تحریک مستشرقین'' کا نقطۂ آغاز ہے۔چنانچہ اس منصوبہ کے تحت عیسائی مبلغین اور ان کے ساتھ یہودی علماء بھی اسلامیات کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیئے گئے۔اس تحریک کا ایک بنیادی مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت وتبلیغ کے لئے رجال کار مہیا کرنا اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے جس سے مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو جائے اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے مسیحیت میں کشش پیدا ہو۔

یہ مستشرقین قرآن وحدیث،سیرت نبوی،فقہ اسلامی اور اخلاق وتصوف کا مطالعہ اس مقصد کے لئے کرتے ہیں کہ ان میں خامیاں نکالی جائیں اور پھر انھیں اپنے دینی وسیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے،ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ پہلے اسلام کے خلاف ایک باطل اور شرانگیز بات طے کر لیتے ہیں اور پھر اس کے اثبات کے لئے ہر طرح کے رطب،تاریخ،حدیث وسیرت،یہاں تک کہ افسانہ وشاعری کے غیر مستند ذخیرہ سے مواد فراہم کرنے کی غیر معقول کوشش کرتے ہیں اور جہاں کہیں سے بھی مقصد پورا ہو خواہ وہ علمی اصول کے رو سے صحت

واسناد کے اعتبار سے کتنا ہی مشکوک ومجروح کیوں نہ ہو اس کو پوری جسارت سے بڑے آب وتاب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

قرآن، حدیث، سیرت نبوی، فقہ وکلام، سیرت صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، اکابر محدثین، فقہاء، رواۃ حدیث، اسماء رجال، فن جرح وتعدیل، جمع قرآن، تدوین حدیث، حجیت حدیث وغیرہ ہر ایک موضوع کے متعلق مستشرقین کی تصانیف اور نام نہاد تحقیقات میں اس قدر مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین وحساس آدمی کو جو ان موضوعات پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دینے اور سلف صالحین وعلماء کی شخصیتوں کو مجروح کر دینے اور ان سے اعتماد ختم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ واقعی علم وتحقیق کی رو سے ان مشکوک ومشتبہ لٹریچر کو یہ لوگ سائنٹفک اور سسٹمیٹک (اصولی مطالعہ) جیسے بھاری بھرکم اور مرعوب کن عنوان سے پیش کرتے ہیں جس کی بناء پر کچے ذہن اور سطحی علم رکھنے والے ان کے دام فریب میں آجاتے ہیں۔ بالخصوص یونیورسٹیوں اور مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے اکثر لوگ اس بھنور میں پھنس چکے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم اپنی مشہور کتاب ''المستشرقون والاسلام'' میں مستشرقین کے پھیلتے ہوئے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نصف صدی کے اندر عالم اسلام میں اصلاح وترقی (بالفاظ واضح تجدد ومغربیت) کے جتنے علم بردار پیدا ہوئے ان کے خیالات، اشتہارات، اعلانات اور طریق کار میں مستشرقین کی دعوت وتلقین کے اثرات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ بات کہی جائے کہ اصلاح وترقی کے داعی ان مصلحین کے فکر وعمل کی اساس مستشرقین کے پیدا کردہ خیالات ہیں تو حقیقت سے بعید نہیں ہوگی۔''

ان مستشرقین نے ایک طرف اسلامی تعلیمات اور دینی افکار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی افکار واقدار کی عظمت نمایاں کیں، پھر اسلامی اصول وقواعد کی ایسی تشریح پیش کی جس سے از خود اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو جائے تاکہ ایک جدید تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے اور وہ اسلام کے بارے میں مشکوک ہو جائے یا کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ اسلام موجودہ عہد کے مزاج کا ساتھ دینے سے عاجز اور ضروریات وقت وتقاضائے زمانہ کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ ایک طرف انھوں نے بدلتی ہوئی زندگی، تغیر پذیر زمانہ اور تہذیب وترقی کا نام لے کر خدا کے آخری، ابدی اور کامل دین پر عمل کو روایت پرستی، رجعت اور بنیاد پرستی کا غیر پسندیدہ نام دیا اور دوسری جانب اس کے برعکس قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سیکڑوں ہزاروں برس سے دفن تھیں، ان بے سود تہذیبوں کی بازیافت کی سعی کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کر کے اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور جاہلیت قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ چنانچہ مستشرقین کی اس دعوت وتلقین کے زیر اثر ان کے شاگردان رشید کے ذریعہ مصر میں فرعونی، عراق میں آشوری، شمالی افریقہ میں بربری، فلسطین ولبنان کے ساحل پر ہٹی تہذیب وزبان کے احیاء کی تحریکوں کا آغاز ہوا اور ان ملکوں میں ان کے مستقل داعی ومبلغ پیدا ہو گئے۔ جن کی جانب سے پوری قوت اور شدومد کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ قرآن کی عربی زبان زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی اس کے بجائے عوامی زبان کو رواج دینا چاہئے اور انہی کو اخبارات اور علمی کتابوں کی زبان بنانا چاہئے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر مستشرقین نے یوروپ، امریکہ وغیرہ میں قائم اسلامیات کی تحقیقات کے نام نہاد اداروں کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دئے۔ اور اسکالر شپ کے عنوان سے بڑے بڑے وظیفے دے کر مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی طرف کھینچ لیا اور نام نہاد سائنٹفک اور اصولی مطالعہ کے عنوان سے ان کے ذہن کو نہ صرف مسموم کیا بلکہ انھیں اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

مستشرقین کے یہ شاگردان رشید جب مشرقی ممالک بالخصوص ہندو پاک، مصر و لبنان وغیرہ میں آئے تو انھوں نے اپنے زہریلے قلم و زبان سے اپنے اساتذہ مغرب کی ترجمانی کی اور یونیورسٹیوں و علمی اداروں کے ماحول کو اسلامی تعلیمات و اقدار کے حق میں خراب کر دیا۔ انھوں نے اپنے مربیان مغرب کے پڑھائے ہوئے سبق کے مطابق خود کو روشن خیال، تجدد پسند، مصلح دین اور محقق و مفکر ظاہر کیا اور اپنے باطل طریقہ کار کو سائنٹفک اور سسٹمیٹک (اصولی مطالعہ) بتایا اور اس کے بالمقابل سلف صالحین مصلحین و مجددین اور علمائے حق کے طریقہ کو دقیانوسیت، انتہاپسندی، غیر معقول وغیرہ سے تعبیر کیا۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر اسی تحریک کے زیر اثر ہندوستان کی کچھ یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے نام سے تحقیقی مراکز قائم کئے گئے جس کے نصاب کو مستشرقین کے امریکی و مغربی اداروں کے نصاب کے مطابق رکھا گیا اور ان مراکز کا ذمہ دار ایسے لوگوں کو بنایا گیا جو مستشرقین کے خاص شاگرد تھے جنھوں نے اسلامی تعلیمات اور اس کے افکار و اقدار کو مسخ کرنے میں اپنے اساتذہ مغرب کی پوری پوری پیروی کی۔

مستشرقین یہود و نصاریٰ کے ان شاگردوں کا ہندوستان میں ایک جدید نعرہ ''اجتہاد'' ہے۔ یہ ہندی مستشرقین اس بات پر مصر ہیں کہ اجتہاد کا حق ہر اس شخص کو حاصل ہے جو قرآن کے ترجمہ کو کسی زبان میں پڑھ سکتا ہو۔ ان کے نزدیک مجتہد کو عربی زبان، صرف و نحو، لغت، بلاغت، تفسیر، علوم تفسیر، حدیث، علوم حدیث، آثار صحابہ، فقہ، کلام، اصول فقہ، ناسخ و منسوخ وغیرہ علوم کے جاننے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہندی مستشرقین اسلامیات کی تحقیق کے نام پر ملک گیر ادارے قائم کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں اور ان کی دعوت و تلقین پر مسلمانوں کے ذریعہ قائم یونیورسٹیوں کے علاوہ ملک کے بڑے شہروں میں اس قسم کے ادارے قائم کئے جا رہے ہیں اور اسلام کے نام پر اسلام کو مضمحل اور کمزور اور عیسائیت کو مضبوط اور توانا کیا جا رہا ہے جس سے ملک میں پھیلی عیسائی مشنریوں کو براہ راست قوت حاصل ہو رہی ہے اور اس وقت ان کے حوصلے اس قدر بلند ہو گئے ہیں کہ وہ ملک کے بہت سے علاقوں میں کھلے عام مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ و دعوت کا کام کر رہے ہیں اور صحیح دین سے ناواقف مسلمان ان کے دام فریب میں مبتلا بھی ہو رہے ہیں۔

ان حاسد، یہودی اور عیسائی' کے فکری نمائندوں نے بڑے اہتمام اور ریاضت کے ساتھ اسلامی فکر اور اس کے مراجع و مصادر کے بارے میں ایسی تحقیقات کے انبار لگا دئے کہ جن کا مقصود اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کے اذہان و قلوب میں شک کے کانٹے بو دیے جائیں۔ مغرب میں بسنے والے ایسے محققین کو ''مستشرقین'' اور ان کے کارنامے کو ''استشراق'' کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ان میں سے بعض مستشرقین نے ہمارے علوم و فنون کے بعض متون کو بہت محنت اور توجہ کے ساتھ مرتب، مدون اور ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ مستشرقین کا موقف مکر و فریب، علمی مغالطوں سے کبھی خالی نہیں رہا۔ مجرد اور معروضی تحقیق کے نام پر ہرزہ سرائیوں کی ایک طویل داستان جسے مرتب کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

اسلام کا پیغام اپنی تابانیوں کے ساتھ "سراج منیر" کے وجود اقدس کے ساتھ طلوع ہوا تو مناجات کے دامن میں اسیر لوگوں کی ایک کثیر تعداد مخالفت پر اتر آئی اور اس مخالفت کے اظہار کے لئے ہر ہتھکنڈا استعمال کیا۔ ذہنی، جسمانی، اذیتوں کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر طرح کے لالچ بھی دیئے۔ وہ یہ سمجھ نہ سکتے تھے کہ نبی روحانی عظمت کی کن بلندیوں پر فائز ہوتا ہے۔ یہ اذیتیں اور لالچ تو غلامان مصطفی کے قدموں میں ذرا بھی لغزش پیدا نہیں کر سکتے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں کے یہود کے انداز قدرے مختلف تھے۔ مگر مقاصد واہداف ایک ہی تھے۔ لیکن وہ بھی اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہیں جا سکتا۔ اسلام کے ان مخالفین کی معنوی اولاد مستشرقین کے روپ میں سامنے آئی۔ وہ حالات وزمانہ کے مطابق پینترے بدلتے ہیں۔ اعتراضات کے لئے نیا اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ کبھی قرآن پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی حدیث نبوی ﷺ پر اعتراضات کر کے شک پھیلانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو فقہ اور تصوف کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں۔ یہ مستشرقین اپنی تحقیق کے نتیجہ میں مختلف نتائج پر پہنچتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار اسلامی علوم کے ماخذ ومصادر کی تعریف بھی کرتے ہیں مگر اسی کتاب میں دوسرے مقام پر شک کے لئے کوئی نہ کوئی جملہ لکھ دیتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیرت نگاری کا مطالعہ اس وقت تک معنی خیز نہیں ہوسکتا جب تک کہ سیرت نگاری کے جملہ تصورات،نظریات معنی، مفہوم، اصول، ماخذ ومصادر ضرورت اور خصوصیات سے مکمل تعارف اور تفہیم حاصل نہ کر لی جائے۔ چنانچہ زیر نظر مقالے کے باب اول کو سیرت اور سیرت نگاری کے مبادیات ومباحث کے لئے کلی طور پر مختص کیا گیا ہے۔ پرانے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمت اسلام میسر آنے کے دو ہی ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آرہے ہیں۔ ایک خدا کا کلام، جو اب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے۔ دوسرا اسوہ نبوت جو اب صرف محمد ﷺ کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہوسکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد ﷺ سے اور محمد ﷺ کو قرآن سے سمجھے ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا۔ ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔

برصغیر پاک وہند میں سیرت نگاری کے مطالعے پر سنجیدہ علمی وتحقیقی توجہ کم دی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اہل علم نے اردو سیرت نگاری کی تاریخ ضرور مرتب کی اور ان میں محترم ڈاکٹر خالد انور محمود صاحب (اردو سیرت نثر میں سیرت رسول ﷺ 1989ء) کی کاوش قابل تحسین ہے تاہم سیرت نگاری کی تاریخ سے زیادہ اُن محرکات وعوامل اور ان امور ومسائل اور حالات وواقعات کی نشاندہی انتہائی ضروری ہے جس سے سیرت نگاری نے اثرات قبول کرتے ہوئے نئی سمت اور نئے زاویہ ہائے مطالعہ کی گنجائش پیدا کی۔ چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر برصغیر پاک وہند کے حوالے سے 1857ء سے 1987ء تک کی، سیرت نگاری کے محرکات، رجحانات اور اثرات کو اپنی علمی جستجو کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس موضوع پر تحقیقی کام کا مقصد اہل علم کی شاندار علمی کارناموں کی دریافت ہی نہیں بلکہ دینی وملی خدمت کا جذبہ بھی ہے۔ کیونکہ بدلے ہوئے قومی اور بین الاقوامی تناظر میں صرف سیرت رسول ﷺ ہی امن عالم، عدل اجتماعی، تمدنی ترقی اور جملہ حقوق وتحفظ انسانی کا واحد ذریعہ وضمانت ہے۔

برصغیر میں اس فکر پر تنقید کے لئے سرسید احمد خاں میدان میں آئے مگر وہ مرعوبانہ فکر لے کر میدان میں اُترے۔ اس فکر کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ میدان میں اُترنے سے پہلے ہی مدمقابل کے بہت سے غلط مقدمات کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اس طرح ہزار خلوص کے باوجود صحیح اور موثر

نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ شبلی کی کاوشوں میں بھی یہ جھلک نظر آتی ہے۔ ''دروغ گو''، ''افسانہ ساز'' واقدی کی روایات کو شاگرد رشید بیان کرے تو وہ قابل استناد بن گئیں۔ ان دونوں کے طرز عمل کی وضاحت ظفر احمد صدیقی کے اس اقتباس سے ہوتی ہے۔ ''اور دفاعی کام کرنے والے بھی دو گروہ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ تو ان مستشرقین کے حملوں سے اتنا مرعوب تھا کہ اس نے مسلمات شرعیہ سے انکار یا ان میں رکیک تاویل تک سے اجتناب نہیں کیا۔ اس گروہ کی مشہور شخصیت سر سید احمد خان تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو اس درجہ مرعوب تو نہیں تھا کہ مسلمات شرعیہ میں تاویل کے راستے تلاش کرے۔ لیکن وہ ایسی چیزوں کو نقل کرنے کا اہتمام کرتا تھا جس پر مستشرقین کا اعتراض کم سے کم ہو۔ شبلی نعمانی مرحوم اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس پر یہ مستزاد ہے کہ خود ان کا انداز فکر، عقل کو نقل پر ترجیح دینے کا ہے جس کی وجہ سے انہیں معتزلہ کا انداز فکر کا حامل قرار دیا گیا ہے''۔

سر سید کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی تحریک کا آغاز ہوا تھا اسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں جسٹس امیر علی (1849ء۔ 1928ء) قاضی سلیمان منصور پوری اور پروفیسر سید نواب علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے سیرت پر متعدد کتابیں لکھیں لیکن جو شہرت عام اور بقائے دوام علامہ شبلی (م 1914ء) کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ علامہ شبلی کو یہ تقدم حاصل ہے کہ انہوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی کوششوں کو نشانہ تنقید نہیں بنایا بلکہ انہوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرت رسول ﷺ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا۔ انہوں نے تحریک استشراق کے جواب میں علمی و تحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکتے تو سیرۃ النبی ﷺ مستشرقین کے اعتراضات کا بھی یادگار جواب بن جاتی۔ بہر حال مطبوعہ سیرت النبی ﷺ کے آغاز ہی میں اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی نے یورپین تصنیفات کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات ان کے اسباب و محرکات ان کے اصول مشترکہ اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے اور پھر مشہور مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شامل کتاب کر دی اس فہرست میں علامہ شبلی نے مشہور مستشرقین کے نام ان کی تصنیفات اور ملک کا نام بقید سنین درج کئے ہیں۔ فہرست میں کل اندراجات 37 لیکن نام 32 مصنفین کے ہیں انہوں نے مستشرقین یورپ کے پانچ گروہوں کو شامل فہرست کیا ہے یعنی انگلستان کے 13 جرمنی کے 8 فرانس کے 7 ہالینڈ کے 3 اٹلی کا ایک ان میں بالتزام سیرت پر لکھنے والے نہیں بلکہ اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلامی ماخذ پر کام کرنے والے سب مستشرقین کا اندراج ہے۔

شبلی چونکہ اپنی کتاب سیرت النبی ﷺ کا ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے اس لئے ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو معیار تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیر بحث لاتے بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالے سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقیب تو گویا منتہائے مقصود تھا اور ان کی زندگی کی آخری خواہش غالباً اسی لئے انہوں نے سیرت النبی ﷺ کے مجوزہ خاکے میں ''پانچواں حصہ'' خاص طور پر یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا جو اگرچہ پورا نہ ہو سکا تاہم آنے والوں کے لئے روشنی چھوڑ گیا اور یہ ثابت کر گیا کہ خود مولانا شبلی مسئلہ مستشرقین کی گہرائی کا ادراک رکھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تحریک استشراق اور اس کے مقابل علامہ شبلی کی جوابی تحریک نے سیرت نگاری کو صد درجہ متاثر کیا اور مستقبل میں سیرت نگاری کے جو نمونے سامنے آئے ان میں تحریک استشراق کے رد کا کوئی نہ کوئی محرک شامل تھا۔

دور حاضر میں جس شخصیت نے اقدامی نوعیت کا طرز عمل اختیار کیا معذرت خواہانہ رویہ کو ترک کر کے اسلام کا سپاہی بن کر جوابات دیئے۔ وہ ضیاءالامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ ہیں۔ ضیاءالنبی کی آخری دو جلدوں میں استشراق کی نام نہاد علمیت کی حقیقت کا پول جس طرح کھولا اردو میں سیرت کی کسی دوسری کتاب میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

چنانچہ مستشرقین کے اسلام پر کی جانے والی موشگافیوں اور برصغیر کے سیرت نگاروں کے جوابات کو بنیاد بنا کر میں نے اس اچھوتے عنوان پر تحقیق کو موضوع بحث بنایا اور اس تمام مواد کو جمع کرنے کی کوشش کی جو مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات میں برصغیر کے سیرت نگاروں نے اپنی کتب کی صورت میں جمع کیے ہے۔

موضوع پر ہونے والے سابقہ کام کا جائزہ (Literature Review)

مورخین اس بارے میں متفق ہیں کہ برصغیر میں سیرت نگاری کی ابتدا تراجم سے ہوئی یعنی دوسرے سیرت نگاروں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر دیا جاتا تھا اور اپنی طرف سے سیرت پر کوئی کتاب نہ لکھی۔ اردو نثر کے ارتقائی سفر میں کتب سیرت رسول ﷺ خاصی تاخیر سے شامل ہوئی ہیں۔ اردو میں اگرچہ منظوم کتب سیرت کا آغاز گیارہویں صدی ہجری سے ہو چکا تھا۔ لیکن نثر میں ان کی ابتداء تیرہویں صدی ہجری سے ہوئی۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں ایک قسم ان قدیم وضع کی تصانیف ہیں جو عربی، فارسی تصانیف کے رنگ پر ہیں یا ان سے ماخوذ ہیں یا ان سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

دوسری وہ قسم ہے جو سرسید کے مذہبی تصانیف کے رنگ پر ہے یعنی جو عیسائی مشنریوں کے اعتراضوں کو مدنظر رکھ کر عقلی اصولوں کے تحت لکھی گئی ہیں۔

تیسری قسم وہ ہے جس میں پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن کو تبصرہ جاتی کہا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ انگریزی کی بعض ایسی کتابوں کے کلی یا جزوی اردو ترجمے ہوئے جو یا تو آنحضور ﷺ اور اسلام کی حمایت میں لکھی گئی تھیں یا ان کا غالب حصہ ان کے حق میں تھا۔ ان تراجم کا مقصد یہ تھا کہ عوام الناس کو بتایا جا سکا کہ مستشرقین اسلام اور بانی اسلام پر جو اعتراض کرتے ہیں وہ بالکل درست نہیں۔ بلکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور محمد ﷺ خدا کے سچے پیغمبر ہیں۔ نیز یہ کہ مسلمانوں پر واضح کیا جا سکے کہ سبھی مستشرقین متعصب نہیں ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ جس حد تک ممکن ہو حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ذیل میں ہم سابقہ کام کا جائزہ لیں گے:

1۔ i۔ مشہور تابعی ربیع بن صبیح السعدی البصری نے احادیث کے منتشر اوراق جمع کئے۔

ii۔ تیسری صدی ہجری میں ابوجعفر الدیبلی نے ''مکاتیب النبی ﷺ'' لکھی۔

iii۔ ''مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ'' کے نام سے امام حسن صغانی لاہوری نے مشہور کتاب لکھی۔

iv۔ امیر کبیر سید علی ہمدانی نے مجمع الاحادیث کے علاوہ ''اربعین'' (جس میں حضرت انس بن مالک سے مروی چالیس احادیث درج ہیں) تحریر کیں۔

v۔ حضرت نور قطب عالم نے ''انیس الغربا'' کے نام سے رسالہ تحریر کیا جس میں رسول ﷺ کی بعض احادیث کا ترجمہ اور صوفیانہ رنگ میں تشریح کی گئی ہے۔

vi۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی حدیث سے متعلق تصانیف ''شرح مشارق الانوار''، ''کتب الاربعین'' اور رسالہ ''سیرت النبی ﷺ'' وغیرہ ہیں۔

vii۔ ابو بکر بن محمد بہروری چی نے الجزری کی ''حصن حصین'' کا ترجمہ اور تشریح کیا ہے۔

اسی طرح مجدد الف ثانی کے استاد حدیث شیخ یعقوب بن حسن مرفی نے سیرت النبی ﷺ پر ایک منظوم رسالہ ''مغازی النبوۃ'' تحریر کیا۔

viii۔ شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری نے اپنے عشق رسول ﷺ کا ثبوت ''التحفۃ المرسلۃ النبی ﷺ'' نامی کتاب لکھ کر دیا ہے۔

ix۔ مجدد الف ثانی نے ''اثبات النبوۃ'' عربی رسالہ تحریر کیا۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آنحضور ﷺ کی نبوت کے اثبات میں لکھا گیا ہے۔

x۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شہرہ آفاق ''مدارج النبوۃ'' ہے جو 1200 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ آنحضور ﷺ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر اس کتاب کے مصنف نے روشنی نہ ڈالی ہو۔

xi۔ شاہ ولی اللہ نے آنحضرت ﷺ کی سیرت پر فارسی میں ایک رسالہ ''سرور المحزون'' لکھا ہے۔

2۔ مغلوں کے دور زوال میں نثر میں کتب سیرت لکھنے کا آغاز ہوا اس میں محمد باقر آگاہ اور مولانا محمد غوث کے نام قابل ذکر ہیں۔

3۔ بعض مغربی مصنفین جنہوں نے بطور خاص آنحضور ﷺ کی زندگی کے حالات پر کتابیں لکھیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ سر ولیم میور کی تصنیف ''سیرت محمد ﷺ'' 1861ء میں تحریر کی گئی۔

"Life of Muhammad", Sir William Muir

ii۔ باسورتھ سمتھ کی تصنیف ''محمد اور محمدیت'' 1847ء میں تحریر ہوئی۔

"Muhammad and Muhammadiat", Basourth Smith

iii۔ گاڈفری ہگنس کی کتاب ''اپالوجی فار محمد ﷺ'' 1829ء میں منظر عام پر آئی۔

"Apology for Muhammad", God Free Higns

iv۔ ڈاکٹر اسپرنگر کی کتاب ''سیرت محمد ﷺ'' بزبان انگریزی 1851ء اور ''سیرت محمد ﷺ'' بزبان جرمن 1861ء میں تحریر ہوئیں۔

v۔ ڈاکٹر گاز لے نوو کی ''محمدن ازم'' مضمون رسالہ Christian Rememberance، مطبوعہ جنوری 1855ء میں لکھا۔

vi۔ ریورنڈ، ٹی، پی، ہیوز (Rev. T.P. Hughes) ''محمدن ازم'' پر کچھ خیالات "Notes on

"Muhammadamism"، طبع 1875ء

4۔ اسی طرح مناظرانہ کتب سیرت میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ ''تریاق مسموم'' مولانا الطاف حسین حالی کا تحریر کردہ رسالہ ہے جو انہوں نے پادری عماد الدین کی کتاب ''تحقیق الایمان'' کے رد میں 1867ء / 1280ھ میں تحریر کیا۔

ii۔ سید امیر علی تصنیف ''سپرٹ آف اسلام'' (Spirit of Islam) کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

iii۔ سر سید احمد کی کتاب ''خطبات احمدیہ'' کا انگریزی ترجمہ "A Series of Essays on the life of Muhammad" کے عنوان سے 1870ء میں لندن سے شائع ہوا۔ ''خطبات احمدیہ'' ولیم میور کی سیرت رسول ﷺ پر مشہور انگریزی کتاب کے جواب میں لکھی گئی۔

عصر حاضر میں پیر کرم شاہ الازہری نے ''ضیاء النبی'' جلد ہفتم میں مستشرقین کے ابہامات و الزامات کے جواب میں لکھی۔

موضوع کا بنیادی سوال (Problem of the Thesis)

سیرت کے موضوع پر غیر مسلم مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تنقیدی جائزہ لینا ہے۔ رسول ﷺ کی ذات پر انہوں نے جو الزامات عائد کیے ہیں ان پر غور کرنا ہے کہ انہوں نے یہ الزامات کس بنا پر لگائے ہیں۔ اکثر مستشرقین کی اسلام دشمنی انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ جانبداری اور متعصبانہ انداز میں تحقیق کریں۔

چنانچہ برصغیر کے سیرت نگاروں نے ان مستشرقین کے جو جوابات دیے ہیں ان کا مطالعہ کرنا ہے۔

مفروضہ جات:

1۔ مسلم سیرت نگاروں کے زیادہ کتابیں مقدس جذبے کے تحت لکھیں۔

2۔ مسلم سیرت نگاروں نے زیادہ کتابیں مستشرقین سے متاثر ہو کر لکھیں۔

3۔ مسلم سیرت نگاروں نے مستشرقین کے جوابات میں نسبتی سی کتابیں لکھیں۔

4۔ مستشرقین کے سیرت کی کتب لکھتے وقت رویہ بہت سخت رکھا ہے۔

5۔ مسلم سیرت نگاروں کا مستشرقین کے حوالے سے رویہ بہت سخت ہے۔

6۔ مسلم سیرت نگاروں کا مستشرقین کے حوالے سے رویہ بہت نرم ہے۔

7۔ مسلم سیرت نگاروں نے سیرۃ النبی ﷺ پر بہت اچھا کام کیا ہے جو مسلم اور مستشرقین کے لئے بہت مفید ہے۔

اہدافِ تحقیق:

1۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مطالعہ سیرت کی ضرورت و اہمیت کو واضح کرنا۔

2۔ تحریک استشراق کا مطالعہ اور اس کے اثرات کا تفصیلی جائزہ۔

3۔ عالم اسلام کے سیرت نگاروں کے تنقیدی اسلوب کا مطالعہ کرنا۔

4۔ برصغیر کے سیرت نگاروں کے تنقیدی اسلوب کا جائزہ مستشرقین کے افکار کے تناظر میں۔

5۔ برصغیر کے سیرت نگاروں کے رجحانات کا جائزہ۔

i۔ وہ سیرت نگار جو مستشرقین سے متاثر ہیں۔

ii۔ وہ سیرت نگار جو ناقدین یعنی متاثر نہیں ہیں۔

موضوع کی نوعیت کے پیش نظر اس کے لئے بیانیہ نیز تاریخی تحقیق کے طریقوں کے مطابق کام کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں لائبریریوں، انٹرنیٹ، کتب، رسائل وغیرہ سے استفادہ نیز دیگر ضروری طریقوں کو استعمال میں لایا گیا ہے۔

میں نے اپنے تحقیقی مقالہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے:

باب اول چار فصلوں پر مشتمل ہے جس میں سیرت کا تعارف، سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء، سیرت نگاری کا تاریخی ارتقاء اور مطالعہ سیرت برصغیر پاک وہند میں جائزہ لیا ہے۔

باب دوم بھی چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں تحریک استشراق، استشراق کی تاریخ، برصغیر میں تحریک استشراق اور مستشرقین اور ان کی تصانیف شامل ہیں۔

باب سوم میں بھی چار فصلیں شامل ہیں جس میں مستشرقین کے افکار سے متاثر سیرت نگار شامل ہے۔ مثلاً سر سید احمد خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی چراغ علی اور سید امیر علی اور ان کے حالات شامل ہیں

باب چہارم آٹھ فصلوں پر محیط ہے جس میں مستشرقین کے افکار کے ناقدین سیرت نگار شامل ہیں۔ مثلاً شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا حکیم عبدالرؤف داناپوری، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا حافظ ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، پیر کرم شاہ الازہری اور مولانا ظفر علی قریشی کے حالات اور واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔

باب پنجم بھی پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ جس میں نبی اکرم ﷺ کے اوصاف و کردار، رسول اکرم ﷺ کی عائلی زندگی تعدد ازدواج، رسول اکرم ﷺ بطور سربراہ مملکت، استحقاق نبوت اور تعلیمات شامل ہیں۔

تحقیق کے آخر میں جملہ تحقیق کے اختصار خلاصہ بحث کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ تحقیق کے اختتام پر موضوع تحقیق کے متعلق سفارشات (تجاویز) بیان کی گئی ہیں۔

فہرست مضامین

مضامین:

باب اول

سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء

فصل اول: سیرت کا تعارف

فصل دوم: سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء

فصل سوم: سیرت نگاری کا تاریخی ارتقاء

فصل چہارم: مطالعہ سیرت برصغیر پاک وہند میں

باب دوم

مستشرقین اور سیرت نگاری

باب سوم

مستشرقین کے افکار سے متاثر سیرت نگار

باب چہارم

مستشرقین کے افکار کے ناقدین سیرت نگار

فصل ہشتم: مولانا ظفر علی قریشی

باب پنجم

مستشرقین کا سیرت رسول ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر نقطہ نظر اور برصغیر کے سیرت نگاروں کا اسلوب تنقید

فصل اول: نبی اکرم ﷺ کے اوصاف و کردار

﴿......باب اول......﴾

سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء

باب اول

سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء

فصل اول

سیرت کا تعارف

برصغیر پاک و ہند میں سیرت نگاری کے آغاز و ارتقاء اور میلانات و رجحانات کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ فن سیرت نگاری کے متعلقات کا علمی و تاریخی جائزہ لیا جائے تا کہ ''سیرت'' کے متعین مفہوم، خصوصیات اور مآخذ و مصادر کی روشنی میں برصغیر میں سیرت نگاری کی نوعیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔

مسلمانوں کی دینی و علمی روایات میں سیرت نبوی ﷺ کو ایمانی و اعتقادی درجہ حاصل ہے۔(1) آپ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان، آپ کی اتباع و اطاعت اور آپ ﷺ عقیدت و محبت کے اظہار کے بغیر اسلام کا صحیح مفہوم اور معرفت الٰہی کا حصول ممکن نہیں ہے۔ (2) قرآن پاک کے بعد رسول ﷺ کی سیرت مطہرہ اسلام کے تعارف و تفہیم کا دوسرا بنیادی ذریعہ اور مصدر و مآخذ ہے جس سے انسان اسلام کے بارے میں صحیح رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔(3) اللہ سبحانہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کو انسانوں کے لئے بہترین قابل تقلید نمونہ قرار دیا ہے۔(4) تمدنی ارتقاء کے ساتھ سیرت کے معنی و مفہوم، وسعت و تنوع اور تحریری مواد میں اضافہ ہوتا گیا تاہم ایمان و عقائد کے اعتبار سے سیرت کا دینی مرتبہ و مقام روز اول کی طرح آج بھی جزو ایمان بلکہ عین ایمان ہے۔(5)

سیرت کا لغوی مفہوم:

سیرۃ، عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کی جمع سِیَر ہے۔ یہ لفظ دراصل سَارَ، یَسِیْرُ، سَیْراً وَمَسِیْراً سے نکلا ہے۔ اور چلنے پھرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سیرت کا مادہ سیر بمعنی چال ہے۔ اسی لئے اچھے چال چلن کو ''حسن السیرۃ'' بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور عربی لغت ''لسان العرب'' میں لکھا ہے کہ السیرۃ کے معنی ہیں چلنا پھرنا۔ حدیث حذیفہ میں ہے ''تسایر عنه الغضب'' یعنی اُس سے غصے کے آثار رخصت ہو گئے۔ سیرۃ کا لفظ مسافت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور السِّیَارۃ کے معنی قافلہ کے ہیں۔ السیرۃ کے معنی ہیئت کے بھی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے: ''سنعیدها سیرتها الاولیٰ'' یعنی ہم اُسے اسی ہیئت میں کر دیں گے۔ جیسی یہ پہلی تھی۔ پھر سیرۃ کے معنی پہلے لوگوں کے واقعات و احادیث بیان کرنا بھی ہیں۔(6)

ایک اور عربی لغت ''تاج العروس'' کے مطابق السیرۃ کے معنی طریقہ کے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ''سار الوالی فی رعیته، سیرۃ حسنة'' یعنی حاکم نے رعایا کے ساتھ اچھے طریقے کے ساتھ برتاؤ کیا۔ احسن السیر کا مطلب ہے اچھا طریقہ اور ''هذا فی سیرۃ الاولین'' کے معنی ہیں یہ بات پہلے لوگوں کے طریقوں میں بھی موجود ہے۔ سِیَر اور سیرۃ (کسرہ کے ساتھ) کے معنی پہلے لوگوں کی باتیں کرنا ہے۔ آخر میں صاحب تاج العروس کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ (استاد) فرماتے ہیں کہ ''السیرۃ النبویه'' اور ''کتب السیر'' کے الفاظ سیرۃ بمعنی طریقہ سے ماخوذ ہیں اور غزوات وغیرہ کو الحاقی طور پر یا تاویل کے باعث اس میں داخل کیا گیا ہے۔(7)

لوئس معلوف کی مشہور کتاب المنجد فی اللغۃ میں السیرۃ کی توضیح اس طرح کی گئی ہے: السیرۃ اسم من سار السنة والطریقة والمذهب والهیئة. السیرۃ سار یسیر کا اسم ہے بمعنی سنت، طریقہ، مذہب اور ہیئت، سیرۃ الرجل صحیفة اعماله و کیفیة سلوکه بین الناس کسی شخص کی سیرت کا مطلب ہے اس شخص کی سوانح حیات اور لوگوں کے ساتھ اس کے برتاؤ کا انداز۔ یقال هو حسن السیرۃ ومنه قولهم ''من طابت سریرته حُمدت سیرته'' کہا جاتا ہے کہ فلاں اچھی چال چلن کا حامل ہے اور اسی سے عرب کا قول ہے کہ جس کا باطن پاکیزہ ہوتا ہے اس کا کردار قابل ستائش ہوتا ہے۔(8)

السیرۃ سار الوالی فی الرعیة سیرۃً حسنةً بادشاہ اپنی رعایا میں اچھے کردار اور چال چلن کے ساتھ مشہور ہوا واحسن

السیر بہترین اخلاق وکردار والا۔ وھذا فی سیر الاوّلین یہ پہلےلوگوں کے واقعات میں پایا جاتا ہے۔ وقال خالد بن زھیر :

فلا تغضبن من سنۃٍ انت سرتھا   فاؤل راضی سنۃ من یسیرھا

خالد بن زھیر کا شعر ہے کہ ایسی عادت وروش پر تجھے غصے میں نہیں آنا چاہیے جو تو خود کر چکا کیونکہ کسی طریقہ پر راضی ہونے والا پہلا شخص وہ ہوتا ہے جو اسے بذاتِ خود کر چکا ہے۔(9) علامہ مجدالدین فیروز آبادی القاموس المحیط میں لکھتے ہیں :

السیرۃ بالکسر السنۃ والطریقۃ والھیئۃ والمسیرۃ "السیرۃ س کے زیر کے ساتھ سنت، طریقہ، ہیئت اور مسافت کے" معنوں میں مستعمال ہے۔(10)

دو اور عربی لغات ''المعجم الاعظم'' اور ''مصباح اللغات'' میں لفظ سیرت کے یہ معنی درج کئے گئے ہیں :

1۔ جانا، روانہ ہونا، چلنا،   2۔ روش، طریقہ،   3۔ شکل وصورت،

4۔ ہیئت،   5۔ حالت،   6۔ کردار،

7۔ سنت،   8۔ طرز زندگی، کام کاج کرنے کا چلن، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ،

9۔ عادت،   10۔ کہانی، پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات کا بیان وغیرہ۔(11)

نسیم اللغات میں ''ذاتی جواہر'' بھی بیان کیا گیا ہے۔(12)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں سیرت کا مفہوم، طریقہ و مذہب، سنت، ہیئت، حالت اور کردار تک محدود نہیں، بلکہ اس سے مراد، داخلی شخصیت، اہم کارنامے اور اکابر کے حالاتِ زندگی بھی ہیں۔(13)

پروفیسر عثمان خالد یورش نے لفظ سیرت کے معنی کو توضیح کے لئے قرآن مجید کی اس آیت کو پیش نظر رکھا ہے :

''قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین''(14)

''اے نبی ﷺ! لوگوں سے کہو کہ زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا''۔

اور کہا کہ ''سیر کا لفظ، غور سے مثبت وٹھوس حقائق کی تلاش میں چلنا، غور وخوض کرنا، عاقبت اندیشی سے کام لینا اور نیک افعال و اعمال سے کردار کی تعمیر کرنا وغیرہ سے عبارت ہے۔ خود قرآن پاک نے ''سیر'' کا لفظ نیک تحریک وعوامل سے مکمل کر دیا ہے۔ پس سیرت کسی نیک نیت اور پاک سرشت انسان کے قواعد وحرکات کا مکمل اور معیاری مجموعہ ہوتا ہے''۔(15) چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیرت کے مراد طور طریقہ، رہن سہن ہے اور زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہم اختیار کرتے ہیں اسے سیرۃ کا نام دیا جاتا ہے۔

سیرت کا اصطلاحی مفہوم :

جہاں تک سیرت کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے تو سیـــر کے معنی چلنے، پھرنے اور سفر کرنے کے ہیں۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ پہلے پہل جہاد وغزوات کے لئے استعمال ہونے لگا کیونکہ جہاد وغزوات میں سفر اور انتقال مکان ہوا کرتا تھا۔

سیرت کا لغوی مفہوم اگرچہ کسی نیک صفت انسان کا انفرادی کردار، مزاج، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اور اس کی سوانح عمری ہے۔ لیکن اصطلاح میں اس سے مراد آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی اور اخلاق وعادات کا بیان ہے اس لفظ کا اطلاق حضور سرورِ کائنات ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر پہلے بھی ہوتا رہا اور اب بھی اس کا اصطلاحی مفہوم یہی ہے۔(16)

سیرت کی اولین کتابیں چونکہ ''مغازی'' کہلاتی تھیں۔ اس لئے سیرت کے معانی میں خصوصیت سے آنحضرت ﷺ کے مغازی کا بیان اور بعد ازاں آپ کی زندگی کے حالات کا بیان شامل ہوگیا۔(17) کشاف اصطلاحات الفنون میں ہے :

''مغازی کو سیر اس لئے کہتے ہیں کہ اول امورھا السیر الی الغزو یعنی میدان جنگ کی طرف چل کر جانے سے

جہاد ومغازی کی ابتداء ہوتی ہے"۔(18)

مغازی، اُن جنگوں کو کہتے ہیں جن میں حضورﷺ خود شریک ہوئے اس اعتبار سے "مغازی" کا دائرہ غزوات رسولﷺ اور شریک جنگ اصحاب رسول تک محدود رہنا چاہیے تھا۔لیکن اس اصطلاح کا اطلاق رسول اللہﷺ کی پوری زندگی اور عہد رسالت کے سارے واقعات پر کیا جانے لگا۔(19)

شیخ محمد طاہر پٹنی "مجمع بحار الانوار" میں کتاب السیر کی ابتداء یوں کرتے ہیں:

كتاب السير. جمع سيرة بمعنى الطريقة لأن الأحكام المذكورة فيها ملتقاة من سير رسول الله ﷺ في غزواته ۔السیر سیرۃ کی جمع ہے جو کہ طریقہ کے معنی میں ہے اس لئے کہ اس میں ذکر شدہ احکام رسول اکرمﷺ کے غزوات سے لئے گئے ہوتے ہیں۔(20)

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور آئمہ رجال، آنحضرتﷺ کے خاص غزوات کو "مغازی" اور "سیرت" کہتے ہیں۔ چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی۔ حافظ ابن حجر "فتح الباری" (کتاب المغازی) میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔کتب حدیث وفقہ میں بھی "کتاب الجہاد والسیر" کے عنوان سے جو باب باندھا جاتا ہے اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام ہی مراد ہوتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "کئی صدیوں تک یہی طریقہ رہا، چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں۔البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں۔مثلاً "مواہب لدنیہ" میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے"۔(21)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے غیر مسلموں سے امن و جنگ کے زمانے کے احکام کو بھی "سیر" قرار دیا ہے۔(22)

اُردو دائرہ معارف اسلامی میں ہے:

انها غلبت في الشرع على امور المغازى وما يتعلق بها یہ لفظ زیادہ تر مغازی اور اس سے متعلق امور کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔(23)

اس کے بعد اس لفظ کے معنی میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کے مفہوم میں جہاد وغزوات کے علاوہ کفار ومشرکین اور باغیوں کے ساتھ صلح وامن کے امور، تجارت اور دیگر متعلقات بھی داخل ہو گئے۔محمد علی الفاروقی لکھتے ہیں کتاب السیر سے مراد سير الامام و معاملاته مع الغزاة والانصار والكفار ہے یعنی مسلمان حاکم وقت کا غازیوں، مددگاروں اور کافروں کے ساتھ سلوک ومعاملات۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

اصل میں سیر بمعنی چلنا اور جانا تھا اس سے طریقہ کی طرف انتقال ہوا۔ پھر شروع میں اس پر خاص معنی غالب آ گئے یعنی:

"طريقة المسلمين في المعاملة مع الكافرين والباغيين وغيرهم من المستامنين والمرتدين واهل الذمة"

یعنی مسلمانوں کا کافروں، باغیوں، پناہ لینے والوں، مرتدوں اور ذمیوں وغیرہ کے ساتھ سلوک وتعلقات۔(24)

سیرت کے مفہوم میں مذکورہ وسعت اور عموم فقہاء کے نزدیک ہے اور انہوں نے اپنی فقہی کتب میں کتاب السیر کے نام سے الگ باب قائم کر کے اس میں مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ جنگ وامن، معاملات، معاہدات اور سلوک وکردار کے مسائل ذکر کئے ہیں جسے اسلام کے بین الاقوامی قانون (International Law of Islam) کا درجہ حاصل ہے اس سلسلے میں سب سے اہم کتاب امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ (متوفی 189ھ) کی کتاب السیر ہے جو شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسیؒ (متوفی 483ھ) کی شرح کے ساتھ چھپ چکی ہے اور عام دستیاب ہے۔محدثین، آئمہ رجال اور ارباب تاریخ کے ہاں سیرت کا لفظ غزوات و جہاد کے احکام وواقعات کے علاوہ رسول اکرمﷺ کی

حیات طیبہ کے تمام حالات کو شامل ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ عجالہ نافعہ میں فرماتے ہیں:

''وہ حدیثیں جو ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ، صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ سے متعلق ہیں اور سرور کائنات ﷺ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات پر مشتمل ہیں وہ ''سیر'' کے نام سے موسوم ہیں''۔ (25)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا فاضل مقالہ نگار لکھتا ہے:

''اس لفظ کا اطلاق حضور سرور کائنات ﷺ کی حیات مبارکہ پر پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی اس کا اصطلاحی مفہوم یہی ہے۔ سیرت کی اولین کتاب چونکہ مغازی کہلاتی تھیں اس لئے سیرت کے معانی میں خصوصیت سے آنحضرت ﷺ کے مغازی کا بیان اور بعد ازاں آپ ﷺ کی زندگی کے حالات کا بیان شامل ہو گیا''۔ (26)

یہی لفظ ''سیرت'' آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی کے علاوہ دوسرے اہم اشخاص کی سوانح کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً کتاب ''سیرۃ معاویہ'' ''کتاب ''سیر الملوک''۔ (27)

اس کے علاوہ کسی مشہور تاریخی یا افسانوی شخصیت کے کارناموں کو بھی ''سیرت'' کا نام دیا گیا ہے۔ مثلاً سیرۃ عنتر، سیرت سیف بن ذی یزن، سیرۃ صلاح الدین وغیرہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیرت کے لئے قدیم زمانے میں لفظ ''تاریخ'' بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً امام بخاری کی تاریخ صغیر و کبیر، السخاوی نے ''اعلان بالتوبیخ'' میں انفرادی اور اجتماعی سوانح عمروں کو بھی تاریخ کی تحت درج کیا ہے۔ آج کل بھی سیرت کا لفظ صحابہ کرام، علماء و فضلا اور دیگر نامور اشخاص کے لئے عام استعمال ہو رہا ہے۔ مثلاً سیرۃ الصحابہ، سیرۃ عائشہ، سیرۃ امام ابن تیمیہ وغیرہ۔ تاہم ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ''تمام اشخاص کی بائیوگرافی کو سیرت کہنا زیادتی ہے۔ کیونکہ سیرت کے لفظ کو اصولی طور پر آنحضرت ﷺ کے حالات ہی سے مخصوص ہونا چاہیے''۔ (28)

اکثر محدثین مغازی و سیر کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ ابتداء سیر سے مراد صرف غزوات لئے جاتے تھے اور اس کے مفہوم میں ابھی زیادہ وسعت نہیں آئی تھی چنانچہ ابن اسحاق کی مشہور کتاب کو سیرت ابن اسحاق بھی کہا جاتا ہے اور مغازی ابن اسحاق بھی۔ اس طرح حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں کتاب المغازی کے لئے ''الجهاد و السير'' کے عنوان سے باب باندھا ہے۔

چنانچہ اسلامی غزوات اور جنگوں کے بیان کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں انہیں کتاب المغازی یا کتاب السیر کا نام دیا جاتا ہے۔ حضرت ابن شہاب زہری (م 124ھ) محمد بن اسحاق (م 151ھ) اور عمر بن راشد الدزدی (م 152ھ) کی کتاب المغازی اور بعد کے دور میں محمد بن عمر الواقدی کی کتاب التاریخ والمغازی، ابن عبدالبر کی الدرر فی اختصار المغازی والسیر اور سلیمان بن موسیٰ الکلاعی اندلسی کی الاکتفائی مغازی رسول اللہ سیرت کی ایسی ہی اولین و چند کتابیں ہیں جن میں حضور ﷺ کے غزوات کا تفصیلی بیان ہے۔ بعد کے ادوار میں لفظ سیرت کے مفہوم میں توسیع ہوئی اور سیرت کی کتابوں میں امام وقت کا غازیوں، اسلامی فوج اور دشمن کے ساتھ مختلف سلوک اور ان سے مختلف معاملات کا بیان کیا جانا شروع ہوا۔ (29) چنانچہ محمد علی الفاروقی لکھتے ہیں کہ:

''کتاب السیر سے مراد سیر الامام و معاملة الغزاة والانصار والكفار ہے یعنی مسلمان حاکم وقت کا غازیوں، مددگاروں اور کافروں کے ساتھ سلوک و معاملات''۔ (30)

دوران جنگ دشمن کے مختلف طبقوں مثلاً کافر، باغی، طالب امن (مستامن)، مرتد، ذمی وغیرہ کے ساتھ مختلف نوعیت کے سلوک کے بیان کے لئے لفظ ''سیرت'' استعمال کیا جانے لگا۔ (31)

حافظ عبدالمومن الدمیاطی کی سیرت دمیاطی، شیخ ظہیر الدین گازرونی کی سیرت گازرونی، علامہ مغلطائی اور ابن عبدالبر الاندلسی کی

سیرت ابن عبدالبر اس کی چند مثالیں ہیں۔ (32)

مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء نے اس کے مفہوم میں کچھ تبدیلی کر کے لفظ سیرت بین الاقوامی کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مشہور شاگرد حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ نے کتاب السیر الکبیر اسی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی، یعنی جنگ وصلح میں مسلمانوں کا دیگر اقوام وملل کے ساتھ معاملہ وطریقہ۔ (33)

بعض محدثین نے مخصوص مضامین سیرت کو شمائل وفضائل کے نام سے ترتیب دیا اور حضورﷺ کے سراپا، حالات وعادات اور کریمانہ اخلاق کی حد تک سیرت کے مضامین کو مخصوص کر دیا۔ محمد بن یحیٰی الترمذی (صاحب ترمذی شریف) کی الشمائل والنبویہ والخصائل المصطفویہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ (34)

علامہ شبلی نعمانیؒ سیرت النبی میں لکھتے ہیں:

''تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی اس میں داخل کر لی گئیں مثلاً مواھب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے''۔ (35)

مشہور جرمن مستشرق جوزف ہورووٹس (Joseph Horovitz) لکھتا ہے:

''مغازی ان جنگوں کو کہتے ہیں جن میں حضورﷺ خود شریک ہوتے۔ اس اعتبار سے مغازی کا دائرہ غزوات رسولﷺ اور شریک جنگ صحابہ رسولﷺ تک محدود رہنا چاہئے تھا لیکن اس اصطلاح کا اطلاق رسول اللہﷺ کی پوری زندگی اور عہد رسالت کے سارے واقعات پر کیا جانے لگا''۔ (36)

بعد کے ادوار میں سیرت کے مفہوم میں مزید وسعت سے کام لیا گیا اور اسے رسول اکرمﷺ کی حیات طیبہ کے علاوہ صحابہ کرام اور اولیائے عظام کی زندگیوں کے واقعات کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا جیسے کتاب سیرۃ الصحابہ، سیرت عائشہ، سیرت عمر بن عبدالعزیز، سیرت النعمان اور سیرت ابن تیمیہ وغیرہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور عام طور پر ملتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق سیرت کا مفہوم طریقہ و مذہب، سنت، ہیئت، حالت اور کردار تک محدود نہیں بلکہ اس سے مراد داخلی شخصیت، اہم کارنامے اور اکابر کے حالات زندگی بھی ہیں۔ (37)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے مذکورہ عبارت میں اکابر کے حالات زندگی کو بھی سیرت کا نام دیا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ اسی کتاب میں انہوں نے رسول اکرمﷺ کی حیات طیبہ کے علاوہ کسی اور کے لئے سیرت کے لفظ کو استعمال کرنا، زیادتی کہا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''تمام اشخاص کی Biography (سوانح حیات) کو سیرت کہنا زیادتی ہے کیونکہ سیرت کے لفظ کو اصولی طور پر آنحضرتﷺ کے حالات ہی سے مخصوص سمجھنا چاہئے''۔ (38)

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ جب سیرت کا لفظ علی الاطلاق استعمال کیا جائے تو اس سے صرف اور صرف آنحضرتﷺ کی سیرت مراد لینی چاہئے اور اس مطلق صورت میں سیرت کا لفظ آنحضرتﷺ کی حیات کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال کرنا زیادتی ہوگی۔ ہاں جب ضافت یا کسی اور قید کے ساتھ ذکر کیا جائے تو پھر درست ہوسکتا ہے۔

سیرت کی مذکورہ اصطلاحی تعریفات کو مدنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اکرمﷺ کی حیات طیبہ کے تمام حالات، واقعات، غزوات، شمائل واخلاق، پسند وناپسند فرمودات اس سے متعلقہ اقوال، افعال وتقریرات، ازواج مطہرات، اہل بیت عظام، صحابہ کرام اور غیر مسلموں کے ساتھ تعامل ومعاملات بلکہ زمانہ قبل پیدائش وبعد وفات کے وہ واقعات جن کا تعلق آنحضرتﷺ کے ساتھ ہے سیرت کہلاتے ہیں۔

قرآن میں لفظ ''سیرت'' کا استعمال:

قرآن پاک میں السیر اور السیر ۃ کے الفاظ انہی لغوی معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ سورہ طور میں ارشاد ہے و تسیر الجبال سیرا اور پہاڑ اپنی جگہ سے چل پڑیں گے۔ (39) سورہ روم میں ہے:

''اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم'' (40)

''کیا یہ لوگ زمین میں نہیں پھرے کہ دیکھ لیتے انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں''۔

سورہ قصص میں ہے:

''فلما قضیٰ موسیٰ الاجل و سار باھلہ انس من جانب الطور نارا'' (41)

''پس جب موسیٰ اپنی مدت پوری کر چکے اور اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر چل دیئے تو ان کو کوہ طور کی طرف سے آگ (روشنی) دکھائی دی''۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے:

''خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَى'' اس (اژدھا) کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں۔ ہم اسے پہلی والی ہیئت پر لے آئیں گے۔ (42)

گویا قرآن پاک میں یہ الفاظ چلنے پھرنے اور ہیئت و حالت کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

اس آیت سے پہلے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے پوچھا کہ ''یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ''یہ میری لاٹھی ہے۔ اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں۔ اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے موسیٰ اسے پھینک دے''۔ حضرت موسیٰ نے اسے پھینک دیا تو وہ یکا یک سانپ بن کر دوڑنے لگی۔ (43)

مذکورہ بالا آیت میں لفظ سیر کے معنی ہیئت، حالت، شکل و صورت اور حقیقی کردار کے ہیں۔

احادیث میں لفظ ''سیرت'' کا استعمال:

البتہ بعض احادیث میں لفظ ''سیرت'' اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ''مسند احمد بن حنبل'' میں دو ایسی احادیث موجود ہیں۔ جن میں یہ لفظ اپنے مخصوص معانی میں برتا گیا ہے۔ (44)

پہلی حدیث یہ ہے:

''قام علی علی المنبر فذکر رسولہ اللہ ﷺ فقال قبض رسول اللہ ﷺ واستخلف ابوبکرؓ فعمل بعملہ وسار بسیرتہ حتٰی قبضہ اللہ عزوجل ذلک ثم استخلف عمرؓ علیٰ ذلک فعمل بعملھما وسار سیرتھما حتٰی قبضہ اللہ عزوجل علیٰ ذلک'' (45)

''حضرت علی منبر پر کھڑے ہوئے اور آپ نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''جب آپ ﷺ کی روح قبض کر لی گئی تو آپ کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب کئے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ جیسے کام کئے اور آپ کی ''سیرت'' پر چلے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو بھی قبض کر لیا۔ آپ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب کئے گئے۔ حضرت عمرؓ نے اُن دونوں جیسے کام کئے اور اُن کی سیرت پر چلے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی روح کو بھی قبض کر لیا''۔

دوسری حدیث میں یہ ہے:

''عن ابی وائل قال قلت لعبد الرحمن بن عوف کیف بایعتم عثمان وترکتم علیاؓ قال ما ذنبی قد برات بعلی فقلت ابایعک علی کتاب اللہ وسنۃ رسولہ وسیرۃ ابی بکر وعمر رضی اللہ عنھما

قال فقال فیما استطعت قال ثم عرضتہا علی عثمانؓ فقبلہا'' (46)

''حضرت ابووائل سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے کہا کہ آپ لوگوں نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت عثمانؓ کی بیعت کیوں کی؟ انہوں نے فرمایا: ''اس میں میرا کوئی قصور نہیں، میں نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور سیرت ابوبکر وعمر پر تمہاری بیعت کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ ''میں ان میں سے جتنی بات کی استطاعت رکھوں گا۔ اُسے سرانجام دوں گا۔'' پھر میں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں یہی بات پیش کی تو انہوں نے اسے تسلیم کرلیا''۔

اول الذکر حدیث میں سار بسیرتہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، آپ کی ''سیرت'' پر چلے) اور ثانی الذکر حدیث میں سیرۃ ابی بکر کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ (یعنی ابوبکر صدیقؓ کا طریق کار اور طرز زندگی)۔ گویا حدیث میں لفظ سیرۃ سے مراد ہیئت، حالت اور طرز زندگی کے ہیں۔

سیرۃ کا استعمال، آثار صحابہ میں:

سیرۃ کا لفظ آثار صحابہ بھی مستعمل رہا ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے:

''قام علی علی المنبر فذکر رسول اللہ فقال قبض رسول اللہ وستخلف ابوبکر فعمل بعملہ وسار بسیرتہ حتی قبض اللہ عزوجل ذلک ثم استخلف عمر علی ذالک فعمل بعملہما وسار بسیرتہما حتی قبض اللہ عزوجل ذالک'' (47)

''حضرت علیؓ منبر پر کھڑے ہوئے اور آپؓ نے رسول اکرم ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے تو آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کئے گئے، حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ جیسے کام کئے اور آپ ﷺ کی سیرت پر چلے یہاں تک کہ آپ فوت ہو گئے تو حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب کئے گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان جیسے کام کئے اور آپ ﷺ کی سیرت پر چلے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح بھی قبض کرلی''۔

اسی مسند ابن حنبل کی دوسری روایت ہے:

''عن ابی وائل قلت لعبد الرحمن بن عوف کیف بایعتم عثمان وترکتم علیا قال ما ذنبی برأت بعلی فقلت ابایعک علی کتاب اللہ و بسنۃ رسولہ و سیرۃ ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما قال فقال فیما استطعت قال ثم عرضتہا علی عثمان فقبلہا''. (48)

''حضرت ابووائل سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے کہا کہ آپ لوگوں نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت عثمانؓ کی بیعت کیوں کی؟ انہوں نے کہا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں میں نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور سیرت ابوبکرؓ وعمرؓ پر تمہاری بیعت کرتا ہوں، حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ میں حسب استطاعت ذمہ داری نبھاؤں گا پھر میں نے حضرت عثمانؓ سے یہی بات کی تو انہوں نے اسے تسلیم کرلیا''۔

سیرت کی اصطلاح کا اولین استعمال اور آغاز:

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لیڈن کے مقالہ نگار جی لیوی ڈیلاویڈا (G. Levi-dellavida) کی تحقیق کے مطابق حضور اکرم ﷺ کی سوانح عمری کے لئے لفظ ''سیرت'' سب سے پہلے ابن ہشام (م/213ھ) نے استعمال کیا۔ اس نے ابن اسحاق (م 151/ھ) کی کتاب المغازی میں گراں قدر اضافے کرکے اپنی مرتبہ کتاب کو ''سیرۃ'' کا نام دیا۔ وہ اسے ''ھذا کتاب سیر رسول اللہ ﷺ'' (یہ

کتاب سیرت رسول اللہ ﷺ ہے) کہہ کر متعارف کراتا ہے۔ وسٹنفلڈ (Wustenfled) کے مرتب کردہ مطبوعہ نسخہ کے سرورق پر یہی الفاظ درج ہیں۔ تاہم مقالہ نگار کے بقول، آنحضرت ﷺ کی حیات کے لئے ''سیرت'' کا استعمال اس سے پہلے بھی ملتا ہے۔ ابن سعد (م230/ ھ) نے ''طبقات'' (18:1/2) میں بتایا ہے کہ اس کے استاد واقدی (م 207/ ھ) نے اس لفظ کو بالکل اسی مفہوم میں برتا ہے۔ من روی السیر ۃ ''اس نے سیرت کو روایت کیا ہے''۔

ابن سعد لکھتے ہیں :ھئو لاء اعلم بالسیرۃ و المغازی من غیر ھم، کہہ کر اس اصطلاح کو حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔(49)

ڈاکٹر مارسڈن جونس، (Dr. Marsden Jones) واقدی کی ''کتاب المغازی'' کے مقدمہ میں لکھتا ہے ''اس میں کچھ شک نہیں کہ لفظ ''سیرت'' کا سیرت النبی کے معنی میں استعمال، ابن ہشام کی ابن اسحاق سے روایت سے قبل بھی ہوا ''کتاب الاغانی'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا اس خاص معنی میں استعمال محمد بن شہاب الزہری (م124/ ھ) کے زمانہ میں بھی معروف تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اصفہانی نے درج ذیل نص پیش کی ہے۔

مدائنی نے خالد بن عبداللہ القسری کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن شہاب نے مجھے خبر دی کہ خالد بن عبداللہ القسری نے مجھے حکم دیا کہ میں اُن کے لئے انساب کے موضوع پر لکھوں، میں نے اُن کے حکم کی تعمیل بھی خاندان مضر کا نسب نامہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ خالد کہنے لگے۔ اسے ختم کرو۔ اللہ اسے اور اس کے اصولوں کو ختم کرے اور میرے لئے ''سیرت'' کے موضوع پر لکھو''۔(50)

جی لیوی ڈیلاویڈا، آنحضرت ﷺ کی سوانح کے لئے لفظ ''سیرت'' کے استعمال کی وجہ سے بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''یوں لگتا ہے کہ اول اول رسول اللہ ﷺ کی سوانح عمری کے لئے لفظ سیر (جمع کا صیغہ) کا تخصیصی استعمال اس لئے کیا گیا تھا کہ اسلام کے عروج کے زمانے میں عرب، پہلوی الاصل ''سیر الملوک'' سے واقف ہوئے اور انہوں نے بھی تقلیداً اپنے پیغمبر کے سوانحی واقعات مدون کر کے انہیں ''سیر'' کا نام دیا۔(51)

اس کے برعکس عبدالقدوس ہاشمی کہتے ہیں کہ ''اردو، بلکہ اس سے پہلے ہی عربی میں بھی لفظ سیرت، اگر مخصوص نہیں تو زیادہ انبیاء کرام اور بزرگان دین کے احوال زندگی کے لئے استعمال ہونے لگا تھا۔ عربی سے اس لفظ کو اسی معنی میں عبرانی، آرامی اور سریانی زبانوں میں بھی لیا گیا تھا۔ اور ان زبانوں میں بھی لفظ ''سیرۃ النبی ﷺ'' کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے احوال وواقعات کو مقصود قرار دے رہے ہیں''۔(52)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ''سیر الملوک'' کی تقلید میں نہیں، بلکہ ارشاد ربانی پر عمل کرتے ہوئے اپنے پیغمبر کی زندگی کی تفصیلات جمع کیں۔

چونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ''(53)

''تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے''۔

اس اُسوہ حسنہ کے ایک ایک پہلو کو محفوظ کرنے کی کوشش میں کتب احادیث وسیر کا عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ:

''ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شھیدا.محمدرسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم ترھم رکعا سجدا یبتغو ن

فضلامن اللہ ورضوانا"(54)

''وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے کہ اس رسول ﷺ کو ہدایت دی اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا تا کہ محمد ﷺ کے اللہ کے رسول ہیں اور جولوگ آپ ﷺ کی صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں۔ اور آپس میں مہربان ہیں۔ اے مخاطب! تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی سجدے کر رہے ہیں کبھی رکوع۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا مندی کی تلاش میں لگے ہیں''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ہدایت یافتہ اور سچا دین دے کر بھیجا اور جولوگ آپ ﷺ کی محبت میں بیٹھتے ہیں۔ یعنی صحابہ کرام وہ بھی آپ ﷺ کی صحبت کی وجہ سے دشمنوں پر سخت ہیں کیونکہ جس قسم کی عادات کسی بھی لیڈر، حاکم، سپہ سالار، قائد کی ہوں گی۔ اس کے کارکنوں کی بھی وہی عادات ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے اخلاق اتنے بلند تھے اور آپ ﷺ کی تعلیم اتنی بہتر تھی کہ آپ ﷺ کے ساتھی بھی چلتے پھرتے نمونہ تھے۔ آپ ﷺ کی سیرت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

"الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التورۃ والانجیل یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبئث ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم فالذین امنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون"(55)

''جولوگ ایسے رسول نبی امی کی اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ جن کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اچھی باتوں کا حکم فرماتے ہیں۔ اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال ٹھہراتے ہیں۔ اور گندی چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔ اور ان لوگوں پر جو طوق اور بوجھ تھے، دور فرماتے ہیں۔ لہٰذا جولوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں۔ اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس کے نور کی اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں''۔

اس آیت میں بھی آپ ﷺ کی سیرت کو بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔ کیونکہ نیک آدمیوں کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ اچھی بات کو پسند کرتے ہیں۔ اور بری بات کو کرنے سے روکتے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا ہے:

"وما ینطق عن الھوٰہ ان ھوالا وحی یوحی"(56)

''اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں کرتے ہیں ان کا ارشاد وحی ہے۔ جو ان پر بھیجی جاتی ہے''۔

اس آیت میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ اپنی خواہشات کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا وہ بیان فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپ ﷺ کی بعثت کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

"لقد من اللہ علی المومنین اذبعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین"(57)

''اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا ہے جو ان کے درمیان ایک رسول بھیجا۔ جو انہی میں سے ہے انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی گو وہ اس سے قبل صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے''۔

ایک اور جگہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

"وما ارسلنک الا رحمة للعالمین"(58)

''ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا''۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں۔ آپ کو مبعوث فرمانے کا مقصد ہی یہی تھا۔ کیونکہ آپ ﷺ کی ذات گرامی ایک عمدہ نمونہ تھی۔ جس سے لوگ کچھ حاصل کرتے تھے۔ اور آج بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

"وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا"(59)

''اور رسول ﷺ تم کو جو کچھ دیں اسے لے لیا کرو۔ اور جس سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو''۔

قرآن پاک میں بے شمار مقامات پر آپ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ جس سے آپ ﷺ کی سیرت قرآن پاک کی روشنی میں واضح ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور کوش خبری بھی سنا دی ہے کہ:

"ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیماً"(60)

''جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے لگا۔ وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا''۔

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص بھی حضور اکرم ﷺ کا کہا مانے گا۔ وہ فلاح پائے گا کیونکہ نبی رحمت ﷺ کے ہر کام میں فلاح و کامیابی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مومنین سے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ:

"یاایھالذین امنوااطیعو اللہ ورسولہ"(61)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو''۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے کہ:

"واطیعوالرسول لعلکم ترحمون"(62)

''اور رسول پاک ﷺ کی اطاعت کرو تا کہ تم پر مہربانی کی جائے''۔

سو ان تمام آیات سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت کی جائے۔ مسلمانوں کی کامیابی اسی میں ہے اس سلسلہ میں تو کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں کہ حضور سرورکائنات کے اقوال و اعمال کو ان کی حیات بابرکات میں بھی بہت اہمیت حاصل تھی۔ اور بعد از وصال تو ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اس ضرورت نے آپ ﷺ کی سیرت کی تمام تفصیلات اور آپ ﷺ کے تمام ارشادات کی تدوین کو ناگزیر بنا دیا۔ بقول ڈاکٹر مارسڈن جونس ''اس عنایت و اہتمام کا باعث صرف تقوی ہی نہیں ہے، بلکہ دینی عقائد اور شرعی احکام کے سلسلہ میں ٹھوس معلومات حاصل کرنا۔ اسلامی معاشرہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔(63) چنانچہ یہی تھی دراصل وہ اساس، جس کے باعث ان علوم (حدیث وسیر) کو مدون و مرتب کیا گیا''۔

فصل دوم

سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء

فن سیرت نگاری:

سیرت نگاری ایک جداگانہ فن اور علم وادب کی ایک ممتاز اور منفرد صنف ہے یہ نہ تو حدیث ہے اور نہ تاریخ۔ ذیل میں ہم حدیث و تاریخ اور سیرت کے حوالے سے یہ جاننے کی کوشش کریں گے ان کے مابین کیا فرق ہے اور سیرت کس طرح ایک جداگانہ اور منفرد صنف ہے۔

حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری نے اپنی کتاب ''اصح السیر'' کے مقدمہ میں حدیث اور سیرت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محدثین کرام فن حدیث میں ان تین امور سے بحث کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا؟ کیا کیا؟ اور آپ ﷺ کے سامنے کیا کیا گیا، ارباب سیر کا موضوع میں بھی یہی تین امور ہوتے ہیں اگر موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ دونوں ایک ہی فن ہیں لیکن تفصیل میں اس کی نوعیت بدل جاتی ہے، پہلی بات یہ ہے کہ محدثین کا مقصد یا حدیث کا موضوع احکام ومسائل کا علم اور ان کا بیان ہوتا ہے اور ذات رسول اللہ ﷺ یہاں التزامی موضوع نہیں ہے جبکہ سیرت نگار رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے بحث کرتے ہیں اور احکام کی بحث ضمناً ہوتی ہے، سیرت کی کتابوں میں واقعات کی تفصیل ہوتی ہے اور ایک ایک پہلو واضح کیا جاتا ہے، حدیث میں واقعات کی تفصیل نہیں ملتی اور کسی خاص پہلو کی وضاحت کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے محدثین کا مدار بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا قول رسول اللہ ﷺ کا ہے یا نہیں؟ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق پر صرف ہوتی ہے کہ اس قول کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح ہے یا نہیں، لیکن اصحاب سیرت کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دو باتیں اور معلوم کرنی پڑتی ہیں، ایک یہ کہ حضور ﷺ نے کب ایسا کہا اور کیا؟ دوم یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟ اصحاب سیرۃ حضور ﷺ کے اقوال وافعال کو مسلسل اور مربوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اسباب وعلل کو بھی جاننا چاہتے ہیں، اصحاب حدیث کہتے ہیں کہ ''اس کی ضرورت نہیں ہے جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فعل رسول اللہ ﷺ کا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا طریقہ ہو گیا گویا یہ نہ معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کب کس دن کس تاریخ ایسا کہا یا ایسا کیا''۔ (64)

اس فرق کی وجہ سے اصحاب سیرۃ اور اصحاب حدیث کی دو جماعتیں الگ الگ بن گئیں اور معیار تحقیق بھی دونوں کا جدا ہو گیا، محدثین رواۃ کی ثقاہت، تقویٰ اور دیانت کی کمی زیادتی کی بنا پر مقبول رواۃ کی روایتوں میں اختلاف کے وقت ترجیح دیتے ہیں اور اصحاب سیرۃ حالات کی موافقت اور واقعات کے علم کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں محدثین نے رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل کی صحت دریافت کرنے کے لئے جس احتیاط سے قواعد بنائے ہیں اس کی نظیر عالم میں نہیں مل سکتی وہ بے سند کسی بات کو قبول نہیں کرتے رواۃ حدیث میں سے ایک ایک کے حالات کی نہایت احتیاط سے تنقید کی ہے، مدارج مقرر کر دیئے ہیں اور بتا دیا ہے کہ کس کی بات کہاں تک قابل قبول ہے اور کہاں تک قابل رد۔ اصحاب حدیث ہوں یا اصحاب سیرۃ جھوٹوں کی روایتیں کوئی قبول نہیں کرتا جس راوی پر جرح شدید ہو اس کی بات کوئی قبول نہیں کرتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اصحاب سیرت اور اصحاب حدیث واقعی دو جماعتیں نہیں ہیں جتنے اصحاب سیر ہیں وہ اصحاب حدیث بھی ہیں اور جتنے اصحاب حدیث وہ اصحاب سیر بھی مگر سیرت پر جب ان کو واقعات جمع کرنے پڑتے ہیں اور سیرت کے مقاصد کو پورا کرنا ہوتا ہے تو اس کے شرائط اور وجوہ ترجیح میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے''۔ (75)

حکیم عبدالرؤف دانا پوری کے مذکورہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیرت اور حدیث میں فرق موجود ہے حدیث اپنے اصول وقواعد کے مطابق اور سیرت اپنے عناصر ولوازم کی بناء پر دو جداگانہ فن ہیں تاہم بعض پہلوؤں سے دونوں میں ظاہری مطابقت ضرور پائی جاتی ہے۔

سیرت اور تاریخ:

حدیث کی طرح تاریخ بھی سیرت سے مختلف اور ایک الگ فن ہے، سیرت نگاری کی بدولت تاریخ نویسی نے ترقی کی منازل اور تاریخی اصول ضرور اختیار کئے ہیں، تاریخ کا موضوع "انسان" اور "زمان" ہے اس کے احوال ان ہی دونوں کے احوال سے متعلق ہوتے ہیں اور اس کی تمام جزئیات ان حالات واقعی کے دائرے میں بیان ہوتی ہیں، جو انسان کے دوران زمانہ پیش آتے ہیں۔ اس کے برعکس سیرت کا موضوع ایک محبوب انسان اور اس کا بابرکت عہد اس عہد میں رونما ہونے والے واقعات کا بیان بھی سیرت کے دائرے میں شامل ہے مؤرخ عموماً سلطنت، ملک اور زمانے کو موضوع بناتا ہے اور جن پر بحث کے ضمن میں شخصیات بھی آجاتی ہیں لیکن سیرت نگار کا موضوع ایک مخصوص شخصیت، اس کی سوانح، اس کا کردار و اخلاق، اعمال و افعال اور شمائل ہوتے ہیں اور ملک وزمانہ ضمنی ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ سیرت کے ماخذ جس قدر مستند اور قابل اعتبار ہیں تاریخ کو ان کا دسواں حصہ بھی حاصل نہیں ہے تاریخ کا مدار صحت مند مآخذ کے بجائے قیاس پر بھی ہوتا ہے لیکن سیرت میں قیاس کا دخل نہیں ہے بلکہ روایات جس طرح پہنچیں انہیں من وعن ذکر کردینا سیرت نگار کا پہلا فرض ہے ان روایات میں جس قدر چھان پھٹک اور کاوش سے کام لیا جاتا ہے وہ الگ ہے۔ (66)

فن سیرت نگاری کی اپنی جداگانہ انفرادیت کی وجہ سے سیرت نگاروں نے اس کے اصول وقواعد اور اس کے حدود وقیود بھی متعین کئے ہیں۔ ذیل میں فن سیرت نگاری کے عناصر ولازم اور اس کے حدود وقیود کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

سیرت نگاری کے اصول وضوابط:

رسول اکرم ﷺ کی سیرت کسی عام فرد کی حالت زندگی (پیدائش سے موت تک) نہیں ہے بلکہ یہ ایک پیغمبر کا مشن اور پوری انسانیت کے لئے رہتی دنیا تک کے لئے ایک مثالی نمونہ ہے اس لئے اس کی تحریر وتدوین میں کسی کمزوری اور خامی کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ ﷺ کی سیرت نگاری کے اصول وضوابط متعین ہوں۔

فن حدیث کی طرح فن سیرت نگاری بھی روایت ودرایت کے اصولوں کا پابند ہے، فن حدیث اور فن سیرت کی تدوین کا کام ہوا تو روایت ودرایت دونوں جہتوں سے اچھی طرح کام لیا گیا، سیرت نبوی کے واقعات باقاعدہ طور پر عہد نبوت کے تقریباً سو سال بعد قلمبند ہوئے اور اس وقت بھی سیرت نگاروں کا مآخذ کتابوں کے بجائے زبانی روایات تھیں، تاہم مسلمانوں نے تحقیقی اعتبار سے فن سیرت کا ایسا معیار قائم کیا جو دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ (67)

قدیم سیرت نگاری میں محدثین کے نقد روایت کے اصول کی کماحقہ پاسداری نہیں کی گئی اور سیرت کی بیشتر روایتوں میں انہیں نظر انداز کیا گیا، کتب احادیث سے بے اعتنائی برتی گئی، سیرت میں قدماء نے جو کتابیں لکھیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں وہ انہیں کے نام سے کیں اور اس میں تدلیس کا عمل جاری ہوگیا، روایت کے مختلف مدارج کا خیال نہیں رکھا گیا، واقعات میں سلسلہ علت ومعلوم قائم نہیں کیا گیا اور کبھی روایت میں قیاس کو بھی شامل کرلیا گیا، خارجی اسباب کے حوالے سے روایت کو نہیں پرکھا گیا، دلائل عقلی اور قرائن حال کی پرواہ نہیں کی گئی، شبلی کی یہ تنقید بعض کتب سیرت کے حوالے سے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قدماء نے سیرت نگاری کا جو انداز اختیار کیا وہ سراسر خارج از اصول تھا، سیرت کی پرانی کتابوں میں معیاری عنصر بھی موجود تھا، لیکن حالات وواقعات کے تحت سیرت کی ہر کتاب بعض جداگانہ خصائص کی حامل تھی اس کی وجہ سے ہر کتاب جہاں ایک لحاظ سے عمدہ تھی وہاں دوسرے لحاظ سے کچھ کمزوریاں تھیں، نقادوں نے سب کی کمزوریوں کو جمع کرکے ایک فہرست تیار کرلی اور یہ تاثر عام کردیا کہ سیرت کی سب یا اکثر کتابیں غیر معیاری ہیں، حالانکہ خود بھی ان کتابوں سے استفادہ کرتے رہے، چنانچہ سیرت ابن ہشام سب کے لئے مستند ہے اور واقدی کی مغازی کے عیوب تسلیم شدہ ہونے

کے باوجود اس کی روایتیں جب ابن سعد نقل کرتے ہیں تو اکثر تسلیم کرلی جاتی ہیں بہر حال شبلی نے سیرت نگاری کے جو اصول پیش کیے ہیں اس کے نتیجہ میں معیاری سیرت نگاری کا ذخیرہ منصۂ شہود پر آ سکتا ہے۔ (68)

مآخذ سیرت:

جب ہم سیرت النبی ﷺ کے ماخذات کی بات کرتے ہیں تو سیرت نبوی ﷺ کے چار قابل اعتماد مراجع اور مآخذ سامنے آتے ہیں وہ ماخذ درج ذیل ہیں:

(1) قرآن کریم:

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک مشہور قول کتب احادیث میں نقل ہوا ہے کہ جب ان سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کان خلقه القرآن یعنی آپ ﷺ کا اخلاق وکردار ہی سے متشکل ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں قرآن میں جو کچھ الفاظ میں ادا ہوا ہے اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ بن جاتی ہے۔ ام المومنین کا یہ قول قرآن سے ماخوذ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا:

"قد انزل اللہ الیکم ذکرا رسولا یتلوا علیکم ایات اللہ مبینت لیخرجکم من الظلمت الی النور"۔ (69)

''اللہ نے تمہاری طرف ذکر اتارا ہے یعنی رسول جو اللہ کی واضح آیات تمہیں سناتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور صالح عمل کرتے رہے ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے"۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ذکر یعنی قرآن مجید کے بول کے طور پر پیش کیا ہے۔ گویا قرآن اور رسول ﷺ حقیقت میں ایک ہی ہیں ایک الفاظ کی شکل میں ہے تو دوسرا انسانی جسم کی شکل میں ہے۔ قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی ذات وصفات آپ کی بعثت کے کوائف، دعوت دین کے مراحل ہجرت، جنگوں کے واقعات، مشرکین اور یہود کے ساتھ اہم بحثوں اور حضور ﷺ کی زندگی سے متعلق دیگر موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ قرآن وہ اولین مآخذ ہے جس سے سیرت نبوی ﷺ کی جھلکیاں اخذ کر سکتے ہیں، قرآن کریم نے آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی سے بحث کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سیرت رسول اللہ ﷺ کے بیشتر واقعات پر قرآن نے گفتگو کی ہے اور چونکہ قرآن پاک اس روئے زمین کی سب سے معتمد کتاب ہے اور متواتر ثبوت اور دلائل روشنی میں کوئی عاقل انسان اس کے نصوص اور تاریخی ثبوت و دوام اور حفاظت کے بارے میں شک نہیں کرسکتا اس لئے میں سیرت کے جن واقعات وحالات سے بحث کی گئی ہے وہ بالعموم سیرت کے صحیح ترین واقعات اور یہ کتاب سیرت کا اولین مآخذ سمجھی جائے گی۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ قرآن پاک نے حالات نبوی ﷺ کا تفصیلی ذکر کرنے کے بجائے اجمال سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی معرکے پر گفتگو کرتا ہے تو اس کے اسباب پر روشنی ڈالتا ہے نہ مسلمانوں اور مشرکوں کی تعداد پر روشنی ڈالتا ہے نہ مقتولین ومجروحین پر بحث کرتا ہے بلکہ وہ جنگ کے نصیحت آموز پہلوؤں کو نکھارتا ہے اور یہی معاملہ انبیاء کے قصص اور اقوام ماضیہ کے واقعات کے ساتھ بھی ہے، قرآن کریم، سیرت نبوی ﷺ کا مستند اور بنیادی مآخذ ہونے کے باوجود سیرت نبوی سے متعلق قرآنی نصوص پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا اور ان نصوص سے حیات رسول ﷺ کی مکمل تصویر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کتب احادیث سے تفصیلی رہنمائی لی جاتی ہے۔

(2) احادیث صحیحہ:

سیرت کا دوسرا مآخذ حدیث نبوی ﷺ ہے، صحیح احادیث جنہیں آئمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور جن پر عالم اسلام پر اعتماد کیا جاتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔ صحاح ستہ، بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ، اسی میں مؤطا امام مالک اور مسند امام احمد کو

بھی شامل کیا جاتا ہے، یہ کتابیں خاص طور پر بخاری اور مسلم صحت واعتماد کی بلند چوٹیوں پر ہیں۔

ان کتابوں سے، جو نبی ﷺ کی حیات مبارکہ، آپ ﷺ کے حالات وواقعات، جنگ وصلح اور اعمال وکردار پر مشتمل ہیں، ہم سیرت رسول اللہ ﷺ کی ایک جامع فکر اخذ کر سکتے ہیں، ان کتابوں میں صحابہ سے متصل سندوں کا ذکر ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی براہ راست صحبت پائی، ان کے ذریعہ اللہ نے اپنے دین کو فتح سے ہمکنار کیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی نگرانی میں ان کی تربیت کی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ تاریخ کی مکمل ترین شخصیت، اخلاق وکردار کا پیکر، ایمانی طاقت کا ہالہ، صدق گوئی، خوش مقالی میں یکتا، روح کی بلندی اور عقل کی برتری میں منفرد تھے۔ انہوں نے صحیح متصل سند سے جو کچھ بھی رسول ﷺ کے بارے میں روایت کیا ہے وہ سیرت کا بہترین اور مستند مواد ہے۔ اگر چہ معاند مستشرقین نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ معتمد اور مستند کتب احادیث کے بارے میں تشکیک پیدا کریں تا کہ شریعت کو آسانی کے ساتھ منہدم کیا جا سکے اور سیرت کے حالات وواقعات کے اندر رخنہ اندازی کی جا سکے لیکن اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایسے افراد پیدا کرتا رہتا ہے جو ان کی افتراء پردازیوں کے تیروں کو کند کر دیتے ہیں اور ان کی تدبیریں ان ہی پر جا پڑتی ہیں۔ علمائے دین نے ان معاند مستشرقین کی افتراء پردازیوں کا علمی اور تاریخی محاکمہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ احادیث کے بارے میں ان کی تشکیک بد دیانتی پر مبنی ہے۔ (70)

(3) دورِ رسالت کے عربی اشعار:

بلاشبہ مشرکین مکہ نے اپنے شعراء کی زبانوں سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوت پر بدترین حملے کئے جس سے مسلمان اپنے شعراء کی زبانی تردید پر مجبور ہوئے جیسے حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور دوسرے شعرائے اسلام ہیں۔ یہ سب اشعار کتب ادب میں درج ہیں اور سیرت کی وہ کتابیں جو بعد میں لکھی گئی ہیں انہوں نے بھی ان اشعار کا بڑا حصہ نقل کیا ہے جن سے ہم اس ماحول کے متعلق بہت سے حقائق اخذ کر سکتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ زندگی بسر کرتے تھے اور جس میں اسلام کی دعوت کا ارتقاء ہوا۔ (71)

(4) کتب سیرت:

سیرت نبوی ﷺ کے واقعات وہ روایات تھیں جنہیں صحابہ اپنے بعد والوں سے روایت کرتے تھے ان میں سے بعض نے سیرت کی جزئیات وتفصیلات کے تتبع کو مخصوص کر لیا پھر تابعین نے ان حالات کو اخذ کیا اور مختلف کتابوں میں انہیں مدون کیا۔ بعض لوگوں نے اس امر پر بھی بھر پور توجہ صرف کی جیسے حضرت ابان بن عثمانؓ، حضرت عروہ بن زبیرؓ اور تابعین صغیر میں عبداللہ بن ابو بکر انصاری محمد بن مسلم شہاب الزہری اور عاصم بن قتادہ انصاری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پھر سیرت پر یہ توجہ ان کے بعد آنے والوں کی طرف منتقل ہوتی رہی حتیٰ کہ انہوں نے تن تنہا تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ چنانچہ سیرت نبوی ﷺ کے مصنفین میں سب سے زیادہ شہرت محمد بن اسحاق کو حاصل ہوئی۔ ذیل میں چند مشہور کتب سیرت کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

(1) محمد بن اسحاق بن یسار (م 153ھ):

ان کے ثقہ ہونے پر جمہور علماء اور محدثین متفق ہیں، ابن اسحاق نے اپنی کتاب ''المغازی'' ان احادیث سے ترتیب دی جن کو انہوں نے مصر اور مدینہ میں بہ نفس نفیس سنا تھا۔ اگر چہ یہ کتاب امتداد زمانہ کی نظر ہو گئی لیکن کتاب کے مضامین محفوظ رہ گئے ہیں جنہیں ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں شیخ بکائی کے واسطے سے روایت کی جو ابن اسحاق کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔

(2) سیرۃ ابن ہشام:

مصنف کا پورا نام ابو محمد عبدالملک بن ایوب حمیری ہے، بصرہ میں پرورش پائی اور اختلاف روایت کے ساتھ 213 یا 218ھ میں

وفات پائی۔ ابن ہشام نے اپنی کتاب ''السیرۃ النبویۃ'' ان سے روایات سے ترتیب دی ہے جوان کے شیخ بکائی نے ابن اسحاق سے بیان کی تھیں اور جنہیں انہوں نے خود اپنے شیخ سے اخذ کی تھیں، جن کا ابن اسحاق نے اپنی سیرت کی کتاب میں ذکر نہیں کیا تھا اور ابن اسحاق کے نام کو بھول گئی اور ایک ایسی کتاب سیرت نبوی کے مآخذ میں شامل ہو گئی جو صحیح ترین اور محفوظ ترین بھی تھی اور اس نے ایسی شہرت اور مقبولیت حاصل کی اس کتاب کو لوگ ابن ہشام کی طرف منسوب کرنے لگے اور اس کا نام سیرت ابن ہشام رکھ دیا اور اس کی شرح اندلس کے عالم دین السہیلی (م 581ھ) اور خشنی (م 604ھ) نے لکھی۔

(3) طبقات ابن سعد:

پورا نام مصنف کا محمد بن سعد منیع زہری ہے۔ بصرہ میں 168ھ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں 230ھ میں وفات پائی۔ سیرت و مغازی کے مشہور مؤرخ محمد بن عمر واقدی (130۔207ھ) کے کاتب تھے۔ ابن سعد نے اپنی کتاب ''الطبقات'' میں سیرت رسول ﷺ کے بعد صحابہ وتابعین کا ان کے طبقات، قبائل اور مقامات کے حساب سے ذکر کیا ہے اور ان کی یہ کتاب سیرت کے اولین مآخذ میں شمار ہوتی ہے اور صحابہ وتابعین کے محفوظ اور سچے تذکرہ کا مرجع سمجھی جاتی ہے۔

(4) تاریخ طبری:

ابوجعفر محمد بن جریری طبری (224۔310ھ) امام، فقیہہ اور محدث تھے انہوں نے تاریخ پر اپنی کتاب لکھی جس میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے علاوہ اسلامی مملکتوں کی تاریخ اور اپنی وفات تک کے دور پر گفتگو کی۔

پھر تالیف سیرت کی دنیا میں انقلاب آیا اور سیرت کے بعض گوشے تصنیف وتالیف کے لئے مخصوص کئے جانے لگے جیسے اصبہانی کی کتاب ''دلائل النبوۃ'' ترمذی کی ''الشمائل المحمدیہ'' ابن قیم کی ''زادالمعاد'' قاضی عیاض کی ''الشفاء'' اور قسطلانی کی ''المواہب الدینیہ'' ادب سیرت میں زبردست انقلاب کی داعی ہیں۔ ''المواہب الدینیہ'' کی شرح آٹھ جلدوں میں زرقانی کے قلم سے موجود ہے۔ (72)

سیرت نگاری کا اصل مدعا:

جب ہم مختلف زبانوں میں سیرت کے تحریری سرمایہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مطالعہ سیرت کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں، سیرت نگاروں نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے حضور اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ پیش کیا ہے یہ تمام کاوشیں بلاشبہ اجروثواب کے جذبہ سے معمور اور قابل قدر ہیں اور دینی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں تاہم اگر سیرت نگاری میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت کے اس پیغام کو فراموش کر دیا جائے یا اسے اجاگر نہ کیا جائے، جو اصل میں نسل انسانی کی فکری اور عملی تعمیر کا اصل محرک ہے تو سیرت نگاری کا مقصد مجروح ہوتا ہے اور سیرت نگاری کا اصل مدعا پورا نہیں ہوتا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر سیرت نگاروں کے اسلوب میں افراط وتفریط نظر آتی ہے، کہیں حضور ﷺ کی سیرت کو ایک مافوق الانسان ہستی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے کہیں سوانح نگاروں کے طرز پر مجرد ایک فرد بنا کر پیش کیا، کہیں ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے پیش کیا اور کہیں قومی تفاخر کے جذبے سے سرشار ایک قومی ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سیرت نگاری میں افراط وتفریط کے اس رجحان کے نتیجے میں سیرت کا اصل مدعا ماند پڑ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرداردو عالم ﷺ کی محبت وعقیدت کے بے شمار مظاہر موجود ہونے کے باوجود اور سیرت پر دماغی کاوشیں صرف ہونے کے باوجود ہماری تاریخ کے افق پر وہ انسان طلوع نہیں ہو رہا ہے جس کا نمونہ کامل حضور ﷺ نے پیش کیا تھا۔

حضور ﷺ کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں، یہ کسی رستم وسہراب کا قصہ اور الف لیلی کی کہانی اور کسی خیالی کردار کا امتیاز نہیں اور اس کا یہ ہرگز مقام بھی نہیں کہ اسے علم وادب کی تفریحی چوپال کا محض ایک سرمایہ رونق بنائیں، اس کی قدر وقیمت اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے محض ذہنی لذت حاصل کرنے کے لئے استعمال کریں، اس کا احترام روکتا ہے کہ ہم اسے مجرد قومی تفاخر کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔

ہمارا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت ایک تاریخی طاقت کی داستان ہے جو ایک انسان کے پیکر میں جلوہ گر ہوئی وہ زندگی سے کٹے ہوئے درویش کی سرگزشت نہیں بلکہ ایک انسان ساز کی روداد ہے، وہ اپنے اندر عالم نو کے معمار کے کارنامے پر تفصیل اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ سرور عالم ﷺ کی سیرت غار حرا سے لے کر غار ثور تک، حرم کعبہ سے لے کر طائف کے بازاروں تک، امہات المؤمنین کے حجروں سے لے کر میدان ہائے جنگ تک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

حضور ﷺ کی سیرت طیبہ محض ایک فرد کی سوانح نہیں جو صرف واقعات اور کارناموں کو تحقیقی اور تاریخی حوالے سے پیش کر کے سیرت کا اصل مدعا حاصل کرلیا جائے، سرور عالم ﷺ کی زندگی جوہڑ کے کھڑے پانی کی مانند بھی نہیں اور محدود تصور کے ایک بڑے اور مشہور انسان کی سیرت بھی نہیں بلکہ حضور ﷺ کی سیرت متحرک سیرت ہے مردہ دلوں کو حیات نو بخشتی ہے، وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جس میں حرکت ہے روانی ہے اور کشمکش ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر گوشہ متوازن ہے بڑے اور مشہور لوگوں کی ذات میں افراط وتفریط ہے لیکن حضور ﷺ کی ذات میں توازن وکمال ہے، مختصر یہ کہ سیرت نگاری کا صحیح منشا اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب پیغام سیرت کو سیرت نگاری کا محور ومقصد قرار دیا جائے۔

سیرت کی حدود وقیود:

مسلمان علماء کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ جب وہ کسی علم یا فن کی تعریف بیان کرتے ہیں تو یہ تعریف ایسی جامع ومانع ہوتی ہے جس سے اس علم یا فن کی حدود خود بخود متعین ہو جاتی ہیں۔ اس تعریف سے اس علم وفن کو اہل علم کے ہاں حد بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سیرت کی مذکورہ تعریفات کی روشنی میں سیرت کی حدود بھی متعین ہو جاتی ہیں یوں کہا جاسکتا ہے کہ سیرت مندرجہ ذیل پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

1۔ وہ تمام واقعات جو رسول اکرم ﷺ کی پیدائش سے قبل کے ہیں اور آپ ﷺ سے متعلق ہیں مثلاً عبدالمطلب کا حضرت عبداللہ کو ذبح کے لئے پیش کرنا اور پھر ان کی جگہ سو اونٹ فدیہ میں ذبح کرنا۔ جس کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

انا ابن الذبیحین میں دو ذبیحوں کی اولاد ہوں ایک حضرت اسماعیل اور دوسرے حضرت عبداللہ۔ (73)

2۔ وہ تمام واقعات جو آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت خصوصی طور پر ظہور پذیر ہوئے مثلاً ایوان کسریٰ کے کنگرے گرنا، مجوس کے آتش کدہ کا ٹھنڈا ہونا، بحیرہ ساوہ کا خشک ہونا اور اس کے گرجے منہدم ہونا۔ (74)

3۔ وہ تمام حالات وواقعات جو آپ ﷺ کی پیدائش کے بعد نبوت ملنے تک آپ ﷺ کی ذات کے حوالہ سے وقوع پذیر ہوئے مثلاً آپ ﷺ کی رضاعت وحضانت، واقعہ شق صدر، بحیرا راہب کی پیش گوئی، جنگ فجار، حلف الفضول، حجر اسود کی تنصیب، آپ ﷺ کا سفر شام، حضرت خدیجہؓ سے شادی کرنا اور غار حرا میں تعبد وغیرہ۔ (75)

4۔ نبوت سے لے کر وفات تک کے سارے حالات، واقعات، شمائل واخلاق، عادات وکردار، معمولات، حلیہ ومزاج، خانگی وبیرون خانہ زندگی میں تعامل ومعاملات، پسند وناپسند فرمودات، عزیزوں، رشتہ داروں، خادموں، دوستوں، دشمنوں، مخالفوں، بت پرستوں، مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ برتاؤ وسلوک وغیرہ۔

5۔ وہ تمام حالات وواقعات جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد وقوع پذیر ہوئے اور آپ ﷺ سے متعلق ہیں مثلاً آپ ﷺ کی تجہیز وتکفین اور تدفین، جیش اسامہ کی روانگی (کیونکہ اس کی تشکیل آپ ﷺ نے فرمائی تھی) اور آپ ﷺ کے متروکات وغیرہ کا بیان۔

سیرت کے مذکورہ اجزاء ومشمولات کو مدنظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ مندرجہ ذیل امور پر سیرت کا اطلاق نہیں ہوتا:

1۔ قرآن پاک واحادیث طیبہ کا وہ حصہ جو عقائد سے متعلق ہے اور اس میں مسلمانوں کی ذہنی وقلبی اصلاح کی گئی ہے۔

2۔ قرآن کریم واحادیث طیبہ کا وہ حصہ جو احکام یعنی اوامر ونواہی سے متعلق ہے۔ یہ فقہاء کا میدان کار ہے اور اس میں وہ حلال وحرام کی تصریح کے تحت فرائض وواجبات اور منہیات وغیرہ کا درجہ متعین کرتے ہیں۔

3۔ وہ آیات جن میں یہود ونصاریٰ اور دیگر غیر مسلم اقوام کے ساتھ بحث اور مخاصمہ ہوا ہے۔ یہ متکلمین کا میدان ہے جس میں وہ باطل مذاہب واقوام کے عقائد ونظریات کی تردید اور اسلامی عقائد ونظریات کا اثبات کرتے ہیں۔

4۔ وہ آیات واحادیث جن میں موت، مابعد الموت، حساب وکتاب اور جنت ودوزخ کا ذکر ہے یہ واعظین کا موضوع ہیں جن کے ذریعہ وہ تذکیر اور وعظ ونصیحت کرتے ہوئے اہل ایمان کے دلوں میں نرمی پیدا کرتے ہیں۔

5۔ وہ آیات واحادیث جن میں اچھے اعمال کے فضائل اور برے اعمال کے رذائل مذکور ہیں یہ بھی واعظین کا موضوع ہیں اور ان کے ذریعہ اچھے اعمال کی ترغیب اور برے اعمال کی ترہیب دی جاتی ہے۔

6۔ زمانہ جاہلیت کے وہ واقعات جو کسی صحابی نے آپ ﷺ کے سامنے بیان کئے۔

7۔ ازواج مطہرات، اہل بیت عظام اور صحابہ کرام کے وہ اقوال وافعال جن کا تعلق صرف ان کی اپنی ذات کے ساتھ ہے۔

8۔ رسول اکرم ﷺ کے زمانہ سے متعلق دنیا کے عام حالات وواقعات جن کا رسول اکرم ﷺ کی ذات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے سیرت کے موضوع سے خارج ہیں۔ (76)

بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت، فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے جو آنحضرت ﷺ کے اخلاق وعادات سے متعلق ہیں تو یہ سیرت بن گئی۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ فن سیرت اور فن حدیث میں موضوع اور طریق کار کی مماثلت کے باوجود اختلافات موجود ہیں۔

عبدالرؤف دانا پوری اپنی کتاب اصح السیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اصحاب حدیث دراصل تین امور کو جمع کرتے ہیں (۱) رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا (۲) رسول اللہ ﷺ نے کیا کام کیا (۳) رسول اللہ ﷺ کے سامنے یا رسول اللہ ﷺ کے وقت میں کیا کیا گیا۔ اصحاب سیرت بھی انہی تین امور کو جمع کرتے ہیں۔ اس لئے اصل کام دونوں کا ایک ہے مگر باوجود اس کے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے اور اصحاب سیر کا مقصود بالذات رسول اللہ ﷺ کو جاننا ہے احکام پر ان کے ہاں بحث ضمناً ہوتی ہے اس لئے محدثین کا مدار بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا قول رسول اللہ ﷺ کا ہے یا نہیں۔ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق پر صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن اصحاب سیرت کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے سوا اس کے ساتھ دو باتیں اور معلوم کرنی پڑتی ہیں ایک یہ کہ حضور ﷺ نے کب ایسا کہا یا کیا۔ دوم یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟ اصحاب سیرت حضور ﷺ کے اقوال وافعال کو مسلسل اور مربوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اسباب وعلل کو بھی جاننا چاہتے ہیں۔ اصحاب حدیث کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فعل رسول اللہ ﷺ کا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا طریقہ ہو گیا گو یہ نہ معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کب، کس دن، کس تاریخ کو ایسا کہا یا ایسا کیا''۔ (77)

حدود وقیود کے حوالہ سے فن سیرت نگاری بھی فن حدیث کی طرح روایت اور درایت کے اصولوں کا پابند ہے یہی وجہ ہے کہ جب فن حدیث اور فن سیرت کی تدوین ہوئی تو روایت اور درایت دونوں جہتوں سے اچھی طرح تحقیق سے کام لیا گیا۔ سیرت نبوی کے واقعات باقاعدہ طور پر عہد نبوت کے تقریباً ایک سو سال بعد قلمبند ہوئے اور اس وقت بھی سیرت نگاروں کا ماخذ کتابوں کے بجائے زبانی روایات تھیں تاہم مسلمانوں نے تحقیقی اعتبار سے فن سیرت کا ایسا معیار قائم کیا جو دنیا میں اپنی مثال آپ ہے زبانی روایات کی چھان بین کے لئے جو اصول قائم کئے گئے ان میں پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریکِ واقعہ تک تمام راویوں کے نام بترتیب بتائے جائیں اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ

تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسی تھی؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟

ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا لیکن ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اس کام میں کھپا دیں وہ ایک ایک شہر میں گئے راویوں سے ملے ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (Biography) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت آج کم از کم ایک لاکھ اشخاص کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر سپرنگر کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ سپرنگر ہی تھا جس نے ''الاصابہ'' کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ (78)

واقعات کی تحقیق کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے وہ عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟ یہ اصول دراصل قرآن سے لیا گیا تھا۔ حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو بہت سے اچھے خاصے لوگ شک میں مبتلا ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کی برائت کی آیات جب نازل فرمائیں تو اس میں یہ بھی فرمایا کہ:

''لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ''. (79)

''سننے کے ساتھ ہی تم نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ سبحان اللہ یہ تو بہتان عظیم ہے''۔

یعنی اس طرح اگر کوئی واقعہ بیان کیا جائے جو عقل سلیم اور بیرونی شواہد کے خلاف ہو تو اسے رد کر دینا چاہئے۔ (80) واقعات کی تحقیق کا یہی اصول درایت کہلاتا ہے اور سیرت نگاروں نے روایت کے ساتھ درایت کے اصول سے بھی خوب کام لیا ہے۔

ایک سیرت نگار کے لئے درایت کے حدود و قیود کے سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی ؒ نے جو اصول مرتب کئے ان کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہئے اگر نہ ملے تو روایت سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

2۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات واسناد کی تنقیح لازم ہے۔

3۔ سیرت کی روایتیں باعتبار پایہ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں لہٰذا بصورت اختلاف، احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

4۔ روایات احادیث میں اختلاف ہونے کی صورت میں ارباب فقہ وہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دی جائے گی۔

5۔ سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

6۔ نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہئے۔

7۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر حصہ شامل ہے۔

8۔ یہ بھی مدنظر رہے کہ اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے۔

9۔ جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی لائق حجت نہ ہوگی۔

10۔ اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق وجمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہئے کہ راوی کے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

11۔ روایات آحاد کو موضوع کی اہمیت وقرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہئے۔ (81)

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اصحاب حدیث نے روایت و درایت کا جو بلند معیار قائم کر رکھا ہے اصحاب سیرت اس درجہ بلند معیار برقرار نہ رکھ سکے کیونکہ بعض اوقات کسی واقعہ کی جزئیات تک رسائی اور معلومات بہم پہنچانے کے لئے محدثین کے قائم کردہ معیار سے

نیچے اترنا پڑتا ہے اور اسی لئے اصحاب حدیث کی روایات کا درجہ زیادہ قوی ہے بہ نسبت اصحاب سیرت کے کہ ان کی روایات کا درجہ اس قدر بڑھا ہوا نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ٹکراؤ کی صورت میں محدثین کی ہی ہر ایک روایت قابل حجت ہوگی اور اہل سیرت کی روایت کو مسترد کیا جائے گا بلکہ بعض اوقات ٹکراؤ کی صورت میں اہل سیرت کی روایت ہی صحیح ہوتی ہے چنانچہ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں ام حبیبہؓ کو آپ کے عقد میں دیتا ہوں۔ اصحاب سیرت کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے باتفاق اہل سیرت ام حبیبہؓ کا عقد حبشہ میں ہوا۔ اس وقت ابوسفیان کافر اور دشمن تھا۔ جمہور محدثین تسلیم کرتے ہیں کہ صحیح مسلم کی یہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔ اسی طرح بخاری کی روایت ہے کہ افک عائشہؓ کے بعد حضور ﷺ نے مسجد میں فرمایا کہ کون ہے جو ان منافقوں کے مقابلہ میں مستعد ہو۔ حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میں مستعد ہوں۔ اصحاب سیرت کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے وہ متفق ہیں کہ حضرت سعدؓ کا غزوہ احزاب کے بعد بنی قریظہ کا فیصلہ کرکے انتقال ہوا تھا اور صحیح یہ ہے کہ غزوہ مریسیع جس میں افک کا واقعہ ہوا وہ اس کے بعد ہوا ہے اس لئے حضرت سعدؓ افک کے وقت تھے ہی نہیں۔ اکثر محدثین تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذؓ کا نام اس روایت میں رواۃ کا تسامح ہے۔ (82)

فصل سوم

سیرت کا تاریخی ارتقاء

سیرت دورِ رسول میں:

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے تقریباً 143ھ میں ہوا اس لیے اس زمانہ کو سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گوکم ہی) مدت سے چلا آتا ہے۔ بہت قدیم زمانہ میں میری اور سامی خط تھا جس کے کتبے آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے۔ اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتداء کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں، اکثر افسانہ ہیں، مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا ان کے نام یہ تھے۔ ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قریشات، (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں۔) اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کیے تھے ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا، وہ تین شخص قبیلہ بولان (قبیلہ طے کی ایک شاخ) کے تھے جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرہ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔ (83)

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمرو بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا جو بنو مخلد ابن نصر بن کنانہ کے خاندان سے تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا اور تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب بن ہاشم آنحضرت ﷺ کے جد امجد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اس کے یہ الفاظ تھے:

حق عبدالمطلب بن هاشم من اهل مكته   على فلاں ابن فلاں الحميرى من اهل وزل

صنعاء اليه الف در هم فضته كيلا بالحديدته   و متى دعا ء بها اجابه شهد الله و الملكان (84)

''یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص پر ہے جو صنعاء کا رہنے والا ہے یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں''۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا اور شاید کراماً کاتبین کا اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں سترہ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے یعنی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابوعبیدہ، طلحہ، زید ابوحذیفہ، ابوسفیان شفاء عبداللہ وغیرہ (85)

بدر کی لڑائی جو 2ھ میں ہوئی اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے ان سے فدیہ لیا گیا لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر ان کو لکھنا سکھادے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت نے جو کاتب وحی ہیں اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ (86)

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا

البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں، اور اسی بناء پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکورہ ہیں تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیثوں کے قلم بند کرنے سے منع فرمایا تھا مسلم کے یہ الفاظ ہیں:

لا تکتبو عنی و من کتب عنی غیر القران فلیمحہ (87)

''مجھ سے جو سنو اس کو قلم بند نہ کرو بجز قرآن کے اور کسی نے قلم بند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیے''۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ آنحضرت ﷺ کی اجازت سے آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابوہریرہ کا قول ہے کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں البتہ عبداللہ بن عمر، مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (88)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کی عادت تھی کہ آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت ﷺ کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمر نے اس بناء پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا آپ نے دہان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔ (89) خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقلید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ (90) ایک دفعہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں ان کے نام قلم بند کیے جائیں چنانچہ پندرہ سو صحابہ کے نام دفتر میں درج کیے گئے۔

خطیب بغدادی نے تقلید العلم میں روایت کی ہے کہ جب لوگ کثرت سے حضرت انس کے پاس حدیثوں کے سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر لکھ لی تھیں۔

متعدد قبائل کو آپ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے اور کتب احادیث میں بعینہا منقول ہیں۔ اسی طرح سلاطین کو دعوت اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔ صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا یمن کے ایک شخص نے آ کر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس شخص کے لیے وہ خطبہ قلم بند کرا دیا جائے۔ (91)

غرض اس طرح آنحضرت ﷺ کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا۔

(1) جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص یا حضرت علی و حضرت انس وغیرہ نے قلم بند کیں۔ (92)

(2) تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت ﷺ نے قبائل کے نام بھیجے۔

(3) خطوط جو آنحضرت ﷺ نے سلاطین اور امراء کے نام ارسال فرمائے۔

(4) پندرہ سو صحابہ کے نام۔

آنحضرت ﷺ کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔ (93)

سیرت دورِ خلفاء راشدین میں:

رسول خدا کی ذات گرامی ابتدا ہی سے ان کے اصحاب کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بن گئی تھی چنانچہ آنحضرت کے عین حیات یہ شروع ہو چکا تھا۔کہ جب ایک مسلمان سے ملتا تو وہ اس سے آنحضرت کے حالات دریافت کرتا اور وہ اس کے جواب میں کسی تازہ وحی یا آنحضرت کے کسی تازہ فرمان کا ذکر کرتا۔آپ کی وفات کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔آپ کے پیرووں کے دل میں اپنے پیشوا کی ذات مبارک ان کے اخلاق و عادات اور ان کی تعلیم وتلقین کے دریافت کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔اس شوق جستجو سے رفتہ رفتہ روایات کا ایک وسیع ذخیرہ پیدا ہوگیا جو سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا۔آخر کار جب مسلمانوں کے ہاں دوسری صدی ہجری میں تصنیف وتالیف کا رواج ہوا تو اہل علم نے ان روایات کو قلمبند کرنا اوران کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنا شروع کیا جن روایات کا تعلق عقائد وعبادات سے تھا اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہو سکتے تھے۔ان سے علم حدیث کی کتابیں مدون ہوئیں اور ان روایات سے جن میں آنحضرت کے حالات زندگی مذکور تھے فن سیرت کا سرمایہ تیار ہوا۔اور وہ روایات جن میں رسول پاک کے غزوات یعنی جنگوں کے واقعات مذکور تھے،فن مغازی کا موضوع قرار پائیں،چونکہ رسول مقبولؐ کی زندگی میں ان کے غزوات کو تاریخی لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے،اس لئے بعض اوقات " مغازی" کا اطلاق تمام فن سیرت پر ہوتا ہے۔

سیرت نبوی کے قدیم مصادر:

صحابہ کرامؓ کے عہد میں صرف قرآن مجید کے جمع وتسطیر کا اہتمام ہو سکا اور پہلی صدی ہجری میں اسلام اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق مختلف نوع کی جو روایات مسلمانوں میں شائع ہوئیں وہ سینہ بسینہ نقل ہوتی رہیں۔ان کو اس خیال سے قلمبند نہیں کیا گیا تھا کہ کہیں قرآن پاک کے متن کے ساتھ غلط ملط نہ ہو جائیں۔پہلی صدی کے آخر میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر بیٹھے تو آپ نے دیکھا کہ جن صحابہ کرامؓ کے سینوں میں رسول خداؐ کے ارشادات اور دیگر تاریخی روایات کا ذخیرہ محفوظ تھا۔وہ یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔اس سے ان کو اندیشہ ہوا کہ اسلامی اخبار وروایات کے مٹنے سے کہیں سنت نبوی کا علم بھی نہ مٹ جائے چنانچہ ان کی فرمائش پر اسلامی روایات کی جمع وکتابت شروع ہوئی۔

رسول پاکؐ نے اپنی عمر عزیز کے آخری دس سال مدینہ میں گزارے تھے اور ان کی وفات کے بعد اکثر صحابہ نے وہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔اس لئے مدینہ ہی حدیث نبوی اور روایات اسلامی کا سب سے پہلا مرکز قرار پایا۔یہاں کے سب سے بڑے عالم امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری تھے۔جنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی فرمائش پر اسلامی روایات وآثار کی جمع وکتابت کا آغاز کیا۔خلیفہ مدوح کی مدت خلافت صرف ڈھائی سال ہے اس لئے اس مختصر سے عرصہ میں روایات کی تدوین کا کام مکمل نہ ہو سکا۔لیکن ان کی تحریک سے مختلف علمی مرکزوں میں روایات کو ضبط لانے کا کام شروع ہوگیا۔مدینہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی حدیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔چنانچہ بصرہ میں امام حسن بصری اور ابراہیم نخعی اور کوفہ میں امام شعبی نے روایات کے جمع کرنے میں خاص کوشش صرف کی۔(94)

1۔امام زہری:

مکہ میں 50ھ میں پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ہے۔آپ قریش کے مشہور خاندان بنوزہرہ میں سے تھے۔اس لئے زہری کہلائے۔آپ تابعی تھے اور آپ نے بہت سے صحابہ کرام کو بذات خود دیکھا تھا۔اور ان سے معلومات حاصل کی تھیں مدینہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جاتے اور ان سے رسول کریمؐ کے حالات اور ارشادات کے بارے میں پوچھتے اور ان کو قلمبند کرتے اپنی عمر کے آخری حصہ میں دمشق کے اموی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ اموی حکمرانوں کی فرمائش پر انہوں نے سیرت اور مغازی پر مستقل کتابیں لکھی تھیں لیکن وہ کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں۔لیکن ان کی سند سے بہت سی متفرق روایات بعد کے مصنفین کے ہاں ملتی ہیں۔

آپ نے 461ھ میں وفات پائی اور حجاز میں شغب کے مقام پر مدفون ہوئے جہاں ان کی اراضی تھی ۔امام زہری کی علمی جستجو اور ان کے درس کی وجہ سے لوگوں میں سیرت ومغازی کا بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ان کے حلقہ درس سے جو باکمال لوگ اٹھے ان میں سے دو عالموں یعنی موسیٰ بن اسحاق نے اس فن میں خاص شہرت پائی ۔

2۔موسی بن عقبہ:

متوفی 141ھ) حضرت زبیر بن العوام کے موالی میں سے تھے انہوں نے عہد رسالت کی اخبار وروایات کے جمع کرنے میں کمال جانفشانی کا ثبوت دیا۔ یہاں تک کہ صاحب المغازی کے لقب سے مشہور ہوئے ۔امام مالک بن انس ان کے بڑے مداح تھے۔اور لوگوں سے کہتے تھے کہ اگر فن مغازی سیکھنا ہو تو موسی سے سیکھو۔ان کی کتاب مغازی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی صحت کا بڑا اہتمام کیا۔چنانچہ آپ کم عمر اور بے سمجھ لوگوں کی روایت نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ پختہ عمر اور پختہ فہم کے لوگوں سے روایات حاصل کرتے تھے۔اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کتاب دیگر کتب مغازی سے مقابلۃً مختصر ہے۔عقبہ کی کتاب المغازی مدت تک شائع رہی۔اور واقدی،ابن سعد اور طبری کی کتابوں میاں اس کے اکثر حوالے ملتے ہیں ۔لیکن مرور ایام سے آخر کار ناپید ہو گئی۔اس وقت تک اس کا ایک قطعہ ملا ہے۔ جسے پروفیسر زخاؤ نے جرمن کے ساتھ 1904ء میں شائع کر دیا تھا۔(95) چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے دور میں بھی ہمیں سیرت نگاری کا خاصل رجحان ملتا ہے۔

سیرت دور بنواُمیہ اور بنوعباس میں:

جب امراء اور احکام نے سیرت نگاری کی طرف توجہ دی تو سیرت نگاری کا شوق پیدا ہوا اور اہل علم تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے ۔عہد بنواُمیہ میں سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے عبید اللہ بن شریح کو یمن سے بلا کر قدما لوگوں کے حالات قلم بند کرنے کا حکم دیا۔اس کے بعد عبدالمالک بن مروان ،حضرت عمر بن عبدالعزیز،ابن سعد، ڈاکٹر مصطفیٰ اور بہت سے لوگوں نے بنواُمیہ اور بنوعباس کے دور میں سیرت نگاری پر کتابیں لکھیں۔جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

عہد بنواُمیہ 40ھ تا 132ھ تک:

	نام کتاب	مصنف	ناشر / کیفیت
1۔	کتاب المغازی	ابان بن عثمان (20 تا 100)	کتاب مفقود ہے
2۔	کتاب المغازی	عروہ بن زبیر (23 تا 94)	طبع ریاض 1987ء
3۔	کتاب المغازی	وھب بن منبہ (34 تا 110ھ)	کتاب مفقود ہے
4۔	کتاب المغازی	عاصم بن عمر (م 120ھ)	کتاب مفقود ہے
5۔	کتاب المغازی	شرحبیل بن سعد (م 133)	کتاب مفقود ہے
6۔	کتاب المغازی	محمد بن شہاب الزہری (51 تا 124ھ)	کتاب مفقود ہے
7۔	کتاب المغازی	امام شعبی (م 109)	کتاب مفقود ہے

ابن سید الناس اور امام طبری کی کتب میں متصل سند کے ساتھ امام شہاب زہری کی کتب کے حوالہ جات موجود ہیں ۔ان تمام کتب کا مواد متصل سند کے ساتھ سیرۃ ابن ہشام اور طبقات ابن سعد میں موجود ہے اس طرح یہ کتب نایاب ہونے کے باوجود دستیاب ہیں ۔

عباسی عہد کی مشہور کتب سیرت:

	نام کتب	مصنف	ناشر
1۔	کتاب المغازی	عبداللہ بن ابوبکر (م 135ھ)	مفقود ہے
2۔	کتاب المغازی	ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن (م 137)	دارالعلوم بیروت سے شائع ہوئی
3۔	کتاب المغازی	موسیٰ بن عقبہ (55 t 141)	مفقود ہے
4۔	کتاب المغازی	معمر بن راشد (96 t 157)	مفقود ہے
5۔	کتاب السیر ۃالنبویہ	محمد بن اسحاق بن یسار (85 t 151ھ)	نایاب ہے
6۔	کتاب السیر ۃالنبویہ	ابومحمد عبدالملک بن ہشام (م 213)	اردو ترجمہ کے ساتھ کتاب موجود ہے
7۔	کتاب المغازی	ابوالمعشر السندی (م 170)	کتاب مفقود ہے
8۔	کتاب المغازی	معتمر سلیمان ن طرخان (106 t 187ھ)	مفقود ہے
9۔	کتاب المغازی	ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی (130 t 207ھ)	طبع مصر 1986ء
10۔	طبقات ابن سعد	محمد بن سعد بن منیع (168 t 230ھ)	دنیا کے اکثر مقامات سے طبع ہوتی رہتی ہے
11۔	کتاب المغازی	محمد بن صالح بن دینار (م 168)	کتاب مفقود ہے
12۔	کتاب المغازی	یونس بن بکیر م (م 199)	کتاب مفقود ہے

درج ذیل سیرت نگاروں کے نام ملتے ہیں کتب دستیاب نہیں:

1۔ عبداللہ بن جعفر المخر ومی (م 170)

2۔ علی بن مجاہد الرازی الکندی (م 180ھ)

3۔ زیاد بن عبداللہ البکائی (م 183ھ)

4۔ ابومحمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی (م 194ھ)

5۔ یعقوب بن ابراہیم الزہری (م 208ھ)

مزید دیکھو کشف الظنون، ج2، ص1012 t 1015

	نام کتب	مصنف	کیفیت/ناشر
1۔	شرف المصطفیٰ ﷺ	ابوسعید عبدالملک نیشاوری (م 604) ضعیف روایات کا مجموعہ ہے	دارالکتب مصر سے چھپی
2۔	شرف المصطفیٰ ﷺ	حافظ عبدالرحمٰن ابن جوزی (م 597)	طبع مصر 1976ء
3۔	سیرت ابن طے	یحییٰ بن حمیدہ (م 630)	دارالقلم مصر 1974ء

فصل چہارم

مطالعہ سیرت برصغیر پاک وہند میں

سیرت طیبہ کے موضوع کو ذات رسالت مآب ﷺ سے نسبت کے طفیل جو اہمیت، مقام، قدر ومنزلت اور قبولیت حاصل ہے وہ یقیناً محتاج بیان نہیں۔ اگر ہم اپنے مذہبی لٹریچر کا جائزہ لیں جو کسی بھی زبان میں مسلمانوں نے اب تک پیش کیا ہے، تو اس کا ایک بہت بڑا حصہ ان مباحث، موضوعات اور عنوانات پر مشتمل ہوگا، جو نبی کریم ﷺ کی ذات وصفات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کے علوم وفنون میں فن سیرت کو یہ ایک عجیب امتیاز اور اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔

آغاز میں اس سے مراد غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات سے متعلق امور پر ہوتا تھا، جیسا کہ فقہائے کرام کے ہاں اس کا مفہوم یہی ہے چنانچہ امام ابن ہمام لکھتے ہیں:

"السیر جمع السیرة، وھی الطریقة فی الامور، وفی الشرع تختص بسیر النبی علیه الصلاة والسلام فی مغازیه ولکن غلب فی لسان اصل الشرع علی الطرائق المأمور بھا فی غزوة الکفار" (96)

سیر لفظ السیرۃ کی جمع ہے، وہ طریقے کو کہتے ہیں، اور شریعت میں یہ لفظ نبی کریم ﷺ کے غزوات کے احوال کے ساتھ خاص ہے، لیکن علمائے شریعت کے نزدیک اس کا اطلاق ان طریقوں پر ہوتا ہے، جن کا حکم کفار سے جنگ کی صورت میں دیا گیا ہے۔

فن سیرت کا آغاز اسلام میں مغازی سے ہوا، ابتدا میں مغازی سے مراد غزوات وسرایا سے متعلق تفاصیل ہوتی تھیں، علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"واصل الغزو القصد، و مغزی الکلام مقصده، والمراد بالمغازی ھنا ما وقع من قصد النبی صلی الله علیه وسلم الکفار بنفسه او بجیش من قبله" (97)

غزوہ کے اصل معنی قصد وارادے کے ہیں اور یہاں مغازی سے مراد نبی اکرم ﷺ کے بنفس نفیس یا اپنے لشکر کے ذریعے کفار کا قصد کرنا ہے۔

لیکن بعد میں اس میں وسعت پیدا ہوگئی، اور مغازی کے عنوان کے تحت لکھی جانے والی کتب میں سیرت طیبہ کا بڑا حصہ بیان ہونے لگا۔ چنانچہ مغازی کی مشہور کتب اسی سے تعلق رکھتی ہیں، اور مغازی عروہ بن زبیر، مغازی ابان بن عثمان، مغازی ابن شہاب زہری، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ میں سے جو کتب دستیاب ہیں، یا جو کتب دستیاب تو نہیں ہیں، لیکن ان کے حوالے قدیم کتب میں ملتے ہیں، ان سے یہی علم ہوتا ہے کہ ان تمام کتب میں محض غزوات وسرایا کا بیان نہیں ہے، بلکہ سیرت رسول ﷺ اور حیات طیبہ کا بہت سا حصہ بیان ہوا ہے۔ اس تفصیل سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

1۔ سیر سے مراد فقہاء کے ہاں غیر مسلموں سے تعلقات کے مسائل ہیں، کتاب السیر اور سیر کبیر وغیرہ ناموں سے جو بہت سی کتب متداول ہیں، وہ انہی مباحث پر مشتمل ہیں۔ ان میں امام محمد رحمہ اللہ کی السیر الکبیر زیادہ معروف ہے۔

2۔ سیرت طیبہ پر لکھنے کا آغاز مغازی سے ہوا، اور یہی کتب سیرت کی بنیادی کتب ہیں۔

سیرت پر سیرت کے عنوان سے سب سے پہلے جو کتاب سامنے آئی، وہ معلوم تاریخ کے مطابق ابن ہشام (م 213ھ) کی السیرۃ النبویہ ہے جسے اس نے خود ھذا کتاب سیرۃ رسول اللہ ﷺ لکھ کر متعارف کرایا ہے۔ (98)

لفظ سیرت آغاز میں ہر ایک کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے، چنانچہ عوانہ بن حکیم کلبی (م 147ھ) کی کتاب سیرۃ معاویہ و بنی امیہ،

اورواقدی(م207ھ) کی کتاب سیرۃ ابی بکر و وفاتہ اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ بعد میں بھی لفظ سیرت کا یہ عمومی استعمال جاری رہا۔ چنانچہ اردو میں بھی اس کی روایت نظر آتی ہے، علامہ شبلی کی سیرت النعمان اور سید سلیمان ندوی کی سیرت عائشہ معروف کتب ہیں، البتہ اب ہمارے عرف اور عام محاورے میں مطلقاً جب لفظ سیرت کا استعمال ہوتا ہے، تو اس سے مراد سیرت نبوی ہی ہوتی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی سیرت کی نہایت جامع تعریف کی ہے، اُن کے الفاظ ہیں:

''سیرت کا مفہوم طریقے و مذہب، سنت، ہیئت، حالت اور کردار تک محدود نہیں، بلکہ اس سے مراد داخلی شخصیت، اہم کارنامے اور اکابر کے حالاتِ زندگی بھی ہیں''۔(99)

یہاں اگر چہ ڈاکٹر صاحب نے سیرت کے مطلق مفہوم کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسرے مقام پر وہ اس مؤقف کو کہ سیرت سے مراد صرف نبیٔ اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ ہے، بالکل واضح اسلوب میں بیان کرتے ہیں:

''تمام اشخاص کی بایوگرافی (سوانح) کو سیرت کہنا زیادتی ہے، کیونکہ سیرت کے لفظ کو اصولی طور پر آنحضور ﷺ کے حالات ہی سے مخصوص سمجھنا چاہیے''۔(100)

اسی مفہوم کے حوالے سے ایک بات اور بھی ہے، خود قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْأُوْلٰى'' (101)

''اسے پکڑلو، اور خوف نہ کرو، اسے ہم پھر پہلی والی ہیئت پر لے آئیں گے''۔

جہاں تک مغازی کا تعلق ہے تو میں یہ واضح کرتی ہوں کہ مغازی کے حوالے سے ابتدائی کتب کے مؤلفین میں عروہ بن زبیرؒ(م 94ھ)، ابان بن عثمان بن عفان (م 105ھ)، عاصم بن عمر بن قتادہ (م 120ھ)، شرجیل بن سعد مدنی (م 123ھ)، ابن شہاب زہری (م 123ھ) اور عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (م 135ھ) کے نام ملتے ہیں۔ ان کے بعد آنے والوں میں تین نام بڑے نمایاں ہیں اور ان تینوں نے جو کتب مغازی کے عنوان سے تحریر فرمائیں، اُن کا زمانہ تحریر بھی تقریباً ایک ہی ہے، یہ تین نام ہیں: موسیٰ بن عقبہ (م 141ھ)، محمد بن اسحاق (م 151ھ) اور ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی (م170ھ)۔

ان میں ابو معشر زیادہ قابل غور ہیں، ایک تو وہ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں، غالباً مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے پہلی بار ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں۔(102) دوسرے ان کی کتاب کا زمانہ تحریر موسیٰ بن عقبہ سے زیادہ بعید نہیں ہے لیکن وہ شاگرد موسیٰ بن عقبہ کے ہی تھے، اور موسیٰ بن عقبہ کو محدثین بھی تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ وہ عام طور پر مغازی نگاروں کو اپنے معیار کا قرار نہیں دیتے، چنانچہ امام مالک محمد بن اسحاق کے سخت ناقد ہیں۔ لیکن وہ موسیٰ بن عقبہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، اسی طرح محمد بن طلحہ بن طویل کا قول ہے:

''لم يكن بالمدينة اعلم بالمغازى عنه'' (103)

''مدینے میں موسیٰ بن عقبہ سے بڑا مغازی کا کوئی عالم نہیں تھا''۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''كان بصيرا بالمغازى'' (104)

''آپ مغازی میں گہری بصیرت رکھتے تھے''۔

اسی طرح خطیب بغدادی ابو معشر سندھی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ابو معشر سندى كان اعلم الناس بالمغازى'' (105)

''ابو معشر سندی کا ایک اور تعارف یہ بھی ہے کہ وہ واقدی جیسے مشہور غزوات نگار کے استاد ہیں''۔

سیرت نگاری کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ اسلام کے دور اول میں جبکہ مسلمانوں میں قرآن حکیم اور اس سے متعلق علوم و فنون نیز احادیث نبویہ کے حوالے سے شغف اور دلچسپی بڑھ رہی تھی، اور جا بجا ان کے حلقے قائم تھے، خلفائے راشدین بذات خود ان حلقوں کو قائم اور ان کی سرپرستی فرماتے تھے، اور ان علوم کے ماہرین کی بڑی تعداد صحابۂ کرام میں موجود تھی، اسی دور میں مغازی کے زیر عنوان سیرت طیبہ پڑھنے اور پڑھانے کا رجحان بھی موجود تھا، اور یہ رجحان مسلسل قوی ہو رہا تھا، جس کا ایک سبب ذات رسالت مآب ﷺ سے مسلمانوں کے تعلق خاص کے علاوہ یہ بھی تھا کہ اسلام سے قبل بھی اہل عرب کے ہاں خاندانی وقبائلی فخر ومباہات کے اظہار کا خاص اہتمام تھا، اور چونکہ ان کے ہاں نوشت وخواند کا رواج بہت کم تھا، اس لئے وہ ان امور کے لئے اپنے خداداد بے مثال حافظے سے فائدہ اٹھاتے تھے اور اس مقصد کے لئے خاص مجالس آراستہ کرتے تھے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ عربوں کی یہی روایت اسلام کی آمد کے بعد غزوات وغیرہ کے بیان کی صورت اختیار کر گئی۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ تفسیر وفقہ کے بڑے اور جید ترین امام ہیں، آپؓ نے اپنی مجالس کے لئے مختلف ایام کے لئے مختلف موضوعات مقرر فرمائے تھے۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کا بیان ہے:

''ولقد کان یجلس یوما لا یذکر الا الفقه، ویوما التاویل، ویوماً المغازی، ویوماً الشعر، ویوما ایام العرب'' (106)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے حلقۂ درس میں ایک دن فقہ، ایک دن تفسیر، ایک روز مغازی، ایک دن شعر وادب اور ایک دن ایام عرب کا بیان فرماتے تھے''۔

اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ مغازی غیرہ کے بیان سے صحابۂ کرام کا مقصد سننے والوں کو شوق دلانا اور انہیں ثابت قدمی، شجاعت اور جواں مردی کی تلقین ہوتا تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے صاحبزادے محمد بن سعد بیان کرتے ہیں:

''کان ابی یعلمنا المغازی والسرایا ویقول، یا بنی انها الشرف آبائکم فلا تضحوا ذکرها'' (107)

''ہمارے والد ہمیں غزوات وسرایا کی تعلیم دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اے میرے بیٹو! یہ تمہارے آبا کا شرف وافتخار ہیں، سو تم انہیں ہرگز ضائع نہ کرنا (بلکہ انہیں یاد رکھنا)''۔

غزوات وسرایا سے مسلمانوں کی اس دلچسپی کا اثر تھا کہ خواتین میں بھی یہ موضوع پسند کیا جاتا تھا، اور وہ بھی اس سلسلے میں خاص ذوق وشوق کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

ام سعد جمیلہ بنت سعد بن ربیع اپنے والد عمر دہت حزم بن زید کا واقعہ یوں بیان کرتی ہیں:

''انا یوم الخندق ابنة سنتین و کانت امی تُخبِرُنی بعد ان ادرکت عن امرهم فی الخندق'' (108)

''میں غزوۂ خندق کے روز دو سال کی تھی، اور میری والدہ میرے ہوش سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کے غزوۂ خندق کے حوالے سے واقعات مجھے سناتی تھیں''۔

اس سلسلے کے اور بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں، اور ان واقعات کو مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ اسلامی حکومت خصوصاً خلفائے راشدین اور ان کے متصل بعد کے حکمرانوں نے بھی مغازی کو خاص توجہ دی۔ ہشام بن عبدالملک نے اپنے بیٹے کے معلم سلیمان کلبی کو یہ ہدایت جاری کی تھی:

''وَبصره طرفاً من الحلال والحرام والخطب والمغازی'' (109)

''اسے حلال وحرام، خطبات اور مغازی کے بارے میں صاحبِ نظر بناؤ''۔

مغازی کا یہ درس دینے والے صحابہؓ وتابعین پھر بڑے جوش اور جذبے سے یہ درس دیا کرتے تھے، اور اس دوران اُن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی۔ سفیان بن علیہ کہتے ہیں:

كان عكرمة اذا تكلم في المغازي فسمعه انسان قال كأنه مُشرِف عليهم يراهم (110)

''حضرت عکرمہؓ جب غزوات کا بیان کرتے تھے تو سننے والا شخص یہ کہتا تھا کہ گویا وہ خود مجاہدین کو جہاد میں مصروف دیکھا رہا ہے''۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مغازی کے زیرِ عنوان مطالعۂ سیرت، صحابۂ کرامؓ اور تابعین کے عہد میں ہی مسلمانوں کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا، جسے بعد میں مزید وسعت حاصل ہوئی، اور پہلے سیرت کے جامع انداز میں بیانات تحریری شکل میں آنا شروع ہوئے، اور بعد میں سیرت نگاری مزید وسعتیں اختیار کرتی چلی گئی۔

علم سیرت اور واقدی:

علم سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے جس شخصیت کا حوالہ ناگزیر سمجھا جاتا ہے، وہ علامہ محمد بن عمر واقدی کی ہے۔ واقدی پر گفتگو کرتے ہوئے خصوصاً عہدِ حاضر میں بسا اوقات نہایت غیر ذمے داری کا ثبوت دیا جاتا ہے، اور واقدی پر قرونِ اولیٰ کے بعض بزرگوں کی جانب سے کی جانے والی جرح کو اس کے سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے، اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ واقدی کی روایاتِ سیرت از اول تا آخر ناقابلِ التفات اور مکمل طور پر قابلِ ترک ہیں۔ یہ تاثر اور واقدی کی شخصیت اور کام کے ساتھ یہ رویہ ناانصافی بھی ہے اور فنِ سیرت سے ناواقفیت کی دلیل بھی۔ اس موضوع پر شاید سب سے بہتر اور معتدل رائے معروف محقق اور اہلِ علم ڈاکٹر محمود احمد غازی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''واقدی نے جو بڑا اور اصل کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے غزواتِ نبوی کے مقامات کو خود جا کر دیکھا، خود جا کر ان غزوات کے مقامات کا نقشہ بنایا۔ اس کام کو آج تک کسی نے مشکوک قرار نہیں دیا۔ یہ کام آج تک مستند مانا جاتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جزوی طور پر اختلافِ رائے رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ میں ذاتی طور پر نہ تو واقدی کے سارے کام کو بے اعتبار قرار دے کر دریا برد کرنے کے حق میں ہوں اور نہ ہی واقدی کے سارے کام کے درجۂ استناد کو امام بخاری کے کام کے برابر سمجھتا ہوں۔ امام بخاری اور ان جیسے دوسرے اکابر محدثین کا کام استناد کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اونچا ہے۔ کوئی بھی بیان اگر اس کے مقابلے میں آتا ہے اور بخاری اور مستند محدثین کی روایات سے متعارض ہے تو اس پر بار بار غور کرنا پڑے گا۔ اس لئے واقدی اور دوسرے سیرت نگاروں کے بارے میں تو ان سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ نہ کلی طور پر رد کرنا مناسب ہے اور نہ ہی کلی طور پر اس کو سو فیصد مستند سمجھنا درست ہے''۔ (111)

حقیقت یہ ہے کہ جہاں واقدی پر کبار محدثین نے جرح کی ہے وہیں بہت سے محدثین نے واقدی کو ثقہ بھی کہا ہے، اور ان سے روایت بھی کی ہے۔

علامہ عینیؒ بجا طور پر فرماتے ہیں:

''ما للواقدي، وقد روى عنه الشافعي، وأبوبكر بن أبي شيبة، وأبو عبيد، وأبو خيثمة: وعن مصعب الزبيري: ثقة مامون، وكذا قال المسيبي. وقال أبو عبيد: ثقة، وعن المدراوردي: الواقدي أمير المؤمنين في الحديث'' (112)

''واقدی کو کیا ہے جبکہ امام شافعی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوعبید اور ابوخیثمہ جیسے لوگ ان سے روایت کرتے ہیں، مصعب زبیری سے ان کے متعلق ثقة مامون کے الفاظ منقول ہیں، مسیبی نے بھی ان کے متعلق یہی الفاظ کہے، ابوعبید نے انہیں ثقة کہا اور دراوردی سے منقول ہے کہ واقدی امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں''۔

اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی درست فرمایا ہے:

"ومع هذا فلا يستغني عنه في المغازي وأيام الصحابة وأخبارهم" (113)

''ضعیف ہونے کے باوجود مغازی، عہد صحابہ اوران کے واقعات میں واقدی سے بے نیازی نہیں برتی جا سکتی''۔

اورانہوں نے واقدی کے تذکرے کے اختتام پر مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مع أن وزنه عندي أنه مع ضعفه، يكتب حديثه، ويروى لأني لا أتهمه بالوضع" (114)

''اس کے ساتھ ساتھ میرے نزدیک ضعیف ہونے کے باوجود واقدی کا رتبہ یہ ہے کہ ان کی حدیث لکھی اوراس کی روایت کی جا سکتی ہے،اس لئے کہ میں اس پر حدیث وضع کرنے کی تہمت نہیں لگاتا''۔

یہ موضوع گفتگو نہایت وسعتوں کا حامل ہے،ہم اسے مختصر کرتے ہوئے اردو سیرت نگاری تک محدود رکھیں گے،اور اس میں صرف پاک وہند کے خطے کو موضوع بحث بنائیں گے۔

سیرت نگاری کا ہمارے ہاں آغاز میلاد ناموں سے ہوا۔میلاد ناموں کا اسلوب بھی مختلف تھا،اوران کے موضوعات بھی محدود تھے ان میں زیادہ تر ولادت نبوی اوراس سے متعلق بیانات پر زیادہ زور ہوتا تھا،جن میں سے بہت سے واقعات قطعاً بے اصل تھے جبکہ بعض واقعات اگر ثابت بھی ہیں تو نہایت ضعیف درجے میں۔پھر معراج،شق القمر وغیرہ جیسے معجزات یا شمائل کے مخصوص پہلو جن میں آپ ﷺ کی ظاہری وجاہت کا بیان ہوتا تھا۔ان میلاد ناموں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں عقیدت تو تھی،مگر ضعیف وموضوع روایات کا ایک طومار تھا،جس کے زوروشور میں اصل سیرت طیبہ ﷺ چھپ کر رہ گئی تھی۔ان میلاد ناموں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کا بہت سا حصہ منظوم بھی ہوتا تھا۔

اس سلسلے کی جو سب سے پہلی مکمل کتاب قرار دی جا سکتی ہے وہ محمد باقر آگاہ (1158ھ۔1745ء/ 1220ھ۔1805ء) کی ''ریاض السیر'' ہے جو 210ھ یا 1795ء سے قبل لکھی گئی۔اس میں ولادت سے انتقال فرمانے تک آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ کا بیان ہے،اس کے دو نام نورمحمدی اور مولود شریف بھی تذکروں میں ملتے ہیں۔اس کا اسلوب سادہ اورقدیم ہونے کے باوجود خاصا عام فہم ہے،گو کہیں کہیں عربی کا اثر اوراس کا اسلوب عبارت پر بھی غالب نظر آتا ہے۔زبان وبیان جاننے کے لئے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''مدت اقامت حضرت ﷺ کی مدینہ منورہ میں بالاتفاق دس برس ہے،اس دس برس میں غزوات ساتھ قول مشہور کے بائیس ہیں۔اورروایت ہے زید بن ارقم سے کہ غزا کئے میں نے ہمراہ حضرت کے سترہ بار،اورکہا ابن اسحاق اور ابومعشر اور موسیٰ بن عقبہ نے کہ مشہور یہ ہے کہ آپ ﷺ بائیس غزوات میں تشریف لے گئے۔اور سرایا پچاس ہوئے۔مقابلہ نہیں فرمایا آپ ﷺ نے مگر سات میں۔غزوۂ بدر،غزوۂ احد،غزوۂ بنی قریظہ،غزوۂ بنی مصطلق،غزوۂ خیبر اور غزوۂ طائف''۔(115)

ڈاکٹر انور محمود خالد نے کافی محنت سے اس موضوع پر مواد جمع کیا ہے اوران کی کتاب اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ کے مطالعے سے اس دور اور بعد کی قدیم کتب کے موضوعات اورزبان واسلوب کے جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔

تقریباً اسی زمانے کی ایک اور کتاب کا ذکر بھی دلچسپی کا باعث ہوگا،حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خاندان کے ایک بزرگ اور حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی کے بھائی شاہ احمد سعید فاروقی مجددی رحمہ اللہ (م 1277ھ/ 1860ء) نے ایک کتاب سعید البیان فی مولد سید الانس والجان کے نام سے تحریر فرمائی تھی۔کتاب کا اسلوب عام طور پر وہی ہے،جو اس دور کے دوسرے میلاد ناموں کا تھا،البتہ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم ترین نثر کا نمونہ ہے جو آج بھی شائع شدہ ہمارے سامنے موجود ہے،اسے معروف محقق اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بزرگ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان رحمہ اللہ نے اپنے مقدمے کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے شائع کیا تھا،چند برس اس کا ری پرنٹ سامنے آیا ہے۔اس سے قبل بھی یہ کتاب کئی بار شائع ہو چکی ہے۔نیز اس کی زبان میں سلاست زیادہ ہے،بعض مقامات پر تو زبان آج کے

اسلوب سے بہت زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے۔ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''روایت ہے کہ جب والدہ آپ کی فوت ہوئیں، ملائک نے جناب باری میں عرض کی کہ نبی تمہارے یتیم رہے، ہم کو حکم ہو پرورش کا۔ارشاد ہوا میں خود متکفل اُن کا ہوں۔ جب عمر شریف آٹھ برس کو پہنچی، عبدالمطلب نے انتقال کیا، ابوطالب نے بموجب وصیت باپ کے، پرورش کی''۔ (116)

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا، کتاب کا اسلوب عام مولودناموں سے زیادہ مختلف نہیں۔مگر اہم بات یہ ہے کہ قرآنی آیات سے استدلال کثرت سے کیا گیا ہے۔اور ابتدائی چند صفحات میں بیس سے زائد آیات قرآنی درج کی گئی ہیں۔

مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

چنانچہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں:

''لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ''

بتادیا اللہ تعالیٰ نے سب کو کہ ہم نے بھیجا رسول انہیں میں سے کہ جانتے ہیں اس کے مرتبے کو کہ سچا اور امین ہے یا سب سے بہتر اوپر قراءت فتحہ کے۔اور دو نام اپنے ناموں سے دیئے، ایک رؤف اور دوسرا رحیم کہ کسی اور کو نہیں دیئے۔

اور فرمایا:

''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ''

اور فرمایا:

''كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ''۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے تفسیر مِنْ اَنْفُسِكُمْ میں منقول ہے کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ السلام سے آباء ہمارے میں نکاح کی سنت جاری ہے اور سفاح نہیں ہوا۔کہا ابن کلبی نے لکھیں میں نے واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچ سو مائیں، نہیں پائے میں نے ان میں رسوم جاہلیت کے۔ابن عباسؓ سے روایت ہے تفسیر وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ میں ایک نبی سے دوسرے نبی تک، یہاں تک کہ نکالا تم کو نبی''۔ (117)

چھوٹی تقطیع کے تقریباً 66 صفحات پر مشتمل ہے اس مختصر کتاب کا ایک بڑا حصہ اس دور کے عام رواج کے مطابق اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ اشعار زیادہ تر مصنف کے خالہ زاد بھائی شاہ رؤف احمد رافت کے ہیں، اور قدیم اردو کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں ان کے علاوہ کتاب میں عربی اور فارسی کے اشعار بھی موجود ہیں۔

سیرت نگاری کا ابتدائی دور جو اٹھارہویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے ہماری دانست میں اس کا اختتام سرسید احمد خان (1817ء / 1898ء) کی جانب سے خطبات احمدیہ کے تحریر کرنے پر ہو جاتا ہے جس کے انگریزی ترجمے کی اشاعت 1870ء میں ہوئی اور اردو متن 1887ء میں منظر عام پر آیا۔ سرسید اگرچہ اس سے قبل جلاء القلوب بذکر المحبوب کوئی 1842ء کے عرصے میں تحریر کر چکے تھے اس کی حیثیت بھی میلاد نامے کی تھی، اور اس میں بھی عام مروج ضعیف اور کمزور باتوں کے ساتھ ساتھ صحیح احادیث درج کرنے کا التزام کیا گیا تھا، مگر بعد میں اس کے بہت سے حصوں سے خود سرسید نے برأت کا اظہار کیا۔

لیکن خطباتِ احمد یہ، جس کا پورا نام خطبات الاحمد یہ علی العرب والسیر ۃ المحمد یہ تجویز کیا گیا تھا، اصل میں اردو سیرت نگاری میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، سرسید کی فکر سے ہزار بار اختلاف کے باوجود یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ سرسید کے خطبات کو نہ صرف اردو سیرت نگاری بلکہ سیرت نگاری کی پوری تاریخ کا اہم موڑ قرار دیا جائے گا، یہ کتاب دراصل سرولیم میور کی ضخیم کتاب ''لائف آف محمد'' (چار جلدیں) کا جواب ہے، جو 1861ء میں شائع ہوئی تھی، اور ایک مغربی پادری پی فنڈر کے ایماپر لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا کمزورترین پہلو یہ ہے کہ سرسید نے معجزات کا انکار کیا ہے یا دوراز کار قسم کی تاویلات کی ہیں۔ اور اس سلسلے میں صحیح احادیث کے انکار سے بھی پس وپیش نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب کو ہم اپنے ہاں ''اعتذاری ادب'' کا آغاز کرنے والی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں۔

لیکن اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں کہ جدید سیرت نگاری کا آغاز سرسید سے ہی ہوا ہے۔ ان کی کتاب کو ان اُمور کے سبب اولیت اور امتیاز کا شرف حاصل ہے۔

الف: سرسید پہلے محقق ہیں، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دینے کا آغاز کیا، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان کی کتاب خطباتِ احمد یہ، ولیم میور کے اعتراضات ہی کے جواب میں لکھی گئی، البتہ اس کا اسلوب مناظرانہ نہیں، مصالحانہ ہے، اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ بات مخاطب کے فہم کے مطابق کی جائے۔

ب: سیرت کے بہت سے بیانات میں ہمیں اختلاف ملتا ہے، تواریخ کا اختلاف، شخصیات کے ناموں کا اختلاف، واقعے کے اسباب کے بارے میں مختلف بیانات، اس حوالے سے بھی سرسید پہلے فرد نظر آتے ہیں جنہوں نے ان اختلافی روایات کے مابین تطبیق یا ترجیح دینے کا آغاز کیا اور اس قسم کے مباحث کہ اختلاف کیوں ہوا؟ اختلافی روایات کے اسباب کیا ہیں؟ وغیرہ امور کو اپنے مطالعۂ سیرت میں شامل کیا۔

ج: آنحضرت ﷺ کے متعلق بشارات کتب سابقہ میں ملتی ہیں، اس موضوع پر اب تو بہت سی کتب بھی ملتی ہیں، لیکن ہماری معلومات کے مطابق سرسید نے پہلی بار اردو میں ان مباحث پر لکھا، اور مذاہب عالم کی کتب میں نبی کریم ﷺ کی بشارات کو سیرت لٹریچر کا حصہ بنایا۔

د: آج اردو کی تقریباً ہر کتاب میں قبل از اسلام عربوں اور دنیا بھر کی مذہبی، سیاسی، معاشی ومعاشرتی واخلاقی حالت کا بیان ملتا ہے، مطالعۂ سیرت میں یہ وسعت سرسید کی کتاب سے ہی آتی ہے، ان سے قبل اس موضوع کو اس قدر تفصیلی انداز میں لکھنے کا رجحان نہیں ملتا۔

ھ: بائبل سے استشہاد اور اس کے بیانات کا قرآن وحدیث سے تقابل بھی سرسید کے ہاں پہلی بار ملتا ہے۔

و: اس کے ساتھ ساتھ درایت کے پہلو کو مطالعۂ سیرت کا حصہ بنانے کا کام بھی جس بھرپور انداز میں سرسید نے انجام دیا وہ اس سے قبل نظر نہیں آتا۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق ہمارے لئے کس حد تک ممکن ہے، انہوں نے جو رجحان مطالعۂ سیرت میں قائم کیا، اس سے پھر بعد میں آنے والے سیرت نگاروں نے فائدہ اٹھایا، اور سرسید کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھایا۔ یہ بھی سرسید کی سیرت نگاری کا امتیازی پہلو ہے۔ بہر کیف خطبات احمد یہ سے اردو سیرت نگاری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، جو علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور سلمان منصور پوری کے ذریعے اپنے عروج تک پہنچ گیا۔

سرسید کے عہد کی ایک اور شخصیت ہمارے مطالعے کا محور ہے وہ ہیں جسٹس سرسید امیر علی۔ یہ بنگال کے رہنے والے تھے، عربی فارسی سے خوب واقف تھے۔ وکیل تھے اور کلکتہ ہائی کورٹ کے پہلے مسلمان جج اور پریوی کونسل کے بھی پہلے مسلم جج تھے، جو سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ انہوں نے بھی سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمد (Life of Muhammad) اور اس میں موجود غلط بیانوں کے ردعمل میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام ابتدا میں یہ تھا۔

A critical appraisal of the life and achievement of Muhammad.

اس کتاب کے ایک حصے میں سیرت طیبہ کا بیان تھا اور دوسرے حصے میں نبی کریم ﷺ کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔ سید امیر علی چوں کہ انگریزی زبان وادب کے ادیب تھے، اس لئے ان کا اسلوب جاندار ہے اور ان کا طرز استدلال بھی خالص مغربی انداز کا ہے، جس کے سبب ان کی کتاب کی افادیت بہت ہے، پھر انگریزی زبان اور انگلش مزاج سے مکمل واقفیت کے سبب ان کے ہاں مرعوبیت کا وہ ماحول نظر نہیں آتا، جو سرسید کے یہاں ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1873ء میں شائع ہوئی، بعد میں سید امیر علی نے اس میں کافی اضافے اور ترامیم کیں، ان کی حیات میں اس کتاب کا آخری ایڈیشن 1909ء میں شائع ہوا۔ اس وقت کتاب کا نام انہوں نے تبدیل کر کے روح اسلام (Spirit of Islam) رکھا، اور اب یہ کتاب اسی نام سے مشہور اور موجود ہے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سرسید کے خطبات احمدیہ کے برعکس یہ کتاب ردعمل میں لکھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی، بلکہ مستشرقین کے الزامات سے تعرض کئے بغیر سیرت طیبہ اور اسلامی تمدن کا ایک واضح اور خوش نما خاکہ پیش کر دیا گیا ہے، اور یوں اسلام کا موقف مثبت انداز میں غیر مسلموں کے سامنے آ گیا ہے۔ اس کتاب کی یہ بھی اہمیت ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں مغربی خیالات، افکار اور انداز فکر کو سامنے رکھ کر دعوتی اسلوب میں انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام سے متعارف کرانے کی یہ اولین کاوش ہے۔

البتہ سید امیر علی بھی مسلمانوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو انگریزی تعلیم یافتہ اور بعض حوالے سے جدت پسند تھا، اس بنا پر ان کی تمام آراء سے اتفاق مشکل ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی کی یہ رائے بھی قابل غور ہے:

''یہ کتاب آج سے سو، سوا سو سال پہلے کے ماحول میں لکھی گئی تھی۔ بلکہ سوا سو سال سے بھی زیادہ 1873ء میں یہ پہلی بار چھپی تھی، اس زمانے کے لحاظ سے جو خیالات مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج تھے، ان خیالات کا اظہار ہے، بعض چیزیں صحیح ہیں، اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ہیں، بعض بعض بیانات قابل غور ہیں اور محل نظر ہیں''۔(118)

سرسید کے بعد علامہ شبلی نعمانی (1857ء/1914ء) کا دور آتا ہے، اُن کی کتاب سیرت النبی ﷺ کو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اس کے مقام بلند کی دلیل تو ہے ہی ہمارے خیال میں وہ عنداللہ قبولیت کا بھی ایک اشارہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سیرت النبی ﷺ کے نام سے یا اس سے ملتے جلتے ناموں سے کئی کتابیں لکھی گئیں، مگر سیرت النبی ﷺ سن کر انسانی ذہن صرف علامہ شبلیؒ کی جانب ہی منتقل ہوتا ہے، لیکن ہمارا مقصد اس وقت صرف ان خصائص کا اظہار ہے جن کے سبب اس کتاب نے مطالعۂ سیرت کو وسعت بخشی، اس حوالے سے چند نکات قابل غور ہیں:

الف: شبلی نعمانیؒ نے سب سے مرتب انداز میں اصول سیرت نگاری پر لکھا، اور اس موضوع پر قابل قدر کام کیا۔ اس موضوع کو اُن کے بعد مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے اصح السیر کے مقدمے میں آگے بڑھایا۔ لیکن یہ موضوع آج بھی تشنہ ہے، اور کسی محقق، عالم کی محنت وکاوش کا منتظر ہے، اس موضوع پر چند کتب بھی لکھی گئیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کا عنوان تو سیرت نگاری ہے، لیکن ان میں اصول سیرت نگاری بیان ہی نہیں کئے گئے، دیگر مباحث پر زور قلم صرف کیا گیا ہے، بہر حال علامہ شبلی اس حوالے سے اولیت کا شرف رکھتے ہیں، ان سے قبل سرسید نے بھی چند نکات خطبات احمدیہ میں بیان کئے تھے، لیکن ان کا بیان ضمناً ہوا تھا، علیحدہ سے باقاعدہ بیان شبلی کے ہاں ہی پہلی بار ملتا ہے۔

ب: مستشرقین پر اور ان کے کام پر نقد، ان کی اقسام اور تقسیم، ان کی چیدہ چیدہ کتب کا تعارف اور مستشرقین کی ایک فہرست مرتب کرنا، یہ بھی علامہ شبلی کا امتیاز ہے، مستشرقین پر کام بعد میں بہت آگے تک پہنچا۔ جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے لیکن اس موضوع کو پہلی بار سیرت لٹریچر کا حصہ علامہ شبلی نے بنایا۔

ج: فن درایت سے سیرت نگاری کا کام لینے کی جو روایت سرسید نے ڈالی تھی، اسے آگے بڑھانے میں بھی علامہ شبلی کا نمایاں حصہ ہے۔

د: علامہ شبلی نے تحقیق وتدقیق کو بھی سیرت نگاری میں رائج کیا، اور روایت ودرایت دونوں سے کام لے کر سیرت کے اختلافی بیانات کے مابین تطبیق پیدا کرنے اور روایات سیرت میں بعض مقامات پر موجود اختلاف دور کرنے کی سعی کی۔

ان امور کے سبب سیرت النبی کو وہ مقبولیت اور قبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ باید وشاید۔ آج جبکہ اردو میں سیرت کے موضوع پر اس قدر کتب موجود ہیں کہ ان کا شمار واستقصا بھی مشکل ہے، لیکن سیرت النبی کے مقام کو کوئی کتاب نہیں پہنچ سکی، آج صرف پاکستان میں غالباً آٹھ، نو ادارے اس کتاب کی اشاعت کر رہے ہیں، اور ہر ایک کا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔ البتہ سیرت النبی پر اب بھی کام کی ضرورت ہے، اور یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اس پر نظر ثانی کی جائے، اور اس کے حوالہ جات کو از سرنو دیکھا جائے، خصوصاً رائج معیار کے مطابق احادیث کی تخریج کی جائے۔ جو کتابت کی غلطیاں عرصے سے جوں کی توں چلی آ رہی ہیں، انہیں درست کیا جائے۔ یہ کتاب کسی باہمت خادم سیرت کی تلاش میں ہے۔ دیکھئے کون اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

علامہ شبلیؒ کے ساتھ ان کے شاگرد رشید اور قارئین سیرت کے بڑے محسن مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا نام ایسا یوں جڑا ہوا ہے کہ ان کے بغیر نہ تو علامہ شبلی کا تذکرہ مکمل ہوتا ہے، نہ سیرت النبی کی تکمیل ہو سکتی ہے، اور خاص ہمارے آج کے موضوع یعنی مطالعۂ سیرت کی وسعت کے حوالے سے بھی ان کا کردار بے حد نمایاں ہے، اور سرسید اور علامہ شبلی کے بعد جو وسیع اثرات علوم سیرت پر سید صاحب نے چھوڑے ہیں، اور مطالعۂ سیرت کو جو وسعت اپنی تحریروں کے ذریعے انہی نے دی ہے، اس تک ان کے بعد آنے والے معروف ترین سیرت نگاروں میں سے کوئی بھی نہیں پہنچ سکا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے نہ صرف سیرت النبی کے موضوعات میں اضافہ کیا، بلکہ خود سیرت کا دائرہ حیات، معجزات اور شمائل سے لے کر عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور سیاسیات تک وسیع کر دیا، مطالعۂ سیرت کی یہ وسعتیں سیرتی ادب کو سید صاحب کے ذریعے میسر آئی ہیں۔ پھر سیرت النبی کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ اس نے مابعد کے سیرتی ادب پر نمایاں ترین نقوش واثرات ثبت کئے ہیں، یہ بیان قطعاً مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ بے شمار کتب محض سیرت النبی سامنے رکھ کر ہی لکھی گئی ہیں۔ اور بعض کتب نے اگر سیرت النبی کے ابتدائی حصوں کے بعض بیانات سے اختلاف کا اظہار بھی کیا، جس کی یقیناً گنجائش موجود تھی، تو بھی اس کتاب کے اثرات کو ایک اعتبار سے انہوں نے بہرحال تسلیم کیا ہے۔

درحقیقت سید صاحب نے علم سیرت کو جو موضوعاتی تنوع، وسعت اور معنوی گہرائی اور پھیلاؤ بخشا ہے، اس کا جواب نہیں، مگر شبلیؒ کی دین کی کو دوسرا کوئی سیرت نگار نہیں پہنچ سکا۔ شبلی کا دوسرا نمایاں امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اردو سیرت نگاری وسوانح نگاری میں مختلف مآخذ سے استفادہ کر کے ایک جامع مفہوم اردو میں منتقل کرنے کا اسلوب رائج کیا۔ اس سے قبل اردو سیرت نگاری وسوانح نگاری میں اقتباسات کی روایت چلی آ رہی تھی، جو جدید علمی اسلوب کے اعتبار سے نہ تو اتنی مفید تھی، نہ تحقیقی پہلو سے اتنی کامیاب۔

سید سلیمان ندوی کی ایک اور کاوش مطالعۂ سیرت کے حوالے سے اختصاص وامتیاز رکھتی ہے، وہ ہے خطبات مدراس، مولانا ندوی کے یہ آٹھ خطبے 1925ء میں مدراس میں دیئے گئے۔ ان خطبات میں انہوں نے قارئین سیرت کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا۔ اور سیرتی ادب میں پہلی بار نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے امتیازی پہلوؤں کو سائینٹفک اسلوب میں پیش کیا۔ یہ کتاب ان غیر مسلموں کے لئے بھی بہترین تحفے کی حیثیت رکھتی ہے، جو مختلف مذاہب کا مطالعہ کر کے راہ ہدایت تلاش کرنا چاہتے ہیں، اس میں سید صاحب نے بتایا ہے کہ کسی بھی شخصی سیرت کا کمال انبیا کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا، اور دائمی نمونۂ عمل صرف آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس بات کا صرف دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اس کے لئے دلائل بھی دیئے ہیں۔ پوری کتاب اسی بنیادی تصور کے گرد گھومتی ہے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت طیبہ کے عملی پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے اور پیغام محمدی

کے زیرعنوان آخری خطبہ تو خاص اسی پہلو کو پیش کرتا ہے، یہ نکتہ ماقبل کے سیرت نگاروں کے ہاں ہمیں نظر نہیں آتا۔

اسی دور کی ایک اور کتاب جدید سیرت نگاری کے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے قاضی محمد سلیمان منصور پوری (م 1930ء) کی رحمت اللعالمین۔ یہ کتاب تین جلدوں میں مکمل ہوئی اور تحقیق وتدقیق، واقعات کی ترتیب، صحت روایات اور مؤلف کے وسعت مطالعہ کے سبب آج تک اپنا علیحدہ حلقہ رکھتی ہے، اور سیرت النبی کی بے مثال مقبولیت کے پہلو بہ پہلو اس کتاب کا یہ مقام بنانا بجائے خود اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔

رحمت اللعالمین ﷺ جہاں ایک جانب سیرت لٹریچر میں بیش بہا اضافہ ثابت ہوئی، وہیں اس نے مطالعۂ سیرت کے موضوعات کو بھی مزید وسعت بخشی۔ قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے خصوصیت کے ساتھ جن عنوانات کو سیرتی ادب میں متعارف کرایا، ان میں سب سے پہلے تعلیمات نبوی شامل ہیں۔ احادیث کا انتخاب اس سے قبل کسی کتاب میں نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ انساب کی تفصیل، خصوصاً خاندان نبوت کے نسب اور اس کی مختلف شاخوں کو بڑی وضاحت سے تحریر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی افضلیت پر بھی بڑی محنت سے کلام فرمایا، بلکہ یہ پورا باب اور اس کے بعد رحمت اللعالمین پر بحث خاص طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

پھر تیسری جلد میں خصائص نبوی ﷺ، خصائص قرآن اور خصائص اسلام کی ابحاث ملتی ہیں، یہ تمام موضوعات بھی سیرت کے قارئین کے سامنے پہلی بار رحمت اللعالمین کے ذریعے آئے، دوسری جلد میں بائبل کے بیانات کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ تقابلی مطالعہ بجائے خود اہمیت کا حامل ہے۔ اس بحث نے مطالعہ سیرت میں پہلی بار کلامی پہلو کو شامل کیا، اس طرح سیرتی ادب کا دامن مزید موضوعاتی وسعتوں سے آشنا ہوا۔

ان پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ رحمت اللعالمین ایک نمایاں کاوش تھی، جس نے سیرت کے موضوعات پر بڑے قیمتی اضافے کئے۔ ایسے اضافے جو بعد میں آنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

یہاں پر اسی عہد کی ایک اور کتاب کا حوالہ بھی انہوں نے ناگزیر ہے، یہ ہے مولانا مفتی محمد عنایت احمد کاکوروی (1228ھ / 1279ھ) کی تواریخ حبیب اللہ ﷺ، انہوں نے 1275ھ/ 1858ء میں اُس وقت تحریر کی تھی جب مؤلف جزائر انڈیمان میں قید تھے اور ان کے پاس ایسی کوئی کتاب بھی موجود نہیں تھی، جس کی مدد سے وہ سیرت پر کتاب لکھ سکتے، نتیجتاً انہوں نے فقط اپنے حافظے کا سہارا لیا، لیکن اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ رہائی کے بعد کتاب کی اشاعت سے قبل اس پر نظر ثانی فرمائی، کتاب کے موضوعات عام کتب سیرت سے مختلف نہیں، لیکن اس کا درجۂ استناد ان سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ اس میں اُس دور میں رائج میلاد ناموں کی بے اصل روایات سے قصداً اجتناب کرتے ہوئے صحیح احادیث اور اس وقت دستیاب کتب سیرت سے مستند واقعات درج کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی رحمہ اللہ ہمارے درس نظامی کے طلبا کے لئے اپنی کتاب علم الصیغہ کی وجہ سے متعارف شخصیت ہیں، گو اُن کی یہ کتاب اس قدر متعارف نہیں ہے۔

رحمۃ للعالمین کو ایک اور امتیاز حاصل ہے، وہ ہے عقلیت کے ساتھ ساتھ جذب وکیف کی ایک خاص فضا، جس کی روح پوری کتاب میں رواں دواں دکھائی دیتی ہے، یوں یہ کتاب ایسے خزینے کی حیثیت رکھتی ہے جس کو جمع اور ذخیرہ کرنے والا شخص فرزانگی کے وصف کے ساتھ ساتھ روحانیت اور خود رفتگی کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔

ان چند اہم اور بنیادی کتب کے علاوہ اور ان کے بعد اردو میں بے شمار کتب لکھی گئیں، جن میں سے بعض یقیناً کسی نہ کسی حوالے سے اختصاص وامتیاز بھی رکھتی ہیں، بہت سی آج بھی متعارف ہیں، اور ان کتب کی ایک بڑی تعداد اپنا وقت پورا کر لینے کے بعد گوشۂ گمنامی میں چلی گئیں۔

اردو سیرت نگاری کے تین ادوار:

اردو سیرت نگاری کے تین واضح ادوار ہیں۔

پہلا میلاد ناموں کا دور، جس کا اختتام سرسید پر ہوتا ہے۔

اردو سیرت نگاری کا دوسرا دور سرسید سے شروع ہوتا ہے۔

اور قیام پاکستان کے بعد تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن آج کے موضوع کے حوالے سے دو باتیں اہم ہیں، ایک تو اس دور میں پہلے دونوں ادوار کے برعکس رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ اور سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ غوروفکر کا رجحان قائم ہوا۔ جس کے نتیجے میں مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ کتب اور وقیع معاملات سیرت کے ادب میں شامل ہوئے۔ مثال کے طور پر، آپ ﷺ بہ حیثیت سپہ سالار، بحیثیت مقنن، بحیثیت شوہر، اور آپ ﷺ کی خانگی وعائلی زندگی، آپ کے مکتوبات، خطبات، مکالمات، آپ ﷺ کے سفر اور سفارتی تعلقات، آپ کی سیاسی زندگی، معاشی پہلو، معاشرتی اور سماجی پہلو، آپ کے قضایا اور فیصلے، آپ بحیثیت ماہر نفسیات اور آپ کی فصاحت وبلاغت، آپ کی خطابت، تعلیم وتربیت کے سلسلے میں آپ ﷺ کی ہدایات، اخلاق نبوی وغیرہ۔ غزوات وسرایا کا مختلف حوالوں سے مطالعہ مثلاً پاک و ہند کے معروف محقق سیرت ڈاکٹر نیبین مظہر صدیقی نے غزوات میں ہونیوالے اخراجات اور مال غنیمت کی شکل میں آمد کا جائزہ لیا ہے، یا پروفیسر ظفر احمد صاحب نے سیرت طیبہ ﷺ کے تمام واقعات کی تاریخوں میں پائے جانے والے اختلافات کو تو قیتی تضادات کے زیر عنوان دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، ہمارے خیال میں یہ جدید دور کی سیرت نگاری میں دقیع اضافہ اور عصر حاضر کے علمی کارناموں میں سرفہرست رہنے والا کام ہے۔ ان کا طویل مقالہ جو کتابی شکل میں بارہ پندرہ سو صفحات سے کم نہیں ہوگا، شش ماہی السیرہ عالمی کے صفحات میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ یہ تمام موضوعات مطالعۂ سیرت کی بے پناہ وسعتوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ہماری گفتگو حد درجہ نامکمل رہے گی اگر ہم ڈاکٹر حمید اللہ کا تذکرہ نہ کریں، ڈاکٹر صاحب کی بے نفسی، علم دوستی، سادگی اور ایثار جیسی دیگر اہم خصوصیات اپنی جگہ، لیکن صرف سیرت میں انہوں نے جو دقیع اضافے کئے وہ بجائے خود ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں، اور بجا طور پر ہمارے عہد کے ایک اور محقق و عالم جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی نے انہیں اس صدی کے مجدد علم سیرت قرار دیا ہے۔ (119)

ڈاکٹر حمید اللہ کا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے نہ صرف سیرت سے متعلق بعض نادرو نایاب معلومات فراہم کیں، بہت سے عقدے حل کئے، اور بہت سی کتب سے ہم جیسے طالب علموں کو متعارف کرایا، بلکہ انہوں نے خاص طور پر مطالعۂ سیرت میں قانون بین الممالک جیسے موضوع کا اضافہ کیا، اور جدید ترین اسلوب میں بحث کرتے ہوئے اپنی متعدد کتب میں اسلامی قانون اور نبی اکرم ﷺ کے پیش کردہ اصول و ضوابط کو ہر اعتبار سے بالاتر ثابت کیا۔ (120) قانون بین الممالک کے حوالے سے ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کا کام بھی اہم ہے۔ انہوں نے آج سے کوئی آٹھ، نو برس قبل اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بارہ خطبات دیئے تھے، جو بعد میں خطبات بہاولپور جلد دوم کے نام سے شائع ہوئے۔ (121)

مستشرقین کے حوالے سے تحریروں کا آغاز بھی سرسید کی خطبات احمدیہ سے ہوتا ہے، جو ولیم میور کے جواب میں لکھی گئی جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں، پھر علامہ شبلی نے اس پر کام کیا، جو سیرت النبی کا حصہ ہے۔ ان کے بعد اردو زبان میں پروفیسر احسان الحق کا کام سامنے آیا، اسی طرح 1982ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ انڈیا میں مستشرقین کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا تھا، اس کے مقالات اور کارروائی اس موضوع پر بعض دیگر مقالات کے ساتھ چھ جلدوں میں شائع ہوئی، جن کی ترتیب وتدوین کا فریضہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے انجام دیا۔

اسی طرح اسّی کی دہائی کے اوائل میں ماہانہ نقوش نے ضخیم رسول نمبر تیرہ جلدوں میں شائع کیا، اس میں دیگر بہت سے اہم موضوعات کے علاوہ مستشرقین پر جناب ڈاکٹر نثار احمد کے دو اہم طویل مضامین شامل تھے۔ کچھ عرصے بعد جامعہ کراچی سے جناب ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی نے اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر، کے زیر عنوان پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ پیش کیا، یہ مقالہ لاہور سے حال ہی میں چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔(122)

اسی طرح پیر کرم شاہ الازہری نے سیرت پر ضیاء النبی کے نام سے مفصل کام کیا ہے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی دو جلدیں مستشرقین کے حوالے سے ہیں۔ مطالعۂ سیرت کا یہ ایک وقیع پہلو ہے، جس کے تحت غیر مسلم مفکرین کے خیالات کا جائزہ لے کر ان پر نقد کیا گیا ہے۔

سیرت کمیٹی:

برعظیم پاک و ہند میں خدمت سیرت اور سیرت طیبہ کی موضوعی وسعت کے حوالے سے ایک نسبتاً کم معروف شخصیت کا حوالہ بھی بے حد اہم ہے، جس نے اپنے دور میں ایک ادارے کا کام کیا اور سیرت اور مطالعۂ سیرت کے فروغ اور اس کی وسعتوں میں اضافے کے لئے بے مثال محنت کی۔ میری مراد عبدالحمید قرشی بانی وصدر سیرت کمیٹی لاہور سے ہے۔ عبدالمجید قرشی نے 1936ء کے لگ بھگ سیرت کمیٹی قائم کی، اور پورے متحدہ ہندوستان میں سیرت کے زیر عنوان اجتماعات کا سلسلہ قائم کر دیا۔ سیرت کمیٹی کے تحت سالانہ اجتماعات بھی منعقد ہوئے تھے لیکن ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف شہروں میں سیرت کے جلسے منعقد ہوتے رہتے تھے، ان اجتماعات نے کئی جدتیں پیدا کیں، ان میں پہلی بار روایتی علماء کے ساتھ ساتھ جدید عصری درس گاہوں کے اساتذہ اور پروفیسرز کو بھی بحیثیت مقرر مدعو کیا جانے لگا، اس طرح یہ طبقہ بھی فعال ہوا، اور یوں مطالعۂ سیرت نے محدود دائرے سے نکل کر وسعت اختیار کی، ان کی آمد کی وجہ سے سیرت نگاری کا اس عہد میں مروج اسلوب تبدیل ہوا اور مطالعۂ سیرت کو موضوعاتی وسعت ملی، جس کے نتیجے میں نئے موضوعات سامنے آئے۔

اس سیرت کمیٹی نے سب سے پہلے مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی معروف کتاب النبی الخاتم کتابی شکل میں شائع کی۔ اس کمیٹی کے ذریعے بہت سے نئے مقرر اور نئے قلم کار سامنے آئے، یہ کمیٹی ایک ہفتہ وار رسالہ ایمان بھی نکالتی تھی، جو دور دراز علاقوں میں بھی ٹھیک جمعرات کے روز پہنچ جاتا تھا، اس رسالے کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس میں تواتر سے غیر مسلم خصوصاً ہندو شعرا کی نعتیں شائع ہوتی تھیں۔ عبدالمجید قرشی 47ء کے فسادات میں شہید ہوئے۔ اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ہی خدمتِ سیرت کا یہ عظیم باب بھی بند ہو گیا۔

سیرت کانفرنس:

سیرت کانفرنسوں کا آغاز وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے کیا تھا اور اسے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل صدر جنرل ضیاء الحق نے دی۔ ان کانفرنسوں نے بھی مطالعۂ سیرت کو فروغ دینے، پیغامِ سیرت کو پھیلانے اور موضوعاتِ سیرت کو وسعت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کا اندازہ ان بعض موضوعات سے کیا جا سکتا ہے، جن پر یہ کانفرنسیں اب تک منعقد ہو چکی ہیں، چند موضوعات یہ ہیں:

1۔ سیرتِ مصطفیٰ میں عصر حاضر کے لئے پیغام (جنوری 1981ء)
2۔ حضور اکرم ﷺ بحیثیت معلم اخلاق (جنوری 1982ء)
3۔ حضور اکرم ﷺ بحیثیت مظہر تکمیل نبوت و رسالت (دسمبر 1982ء)
4۔ حضور اکرم ﷺ بحیثیت دہندہ نظام معیشت (دسمبر 1983ء)
5۔ حضور اکرم ﷺ کا نظام عدل (دسمبر 1984ء)

6۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام کی آفاقیت (1985ء)

7۔ دعائے ابراہیمی کی روشنی میں سیرت نبوی ﷺ کا تجزیہ (نومبر 1986ء)

8۔ حضور ﷺ کا اصلاح معاشرہ (اکتوبر 1987ء)

9۔ اسلام کا نظام عدل واحسان (اکتوبر 1988ء)

10۔ داعیٔ امن واخوت (1989ء)

11۔ انسانی حقوق اور تعلیمات نبوی ﷺ (1991ء)

12۔ اسلامی فلاحی ریاست کا تصور اور اس کے تقاضے (1991ء)

13۔ حضور اکرم ﷺ کی رفاہی منصوبہ بندی (1994ء)

14۔ اسلامی معاشی اقدار کے فروغ کا عملی طریقہ کار (1994ء)

15۔ انسداد منشیات اور اس کے تقاضے (1994ء)

16۔ تعمیر شخصیت وفلاح انسانیت (1996ء)

17۔ استحکام پاکستان تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں (1997ء)

18۔ تحریک پاکستان کے فکری محرکات اور تعلیمات نبوی ﷺ (1997ء)

19۔ عدم برداشت کے قومی اور بین الاقوامی رجحانات اور تعلیمات نبوی ﷺ (1999ء)

20۔ بے لاگ احتساب، سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں (2000ء)

21۔ اسلامی نظم معیشت اور کفالت عامہ میں زکوٰۃ کی اہمیت (2001ء)

22۔ معاشرتی ومعاشی ارتقاء میں زکوٰۃ وعشر کا کردار (2001ء)

23۔ مثالی نظام تعلیم کی تشکیل سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں (2003ء)

24۔ نیا عالمی نظام اور امت مسلمہ کی ذمے داریاں تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں (2003ء)

25۔ عصر حاضر میں مذہبی انتہا پسندی کا رجحان اور اس کا خاتمہ تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں (2004ء)

26۔ عصر حاضر کے تقاضے اور ایک روشن خیال، اعتدال پسند اسلامی معاشرے کی تشکیل وضرورت تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں (2005ء)

27۔ دور جدید میں بین المذاہب عالمی اتحاد، یگانگت وہم آہنگی کا تصور اور اس کی حقیقت تعلیمات اسلام اور اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں (2006ء)۔ (123)

دور جدید میں بھی سیرت کانفرنس میں بہت سارے لوگوں نے مختلف موضوعات پر مقالات لکھے۔ ان موضوعات کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ مطالعۂ سیرت کی وسعتوں میں ان کانفرنسوں کے عنوانات نے یقیناً اضافہ کیا، اور ان کی وجہ سے سیرتی ادب میں جو نیا عنصر پیدا ہوا وہ تھا جدید مسائل کو سیرت طیبہ اور تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں دیکھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کا رجحان۔

اس کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کے اس تیسرے دور میں ایک اور پہلو بھی سامنے آیا۔ وہ یہ کہ کتب سیرت میں حوالہ جات بالالتزام دینے کا رجحان بھی پیدا ہوا، اور حوالہ جات کے اندراج کے مسلمہ معیار کی بھی پیروی کی جانے لگی، اس کے نتیجے میں جہاں مطالعہ و استفادہ کرنا سہل ہوا، وہیں اس میں غلو کے نتیجے میں خرابیاں بھی پیدا ہوئیں، اور بعض حلقوں نے یہ فرض کرلیا کہ حوالہ جات ہی سب کچھ ہیں، نتیجتاً حوالوں کی بھرمار میں متن تلاش کرنا اور مفہوم اخذ کرنا بھی دشوار ہوتا گیا، یہ صورت حال آج بھی قائم ہے۔ حوالوں کی اپنی اہمیت ہے

لیکن انہیں متن پر حاوی نہیں ہونا چاہیے، نہ یہ حوالہ جاتی مشق کسی خارجی سبب سے ہونی چاہیے۔اسی رجحان کے نتیجے میں سرقہ بازی بھی شروع ہوئی اور بلاحوالہ بلکہ اصل حوالوں کے ساتھ دوسروں کو کاپی کر لینے کا رجحان بھی سامنے آیا ہے،اوراس سلسلۂ فاسدہ کے نتیجے میں بہت سی کتب سامنے آ چکی ہیں۔

محاضراتِ سیرت:

سیرتی ادب میں برعظیم پاک وہند میں تنوع کا ایک اہم مظہر سیرت کے محاضرات،خطبات یا لیکچرز کی شکل میں سامنے آیا ہے،اس سلسلے کے سب سے پہلے اور ابتدائی خطبات علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خطبات مدراس تھے۔

غالباًاسی عہد میں یا اس سے قبل معروف سیرت نگار علامہ محمد سلیمان منصور پوری کے چار خطبات بھی سیرت کے حوالے سے سامنے آئے، یہ سیدالبشر کے نام سے شائع ہوئے، یہ مختصر کتاب جو 111 صفحات پر مشتمل ہے،اب طارق اکیڈمی فیصل آباد سے اچھے انداز میں شائع ہوئی ہے۔ان خطبات کے عنوانات یہ ہیں:

1۔ پیغمبر اسلام　　2۔ ربیع القلوب فی سیرت المحبوب

3۔ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق　　4۔ سراج منیر

ان کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطبات ہیں جو جنوری 1957ء میں مدارس میں دیئے گئے تھے اور بعد میں سیرت نبوی قرآنی کے نام سے شائع ہوئے اور اس کے بعد مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔

سیرت طیبہ کو قرآن حکیم کی روشنی میں جاننے اور سمجھنے کی یہ پہلی اور اب تک کی سب سے وقیع کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ سات خطبات تھے،جن کے عنوان یہ ہیں:

1۔ ظہور کی پیش بندیاں　　2۔ نام،نسب،وطن،زمانہ

3۔ فضائل،خصائل،مشاغل　　4۔ رسالت وبشریت

5۔ ہجرت　　6۔ غزوات ومحاربات

7۔ معاصرین

سیرت طیبہ پر چند مختصر خطبات ڈاکٹر حمید اللہ کے بھی موجود ہیں، جو خطبات بہاولپور کے علاوہ ہیں، یہ خطبات حیدرآباد دکن میں دیئے گئے تھے۔کافی عرصے کے بعد ان خطبات کا نیا ایڈیشن کتب خانہ سیرت کراچی کے زیر اہتمام سامنے آیا ہے۔

دو برس قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں علامہ سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے اور ڈربن یونیورسٹی ساؤتھ افریقہ کے سابق پروفیسر ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے آٹھ خطبات ہوئے، جو خطبات سیرت کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ان کے عنوانات یہ ہیں:

1۔ اسلام سے قبل عرب کے مذہبی،سماجی اور سیاسی پس منظر کا تجزیہ　　2۔ پہلی وحی اور اس کے اثرات

3۔ قریش کی طرف سے شدید مزاحمت کی وجوہات　　4۔ معراج کی حقیقت واہمیت اور نتائج مجالس عقبہ

5۔ ہجرت مدینہ تاریخ اسلام کا نقطہ انقلاب　　6۔ میثاق مدینہ کی ضرورت اور اس کی اہمیت

7۔ نمایاں غزوات،بدر،احد اور خندق اور ان کے اسباب اور دوررس نتائج　　8۔ صلح حدیبیہ ایک کھلی کامیابی

حال ہی میں ایک اور وقیع کام ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی کے خطبات کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ یہ آٹھ خطبات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف عہد مکی سے تعلق رکھتے ہیں۔اور یہ ''مکی اسوۂ نبوی'' کے نام سے انڈیا سے شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ دو کتابیں اس سلسلے میں اور ہمارے سامنے آتی ہیں۔ایک مولانا سید سلمان ندوی کے خطبات سیرت ہیں، یہ تین خطبے

بنگلور میں دیئے گئے تھے۔ یہ کام اگر چہ ضخیم ہے، مگر بیانیہ نوعیت کا ہے، جس میں پوری سیرت طیبہ کو مرحلہ وار بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب 412 صفحات پر مشتمل ہے، اور زمزم پبلشرز کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

دوسری کتاب تقاریر سیرت ہے، یہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی چند عوامی تقریروں کا مجموعہ ہے، جس کے صفحات 160 ہیں۔ 2002ء میں یہ کتاب ادارۃ القرآن دارالعلوم الاسلامیہ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

سلسلہ محاضرات سیرت کی ایک اہم اور حالیہ کڑی جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات سیرت ہیں، جو انہوں نے 24 جولائی سے 5 اگست 2006ء تک اسلام آباد میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے زیر اہتمام دیئے۔ اُن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

1۔ مطالعۂ سیرت کی ضرورت واہمیت
2۔ سیرت اور علوم سیرت: ایک تعارف
3۔ چند نامور سیرت نگار اور اہم کتب سیرت: ایک جائزہ
4۔ علم سیرت: آغاز، تدوین، ارتقا، توسیع
5۔ سیرت نگاری کے مناہج واسالیب
6۔ ریاستِ مدینہ: دستور اور نظامِ حکومت
7۔ ریاست مدینہ: معاشرت اور معیشت
8۔ کلامیاتِ سیرت
9۔ فقہیاتِ سیرت
10۔ مطالعۂ سیرت، پاک وہند میں
11۔ مطالعۂ سیرت، دورِ جدید میں
12۔ مطالعۂ سیرت، مستقبل کی ممکنہ جہتیں

حقیقت یہ ہے کہ فن سیرت اور علوم سیرت کے حوالے سے یہ محاضرات خاص انفرادیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً فقہیاتِ سیرت اور کلامیاتِ سیرت پر فاضل مقرر کی گفتگو مجتہدانہ بصیرت کی عکاس ہے۔

خلاصہ

اردو سیرت نگاری آج ایک طویل فاصلہ طے کر کرا یک اہم مقام پر کھڑی ہوئی ہے، اس نے اپنے تیسرے دور میں بہت سے اہم سنگ میل عبور کر لئے ہیں، بہت سے اہداف حاصل کر لئے ہیں، البتہ کام کی راہیں آج بھی روشن ہیں، رجال کار کے سامنے آج بھی میدانِ عمل واضح ہے، کیونکہ سیرتِ طیبہ کی وسعتوں کو محدود کیا ہی نہیں جا سکتا، زندگی کا ہر گوشہ نبیٔ رحمت ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی ضیا پاشیوں سے روشن اور سیرت مبارکہ سے منور ہے۔ جب تک نئے نئے مسائل سامنے آتے رہیں گے، سیرت طیبہ ہماری راہنمائی کرتی رہے گی، اور خوش قسمت حضرات بقدر ظرف اپنا دامن بھرتے رہیں گے۔ مگر اہلِ علم کے لئے یہ بھی سو فیصد ضروری ہے کہ وہ سیرت کی جس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کتاب کا علمی مقام کیا ہے؟ میری مراد صرف یہ ہے کہ مطالعہ سیرت میں کتب کے علمی معیارات کو جانچنا بھی بے حد ضروری ہو گیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ القرآن، النساء: 59

2۔ ''اے محمد ﷺ کہہ دو کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔
القرآن، آل عمران: 31

3۔ مولانا مودودی نے اس مفہوم کی وضاحت اپنے مخصوص متکلمانہ انداز میں اس طرح کی ہے''اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے ایک اللہ کا کلام، دوسرے انبیا کی شخصیتیں، جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ اور تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا۔ تا کہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پورا کرنے کے لئے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔
یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ہی لازم وملزوم ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہوسکا اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہوسکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجئے تو وہ ایک کشتی ہے نا خدا کے بغیر جسے لے کر اناڑی مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزل مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے اور نبی کو کتاب سے الگ کر دیجئے تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی نا خدا ہی کو خدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لئے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں حتیٰ کہ آخر کار خود کتابوں کو بھی وہ گم کر بیٹھے۔ عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا اور اس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔
پرانے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمت اسلام میسر آنے کے دو ہی ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آرہے ہیں۔ ایک خدا کا کلام، جواب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے۔ دوسرا اسوہ نبوت جواب صرف محمد ﷺ کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہوسکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد ﷺ سے اور محمد ﷺ کو قرآن سے سمجھے ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا۔ ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔'' سیرت سرور عالم ﷺ''، ج 1، ص 35

4۔ القرآن، الاحزاب: 4

5۔ القرآن، النساء: 80,64

6۔ ابن منظور، الافریقی المصری، ''لسان العرب''نشر ادب الحوزۃ، ایران 1985ء، ج 4، ص 89-390

7۔ الزبیدی، محمد مرتضیٰ، السید، تاج العروس، منشورات دار مکتبہ بیروت، لبنان، ج 3، ص 86-287

8۔ لوئس معلوف، ''المنجد فی اللغۃ''، المطبعۃ الکاثولیکیہ، بیروت، 1937ء، ص 378

9۔ الزمخشری، جاراللہ محمود بن عمر، ''اساس البلاغۃ''، طبع القاھرۃ، 1382ھ، ص 226

10۔ الفیروزآبادی، محمد بن یعقوب، ''القاموس المحیط''، دار المعرفۃ بیروت، ج 2، ص 54

11۔ عبدالحفیظ مولانا، ''مصباح اللغات'' قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی 1950ء، ص 387، فیروز اللغات، ص 785

12۔ فاضل لکھنوی مرتضیٰ حسین سید، ''نسیم اللغات''، (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1984ء، ص 600

13۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، ''فکر و نظر''، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ اپریل 1976ء، ص 826

14۔ القرآن، سورۃ النمل: 69

15۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، ''کاروان قمر'' قمر الاسلام سلیمانیہ، کراچی 2003ء، ص 14

16۔ محمد قاسم، سید، ''اسلامی شاہکار''، اردو انسائیکلوپیڈیا، الفیصل مارکیٹ، اردو بازار لاہور طبع 2001ء، ص 944
17۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، دانش گاہ پنجاب لاہور 1975ء، ج 11، ص 505
18۔ محمد علی الفاروقی: ''کشاف اصطلاحات الفنون''، طبع کلکتہ، ص 663
19۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر: ''کاروان قمر''، طبع 2003ء، ص 15
20۔ محمد طاہر پٹنی، شیخ: ''مجمع بحار الانوار''، طبع پٹنہ، ج 2، ص 165
21۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''سیرۃ النبی ﷺ''، ج 1، ص 8
22۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''فن سیرت نگاری پر ایک نظر''، فکر ونظر، اپریل 1976ء
23۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، ج 11، ص 506
24۔ محمد علی الفاروقی: ''کشاف اصطلاحات الفنون''، ص 663
25۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی: ''عجالہ نافعہ مع شرح فوائد جامعہ''، از مولانا عبدالحلیم چشتی، ص 48
26۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، مقالہ ''سیرت''، ج 11، ص 505
27۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، 1975ء، ج 11، ص 505
28۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر: ''فن سیرت نگاری پر ایک نظر''، فکر ونظر، ص 826
29۔ محبوب حسن، واسطی، سید، ''سیرت کیا ہے؟''، ششماہی السیرۃ العالمی، کراچی شمارہ جون 1999ء
30۔ محمد الفاروقی: ''کشاف اصطلاحات الفنون''، طبع کلکتہ
31۔ ایضاً
32۔ محبوب حسن، واسطی، سید، ''سیرت کیا ہے؟''
33۔ ایضاً
34۔ ایضاً
35۔ شبلی نعمانی، مولانا: ''سیرت النبی''، مقدمہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ستمبر 1981ء، حاشیہ، ج 1، ص 8
36۔ جوزف ہورووتس: ''سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین''، مترجمہ نثار احمد فاروقی، ص 11
37۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''فن سیرت نگاری پر ایک نظر''، ص 826
38۔ ایضاً
39۔ القرآن، الطور: 10
40۔ القرآن، الروم: 11
41۔ القرآن، القصص: 29
42۔ القرآن، طٰہٰ: 21
43۔ مودودی، ابو الاعلیٰ، سید: ''تفہیم القرآن''، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، 1981ء، ج 3، ص 91
44۔ الف، ی، ونسنک، ڈاکٹر: ''المعجم المفہرس الالفاظ الحدیث النبوی المغازی''، مکتبہ بریل، لندن 1955، ج 3، ص 47
45۔ احمد بن حنبل، امام: ''مسند احمد بن حنبل''، مکتبہ اسلامی، بیروت 1398ھ، ج 1، ص 128
46۔ احمد بن حنبل، امام: ''مسند احمد بن حنبل''، ج 1، ص 128
47۔ احمد بن حنبل، امام: ''المسند''، ج 1، ص 28

48۔ محمد الفاروقی، ''کشاف اصطلاحات الفنون''، طبع کلکتہ، ص 663

49۔ جی لیوی ڈیلاویڈا، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لندن، ج 4، ص 349

50۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر: ''کاروان قمر''، 2003ء، ص

51۔ ایضاً، ص

52۔ ہاشمی، عبدالقدوس، ''کمال انسانیت''، فکرونظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ اپریل 1975ء، ص 576

53۔ القرآن، الاحزاب: 21

54۔ القرآن، فتح: 28

55۔ القرآن، اعراف: 108

56۔ القرآن، النجم: 2,3

57۔ القرآن، آل عمران: 124

58۔ القرآن، انبیاء: 108

59۔ القرآن، الحشر: 8

60۔ القرآن، احزاب: 81

61۔ القرآن، انفال: 20

62۔ القرآن، نور: 56

63۔ مارسڈن، جونس، ڈاکٹر: ''کتاب المغازی''، ج 1، ص 20-19

64۔ داناپوری، حکیم ابوالبرکات عبدالروف: ''اصح السیر''، نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی، 1957ء

65۔ ایضاً

66۔ ایضاً

67۔ شبلی نعمانی: ''سیرۃ النبی''، دارالاشاعت کراچی، 1985ء، ج 1

68۔ خالد انور محمد، اردو نثر میں ''سیرت رسول''، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، 1989ء

69۔ القرآن، الطلاق: 11-10

70۔ سباعی مصطفیٰ: ''سیرت نبوی''، مترجم مزمل حسین فلاحی، القمر انٹر پرائز لاہور، 1989ء

71۔ ایضاً

72۔ ایضاً

73۔ محمد ابن ہشام: ''سیرت ابن ہشام''، ج 1، ص 155-151

74۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی: ''مختصر سیرۃ الرسول ﷺ''، ص 12

75۔ صفی الرحمن، مبارکپوری: ''الرحیق المختوم''، ص 80

76۔ شبلی نعمانی: ''سیرت النبی''، مقدمہ، ذیل حاشیہ، ج 1، ص 8

77۔ حکیم ابوالبرکات عبدالروف داناپوری: ''اصح السیر''، مقدمہ، ج 1، ص 8

78۔ شبلی نعمانی: ''سیرت النبی''، ذیل حاشیہ، ج اول، ص 38,39

79۔ القرآن، نور: 16

80۔ شبلی نعمانی: ''سیرت النبی''، مقدمہ، حاشیہ ج 1، ص 41,42
81۔ ایضاً، ص 83,84 / دائرہ معارف اسلامیہ، ج 14، ص 176,175 / ڈاکٹر سید عبداللہ، مقالہ: ''علم سیرۃ''
82۔ حکیم ابوالبرکات دانا پوری: ''اصح السیر''، ج 1، ص 11 مقدمہ
83۔ شبلی نعمانی، علامہ: ''سیرت النبی ﷺ''، مکتبہ مدینہ، صفر 1408ھ، ج 1، ص 25
84۔ ابن ندیم، طبع مصر، ص 17
85۔ فتوح البلدان، ذکر خط، مطبوعہ یورپ، ص 471
86۔ محمد بن سعد: ''طبقات ابن سعد''، غزوہ بدر، ص 14
87۔ ایضاً، ص 15
88۔ شبلی نعمانی، علامہ: ''سیرت النبی ﷺ''، ج 1، ص 26
89۔ ابو داؤد: ''سنن ابی داؤد''، ج 2، ص 77
90۔ ابن عبدالبر: ''جامع البیان العلم''، مطبوعہ مصر، ص 77
91۔ شبلی نعمانی، علامہ: ''سیرت النبی ﷺ''، ج 1، ص 27
92۔ محمد بن اسماعیل: ''الجامع الصحیح''، صحیفہ علی و کتابۃ الرجل من الیمن، ج 1، ص 21,22
93۔ ایضاً، ج 1، ص 15
94۔ محمد طفیل: ''نقوش، رسول نمبر''، ادارہ فروغ اردو، لاہور، شمارہ 130، دسمبر 1982ء، ج 1، ص 710,711
95۔ ایضاً، ص 711,712
96۔ ''فتح القدیر''، ج 4، ص 277
97۔ ابن حجر العسقلانی: ''فتح الباری''، بیروت، دار المعرفہ، ج 7، ص 279
98۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: ''فن سیرت نگاری پر ایک نظر''، فکر و نظر، اسلام آباد، اپریل 1976ء
99۔ ایضاً
100۔ ایضاً
101۔ القرآن، طٰہٰ: 21
102۔ اطہر مبارک پوری، قاضی: ''آثار و اخبار''، ج 1، ص 50
103۔ العسقلانی، ابن حجر: ''تہذیب التہذیب''، بیروت، دار الفکر، 1984ء، ج 10، ص 322
104۔ ذہبی، محمد بن احمد، ابوعبداللہ (م 748ھ): ''سیر اعلام النبلاء''، بیروت، موسسۃ الرسالۃ، 1413ھ، ج 7، ص 437
☆ یوسف بن زکی، عبدالرحمٰن ابوالحجاج المزی (م 742ھ): ''تہذیب الکمال''، بیروت، موسسۃ الرسالہ، 1980ء، ج 29، ص 326
☆ ''الجرح والتعدیل''، ج 10، ص 361
105۔ البغدادی، احمد بن علی ابوبکر الخطیب (م 463ھ): ''تاریخ البغداد''، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ج 13، ص 427
106۔ محمد بن سعد: ''الطبقات الکبریٰ''، بیروت، دار المعرفہ، ج 2، ص 368
107۔ برہان الدین حلبی: ''سیرت حلبی''، بیروت، دار المعارف، ج 1، ص 1
108۔ ''الطبقات''، ج 28، ص 360
109۔ ''تدوین سیر و مغازی''، ص 79

110۔ ''تہذیب التہذیب''، ج7، ص266

111۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، ''محاضرات سیرت''، الفیصل، لاہور، 2007ء، ص630

112۔ عینی، بدرالدین محمود بن احمد، ''عمدۃ القاری'' شرح بخاری، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، ج20، ص69,70

113۔ الذہبی، شمس الدین محمد بن احمد الکاشف، ''مؤسسۃ علوم القرآن'' جدہ، 1413ھ، ج9، ص455

114۔ ایضاً، ص469

115۔ ڈاکٹر انور محمود خالد، ''اردو نثر میں سیرت رسول''، ص244

116۔ ایضاً، ص27

117۔ شاہ احمد سعید دہلوی، ''سعید البیان فی سید الانس والجان''، خواجہ پرنٹرز، کراچی، ص5

118۔ ''محاضرات سیرت''، ص634

119۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی خدمات کے حوالے سے ماہنامہ دعوۃ، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ڈاکٹر حمید اللہ نمبر اور السیرۃ کے شمارہ 10 میں ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مضامین اور سہ ماہی فکر ونظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ڈاکٹر حمید اللہ نمبر کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

120۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر حمید اللہ کی سیرت نگاری''، ایک جائزہ، ششماہی السیرہ عالمی شمارہ 10، ص325

121۔ اس کتاب کا نیا ایڈیشن اب شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد سے قانون بین الممالک کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

122۔ عبدالقادر جیلانی، ڈاکٹر، ''مقالہ، اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر''، ناشر بیت الحکمت، لاہور، تقسیم کار کتاب سرائے اردو بازار، لاہور

123۔ السیرۃ عالمی، ششماہی، شمارہ نمبر 18، رمضان المبارک 1428ھ، ستمبر 2007ء، ص292 تا 294

﴿...... باب دوم ......﴾

مستشرقین اور سیرت نگاری

باب دوم

مستشرقین اور سیرت نگاری

فصل اول: تحریک استشراق

فصل دوم: استشراق کی تاریخ

فصل سوم: برصغیر میں تحریک استشراق

فصل چہارم: مستشرقین اور اُن کی تصانیف

فصل اول

تحریک استشراق

مستشرقین کا لغوی معنی تو شرق شناسی یا مغربی علوم وفنون اور ادبیات میں مہارت حاصل کرنے والے لوگ ہیں اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہوتے ہیں لیکن مستشرقین کی اصلاحی اور ایک جامع تعریف یوں کی گئی ہے۔ اہل مغرب بالعموم اور یہود ونصاریٰ بالخصوص، جو شرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب و تمدن، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات، وسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تہذیب کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر اُن کر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کر سکیں۔ اور اُن پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے اُن کے وسائل حیات کا استعمال کر سکیں۔ اُن کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے وہ لوگ منسلک ہیں اُنہیں تحریک استشراق کہا جاتا ہے۔ اہل کتاب کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کاروائیاں تو اس وقت سے شروع ہوگئی تھیں جب اسلام اس دنیا پر طلوع ہوا تھا۔ اس وقت سے وہ اسلام اور مسلمانوں پر مختلف جہتوں سے حملوں کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ لیکن استشراق مسلمانوں کے خلاف یہود ونصاریٰ کی ''قلمی جنگ'' کا نام ہے۔ یہ ذرہ بعد میں شروع ہوئی۔

استشراق لغوی مفہوم:

استشراق کی جو تعریف عام طور پر مشہور ہے وہ یہ ہے۔

''غیر شرقی لوگوں کا شرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہونے کا نام استشراق ہے۔'' (1)

اس تعریف کی رو سے جو غیر شرقی عالم، شرقی علوم کیلئے اپنے آپ کو وقف کرے گا اسے مستشرق کہا جائے گا۔

آکسفورڈ کی جدید ڈکشنری میں مستشرق کی جو تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے۔

''مستشرق وہ ہے جو شرقی علوم وآداب میں مہارت حاصل کرے۔'' (2)

المنجد میں مستشرق کا مفہوم یہ بتا گیا ہے:

''العالم باللغات و الاداب والعلوم الشرقية و الاسم الاستشراق''. (3)

یعنی شرقی زبانوں، آداب اور علوم کے عالم کو مستشرق کہا جاتا ہے اور اس علم کا نام استشراق ہے۔

ان تعریفوں میں سے کوئی تعریف بھی ایسی نہیں جو صدیوں سے موجود، استشراق کی فعال اور متحرک تحریک کے مقاصد اور عملی پہلوؤں پر صحیح روشنی ڈالتی ہو۔

شرق کا لفظ بذات خود وضاحت طلب ہے۔ شرق ومغرب کے مفہوم میں تبدیلیاں بھی واقع ہوتی رہی ہیں۔ قرون وسطیٰ بلکہ ازمنہ قدیمہ میں بحیرہ روم کو دنیا کا مرکز قرار دیا جاتا تھا اور جہتوں کا تعین اسی کے حساب سے ہوتا تھا۔ اس کے شرقی اطراف میں واقع علاقوں کو شرق اور اس کے مغرب میں واقع علاقوں کو مغرب سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اگر ہم شرق ومغرب کے اس مفہوم کو تسلیم کر لیں تو بھی بات واضح نہیں ہوتی اور نہ ہی شرق کے اس مفہوم کی رو سے مستشرق کی مندرجہ بالا تعریف جامع ومانع رہتی ہے۔

شرق کی اس تعریف کی رو سے حضرت عیسیٰ اور دین مسیح کا تعلق شرق سے ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں جو مغرب عالم حضرت عیسیٰ کی زبان آپ کی سیرت، آپ کے مذہب اور دیگر مسائل کے مطالعہ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے۔ اسے مستشرق کا لقب دیا جانا چاہیے۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہے۔

بائبل کے دونوں حصوں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید جتنے واقعات اور حالات کا بیان ہے ان میں سے اکثر کا تعلق شرق سے ہے۔ لیکن بائبل کے علوم کے ماہر کو کوئی بھی مستشرق نہیں کہتا۔ یہ ایک حیران کن حقیقت ہے کہ وہ علمی مصادر میں مستشرقین مساعی کا نتیجہ ہیں۔ وہ یا تو اس تحریک کے بارے میں کلیتہً خاموش ہیں اور اگر وہاں (Orientalism) یا (Orientalist) کا کوئی ذکر ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی ناکافی اور باہم مختلف ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جس طرح مستشرقین اپنے مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی حکمت عملی پر کاربند ہیں اسی طرح وہ اپنے نام کی بھی تشہیر نہیں چاہتے۔ یہ تحریک صدیوں مصروف عمل رہی لیکن اس تحریک کا کوئی باضابطہ نام نہ تھا۔ اربری کہتا ہے کہ "Orientalist" کا لفظ پہلی مرتبہ 1630ء میں شرقی یا یونانی کیسا کے ایک پادری کے لئے استعمال ہوا۔ (4)

روڈسن کہتا ہے کہ "Orientalism" یعنی استشراق کا لفظ انگریزی زبان میں 1779ء میں داخل ہوا اور فرانس کی کلاسیکی لغت میں استشراق کے لفظ کا اندراج 1838ء میں ہوا۔ حالانکہ عملی طور پر تحریک استشراق اس سے کئی صدیاں پہلے وجود میں آچکی تھی اور پورے زور وشور سے مصروف عمل تھی۔ (5)

جن لوگوں نے تحریک استشراق کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے اغراض ومقاصد، ان کی تاریخ اور ان کے علمی کارناموں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مستشرقین کے مختلف نظریات اور مساعی کے پیش نظر استشراق کی کچھ تعریفیں کی ہیں۔

ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب نے اپنی کتاب ''رویۃ اسلامیۃ للاستشراق'' میں کچھ تعریفیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چند ایک پیش خدمت ہیں۔

1۔ استشراق مغربی اسلوب فکر کا نام ہے۔ جس کی بنیاد شرق ومغرب کی نسلی تقسیم کے نظریہ پر قائم ہے۔ جس کی رو سے اہل مغرب کو اہل شرق پر نسلی اور ثقافتی برتری حاصل ہے۔ (6)

یہ تعریف گو ہر مستشرق کی ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے لیکن اس تعریف کی رو سے اگر دیکھا جائے تو آج سارا یورپ اور امریکہ مستشرق کہلائے گا۔ کیونکہ جب سے مغرب نے صنعتی اور عسکری میدان میں ترقی کی ہے اور ایک عرصہ انہوں نے اہل شرق کو زیر نگیں رکھا ہے اس وقت سے سارا مغرب اسی انداز میں سوچتا ہے۔ اس صورت میں یہ تعریف استشراق کی تحریک کو سمجھنے کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔

2۔ استعماری مغربی ممالک کے علماء اپنی نسلی برتری کے نظریے کی بنیاد پر، شرق پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اس کی تاریخ، تہذیبوں، ادیان، زبانوں، سیاسی اور اجتماعی نظاموں، ذخائر دولت اور امکانات کا جو تحقیقی مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے بھیس میں کرتے ہیں اسے استشراق کہا جاتا ہے۔

3۔ استشراق اس مغربی اسلوب کا نام ہے جس کا مقصد مشرق پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اس کی فکری اور سیاسی تشکیل نو کرنا ہے۔ (7)

آخری دونوں تعریفیں گو مستشرقین کے استعماری اور استحصالی ارادوں کا پتہ دیتی ہیں لیکن ان کے سینوں میں چھپی ہوئی اس حقیقی خواہش کی طرف اشارہ نہیں کرتیں جس کا پردہ ہمارے علیم وخبیر رب نے صدیوں پہلے چاک کر دیا تھا۔

''ودت طائفة من اهل الكتب لو يضلونكم وما يضلون الاانفسهم وما يشعرون''(8)

''دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کردیں تمہیں۔ اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔''

ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب نے مندرجہ بالا تعریفیں معتبرہ ذکر کرنے کے بعد استشراق کی جو تعریف خود کی ہے وہ یہ ہے:

''مغربی اہل کتاب، مسیحی مغرب کی اسلامی شرق پر نسلی اور ثقافتی برتری کے زعم کی بنیاد پر، مسلمانوں پر اہل مغرب کا تسلط قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں گمراہی اور شک میں مبتلا کرنے اور اسلام کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کی غرض سے،

مسلمانوں کے عقیدہ، ثقافت، شریعت، تاریخ، نظام اور وسائل وامکانات کو جو مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے دعوے کے ساتھ کرتے ہیں اسے استشراق کہا جاتا ہے۔''(9)

یہ تعریف گو مستشرقین کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں عزائم کا پردہ چاک کرتی ہے۔لیکن اس تعریف میں ایک تو شرق کے لفظ کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق ہے کیونکہ اسی کی بنیاد پر مستشرقین کو مستشرقین کہا جاتا ہے۔اس تعریف میں دوسری خامی یہ ہے کہ اس کی رو سے تمام مستشرقین ایک ہی زمرے میں شمار ہو جاتے ہیں۔حالانکہ مستشرقین کو بڑی آسانی سے کئی گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس تعریف میں تیسری خامی یہ ہے کہ جو مستشرقین اسلام کے علاوہ دیگر شرقی علوم اور تہذیبوں کے میدان میں مصروف عمل ہیں وہ مستشرقین کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں حالانکہ معروف معنوں میں وہ مستشرق ہیں۔

مستشرقین اور استشراق کی صحیح تعریف کرنے کے لئے لفظ ''شرق'' کا وہ مفہوم بڑا معاون ثابت ہوسکتا ہے جو رودی بارت نے بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد ابراہیم الفیومی رودی بارت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مستشرقین کے عرف میں لفظ ''شرق'' کا جغرافیائی مفہوم مراد نہیں بلکہ ان کے ہاں شرق سے مراد زمین کے وہ خطے ہیں جن پر اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔(10)

گویا مستشرقین کے نزدیک لفظ شرق سے مراد اسلامی ممالک ہیں اور دنیائے اسلام کو وہ شرق کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

شرق کے اس مفہوم کے تحت، مستشرقین کی عملی جدوجہد جن خفیہ مقاصد کی غمازی کرتی ہے اور جن کا اظہار کبھی کبھی بعض مستشرقین کی طرف سے ہوتا بھی رہتا ہے ان کو اور مستشرقین کے بے شمار علمی کارناموں اور ان کے مختلف طبقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستشرقین کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔

اہل مغرب بالعموم اور یہود و نصاریٰ بالخصوص، جو شرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب و تمدن، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات، وسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کرسکیں اور ان پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے ان کے وسائل حیات کا استحصال کرسکیں۔ ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے وہ لوگ منسلک ہیں وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے۔

تحریک استشراق:

استشراق اور صاحبان استشراق (مستشرقین) کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک استشراق، اپنی حقیقت و ماہیت میں چونکہ اسلام کے خلاف ہے اور ہر دور کے (غیر مسلم) مستشرقین کی تمام سرگرمیاں اپنے علمی تنوع کے باوجود، چونکہ اسلام، پیغمبر اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون کے حوالہ سے بہر حال معاندانہ رہی ہیں اور چونکہ مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد اپنی اصل و نسل میں یہودی ہیں یا عیسائی، اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسلام اور یہودیت و عیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ وفکر کی نمو ہوگئی تھی۔تاہم اپنے مخصوص فنی و اصطلاحی معنوں میں اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز مستشرقین کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ:

1۔ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں بلکہ انگریزی زبان وادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورہ بالا دونوں الفاظ اورینٹ سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں شرق یا شرقی سمت، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔پھر اسی سے اورینٹل ہے یعنی مشرقی، جو تمام معنوں میں مغربی (Occidental) کا ضد ہے۔مشرقی کے مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو شرق یعنی، ایشیا یا ان ممالک کا

باشندہ ہو جو بحر روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں۔ جب کہ اورینٹلزم یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرز و ادا، اقدار، علوم و آداب اور فنون و ثقافت وغیرہ سے واقفیت اور مہارت وغیرہ نیز اس کے تحت اورینٹل اسکالرشپ کا مطلب ہوگا۔ مشرقی زبانوں سے واقفیت اور پھر اس سے بنا ہے اورینٹلسٹ (مستشرق) اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں و علوم و فنون اور تہذیب و تمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو۔ (11)

عربی، فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش، ر، ق، تو موجود ہے لیکن زیر بحث الفاظ یعنی باب استفعال میں اس کے معنی و مفہوم یا بطور فعل ان لغات سے بحث نہیں پائی جاتی (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے) عربی قواعد کی رو سے استشراق، ثلاثی مزید کا باب استفعال ہے۔ جس کا مادہ ش، ر، ق (شرق) ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کا جملہ خصائص و لوازم یعنی اتخاذ و طلب، وجدان و حسبان اور تحول و تکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی، صاحبانِ استشراق کے احوال و شخصیات سے اور ان کی تحقیقات و تخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ گویا الفاظ کا پیکر، بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا تمام تر علم اکتسابی ہے جسے انہوں نے بڑی محنت و ریاضت سے طلب و جستجو کر کے حاصل کیا۔ اس کی خاطر سفر حضر، تمکن و توطن اختیار کیا اور پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان میں تخمین و ظن تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ عربی میں استشراق کے لغوی معنی ہوں گے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کا مطلب ہوگا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا ہوا اردو لغت و ادب میں بھی کم و بیش یہی مفہوم ہے یعنی مستشرق کا مطلب ہوگا وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو یا وہ فرنگی یا امریکی جو مشرقی زبان یا علوم کا ماہر ہو۔ (12)

زبان و لغت کی مندرجہ بالا بحث سے استشراق اور مستشرق کا مفہوم اگرچہ کسی قدر واضح ہو جاتا ہے اور مستشرق کی نوعیت و ماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جا سکتی ہے۔ تاہم استشراق کی اصل حقیقت اس اس وقت سامنے آئی جب کہ استشراق، السنہ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم و آداب کے یک رخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے بغض و عناد، اس کا جز و لازم ٹھہرا، پھر یہی بغض و عناد، پہلے پہل تو مشنری جذباتیت کا آئینہ دار رہا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے متعین مقاصد کے تحت علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا، گویا اس دوسرے مرحلہ میں استشراق نے ایک تحریک، ایک مستقل رویہ اور سلوک کی شکل اختیار کر لی اور اسی رویہ و سلوک کے احاطہ میں رہتے ہوئے تمام ضروری مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا۔ مثلاً اسلام اور اس کی تعلیمات کو مجبوراً تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ کے عہد بہ عہد ارتقاء کے ساتھ وہ تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں۔ قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تا کہ یہ تہذیبیں، اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے چیلنج بن سکیں۔ عربی زبان کے لئے کہا گیا کہ قرآنی عربی، عہد جدید کی ضروریات و حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے مقامی زبانیں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہیے بلکہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط سے تبدیل کر دینا چاہیے۔

پیغمبرِ اسلام کی سیرت و کردار کے بارہ میں ان نکات کو اچھالا گیا، جن سے عام ذہن کے لوگ بھی اچھا تاثر نہ پا سکیں اور ان کے لائے ہوئے مشن کو ناقابلِ التفات گردانا جائے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعمیر و ترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی ثابت کی جائے تا کہ اسلامی ثقافت مجموعہ خرافات ٹھہرے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مطالعات کا ہدف بہر حال مستشرقین کے نزدیک اپنے عزائم کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمتِ عملی تبدیل ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت، علمیت اور استدلال کے اوزان و پیمانے استعمال کرنے لگے۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے متعلق اپنے رویہ پر خود انہوں نے نظر ثانی کی اور بددیانتی کے باوجود مخالفت و مخاصمت کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقہ سے کیا جانے لگا اور اسلام کے مقابلہ میں تعصب و ظلم کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا۔

مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہا اسی لئے ان کے ہاں علم، تجربہ، انداز استدلال، مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے فکر وفن اور تحقیق وتالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔ لیکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو، اس لئے اس اجمال کی کچھ تفصیل، آئندہ صفحات میں عرض کی جائے گی۔ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق وجذبہ وفکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا اور مطالعہ وتحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ وسلوک کیا رہا۔

تحریک استشراق کا آغاز:

تحریک استشراق کو اگر خلاف اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز دراصل ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام کے خلاف بالخصوص، بغض وعداوت کا اظہار موقع بہ موقع، تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور وفور جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر وتصنیف اور وقائع و اشعار کے قالب میں ڈھلتی رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایہ افتخار قرار پائیں۔ چنانچہ ظہور اسلام کو بعد سے کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور داعی اسلام کے حوالہ سے ان کی مخالفت ومخاصمت کا عام انداز یہی رہا، اور اس تمام عرصہ میں، بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق وواقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ وثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے۔ اس صورت حال کا ایک بظاہر سبب ان کے دلی جذبات کے علاوہ یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لئے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی۔ پھر تعصب، سنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انہیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں۔ اس پر مستزاد تصادم، کشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دہرائے گئے۔ خاص طور پر آنے والے زمانہ میں، صلیبی محاربات کا سلسلہ دشمنی وعداوت کا ایسا نشان پر طاری ہوا جو آج تک نہیں اترا۔ صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہو گئی بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی وفکری محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے۔ اس کی تدبیر اس سے بہتر کوئی اور نہ تھی کہ اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لئے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا۔ پھر لاطینی آبادکار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم ومعلومات رکھتے تھے وہ کتنی ہی ناکارہ وخام سہی، ان کے لئے بہرحال مفید مطلب تھیں جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز اور بھیانک تصویر پیش کی جا سکتی تھی، اور سیرت ختم الرسول ﷺ کو افراط وتفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی، پیغمبر اسلام کے بارہ میں مغرب کے پاس معلومات، انتہائی مبہم اور ناقص تھیں اور اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پر کیا گیا۔ اس افسانوی مواد کے بھی 2 حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرت ﷺ کے واقعات سیرت کو پیکر خیال میں پیش کیا گیا، اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی اصل اور حقیقت نہ تھی بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد واختراع اور کذب وافتراء سے عبارت تھا۔ اس عہد میں آنحضرت ﷺ کے لئے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے گئے، مثلاً (نقل کفر، کفر نہ باشد) آپ ﷺ کو نبی کاذب، مخالف مسیح، موجد مذہب نو اور بہروپیا کہا گیا اور ہر عداوت اس حد تک گر گئے کہ آپ ﷺ کے لئے لفظ محمد ﷺ استعمال کرنے کے بجائے (Mahomd) سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی ہیں "شہزادہ ظلمات" پھر جب صلیبی جنگوں کی ناکامی نے ان کی آتش عداوت اور بھڑکا دی تو وہ حضور ﷺ کے لئے Baphomet, Maphomet اور Bapum کے الفاظ استعمال کرنے لگے اور آپ ﷺ کی سیرت وسوانح کے بارہ میں مہمل کہانیاں، دیومالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں۔ ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بت پرست تھے اور ان کا مرکز پرستش، محمد ﷺ کا بت تھا۔ پھر ایک سے زائد

بتوں کی پرستش کا فسانہ تراشا گیا اور یہ انکشاف کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ تو دراصل خود پیروِ دینِ عیسوی تھے لیکن پوپ منتخب نہ ہو سکے تو انتقاماً رومی چرچ سے بغاوت کر کے اسلام ایجاد کیا۔ وحی و تنزیل کے حوالہ سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمد ﷺ نے ایک سفید کبوتر، فاختہ یا قمری کو سدھار رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا، ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیالات میں آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔(13)

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علماء و مستشرقین، صدیوں کسی شدید ناواقفیت کا شکار رہے کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علماء سیرت وسوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

اس قسم کی تصویر کشی میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا جن میں سے سب سے زیادہ قابلِ ذکر جان آف دمشق ہے۔ جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کو بے دین اور جھوٹا قرار دیا۔ اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمد ﷺ کی پوجا کی جاتی تھی۔ نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا، جس نے حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کر دی۔ اس نے حضور ﷺ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی، اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی۔ جان کے بعد آنے والے قرونِ وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویرِ رسول ﷺ کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات واتہامات عائد اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم و بیش یکساں تھے۔ اسی لئے جب بھی انہوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسول ﷺ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پیش کیا۔ اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہلِ مغرب آنحضرت ﷺ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار اور شیطان کا چیلا قرار دیتے رہے کہ اتنے میں صلیبی جنگوں کو طویل سلسلہ نو جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہو گئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ میدانِ جنگ میں رسد، کمک اور سامانِ جنگ کی فراوانی کے باوجود مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انہوں نے کمال عیاری سے اسباب و وسائل اور تدبیر و حکمتِ عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لئے نیا ترکش، نئے تیر استعمال جائیں اور ''گرم جنگ نہ سہی'' سرد جنگ میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں علم و تحقیق کی معنوی اسلحہ سے لڑی جائے۔ شاید اسی لئے رائمنڈلل (Raymondlull) نے اہلِ مغرب کو سب سے پہلے شرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ایک پُرامن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں''۔(14)

اس سلسلہ میں اہلِ مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے شرق و غرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گذشتہ کئی صدیوں میں، اسلام، پیغمبرِ اسلام اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزامات واتہامات اور تشکیک و تذبذب کے بیج بو کر خرافات کا ایسا جنگل اگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا۔ برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا۔ دوسری طرف انہیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم و فن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے اس کے سبب یونانی علوم و فنون کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، اور یوں ان کے آباء اجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں علوم و فنون

اور آداب ومعارف کے اسلامی مراکز سے اخذ واستفادہ کے لئے اور اندلس وصقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمع عرفان وحقیقت کی روشنی سے آپ کو منور کرنے کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم وفنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھے۔ چنانچہ سولہویں صدی عیسوی میں بالآخر وہ مرحلہ آ گیا جب کہ ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا۔ سب نے مل کر اسلام کو اپنا واحد مشترکہ دشمن قرار دیا اور ایک متحدہ رومی کیتھولک چرچ کی بنیاد رکھی گئی اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی، یہودی، راہب، پادری، قصہ گو، مناظر، شاعر وغیرہ ڈٹے ہوئے تھے، اب ان کی جگہ مغربی دنیا کے وہ عقلاء وفضلاء لیں گے جو کلاہ علم سے آراستہ ہوں گے اور درس وتدریس کی مسندوں پر فائز ہو کر داد تحقیق دیں گے تاکہ ادھران کے ان دیکھے جذبات نفرت وعداوت بھی تسکین پائیں اور ادھر علم وتحقیق کے حوالہ سے ان کا رعب ودبدبہ قائم ہو جائے۔ چنانچہ یہی ضرورتیں گیام پوسٹل کو (G. Postal) کو سامنے لائیں جو عام طور پر مستشرقین یورپ کا باوا آدم شمار ہوتا ہے، وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور بطور خاص لغت ولسانیات کے حوالہ سے اہم خدمات انجام دیں۔ پوسٹل ہی کے لئے 1539ء میں کالج فرانس قائم کیا گیا اور وہ عربی کی پہلی کرسی صدارت پر فائز ہوا۔ گیام پوسٹل کے کام کو لغت ولسانیات کے ہی حوالہ سے اس کے لائق وفائق شاگرد جوزف اس کالیجر نے آگے بڑھایا۔ بہر حال کم وبیش پینتالیس سال کی تیاری کے بعد 1586ء میں عربی مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا جس کا سہرا بڑی حد تک ڈیوک آف اسکانی کے سر ہے۔ (15)

اوپر کی تفصیل سے 2 باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں یعنی:

1۔ یہ کہ سولہویں صدی عیسوی کو ہم باقاعدہ طور پر تحریک استشراق کا آغاز قرار دے سکتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب کہ مستشرقین یورپ نے کام کا مربوط ومنظم نقشہ مرتب کیا۔

2۔ اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور عیسائی پس منظر میں ہوئی جس کا اثر تاریخ مابعد پر جاری وساری رہا، کیونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ (کلیسا) کا پروردہ تھا۔

تحریک استشراق کے حوالہ سے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ تحریک کے ارتقاء اس کے پھلنے پھولنے کا عہد ثابت ہوا۔ جہاں تک سترہویں صدی عیسوی کا تعلق ہے۔ بقول مولانا شبلیؒ یہ صدی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے اور یورپ کی جد وجہد، سعی وکوشش اور حریت وآزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے۔ پھر یہ عروج استعمار کی صدی ہے جس کے پنجہ استبداد میں رفتہ رفتہ عالم اسلام آتا چلا گیا۔ یورپی شہزادوں کی سرپرستی میں اسلامی مطبوعات کے ابرہ میں معلومات جمع کی جانے لگیں۔ عربی زبان کی ماہیت وخاصیت کو سمجھنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ارپی نیس (Erpenius, 1584-1626) نے پہلی عربی کی قواعد شائع کی، جو لغوی اصولوں پر مرتب کی گئی تھی۔ پھر اس کے اتباع میں اس کے شاگرد جیکب جولیس (Jacob Golius, 1595-1667) پہلا انگریز مستشرق تھا جسے آکسفورڈ میں شعبہ عربی کا صدر نشین بنایا گیا۔ مزید برآں عربی زبان کی قواعد اور لغت کی ترتیب کا کام آسٹریا کے میرنسکی (Meurnski) نے بھی 1680ء میں انجام دیا۔ اس کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب وتمدن کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے لئے ایک ادارہ ڈی ہربیلوٹ (D. Herbelot) کی سرکردگی میں قائم کیا گیا۔ اس ادارہ نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس وقت تک جس قدر بھی مشرقی علوم پر کتابیں شائع ہوئی تھیں ان کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے شائع کر دی جو پُراز معلومات تھی۔ اسی ادارہ کے تحت آنحضرت ﷺ پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا۔

سترہویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ سُنے سُنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخِ اسلام و سیرتِ پیغمبر کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی۔ گو موقع بہ موقع معلومات کے سابقہ سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ اسی صدی میں مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا ان کے ماخذ کے بدل جانے میں مضمر تھی، ازمنہ وسطیٰ کے روایتی لاطینی اور بازنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی اور انہوں نے اس تضاد کو بھی سمجھ لیا جا سیاحوں کے سفرناموں کے اندراجات، ان کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا تھا۔ اس عہد میں بھی حسب سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں۔

1۔ ولیم بیڈول (W. bedwell) انگریز مستشرق تھا۔ جس کا زمانہ 1561ء تا 1632ء ہے۔ اس کے آثار و باقیات میں دو کتابیں قابل ذکر ہیں ایک عربی لغت جو سات جلدوں میں ہے اور 1610ء سے پہلے شائع ہوئی، اور دوسرے سیرت رسول ﷺ پر کتاب جو لندن سے 1615ء میں شائع ہوئی۔ سیرت کی کتاب نہایت گستاخانہ ہے اور نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے اس کا نام ہی "محمد کاذب" رکھا گیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

2۔ واییر (Vattier.P) فرانسیسی مستشرق تھا۔ اس کا زمانہ 1613ء تا 1667ء ہے اس نے عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بڑی کثرت سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

3۔ ہاٹجر (Hottinger. J.H) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق، 1620ء تا 1167ء اس کے باقیات میں شرقی تصانیف کی ایک فہرست مطبوعہ ہائیڈلبرگ 1658ء قابل ذکر ہے۔

4۔ ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubbe) سترہویں صدی کا مشہور مستشرق ہے زمانہ 1631ء تا 1676ء اس کی مشہور کتاب (جو پہلے پہل لندن سے 1911ء میں شائع ہوئی) کا نام ہے An Account of the Rise and Progress of Mohametanism) کہا جاتا ہے اگر اس کی کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظر انداز کر دی جائیں تو اسے سیرتِ رسول ﷺ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ (16)

اور جیسا کہ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرتِ رسول ﷺ کے بارہ میں اولین اعتذار ہے۔ اس کتاب میں اسٹب نے نہ صرف یہ کہ اس رویہ کا جائزہ لیا ہے جو پیغمبرِ اسلام کے ساتھ مسیحی مصنفین نے پہلے اختیار کر رکھا تھا۔ جب کہ ان مصنفین کی تصویر کو اس نے مکروہ قرار دیا ہے جو انہوں نے اخلاق و کردارِ نبوی کی کھینچی تھی، اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ اس آسمان کے نیچے سوائے محمد ﷺ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکز توجہ بنی ہو کہ اپنی تو اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اسے نگاہ تحسین سے دیکھیں۔ مشرق میں اسے سراہا گیا لیکن مغرب نے التفات نہ کیا۔

دوسرے مستشرقین میں سے جین برارڈ (Gene Brard) کا زمانہ گرچہ 1535ء تا 1597ء تھا لیکن اس کا موقف تقریباً سترہویں صدی میں عام ہوا۔ وہ ایک مشہور کیتھولک مناظرہ باز تھا۔ جین برارڈ کو سب سے بڑا اعتراض اس پر تھا کہ حضور ﷺ نے قرآن کو عربی زبان میں کیوں لکھا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خالص مہذب زبانوں میں کیوں نہیں لکھا گیا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس لئے کہ "محمد ﷺ (خاکم بدہن) خود ایک حیوان (جانور، چوپایہ) تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ) زبان (عربی) جانتے تھے، جو ان کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی۔ اس لئے اس کے نقطہ نظر کے مطابق قرآن عربی جیسی وحشی زبان میں لکھا گیا۔

1653ء میں الیگزینڈر روس نے (Alexander Ross) نے اپنی کتاب (Pondebli) شائع کی۔ وہ اگرچہ تقابل ادیان کے حوالہ سے سامنے آئی، لیکن اس کے ایک حصہ میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارہ میں کچھ بہتر مواد پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی پہلی

کتاب ''حیات محمد ﷺ کا مختصر جائزہ'' قرون وسطیٰ کے روایتی خرافاتی مواد، قصے کہانیوں اور زہریلے معاندانہ مواد پر مشتمل تھی۔ لیسلوٹ ایڈیسن (Lancelot Addison) نے 1678ء میں سیرت پر ایک کتاب شائع کی اگلے سال یہی کتاب نئے عنوان (حیات و ممات محمد ﷺ) کے نام سے سامنے آئی۔ مگر اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے۔ آنحضرت ﷺ کے خلاف اسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اپنی کتاب ''قرآن'' کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کیا تھا۔ ایک اور مستشرق ہمفر پرائی ڈیکس (Humpherey Prideaux) نے حضور ﷺ کی سوانح لکھی۔ لیکن اپنے دامن کو وہ بھی خرافات سے نہ بچا سکا اور دوسروں کی طرح آپ کو خدانخواستہ مدعی کاذب، مکار فریبی قرار دیا۔ اس پر تماشہ یہ ہے کہ اس کی کتاب ایک صدی تک دوسروں کے لئے ''معیاری کتب حوالہ'' بنی رہی ایک ہی سال 1697ء میں 2 اشاعتیں عمل میں آئیں اور فرانسیسی ترجمہ بھی 1698ء میں ہوگیا۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کے حلقوں میں عام مذاق کیا تھا اور کس قسم کے مواد کو ان کے بڑے بڑے علما استعمال کرتے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران بھی تحریک استشراق، منازل ارتقا طے کرتی رہی۔ البتہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، زحمتِ سفر کم و بیش ہوتا رہا اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کی علی الرغم، مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی بھی پیدا ہوگئی اس نرمی اور لچک کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان میں سے چند کا رویہ رنگ و آہنگ اور آواز و انداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا، بلکہ دل و نگاہ میں گنجائش پیدا کر کے اثبات و معروضیت سے آگے بڑھ کر توصیف و مدح اسلام و پیغمبرِ اسلام میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، ورنہ پرانے خیالات اور ان کے متقدمین کے قائم کئے ہوئے نظریات بہر حال گرم سفر رہے اور مقبولیت بھی انہی کو حاصل رہی۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ متشددانہ و متعصبانہ رویہ کے شانہ بشانہ معقولیت و انصاف پسندی کی رجحان بھی جاری و ساری ہوگیا اور اس رجحان نو کا ساز غالباً اس صدی میں سب سے پہلے ولندیزی مستشرق ریلان (De Religione Dica H. Relant) لکھ کر چھیڑا، اور اپنے ہم شربوں سے مطالبہ کیا کہ ''ہم شرق کو اس کے اپنے اصل مآخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں'' اور برملا کہا کہ ''تاریخی انصاف'' کے ترازو میں تو ہمیں اسلام کو بھی تولنا چاہیے۔ پھر اس ''نے نوازی'' میں پیری بائل اور بولین، ولیر زوغیرہ بھی شامل ہو گئے۔ (17)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مغرب نے اسلام، پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کی طرف بنظر شفقت دیکھا اور افہام و تفہیم کی جانب پیش قدمی کی۔

اس صدی میں مستشرقین کی ذاتی و انفرادی کوششوں کے علاوہ سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی سرگرمیاں منظم کی گئیں۔ خصوصاً اس صدی کے اواخر میں ان رجحانات نے زیادہ زور پکڑا، بقول مولانا شبلیؒ یہ وہ زمانہ جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی۔ جس نے اورینٹلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنہ مشرقیہ کے مدارس کھولے مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں۔ مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔ اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں۔ عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔ السنہ مشرقیہ کے علاوہ مسلمانوں کے سائنسی علوم پر علمی و تحقیقی کام کی غرض سے پیرس میں 1795ء میں ایک ادارہ قائم کیا گیا، اس کے تحت اضافی طور پر مشرقی زبانوں کے بارہ میں بھی معلومات اکٹھا کی گئیں۔

اٹھارہویں صدی کی ایک خصوصیت اس تحریک کے حوالہ سے یہ بھی ہے کہ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحوں کا رواج اسی زمانہ میں شروع ہوا۔ چنانچہ انگلستان میں 1779ء کے لگ بھگ اور فرانس میں 1799ء کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی اور پھر جلد ہی استشراق نے بھی رواج پا لیا، اور اس کے ساتھ ایک مخصوص تصور اور مخصوص سلوک اور رویہ نے بھی جنم لیا۔ اس صدی کے مشاہیر علمائے

مستشرقین میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں۔

1۔ سائمن اوکلے (S. Ockley) انگریز مستشرق تھا، جس نے زمانہ 1678ء تا 1720ء تھا۔ اس کی کتاب مسلمانوں کی تاریخ پر 1708ء تا 1718ء میں شائع ہوئی۔ یہ تین جلدوں میں تھی کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ نتائج تحقیق کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا۔

2۔ ایڈورڈ پوکاک انگریز مستشرق تھا جس کا زمانہ 1648ء تا 1727ء تھا اس کا اہم نام ایک مستشرق سترہویں صدی میں گزر چکا ہے۔

3۔ جارج سیل انگریز مستشرق تھا جس کا زمانہ 1697ء تا 1736ء تھا اس نے 1734ء میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا اور بعض مستشرقین کے کلمات خیر کے ردعمل میں آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب قرار دیا۔

4۔ جین گنیر (J. Gagnier) انگریز مستشرق تھا جس کا زمانہ 1670ء تا 1740ء تک کا تھا اس نے 2 کتابیں شائع کیں۔ ان دونوں کتابوں کا مقصد بولین ویلر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ بولین ویلر کے مقابلہ میں اس نے ایک نئی تالیف پیش کی جو 1748ء میں امسٹرڈم سے نمودار ہوئی۔

5۔ رسک (Reiske J.J) جرمن مستشرق تھا جس کا زمانہ 1716ء تا 1774ء تک تھا۔ وہ جرمنی کا کلاسیکی لغوی اور عربی اسکالر تھا اور یونانی زبان وادب پر سند مانا جاتا تھا۔

6۔ ایڈورڈ گبن انگریز مورخ تھا جس کا زمانہ 1737ء تا 1794ء اپنی کتاب تاریخ زوال روما کے لئے خاصی شہرت کا حامل تھا۔ اس نے 1750ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرت ﷺ کے بارہ میں نہایت دل آزار رائے کا اظہار کیا اور رواداری کے دعویٰ کو باوجود آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب کا خطاب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ آخری ایام میں شہوت، لالچ جاہ طلبی اور بوالہوسی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (نعوذباللہ)

7۔ والٹیر (Voltair) فرانسیسی مصنف زمانہ 1694ء تا 1778ء اس نے پیغمبر اسلام کے بارہ میں اپنا مشہور ڈرامہ تحریر کیا۔ یہ ڈرامہ اگر تاریخی لحاظ سے بے بنیاد تھا، تاہم یہ امر ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ اس وقت تک مستشرقین، شریعت اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوئے تھے۔ یہ ڈرامہ 1742ء میں منظر عام پر آیا۔ اس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا بلکہ یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی۔ جنہوں نے اسلام اور آنحضرت ﷺ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا یا انصاف کا مطالبہ کیا۔ اس نے آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب سے موسوم کیا۔ اس نے ڈرامہ کو پوپ پاژدہم کے نام منسوب کیا اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا۔ پھر اپنے مقالات کے مجموعہ 1751ء میں بھی والٹیر نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کے خلاف سخت نفرت کا مظاہرہ کیا۔ والٹیر کی شخصیت اور تالیف کا گہرا اثر دوسرے مستشرقین پر بھی پڑا چنانچہ ڈیڈی روٹ (Diderot) اس خش نگاری پر بھی اتر آیا کہ محمد ﷺ دنیا میں سب سے بڑھ کر عورتوں کے دوست اور سنجیدگی ومعقولیت کے دشمن تھے۔ (نعوذباللہ) (18)

فصل دوم

استشراق کی تاریخ

جب استشراق کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تین قسم کے مستشرقین نظر آتے ہیں جن کا جائزہ آنے والے صفحات میں لیا جائے گا۔

1۔ متعصب مشنریز (یہودی اور عیسائی) مستشرقین:

استشراق کی تحریک کو شروع کرنے، اسے پروان چڑھانے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اس کی سمتیں متعین کرنے میں ان لوگوں کا کردار بڑا واضح ہے جو عیسوی اور یہودی ادیان سے گہرا ذہنی اور قلبی رابطہ رکھتے ہیں۔ تحریک استشراق کی تاریخ کے کسی بھی دور کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے مختلف طریقہ ہائے کار میں سے جس کا بھی تجزیہ کیا جائے وہاں متعصب یہودی اور عیسائی مختلف بھیسوں میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔

مستشرقین نے اسلام پر مختلف محاذوں سے حملے کئے ہیں اور ان کا یہ طبقہ ہر قسم کے حملوں میں صف اول میں رہا ہے۔

یوحنا دمشقی کی اسلام کے خلاف کتابیں، قرطبہ کے شہیدوں کی پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی کی منظم تحریک، پمپلونا کی ایک خانقاہ میں لکھی جانے والی حضور ﷺ کی فرضی سوانح عمری، جس نے قرون وسطی کے مستشرقین کو توہین رسول کے لئے بنیادی مواد فراہم کیا، پطرس محترم کی نگرانی میں ہونے والا ترجمہ قرآن جس کو بعد کے مستشرقین مترجمین قرآن نے ترجمہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، علوم اسلامیہ کو یورپ کی زبانوں میں منتقل کرنے کی تحریک، یورپی یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تدریس کے لئے ادارے قائم کرنے کی مہم، صلیبی جنگوں کا مہیب سلسلہ، حضور ﷺ کی پاکیزہ شخصیت کو داغدار کرنے کی متعدد کوششیں قرآن حکیم کی حیثیت میں تشکیک، احادیث طیبہ پر حملے، مسلمانوں کا رشتہ اپنے نبی اور اپنے دین سے توڑنے کی کوششیں، مسلمانوں کے دلوں سے اپنے دین کی محبت کم کر کے وہاں عیسائیت کی محبت کا بیج بونے کے حیلے، مسلمانوں کو عیسائی بنانا ممکن نہ ہو تو ان کو اپنے دین سے بیگانہ کرنے کی تدبیریں، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر بے بنیاد حملے اور پھر ان حملوں میں کمی کرنے کی تدبیریں، مستشرقین کی ان تمام کوششوں کے پیچھے عیسائی راہبوں، پادریوں اور یہودی علماء کا ہاتھ کار فرما نظر آتا ہے۔(19)

اس قسم کے لوگ اسلام کا مطالعہ نہ تو حقائق تک پہنچنے کے لئے کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن مذہبی تعصب کی آگ میں جل رہے ہیں اور مذہبی تعصب اتنی ظالم شے ہے کہ یہ انسان کو حق کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا اگرچہ حق روز روشن کی طرح عیاں ہو۔ اس طبقے کے مستشرقین نے غیر جانبداری اور بے لاگ علمی تحقیق کے لبادے میں اسلام کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

ایک فرانسیسی مستشرق ''کیمون'' اپنی ایک کتاب میں رقمطراز ہے:

''دین محمدی جزام کا مرض ہے جو لوگوں میں پھیل رہا ہے اس مرض نے لوگوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ بلکہ یہ ایک خوفناک مرض، ایک عام فتنہ اور ایک ایسا جنون ہے جو سب کچھ فراموش کرا دیتا ہے۔ جو انسان کو سستی اور کاہلی پر ابھارتا ہے۔ جو آدمی اس مرض میں مبتلا ہو، اسے قتل وغارت، شراب نوشی اور بدکاری کی دعوت کے سوا کوئی چیز سستی اور کاہلی کی اس حالت سے نہیں نکال سکتی''۔(20)

یہی مستشرق اپنے خبث باطن کا مزید اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

''محمد ﷺ کی قبر کی مثال بجلی کے ایک کھمبے جیسی ہے جو مسلمانوں کے سروں میں جنون پیدا کرتا ہے اور انہیں ایسے کام کرنے پر مائل کرتا ہے جو مرگی کے مریض اور مخبوط الحواس لوگ کرتے ہیں۔ اس کے اثر سے مسلمان مسلسل لفظ ''اللہ'' کا تکرار کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ ایسی چیزوں کے عادی بن جاتے ہیں جو سادہ طبیعتوں کا خاصہ ہیں۔ مثلاً خنزیر کا گوشت کھانے، شراب نوشی اور موسیقی سے نفرت اور جو چیزیں سفاکی اور بدکاری کے خیالات سے جنم لیتی ہیں ان سے محبت''۔(21)

پھر یہی مستشرق اپنے ناپاک اور مکروہ جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''میرا اعتقاد ہے کہ مسلمانوں کی ساری آبادی کے پانچویں حصے کو نیست و نابود کر دیا جائے اور جو باقی بچ جائیں انہیں مشقت طلب کاموں پر لگا دیا جائے۔ کعبہ کو گرا دیا جائے اور (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کی قبر اور ان کے جسم کو ''لوفر'' کے عجائب گھر میں رکھا جائے''۔(22)

یہ تحریریں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کے لکھنے والے نہ تو علم کے شائقین ہیں اور نہ ہی تحقیق سے ان کا کوئی واسطہ ہے۔ وہ علم اور تحقیق کے لبادے میں اسلام پر حملے کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے متعلق کچھ مطالعہ کرنے سے پہلے ان کے ذہن میں یہ عقیدہ پختہ ہوتا ہے کہ سچا دین تو ان کا اپنا دین ہے۔ اسلام تو محض ایک گمراہی ہے اور یہ ایک باطل فرقے کا نام ہے۔ وہ جب اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس مطالعہ سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دلائل تلاش کریں جو عقیدہ ان کے ذہنوں میں پہلے سے راسخ ہوتا ہے۔

اس قسم کے دلائل انہیں مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کی تحریروں سے ملیں یا کچھ موضوع احادیث ان کو اپنے مطلب کی مل جائیں، وہ ان کی طرف جھپٹتے ہیں اور پھر ان بے بنیاد دلائل کو بنیاد بنا کر وہ اپنے تخیل کے زور پر اسلام کو بدنام کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اور تاثر یہ دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے لئے ان کے پاس بڑے معتبر دلائل ہیں۔ وہ ان بے بنیاد دلائل کے مقابلے میں قرآن حکیم کی نصوص، معتبر احادیث اور مسلم علماء کے اقوال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

مستشرقین کے اس طبقے نے جو رویہ اپنایا ہے، اس کے اسباب تاریخی ہیں۔ تحریک استشراق میں مستشرقین کے اس طبقے کا کردار بہت واضح ہے۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں ہم نے تفصیل سے ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو اسلام کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کی دینی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حیثیت پر مرتب ہوئے تھے۔ اسلام نے یہود و نصاریٰ کو عسکری میدانوں میں شکستیں دی تھیں۔ عیسائیت اور یہودیت کے جزیرہ عرب اور گردونواح میں پھیلنے کے جو واضح امکانات موجود تھے، اسلام نے ان کو ختم کر دیا تھا۔ بت پرستوں کے مقابلہ میں اہل کتاب ہونے کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کو سماجی برتری حاصل تھی، بت پرستوں کے مسلمان ہو جانے سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ اہل کتاب کے علماء اور راہبوں کو جو سماجی حیثیت حاصل تھی اور اس سماجی حیثیت کے سہارے وہ جس اقتصادی خوش حالی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا اور اسلام نے نہ صرف عرب و حجاز میں یہود و نصاریٰ کا وقار ختم کیا بلکہ ان سے کئی ممالک چھینے اور ممالک کے ساتھ ساتھ ان کے عوام کی اکثریت کے دلوں کو بھی فتح کر لیا۔(23)

یہود و نصاریٰ نے اسلام دشمنی کا بیج تو اپنے دلوں میں اسی دن بو لیا تھا، جب انہوں نے محسوس کیا تھا کہ نبوت و رسالت کا منصب اعظم بنو اسرائیل سے منتقل ہو کر بنو اسماعیل کے پاس چلا گیا ہے۔ انہوں نے شجر اسلام کی بیخ کنی کی کوششیں بھی پہلے ہی دن سے شروع کر دی تھیں لیکن ان کی دشمنیاں جتنی شدید ہوتی گئیں، اسلام کے شجرہ طیبہ کی جڑیں اتنی ہی مضبوط ہوتی گئیں۔

ان کی مسلسل ناکامیوں نے اسلام دشمنی کے اس پودے کو تناور درخت بنا دیا جس کا بیج طلوع اسلام کے ساتھ ہی ان کے دلوں میں بو دیا گیا تھا۔ ان کے حسد، کینہ، بغض اور سفلہ پن کی اس وقت تو کوئی انتہا نہ رہی جب اسلام اس رنگ میں جلوہ گر ہوا جس کا پروردگار عالم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ o تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ''(24)

''آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے۔ جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لئے تاکہ انہیں خوب ذہن نشین کر لیں''۔

یہ بات یہود ونصاریٰ کے لئے کتنی تکلیف دہ تھی کہ اسلام کے جس پودے کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا۔ اسلام کو ختم کرنے کی انہوں نے اس وقت بھی کوششیں کیں جب مسلمانوں کو غیر مسلم طاقتیں کمزور سمجھتی تھیں۔ انہوں نے اسلام کے خلاف سازشیں بھی کیں۔ مسلمانوں کے خلاف انہوں نے مختلف حربے استعمال کئے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام نے ان سے بیت المقدس چھین لیا ہے، اس کے جھنڈے سپین اور سسلی پر لہرا رہے ہیں اور اس کی فوجیں قلب یورپ کے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں تو انہوں نے صلیبیں اپنے گلوں میں لٹکائیں اور تلواریں ہاتھوں میں لئے مسلمانوں کے مقابلہ میں آ گئے۔ صلیبی جنگوں میں کئی صدیوں کی مسلسل ناکامیوں کے بعد انہوں نے صلیب اور تلوار ہاتھ سے رکھ دی اور قلم اور کاغذ کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مصروف جہاد ہو گئے۔ جب ان کے تیار کردہ زہریلے لٹریچر نے مسلمانوں کو اپنے دین سے بیگانہ کر دیا اور وہ کمزور ہو گئے تو یہی لوگ پھر عادل اور رحم دل حکمرانوں کے روپ میں اسلامی ممالک پر چھا گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے دین سے دور اور عیسائیت سے قریب کرنے کے لئے کتابیں لکھیں۔ سکول اور کالج قائم کئے۔ ہسپتال قائم کئے اور ان میں مریضوں کا مفت علاج کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ خیراتی ادارے اور تنظیمیں قائم کیں اور اپنے آپ کو دکھی انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد ظاہر کر کے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ صرف ان کا دین ہی اپنے دامن میں دکھی انسانیت کے لئے نجات اور فلاح کی خوشخبری لے کر جلوہ گر ہوا ہے۔

انہوں نے ہسپتالوں میں مریضوں کی جسمانی بیماریوں کا علاج کیا لیکن انہیں روحانی مریض بنا دیا۔ انہوں نے سکولوں میں بچوں کو تعلیم کے نام پر جہالت کا درس دیا اور دکھی انسانیت کو ایمان کے بدلے چند سکے دے کر خوش کرنے کی کوشش کی۔ (25)

مستشرقین کا یہ طبقہ پہلے بھی مصروف عمل تھا اور آج بھی مصروف عمل ہے۔ کبھی اس نے اعلانیہ مسلمانوں کو زہر کا پیالہ پلانے کی کوشش کی اور کبھی اس زہر کو شہد میں ملا کر بڑی شفقت سے مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ دشمنوں کے اس گروہ سے محتاط رہنا مسلمانوں کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

2۔ ملحد مستشرقین:

یورپ کی تاریخ میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو شاید کسی دوسری قوم کی تاریخ میں نہ مل سکے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں یورپ میں مذہب اور سائنس کے درمیان باقاعدہ جنگ رہی ہے۔ یورپ کا اقتدار کلیسا کے قبضے میں تھا اور کوئی ایسی آواز جو کلیسا کے معتقدات کے مخالف ہوتی تھی، اسے کچل دیا جاتا تھا۔

انسان فطرۃً علم کے لئے پیاس محسوس کرتا ہے اور جہاں اسے علم کی کوئی مشعل فروزاں نظر آتی ہے وہ اس کی طرف لپکتا ہے۔ یورپ میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو علم کے پیاسے تھے لیکن ان کے ساتھ پاپائے روم کا جو سلوک تھا وہ ڈاکٹر ڈریپر کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''پاپائے روم کے ہاں ہر وہ عیسائی کافر تھا جو کلیسائی ذہن سے بالاتر ہو کر سوچتا، علمی کتابیں لکھتا، سائنسی نظریات پیش کرتا، مسلمانوں کی تہذیب یا کسی اور بات کو اچھا سمجھتا یا ہر روز نہاتا تھا۔ ایسے کافروں کو سزا دینے کے لئے پاپا نے 1478ء میں ایک مذہبی عدالت (انکوائزیشن) قائم کی۔ اس نے پہلے سال دو ہزار اشخاص کو زندہ جلایا اور سترہ ہزار کو قید و جرمانہ کی سزا دی۔ دس برس میں اس نے سترہ ہزار کو آگ میں پھینکا۔ ستانوے ہزار تین سو کیس کو قید و بند کی سزا دی اور ساتھ ہی مختلف علوم کی چھ ہزار کتابیں جلا دیں۔ پوپ کی مرکزی مذہبی عدالت نے 1481ء اور 1808ء کے درمیانی عرصے میں تین لاکھ چالیس ہزار نفوس کو نہایت المناک سزائیں دیں۔ ان میں سے بتیس ہزار کو زندہ جلایا''۔ (26)

اس ظلم کا ردعمل یہ ہوا کہ علم کے شیدائی مذہب کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے علمی ترقی کے لئے مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوا

ضروری سمجھا۔ مذہب اور کیسا کے خلاف ایک طوفان اٹھا اور یہ طوفان پوپ اور کیسا کے اختیارات کو بہا کر لے گیا۔

یورپ میں علم کی ترقی کیسا کی اسی شکست کی مرہون منت ہے۔ کیسا کی اس علم دشمنی کا نتیجہ تھا کہ اہل مغرب نے مذہب کو زندگی کے عام معاملات سے فارغ کر کے گرجے میں بند کر دیا جہاں ہر اتوار کے روز چند عیسائی اپنے محبوس مذہب کی زیارت کے لئے چلے جاتے ہیں۔

مسلم ممالک میں بھی مذہب کو انفرادی معاملہ قرار دینے اور اسے ملی زندگی سے لاتعلق کرنے کی کوششیں، یورپ کے اسی تجربے کی صدائے بازگشت ہیں حالانکہ اسلام کیسا کی طرح علم کا دشمن نہیں بلکہ وہ تو مہد سے لے کر لحد تک علم حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

عیسائیوں کی مذہب بیزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ جو عیسائیت کا مرکز ہے وہاں گرجے فروخت ہو رہے ہیں اور کئی گرجوں کو مسلمانوں نے خرید کر مسجدوں میں بدل دیا ہے۔ عیسائیوں کے مذہبی راہنما شکوہ سنج ہیں کہ ان کی آبادی کی اکثریت برائے نام عیسائی ہے عملاً وہ مذہب کو خیرباد کہہ چکی ہے۔

اس صورت حال میں یورپ میں الحادی تحریک نے زور پکڑا۔ اہل یورپ کی قومی زندگی کا ہر شعبہ عملاً ان لوگوں کے قبضے میں چلا گیا جو عیسائی کہلاتے تھے لیکن ان کی سوچ بھی ملحدانہ تھی اور ان کا عمل بھی ملحدانہ۔ زندگی کے دیگر تمام شعبوں کی طرح استشراق کی تحریک میں بھی ملحد شامل ہو گئے۔ یہ ملحد مستشرقین، استشراقی جدوجہد میں عیسائی راہبوں اور پادریوں کے شانہ بشانہ مصروف کار تھے۔ ان لوگوں کی عیسائیت یا یہودیت سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ عیسائیت کے بھی دشمن تھے اور کیسا کے بھی۔ لیکن جس طرح ہزاروں اختلافات کے باوجود استشراق کی تحریک میں یہودی اور عیسائی کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے اسی طرح ملحد مستشرقین بھی پادریوں اور راہبوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

ان ملحدین کو استشراق کی شکل میں ایک آڑ میسر آ گئی جس کے پیچھے سے انہوں نے مذہب کے خلاف اپنی کاروائیاں جاری رکھیں۔ اس قسم کے مستشرقین کے طریقہ کار اور ان کے مزاج کو سمجھنے کے لئے فولٹیر کی مثال کافی ہے۔

"فولٹیر" ایک ملحد تھا۔ وہ مذہب اور کیسا سب کا مخالف تھا۔ لیکن وہ نہ کھل کر بنو اسرائیل کے کسی نبی پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی پوپ وغیرہ کو براہ راست اپنی تنقید کا نشانہ بنا سکتا تھا، کیونکہ اس صورت میں اسے کیسا، عوام اور حکومت سب کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس مشکل کا حل اس نے یہ نکالا کہ اس نے تمام ادیان اور ان کے بانیوں پر کیچڑ اچھالنے کے لئے حضور ﷺ کی ذات بابرکات کو بطور رمز استعمال کیا۔ اس نے حضور ﷺ کی ذات پر ایسے رکیک حملے کئے جن کی ہمت اس سے پہلے کسی کو نہ ہوئی تھی۔

اس ملحد مستشرق کی عیاری کی انتہا یہ تھی کہ اگرچہ اس نے اپنی تحریروں میں حضور ﷺ کے علاوہ دوسرے مذاہب کی مقدس ہستیوں پر بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ اس نے حضور ﷺ کا نام لے کر یہ حملے کئے تھے اس لئے اس نے اپنے اس کارنامے پر پوپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یا کم از کم اس کی ناراضگی سے بچنے کے لئے اپنی ایک کتاب کا انتساب پوپ کے نام کر دیا۔ اس طرح اس ملحد مستشرق نے کیسا اور اسلام دونوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لی اور اسے کسی خطرے کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔ (27)

یہ بات صرف فولٹیر تک ہی محدود نہیں بلکہ جن لوگوں نے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں کثیر تعداد اسی قسم کے لوگوں کی ہے۔

موجودہ دور میں مغرب کا الیکٹرانک میڈیا اور پریس جو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان اٹھا رہا ہے ان میں بھی اکثریت انہی لوگوں کی ہے۔ گو یہ لوگ عیسائیت کے بھی خیر خواہ نہیں لیکن اسلام دشمنی ان کو ورثے میں ملی ہے۔ انہوں نے اسلام کو سمجھنے کے لئے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے جس قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے، اس لٹریچر میں ہر برائی کو اسلام کی پہچان قرار دیا گیا ہے۔ ان حقائق کے باوجود مسلمانوں کی بے حسی کی انتہا ہے کہ انہوں نے اس قسم کے دین بیزار اور اسلام دشمن لوگوں کو اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھ رکھا ہے اور ان سے بھلائی کی توقع رکھتے ہیں حالانکہ ان ملحدین کی نظروں میں اسلام ہی ان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ (28)

3۔ مستشرقین کے اعتراضات کی نشر و اشاعت میں مشنریز کا کردار:

مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں اپنے اعتراضات میں ملمع کاری کر کے انہیں بہت دلفریب اور خوشنما بنا دیا ہے۔ اور دنیائے اسلام کے افکار و عقائد اور نظام تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہونے کے لئے عربی زبان میں ان کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ جو اسلامی مکتبوں (بک ڈپو) میں فروخت ہو رہے ہیں۔ بعض ممتاز اہل عرب اور مسلمان بھی ان کے خوشہ چیں ہیں اور وہ ان سے استفادہ کے لئے مغربی ملکوں کا سفر کرتے ہیں اور انہیں بھی اسلامی ملکوں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ دراصل اسلامی فکر کی بنیادیں متزلزل کرنے میں مستشرقین کے شریک و معاون ہوتے ہیں۔

دنیا کی موجودہ اقتصادی پالیسی اور حکومتوں کا وفاق بھی مستشرقین کے شکوک و شبہات کو پروان چڑھا رہا ہے۔ چنانچہ ان کے افکار و نظریات کی اشاعت کے لئے کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ پہلے ان کے خیالات مقامی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ پھر عربی اور دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے ہوتے ہیں۔

مستشرقین کی ان حرکتوں سے اسلام، اسلامی تہذیب اور بالخصوص آنحضرت ﷺ کی مقدس زندگی کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں ہے۔ وہ مکمل تیاری اور منظم منصوبے کے بعد جب اسلام کے خلاف بہتان تراشی کر کے شبہات وارد کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے عیسائی مبلغین اور استعمار پسند طاقتیں ان کو دنیا بھر میں پھیلانے اور عام کرنے کی اسکیمیں تیار کرتی ہیں۔ اور کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں۔ اسلام کو ہدف طعن بنانے والے بعض مستشرقین سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ اس طرح انہیں مادی استعمار کی تعمیر و استحکام اور اسلامی افکار کو مغربی سانچے میں ڈھالنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کی تکمیل کے لئے وہ عربوں اور مسلمانوں میں سے اپنے ان معاونین کا انتخاب کرتے ہیں جو فکری اور علمی حیثیت سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور جو ان کے مادی و فکری موقف کو درست ثابت کرتے ہیں۔ یہ صورت حال انڈونیشیا میں ہالینڈ کے غلبہ، عربی ملکوں میں برطانوی اور فرانسیسی استعمار اور خصوصاً مصر نپولین اور الجزائر و مغرب پر فرانس کے حملہ کے زمانہ میں پیش آچکی ہے۔ مستشرقین کے اعتراضات و الزامات کے نشو و نما پانے اور ان کے نشر و اشاعت کے خاص اسباب و ذرائع یہ ہیں:

الف۔ گرجا اور عیسائی مشنریاں:

مونسیور کولی نے ''دین حق کی بحث و تحقیق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں اسلام اور نبی اکرم ﷺ کی تصویر بالکل مسخ کر کے پیش کی گئی ہے۔ مصنف نے عصبیت اور صریح جانبداری سے کام لے کر اسباب بیان کئے بغیر جارحانہ اور تحکمانہ انداز میں اعتراضات عائد کئے ہیں وہ لکھتا ہے:

''محمد ﷺ نے اخلاق و شرافت کو خیر باد کہہ کر اپنے پیرووں کے ہاتھ میں تلوار رکھی، بدکاری اور لوٹ مار کی، ان کو کھلی چھوٹ دی، اور جنگ میں ہلاک ہونے والوں کو اس کی بشارت سنائی کہ انہیں دائمی لذت و راحت نصیب ہوگی'' ایسی صریح کذب بیانی اور یاوہ گوئی کے بعد مستشرقین صحیح دینی و تاریخی حقائق سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔

اڈیسون نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف دو بہتان تراشے ہیں:

اوّل: یہ کہ آپ ﷺ انجیل سے واقف تھے اور اسی سے اخذ و استفادہ کرتے تھے۔

دوم: یہ کہ آپ ﷺ کی انجیل سے واقفیت ناقص تھی اور آپ نصرانیت کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔

مگر اسی ناواقفیت اور نصرانیت کی بگڑی ہوئی صورت پر آپ ﷺ نے اپنے اس دین کی بنیاد رکھی جسے عربوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ عیسائی مبلغین نے یہ اور اسی قسم کے دوسرے غلط اور بیجا الزامات مستشرقین کے ذہنوں میں نقش کر دیئے ہیں جس کے نتیجہ میں انہوں نے

آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ پر ایسے رکیک اور ناروا اعتراضات کئے ہیں جن سے ان کی سیرتیں اور شخصیتیں بالکل مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

عیسائی مشنریوں کے منصوبے بہت منظم، وسیع اور گونا گوں ہیں۔ وہ مشرق میں ان کی اشاعت کے لئے مبلغین بھیجتی ہیں۔ امریکہ نے اس میدان میں سبقت لی اور بیروت، قاہرہ، استنبول اور دمشق وغیرہ میں اپنے قدم جمائے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور اسی انداز پر اب تک مغربی افکار و اعمال کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہالٹن گب اور چار مستشرقین کے مباحثہ میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور 1930ء میں شائع ہونے والی کتاب ''اسلام کا نظریہ'' میں بھی اس کا ذکر ہے۔ (29)

ب۔ مادی استعمار:

مستشرقین کی فکری و اعتقادی کاوشوں پر استعمار پسند پورا اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں۔ اور ان میں مزید ایسے شکوک و اعتراضات کا اضافہ کرتے ہیں جن کا اسلام اور ذاتِ نبوی ﷺ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کو اطمینان ہے کہ مسیحیت مشرق میں مغربی استعمار کی بنیاد ہوگی۔ اسی بناء پر وہ مشنریوں کے مشن کو ہموار اور وسیع کرنے کے لئے ان کی ہر ممکن امداد و اعانت کرتے ہیں۔ ان کے لئے مال و اسباب مہیا کرتے ہیں اور انہیں اقتدار و اختیار بھی عطا کرتے ہیں۔ دراصل شروع میں مستشرقین عیسائی مبلغین اور راہبوں کے کندھوں پر سوار ہوتے ہیں۔ پھر وہ استعماریت سے اپنا تعلق قائم کرتے ہیں۔ اس طرح نتیجہ کے اعتبار سے مستشرقین کی تگ و دو کا مقصد بھی فکری استعمار ہے۔ وہ اسے مستحکم کرنے کے لئے دو طریقے اختیار کرتے ہیں:

1۔ اسلام کی تاریخی اور عظیم الشان شخصیتوں کو مجروح اور کمتر قرار دیتے ہیں جن میں سرفہرست خود آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک ہے۔

2۔ اس کے مقابلہ میں استعمار پسندوں کی شخصیتوں کو اہم اور برگزیدہ ثابت کرتے ہیں۔

اسی لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ استعماریت کے دور میں عالم عرب اور دنیائے اسلام کو استعمار پسندوں کے حالات اور کارناموں سے جس قدر واقفیت ہوئی اس قدر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی، سیرت اور کارناموں سے نہیں ہوئی۔ جو لوگ استعمار پسندی کے اس دور کو دیکھ چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مستشرقین اپنے ان دونوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے یا تو کلیسا کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں یا پھر استعمار اور توسیع پسندوں کے اشتراک سے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ ان کو حق کی تلاش و جستجو سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ شبہات وارد کرنے اور پروپیگنڈا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اور عیسائی مشنریوں اور مشرق میں ان کے نمائندہ مبلغین کے لئے ساز و سامان مہیا کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے علوم، افکار، عقائد، اشخاص اور زبان و تہذیب کی اچھی طرح مذمت اور تنقیص کی جاسکے۔

ج۔ تجارتی کمپنیاں:

استعمار پسندوں نے عربوں اور مسلمانوں کے بیش قیمت علمی سرمایہ میں سے بہت کچھ چیزیں سرقہ کی ہیں۔ اس پر تجارتی اداروں اور کمپنیوں کا قبضہ ہے۔ اہل عرب کو اپنے علوم و آداب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ تھا۔ اس لئے انہیں نہایت سستے اور معمولی داموں پر ان سے حاصل کر کے مستشرقین کی تحقیق کے بعد شائع کیا گیا۔ اور اشاعت کے لئے ایسی چیزیں منتخب کی گئیں جو غیر اہم اور فکری حیثیت سے زیادہ بلند پایہ نہ تھیں۔ تاکہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ معمولی چیزوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ جائے۔ پھر ان اداروں نے اسلامی تہذیب اور کلچر کی کتابوں کی تجارت اپنے لئے مخصوص کر لی جس کا منافع مستشرقین پر خرچ کیا جاتا تھا تاکہ وہ ترتیب اور طباعت و اشاعت کا کام پوری دلچسپی اور سرگرمی سے انجام دے کر ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکیں۔ تجارتی کمپنیوں کے پیش نظر دو طرح کے اغراض تھے:

1۔ اسلام کو مغربی اور اسلامی دنیا میں مسخ کر کے پیش کرنا اور اس کی شخصیتوں کو مجروح اور داغدار بنانا۔ اپنی اس ناپاک مہم کو فروغ دینے کے لئے وہ مستشرقین کو اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات والزامات کی کرید کرنے پر آمادہ کرتی تھیں۔

2۔ اسلامی علوم کی کتابوں کا حق طباعت اپنے لئے مخصوص کر کے ناجائز کمائی کرنا۔ (30)

د۔ معاشی و شخصی:

مستشرقین کو تقویت اس طرح بھی ملی کہ بعض لوگوں کے لئے رزق کے دوسرے وسائل و ذرائع کم ہو گئے تو انہوں نے ان کا ساتھ دینا شروع کیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ان کے ہم نوا ہوئے جنہوں نے محسوس کیا کہ ان کی فکری و عملی صلاحیت دوسرے فضلا اور ماہرین علوم کے برابر نہیں ہے۔ اسی لئے بعض حضرات مسیحی سوسائٹی میں اپنی براہ راست ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کے لئے بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے۔ غرض ان لوگوں کا مقصد اپنی کوتاہی اور فکری عجز و نقص پر پردہ ڈالنا اور حصول معاش تھا۔ کیونکہ رزق و معیشت کے دوسرے وسائل و ذرائع کے مقابلہ میں یہ زیادہ آسان صورت تھی اور اس میں کم تگ و دو بھی کرنا پڑتی تھی۔ (31)

مستشرقین اور مناظرانہ رویہ:

اسلام کی تعلیمات نے صرف مخالفوں سے اپنی تعریف ہی نہیں کرائی بلکہ ان میں سے بے شمار لوگوں کو اپنے حلقے میں شامل ہونے پر مجبور بھی کیا ہے۔ بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے یورپ اور امریکہ میں آنکھیں کھولیں، مستشرقین سے تعلیم حاصل کی لیکن آخر کار توفیق خداوندی نے انہیں ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک بنا دیا۔ ذیل میں ایسے چند خوش نصیب لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن کو ان کی تحقیق و جستجو نے منزل مراد تک پہنچا دیا اور انہوں نے کلمہ توحید پڑھ کر دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی سعادت حاصل کی۔

1۔ عبداللہ بن عبداللہ:

ان کے قبول اسلام کا حال پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے اپنی کتاب ''دعوت اسلام'' میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے عبداللہ بن عبداللہ کا پرانا عیسائی نام ذکر نہیں کیا کیونکہ پروفیسر موصوف نے ان کے حالات ان کی خود نوشت سے نقل کئے ہیں جس میں ان کا صرف اسلامی نام مذکور ہے۔

عبداللہ جزیرہ میورقہ میں ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اس انداز میں ہوئی کہ وہ بڑے ہو کر عیسائی پادری بن سکیں۔ مختلف یونیورسٹیوں سے دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایک عمر رسیدہ پادری کی خدمت میں گزارا۔ اس پادری کو عالم عیسائیت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور لوگ اس کے بڑے قدر دان تھے۔ پادری کو اپنے اس شاگرد پر بڑا بھروسہ تھا اور اس نے اپنے مال و متاع کی کنجیاں اس کے حوالے کر رکھی تھیں۔ ایک دن پادری اپنی درس گاہ نہ جا سکا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے شاگرد دیر تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول پر بحث کرتے رہے کہ ''میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام فارقلیط ہو گا''۔ وہ یہ بحث کرتے رہے کہ اس کلام میں فارقلیط سے مراد کون ہے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ عبداللہ نے واپس جا کر پادری کے سامنے اس بحث کا ذکر کیا اور اپنے استاد سے درخواست کی کہ جس طرح انہوں نے اسے علم کے بے بہا موتی عطا فرمائے ہیں اسی طرح اس عقدے کو بھی حل کر دیں۔ پادری نے رونا شروع کر دیا اور کہا: میرے بیٹے! بے شک تم مجھے بہت عزیز ہو کیونکہ تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ فی الواقع اس مبارک نام کے معنی دریافت کرنے میں بڑا فائدہ ہے مگر مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے اس کے معنی تم پر ظاہر کر دیئے تو عیسائی تجھے فوراً مار ڈالیں گے۔ عبداللہ نے راز کو افشاء نہ کرنے کا وعدہ کیا تو پادری نے کہا: میرے فرزند! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ فارقلیط پیغمبر اسلام محمد ﷺ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام ہے۔ اور یہ وہی پیغمبر ہیں جن پر وہ چوتھی کتاب نازل ہوئی جس کا اعلان دانیال کی زبان سے ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا دین یقیناً سچا دین ہے اور ان کا مذہب وہی شاندار اور پر نور مذہب ہے جس کا ذکر انجیل میں آیا ہے۔ (32)

پادری نے عبداللہ کو دین اسلام قبول کر لینے کی نصیحت کی لیکن خود عبداللہ کی منت سماجت کے باوجود اس نعمت کو اپنے دامن میں سجانے سے محروم رہا۔

عبداللہ اپنے استاد سے رخصت ہوا۔ مختلف ممالک سے ہوتا ہوا تیونس جا پہنچا۔ وہاں کے عیسائیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا کیونکہ عبداللہ کے علم کی شہرت عالم عیسائیت میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چار مہینے عیسائیوں کے پاس رہا۔ اس کی بڑی خاطر مدارات کی گئی۔ آخر وہ تیونس کے سلطان ابوالعباس احمد کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کرنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ سلطان نے انہیں خوش آمدید کہا۔

عبداللہ نے درخواست کی کہ سلطان ان کے اسلام قبول کرنے کے اعلان سے پہلے عیسائیوں کی ان کے متعلق رائے دریافت کر لیں کیونکہ جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے اس پر اس کے ہم مذہب ہر قسم کی الزام تراشیوں کو روا رکھتے ہیں۔ سلطان نے کہا: تم نے تو بالکل وہی بات کہی ہے جو حضرت عبداللہ بن سلام نے اسلام قبول کرنے سے پہلے کہی تھی۔

سلطان نے عبداللہ کی درخواست کے مطابق عیسائیوں کو شاہی دربار میں جمع کیا اور ان سے عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ جب سلطان عیسائیوں سے یہ سوال جواب کر رہے تھے، عبداللہ برابر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عیسائیوں نے جواب دیا: وہ ہمارے بہت بڑے عالم ہیں۔ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ انہوں نے علم وفضل اور پرہیزگاری میں عبداللہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ سلطان نے عیسائیوں سے پوچھا کہ اگر تمہارا یہ پادری مسلمان ہو جائے تو تم اس کی نسبت کیا خیال کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا:

معاذ اللہ! وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ سلطان نے عبداللہ کو اپنے پاس بلایا۔ عبداللہ دوسرے کمرے سے اٹھ کر سلطان کے پاس آئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر حلقہ اسلام میں شامل ہو گئے۔ عیسائیوں نے عبداللہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا۔ اس شخص نے صرف شادی کے شوق میں یہ حرکت کی ہے کیونکہ پادری کی حیثیت میں وہ شادی نہیں کر سکتا تھا۔

عبداللہ نے مسلمان ہونے کے بعد 1440ھ میں عیسائیوں کے رد میں ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام "تحفۃ الاریب فی الرد علی اھل الصلیب" رکھا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عبداللہ کے حالات اسی کتاب کے مقدمے سے نقل کیے ہیں۔ (33)

2۔ مسٹر ڈبلیو۔ ایچ کیولیم (W.H. Quilliam):

مسٹر ڈبلیو۔ ایچ۔ کیولیم ایک انگریز قانون دان تھا۔ اس نے قرآن مجید اور دیگر اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کی توجہ اسلام کی طرف اس وقت مبذول ہوئی جب اس نے 1884ء میں مراکش کا سفر کیا۔ اسے یہ بات دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ پیروان اسلام بڑے مخلص لوگ ہیں اور شراب نوشی اور دوسری برائیوں سے پاک ہیں جو انگلستان کے بڑے شہروں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

"کیولیم" نے اسلام قبول کر کے لورپول میں ایک مسلم مشن قائم کیا اور تبلیغی کوششیں شروع کریں۔ اس نے عام لوگوں کو لیکچر دیئے۔ چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں۔ ایک رسالہ جاری کیا۔ انگریزوں نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

انگلستان سے اٹھنے والی تبلیغ اسلام کی اس تحریک نے اسلامی ممالک میں جوش پیدا کر دیا۔ 1891ء میں ترکی سلطان نے "کیولیم" کو ملاقات کے لئے قسطنطنیہ بلایا۔ اور پھر تین سال بعد سلطان نے ایک مسلمان تاجر کو کیولیم کے پاس تحائف دے کر بھیجا۔ (34)

3۔ رسل ویب (Russel Webb):

ان کا پورا نام محمد الیگزینڈر رسل ویب ہے۔ ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ یہ ادیب، مصنف اور صحافی تھے۔ سینٹ جوزف گزٹ اور "میسوری ریپبلکن" کے ایڈیٹر رہے۔ 1887ء میں منیلا (فلپائن) میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قونصلر مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ ابتدا میں عیسائی مذہب کے پیروکار تھے، پھر مادہ پرست بنے اور آخر کار توفیق خداوندی نے انہیں دولت اسلام سے مالا مال کر دیا۔ وہ پہلے منیلا سے ہندوستان آئے۔ وہاں بڑے بڑے شہروں میں اسلام پر لیکچر دیئے۔ پھر وہ امریکہ گئے اور ایک عرب تاجر حاجی عبداللہ کے تعاون سے نیویارک میں ایک اسلامی مشن قائم کیا۔ انہوں نے ایک رسالہ بھی مسلم ورلڈ (The Muslim World) کے نام سے جاری کیا۔

''رسل ویب'' فرماتے ہیں:

''میں گہرے اور وسیع مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسلام وہ واحد اور بہترین نظام حیات ہے جو انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بعض نوجوانوں کے برعکس میں ابتدا ہی سے مذہب کے ساتھ اچھا خاصا لگاؤ رکھتا تھا۔ مگر بیس سال کی عمر میں، میں جوں ہی شعور مند ہوا، چرچ کی خشک اور بے معنی رسومات وقیود سے سخت بیزار ہو گیا۔ عیسائیت سے بیزار ہو کر میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا لیکن کوئی مذہب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ آخر اسلام کو پڑھنے کا موقعہ ملا تو حق واضح ہو کر سامنے آ گیا۔

یاد رہے! میں نے اسلام کسی جذباتی ردعمل، اندھی عقیدت یا محض سطحی جوش سے متاثر ہو کر قبول نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل، مخلصانہ، دیانتدارانہ اور قطعی غیر متعصبانہ مطالعہ اور تحقیق کارفرما ہے'۔ (35)

4۔ ڈاکٹر مارٹن لنگز (Dr. Martin lings):

مشہور برطانوی مستشرق ڈاکٹر مارٹن لنگز مصر یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ پھر ''برٹش میوزیم لائبریری'' کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہوں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اسلام کی تعلیمات کا دوسرے ادیان کی تعلیمات سے موازنہ کیا۔ اسلامی تصوف خصوصی طور پر ان کے زیر مطالعہ رہا۔ آخر کار قسمت نے یاوری کی اور بقول علامہ زکریا ہاشم زکریا: ''وہ تصوف کی سیڑھی کے ذریعے خدا تک جا پہنچے''۔

انہوں نے ابوبکر سراج الدین کا اسلامی نام اختیار کیا اور اسلام کی نورانی اور حیات بخش تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

انہوں نے سیرت رسول ﷺ پر ایک کتاب لکھی۔ وہ اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

''مجھے اسلامی تصوف کی انسان دوستی، ذوق ووجدان، خدا سے بندوں کے تعلق اور انسانوں کے باہمی تعلقات کے متعلق واضح احکامات نے اسلام کی طرف مائل کیا''۔ (36)

5۔ ڈاکٹر ارتھر کین:

امریکی ماہر نفسیات ''ڈاکٹر ارتھر کین'' نے توفیق خداوندی سے اسلام قبول کیا اور علی عمر کریم نام اختیار کیا۔ وہ اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

''تیس سال کی عمر تک میرا خدا پر ایمان نہ تھا۔ میرا گھرانہ مذہبی تھا اور میں اپنے اہل خانہ کا دل رکھنے کے لئے گرجے جایا کرتا تھا لیکن میرے ذہن میں مادے کے سوا کسی چیز کا وجود نہ تھا۔ میری زندگی روحانی عنصر سے مطلقاً بے بہرہ تھی۔ ایک وقت آیا کہ مجھے اپنی اس بے کیف زندگی کے متعلق بے چینی محسوس ہونے لگی۔ کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ لگا جس پر قرآن حکیم کی چند آیات بمعہ ترجمہ لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو پڑھا اور محسوس کیا کہ یہ کلام مجھے اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔

میں نے مختلف ادیان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں نے عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مجھے گو تمام ادیان میں کچھ چیزیں ایسی ملیں جن کے حق ہونے کے متعلق مجھے قلبی اطمینان حاصل ہوا لیکن اسلام میں مجھے بڑی عظیم چیزیں نظر آئیں۔ اسلام کی شکل میں حق کی بعض چیزیں نہیں بلکہ حق کا پورا نظام نظر آ گیا۔ اسلام کی تعلیمات میں مجھے صراحت، عظمت وبرتری اور عظیم روحانیت نظر آئی۔

دس سال کے مطالعہ سے مجھے عقلی اور روحانی طور پر یقین ہو گیا کہ اسلام سچا دین ہے۔ میں نیویارک کی مسجد میں پہنچا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر کا انسان مجھے نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کی

اور میرے رب نے میرے دل کو ہدایت کے نور سے بھر دیا''۔

ڈاکٹر علی کریم قرآن حکیم کے متعلق کہتے ہیں:

''یہ مقدس ربانی کتاب ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی''۔ (37)

ڈاکٹر موصوف اسلامی شخصیات میں حضورﷺ کے بعد امام غزالی کو اپنی محبوب ترین شخصیت قرار دیتے ہیں جن کی تحریریں عقل اور روح دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔

6۔ جان سنت:

انگریز مبشر ''جان سنت'' نے اسلام قبول کیا اور ''محمد جان'' نام اختیار کیا۔ اس نے پندرہ سال کی عمر میں ادیان کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کا تعلق برطانیہ کی ''سالویشن آرمی'' کے ساتھ تھا جس کا مشن عیسائیت کی تبلیغ ہے۔

وہ کہتا ہے:

''میں نے عیسائیت کا گہرا مطالعہ کیا لیکن مجھے عیسائیت میں انسانی زندگی کے بے شمار مسائل کا شافی حل نظر نہ آیا۔ میرے دل میں عیسائیت کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ میں اشتراکیت کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس نظام میں میری روح کے لئے کچھ نہ تھا۔ پھر بدھ مت اور دیگر ادیان کے مطالعہ کے بعد 1950ء میں آسٹریلیا کے ایک تبلیغی مشن کے دوران اسلام کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے حضورﷺ کی سیرت طیبہ کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اسلام کے مطالعہ سے مجھے اپنی زندگی کے تمام مسائل کا حل پوری وضاحت کے ساتھ مل گیا۔

میں نے دیکھا کہ اسلام میں فرد اور معاشرے دونوں کی فلاح کے لئے قوانین موجود ہیں اور اسلام معاشرے کو مساوات اور توحید کی بنیادوں پر استوار کرنے کا علمبردار ہے تو میں نے اسلام کی طرف عقلی اور روحانی کشش محسوس کی اور میں نے اسی دن اپنے رب سے عہد کر لیا کہ اپنی زندگی اسلامی ہدایت کے نور کو اکناف عالم میں پھیلانے کے لئے وقف کر دوں گا۔ برطانیہ واپس پہنچ کر میں نے ''برٹش مسلم ایسوی ایشن'' قائم کی اور تبلیغ اسلام کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ میرے کثیر ہم وطن انگریزوں نے اسلام کی تعلیمات کو سمجھ لینے کے بعد اسلام قبول کر لیا''۔ (38)

7۔ علاء الدین شلبی:

علاء الدین شلبی جرمن مفکر ہیں۔ وہ اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق فرماتے ہیں:

''میں نے مغرب کی گمراہی کو محسوس کرنا شروع کیا۔ مغرب الحادیت اور سرمایہ داری کے مادی نظاموں میں سرگرداں تھا۔ وہ لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے دوسروں کے حقوق غصب کرنے، ان کا خون چوسنے اور خون بہانے میں مصروف تھے۔ لالچ اور ظلم کی مشترک قدروں نے ہزار اختلافات کے باوجود ظالموں کو جمع کر دیا تھا۔

اس تاریک ماحول میں، میں نے محسوس کیا کہ اسلام تمام ادیان کا نچوڑ ہے۔ اس کی بنیاد عقیدہ توحید پر ہے۔ اس کے ستون وہ حقائق ہیں جو عقل اور روح دونوں کو مطمئن کرتے ہیں۔ یہ دین خدا کے مختار اور برگزیدہ بندوں کے ذریعے ملائکہ، الہامی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ لوگوں کو اعمال حسنہ کی تعلیم دیتا ہے تاکہ قیامت کے دن، جب اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ کے اصولوں پر فیصلے ہوں گے، ان کے چہرے نور سے معمور ہوں گے۔ مجھے اس بات پر شدید ندامت محسوس ہوئی کہ میں گوری نسل سے ہوں۔ وہ گوری نسل جس نے اپنے ظلم و عدوان اور کفر و طغیان کی وجہ سے انسانیت کے اعمال نامے کو سیاہ کر دیا تھا۔ یہ نسل انسانی قدروں سے آزاد ہو گئی، انسانوں کو رنگ اور نسل کی بنیاد پر تقسیم کیا اور اس راستے پر ایسے مظالم کا ارتکاب کیا جن سے انسانیت اپنی اصلیت سے محروم ہو گئی۔

یہ نسل اس سفید پتھر کی مانند ہے جس کا رنگ تو سفید ہوتا ہے لیکن وہ رحمت و محبت کے جذبات سے محروم ہوتا ہے۔

میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک روز میری نظر تلاوت قرآن کے دوران اس آیۂ کریمہ پر پڑی: فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ۔ دوڑو اللہ تعالیٰ کی طرف۔ میں نے سوچا کہاں جاؤں؟ آخر قاہرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک مجلس میں پہنچا جہاں اکناف عالم سے آئے ہوئے مسلمان رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر ذکر ''اللہ'' میں مصروف تھے۔ میں بھی اس مجلس میں شامل ہوگیا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا تھا جب میرا ہاتھ ایک سیاہ فام مسلمان بھائی کے ہاتھ میں تھا اور ہم یک زبان ہو کر اَللّٰهُ اَحَدٌ کا نعرہ مستانہ بلند کر رہے تھے۔ سچ ہے اسلام وہ دین ہے جو کبھی مغلوب نہ ہوگا۔ یہ دین باقی رہے گا خواہ لالچ کے مارے ہوئے کم فہم لوگ اس کو نقصان پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگالیں''۔ (39)

8۔ الفونس آتیین:

مشہور فرانسیسی مستشرق ''الفونس اتیین'' ایک سلیم الفطرت انسان تھے۔ وہ ایک ماہر آرٹسٹ تھے۔ وہ مدتوں مظاہر فطرت میں رب کائنات کی شان خلاقیت کا مشاہدہ کرنے میں مصروف رہے۔ آخر کار اسلام کے نور ہدایت نے ان کی راہنمائی کی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے ناصر الدین کا نام اختیار کیا اور پھر اپنی زندگی اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے خدمت دین میں گزار دی۔ انہوں نے مستشرقین کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے شافی جواب دیئے اور ثابت کیا کہ اہل مغرب علم، ثقافت یا شجاعت کسی میدان میں بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ (40)

9۔ علامہ محمد اسد (پولینڈ):

ان کا پہلا نام ''لیو پولڈ ویس'' تھا۔ وہ 1900ء میں پیدا ہوئے۔ بائیس سال کی عمر میں شرق وسطی کا سفر کیا۔ جرمنی کے ایک اخبار ''فرانکفرٹر'' نے ان کو شرق وسطی کے لئے اپنا گشتی نمائندہ مقرر کیا۔ اس منصب کی وجہ سے انہیں شرق وسطی کے مختلف علاقوں کا سفر کرنے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے مسلمانوں کی زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا۔ انہیں مغرب کی مشینی زندگی کی بے چینی اور خود غرضی کے مقابلے میں مسلمانوں کی زندگی میں غربت کے باوجود خلوص اور بے تکلفی نظر آئی جس نے انہیں اسلام کا مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔

انہوں نے تفصیل سے اسلام کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے اسلام کی حقانیت ان پر روز روشن کی طرح واضح کر دی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

قبول اسلام کے بعد وہ تقریباً چھ برس تک مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دیگر شہروں میں مقیم رہے۔ پھر برصغیر آ گئے اور سالہا سال شاعر مشرق علامہ اقبال کے قریب رہنے کا شرف حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد اسی حکومت کی زیر سرپرستی ایک جدید محکمہ ''اسلامی تعمیر جدید'' کی تنظیم و نگرانی پر مامور کیا گیا۔ بعد میں ان کی خدمات محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئیں اور ان کا تقرر وزارت خارجہ میں شرق وسطی کے افسر اعلی کی حیثیت سے ہوا۔ بعد میں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب بھی رہے۔ ان کا قیام پاکستان کے علاوہ مراکش میں بھی رہا۔ انہوں نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دی۔ ان کی دو کتابیں: ''اسلام آن کراس روڈز'' اور ''دی روڈ ٹو مکہ'' بہت مشہور ہیں۔

علامہ محمد اسد نے ''دی روڈ ٹو مکہ'' میں اپنے اسلام لانے کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''میں اسلام کی تعلیمات میں سے کسی ایک تعلیم کو متعین نہیں کر سکتا جس نے میرے دل کو اپنی طرف مائل کیا ہو۔ اسلامی تعلیمات کے حسین اور مکمل مجموعے نے جو ایک طرف روحانی عظمتوں کا امین اور دوسری طرف عملی زندگی گزارنے کا بہترین پروگرام ہے، مجھے اپنی طرف مائل کیا''۔

علامہ محمد اسد فرماتے ہیں:

''جب اسلامی تعلیمات کی غیر محدود قوت اور عملی زندگی سے ان کی تطبیق کی صلاحیت مجھ پر منکشف ہوئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آخر آج کا مسلمان اس حیات بخش اور قوت بخش نظام سے دور کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے اس سوال کا جواب کئی مسلمانوں سے پوچھا لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ یہ سوال میرے ذہن پر یوں سوار رہا کہ میں مسلمانوں سے اس بات پر جھگڑا شروع کر دیتا کہ وہ اپنے دین سے دور کیوں ہو رہے ہیں۔ گویا میں، جو ابھی ایک غیر مسلم تھا، مسلمانوں کے سامنے اسلام کے دفاع میں مصروف تھا۔ اور آخر کار قدرت نے راہنمائی کی اور میں نے اسلام قبول کر لیا''۔ (41)

10۔ ڈاکٹر عبداللہ علاؤ الدین (جرمنی):

والدین نے ڈاکٹر عبداللہ علاء الدین کو پروٹسٹنٹ طریقے کے مطابق کلیسا میں داخل کیا لیکن تثلیث اور کفارہ کے عقائد کو ان کے ذہن نے قبول نہ کیا۔ انہوں نے پادری سے ان مسائل کی وضاحت کرنے کی درخواست کی تو ان پر منکر خدا ہونے کا فتویٰ جڑ دیا گیا۔ پادریوں سے مایوس ہو کر انہوں نے حقیقت کی تلاش کے لئے مطالعہ کا سہارا لیا۔ ان کا جذبہ جستجو اتنا شدید تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے میں صرف دو گھنٹے سوتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''اس مسلسل مطالعہ سے میری صحت خراب ہونے لگی لیکن مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ لیکن جب میں نے اپنی قوت ارادی پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا تو رحمت ربی نے میری دستگیری اور راہنمائی کی۔ کسی جہاز ران کے سفر نامے کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظر سورۂ اخلاص اور اس کے ترجمے پر پڑی۔ میں حقیقت کو اس طرح سامنے پا کر دنگ رہ گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار پڑھا کہ نہ اللہ کو کسی نے پیدا کیا اور نہ ہی اللہ نے اپنا کوئی بیٹا پیدا کیا۔ یہ آیت پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھے اسلام کا کوئی علم نہ تھا۔ میں نے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے جرمنی سے استنبول تک سائیکل پر سفر کیا۔

میں نے قرآن شریف کو اس خیال سے پڑھنا شروع کیا کہ جس طرح کتاب مقدس کی غلطیاں تلاش کرتا رہا ہوں، اسی طرح اس کتاب کی غلطیاں بھی ڈھونڈوں گا۔ لیکن جوں جوں اس کی تلاوت اور مطالعہ سے مستفیض ہوتا گیا، میرے ایمان میں اضافہ ہوتا گیا کہ یہی وہ آخری اور سچی ہدایت ہے جس کی مجھے تلاش تھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ میں 1954ء میں استنبول میں مسلمان ہو گیا الحمد للہ کہ مجھے یہ دولت نصیب ہوئی''۔ (42)

11۔ ڈاکٹر عمر رولف ہیرنفلس (Dr. Umar Rolf Ehrenfels):

ان کا تعلق آسٹریا سے تھا۔ پہلی عالمی جنگ چھڑی تو ڈاکٹر عمر رولف ابھی بچے تھے۔ جنگ نے ان کو ترکوں کے حالات جاننے کی طرف مائل کیا۔ انہوں نے ترکوں اور عربوں کے متعلق کتابیں ڈھونڈ کر ان کا مطالعہ شروع کیا۔ پھر وہ اپنے والد اور ان کے ایک دوست کی نگرانی میں مشرقی مذاہب اور مشرقی زبانوں کی تعلیم میں باقاعدہ مشغول ہو گئے۔

بعد میں انہوں نے اپنے ایک بہترین دوست کے ہمراہ ترکی کا سفر کیا۔ ترکوں کے برتاؤ نے انہیں بہت متاثر کیا۔ وہ اسلام قبول کئے بغیر مسجدوں میں چلے جاتے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز باجماعت میں شامل ہو جاتے۔ مسلمانوں کی زندگی کے تفصیلی مطالعہ اور ان کے رویہ نے ان کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام اپنے اندر ہر قسم کے عصری مسائل کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ یہ وہ نظام زندگی ہے جو انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے اور توہمات کی بجائے سائنسی بنیادیں رکھتا ہے۔

ترکی سے اپنے وطن واپس آ کر انہوں نے ترکی کے بارے میں ایک کتاب لکھی جو برلن کے رسالے ''مسلم ریویو'' میں قسط وار چھپی۔

اسی رسالے کی وساطت سے ان کی ملاقات سیالکوٹ کے ایس۔ این۔ عبداللہ سے ہوئی جن کے ساتھ انہوں نے برصغیر کا سفر کیا۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ سفر میری زندگی کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا اور میں نے بالآخر وہ فیصلہ کر ہی لیا جس کی طرف قدرت ایک مدت سے میری راہنمائی کر رہی تھی۔ اسلام کی مندرجہ ذیل باتوں نے مجھے خصوصی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔

1۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام ایک ہی پیغام لے کر آتے رہے۔ روشنی کا منبع ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور ہر نبی نے نسل انسانی کے سامنے جو پروگرام پیش کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔

2۔ اسلام سارے مذاہب کی کامل ترین شکل ہے۔

3۔ حضور ﷺ کے بے مثال کارناموں کے باوجود آپ کو مافوق الفطرت حیثیت نہیں دی جاتی۔

4۔ اسلام قبول کرنے والا اپنے پرانے مذہب کی کسی سچائی کی نفی نہیں کرتا۔

5۔ اسلام انسانی اخوت کا علمبردار ہے اور نسلی یا لسانی تفریق کا قائل نہیں۔

6۔ اسلام پوری انسانیت کے لئے سراپا رحمت ہے''۔ (43)

12۔ ڈاکٹر غریبیہ (فرانس):

ڈاکٹر غریبیہ کو بحری سفروں اور کتابوں کے مطالعہ کا انتہائی شوق تھا۔ اسی شوق نے انہیں آخر کار ساحل مراد تک پہنچا دیا۔ وہ اپنے قبول اسلام کے متعلق بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

میں قرآن حکیم کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظریں سورۂ نور کی ایک آیت پر جم گئیں۔ وہ آیت یہ تھی۔

''اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ط ظُلُمٰتٌ م بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰهَا وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ'' (44)

''یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں۔ چھا رہی ہوتی ہے اس پر موج۔ اس کے اوپر اور موج (اور) اس کے اوپر بادل (تہ درتہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۔ جب وہ نکالتا ہے اپنا ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے۔ اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لئے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے تو اس کے لئے کہیں نور نہیں''۔

جب میں نے یہ آیت پڑھی تو میرا دل تمثیل کی عمدگی اور انداز بیان کی واقعیت سے بے حد متاثر ہوا اور میں نے خیال کیا کہ محمد ﷺ ضرور ایسے شخص ہوں گے جن کے دن رات میری طرح سمندروں میں گزرے ہوں گے۔ لیکن اس خیال کے باوجود مجھے حیرت تھی اور پیغمبر اسلام ﷺ کے کمال اسلوب کا اعتراف تھا کہ انہوں نے گمراہوں کی آوارگی اور ان کی جدوجہد کی بے حاصلی کو کیسے مختصر مگر بلیغ اور جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ گویا وہ خود رات کی تاریکی، بادلوں کی دبیز سیاہی اور موجوں کے طوفان میں ایک جہاز پر کھڑے ہیں اور ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی بدحواسی کو دیکھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سمندری خطرات کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اس قدر کمتی کے لفظوں میں ایسی جامعیت کے ساتھ خطرات بحر کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔

لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد عربی ﷺ امی محض تھے اور انہوں نے زندگی بھر کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا تھا۔ اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہو گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ محمد ﷺ کی آواز نہیں بلکہ ان کے خدا کی آواز ہے جو رات کی تاریکی میں ہر ڈوبنے والے کی بے حاصلی کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ میں نے قرآن کا دوبارہ مطالعہ کیا اور خصوصاً متعلقہ آیت کا خوب غور سے تجزیہ کیا۔ اب میرے سامنے مسلمان ہوئے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ میں نے شرح صدر کے ساتھ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا''۔ (45)

13۔ ڈاکٹر خالد شیلڈرک(Dr. Khalid Sheldrick):

ڈاکٹر خالد شیلڈرک کا تعلق انگلستان سے تھا۔ یہ ایک مشہور اور باصلاحیت صحافی تھے۔ انہوں نے عیسائیت کے مذہبی ماحول میں پرورش پائی لیکن عیسائیت کے غیر عقلی عقائد انہیں مطمئن نہ کر سکے۔ انہوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا۔ اسلام کے متعلق مستشرقین کی کتابیں پڑھیں جو اسلام کے خلاف الزامات سے پر تھیں اور یہی کتابیں ان کے لئے ہدایت کا سبب بن گئیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:

''مذاہب عالم پر انگلستان کی لائبریریوں میں مجھے جتنی کتابیں بھی ملیں، میں نے وہ پڑھ لیں۔ اس مرحلے میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ ان کتابوں میں یہودیت، ہندومت اور بدھ مت وغیرہ کے بارے میں تو صرف معلومات ہی تھیں مگر اسلام کا جہاں بھی ذکر آتا کوئی بھی مصنف طعن وتشنیع کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اسلام کے بارے میں ان کتابوں کا ماحصل یہ تھا کہ اسلام بذاتہ کوئی مستقل مذہب نہیں ہے بلکہ وہ محض عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال کا مجموعہ ہے۔ قدرتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر واقعی اسلام ایسا بے حقیقت مذہب ہے جیسا کہ ہمارے مصنفین ظاہر کرتے ہیں تو پھر اس پر اس قدر اعتراضات طعن وتشنیع اور شور وواویلا کی اتنی ضرورت کیوں ہے اور اس کے مقابلہ ومدافعت پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟

اس احساس نے غور وفکر کی راہیں مزید کھول دیں اور یہ بات میرے دل میں بیٹھتی چلی گئی کہ اگر عیسائی مصنفین مذہب اسلام سے خائف نہ ہوتے اور اس کی قوت وحرکت سے مرعوب نہ ہوتے تو اس سے مقابلہ ومجادلہ کی اس قدر فکر نہ کرتے۔ نہ اٹھتے بیٹھتے اس کی تذلیل کے درپے ہوتے۔

اب میں نے طے کر لیا کہ اسلام پر خود مسلمانوں کی کتابیں پڑھوں گا اور اسے اس کے صحیح آئینے میں دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ میں نے سارا وقت اسلام کو پڑھنے اور سمجھنے میں لگا دیا اور خدا کا شکر ہے کہ حقیقت تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔

میں نے خوب دیکھ لیا کہ اسلام کے خلاف اعتراضات کی جو بوچھاڑ کی جاتی ہے وہ قطعی بے بنیاد ہے۔ اسلام ہی دین فطرت ہے اور سلامت طبع رکھنے والا کوئی فرد اس سے زیادہ عرصہ تک دور نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میں نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے قبول اسلام کی اطلاع اپنے والد کو دی۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہیں میرے عیسائیت کو خیر باد کہنے سے تو کوئی رنج نہ ہوا مگر میرے قبول اسلام کی خبر سے ان کے دل پر سخت چوٹ لگی اور ان کے ساتھ خاندان نے بھی شدید صدمہ محسوس کیا''۔(46)

14۔ محترمہ مریم جمیلہ(امریکہ):

محترمہ مریم جمیلہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ قبول اسلام سے پہلے بھی وہ پاکیزہ اور باوقار زندگی کی حامل تھیں۔ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد تصنیف وتالیف کے میدان میں اسلام کی خدمت میں زبردست کوششیں کی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں مشہور ہیں جن میں ''اسلام اینڈ ماڈرنزم'' اور ''اسلام ان تھیوری اینڈ پریکٹس'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بچپن میں موسیقی کے شوق نے انہیں عربی موسیقی کا دلدادہ بنا دیا۔ وہ عربی موسیقی کے ریکارڈ اکٹھے کرتیں اور انہیں سن کر ان کو انتہائی سکون میسر آتا۔

ان ریکارڈز میں سے ایک میں قرآن حکیم کی سورۃ مریم کی تلاوت بھی تھی۔ اس تلاوت کو سن کر وہ جھوم اٹھتیں۔ وہ نہ عربی گانوں کو سمجھ سکتی تھیں اور نہ ہی قرآن حکیم کو لیکن اس کے باوجود وہ ان کو سن کر قلبی سکون محسوس کرتیں۔

اسی شوق نے انہیں قرآن حکیم کے مطالعے کی طرف متوجہ کیا۔ انہیں جارج سیل کا ترجمہ قرآن ملا۔ انہوں نے اس ترجمہ کو پڑھا لیکن اس کے مسلسل مطالعہ کے باوجود کچھ سمجھ نہ سکیں۔ اس کے بعد خوش قسمتی سے انہیں ''محمد مارمڈیوک پکتھال'' کا ترجمہ قرآن مل گیا۔ اس

ترجمہ قرآن کے مطالعہ کے متعلق ان کے جو تاثرات تھے انہیں وہ خود یوں بیان کرتی ہیں:

''جوں ہی میں نے اس کتاب کو کھولا، ایک زبردست انکشاف نے میرا استقبال کیا۔ زبان کا حسن اور بیان کی فصاحت مجھے اپنے ساتھ بہالے گئی۔ دیباچے کے پہلے ہی پیرے میں مترجم نے بہت خوب صورت طریقے سے وضاحت کی ہے کہ یہ قرآنی مفاہیم کو، جیسا کہ عام مسلمان اسے سمجھتے ہیں، انگریزی زبان میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اور جو شخص قرآن پر یقین نہیں رکھتا، اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کرسکتا...... میں فوراً سمجھ گئی کہ جارج سیل کا ترجمہ قرآن ناگوار کیوں تھا دراصل جارج سیل اٹھارہویں صدی کا عیسائی عالم اور مبلغ تھا مگر سخت متعصب اور تنگ نظر۔ اس کے ترجمے کی زبان مغلق ہے اور حاشیے بلاضرورت۔ سیاق وسباق سے ہٹ کر بیضاوی اور زمخشری کے حوالے دیئے گئے ہیں تاکہ عیسوی نقطہ نظر سے انہیں غلط ثابت کیا جاسکے''۔

قرآن حکیم کے مطالعہ کے بعد مریم جمیلہ نے کتب احادیث خصوصاً ''مشکوٰۃ المصابیح'' کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس کے مطالعہ سے وہ جس نتیجے پر پہنچیں وہ ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔ کہتی ہیں:

''مشکوٰۃ کے مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت میں ذرہ برابر شبہ نہ رہا کہ قرآن حکیم وحی الٰہی ہے۔ اس بات نے اس امر کو تقویت دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ محمد ﷺ کی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ قرآن زندگی کے بارے میں تمام بنیادی سوالات کا ایسا مسکت، ٹھوس اور اطمینان بخش جواب دیتا ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی''۔

محترمہ مریم جمیلہ نے برسوں کے مطالعہ کے بعد، اور اسلام کے عقائد، عبادات اور دیگر تعلیمات کو پوری طرح پرکھ کر اور دیگر ادیان کی تعلیمات سے ان کا موازنہ کرکے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ امریکہ سے پاکستان منتقل ہوگئیں اور اپنی زندگی کو اپنے دین کی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ (47)

وہ لوگ جنہوں نے یورپ اور امریکہ میں آنکھ کھولی، عیسائی اور یہودی گھرانوں میں پروان چڑھے، اسلام کے متعلق انہیں بچپن سے یہ تصور دیا گیا کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت کی بگڑی ہوئی شکل کے سوا کچھ نہیں، جن کو بتایا گیا کہ دنیا کی ہر برائی دین اسلام میں موجود ہے اور یہ دین اپنے پیروکاروں کو درندوں سے بدتر بنا دیتا ہے، ایسے لوگ مسلمان ہوئے، ایک نہیں ہزاروں اور یہ عمل مسلسل جاری ہے۔

اس اسلام دشمن ماحول میں اسلام قبول کرنے والوں میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عیسائیت اور یہودیت کے کٹر پیروکار بھی ہیں اور ملحد بھی۔ سائنس کی دنیا کے عالمی شہرت یافتہ لوگ بھی ہیں اور بحر علم وحکمت کے شناور بھی۔ سیاستدان بھی ہیں اور دفاعی افواج سے تعلق رکھنے والے بھی۔

ایسے خوش نصیبوں کی تعداد بھی ہے۔ ان کے حالات پر کئی مسلمان مولفین نے کتابیں تالیف کی ہیں۔ ہم نے ان میں سے چند ایک کے نام اور ان کا انتہائی مختصر تعارف صرف نمونے کے لئے ذکر کیا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ صرف انہی لوگوں کا ذکر کیا جائے جنہوں نے اسلامی ادب کے وسیع مطالعہ کے بعد اسلام قبول کیا ہو۔ کیونکہ ہماری بحث مستشرقین سے ہے۔ اور یہ لوگ جب مغرب کی سرزمین پر بیٹھ کر اسلام کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر نے اسلام کے مطالعہ سے پہلے دیگر ادیان مشرق کی تعلیمات کا مطالعہ کیا، تو اس وقت وہ لوگ مستشرق کی ہر تعریف کے لحاظ سے مستشرق تھے۔ لیکن اب جب کہ انہوں نے کلمہ توحید پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کردیا ہے تو اب وہ مستشرق نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کا جزو ہیں۔

مستشرقین صدیوں سے لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے بے پناہ وسائل کو اس مکروہ مقصد کے لئے استعمال کیا ہے لیکن ان کی ان مساعی کے باوجود ان کے اپنے مذاہب اور ان کی اپنی اقوام کے لوگ دھڑا دھڑ اسلام قبول کررہے ہیں۔ کوئی شخص قرآن حکیم میں کسی بحری سفر کے تجربات کا خوب صورت بیان دیکھتا ہے تو وجد میں آجاتا ہے۔ کسی کو مستشرقین کا

اسلام کے خلاف غیر معقول اور معاندانہ رویہ حقیقت کی جستجو کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ مستشرقین جس شمع کو بجھانے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اس کی ضو میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ان کے اپنے ظلمت کدے بھی اس کی تنویرات سے محفوظ نہیں۔

مستشرقین کی ان کوششوں اور ناکامیوں کو قدرت نے چودہ سو سال پہلے کس خوب صورت انداز میں بیان فرما دیا تھا:

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط فَسَیُنْفِقُوْنَھَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ حَسْرَۃً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ" (48)

"بے شک کافر خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے۔ اور یہ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کریں گے۔ پھر ہو جائے گا خرچ کرنا ان کے لئے باعث حسرت و افسوس۔ پھر وہ مغلوب کر دیئے جائیں گے"۔

فصل سوم

برصغیر میں تحریک استشراق

تحریک استشراق کا عروج:

انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لئے متعدد اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ پچھلی صدیوں میں عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط و انحاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا، ایک تو ان کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف ''مغرب'' کو زمانہ بیداری کے بعد سے سیاسی، عسکری، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ہر میدان میں مسلسل تفوق و بالادستی حاصل ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالم اسلام خستہ و زار رہوا اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا، یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو، اقوام مغرب کے لئے بہر حال خوش آئند تھی، اور اس سے برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا۔ چنانچہ زیر نظر دور (1800 تا 1925ء) تحریک استشراق کو عروج و کمال کی عبارت ہے اس عہد میں تحریک استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا۔ مستشرقین کو انداز و اطوار اگرچہ بدل گئی تاہم کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے ان کے خلاف اپنی اسلاف پر بازی لے گئی، چنانچہ:

(1) کمیت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ زیر بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی۔ اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے جو خاموش صلیبی جنگ کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے۔ مثلاً فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، سویڈن، ہنگری، روس، بیلجیم، چیکوسلوا کیہ، فن لینڈ، وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے۔

(2) کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصانیف کے ڈھیر لگا دیئے، ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا بلکہ عقائد اسلام، قرآن، حدیث، سنت، اجتہاد، عرب، اہل عرب اور احوال عرب ترکوں اور عربوں کے تعلقات، اسلام کی اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبر اسلام کی سیرت و سوانح وغیرہ پر کثرت سے لکھا گیا۔ اس دور میں مستشرقین کا معیار تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انہوں نے ایسا کمال دکھایا، جو آج بھی باعث حیرت ہے۔ قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافات قدیم کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویت وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں، ان کی محنت و ریاضت، علم شناسی اور شرق نوازی کی روشن دلیل ہیں۔ بلکہ یہ ان کا مسلمانوں پر احسان ہے کہ ان ہی کی کوششوں کے طفیل بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں مسلمانوں تک پھر سے پہنچیں اور مشہور و متعارف ہوئیں۔

(3) مستشرقین کے گروہ میں حسب سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف و تالیف میں حصہ لیا۔ ایک طرف اگر روایتی قسم کے متشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے تو دوسری طرف حقیقت بیں، انصاف پسند، نرم رو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے۔ مثلاً گاڈفرے ہگنز، کاسن دی پرسیوال، ویل، رینان، گوئٹے، شول، کارلائل و رورسٹھم وغیرہ۔

(4) مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا اور بحیثیت مجموعی اس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا نہ رہا، بلکہ مختلف عوامل کے نتیجہ میں نرم، حقیقت پسندانہ اور معقول ہوتا چلا گیا۔ اس کی بظاہر وجہ ایک شرقی مصادر تک ان کی رسائی، عربی اور دوسری شرقی زبانوں سے واقفیت تھی کہ جس کے نتیجہ میں محض تخمین و ظن کے بجائے وہ عقل و استدلال اور علم روشنی میں بات کرنے لگے۔ شرقی ممالک کے مشاہدات اور اسفار نے ان کے اپنے اسلاف کی لغویت ثابت کر دی، اور بیان و واقعہ کا تضاد سامنے آ گیا۔ دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی۔ نیز جدت پسندی، سائنسی ایجادات و اختراعات، تعصب اور تقشف کے خلاف بے چینی، رومانی تحریک،

کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی موثر عوامل ثابت ہوئی ۔ان باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت ونفرت پر محبت ومودت کے جذبات غالب آ گئے تھے۔ بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انہیں نقطہ نظر بدلنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بہرحال اصل وجہ ہم کسی کو قرار دیں، واقعۃً عملاً یہ پیش آیا کہ:

(i) اس دور میں ان کے یہاں لغویات کم ہو گئیں اور الزامات واتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہو گیا۔

(ii) صورتِ حالات نے کیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کر دیئے جنہوں نے جرأت سے کام لے کر اپنے پیشرو مصنفین کی تغلیط کی، اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا۔

(iii) اپنی سرگرمیوں کو منظم و مرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کئے مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس 1822ء رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹش اینڈ آئرلینڈ 1823ء اور امریکن اورینٹل سوسائٹی 1842ء وغیرہ، ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جریدے نکالنا شروع کر دیئے۔ جس سے ان کی تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی۔ لوگوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے میں رسائل وجرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے متذکرہ بالا مجلات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ اپنی حکمت عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد رسائل وجرائد کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ چنانچہ ہندوستان سے (The Muslem World) کا اجراء پیرس سے 1895ء (Revae-de-Islam) کا اجراء روس سے 1912ء میں (MIR Islam) کا اجراء وغیرہ، رسائل وجرائد اور مجلات کی ان اشاعتی سرگرمیوں کا بظاہر مقصد تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کرا سکیں۔لیکن یہ باطن مدعا، اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا، رہی ان کی بلند آہنگی تو وہ صاف نتیجہ تھی اقوام یورپ کی بالادستی کا اور استعماری تسلط کا، بہرحال اب منزل وہ بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانگرس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور 1873ء میں اسے پہلی بار عملی جامہ پہنایا گیا۔ عالمی کانگرسوں کا انعقاد بھی ان کے لئے بڑا مفید مطلب تھا۔ مختلف اداروں کی سرگرمیوں، کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علماء وفضلاء کی شرکت، مقالات، خطبات، صلاح مشورے، قراردادیں وغیرہ، یہ سب باتیں تحریکِ استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لئے بہرحال ضروری تھیں اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا اور انیسویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کر دیا۔ (49)

بہرحال یہ تفصیل اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ تحریکِ استشراق کا دور عروج وکمال تھا اور پھر ہم نے دیکھا کہ تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی رفتار سے ترقی ہوئی۔ مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام سرگرمیاں، بہت منظم طریقے سے، ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں۔ اسی عہد کی آخری دہائی میں اگرچہ عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور متعدد واقعات وحوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی، سماجی اور معاشی وثقافتی حالات کا نقشہ بدل ڈالا۔

اسباب ومحرکات:

تحریکِ استشراق نے اپنے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک کا سفر جس انداز سے طے کیا ہے اس کا ایک عمومی جائزہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے اور بین السطور تحریک کے اغراض ومقاصد اور محرکات کی بڑی حد تک نشاندہی بھی ہو چکی ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے پس پردہ محرکات واسباب کو صاف صاف بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ بطور خلاصہ ان کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

1۔ اسلام اور ادیان غیر میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں اسلام کا نظریہ حیات اس کا نظام فکر وعمل، اس کے تہذیب وتمدن کا اظہار، یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے۔ پھر دانائے سبل ختم الرسلؐ نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اس نے روز اول سے ہی ادیان باطلہ کی نفی کر دی تھی۔ اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار، اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کے بارہ میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں اور اپنے بغض وعناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں ان کا یہ رویہ اور ان کی شقاوت و قساوت دراصل نظریاتی وفکری بنیادوں پر استوار ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ”تم دیکھو گے کہ اہل ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس لئے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ (50)

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے ان کے پورے گروہ میں نمایاں یہود، نصاریٰ اور مشرکین ہیں۔ ان کو اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پر پسند نہیں بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان، اسلام دشمنی کے زیر سایہ ہوئی اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے۔

2۔ نظریاتی سبب کے علاوہ ایک سبب تاریخی بھی ہے محمد رسول ﷺ کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا گیا اور اس کے علمبرداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر لہرا دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی پیش قدمی میں اسلام نے اپنی راہ کی تمام مزاحمتوں کو اس آسانی کے ساتھ ختم کر دیا کہ دنیائے مغرب آج تک انگشت بہ دندان ہے۔ خاص طور پر اس وقت کی معلوم دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم اور فارس کا سر غرور اسے یوں سرنگوں کیا کہ وہ صدیوں خمیدہ رہا۔ بہر حال اسلام کی تیز رفتاری کے ساتھ وسعت واشاعت نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی ونظریاتی رفعتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں (شام، فلسطین، مصر وغیرہ) پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے۔ شمالی افریقہ کی فتوحات، اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیر وزبر کر دیا۔ اور یوں اسلام اور مغرب کے درمیان عداوت کی مستقل بنیاد پڑ گئی۔ یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور مخاصمانہ کاروائیوں کا بھی نقطہ آغاز ثابت ہوا۔

3۔ محاربات صلیبی کو اگر ہم تحریک استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہو گا۔ صلیبی جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے البتہ اس حد تک نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام ونامراد ہوئیں اور (1096ء سے 1292ء تک کے) معرکہ ہائے صلیب وہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے۔ اس لئے انہوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لئے علمی وفکری محاذ کو منظم کیا جائے۔ یہی فیصلہ بالآخر تحریک استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں لارڈ ڈلبی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے کہ ”فوجی اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں مگر یورپی لوگ دین اسلام اور اس کی تہذیب کے بارہ میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے ان میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے۔

4۔ مستشرقین من حیث المجموعہ چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، اپنی اصل ونسل کے اعتبار سے بہر حال یہودی، عیسائی اور مشرک ہی رہے ہیں۔ گویا اختلاف دین ومذہب کی بنا پر ان کے جذبات وخیالات تو پہلے سے ہی مذہبی وعداوت کے آئینہ دار تھے۔ اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے حقیقی مآخذ سے دور صدیوں جہالت وبے خبری اور عدم واقفیت کا شکار رہے۔ اس کا واضح نتیجہ ایک طرف تو یہ سامنے آیا کہ اسلام اور داعیٔ اعظمؐ کے بارے میں کم وبیش انیسویں صدی کے اواخر تک دانستہ یا نادانستہ طور پر وہ جو

کچھ لکھتے رہے اور پھیلاتے رہے وہ صریحاً ظن وتخمین اور وہم وگمان کی پیداوار تھا۔ چنانچہ بے سروپا روایات، من گھڑت حکایات، فسانہ فسوں، لچر قصے، کہانیاں اور اسی طرح کا بلا تحقیق خام مواد مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام کی نفرت انگیز تصور پیش کرنے کے لئے بڑی دلیری کے ساتھ صدیوں استعمال کرتے رہے (جس کا کچھ اندازہ پچھلے تاریخی جائزہ میں سامنے آچکا ہے اور کچھ جھلکیاں آئندہ فصل میں سامنے آئیں گی) پھر دوسری طرف جب جہالت و بے خبری کا پردہ چاک ہوا اور مستشرقین اسلامی مآخذ کی تحقیق وتفتیش میں منہمک ہوئے، تب بھی انہوں نے دانستہ طور پر قرآن واحادیث سے کھیلنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔ نیز مشرقی مصادر کی ترتیب کے سلسلہ میں تمام محنتوں کے باوجود فاش قسم کی غلطیاں کرتے رہے۔ (51)

بہر حال ان تمام باتوں کا مقصد ایک تھا یعنی تشکک وتذبذب کے بیج بو کر اسلام اور سرور عالمؐ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا اور انہیں آمادہ بہ نفرت کرنا، اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں بقول ایک مصنف ''ایسے خیالات کو خاموشی کے ساتھ اسلام کے نظام فکر میں داخل کر دیں جس کا ادراک راسخ العقیدہ لوگوں کے سوا دوسرے نہ کرسکیں۔ انہوں نے یہ خیال کرلیا کہ ان کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر ان کی ہر بات کو بلا چون وچرا درست مان لیا جائے گا۔ چنانچہ علوم اسلامی کا ہر میدان انہوں نے اپنی جولانگاہ کے لئے منتخب کیا اور علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں انہوں نے خلط مبحث کام نہ لیا ہو''۔

5۔ مسلمانوں کا زوال وانحطاط بحیثیت مجموعی تحریک استشراق کے فروغ کا باعث ہوا۔ ادھر عالم اسلام سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ اندلس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا اور پھر سیاسی انحطاط، معاشرتی واخلاقی اور تہذیب وثقافت کے تنزل کا باعث ہوا تو اُدھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں بلکہ اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لے کر تو اتنا غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے انہیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا۔ تو اقوام یورپ نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ واضح تھا مغربی تہذیب کا غلبہ چلا گیا اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا تو مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی اور تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی اور اس طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ اپنے ہتھیار تیز کرلیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں ان کے افکار وعلوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کے مآخذ کو استعمال کرسکیں اور یوں اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔

6۔ پندرہویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے پھر انگڑائی لی اس کے عہد تاریک کا خاتمہ ہوا اور ان کے ہاں علم وتحقیق، بیداری، تہذیب وتمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یہاں کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا۔ اور انہیں ضرورت تھی کہ ایشیا اور فریقہ میں انہوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں انہیں مضبوط ومستحکم بنانے کے لئے مادی وسائل اور اسلحہ سے زیادہ توجہ علمی وذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے۔ چنانچہ استعمار مغرب کے تحفظ کے لئے بجائے خود تحریک استشراق کی سرگرمی ناگزیر تھی یہ وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم وفنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے یورپی حکمران کی تحریک استشراق کی مکمل سرپرستی کی۔ یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہیں تھی بلکہ مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں۔ جو ان کی تحقیق وتفتیش کے لئے ضروری تھی۔

7۔ مذہبی اور سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریک استشراق سے وابستہ تھے۔ اقوام یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتدا تجارتی تعلقات سے ہوئی تھی۔ پھر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہی تجارت بالآخر سیاہ وسفید کے مالک اور حکمران بن بیٹھے۔ تاہم منڈی والی تجارت میں وہ اب بھی منہمک تھے۔ استشراقی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کتابوں کی اشاعت وطباعت، مورخین کی کتابوں کی فروخت اور مستشرقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ اہل یورپ کے تجارتی مفادات کے تحفظ وفروغ کا باعث بھی ہوا۔ (52)

اسباب و محرکات کا یہ مختصر سا تجزیہ تحریک استشراق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے جاننے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے اب ہم آگے بڑھ کر ایک نظر ان مقاصد پر ڈالنا چاہتے ہیں جو مستشرقین کی طرف سے ہمارے ہادی برحق سید الانبیاء والرسل ﷺ کی شخصیت و کر دار کو (نعوذ باللہ) مجروح کرنے کے لئے تحریک استشراق کی صورت میں سامنے آئے۔

تحریک استشراق کے مقاصد:

پیغمبر اسلام ﷺ سے متعلق مستشرقین کے موقف کی تشکیل ایک ایسے دینی دائرہ کے اندر ہوتی ہے جس میں قومی تعصب، ذہنی تنگی، بغض و کینہ اور نفرت و کدورت کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور ان کی ارادی وغیر ارادی دونوں طرح کی جہالت اس کا احاطہ کئے ہوتی ہے۔ اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت اور عام لوگوں کے درمیان ناقابل عبور گھاٹیاں اور تہہ بہ تہہ یکساں حائل ہو گئی ہیں۔ غرض رسول اکرم ﷺ کے متعلق مستشرقین کی بحث و تحقیق اور ان کا مطالعہ و تجزیہ نہ معروضی و موضوعی ہے اور نہ تاریخی و علمی، بلکہ وہ سب و شتم کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں کلیسا کی دینی اور تقدس مآب شخصیتوں کے ساتھ غیر دینی اور لامذہبی افراد بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں، اور یہ سیلاب بلا خیز آج تک رواں ہے۔

مستشرقین نے رسول ﷺ کے متعلق جو کچھ ہرزہ سرائی کی ہے اسے بطور استشہاد پیش کرنے کے لئے بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ہے اور قلم میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر نقل کفر کفر نباشد کے بموجب ان کے بعض ہفوات نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ خیالات دور جدید کے مستشرقین کے ہیں جن میں سے بعض ابھی بقید حیات بھی ہیں۔ عمادالدین کسی مستشرقین کی لکھی ہوئی بات کو بیان کرتے ہیں کہ:

''مشرق میں ایک نئے دشمن اسلام کا ظہور ہوا جس کی بنیاد اور تعمیر طاقت اور شدید تعصب پا قائم ہے۔ محمد ﷺ نے اپنے پیروؤں کے ہاتھوں میں تلوار دے کر اخلاق کے مقدس ترین ضابطے پامال کر ڈالے اور اپنے ساتھیوں کو فسق و فجور اور لوٹ کھسوٹ کی اجازت دیدی۔ لڑائیوں میں قتل ہو جانے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ جنت کی دائمی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں ان کے متبعین نے ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین کو اپنا شکار بنا لیا۔ ان کی وجہ سے اٹلی کو خطرہ درپیش ہوا۔ آدھا فرانس بھی ان لوگوں کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ اور تہذیب و تمدن پر سخت افتاد آئی ۔۔۔ یہ عیسائیت تھی، جس نے اسلام کی فاتحانہ پیش قدمی پر روک لگائی اور تقریباً 2 سو برس تک صلیبی جنگیں ہوتی رہیں جن کے نتیجہ میں یورپ میں اسلحے عام ہوئے۔ تب عیسائیت کو نجات ملی اور صلیبی جھنڈے کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہوا اور انجیل نے قرآن اور اس کے معمولی اور گھٹیا قوانین اخلاق پر فتح حاصل کی''۔ (53)

ایک اور مستشرق مسیو کیون اپنی کتاب میتھاڈالوجی آف اسلام میں لکھتے ہیں:

''دین محمدی ﷺ، جذام کی بیماری کی طرح لوگوں میں پھیلا اور اس نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک خوفناک مرض اور ایسا پاگل پن ہے جو انسان کو انتہائی کمزوری اور سستی پر آمادہ کرتا ہے اور اگر بیداری کرتا ہے تو صرف خون ریزی، شراب خواری اور دوسری ساری برائیوں کے لئے مکہ میں (؟) محمد ﷺ کی قبر بجلی کا ایک ایسا ستون ہے جو مسلمانوں کے سروں میں جنونی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور انہیں ہذیان، ہسٹیریا، عقل فراموشی اور اللہ اللہ کے الفاظ کی رٹ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے اور جو چیزیں اصل فطرت کی مرغوب ہیں ان سے نفرت کو خوگر بناتا ہے مثلاً لحم خنزیر، شراب اور موسیقی وغیرہ اور ان میں سنگدلی اور فسق و فجور کے جذبات و خیالات کی پرورش کرتا ہے''۔ (54)

مستشرق جولیان اپنی کتاب تاریخ فرانس میں لکھتے ہیں:

''محمد ﷺ مسلمانوں کے مذہب کے بانی ہیں انہوں نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ دنیا کو زیر کریں اور سارے مذاہب کو تبدیل کر کے اپنے مذہب کا بول بالا کریں۔ ان بت پرستوں (مسلمانوں) اور عیسائیوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ عربوں نے اپنے مذہب کو طاقت سے لوگوں پر مسلط کیا اور لوگوں سے کہا کہ اسلام لاؤ ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جب کہ مسیح کے ماننے والوں نے اپنی نیکی اور حسن سلوک

سے لوگوں کو راحت بخشی، اگر یہ عرب ہم پر فتح یاب ہو جاتے تو خدا جانے دنیا کی کیا حالت ہوتی۔ آج ہم بھی الجزائری اور مراکشی مسلمانوں جیسے ہوتے''۔(55)

ڈاکٹر گلوور نے اپنی کتاب ''تقدم التبشیر العالمی'' (عالمی مشنریوں کی ترقی) میں جو 1960ء میں نیویارک سے شائع ہوئی ہے ان کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''محمد ﷺ کی تلوار اور قرآن یہ دونوں تہذیب، حریت اور حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور دنیا پر اب تک جو تباہی و بربادی منڈلا رہی ہے اس کے سب سے بڑے باعث یہی ہیں۔ جس طرح قرآن، حقائق و خرافات اور قوانین اور دیومالائی تصورات کا عجیب و غریب مجموعہ ہے اسی طرح تاریخی غلطیوں اور باطل خیالات کی بھی اس میں آمیزش ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے۔ اس کی کسی خاص تفسیر کے بغیر اسے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا معبود وہ اللہ ہے جو تنہا ہے، بے نیاز ہے، اس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ بیٹا، گویا اللہ ایسا ظالم و جابر بادشاہ ہے جس کو اپنی مخلوق و رعایا سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ اسلام ان دونوں کے ربط و تعلق کا ذکر کرتا ہے۔ محمد ﷺ ایک آمر مطلق تھے ان کا خیال تھا کہ قوم پر بادشاہ کا تو یہ حق ہے کہ وہ اس کی مرضی پر چلے مگر بادشاہ جو چاہے من مانی کرے۔ خود محمد ﷺ کی فطرت میں بھی یہ بات داخل تھی۔ چنانچہ جو ان کی مرضی پر نہ چلتا وہ اسے قابل گردن زدنی سمجھتے تھے۔ ان کا عربی لشکر، تباہی و بربادی اور غلبہ و تسلط کا پیاسا تھا۔ جس کو اس کے پیغمبرؑ نے ہدایت بھی یہی دی تھی کہ جو ان کی اتباع کو نامنظور کرے اور ان کے راستہ سے دور ہو جائے اسے قتل کر دیں''۔(56)

مستشرق سفاری نے 1752ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا ان کا خیال ہے کہ:

''محمد ﷺ نے اقتدار الٰہی کا اسی لئے سہارا لیا تا کہ لوگ اس عقیدہ کو (آسانی) قبول کرلیں۔ پھر انہوں نے خود پر بحیثیت رسول اللہ کے ایمان لانے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ یہ اعتقاد محض ایک فریب تھا جس کو عقلی ضرورت نے جنم دیا تھا''۔(57)

اسی کج بحثی اور یاوہ گوئی نے دراصل اسلام اور صلیبیت کے درمیان خلیج حائل کر دی اور دونوں میں ایسی شدید کشمکش پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں صلیبی جنگوں کے تلخ و تند گھونٹ آج تک یورپ کے حلق سے نیچے نہیں اترے اور نہ ہی وہ اس تلخی کو فراموش کر سکا ہے۔ تو مسلم محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) ایک تلخ تجزیہ کی طرح یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں کہ اسلام سے متعلق یورپ کو ورثہ میں جو حقارت کے جذبات ملے وہ غیر عقلی تعصب کی صورت میں ان کی علمی بحثوں میں ظاہر ہو رہے ہیں اور تاریخ نے یورپ اور عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں کے زمانہ سے جو خلیج پیدا کی اس پر کوئی پل نہیں بن سکا اور وہ نہ صرف یہ کہ باقی ہے بلکہ اسلام کی تحقیر و تذلیل یورپ کے طرز فکر کا بنیادی حصہ بن چکی ہے۔ درحقیقت یورپ کے اولین مستشرقین نے موجودہ دور میں عیسائی مشنریوں کا رنگ روپ اختیار کر لیا ہے۔ جن کی ریشہ دوانیاں عالم اسلام میں جاری ہیں۔ ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کی ایسی مسخ اور بگڑی ہوئی تصویر پیش کی ہے کہ وہ یورپ کے عیسائیوں کو ایک بت پرست مذہب نظر آتا ہے۔ گو بعد میں علوم استشراق مشنریوں کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ اس لئے ان پر جانبداری اور غیر عقلی رویہ اختیار کرنے اور مذہبی حمیت اور تعصب سے کام لینے کا الزام بھی نہیں عائد کیا جا سکتا۔ تاہم مستشرقین کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے اور وہ ان کی گھٹی میں داخل ہے اس کا سبب صرف صلیبی جنگیں ہی نہیں خود اسلام ہے جو ان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جیسا کہ لارنس براؤن نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اسلام کے اندر جو وسعت اور اپنی بات کو منوا لینے کی جو طاقت نیز حرکت و حرارت اور توانائی پوشیدہ ہے۔ اس کی وجہ سے وہ یورپ کے سامراج کی راہ میں تنہا دیوار اور رکاوٹ ہے۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار دی مسلم ورلڈ مطبوعہ 1930ء کے ایک مضمون میں کیا گیا ہے:

''مغرب کی دنیا پر خوف و دہشت کا طاری ہونا ضروری ہے جس کے چند اسباب ہیں۔ اسلام کا جب سے مکہ میں ظہور ہوا وہ عددی لحاظ سے کبھی کمزور نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ بڑھتا اور پھیلتا رہا۔ اور اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں ہے بلکہ اس کے بنیادی ارکان میں جہاد بھی شامل ہے۔ ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ کچھ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ عیسائی ہو گئے ہوں''۔ (58)

جرمن مستشرق بیکر نے صراحت کے ساتھ کہا کہ:

''عیسائیت کی اسلام دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام جب قرون وسطیٰ میں پھیلا تو وہ عیسائیت کے فروغ کی راہ میں ایک طاقتور پشتہ بن گیا، اور ان ملکوں پر بھی حاوی ہو گیا جو عیسائیت کے زیر نگیں تھے''۔ (59)

ایسے پر از تعصب ماحول اور کیسائی طرز فکر کے ہوتے ہوئے کس کو اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی اصل روح و حقیقت کی سمجھنے سے دلچسپی اور رغبت ہو سکتی تھی یورپ میں مذہبی اصلاح اور روشنی و بیداری کے زمانہ میں دین کو سیاست سے جدا کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی آ گئی لیکن اسلام اور خصوصاً سیرت نبوی ﷺ کے بارہ میں عیسائیت کے طرز فکر میں شمہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس تعصب پر مبنی طرز فکر کی تقویت کے لئے اسٹیج تیار ہوتے رہے اور اسلام کے تجزیہ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے مطالعہ کے لئے نسلوں کی نسلیں ان اسٹیجوں پر اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ اسی قسم کے لوگ مستشرقین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض تو خالص کیسا کے آدمی تھے جو پادریوں کے لباس میں ملبوس تھے لیکن ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کو کیسا سے کوئی سروکاری تعلق اور واسطہ نہیں تھا۔ ان سے یہ توقع ضرور تھی کہ پیغمبر اسلام ﷺ پر ان کے حملوں میں نرمی ہوگی۔ اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ان کا گذشتہ موقف اور نظریہ بدلا ہوا ہوگا۔ اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی، چنانچہ لب ولہجہ اور سب و شتم میں کچھ شائستگی آ گئی لیکن طرز فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سیرت نبوی ﷺ سے ناواقفیت اور اس کے مباحث میں تعصب کی کارفرمائیاں بدستور جاری رہیں بے سروپا تعلیل و تجزیہ کی مشقیں ہوتی رہیں۔ دانستہ غلط فہمیوں کی تکرار ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جو محض وہم و خیال اور تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار تھا اور جس کی بنیاد مستند واقعات کے بجائے شاذ اور غیر مستند روایات پر تھی۔ وہ لوگوں کی نگاہ میں یقین اعتماد اور اعتبار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ طرز فکر، انداز بحث اور طریقہ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں ان میں سے کچھ کی ذیل میں نشاندہی کی جاتی ہے اور اسی ضمن میں اس قبیل کی بعض اور غلطیوں کی جانب ہم اشارہ کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر انہی کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں اور ان کی تقویت کے لئے شاذ و غریب حدیث کو پیش کرتے ہیں اور اسے مشہور و مستند روایات پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ خواہ وہ نقد و جرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی کیوں نہ ثابت ہو۔ یہ لوگ ایسا قصداً اس لئے کرتے ہیں کہ یہی وہ واحد حربہ ہے جس سے وہ شکوک و شبہات کو ہوا دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سیرت نبوی ﷺ کے ملحقات اور کارناموں کو وہ عیسائی یا یہودی اصولوں کی دین سمجھتے ہیں۔ مستشرقین کی بڑی تعداد نصرانی مسیحی ہے اس لئے وہ اسلام کے محاسن کا اصل سہرا، عیسائیت کے سر باندھتے ہیں اور مستشرق یہودی ہیں وہ اسرائیل کے قیام اور صیہونیت کے تسلط کے بعد خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر عربی اور اسلامی چیز کا سرا یہودیت سے ملا دیں۔ درحقیقت اس باب میں دونوں گروہ اپنے میلانات و خواہشات کے تابع ہیں۔ مثلاً برطانوی مستشرق میٹگمری واٹ کہتے ہیں کہ:

''اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمد ﷺ کی غار حرا میں آمد و رفت، کوئی ناممکن بات نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ موسم گرما میں شہر مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں جا سکتے تھے وہ غار حرا میں چلے جاتے رہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی خصوصاً راہبوں کے اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں یا ہو سکتا ہے کہ خود محمد ﷺ کے ذاتی تجربہ نے ان میں بقائے دوام اور حیات جاودانی کی آرزو، امنگ اور رغبت پیدا کی ہو۔ یہی مستشرق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ناموس کا لفظ یونانی لفظ (Momos) سے مشتق ہے۔ جس کے معنی شریعت یا کتب مقدسہ کے ہیں۔ موسیٰ کے ذکر میں بھی یہ لفظ ملتا ہے اور ورقہ بن نوفل نے جب محمد ﷺ پر وحی کی کیفیت دیکھی تو اسی ناموس

کے الفاظ سے اس کو تعبیر کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے مشابہ و مماثل ہے۔ مگر محمد ﷺ کو یہ وہم تھا کہ وہ ایک قوم کے بانی اور اس کے شارع ہیں اور جیسا کہ ابتداء میں ہوتا ہے۔ محمد ﷺ شروع طبعی طور سے متردد تھے اس وقت ورقہ بن نوفل کی حوصلہ افزائی، محمد ﷺ کی داخلی کیفیات کے لئے اہم چیز ثابت ہوئی۔ اسی لئے بعد کی اسلامی تعلیمات، ورقہ بن نوفل کے افکار سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں''۔ (60)

اسلام پر پہلی نظر ڈالنے ہی سے یہ شبہ رفع ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں اور عیسائیت میں کوئی مشابہت نہیں ہے لیکن اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے بنیادی اختلافات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ یہی حقیقت تھی جس نے ماضی میں مشنریوں کے شعلوں کو بھڑکا دیا تھا۔ حال ہی میں پن گوئن سیریز کی ایک کتاب میں ایک پادری مستشرق نے ایسے کئی موازنے کئے ہیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اصلاً مسیحیت کی مسخ شدہ یا ناپختہ صورت ہے مشہور مستشرق کانٹ ویل اسمتھ نے بھی اسلام اور مسیحیت میں یکسانی اور مشابہت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی ایک دوسرے سے نفرت اور دوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے عقائد کو سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے عقیدہ کو بھی اسی صورت میں پیش کرنے اور ڈھالنے کی کوشش کی جس صورت میں وہ خود اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن بہت سے دوسرے خیالات کی طرح یہ رائے بھی منصفانہ نہیں ہے۔ کیونکہ تنہا عیسائی ہی صدیوں سے اسلام کو سمجھنے بلکہ غلط سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان کی یہ کوشش عیسائی اصطلاحات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے۔ اس کا انجام ظاہر ہے کہ سوء فہمی اور عقیدگی کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ دوسری جانب مسلمانوں کا بنیادی زاویہ نگاہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہا کیونکہ یہ نقطہ نظر قرآن کا عطا کردہ تھا۔ اسی لئے کسی مسلمان نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ عیسائیت کو کسی اور فریم میں اتاریں۔ لیکن ایک عیسائی اپنی مقدس کتابوں میں ایسی کوئی صراحت نہیں پاتا ہے جو اس کو اسلام کے بارہ میں ایک مسلمان کے اعتقادو نقطہ نظر کو قبول کرنے سے روک دے۔

اس کے باوجود وہ نہ صرف عیسائیت کے بارہ میں مسلمانوں کے اعتقاد کو رد کرتا ہے بلکہ اسلام سے متعلق اس کی رائے کو بھی رد کرتا ہے۔ اور دونوں رایوں کو تبدیل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتا۔ یہ پرانے عیسائی مبلغ (کانٹ ویل اسمتھ) اپنے قارئین کی ذہانت کا شاید احترام بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ اپنے ایک مقالہ کے مقدمہ میں علی الاعلان دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ اپنے معروضی اور خالص موضوعی مطالعہ کے بعد وہ صحیح معلومات پیش کرر ہے ہیں تاکہ انہیں منصف اور محقق تسلیم کیا جائے۔ لیکن ان سب کے باوجود دوران بحث میں بڑے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اب کسی طور پر بھی اس حقیقت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ محمد ﷺ نے یہودیوں کی کتاب تلمود اور دوسرے بعض تحریف شدہ صحیفوں کے افکار کو پیش کیا ہے اور مسیحیت کی نسبت و تعلق سے تو اس کی قوی احتمال ہے کہ محمد ﷺ کی وحی میں اس سے مدد لی گئی ہے۔ معروضی و موضوعی مطالعہ کا دعویٰ کرنے والے ان مستشرق کی یہ شاعرانہ خیال آرائی بھی لائق توجہ ہے جو مقالہ کے آخر میں درج ہے کہ دنیا والوں کو غور کرنا چاہیے کہ اس وقت کیا صورت پیش آئے گی۔ جب لاکھوں مسلمانوں کے سامنے زندہ مسیح کی انجیل کو مناسب طور پر پیش کیا جائے گا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ یہ مستشرقین اپنے مطالعہ میں معکوس طریقہ و نہج اختیار کرتے ہیں اور نتائج کے استنباط میں بجائے عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ اولین اکابر مستشرقین میں کیتانی اس طرز کے نمایاں نمائندہ تھے۔ اور آج تاریخ اسلام کے نئے ماہرین انہی کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔ یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مد نظر رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ پہلے سے رائے قائم کرتے ہیں۔ اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں جو ان کی رایوں کی کسی بھی درجہ میں تائید کرتی ہوں۔ باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں کیتانی ذی رائے اور صاحب فکر تھے انہوں نے سیرت نبوی ﷺ کی تدوین سے پہلے ہی اس کے متعلق کچھ مخصوص خیالات قائم کر لئے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے سیرت سازی شروع کی تو رطب و یابس ہر قسم کی روایتوں پر اعتماد کر لیا اور ان

روایتوں کو خاص طور پر قبول کر لیا جن سے ان کے موقف کی تائید ہوتی تھی اور ان کے ضعف یا قبح کی کوئی پرواہ نہ کی بلکہ انہیں دلیل بنا لیا اور پھر انہی کے مطابق اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا۔ حالانکہ یقین ہے کہ وہ علمائے فن کے نزدیک وضعی اور جھوٹی روایات کے مشہور طرق و سلاسل سے واقف رہے ہوں گے۔ لیکن وہ علماء کے اقوام و آراء سے چشم پوشی کر گئے۔ وہ ظاہر ہے کہ وہ صاحب فکر تھے انہیں اپنے خیال کا ثابت کرنا تھا۔ خواہ جس طریقہ سے بھی یہ ممکن ہوا گر وہ جدید طرز و اسلوب کے مطابق نقد و جرح سے کام لیتے اور غلط روایات کو رد کرتے تو پھر ''سیرت سازی'' کا کارنامہ کیسے انجام دیتے۔ نومسلم مستشرق ایٹن ڈینیہ اپنی کتاب ''الشرق کما یراہ الغرب'' (مشرق مغرب کی نظر میں) میں اس طرز و نہج کے متعلق بعض باتیں خوب لکھ گئے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

ڈاکٹر اسنوک ہیرگونج کی یہ رائے درست ہے کہ ''محمد ﷺ کی جدید سیرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی نظریہ یا کسی رائے کے متعلق تمسخر کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو گویا تاریخی مباحث کے بانجھ اور بے جان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں''۔ (61)

اس حقیقت کو موجودہ مستشرقین کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا بہتر ہوگا۔ کیونکہ اس سے انہیں اُن پرانے امراض سے چھٹکارا ملے گا جن کی وجہ سے ان کو مقدور سے زیادہ محنت و زحمت کرنے پڑتی ہے۔ اور وہ بلاشک وشبہ غلط نتائج تک جا پہنچے ہیں اور لامحالہ انہیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ اپنے کسی خیال کی تائید کے لئے بعض روایتوں کو باطل قرار دے کر ان کی جگہ دوسری روایتوں گھڑ کر پیش کریں اور یہ ظاہر ہے کہ بڑا مشکل کام ہے بیسویں صدی میں ایک عالم کے لئے صرف اسی صلاحیت کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو زمانہ، ماحول، مقام، رسوم اور ضروریات، رجحان اور میلانات جیسے بنیادی عوامل کی معرفت بھی ضروری ہے اور اس سے بڑھ کر ان باطنی عوامل کا شعور بھی لازمی ہے جو عقل و قیاس کے پیمانوں سے پرے ہیں اور جو افراد و جماعت میں بہر حال اپنی تاثیر رکھتے ہیں۔ مانٹگمری واٹ نے فرانسیسی مستشرق لامانس پر اسی قسم کے الزامات عائد کئے ہیں جن کے مرتکب اکثر مستشرقین ہوئے ہیں۔ کہ وہ کج اسلوب ہیں اور معکوس طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ مطالعہ ہی غلط ہے خاص طور پر تاریخی واقعات سے اپنی ذاتی رایوں کو یہ لوگ جس طرح مدلل کرتے ہیں وہ مطالعہ و تجزیہ کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ لامانس جیسے مستشرق، دلائل کو اکثر و بیشتر غلط رُخ دے دیتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ قطعاً علمی نہیں ہے۔ معروضیت و موضوعیت کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنے خاص معتقدات و افکار کی تائید میں ایک خیال کو چھوڑ کر دوسرا خیال اپنا لیتے ہیں مثلاً ایک عبارت میں ''الاحابیش وعبید اھل مکہ'' کا جملہ ہے۔ اس میں واؤ تفسیری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احابیش عبید مکہ کے ضمن میں شامل ہیں۔ ایک اور عبارت میں ہے ''الاحابیش ومن اطلعھم ای القریشین من قبائل کنانہ وتھامۃ'' یہاں پر واؤ تمیز نام پر دلالت کر رہا ہے لیکن لامانس نے اس عام نحوی قاعدہ کے برخلاف اس عبارت کی تشریح اپنے خیال کے مطابق کی۔ اپنی پسند اور مرضی کے مطابق تاریخی واقعات کی تفسیر اور ان سے استنباط کی سینکڑوں مثالیں ان مستشرقین کی کتابوں میں موجود ہیں مثلاً بروکلمان نے غزوہ احزاب کے سلسلہ میں کہیں اس کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا کہ مدینہ پر عرب کے قبائل کو حملہ کرنے کے لئے اکسانے میں یہود کا حصہ تھا۔ اور نہ یہ ذکر کیا کہ آزمائش اور امتحان کی سخت ترین گھڑی میں بنوقریظہ نے رسول ﷺ سے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا۔ بلکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ پھر مسلمانوں نے بنوقریظہ پر حملہ کر دیا جن کا رویہ بہر حال خاموش و پوشیدہ تھا۔ مستشرق اسرائیل ولفن سون نے غزوہ خندق میں نعیم بن مسعود کے واقعہ سے چشم پوشی کر کے صرف یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ مشرکین اور یہود کے درمیان عدم اعتمادی وجہ سے پیش آیا۔ اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے لئے دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں تھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مستشرقین اسلام دشمن عناصر پر بڑے مہربان ہوتے ہیں خصوصاً یہودیوں کے لئے وہ اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں اسرائیل ولفن سون بنونضیر کے یہود پر مسلمانوں کے حملہ کے سلسلہ میں اس کی جانب تو اشارہ کرتے ہیں کہ مورخین عرب کے نزدیک مسلمانوں کے حملہ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے رسول ﷺ پر تاتلانہ حملہ کی سازش کی تھی۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ مستشرقین اس

روایت کی صحت کو قبول نہیں کرتے ان کی دلیل یہ ہے کہ سورہ حشر میں جو بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد نازل ہوئی تھی کہیں اس سازش کا ذکر نہیں ہے وہ جوش میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر چشم بینا رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ بھلا ایسے حالات میں یہود کب یہ سازش کر سکتے تھے۔ اور ان کو یہ سازش کرنی بھی ہوتی تو وہ بجائے اس کے کہ آپ ﷺ دیوار سے بھاری پتھر پھینکتے۔ آپ ﷺ کو اچانک گھات دیکھ کر قتل کر دیتے۔ اسرائیل ولفن سون شاید یہودیوں کی نفسیات سے واقف نہیں کہ یہ وہ قوم ہے جو آخر وقت تک کسی بھی براہ راست تصادم سے بچتی رہتی ہے۔

بروکلمان لکھتے ہیں کہ:

مشرکین پر رسول ﷺ کے باقاعدہ حملہ اور لشکر کشی کی راہ میں بعض دقتیں اور رکاوٹیں تھیں۔ قدیم عربی شرافت فکر مہاجرین کو اپنے قریشی بھائیوں سے جنگ کرنے سے روکتی تھی۔ مدینہ والے اپنے طاقتور پڑوسیوں سے صلح و امن کی فضا کو غبار آلود کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار رجب کا مہینہ آیا تو رسول ﷺ نے خفیہ احکام کے ساتھ ایک فوجی دستہ کو روانہ کیا جس نے ایک تجارتی قافلہ پر اچانک حملہ کیا اور کافی مال غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس ہوا۔ اس قدیم ضابطہ اخلاق کی قانون شکنی نے خود مدینہ میں نفرت کے جذبات بھڑکا دیئے تھے۔ مگر محمد ﷺ نے اپنے پیروؤں کے عمل پر محض ہلکی سی نکیر کی اور کہا کہ ان لوگوں سے ان کا حکم سمجھنے میں سہو ہو گیا ہے۔ گو کہ ان لوگوں نے محمد ﷺ ہی کی خواہش کے مطابق عمل کیا تھا۔ بروکلمان ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کا عہد ابھی زیادہ نہیں گزرا تھا کہ ان کے اور احبار یہود کے درمیان نزاع شروع ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور دراز علاقہ میں اپنے محدود علم کے باوجود یہودی علماء علم و ادراک میں نبی امی سے بڑھ کر تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کی گرتی ہوئی ساکھ کو کسی دوسری صورت سے بحال کریں۔ چنانچہ غزوہ احد کی شکست کے بعد ایک معمولی سی بات پر انہوں نے بنو نضیر پر حملہ کر دیا۔ مستشرق ول ہاؤزن لکھتے ہیں کہ غزوہ بدر کے بعد اسلام اپنی رواداری کی پالیسی پر قائم نہیں رہ سکا۔ بلکہ اس نے مدینہ کے اندر رعب اور دہشت کی سیاست شروع کر دی۔ منافقین کے مسئلہ کو ابھارنا اسی تبدیلی کی علامت ہے اور یہودیوں کو یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ عہد شکنی ہیں۔ چنانچہ چند ہی برسوں میں سارے یہودیوں کو یا تو جلاوطن کر دیا گیا، یا پھر ان کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کے لئے چند لایعنی اسباب تلاش کئے گئے۔ مارگولیوتھ نے یہودیوں سے اپنی محبت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ خیبر کا سقوط، یہودیوں کے ساتھ سراسر ظلم تھا جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ محمد ﷺ نے ہجرت کے بعد غارت گری اور لوٹ مار کا طریقہ اختیار کیا۔ مکہ والوں سے تو اس طرز عمل کی گنجائش یوں ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے محمد ﷺ کو اپنے شہر سے نکالا تھا۔ ان کے مال و جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ مدینہ کے یہودیوں کے سلسلہ میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے محمد ﷺ کو انتقام لینا تھا۔ (62)

لیکن خیبر والے تو مدینہ سے بہت دور تھے۔ وہ محمد ﷺ یا ان کے متبعین کے حق میں کسی جرم و خطا اور ظلم و تعدی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کی سیاست میں کیسی عظیم تبدیلی آ گئی تھی۔ مدینہ میں آنے کے بعد ہی انہوں نے یہ اعلان کیا کہ یہودیوں کے ساتھ ان کا معاملہ مسلمانوں کی طرح ہوگا۔ لیکن ہجرت کے چھٹے سال میں ان کا یہ موقف سراسر بدل چکا تھا۔ اور اب محض اتنی ہی بات کسی پر حملہ کرنے کے لئے کافی تھی کہ وہ غیر مسلم ہے۔ اس سے محمد ﷺ کی اس ہوس مال و جاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے پے در پے حملے کئے۔ اسی ہوس میں پہلے سکندر اور بعد میں نپولین بھی سرشار تھا۔ خیبر محمد ﷺ کا قبضہ اس اندیشہ کا اعلان تھا کہ اسلام امن عالم کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔ مستشرق نولدیکی کو یہ حیرت ہی رہی کہ کاش عرب قبائل نے محمد ﷺ کے خلاف اپنے معابد اور دینی شعائر کے تحفظ کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہوتا تو ان کا جہاد کامیاب نہ ہوتا۔ افسوس عرب متحد نہیں ہوئے اور ان کے اختلاف و انتشار نے محمد ﷺ کو یہ مہلت دی کہ وہ یکے بعد دیگرے ہر قبیلہ کو مطیع کرتے جائیں اور ان پر کبھی طاقت و قوت کے ذریعہ اور کبھی دوستانہ معاہدوں اور پُرامن ذرائع سے غلبہ حاصل کرتے رہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ان مستشرقین نے سنت اور تاریخ کے عطایا اور ثمرات میں شکوک و شبہات پیدا کئے اور اپنے ذوق و طبیعت او

رمرضی سے ان کی نفی کی ۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک میں بھی شکوک پیدا کئے ۔ اور عجب کیا اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے وجود مبارک میں ہی شک پیدا کر دیتے ۔ بہر حال سیرت رسول ﷺ سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ جو چاہیں کہیں ۔ اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ تمام انبیاء ورسل میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے ۔ ورنگھم اس نقطہ پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض بڑے مستشرقین مثلاً میور، مارگولیوتھ، نولدیکی، اسپرنگر، ڈوزی، کیتانی، مارسین، گولیم، گولڈ زیہر اور گارڈفر وغیرہ نے نقد میں بعض اوقات نہایت غلو سے کام لیا ہے اور ان کی کتابوں میں خاص طور سے سیرت وکردار کشی کی گئی ہے ۔ رنج کا مقام ہے کہ مستشرقین کا حاصل مطالعہ اور نتیجہ فکر برابر سلبی رہا ہے ۔ فادر لامانس ممتاز مستشرق ہیں ۔ مگر تعصب میں بھی ممتاز ہیں ۔ اپنی شاندار کتابوں کو انہوں نے اسلام اور نبی اسلام ﷺ کی دشمنی سے داغدار کر دیا ۔ ان عیسائی عالم کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو گویا وہ قرآن سے منقول ہے ۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دو دلیلوں کی مطابقت کا اقتضا یہ ہو کہ انہیں رد کر دیا جائے اور ان سے ایک دوسرے کی تائید وتقویت نہ ہو تو تاریخ کی تالیف کیونکر ممکن ہو گی ؟ مستشرقین بڑی خوبصورتی سے سیرت کا اصل مصدر قرآن کو بتاتے ہیں اور پھر سیرت کے ان واقعات کی تردید کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ۔ اس طرح صاحب قرآن کی سیرت کو مشکوک کر کے خود بخود قرآن کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں ۔ گویا قرآن صرف ایک تاریخ کی کتاب ہے جس کا خاص مقصد حضرت محمد ﷺ کی مفصل سیرت کا استقصا ہے ۔ اور قرآن کے علاوہ سیرت کی دوسری روایتوں میں حضور ﷺ کے جو فضائل یا حالات بیان ہوئے ہیں وہ ناقابل قبول ہیں ۔ اسپرنگر کہتے ہیں کہ "محمد ﷺ کا نام قرآن کی چار سورتوں یعنی آل عمران، احزاب، محمد اور فتح میں آیا ہے اور یہ ساری سورتیں مدنی ہیں ۔ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے لئے محمد ﷺ کے نام کا استعمال نہیں ہوتا تھا ۔ مدینہ میں انجیل کے اثر اور نصاریٰ سے ربط وضبط کے بعد آپ ﷺ نے اپنے لئے یہ نام بطور اسم علم اپنا لیا ۔ کاش اسپرنگر سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر نبی کریم ﷺ نے اس نام کو انجیل کے مطالعہ کے بعد اپنایا تو پھر وہ محمد ﷺ کہاں ہیں جن کے بارے میں عہد نامہ قدیم وجدید میں بشارتیں موجود ہیں" ۔ (63)

سیرت سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے اور صحیح واقعات کی غیر منصفانہ نفی کے اس طرز ادا کے بارہ میں مانٹگمری واٹ نے ایک اچھی بات کہی، حالانکہ وہ خود اپنے اس اصول پر ہمیشہ عمل پیرا نہیں رہے وہ کہتے ہیں کہ "اگر واقعی ہماری خواہش یہ ہے کہ محمد ﷺ سے متعلق ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی اصلاح اور تصحیح کریں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم سیرت کے واقعات کو سچ جانیں ۔ سوائے کسی ایسی روایت کے جس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود ہو یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قطعی دلیل کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ درجہ امکان میں ہو اور اس قسم کے موضوع میں اس کا حصول دشوار ہے" ۔ (64)

چھٹی بات یہ ہے کہ مستشرقین کی تحریروں میں لا مذہبی غیر معیاری اور غیر منطقی طرز استدلال نمایاں ہے وہ سیرت کے زمانہ کو موجودہ زمانہ کے معیار کے مطابق جانچتے اور پرکھتے ہیں ۔ ایتین ڈینیہ اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے کہ مستشرقین اپنی تحریروں کو اپنے جذبات ورجحانات اور اپنے ماحول اور اس کے اثرات سے بالاتر رکھیں ۔ اسی وجہ سے سیرت نبوی ﷺ اور سیرت صحابہؓ میں انہوں نے انتہائی درجہ تحریف وترمیم سے کام لے کر اس کی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے ۔ وہ یہ دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں کہ ان کی تنقید کا اسلوب معروضی تعصب سے پاک حقیقت پر مبنی اور سنجیدہ وعلمی ہے ۔ لیکن عالم یہ ہے کہ اگر مولف جرمن مستشرق ہے تو محمد ﷺ جرمن لہجہ میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور اگر وہ اطالوی ہے تو محمد ﷺ کا طرز بھی اطالوی ہو جاتا ہے ۔ اس طرح مصنف کے ساتھ محمد ﷺ کی شخصیت بھی بدلتی رہتی ہے اگر ان لوگوں کی تحریر کردہ کتب سیرت میں اس کی صحیح تصویر تلاش کی جائے تو وہ بالکل ہی نظر نہ آئے گی ۔ یہ مستشرقین صرف خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں جو حقیقت سے تمام تر دور ہوتی ہیں ۔ والٹر اسکاٹ اور الیگزینڈر ڈیماس نے تاریخی افسانوں

میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے ان کی تصویر اس کے مقابلہ میں حقیقت سے کہیں زیادہ قریب ہے۔ لیکن ان مستشرقین نے افسانہ نگاروں کو بھی مات کر دیا اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی سیرت نگاری وہ محض اپنی مغربی منطق اور موجودہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں ان کی کتابوں میں جرمن محمد، انگریز محمد اور فرانسیسی محمد ضرور ملتے ہیں۔ لیکن محمد ﷺ عربی کا پتہ کہیں نہیں چلتا۔ یہ اور بات ہے کہ حق کے جویا محمد ﷺ کی روشن اور واضح سیرت کو پا ہی لیتے ہیں۔ اس لامذہبی اور محدود و مقامی طرز استدلال نے اکثر مستشرقین کو دوسری غلطیوں کا مرتکب بنا دیا ہے۔ اس کی نمایاں مثال وہ ہے جسے ولہاوزن اور ان کے چند رفقاء نے بیان کیا ہے تحریک اسلامی مکہ میں محدود تھی اور شروع میں مدینہ میں بھی اس کی یہی کیفیت رہی۔ مگر جب وہاں حالات سازگار ہوئے تو وہ عالمی مرحلہ میں داخل ہوئی جس کے بارہ میں اس سے پہلے محمد ﷺ نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی دور میں عدم تشدد کے قائل تھے۔ لیکن مدینہ میں جب انہیں قوت واقتدار حاصل ہوا اور ان کے اردگرد جنگ جو اور لڑائی کرنے والے اکٹھا ہو گئے تو وہ طاقت اور تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہو گئے۔ (65)

مستشرقین کا خیال ہے کہ ”محمد ﷺ کے حلقہ بگوشوں میں چونکہ وہ لوگ بھی تھے جن کا ان سے خونی رشتہ نہ تھا اور ان کا عقیدہ چونکہ خونی رشتہ سے بڑھ کر تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تو تعصب اور تنگ نظری کے اس دائرہ کو ختم کر دیتے جو خونی رشتہ کا نتیجہ تھا۔ لیکن وہ خونی رشتہ و دائرہ سے ہٹ کر ایک وسیع دینی رشتہ و دائرہ کا تصور نہیں کر سکے“۔ ان غلط کار مورخین میں سر ولیم میور بھی ہیں جو رسالت محمدی ﷺ کی آفاقیت کو بعد کی بات بتاتے ہیں بہت سی آیات واحادیث کے باوجود محمد ﷺ کو اس کا خیال نہیں ہوا اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انہیں اس کا خیال ہوا تھا تب بھی یہ بہت مخفی اور پوشیدہ رہا اور جو عالم ان کے پیش نظر تھا وہ صرف عرب تھا۔ کیونکہ یہ دین صرف اسی کے لئے ہی تھا اور محمد ﷺ نے اپنی بعثت سے وفات کے وقت تک بجز عربوں کے کسی اور کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔ گویا اسلام کی عالمیت کا بیج بو دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی نشوونما اور اس کے برگ وبار لانے میں منصوبوں اور پروگراموں سے زیادہ حالات وواقعات کو دخل ہے۔ آرنلڈ نے اس خیال کو باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

اسلام کا پیغام صرف عرب تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا فیضان ساری دنیا کے لئے عام تھا۔ جس طرح اس کے نزدیک صرف ایک ہی معبود ہے اسی طرح دین بھی ایک ہی ہے جس کی جانب ساری انسانیت کو دعوت دی گئی۔ اس بحث میں آرنلڈ کی ہمنوائی میں گولڈ زیہر، نولدیکی اور سخاؤ بھی شامل ہیں جن کا خیال ہے کہ اسلام کا پیغام محض سرزمین عرب تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ خدا کا یہ دین تمام مخلوقات کے لئے ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ساری انسانیت اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے اور محمد ﷺ چونکہ اللہ کی رسول تھے اس لئے ان پر لازم تھا کہ وہ مطالبہ کرتے اور لوگوں کو خدا کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے۔ اور یہ اعلان اسلام کے آغاز سے ہی کر دیا گیا تھا۔ آرنلڈ نے فہاوزن اور میور وغیرہ کے اس نظریہ کی بھی تردید کی ہے کہ محمد ﷺ نے حالات کے تحت قوت وطاقت کا استعمال کیا ہے مگر وہ یہ لکھ کر خود بھی غلطی کر گئے ہیں کہ محمد ﷺ کی خواہش اور ان کے ایک اندرونی جذبہ نے انہیں ایک نئے دین کی تشکیل کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اور وہ اس راہ میں کامیاب ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے نئے طرز پر ایک جداگانہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی رکھی۔ حالانکہ ابتداءً ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو خدا کی وحدانیت کی دعوت دیں۔ (66)

حقیقت یہ ہے کہ سیرت نبوی ﷺ کے فہم ومطالعہ کے لئے ایسی گہری نظر درکار ہے جو اسلام کی تحریک کا اس حیثیت سے جائزہ لے کہ وہ خدا کے علم میں ایک مکمل پروگرام کی شکل میں تھی جس کا ارتقاء تدریجاً ہوا اور یہ قرآن میں بھی متعین صورت میں تھا رسول ﷺ کی حیثیت اس پروگرام کو بہترین ڈھنگ سے اپنی بےنظیر صلاحیتوں، اعلیٰ اخلاق اور انتہائی ذہانت کے ساتھ نافذ کرنے والے کی تھی۔ قرآن گو حالات وواقعات کی رعایت سے نجماً نجماً نازل ہوا ہے۔ لیکن یہ اس کے متعین خدائی پروگرام ہونے کے منافی نہیں ہے دراصل وہ ایک بہترین نظام حیات ہے جس میں جزئیات وکلیات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ یہ حالات وواقعات ایسی وقتی اور قطعی نہیں تھے جو اسلام کی رفتار

ترقی کو محدود کر دیتے نیک ہدف اور مقصد تھا جو کبھی کبھی حالات وعادات زمانہ کے لئے روک چیلنج اور ہمہ گیر انقلاب بن جاتا تھا۔ اس کا پور طرح اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اوّل قدم ہی پر جب رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کے رخ پر لاالٰہ الا اللہ کا نقاب ڈال دیا تھا۔ اس وقت وہ کون سے وقتی حالات یا مقامی تقاضے تھے جس نے اس انقلابی نشان کی جانب آپ کی رہنمائی کی تھی جس نے جاہلیت کو بیخ دین سے اکھاڑ دیا تھا۔ اور اس کی یادگاروں، رسم و رواج، نشانات وعلامات اور معانی ومفاہیم سب کو تہہ وبالا کر ڈالا تھا۔ آرنلڈ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام کا اس شان سے ظہور بالکل نہیں کھٹکتا کیونکہ وہ بت پرست عربوں میں ایک نئی تحریک تھی۔ دو مختلف معاشروں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا یہ کتنا زبردست تعارض تھا۔ (67)

اسلام عرب معاشرہ میں محض اس لئے نہیں داخل ہوا کہ وہ چند ظالمانہ و وحشیانہ رواجوں کا خاتمہ کر دے بلکہ وہ ایک مکمل انقلاب تھا جس نے اپنے سے قبل کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی دعوت میں چند ایسی بنیادی باتیں تھیں جو عام عربوں کی اس نقطہ نظر سے قطعاً مختلف تھیں جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی کہ وہ نومسلم جن کو یہ اسلام سے پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اب فضائل میں وہ ان سے آگے ہیں۔ قرآن ایک اعلیٰ کتاب تھی جس کی آیتیں ہر نئے دور میں اور ہر زمان ومکان میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ وہ سلبی اور ایجابی کسی پہلو سے بھی کسی خاص زمانہ اور مخصوص فضا کے زیر اثر نہ تھا۔ جیسا کہ اکثر مستشرقین عیسائیوں اور کمیونسٹوں کا خیال ہے۔ اہل مغرب سے ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر بحیثیت آسمانی کتاب کے ایمان لائیں اور محمد ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم کریں۔ بلکہ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار رہ کر معروضیت اختیار کریں اور سیرت نبوی ﷺ کا اسی حیثیت سے مطالعہ کریں اور قرآن کریم کو ایک مثالی ونظریاتی کتاب سمجھیں، جس کی تعلیمات، زمان ومکان اور وقتی حالات سے ماوراء ہیں۔ اس میں اگر چند وقتی حالات کا ذکر بھی ہے تو یہ گوناگوں پاکیزہ قدروں اور اصولوں کا سرچشمہ ہیں۔ جن سے مستشرقین کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ مستشرقین کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جس نے اپنی وقت نظر سے سیرت نبوی ﷺ سے متعلق ہماری تاریخ اسلام کے بعض نازک، دقیق اور پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ لیکن اس غلط نہج اور طرز فکر کی وجہ سے جس کی کچھ مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں۔ اس نے اصل موضوع کے اندر بہت سے غلط نتائج وثمرات بھی شامل کر دیئے ہیں اور یہ ایک فطری امر بھی ہے کہ خطا سے خطا ہی سرزد ہوتی ہے۔ اور موضوعیت سے بُعد وانحراف کے بعد ایسے ہی نتائج برآمد ہوں گے جو علم کی روح اور سنجیدگی سے خالی ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کی شخصیت ہی مستشرقین کی ہرزہ سرائی، دسیسہ کاری اور خردہ گیری کا اصل محور ومرکز ہے۔ اس بارہ میں ان کا رویہ کبھی بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور کبھی وہ مغالطہ آمیز نرم لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ یورپ میں قرون وسطیٰ سے سترہویں صدی عیسوی تک اسلام کے بارہ میں عجیب وغریب خرافات اور داستانیں مشہور رہی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک سب سے زیادہ سب وشتم کا نشانہ بنائی گئی ہے۔ بعد میں یورپ نے مذہبی تعصب سے آزاد ہونے کا اعلان اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں کچھ مغربی اہل قلم نے نبی کریم ﷺ کی شخصیت کو مجروح کرنے سے پرہیز کیا اور آپ ﷺ کے معاملہ عدل وانصاف کا رویہ اختیار کیا (گو یہ عمل تادیر قائم نہ رہ سکا) ان لوگوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اکثر مستشرقین کا یہ عام شیوہ ہے کہ وہ حقیقت پر پردہ ڈال کر اسلام کے حقیقی چہرہ کو داغدار اور مسخ کرتے رہے ہیں۔ مستشرق گلیوم بوسٹل نے سیرت رسول ﷺ کا مسیحی نقطہ نظر سے جائزہ لیا۔ میشیل بوڈیہ نے کلیسا کے مصادر سے اپنی معلومات کو آب ورنگ بخشا۔ ہوٹنگر نے سیرت کو پیش کرتے وقت مسیحی مشنری کے فریضہ کو انجام دیا۔ کچھ لوگوں کی نظر انتخاب میں صرف وہی واقعات آسکے جن میں ان کے لئے طنز وتشنیع کی گنجائش تھی۔ مزید براں انہوں نے انہیں اپنی جانب سے بہت کچھ مضحکہ اور بے سروپا واقعات بھی شامل کر دیئے۔ جن آیتوں میں مسیحیت کا ذکر تھا۔ ان پر خصوصی توجہ دی گئی اور انجیل وقرآن کے مابہ الاختلاف واقعات کو بیان کر کے قرآن مجید کی حقانیت پر تمسخر کیا گیا۔ اس طرح وہ علمی سنجیدگی کی دعوؤں کے باوجود صلیبی شرانگیزی کی روش پر ہی قائم رہے۔ (68)

ان مستشرقین کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت رسول ﷺ کے چند واقعات کے متعلق سب کے خیالات یکساں ہیں۔ مثلاً بحیرا راہب، ورقہ بن نوفل اور قس بن ساعدہ سے نبی کریم ﷺ کی ملاقات کا ذکر کر کے سب عجب اور دوراز کار نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یہ لوگ بحیرا راہب سے آپ ﷺ کے ایک مدت تک دینی تعلیم اخذ کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس حقیقت سے یہ واقف نہیں ہیں کہ نبی کریم ﷺ بحیرا راہب سے دس گیارہ سال کی عمر میں ملے تھے۔ اور یہ سن وسال ایسا نہیں ہے کہ اس میں آپ کوئی تعلیم حاصل کرتے چہ جائے کہ دینی مسائل کا استیعاب واستقصا کرتے۔ پھر آپ ﷺ کی ان سے ملاقات صرف ایک بار ابوطالب کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ عقل محو تماشا ہے کہ صرف اس تھوڑے سے وقت میں بحیرا نے ایک بچہ کو کیسے اس قدر فیضیاب کیا۔ اور آپ ﷺ نے کس طرح ان تعلیمات کو بالاستیعاب یادداشت میں محفوظ رکھ کر تقریباً تیس برس کے بعد اپنی رسالت کی صورت میں پیش کیا۔ لیکن مستشرقین کے علمی ذوق کو اس سے کیا سروکار انہیں تو محض بہتان تراشی کرنی تھی۔ ورقہ بن نوفل کو یہ لوگ نصرانیت کے ایک داعی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ ورقہ بن نوفل ایک موحد شخص تھے اور انہوں نے اس کی خبر دی تھی کہ آپ وہی ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے ان سے اخذ و استفادہ کیا ہوتا تو مستشرقین مکہ ہی نہیں بلکہ تمام لوگوں میں ضرور یہ خبر عام ہوتی جو ان کے حق میں ایک عمدہ حربہ ہوتی۔

رسول اکرم ﷺ کی شخصیت کو مجروح کرنے اور آپ کی عالمگیر اور دائمی رسالت سے شک وشبہہ پیدا کرنے کے لئے ان مستشرقین کا ایک خاص اور اہم اعتراض یہ ہے کہ آپ نے متعدد شادیاں کی تھیں۔ اس سے وہ آپ کے جنسی پہلو اور شہوت رانی کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مادہ پرست یورپ کے یہ دانشور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ آپ کی متعدد بیویاں اس وقت تھیں جب آپ کا سن پچاس برس سے تجاوز کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے تبلیغی ودعوتی مصالح کے پیش نظر کئی شادیاں کی تھیں۔ ورنہ آپ کی جوانی کی عمر کا بڑا حصہ ایک ہی حرم کے ساتھ گزرا۔ (69)

اس طرح مستشرقین نے وحی کو بھی اپنا تختہ مشق بنایا ہے۔ وہ اسے آپ ﷺ کی نفسیاتی وعقلی کمزوری اور بیماری کا نام دیتے ہیں۔ خالص مادہ پرست ہونے کی بناء پر یہ لوگ وحی کی حقیقت کے فہم وادراک سے عاجز وقاصر ہیں۔ وحی کی کیفیات اور نبی کریم ﷺ اور حامل وحی حضرت جبرائیل کے تعلقات کی نوعیت کو یہ لوگ نہیں سمجھ سکے اور نہ ان حدیثوں کے مفہوم سے آگاہ ہو سکے جن میں حالات وکیفیات وحی بیان ہوئی ہیں اس لئے انہوں نے اس کی نہایت غلط توجیہ کی ہے۔

کچھ مستشرقین اس نرم لہجہ سے اپنی بات شروع کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے زمانہ کے تقاضوں اور اپنے ماحول کے چیلنجوں کی نباضی کی اور ان میں اصلاح ودرستگی کی سعی بھی کی۔ گویا آپ ﷺ کی حیثیت دنیا کے عام مصلحین اور لیڈروں کی طرح ایک مصلح انقلاب وحریت کے علمبردار اور معاشرتی، سماجی واجتماعی انصاف کے داعی بھی ہے۔ اور آپ صرف ایک ریفارمر تھے۔ اس قسم کی رائے زنی کا اصل سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے وحی اور پیغام الٰہی کی کنہ وکیفیت سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی یا کی تو وہ اس میں عاجز وقاصر رہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب بھی غلط فہمی کا باعث بنے ہیں۔ جن کا اجمالی ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یعنی نصوص اور اصل عبارتوں میں تحریف، مذہبی تعصب، اسلام اور مسلمانوں سے کد وعناد اور اپنی مرضی کے مطابق تشریح وتفسیر اور دیدہ ودانستہ حق سے چشم پوشی، فریب اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی عادت وغیرہ۔ مارگولیوتھ نے سیرت رسول ﷺ پر ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں محققین نے بہت زیادہ غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصل وجہ یہ بیان کی ہے کہ مارگولیوتھ واقعات کی تعبیر اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ غلط مفروضے قائم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں عربی زبان کا ناکافی علم تھا۔ لامانس نے خاص طور پر تحریف نصوص کے عمل کو اپنایا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تاریخ پیدائش تک میں تحریف کر ڈالی ہے۔ اور بلا کسی مستند تاریخی ثبوت کے حضرت فاطمہ زہرا کی پاک سیرت کو بھی عیب دار بنانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ان کا علمی مقام اب خود مستشرقین کی نگاہ میں ساقط ہو چکا ہے اور انہوں نے ان کی مضحکہ خیز غلطیاں پیش کر کے ان کی بے اعتبار تحریروں سے محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔

محمد کامل عیاد کا بیان ہے کہ مستشرقین کی اکثریت محض اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی قدر و قیمت پہنچانے سے قاصر رہی ہے۔ ان میں ایک قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ضرور ہے جو مذہبی تعصب کی عینک سے واقعات کو نہیں دیکھتی ہے۔ لیکن وہ بھی اپنے نظریہ تاریخ میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے سیرت رسول کی روشن اور شفاف تصویر غبار آلود ہو جاتی ہے۔(70)

مستشرقین کے اہداف:

مستشرقین نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ ان میں جرمنی، فرانس، انگلینڈ، ہالینڈ اور روس کے مستشرقین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان صاحبان علم و دانش نے بعض پہلوؤں سے اسلامی علوم و فنون کی ترویج و تحقیق کے سلسلہ میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ بالخصوص مغازی و سیر اور عربی ادب کے نادر مخطوطات کی طباعت عالم اسلام پر احسان ہے۔ ان مستشرقین کی غالب اکثریت عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل ہے۔ جن میں ہر مزاج کی شخصیات موجود ہیں۔ ان میں غیر جانبدار اور معتدل مزاج بھی ہیں مثلاً ایڈورڈ گبن، ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ، اے۔ جے آربری، کارلائل اور اینی میری شمل وغیرہ۔ بعض اسلام کی طرف ہمدردانہ رویے کا اظہار کرنے والے بھی ہیں مثلاً تارآندرے اور ڈیون پورٹ وغیرہ۔ بعض تو اسلام کی حقانیت اور آفاقیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ایمان سے مشرف ہو گئے۔ محمد مارما ڈیوک پکتھال، محمد اسد اور مریم جمیلہ ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہیں، اس کے برعکس مستشرقین کے گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو انتہائی متعصب اور اسلام کے خلاف معاندانہ رویہ رکھتے ہیں اور یہ اکثریت میں ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت کے من گھڑت عقائد کے رد میں اسلام کی زوردار تحریک ان کے تعصب کا سبب ہے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اسلامی عقائد کو مسخ کرنے، سیاق و سباق سے ہٹ کر واقعات کو پیش کرنے اور غلط تاویلات کے ذریعے، اسلام پر بھرپور وار کئے۔

مستشرقین جب قرآن و حدیث وغیرہ پر کلام کرتے ہیں تو بلاشبہ ان کی تحقیقات لائق تحسین ہوتی ہیں۔ گستاو فلوگل، اے۔ جے۔ ونسنک، فلپ۔ کے۔ ہٹی، اے گلیوم (یا گائیلام) کارل بروکلمان اور آر۔ اے نکلسن وغیرہ کی تحقیقات کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب مستشرقین حضرت محمد ﷺ کی ذات کو زیر بحث لاتے ہیں تو ان کا متعصبانہ رویہ انتہا کو چھونے لگتا ہے۔ اس طبقہ کے مستشرقین کا سرخیل ولیم میور تھا۔ عصر حاضر میں منٹگمری واٹ یہی روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ واٹ نے حضرت محمد ﷺ پر ہر وہ طعن کیا ہے ولیم میور کر چکا ہے۔ لیکن واٹ زبان و بیان کی سحر انگیزی میں اپنی متعصبانہ تحقیقات کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ عام قاری اس کی ضرب کاری کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

ٹائن بی بھی اس صدی کا عظیم مورخ ہے۔ پیغمبر آخر الزمان ﷺ سے متعلق اس کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

''اسلام ایک سریانی مذہب ہے۔ بانی اسلام اولاً یہودیت سے متاثر ہوئے۔ ثانیاً نسطوریت سے متاثر ہوئے جو عیسائیت کی ہی ایک شکل ہے''۔(71)

دوسری جگہ لکھتا ہے:

''محمدؐ رومی سلطنت سے زبردست متاثر تھے۔ کیونکہ رومی سلطنت کی سماجی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ مذہب میں توحید پرستی اور انتظامیہ میں نظم و ضبط۔ محمدؐ نے انہی دونوں اوصاف کو عربی قالب میں ڈھالا۔ دونوں کو ختم کر کے ایک ادارے کی شکل بنائی۔ محمدؐ نے اپنی حیات کا یہ مشن دو مرحلوں میں پورا کیا۔ پہلا مرحلہ خالصتاً مذہبی تھا۔ یہ مرحلہ مکی زندگی پر مشتمل ہے۔ دوسرا مرحلہ ہجرت کے بعد مدنی زندگی کا ہے۔ اس مرحلہ میں مذہب پر سیاست کا غلبہ ہو گیا۔ محمدؐ پہلے مرحلہ میں سولون (Solon) سے مشابہت رکھتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں قیصر سے مشابہہ ہیں۔ سولون پہلے تاجر تھا پھر مدبر بن گیا۔ قیصر پہلے سیاست دان (Politician) تھا بعد میں مدبر (States man) بن گیا''۔(72)

مستشرقین کا ایک طبقہ اور بھی ہے۔ یہ کمیونسٹ مستشرقین پر مشتمل ہے۔ بقول ان کے یہ مذہب سے ہٹ کر سماج میں ارتقاء کا تجزیہ

جدلیاتی انداز سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب کو ریاست کا سپر سٹرکچر کہتے ہیں۔ان کے مطابق ریاستکی اصل بنیاد معاشی عوامل ہیں۔ یہ کسی عہد کی خوشحالی یا کسی شخصیت کی عظمت میں اس عہد کے معاشی نظام کو کلیدی اہمیت دیتے ہیں۔لیکن یہ حضرات بھی جب حضرت محمد ﷺ کی ذات کا تجزیہ کرتے ہیں تو دھریت کے خرقہ سالوس میں مذہبی مہاجن ہی نظر آتے ہیں۔

اس طبقہ کا گل سرسبد فرانس کا میکسیم روڈنسن (Maxime Rodinson) ہے۔ یہ 1915ء میں پیدا ہوا۔اس کا والد پیرس کی جیوش ورکرز ٹریڈ یونین کے بانیوں میں سے تھا۔ گویا روڈن سن کا خاندانی مذہب یہودیت ہے۔ 1937ء میں روڈن سن کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہوگیا۔لیکن 1958ء میں اس نے پارٹی کو خیر باد کہدیا۔لیکن مارکسزم سے اس کا تعلق باقی رہا۔اور ابھی تک اس کے نظریہ دان کی حیثیت سے مصروف عمل ہے۔اس کی ایک کتاب "Capitalism and Islam" ہے۔ یہ محققانہ کتاب پنگوئنکس انگلینڈ سے 1977ء میں شائع ہوئی۔

اس کتاب میں روڈن سن نے قبل از اسلام اور عہد رسالت کے معاشی عوامل کا نہایت عرق ریزی کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے۔اس عہد کی جدلیاتی تعبیر پیش کر کے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ عہد بھی سرمایہ داری کا عہد تھا۔ کیونکہ جس نظام میں نجی ملکیت اور آزاد تجارت کا غلبہ ہو وہ سرمایہ داری ہی کی ایک شکل ہے جیسا کہ قدیم یونان میں تھا۔ غالباً ذاتی ملکیت کے موید ہونے کے سبب روڈن سن مولانا مودودی کے اسلامی معاشی نظریہ کی تائید کرتا ہے۔مندرجہ بالا کتاب کے علاوہ روڈنسن کے دو طویل مقالات اور بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں:

A Critical Survey of Modern Studies on Muhammad.

یہ مقالہ انگریزی کتاب Studies on Islam میں چھپا ہے۔(73) دوسرا طویل مقالہ The Western Image and Western Studies of Islam ہے۔ یہ پرمغز مقالہ انگریزی کتاب The Legacy of Islam میں شائع ہوا۔(74)

دونوں مقالے علمی انداز، گہری تحقیق، منطقی استدلال اور معروضی انداز فکر کے بہترنمونے ہیں۔ یہ اسلام کے بارے میں مغربی نکتہ نظر کا شاہکار ہیں۔(75)

روڈنسن کی ایک اور کتاب The Muhammad ہے۔ یہ فرانسیسی میں لکھی گئی ہے۔اسے انگریزی کے قالب میں این کارٹر (Anne Carter) نے ڈھالا ہے۔ یہ کتاب 1983ء میں پینگوئن پریس کی طرف سے انگلینڈ سے شائع ہوئی ہے۔روڈن سن نے جب یہ کتاب لکھی تو اس کے پیش نظر جرمنی کے گولڈ زیہر، تھیوڈور نولڈیکے، برطانیہ کے رچرڈ بیل اور واٹ رہے ہیں۔ یہ واٹ وہی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے،عربی ماخذ میں ابن ہشام اور ابن سعد اس کے مدنظر رہے ہیں،وہ بھی انگریزی تراجم کے ساتھ۔گلیوم نے جو ابن ہشام کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اس کے بارے میں لکھتا ہے،اس ترجمہ میں بے شمار اغلاط ہیں۔ یہ اس کا اپنا قول ہے ورنہ ہمارے نزدیک گلیوم کا ترجمہ مستند شمار کیا جاتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ وہ روڈن سن جو دیگر کتب و مقالات میں تحقیقی معیارات کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے، وہ اپنی اس کتاب The Muhammad میں ان تمام تحقیقی معیارات سے صرف نظر کرتے ہوئے بے بنیاد واقعات درج کر کے ان سے غلط استدلال کرتا ہے۔ اس کی یہ کتاب غلط مبحث اور تضادات کا شاہکار ہے۔ پوری کتاب میں متعصبانہ رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے بارے میں متعصبانہ بیانات دیتا ہے،انہیں جاہل قرار دیتا ہے۔اس کے برعکس قوم پرستی کی بنیاد پر عبداللہ بن ابی کی شان میں رطب اللسان ہے۔عمومی طور پر صحابہ کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ جناب صدیق اکبرؓ سے متعلق بھی پھبتی کستا ہے۔(76)

ذیل میں ہم اس کتاب کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتے ہیں:

حقائق سے ناواقفیت اور بے سند دعوے:

میکسیم روڈن سن نے جگہ جگہ واقعات کو غلط انداز میں پیش کیا ہے۔ اسماء کا اندراج غلط کیا اور بے بنیاد دعوے کئے ہیں۔ مثلاً:

1۔ محمدؐ نے خط و کتابت کا جواب دینے کے لئے زید بن حارثہؓ کو آرامی یا عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا۔

2۔ محمدؐ نے عیسائیت کے بارے میں زید بن حارثہؓ سے جو آپؐ کے غلام تھے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔

3۔ خطبہ حجۃ الوداع کی بعض شقیں مسلمانوں نے بعد میں شامل کی ہیں۔

4۔ مولفۃ القلوب کو فتح مکہ کے موقعہ پر انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا۔

5۔ محمدؐ نے دیوی عزیٰ کے آگے بھیڑ کی قربانی دی تھی۔

6۔ مسیلمہ کذاب نے محمدؐ سے پہلے یمامہ میں اعلان نبوت کر رکھا تھا۔ اس نے اپنا نام رحمان رکھا ہوا تھا۔ محمدؐ نے نبوت کے حقائق اسی سے سیکھے تھے۔

7۔ محمدؐ نے غزوہ تبوک کے بعد مختلف ممالک کے بادشاہوں کو تبلیغ اسلام کے لئے خطوط لکھے تھے۔

8۔ واقعۂ افک سے متعلق روڈن سن لکھتا ہے: ''اس واقعہ کے تقریباً بیس برس بعد علیؓ عائشہؓ کے بارے میں یہ رائے دینے کی پاداش میں ایک قاتل کی تلوار سے مارے گئے''۔

9۔ صلح حدیبیہ کے بارے میں لکھتا ہے: ''اس صلح پر عمرؓ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ بعد میں عمرؓ کہا کرتے تھے اگر میرے ساتھ اس وقت سو آدمی بھی ہوتے تو میں یہ صلح کبھی نہ کرتا''۔

10۔ میثاق مدینہ کے بارے میں لکھتا ہے: ''یہ کوئی مستند وثیقہ نہیں ہے۔ تاہم اس میں کچھ دلائل و حقائق موجود ہیں''۔

11۔ ہجرت حبشہ کے سربراہ عثمان بن مظعونؓ تھے۔ حالانکہ اس کے سربراہ حضرت عثمان بن عفانؓ تھے۔

12۔ قرآن میں جنت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ سینٹ افرائیم (St. Ephraem) کی ایک نظم سے ماخوذ ہے، جو عراق کا پادری تھا۔ اس کی یہ نظم عربوں میں مشہور و معروف تھی۔ (77)

تاریخ سیر کا عام طالبعلم بھی جب روڈن سن کے تاریخی تسامحات اور بے بنیاد دلائل پر نگاہ ڈالتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے، زید بن ثابتؓ کی جگہ زید بن حارثہؓ کا نام لکھ دیا، مولفۃ القلوب کو غزوہ طائف میں انعامات سے نوازا گیا مگر مصنف موصوف نے اسے فتح مکہ کے موقعہ پر لکھ دیا۔ ہجرت حبشہ میں سربراہی حضرت عثمان بن عفانؓ کر رہے تھے جسے روڈن سن نے عثمان بن مظعونؓ لکھ دیا۔ واقعۂ افک اور صلح حدیبیہ سے متعلق حضرت عمرؓ کا رویہ روڈنسن کے بے دلیل بیانات ہیں۔

میکسیم روڈن سن نے اپنی اس کتاب میں جگہ جگہ تضادات کا ثبوت دیا ہے۔ کسی کتاب میں تضادات کی بھرمار مصنف کی اپنے موضوع سے ناانصافی کا مظہر ہوتی ہے ایسا مصنف اپنے موضوع سے عدم دلچسپی کا بھی شکار ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے انسان کی تصنیف میں کہیں کہیں تضاد ضرور آئے گا۔ لیکن روڈن سن کی ''دی محمد'' میں تضادات کی اتنی کثرت ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ جلد از جلد اس بارگراں سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔

چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

1۔ لکھتا ہے: ''ہجرت کے وقت محمدؐ اور ابوبکرؓ کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں تھا''۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے: ''جب محمدؐ ہجرت کر رہے تھے تو ان کے ذہن میں یہ بات ضرور تھی کہ مدینہ کے توحید پرست حضرات ان کی مدد کریں گے''۔

یہ روڈن سن کا اپنا مفروضہ ہے۔ مدینہ میں تو حید پرست طبقہ یہودیوں کا تھا اور سب سے بڑھ چڑھ کر حضرت محمد ﷺ کی مخالفت

انہی تو حید پرستوں نے کی تھی۔ یہ بات روڈن سن محض یہودیت کی طرف میلان رکھنے کی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ ورنہ تاریخ بتاتی ہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ میں ایک بھی یہودی موجود نہ تھا۔ اور حضرت محمد ﷺ جیسی صاحب بصیرت شخصیت یہودیوں سے مدد کی توقع کیسے کر سکتی تھی؟ (78)

2۔ میکسیم روڈن سن معجزات کا منکر تھا۔ لیکن جنگ بدر میں حضورؐ کے لشکر کے کفار پر کنکریوں کے پھینکنے والے قصے کو سنجیدگی سے بیان کرتا ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

3۔ ایک جگہ لکھتا ہے: تیرہ سو سال گزرنے کے باوجود قرآنی عربی کا سحر آج تک قائم ہے۔ لکھتا ہے: ''قرآن محمدؐ کے تحت الشعور کا ثمرہ ہے۔ لکھتا ہے: ''محمد نے قرآن میں رد و بدل بھی کیا ہے''۔

4۔ لکھتا ہے: ''محمدؐ کی تعلیمات میں کوئی انقلابی چیز نہیں ملتی''۔ لیکن دوسری جگہ لکھتا ہے: ''محمد ایک انقلابی صوفی تھے۔ جنہوں نے سماج کو بدلنے کی کوشش کی''۔

5۔ لکھتا ہے: ''محمدؐ ایک متوازن، عقیل و مدبر، زبردست قوت برداشت کے مالک سیاست دان اور بادشاہ تھے''۔ دوسری جگہ لکھتا ہے: ''محمدؐ بیک وقت مسیح وشارلیمان تھے''۔ یہ وہی مفروضہ ہے جو ائن بی نے پیش کیا ہے صرف ناموں کا فرق ہے۔

6۔ کتاب کے آخر میں گوئٹے اور کارلائل کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد جو کچھ روڈن سن نے کہا ہے وہ من وعن پیش خدمت ہے۔ قارئین خود ہی اندازہ لگائیں کہ یہ پورا پیراگراف تضادات کا کتنا خوبصورت مرقع ہے۔ لکھتا ہے: ''محمدؐ کو ہر شخص نے اپنے اپنے مزاج اور نفسیات کے مطابق پایا ہے۔ محمدؐ کی تصویر پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ محمدؐ کی شخصیت کوئی مافوق الفطرت دیومالائی نہیں جو دوسروں کے لئے خوبصورت انداز میں تخلیق کی گئی ہو۔ آپؐ نہ تو سرد مزاج دھوکہ باز تھے اور نہ ہی سیاسی نظریہ ساز تھے اور نہ ہی وہ ایسے صوفی تھے جس نے اپنا تن من دھن حب خدا میں لٹا دیا ہو۔ اگر ہم محمدؐ کو صحیح انداز میں پیش کرنا چاہیں تو بہت مشکل پیش آئے گی۔ کیونکہ وہ ایک پیچیدہ شخصیت تھے۔ یہ شخصیت تضادات سے بھر پور ہے۔ وہ اپنی ذات کے لئے مسرت کے بھی متلاشی تھے لیکن تجرد میں بھی ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اکثر اوقات رؤوف ورحیم نظر آتے ہیں اور کبھی کبھار ظالم و سنگ دل بھی نظر آئے ہیں۔ وہ خوف خدا سے سرشار بھی تھے مگر ساتھ ہی ایسے سیاست دان بھی تھے جو ہر مہم کے لئے تیار بھی رہتے تھے۔ عام زندگی میں انہیں خطابت کا ملکہ حاصل نہیں تھا۔ لیکن قلیل عرصہ میں وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ اپنے لاشعور سے ایسے جملے تخلیق کریں جن میں شعری مدوجزر پایا جاتا ہے۔ آپؐ دھیمے مزاج والے مضبوط اعصاب والے اور بہادر انسان تھے۔ مگر ساتھ ہی باحیا اور شرمیلے بھی تھے۔ آپؐ ایک زیرک اور جلد گھل مل جانے والے انسان تھے۔ گاہے معاف کرنے والے اور گاہے منتقم مزاج، کبھی مغرور اور کبھی منکر المزاج اور کبھی زاہد اور کبھی ہوس پرست انسان تھے۔ وہ ایک فطین انسان تھے۔ لیکن کچھ اشیاء کی کنہ حاصل کرنے سے قاصر بھی تھے۔ ان کے اندر ایک طاقت تھی جو شاذ و نادر انسانوں میں ہوتی ہے وہ طاقت جو دنیا کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ ان تمام تضادات پر ہمیں استعجاب ہوتا ہے وہ کیسی طاقت اور کمزوری کا مجموعہ تھے۔ بہر حال وہ تمام انسانوں کی طرح اپنے عہد کی خوبیوں اور خامیوں سے متصف تھے اور قبیلہ قریش کا یہ محمدؐ بن عبداللہ ہمارا ہی بھائی ہے''۔ (79)

کتاب کے ابتدائی صفحات میں روڈن سن نے حضرت محمد ﷺ کا نفسیاتی جائزہ لیا ہے کہ آپؐ نے معاشرے کی اصلاح وتربیت کا عظیم بیڑہ کیوں اٹھایا۔ اس کے نفسیاتی اسباب تین تھے۔ روڈن سن کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتا ہے: محمد تین طرح سے غیر مطمئن انسان تھے۔

1۔ وہ والدین اور دولت سے محروم انسان تھے۔ وہ نچلے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

2۔ وہ عظیم جنسی طاقت کے مالک ہونے کے باوجود اولاد ذکور سے محروم تھے۔

3۔ وہ اپنے عہد کے عیسائی اور یہودی کاہنوں کے معیار اخلاق سے غیر مطمئن تھے۔ بلکہ وہ ایرانی و رومی طرز سیاست سے بھی محروم تھے۔

دوسرے الفاظ میں روڈن سن کہنا یہ چاہتا ہے کہ وہ مندرجہ بالا تین محرومیوں کے ردعمل کے طور پر سامنے آئے اور دنیا کی اصلاح پر کمر بستہ ہو گئے۔ اسلامی ریاست کے بارے میں رائے:

میکسیم روڈن سن نے حضرت محمد ﷺ کی قائم کردہ ریاست کے بارے میں کچھ فکر انگیز باتیں کہی ہیں جو کئی بھی ہیں اور قابل غور بھی مثلاً:

1۔ اسلام نے عربوں کو تمام ضروریات زندگی مہیا کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ محمدؐ نے مالتھس کے معاشی نظریہ کو اپنانے سے پرہیز کیا ہے۔ آپؐ کی سلطنت اگرچہ ایک عبوری مرحلہ سے گزر رہی تھی پھر بھی اس میں ایمانویل کانٹ کے نظریہ عقل خالص کے مطابق ہر فرد کو عمل کی آزادی حاصل تھی۔ اس ریاست میں انفرادیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

2۔ بعد میں یہی اسلامی ریاست ''مرجھا جانے'' کی بجائے ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو گئی اور اپنے ابتدائی عشروں میں ماضی کی بہ نسبت زیادہ مضبوط ہو گئی۔

3۔ فتح مکہ کے وقت محمدؐ نے عتاب بن اسید کو مکہ کا پہلا گورنر مقرر کیا۔ اس کی اجرت روزانہ ایک درہم مقرر کی۔ تنخواہ دار ملازم کی یہ پہلی مثال ہے۔

4۔ محمدؐ کی وفات پر آپؐ کا جسد تبدیل ہو گیا تھا مگر صحابہؓ سیاسی اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قیصر کی وفات پر انٹونیو (Antonio) بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔ لینن کی وفات پر سٹالن نے بھی سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی اسی طرح کوشش کی تھی۔

5۔ محمدؐ عربوں کے بادشاہ اور لارڈ آف مدینہ تھے۔ (80)

مذکورہ بالا سطور میں روڈن سن کے بعض اعتراضات کو تاریخ اور کتب سیر کے اولین ماخذ کی روشنی میں دیکھا جائے تو صریحاً بے بنیاد اور مبنی بر تعصب نظر آتے ہیں۔ اور حیران کن بات یہ ہے کہ تحقیق کے جملہ قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر دیا گیا۔

فصل چہارم

مستشرقین اور اُن کی تصانیف

مشہور مستشرقین بطور سیرت نگار:

مستشرقین نے اپنی مہم کو چلانے اور اپنی تحقیقات کی اشاعت کے لئے ہر ممکن وسیلہ کو اختیار کیا، جن میں سے چند کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(1) اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابوں کی تالیف، جن میں اسلامی نقطۂ نظر، قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو موضوع بنایا جاتا ہے، جن میں سے اکثر نصوص و متون کی تحریفات پر مشتمل ہوتی ہیں۔

(2) رسائل و مجلات کی اشاعت، جس میں اسلام اور بلادِ عربیہ کے مسائل پر بحث ہوتی ہے۔

(3) عالم اسلام میں مشنریوں کا قیام، جو بظاہر انسانی خدمت اور گرام سدھار کے نام پر کام انجام دیتی ہیں، لیکن ساتھ ہی پُر خطر اور دور رس نتائج لوگوں کے دلوں میں چھوڑ جاتی ہیں ان خدمات کے تحت اسپتال، ڈسپنسریوں، یونین، کالج، یتیم خانوں اور مہمان خانوں کا بہت سے مقامات پر پورا انتظام موجود ہے اس کے علاوہ مسیحی نوجوانوں کی بہت سی انجمنیں عالم اسلام میں قائم ہو چکی ہیں۔

(4) یونیورسٹیوں اور علمی سیمیناروں میں محاضرات و مقالات کے اجتماعات کا انتظام ہے اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اسلامی ملکوں کی یونیورسٹیوں اور سیمناروں میں انہیں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے چنانچہ قاہرہ، دمشق، رباط، کراچی اور علی گڑھ کے علمی مراکز میں انہیں اظہار خیال کا پوری آزادی سے موقع ملتا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے افکار و خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔

(5) انہوں نے اپنے قلم کے زور سے اسلامی ملکوں کی صحافت اور وہاں سے نکلنے والے جرائد و اخبارات کی بڑی تعداد کو خرید لیا ہے ڈاکٹر عمر فرخ اور ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی کی مشترکہ کتاب ''التبشیر والاستعمار'' جسے استشراق کے سلسلہ میں بڑے مرجع یا (Sourse) کا درجہ حاصل ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مسیحی کارکنوں نے مصر کی صحافت سے خاص طور پر بہت زیادہ فائدہ اٹھایا، اس کے ذریعہ انہیں عیسائی نظریات کی اشاعت میں جس قدر مدد ملی، وہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں مل سکی ہو، ان کے بے شمار مضامین مصر سے نکلنے والے رسائل میں شائع ہوتے ہیں، جن میں سے اکثر اجرت کے ساتھ اور بہت کم اعزازی طور پر چھپتے ہیں''۔ (81)

(6) اپنے ذہنی خاکوں کو عملی شکل دینے کے لئے کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے، جن میں بظاہر صرف عام عناوین سے بحث کی جاتی ہے یہ کانفرنسیں 1783ء سے لے کر اب تک مسلسل منعقد ہوتی رہی ہیں۔

(7) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (Encyclopedia of Islam) کی اشاعت، جو ''دائرۃ المعارف'' کے نام سے مختلف زبانوں میں شائع ہوتی ہے، اور اس کے جدید ایڈیشن برابر شائع ہوتے رہتے ہیں، عربی میں اس کا سب سے پہلا ترجمہ 1956ء میں ہوا، جس کی اب تک 14 جلدیں شائع ہو چکی ہیں، ان مستشرقین نے اس کتاب میں اسلام کے نام پر زہر گھول کر خرافات و اباطیل کا ذخیرہ جمع کیا ہے اور افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک اس کتاب کو ماخذ (Sourse) کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے، اور اس کو کتاب الحوالہ (Reference Books) سمجھا جانے لگا ہے، جو اسلامی ثقافت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، یہ مستشرقین کے مقاصد و وسائل کا مختصر سا جائزہ تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں مشہور مستشرقین، ان کی اہم تصنیفات اور رسائل کا ذکر بھی کر دیا جائے، جو سامراجی ملکوں میں ان کی زیر نگرانی شائع ہوتے رہے ہیں۔ (82)

صحافت و رسائل:

(1) 1887ء میں فرانسیسیوں نے مستشرقین کی ایک انجمن قائم کی، ان کے ماتحت آسیویہ کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔

(2) 1883ء میں لندن میں علوم شرقیہ (Oriential Studies) کی ہمت افزائی کی غرض سے ایک انجمن قائم ہوئی، اس کے زیر نگرانی رسالہ "مجلة الجمعية الاسبوية الملكية" شائع ہوا۔ اس صدی میں امریکی مستشرقین کے زیر اہتمام نکلنے والے رسائل میں "مجلدة الدراسات الشرقية" خاص طور پر قابل ذکر ہے، یہ صوبہ OHIO کے شہر Combier سے شائع ہوتا تھا، اور اس کے مختلف ایڈیشن روس، لندن اور دوسرے مقامات سے شائع ہوتے تھے، معلوم نہیں اس وقت اس نام سے شائع ہوتا ہے یا کسی دوسرے نام سے، اس پر سیاسی سامراج کی پوری چھاپ تھی۔

(3) اس وقت امریکی مستشرقین کے قلم سے نکلنے والے رسائل میں مشہور یہ ہیں: (The Islamic world affairs) "مجلہ شئو ن الشرق الاوسط" جو بڑی حد تک سیاست سے متاثر ہے۔

(4) سب سے خطرناک رسائل وہ ہیں جو امریکی مشنریاں نکال رہی ہیں، ان میں "صموئیل زویمر" (S.Zwemer) کے زیر ادارت نکلنے والا "العالم الاسلامی" (The Muslim World) خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ رسالہ 1911ء میں پہلی بار نکلا، اور اب بھی (Harl Forse) امریکہ سے شائع ہوتا ہے حال میں اس کے مدیر اعلیٰ کینٹ کراج (K.Cragg) تھے۔

(5) اسی سے ملتا جلتا ہوا رسالہ (Le Mede Muslmalmane) ہے، جو ایک فرانسیسی مستشرق کے زیر نگرانی نکلتا ہے۔ (83)

مشہور مستشرقین اور ان کی تصانیف:

1۔ اے۔ جے۔ آربرے A.J. Arberry:

مشہور انگریز مستشرق ہے، اس کی اسلام دشمنی ضرب المثل ہے۔ اسلامک انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین میں ہے، آج کل کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، وہ ہمارے معاصر مصری فاضلوں کا استاد رہ چکا ہے، اس کی مشہورترین کتابیں حسب ذیل ہیں:

1۔	الاسلام و اليوم:	1943ء میں شائع ہوئی۔
2۔	مقدمة لتاريخ التصوف:	1947ء " " " "
3۔	التصوف:	1950ء " " " "
4۔	ترجمة القرآن:	1950ء " " " "

2۔ الفرڈ جیوم A. Geom:

ہم عصر انگریز ہے، تعصب اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے لندن یونیورسٹی میں لیکچرار ہے، اس کی تحریر میں مشنری روح کا غلبہ ہے، اس کی تصنیفات میں معرکۃ الآرا کتاب "الاسلام" ہے، مصری حکومت نے بہت سے نوجوانوں کو شرقی زبانوں کی تحقیقات کے لئے اس کے پاس بھیجا ہے۔

3۔ بارون کیرا ڈی فو Baron Carra De Roun:

فرانسیسی مستشرق ہے اسلامک انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین میں اس کا نام اہم ترین ہے۔

4۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب H.A.R.Gibb:

انگلینڈ کا ہم عصر مستشرق ہے، مصر کی لینگوئج اکیڈمی کا ممبر رہا ہے، آج کل امریکہ میں اسلامیات کا پروفیسر ہے دائرۃ المعارف

کے مرتبین میں یہ بھی ہے اس کی اہم تصنیفات یہ ہیں:

1۔ طریق الاسلام: 1946ء میں پہلی بار شائع ہوئی، اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

2۔ الاتجاهات الحديثة فی الاسلام: 1947ء میں شائع ہوئی ہے۔

3۔ المذهب المحمدی: یہ بھی 1947ء میں پہلی بار شائع ہوئی، اور اب تک مختلف ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

4۔ الاسلام و المجتمع الغربی: اس کی کئی جلدیں ہیں، اس کی تالیف میں دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔

5۔ مجموعۂ مضامین

5۔ گولڈ زیہر Gold Zieher:

علمی بد دیانتی اور اسلام دشمنی کے لئے مشہور ہے دائرۃ المعارف کی ترتیب میں اس کا بھی حصہ رہا ہے، قرآن مجید اور حدیث پر اس کی تصنیفات ہیں، اس کی کتابوں میں "تاريخ مذاهب التفسير الاسلامی" کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جس کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے۔

6۔ جان مائی نارڈ Mynard:

متعصب امریکی ہے "رسالة دراسات الشرقية" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکا ہے اس رسالہ کے مضامین اس کی زہر افشانی کے شاہد ہیں۔

7۔ ایس۔ ایم۔ زویمر S.M.Zwemer:

مشنری مستشرق ہے اس لئے اسلام کے ساتھ اس کی دشمنی دوہری ہے۔ رسالہ "العالم الاسلامی" کا بانی اور کتاب "الاسلام تحد لعقيدة" کا مصنف ہے یہ کتاب 1908ء میں شائع ہوئی، یہ کتاب اس کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مشنریوں کی کانفرنس منعقدہ 1907ء کو لکھنؤ میں پڑھے گئے تھے، اس کی علمی اور تبلیغی سرگرمیوں کی یاد میں امریکیوں نے ایک اوقاف قائم کیا ہے، جس کے تحت لاہوتی مطالعہ اور مبلغین کی جماعت تیار ہوتی ہے۔

8۔ عزیز عطیہ سوریال:

مصری مسیحی مستشرق ہے، اسکندریہ کی یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے اور اب امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں ہے، اسلامی تعلیمات کی تخریب میں اس کا بڑا حصہ ہے، اس کے لئے اس نے بہت سے وسائل اختیار کئے ہیں، صلیبی جنگوں سے متعلق اس کی بہت سی تصنیفات ہیں۔

9۔ جی۔ فون گروبارم G.Von Greev Bourm:

یہودی النسل جرمن ہے بعد میں امریکہ میں سکونت اختیار کر لی، اور تدریس کا شغل اختیار کیا، شیکاگو یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے ہیں، اس کی تصنیفات میں اسلامی اقدار پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی ہے لکھنے میں بڑا ماہر ہے اس کی مشہور کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:

1۔ اسلام العصور الوسطی — 1946ء میں پہلی بار چھپی۔

2۔ الاعيان المحمدية — 1951ء میں چھپی۔

3۔ محاولات فی شرح الاسلام المعاصر — 1947ء میں شائع ہوئی۔

4۔ دراسات فی تاريخ الثقافة الاسلامية — 1954ء " " "

5۔ الاسلام مختلف مقالات کا مجموعہ ہے — 1957ء " " "

6۔ الوحدة والتنوع فی الحضارة الاسلامية — 1957ء " " "

10۔ فیلپ حتی P.H.Hitti:

لبنانی مسیحی مستشرق ہے، پرنسٹن یونیورسٹی میں پہلے اسلامک اسٹڈیز کے استاد تھے، پھر اس کے ہیڈ ہوگئے، آج کل امریکہ کے وزیر خارجہ کے کاونسلر ہیں، ان کی شدید کوشش رہتی ہے کہ انسانی تہذیب کی تشکیل میں اسلام کی کوتاہی ثابت کی جائے، مسلمانوں کی طرف کسی مرتبہ وشرف کی نسبت نہ ہونے پائے۔(84)

دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ 1948 ءصفحہ 229 پر الادب العربی کے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''عربوں میں ادبی زندگی کی علامتیں پہلے نہ تھیں، ان کا ظہور انیسویں صدی کے اخیر میں ہوا ہے، نئی تحریک کے قائدین کی صف اول میں لبنان کے وہ نصاریٰ ہیں، جنہوں نے امریکی مبلغین کی کوششوں سے تعلیم کی منزل طے کر کے نئی روشنی اخذ کی''۔(85)

اس کی ساری کوشش یہ رہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے علم وفضل کو ناقص قرار دیا جائے ان کی رائے میں یہ کوتاہی اور کمی عصر جدید ہی میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے ہر مرحلہ میں رہی ہے، ان کی یہ رائے ان کی اپنی تصنیفات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ان کی بعض کتابیں یہ ہیں:

1۔ تاریخ العرب:

اصلاً انگریزی میں ہے، عربی میں بعد میں ترجمہ ہوئی کتاب اسلام اور رسول ﷺ پر طعن واستہزاء سے بھری ہوئی ہے۔

2۔ تاریخ سوریا

3۔ اصل الدروز و دیانتهم: 1958ء میں شائع ہوئی۔

11۔ اے۔جے۔وینسنک A.J.Wensink:

پہلے مصر کی لسانی اکیڈمی کا ممبر تھا، طیب حسن ہواری نے اس کو الگ کرایا، اس کے نزدیک قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کی تصنیف ہے، انہوں نے مذہبی اور فلسفیانہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کر کے اس کو لکھا ہے، دیکھئے: "المستشرقون والاسلام" ص 71، اس کی دوسری مشہور کتاب **عقیدۃ الاسلام** ہے جو 1932ء میں شائع ہوئی۔(86)

12۔ لوی ماسینون L.Massegnon:

فرانسیسی مستشرق ہے، شمالی افریقہ میں فرانس کی وزارت نوآبادیات کا ایڈوائزر رہا، مصر کے مشنریوں کا روح رواں ہے، اس نے دنیائے اسلام کا کئی بار سفر کیا، مصر کی لسانی اکیڈمی اور دمشق کی المجمع العلمی العربی کا ممبر رہا، فلسفہ وتصوف اس کے امتیازی علوم ہیں۔ اس کی مشہور کتابوں میں الحلاج الصوفی الشهيد في الاسلام ہے، یہ کتاب 1922ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ اس کے مقالات ومحاضرات کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی ترتیب میں اس کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

13۔ ڈی۔بی۔ماکڈونالڈ D.B.Macdonald:

امریکی مستشرق ہے، یہ بھی دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی مشہور کتابوں میں "تطور علم الكلام والنظرية الدستورية في الاسلام" مطبوعہ 1903ء اور "الموقف الديني والحياة في الاسلام" مطبوعہ 1908ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

14۔ مجید قدوری:

عراق کے عیسائی ہیں، واشنگٹن یونیورسٹی میں اورنٹیل اسٹڈیز کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ اور مجلس علوم شرقیہ کے سرگرم رکن ہیں، یہ بھی اسلام کے خاص ناقدوں میں ہیں، ان کی شاہکار کتاب "الحرب والسلام فی الاسلام" 1955ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ مطبوعہ مقالات بھی ہیں۔

15۔ ڈی۔ایس۔مارگولیس D.S.Margoliouth:

نسلاً انگریز، اور انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین میں سے ہیں، مصر و دمشق کی اکیڈمیوں کے ممبر رہے ہیں۔

ان کی مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:

1۔ التطورات المبکرة فی الاسلام — مطبوعہ 1913ء
2۔ محمد و مصطلح القرآن — مطبوعہ 1905ء
3۔ الجامعة الاسلامة — مطبوعہ 1912ء

16۔ نکلسن R.A.Nicholson:

مشہور انگریز مستشرق ہے دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار ہے، مصر کی لسانی اکیڈمی کا بھی ممبر رہا ہے، اسلامی فلسفہ و تصوف اس کا خاص موضوع ہے، اس کے باوجود اس کو اسلام کے روحانی نظام ہونے سے اتفاق نہیں ہے اور اس کو وہ سطحی مذہب قرار دیتا ہے۔ (۱) متصوفو الاسلام: مطبوعہ 1910ء اور (۲) التاریخ الادب العربی: مطبوعہ 1930ء اس کی مشہور کتابیں ہیں۔

17۔ ہنری لامنس:

فرانسیسی مستشرق اور دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار ہے، اس کی اسلام دشمنی مشہور ہے، فرانسیسی میں اس کی دو کتابیں ہیں، "اسلام" اور "طائف"۔(87)

اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق مستشرقین کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

1۔ حیاۃ محمد رسول اللہ ﷺ — A.Ton bee (آرنلڈ ٹوئن بی)
2۔ الاسلام — William Muir (ولیم میور)
3۔ دین الشیعه — A.Geom (الفرڈ گیوم)
4۔ تاریخ شارل الکبیر — D.MDonolson (ڈونلسن)
5۔ الاسلام — Bishop Turpin (ترپن)
6۔ الاسلام تحد لعقیدة — H.Lammens (ہنری لامنس)
7۔ دعوة المسذنة — S.MZwemer (زویمر)
8۔ الاسلام الیوم — K.Cragg (کینٹ کراج)
9۔ ترجمة القرآن — A.J.Arbary (اے۔جے۔آربرے)
10۔ تاریخ مذاهب التفسیر الاسلامی — Gold Zieher (گولڈزیہر)
11۔ تاریخ العرب — " "

12۔ الیھو دیة فی الاسلام (فلپ حتی) P.Hitti

13۔ عقیدۃ الاسلام (ابراہیم کاش) Abraham Kash

14۔ الحلاج الصوفی الشھید فی الاسلام (وینسک) Wensnik

15۔ الحرب والاسلام مجید قدوری

16۔ تطور علم الکلام والفقه والنظریة الدستوریة فی الاسلام (لوی ماسینون) L.Massegnon

17۔ الاتجاہات الحدیثة فی الاسلام (میکڈونالڈ) Mecdo Nald

18۔ طریق السلام (اے۔آر۔گب) A.R.Gibb

19۔ التصوف فی الاسلام " "

20۔ مصادر تاریخ القرآن (نکلسن) Nicholson

21۔ اصول الاسلام فی البیئة المسیحیة (آرتھر جیفری) Arthur Jeffeiry

22۔ مقدمة القرآن (آر۔بل) R.Bell

23۔ التطورات المبکرۃ فی الاسلام " "

24۔ محمد و مصطلح الاسلام (مارگولیس) D.S.Marglious

25۔ الاسلام " "

26۔ الجامعة الاسلامیة " "

27۔ قنطرۃ الی الاسلام " "

28۔ اسلام العصور الوسطی (اربک بتان) A.Betmon

29۔ الاسلام (جی۔ون۔گروتیارم) Von Greeboun

30۔ الاعیاد المحمدیة " "

31۔ الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیة " "

32۔ دراسات فی تاریخ الثقافة الاسلامیة " " (88)

مستشرقین کا سب سے بڑا کارنامہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ہے، گو یہ بھی بد دیانتی سے خالی نہیں، لیکن اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے اس کے اہم مقالہ نگاروں کے نام حسب ذیل ہیں:

1۔ ابراہیم کاش الیھو دیة فی الاسلام کا مصنف ہے۔

2۔ (سی۔سی۔ایڈمز) C.C.Adoms امریکن یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے۔
الاسلام فی التجدید فی مصر کا مصنف ہے۔

3۔ (اورڈا فرمان) E.Ferman تاریخ المسلمین و فتوحاتھم کا مصنف ہے۔

4۔ (ایڈون کیلوری) E.Calverry رسالہ "العالم الاسلامی" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب میں بھی حصہ لیا، اور قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی میں استاد رہے۔

5۔ اریک شرور — انہوں نے ''امت محمد'' کے نام سے 1955ء میں کتاب لکھی تھی۔

6۔ ایلڈر — The Muslim World Elder کے ایڈیٹر ہیں۔

7۔ A. Carlton(الفرڈ کارلٹن)

8۔ L.Eisembeeg(ال ایزمبرج)

9۔ W. Iwanow(ڈبلیو۔ ایوانو)

10۔ H.Balinger(بالنجر)

11۔ A.Bagliaro(اے۔ باگلیرو)

12۔ J.Barth(جے۔ بارتھ)

13۔ R.Peret(آر۔ پیرٹ)

14۔ R.Besst(آر۔ بسٹ)

15۔ Bishap(بشپ)

16۔ C.C.Berg(سی۔ سی۔ برگ)

17۔ H.H.Brau(ایچ۔ ایچ۔ برو)

18۔ I.L.Previncsal(آئی۔ ال۔ پرنسل)

19۔ R.Bell(آر۔ بل) موصوف نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جن میں اصول الاسلام فی البیئة المسیحیة مطبوعہ 1937ء اور مقدمة القرآن مطبوعہ 1954ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (89)

20۔ M.Plenser(ام۔ پلنسر)

21۔ F.Buhl(ایف۔ بول)

22۔ V.T.Bushner(وی۔ ٹی۔ بوشنر)

23۔ J.Paderson(جے۔ پیڈرسن)

24۔ (ایس۔ ایچ۔ بیکر)

25۔ A.S.Triton(اے۔ ایس۔ ترتیون)

26۔ R.Chudi(آر۔ چوڈی)

27۔ T.H.Toynaball(ٹی۔ ایچ۔ ٹائی نابال)

28۔ Gouard Feray(گارڈ فرائی)

29۔ W.Jorkomon(ڈبلو جورکومن)

30۔ (جویڈی)Guidi

31۔ (بی۔گوئیل)B.Goil

32۔ (گی۔ڈوسوڈ)G.Dussaud

33۔ (ڈی۔ال۔ڈلاویڈ)D.L.Dellvid

34۔ (ڈی۔بور)D.Boer

35۔ (ڈیلیشن)Dielec

36۔ (ای۔ڈینٹ)E.Dinet

37۔ (آر۔روبرٹ)R.Robert ان کی دو کتابیں زیادہ مشہور ہوئیں۔

(۱) القوانین الاجتماعیة فی القرآن

(۲) القرآن التوراة فی القوانین الاجتماعیة (مطبوعہ 1925ء)

38۔ (ریکنڈرف)Recenderf

39۔ (کے۔ایف۔زیٹرسن)K.F.Zettersan

40۔ (او۔اسپائیس)O.Spies

41۔ (ایم۔اسٹریک)M.Streck ان کی کتاب تاریخ الحروف الصیلیبیہ 1954ء میں شائع ہوئی۔

42۔ (ایچ۔اسپیر)H.Spyer

43۔ Snouk Horgrcvji

44۔ R.Slart-meut

45۔ (بی۔شریک)B.Schrecch

46۔ (جے۔شیلفر)J.Shelfar

47۔ (ایس۔مرسر)S.Merser

48۔ C.Von Areudonk

49۔ H.Huches

50۔ (کے۔فولرز)K.Vollers

51۔ (ایف۔ووکا)F.Vocca

52۔ (اے۔فیشر)A.Fecher

53۔ (کارل بروکلمان)Karl Brockelman موصوف اصلاً جرمن ہیں، جرمن زبان میں عربی ادب کی تاریخ لکھی ہے، تاریخ

الشعوب الاسلامیہ بھی انہی کی کتاب ہے، روس کی مجلس علمی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔(90)

54۔ (آر۔اے۔کرن) R.A.Kern

55۔ (کور) A.Cour

56۔ (کوشی ولسن) K.Wilson

57۔ (کریمرز) J.H.Kromers

58۔ (لانگ ورتھ ڈیمس) Lohng warth Dames

59۔ T. Luwichi

60۔ Bernard Lewies ان کی مشہور کتاب العرب فی التاریخ ہے، یہ کتاب 1950ء میں شائع ہوئی، آج کل صاحب کتاب لندن میں پروفیسر ہیں۔

61۔ G. Marsais

62۔ T. Menzel

63۔ Morrison

64۔ V. Minorski

65۔ (میلنو) Naleno

66۔ H.S. Nebredg

67۔ (ہارٹنر) Hartner

68۔ (ہارٹمان) Hartman ان کی کتاب الاسلام والقومیۃ شائع ہوئی ہے۔

69۔ (ایچ۔ڈیون) H.Dunne

70۔ (ایچ۔ریڈ) H. Reed موصوف ترکی میں عیسائی مشنری کا کام انجام دے کر بعد میں امریکن یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے، اور کئی کتابیں لکھیں۔

71۔ M. Houtsma

72۔ J.Horovits

73۔ A. Aongman

74۔ A.J. Hwsman

75۔ B. Aeller

76۔ Huart

77۔ (ام۔واٹ) M wat ان کی کتاب "الجبر والاختیار فی الاسلام" شہرت عام حاصل کر چکی ہے۔

78۔ (جے۔والکر) J.Walker

79۔ (پی۔ وٹک) P.Witteck

80۔ T. H. Wair

81۔ C. Young

82۔ J. Welhousen

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے علاوہ انہوں نے اس کے اختصار میں درج ذیل کتابیں لکھی ہیں:

1۔ موجز دائرۃ المعارف الاسلامیہ Short Encyclopedia of Islam

2۔ دائرۃ المعارف من قسم الدین Encyclopedia of Religion & Ethics

3۔ دائرۃ المعارف العلوم الاجتماعیۃ Encyclopedia of Social Science

4۔ دراسۃ التاریخ Study in History

لکھیں ان سب کو اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔(91)

اسلام اور شارع اسلام علیہ السلام و تاریخ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں مولانا شبلیؒ نے جو مستقل مضامین لکھے ہیں اور اپنی بعض تصانیف میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔

سیرت نبوی ﷺ پر کتاب لکھنے کا ایک اہم سبب:

''یورپ کے مورخین آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کر جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرت نبوی ﷺ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا''۔(92)

سیرت پر یورپین تصنیفات:

''آنحضرت ﷺ کے سیرت مبارک پر یورپین تصنیفات ہیں ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف بلدی برٹ سے لے کر جو 1139ء میں موجود تھا۔ آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائل معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوء ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جا بجا تصنیفات سے کام لینا یا ان سے تعرض کرنا پڑتا ہے۔

یورپ ایک مدت تک اسلام سے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا۔ ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

''عیسائیت اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجا لاتی تھی۔ لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ

مویشیوں کا گا جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے"۔ (93)

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا اس کو فرانس کا مشہور ہنری کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے یوں بیان کرتا ہے:

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرون وسطی میں رائج تھے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں سن کر کیا کہیں گے؟ وہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض وعداوت سے بھری ہوئی ہے جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں۔ ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں۔ ہر مسیح شاعر مسلمانوں کو شرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے۔ ماہوم یا ماہون، یا مافومیڈ (یعنی محامد) اور اپلین اور تیسرا ٹرگامان ان کا خیال تھا کہ محمد ﷺ نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمد ﷺ (وہ محمد جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب آئے اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا۔ اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے:

"اپلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا اس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا۔ اس کو سؤر اور کتوں نے نوچ ڈالا۔ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی اور از سر نو تلف شدہ بتوں کو بنایا۔ اسی بناء پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں۔ وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہوں کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا"۔ ایک دوسرا شاعر ریچر خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے" اس کے بعد وہ امراء کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے "اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرگان کے بتوں کو منہدم کر دو اور ان کو آگ میں ڈال دو اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کر دو"۔ (94)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی:

سترہویں صدی کے ستیں وسطی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے یورپ کی جد و جہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور۔ اسی عہد سے شروع ہوتا ہے ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی وہ مستشرقین کا وجود ہے جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں۔ عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جا بجا ملک میں قائم ہوئے اور اس طرح وہ زمانہ قریب آ گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی گو موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے۔ اس بناء پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہو گئیں۔ عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق وغیرہ متعصب گروہ۔ اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔ اس عہد میں عربی زبان کی تاریخ تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے آرپی نیوس مارگولیوس ایڈورڈ پوکاک اور ہاٹنجر ذکر کے قابل ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً قصداً ان مستشرقین نے ابتداء

جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں۔ جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے۔ یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی 939ء جو اسکندریہ کا پٹریارک تھا اور ابن العمید المتوفی 1273ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا اور ابوالفرج ابن العبری الملطی المتوفی 1286ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے۔ اورپی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے ایک ٹکڑا شائع کیا جو ابتدائے رسالت سے دولت اتابکیہ تک واقعات پر مشتمل ہے۔ المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔ (95)

اخیر اٹھارہویں صدی:

یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی۔ جس نے ''اورنٹیلسٹ'' کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی۔ جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنہ مشرقیہ کے مدارس کھولے۔ مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں۔ ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں۔ مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے اور ان کی تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرق میں 1778ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی۔ اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ 1784ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور 1788ء میں بنگالی ایشیاٹک سوسائٹی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد 1795ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں۔ عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسر اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا۔ سب سے پہلے رسک المتوفی 1774ء نے تاریخ ابوالفدا مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کی۔ 1809ء میں کیپٹن اے متھوس نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ 1856ء میں وان کریمر نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی۔ 1860ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کو نکس سے اشاعت کی۔ اس کے علاوہ اسی مستشرقین نے سہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی۔ 1864ء میں ڈاکٹر ویل نے ابن ہشام کا جرمن میں ترجمہ کیا۔ 1877ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر ڈی انبارڈ نے شائع کی۔ والہوسن نے 1882ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بہ عنوان ''محمد بہ مدینہ'' برلن سے شائع کیا۔ 1883ء میں لیڈن ہاؤسمار کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی۔ 1889ء سے 1892ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ اور نولدیکی وغیرہ نے شائع کی۔ اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں تقریباً 1900ء سے گذشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔ ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر ﷺ کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

''محمد ﷺ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ، جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے۔ لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے''۔ (96)

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں۔ جو بہ تخصیص آنحضرت ﷺ کے حالات میں یا اسلام کے اصول عقائد پر لکھی گئیں اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں یا ہم اس سے متمتع ہو چکے ہیں

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
1	ڈاکٹر جی ۔ پی (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	1815ء
2	ڈاکٹر وائٹ واعظ اوکسفورڈ	انگلستان	بیمفلٹس سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام پر	اوائل 1800ء
3	گاڈفری ہگنس ایم آر اے ایس	انگلستان	اپالوجی	1829ء
4	ڈاکٹر جے ،مولر	جرمنی	اسلام ازم	1830ء
5	گارسن ڈی تاسی	فرانس	اسلام قرآن	از 1831ء تا 1874ء
6	اڈورڈ ڈین	انگلستان	انتخابات القرآن	1843ء
7	ڈاکٹر ویل	جرمن	ترجمہ وتحشیہ ابن ہشام و کتاب محمد ﷺ پیغمبر	1845ء و 1846ء
8	کارلائل	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	1846ء
9	کوسن ڈی پرسیوال	فرانس	تاریخ عرب	1847ء
10	واشنگٹن ارونگ	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	1849ء
11	ڈاکٹر اسپرنگر	جرمنی	سیرت محمد ﷺ	1851ء
12	وان کریمر	جرمنی	ترجمہ وتحشیہ واقدی	1856ء
13	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون "محمد ﷺ"	1858ء
14	ڈوزی	ہولینڈ	تاریخ اسلام	1861ء
15	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	1861ء
16	ڈی لین		سیرت محمد ﷺ	1861ء
17	میور	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	1861ء
18	برتھالی سینٹ ہلیر	فرانس	محمد ﷺ قرآن	1865ء
19	نولدیکی	جرمن	مضامین قرآن و اسلام	1869ء
20	دوشیف، مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	1869ء
21	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	انگلستان	محمد ﷺ	1872ء
22	جولیس چارلس	فرانس	تاریخ بانی اسلام	1874ء
23	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمد ﷺ اور اسلام	1875ء
24	باسورتھ اسمتھ	انگلستان	محمد ﷺ اور اسلام	1875ء
25	سیدیو	فرانس	تاریخ عرب	1877ء

26	ولہوسن	جرمن	تبصرہ بر واقدی	1882ء
27	ایل کرابل	جرمنی	سیرت محمد ﷺ	1884ء
28	گولڈ زیہر	جرمنی	مطالعہ اسلام	1890ء
29	رینان	فرانس	تاریخ مذاہب	1892ء
30	ایچ گریم	ہولینڈ	سیرت محمد ﷺ	1894ء
31	ہنری دی کاستری	فرانس	اسلام پر خیالات	1896ء
32	ایف بوہل	ہولینڈ	سیرت محمد ﷺ	1903ء
33	والسٹن	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمد ﷺ کے ساتھ	1905ء
34	مارگولیوتھ	انگلینڈ	محمد ﷺ	1905ء
35	کوئل	انگلینڈ	محمد ﷺ اور اسلام	1894ء
36	پرنس کیجانی	اٹالیہ	تاریخ کبیر محمد ﷺ اسلام وسلاطین اسلام	جاری
37	میجر لیونارڈ	انگلینڈ	اسلام کا روحانی واخلاقی پایہ	1909ء (97)

مصنفین یورپ، تین قسموں میں کیے جا سکتے ہیں:

1۔ جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ علومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھاتیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صاحب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں۔ لیکن قلیل ما ھُمْ:

2۔ عربی زبان اور علم ادب وتاریخ وفلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔

مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے اس کی وسعت علومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے۔ لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے لکھا تھا، نولد یکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلو پیڈیا (ج 16) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

3۔ وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے مثلاً پامر صاحب یا مارگولس صاحب ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی کثرت مطالعہ تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ''دیکھتا سب کچھ ہوں سوجھتا کچھ بھی نہیں''۔

مارگولیس نے مسند امام حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب وافترا اور تاویل وتعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی۔ اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی داں ہیں۔ لیکن سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پروفیسر رہے، لکھنو آ کر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ اول اول انہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب تین جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ (یہ کتاب جرمن زبان میں ہی ہیں جرمن نہیں جانتا لیکن اس کے اقوال اکثر اور مصنفین نے نقل کیے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گزرے ہیں)۔ (98)

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو یہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے۔ لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم اُن کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

1۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں۔ مثلاً مغازی، واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاسی یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، چنانچہ اس کی بحث گزر چکی۔ مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن بزرگوں سے مروی ہیں مثلاً سیف، سری، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں۔ اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی سعادت کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے ان کے لئے یہ سرو پیکار ہے۔

آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیح منقول ہیں۔ یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مار گولیوس) تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

2۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب اس کے اخلاق و عادت کیا ہیں حافظہ کیسا ہے اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے نہ ضروری۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرآن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرآن موجود اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں کھٹرتا، تو یورپ کے مذاق واقعہ کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مؤرخ اور خصوصاً محدثین کی پرواہ نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے۔ بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ ''اسمائے رجال'' کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتناء ہے۔ بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا، تو گر قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے۔ مثلاً اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے۔ جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں۔ واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں موجود ہوتی ہیں۔ (99)

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصل راز کی پردہ دری کرتی ہیں جو روایتیں 100 برس سے زیادہ تک محض زبانوں پر ہیں۔ ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں۔ یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں۔ چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے۔ لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے۔ محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں۔ ثقاقت بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں اس لئے ضرور ہے کہ روایت کے جو اصول محدثین نے قائم کیے ہیں اور جن کو بعض جگہ وہ خود بھول جاتے ہیں ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ:

1۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی، مکہ معظمہ پیغمبرانہ زندگی ہے۔ لیکن مدینہ میں جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتہً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

2۔ کثرت ازدواج اور میل الی النساء۔

3۔ مذہب کی اشاعت، جبر اور زور سے۔

4۔ لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

5۔ دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بناء پر ہماری کتاب کے ناظرین کو تمام واقعات میں نکتہ چینی پر نظر رکھنی چاہیے کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں؟ یا نہیں؟۔(100)

یہاں زیر بحث دور کے کچھ مشاہیر مستشرقین کا مختصر تعارف کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

1۔ جان جاک سیدیلو (Sedillot, J.J) مشہور فرانسیسی مستشرق جس کا زمانہ (1777ء تا 1832ء) تھا۔ متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں جن میں ایک تاریخ عرب بھی ہے۔

2۔ دیورجے (Deevergers, A.N) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (1805ء تا 1867ء) اس کے آثار میں متعدد تصانیف شامل ہیں۔ تاریخ ابوالفداء سے سیرۃ النبی ﷺ کا خلاصہ، متن و ترجمہ کے ساتھ 1847ء میں شائع کیا۔ بلاد عرب پر کئی مجلدات بشمول تاریخ خلافت، عہد مغلیہ تک، مطبوعہ 1847ء۔

3۔ ڈاکٹر پیرون (Parron) فرانسیسی مستشرق زمانہ (1805ء تا 1876ء) ہیں مصنف کتاب نساء العرب قبل الاسلام و بعدہ مطبوعہ 1858ء نیز ترجمہ کتاب الطب النبوی، از جلال الدین، بی سلیمان داؤد، مطبوعہ 1860ء۔

4۔ گارسن دی تاسی، فرانسیسی مستشرق، زمانہ (1794ء تا 1878ء) صاحب تصانیف دین اسلام قرآن، مذہبی تعلیمات و فرائض وغیرہ۔

5۔ جوزف وہائٹ (White J.) انگریز مستشرق، زمانہ (1746ء تا 1814ء) اسلام اور نصرانیت کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل مقالات و محاضرات، اسلام اور پیغمبر اسلام پر خطبات۔

6۔ ولیم رائٹ (Wright,W) برطانوی مستشرق اور مصنف، زمانہ (1830ء تا 1889ء)۔

7۔ ایڈورڈ ہنری پامر (Palmer, E.H) برطانوی اور مشہور مترجم قرآن، ترجمہ قرآن مطبوعہ آکسفورڈ 1880ء، زمانہ (1842ء تا 1883ء)۔

8۔ ڈی جونگ (Jong, De) ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ 1832ء تا 1890ء، دوسرے ہم وطن مستشرق ڈی جوجے (Goeje, M.j.De) کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام پر کام کیا۔ متن اور لاطینی ترجمہ، لیڈن سے 1881ء میں شائع کرایا۔

9۔ ڈی جوجے، ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ 1836ء تا 1909ء کثیر التصانیف، ل وفیات الاعیان از ابن خلکان پر کام کیا، اور اپنے ہم وطن مستشرق ڈی جونگ کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام کے متن و ترجمہ کی اشاعت کی۔

10۔ فلائشر (Fleischer. H.L) جرمن مستشرق تھا زمانہ 1801ء تا 1888ء متعدد کتابیں لکھیں، تاریخ ابی الفداء کو متن و ترجمہ

کے ساتھ اور تعلیقات وحواشی سے آراستہ کر کے لیپرگ سے 1831ء میں شائع کرایا۔ ایک اور کتاب تاریخ عرب قبل اسلام پر لکھی جو لیپرگ سے اسی سنہ میں چھپی۔

11۔ وسٹنفیلڈ (Wasten Feld, F) جرمن مستشرق زمانہ 1808ء تا 1899ء زود قلم مصنف، تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات وحواشی (تین جلدیں) آراضی مدینہ منورہ اور تاریخ اشراف مکہ وغیرہ کتابیں اس کی یادگار ہیں۔

12۔ بیریزین (Beresine, N) مشہور روسی مستشرق زمانہ (1818ء تا 1896ء) گویا روسی مستشرقین کے زمرۂ اساتذہ میں شامل متعدد تصانیف، مصادر اسلامی، تہذیب وتمدن اور اسلام کے درمیان تعلق پر کتابیں، روسی دائرۃ المعارف میں شرق اور شرقی علوم و آداب پر متعدد مقالات اسی مستشرق کے قلم سے ہیں۔

13۔ بلانکو (White Josat Blanco) مشہور مستشرق برطانوی مذہبی مصنف (1775ء تا 1841ء) مستند پادری، خاص کام کا میدان، اندلس کی تاریخ کا تھا۔

14۔ ایڈورڈ سخاؤ، مشہور ومعروف جرمن مستشرق، برلن میں شرقی زبانوں کے کلیہ کا سربراہ، خود بڑا اسکالر اور زبان داں تھا۔ بقول مولانا شبلیؒ، پروفیسر سخاؤ کی ہی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبویؐ میں کوئی تالیف نہیں شائع ہوئی۔

15۔ سلیم نوفل، روسی استشراق کی تاریخ میں اہم نام، استادوں کا استاد، مرخیل مستشرقین روس میں سے ایک تھا، زمانہ (1828ء تا 1902ء) توطن لبنان، کام فرانسیسی میں کیا، سیرت نبویؐ اور اسلامی تعلیمات پر تصانیف۔

16۔ فان کریمر (Voncremer) آسٹریا کا مشہور مستشرق، ولادت ویانا میں ہوئی، تعلیم بھی وہیں پائی ترقی کر کے وزارت کے درجہ تک پہنچا اور وفات تک وزارت خارجہ اور دوسری وزارتوں میں خدمات انجام دیتا رہا۔ اسلامی مصادر کی تقریباً بیس عربی کتابوں کو تلاش کر کے شائع کیا۔ ان میں سے واقدی کی المغازی، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، نشوان کا قصیدہ الحمیر یہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس نے اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کے بارہ میں کثرت سے کتابیں لکھیں جو جرمن زبان میں ہیں۔

17۔ سر ولیم میور مشہور انگریز مستشرق، اس کا تفصیلی تعارف مقالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔

18۔ نیارڈ (Neynord.B.De) فرانسیسی مستشرق زمانہ (1827ء تا 1908ء) اس نے استشراق پر پہلا رسالہ لکھا اور شائع کرایا۔ جغرافی، تاریخی، ادبی لغت مرتب کی، مسعودی کی مروج الذہب کا متن وترجمہ شائع کیا۔

19۔ رینی باسے (Basse Rene) فرانسیسی مستشرق زمانہ 1855ء تا 1924ء بے شمار کتابوں کا مصنف مثلاً الشعر العربی قبل الاسلام مطبوعہ 1880ء بوصیری کا قصیدہ بردہ، نقد شرح مع ترجمہ مصنف وغیرہ وغیرہ۔

20۔ ڈاکٹر لیبان (Lebon, D.G) فرانسیسی مستشرق مشہور عالم، طبیب اور تمدن وحضارت شرق کا جاننے والا مورخ تھا۔ 1841ء میں پیدا ہوا متعدد ضخیم کتابیں لکھیں، تمدن مصر، تمدن عرب اور اندلس عربی تمدن پر کام قابل ذکر ہے۔
اس کا شمار ان مغربی مستشرقین میں ہوتا ہے جو انصاف پسند تھے اور اسلامی خوبیوں کے قائل تھے۔

21۔ گولڈ زیہر ہنگری کا مشہور ومعروف مستشرق (1850ء تا 1921ء) کثیر التصانیف شخص تھا۔ قرآن، تفسیر، حدیث، سیرت پر بے شمار دراسات قائم کیے۔ گولڈ زیہر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نولدیکی کے نقد حدیث سے آگے بڑھ کر انکار حدیث میں اس کا ہم نوا بن گیا۔ انکار حدیث کے بعد گولڈ زیہر نے سیرت کے دوسرے مصادر کو بھی نشانہ بنایا۔

22۔ ولہاوزن، جرمن مستشرق (1844ء تا 1918ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ مختلف موضوعات پر لکھا، تاریخ یہود، محمد مدینہ

میں، دین اسلام کے مطالعات، عہد نبویؐ میں بائبل پر عبور رکھتا تھا۔

23۔ واشنگٹن ارونگ، معروف امریکی اسکالر اور مستشرق (1783ء تا 1859ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، خصوصاً سیرت محمد ﷺ خلفاء پر دو جلدیں جو 50-1849ء میں شائع ہوئیں۔ ان کی کتاب حیات محمدؐ کا ترجمہ عربی میں شائع ہوا۔

24۔ یوجین یونج (Eugen-Younge) فرانسیسی مستشرق، متعدد کتابوں کا مصنف، ایک ضخیم رسالہ نور اسلام کی خاص کرن، دوسرا مشرق جس طرح اسے مغرب نے دیکھا سیرۃ نبویؐ بہ زبان فرانسیسی وغیرہ وغیرہ۔ انتقال 1920ء میں ہوا۔

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ، قرون وسطیٰ کا مسیحی دماغ بھی بدلتا چلا گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگرچہ ان کے عزائم اور مقاصد میں فرق نہیں آیا۔ تاہم دین اسلام اور سیرت رسول ﷺ کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ اور سلوک یکساں نہیں رہا اور جیسے جیسے عہد جدید کی منزل قریب آتی گئی مجموعی طور پر ان کے ظاہری رویہ میں معقولیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اور وہ خود یہ محسوس کرنے لگے کہ تعصب اور تشدد کی انتہا پسندی خود ان کی تحریک کے لئے ضرر رساں ہوگی۔ بہر حال اب ہم اگلے دور میں قدم رکھتے ہیں۔ (101)

اب ہم عہد حاضر کے چند مشاہیر مستشرقین کا تعارف پیش کرتے ہیں:

1۔ مونٹے (Montet, ed) (1856ء تا 1927) اس کی علمی یادگاروں میں اسلام حال و مستقبل (مطبوعہ پیرس 1910ء) الاسلام (مطبوعہ 1921ء) تاریخ اسلام (مطبوعہ 1913ء) و فرانسیسی میں ترجمہ قرآن (مطبوعہ 1929ء) شامل ہیں۔

2۔ گاڈفرے ڈی ممبائن (Goude Frey de Mombynes,) فرانسیسی مستشرق زمانہ (1862ء تا 1957ء) پیرس میں مشرقی علوم والسنہ کے شعبہ میں عربی کا استاذ، متعدد کتابوں کا مصنف، مثلاً اسلام میں نظم (31ء) مکہ و مدینہ (1918ء) عالم اسلامی و بازنطینی صلیبوں تک (1931ء) وغیرہ۔

3۔ کارلوالفانسوئل، اطالوی مستشرق زمانہ (1872ء تا 1938ء) بے شمار مصنفات و مطبوعات اس سے منسوب ہیں مثلاً منتخبات القرآن (لیپزگ 1893ء) اسلام سے پہلے قبائل عرب کی تکوین و ترتیب (1893ء) تاریخ یمن، قبل اسلام (1927ء) ممالک عرب کی اسلام کے بعد عصر حاضر تک تاریخ، جغرافیہ، ثقافت، عادات، اسماء قبائل، و تراجم رجال، فہرست مخطوطات اور شخصیات کی تحقیق، رواۃ روایت اور مصادر کی تحلیل وغیرہ اور حیات محمد ﷺ جو اس کے انتقال کے بعد روم سے 49ء میں شائع ہوئی۔

4۔ سرتھامس آرنلڈ، انگریز مستشرق، زمانہ (1846ء تا 1930ء) اس کی مشہور ترین کتاب دعوت اسلام ہے (مطبوعہ لندن 1896ء)۔

5۔ رابرٹ بریفالٹ (Briffault, Robert) برطانوی مستشرق، انگریز سرجن اور ناول نگار، مشہور ترین کتاب ''دی میکنگ آف ہیومینیٹی'' تھی۔

6۔ اسٹینلے لین پول، مشہور برطانوی مستشرق زمانہ (1854ء تا 1931ء) مورخ ماہر اثریات، برٹش میوزیم میں پرانے سکوں کا محافظ (1874ء تا 1892ء) تاریخ مسلمانان اندلس پر خاص کام ہے۔

7۔ نکلسن، مشہور برطانوی مستشرق متعدد تصانیف کا مصنف لیکن خاص کتاب عرب کی ادبی تاریخ (مطبوعہ لندن و نیویارک 1907ء) اور اس کا مضمون محمد ﷺ اور قرآن، نیز محمد ﷺ کی ایک نامعلوم سوانح، نکلسن کا زمانہ (1868ء تا 1945ء) ہے۔

8۔ نولدیکے مشہور جرمن مستشرق (زمانہ 1836ء تا 1930ء) تصنیفات زیادہ تر سامی زبانوں پر اور تاریخ اسلام پر، نیز قرآن کی اصل اور ترکیب پر بحث، نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل، سیرت پر ایک کتاب کا مصنف (مطبوعہ 1863ء)۔

9۔ ہرگرونج (Hargronj) ہالینڈ کا مستشرق (زمانہ 1857ء تا 1939ء) اس کے آثار میں مکہ کا حج، فقہ اسلامی اور سیاست نبویؐ شامل ہیں۔ مذہباً عیسائی، زیادہ تر کام ولندیزی زبان میں ماہر اسلامیات سمجھا جاتا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنی ابتداء سے ہی سیاسی مذہب تھا بہر حال اسے اسلام کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں اور اس نے نجی اسلام اور سرکاری اسلام کے درمیان فرق متصور کیا۔

10۔ ونسنک، ولندیزی مستشرق (1881ء تا 1939ء) اس کی علمی یادگاروں میں یہود مدینہ کے بارہ میں رسولؐ اللہ کا موقف جو اس کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع بھی تھا اور لندن سے 1908ء میں شائع ہوا۔ نیز محمد ﷺ اور یہود، الاسلام (مطبوعہ 1911ء) وغیرہ خاص کتابیں ہیں۔

11۔ زاخاؤ، جرمن مستشرق (زمانہ 1845ء تا 1930ء) جیسا کہ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ابن سعد کی طبقات اسی کوششوں سے زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ (سیرۃ النبی ﷺ ج 1، ص 92)

12۔ جوزف ہوروز جرمن مستشرق زمانہ (1874ء تا 1931ء) اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں مغازی واقدی پر قلم اٹھایا (مطبوعہ 1898ء)۔

13۔ جوزف ہیل، جرمن مستشرق (زمانہ 1865ء تا 1950ء) آثار میں عربی تہذیب پر اس کی کتاب مشہور ہے۔

14۔ کارل بروکلمان جرمن مستشرق (زمانہ 1868ء تا 1956ء) بے شمار کتابوں کا مصنف، لیکن مشہور ترین تصنیف "تاریخ اقوام مسلم" ہے اس میں آنحضرت ﷺ پر تحریر قابل ذکر ہے۔

15۔ بارتھولڈ، روسی مستشرق (زمانہ 1869ء تا 1930ء) تصانیف کثرت سے ہیں۔ مثلاً اسلامی تہذیب، تاریخ ترکستان، عالم اسلام، خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہ۔

16۔ سموئل زویمر امریکی نژاد، اجل علمائے مستشرقین اس کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ خاص طور پر مسیحیت اور اسلام کے تعلقات پر اس کی دیگر کتابوں میں اسلام سے پہلے بلاد عرب، دنیا میں اسلام، حیات محمد ﷺ، اسلام صحرائے عرب میں اور ورثہ نبوی ﷺ وغیرہ ہیں۔

17۔ ایچ۔ جی۔ ویلز، انگریز مستشرق (زمانہ 1886ء تا 1946ء) افسانہ نگار، ماہر عمرانیات اور مورخ، متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ خصوصاً دی آؤٹ لائن آف ہسٹری میں محمد ﷺ اور اسلام۔

18۔ گب، اس عہد کا مشہور ترین برطانوی مستشرق 1895ء میں پیدا ہوا اور ابھی چند سال پہلے وفات ہوئی ہے۔ گب کی تصانیف اگرچہ بہت سی ہیں تاہم اصل شہرت کتاب محمد ازم سے ہوئی جو 49ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے نام کے سلسلہ میں گب نے توجیہات پیش کی ہیں۔ لیکن یہ نام مع توجیہات خود اس کے شاگرد اسمتھ کو پسند نہیں آئیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گب کے یہاں مختلف نظریات، تصورات اور خیالات میں ارتقاء واقع ہوا۔ اور وقت و حالات کے تحت بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے جس کا ثبوت اس کی مختلف تحریروں سے ملتا ہے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں بہر حال اس نے اسلام کے بارہ میں نرم روی کا مظاہرہ کیا۔

19۔ ولفریڈ کینٹویل، اسمتھ، گب کا شاگرد وہ جولائی 1916ء میں پیدا ہوا۔ پی ایچ ڈی کی سند 1949ء میں ایک اور مستشرق فلپ کے ہٹی کی زیر نگرانی تحقیقی مقالہ مجلہ الازہر، تجزیہ و تنقید پر حاصل کی۔ مذہباً عیسائی، متعدد کتابوں کا مصنف، حال پروفیسر ڈلہیں ڈلہوزی یونیورسٹی کناڈا۔

20۔ جوزف شاخت، جرمن مستشرق پیدائش 1902ء میں ہوئی۔ خالص یہودی اسلام اور علوم اسلامی پر متعدد تصانیف ہیں۔ لیکن اصل کام قانون اور اصول فقہ اسلامی پر ہے۔

21۔ برنارڈ لوئس عہد جدید کا مشہور انگریز مستشرق 1916ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ تصانیف کثرت سے ہیں لیکن مشہور کتابوں میں عربس ان ہسٹری، اسلام ان ہسٹری، کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مدیر و مقالہ نگار ہے۔ اسلام دشمنی کے لئے مشہور و معروف ہے اور آج کل یہود پرستی اور اسلام دشمنی میں سرفہرست ہے۔(102)

خلاصہ:

عہد جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجہ بالا تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن تحریک استشراق کے کیف وکم کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے اور بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریکِ استشراق اپنے آغاز اور عروج وارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد آج کے عہد میں انتشار سے دوچار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنفین اپنی اصلی تحریک کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہر حال نظر نہیں آتی جو پہلے ان کا خاصہ تھا۔ مستشرقین کی نوجوان نسل زمانہ کے حالات و وسائل کے پیش نظر ذہن وفکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار ہو رہی ہے۔ ادھر اسلامی دنیا میں سوچ کی نئی لہر پیدا ہو رہی ہیں۔ اور بعض جدید مفکرین و مصنفین مشرق کی تحریروں نے خود مغربی دنیا میں مدوجزر پیدا کر دیا ہے۔ پھر یہ بات صاف ہے کہ اب طاقت وقوت کے سارے اوزان و پیمانے بدل گئے ہیں۔ استعمار اور استحصال کی لغات بدل گئی ہیں۔ علمی و ذہنی مرعوبیت پہلے جیسی نہیں رہی اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر فلک وفضا اور زمین دیکھ رہا ہے۔ اس لئے کیا عجب کہ آنے والا زمانہ تحریک استشراق کے کوچ کر نکل بجا دیئے۔ اس لئے بقول ایک مصنف ''وقت آگیا ہے کہ اسلامی مفکرین وعلماء اپنے حریفوں کے مدمقابل آئیں اور معاندین ومخالفین اسلام کے خلاف علمی محاذ پر حقیقی معرکہ کے لئے صف آرا ہوں۔ البتہ معروضیت کا خواہ مخواہ دعویٰ نہ کریں کہ علمی معروضیت تو درحقیقت فریب نظر (Myth) ہے۔

حوالہ جات

1۔ دکتور محمد احمد دیاب، ''اضواء علی الاستشراق والمستشرقین''، قاہرہ، 1989ء) ص10

2۔ دکتور محمد ابراہیم الفیومی، ''الاستشراق رسالۃ الاستعمار''، (قاہرہ 1993ء) ص143

3۔ معلوف، لوئس، اب، ''المنجد فی الاعلام''، دارشرق بیروت، 1976ء

4۔ ''الاستشراق، رسالۃ الاستعمار''، ص142

5. Rodon son, "The western Image and western studies of Islam, published in the Legacy of Islam, edited by C.E. Bosworth. Joseph schcht, oxford University, press, second edition 1979,

6۔ دکتور احمد عبدالحمید غراب، ''رویۃ اسلامیۃ للاستشراق''، ریاض، 1988ء ص7

7۔ ایضاً، ص8

8۔ سورۃ آل عمران: 69

9۔ ''رویۃ اسلامیۃ للاستشراق''، ص9

10۔ ''الاستشراق، رسالۃ الاستعمار''، ص144

11. "Oxford English Dictionary", Edited by Catherine Soans Angus Sterenson, oxford University press, 2006, 11th Edition, revised p.1008.

12۔ صباح الدین عبدالرحمن، سید، ''اسلام اور مستشرقین''، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی (ہند)، 276001، ج3، ص65,66

13۔ نثار احمد، ڈاکٹر، ''مطالعہ سیرت اور مستشرقین''، مقالات، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، جون 1984ء، ص416

14۔ ایضاً، ص417

15۔ ایضاً، ص418

16۔ صباح الدین، عبدالرحمن، سید، ''اسلام اور مستشرقین''، ج3، ص72,73

17۔ ایضاً، ص74,75

18۔ ایضاً، ص76,77

19۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ''ضیاء النبی''، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، 1418ھ، ج6، ص191-192

20۔ محمد محمد الدحان، ''قوی الشر المتحالفۃ و موقفھا من الاسلام والمسلمین''، قاہرہ 1988ء، ص52

21۔ ایضاً

22۔ ایضاً

23۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ''ضیاء النبی''، ج6، ص194

24۔ القرآن، ابراہیم: 24,25

25۔ پیر کرم شاہ الازہری، ''ضیاء النبی''، ج6، ص195

26۔ غلام جیلانی، برق، ڈاکٹر، ''یورپ پر اسلام کے احسان''، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ص90

27۔ محمد احمد دیاب، دکتور، ''اضواء علی الاستشراق والمستشرقین''، دارالمنار، قاہرہ، 1989ء، ص28,29

28۔ ایضاً

29۔ نذیر احمد، ''الرسول فی کتابات مستشرقین'' بترجمہ، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ''مستشرقین کے اعتراضات کی نشر واشاعت کس طرح ہوتی ہے''، اسلام اور مستشرقین، دار المصنفین، اعظم گڑھ، الہند، ج7، ص199,200

30۔ ایضاً، ص102

31۔ ایضاً

32_ T.W Arnold, "Preaching of Islam", London 1896, p415-417

33۔ ایضاً، ص418-420

34۔ ایضاً، ص424

35۔ عبدالغنی فاروق، ''ہم کیوں مسلمان ہوئے''، لاہور 1987ء، ص213,214

36۔ زکریا ہاشم زکریا، ''المستشرقین والاسلام''، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ 1968ء، ص439-440

37۔ ایضاً، ص450,451

38۔ ایضاً، ص451,452

39۔ ایضاً، ص452,453

40۔ ایضاً، ص454

41۔ عبدالغنی فاروق، ''ہم کیوں مسلمان ہوئے''، ص194-200

42۔ ایضاً، ص149-151

43۔ ایضاً، ص168-172

44۔ القرآن، النور: 40

45۔ عبدالغنی فاروق، ''ہم مسلمان کیوں ہوئے''، ص186-189

46۔ ایضاً، ص85-89

47۔ ایضاً، ص235-246

48۔ القرآن، انفال: 36

49۔ جانس، ''لی نینیٹ اسلام''، لندن طبع 79ء، ص83

50۔ القرآن، مائدہ: 82

51۔ شبلی نعمانی، مولانا ''سیرۃ النبی ﷺ''، الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، مارچ 1991ء، ج1، ص110، 111

52۔ ایضاً، ص122

53۔ عماد الدین خلیل، ڈاکٹر، ''مستشرقین اور سیرت نبوی ﷺ''، مترجم، حافظ محمد عمیر الصدیق، دریا آبادی ندوی، رفیق دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ج2، ص15012

54۔ مسیو کیون، ''سیوتھا ڈالوجی آف اسلام''، بحوالہ عماد الدین خلیل، ڈاکٹر، ''مستشرقین اور سیرۃ النبی ﷺ'' مترجم، حافظ محمد عمیر الصدیق، ص151

55۔ جولیان، ''تاریخ فرانس''، طبع، 1847ء

56۔ کلوور، ڈاکٹر، ''نقد التبشیر العالمی''، (عالمی مشنریوں کی ترقی)، نیویارک، طبع 1960ء

57۔ سفاری، ''ترجمہ قرآن مجید''، طبع 1752ء

58۔ لارنس براؤن، ''دی مسلم ورلڈ''، طبع 1930ء

59۔ (i) عماد الدین، ڈاکٹر، مقالات، ''مستشرقین اور سیرت نبوی ﷺ''، ج 2، ص 158

(ii) معارف، مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ، اگست 1983ء، ص 89

60۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مکہ''، عربی ترجمہ از شعبان، برکات مطبوعہ المکتبہ العصریہ، بیروت، ص 102

61۔ الفانس ڈینیہ، ''استشراق کا یراہ الغرب'' (مشرق مغرب کی نظر میں)، طبع 1890ء

62۔ عماد الدین خلیل، ڈاکٹر، ''اسلام اور مستشرقین''، مقالہ، ''مستشرقین اور سیرت نبوی ﷺ''، ج 2، ص 159

63۔ اسپرنگر، ڈاکٹر، ''سیرت محمد ﷺ''، جرمنی، 1851ء

64۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مکہ''، لندن، 1953ء

65۔ ایضاً، ص 161,162

66۔ آرنلڈ، ''دی پریچنگ آف اسلام''، لندن 1896ء

67۔ عماد الدین خلیل، ڈاکٹر، ''مستشرقین اور سیرت نبوی ﷺ''، معارف، ص 103

68۔ الور الجندی، شیخ، ''مستشرقین اور اسلام''، مصر، مترجم عمیر الصدیق، دریابادی، ندوی، رفیق دار المصنفین، بحوالہ ''اسلام اور مستشرقین''، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، (276001)، ج 2، ص 182

69۔ ایضاً، ص 183

70۔ الور الجندی، شیخ، ''مستشرقین اور اسلام''، معارف، ستمبر 1983ء، ص 185,186

71. Tayn B, "A study of history, oxford, 1956, vol. 1, p.83

72. Abid, vol.3, p.277-278

73. Rodon son, "A critical survey of modern studies on Muhammad, published in studies on Islam, Translated and edited by Merlin L. Swarty oxford University, press, 1981, p.23 to 60

74. Rodon son, "The western Image and western studies of Islam, published in the Legacy of Islam, edited by C.E. Bosworth. Joseph schcht, oxford University, press, second edition 1979, p.9

75۔ غزل کاشمیری، ڈاکٹر، ''دی محمد ﷺ''، مقالہ بحوالہ فکر و نظر، ج 32، شمارہ 2 اکتوبر، دسمبر 1994ء، ص 77

76۔ ایضاً، ص 78

77. Maxeem Rodon son, "The Mohammad, Translated by Anne carter, Pantagon press, England, 1983, p.205,99,480,67,202,251,151-154,114

78۔ ایضاً

79. Rodon Son, "The Mohammad", p. 148,158,219,24,94,81,82,293,313

80. Abid, p.229,226,292

81۔ عمر فروخ، ڈاکٹر، و مصطفیٰ خالدی، ''التبشیر والاستعمار''، عربی، مطبوعہ، بیروت

82۔ سلمان شمسی ندوی، مولانا، ''مشہور مستشرقین اور ان کی تصنیفات جائزہ اور تعارف''، بحوالہ معارف، ج 406، دسمبر 1970ء، عدد 6

83۔ طیب حسن ہواری ''المستشرقون و الاسلام''، عربی، البحث الاسلامی، (لکھنؤ) 1983ء، ص 82 تا 88

84۔ محمد الہی، ڈاکٹر ''المشرون والمستشرقین فی موقفهم عن الاسلام'' عربی، الازہر، طبع جدید

85۔ فیلپ حتی، ''دائرۃ المعارف الاسلامیہ''، مقالہ الادب العربی، مطبوعہ 1948ء، ص 229

86۔ طیب حسن ہواری ''المستشرقون و الاسلام''، ص 71

87۔ سلمان ندوی، مولانا، ''مشہور مستشرقین اور ان کی تصنیفات۔ جائزہ اور تعارف''، بحوالہ ''اسلام اور مستشرقین''، عارف، محمد، ڈاکٹر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یو۔پی، (الہند)، طبع 2006ء، ص 237,238,720

88۔ ایضاً، ص 239

89۔ سباعی، مصطفی، ڈاکٹر، الاستشراق والمستشرقون ما لهم وما عليهم''، المکتبہ الاسلامی، بیروت 1985، ص 69

90. Siddiqi, Mazheruddin, "The Holy Prophet and the Orientalists", Islamic studies (Islamabad). 19:3, 1982

91۔ ایضاً

92۔ شبلی نعمانی، علامہ، سلیمان ندوی، سیرت علوم، مقدمہ سیرۃ النبی ﷺ، فیصل پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور، 1991ء، ج 1، ص 5

93۔ باسورتھ آدم سمتھ، ''محمد اینڈ محمدزم''، ایم اے، شیکاگو 1900، ص 63

94۔ ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری، بزبان عربی، مطبوعہ مصر، ص 8 تا 10

95۔ عبدالرحمن، مولانا، بحوالہ ''اسلام اور مستشرقین'' مرتبہ اصلاحی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)، ج 4، ص 268,269

96۔ مارگولیوتھ، ''دی محمد ﷺ''، دیباچہ، انگلینڈ، 1905ء، ص 11

97۔ ''اسلام اور مستشرقین''، ج 4، ص 271 تا 274

98۔ ایضاً، ص 275

99۔ شبلی نعمانی، مولانا، سلیمان ندوی، مولانا، ''سیرت النبی ﷺ''، ج 1، ص 65

100 ''سیرت النبی ﷺ''، حصہ اول، ص 72

101۔ ''اسلام اور مستشرقین''، ج 3، ص 80 تا 83

102۔ جانس، ''لی غینٹ اسلام''، لندن 79ء، ص 85

﴿...... باب سوم ......﴾

مستشرقین کے افکار سے متاثر سیرت نگار

باب سوم

مستشرقین کے افکار سے متاثر سیرت نگار

فصل اول: سرسید احمد خان

فصل دوم: مولانا ابوالکلام آزاد

فصل سوم: مولوی چراغ علی

فصل چہارم: سید امیر علی

فصل اول

تمہید:

مستشرق ایک وسیع اصطلاح ہے۔لیکن اپنے نصب العین کے لحاظ سے یہ وہ منظم طبقہ ہے جو ارباب کیسا کے منصوبوں کے عین مطابق مشرقی زبانوں اور اسلامی لٹریچر کا بنظر غائر مطالعہ کرنے اور اس سے ایسا مواد مہیا کرنے کی خاطر معرض وجود میں لایا گیا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلامی لٹریچر کے خلاف نظریاتی جنگ کے لئے کارآمد ہو سکے اور فرضی ہی سہی لیکن انہیں سہارا ضرور فراہم کر سکے۔کیونکہ علم وتحقیق کے نام پر مستشرقین کی کوششوں کا بنیادی اور اہم ہدف اسلام کو نقصان پہنچانے یا کم از کم اسے کمزور کرنے کے لئے آنکھیں بند کر کے ایڑی چوٹی کا زور لگانا ہے۔اس مقصد کے لئے انہوں نے جھوٹ، فریب، دھوکا اور الزام تراشی کے کسی بھی حربے کو نا پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔انہیں معلوم تھا کہ اسلامی تعلیمات کا پہلا ماخذ قرآن مجید ہے۔انہوں نے اس مخزن علم وحکمت پر بے شمار حملے کیے۔لیکن سینکڑوں صدیوں کی مذموم اور سرتوڑ کوششوں کے باوجود انہیں سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس ناکامی پر بجائے سبق حاصل کرنے کے انہوں نے نہایت ڈھٹائی سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے ایک نیا محاذ کھولا اور اب انہوں نے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ احادیث مبارکہ پر بھی خود ساختہ اور بے بنیاد الزامات لگانا شروع کر دیئے۔لیکن اس محاذ پر بھی علماء اسلام نے انہیں علمی اور تحقیقی میدان میں لاجواب اور بے بس کر دیا اور قرآن وحدیث کی حقانیت کے دلائل کا انبار لگا دیا۔جسے مستشرقین شرمندگی اور بے بسی سے ملاحظہ کر رہے ہیں مگر کوئی جواب نہیں دے سکتے۔

اس بات سے واضح ہوا کہ مستشرقین کی تحقیق وتدقیق علم کی لذتوں کے سبب انسانی خدمت کے سچے جذبوں کے تحت نہیں ہوتی بلکہ یہ لوگ اپنی تحقیق کے بل بوتے پر لوگوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے کی سعی مذموم کرتے ہیں تا کہ اسلام کے ساتھ لوگوں کی وابستگی کم سے کم ہو اور وہ ان کی تحقیق کو ہی حرف آخر سمجھتے ہوئے ان کی صداقتوں کے معترف ہو جائیں۔یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی وابستگی جس چیز کے ساتھ جتنی زیادہ ہوتی ہے یہ اس پر اتنے ہی زیادہ اعتراضات کرتے ہیں ان کے مکروہ عزائم بالکل واضح ہوتے ہیں اور کبھی بین السطور انہیں پڑھنے کے لئے چشم بصیرت درکار ہوتی ہے۔

برصغیر میں سیرت نگاری کا نقطہ آغاز ہی 1857ء کو قرار دیا جاتا ہے ہاں اگر کسی خاص زبان یا خاص مفہوم میں یہ بات ہے تو ہو سکتا ہے درست ہو لیکن 1857ء سے قبل برصغیر میں سرے سے سیرت نگاری کا کوئی تصور ہی نہیں تھا تو یہ بات درست نہیں ہے۔چنانچہ ہم نے 1857ء سے پہلے برصغیر میں تصور سیرت اور سیرت کے تحریری سرمائے کا جائزہ لیا ہے اور اس کے اسباب محرکات کو بھی تلاش کیا ہے اور سیرت نگاری کی اصناف واسلوب کی بھی نشاندہی کی ہے۔گویا باب سوم 1857ء سے قبل کے سیرت کے تحریری مواد اور اس کے محرکات کے جائزے پر مشتمل ہے۔

1857ء بجا طور پر برصغیر میں اہم سیاسی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کے تہذیبی اثرات بھی کم دور رس نہیں تھے اس سیاسی و تہذیبی تبدیلی نے اسلام اور مسلمانوں کو براہ راست متاثر کیا۔عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں صرف تبدیلی مذہب تک محدود نہیں تھی بلکہ تعلیم، زبان اور ادب سب کو متاثر کر رہی تھیں۔پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس کو بھی ہدف وتنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔یہی وہ دور ہے جب سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے نے قرطاس وقلم کا محاذ بھی سنبھالا اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس کو نشانہ بنانے والوں کو جواب دیا۔سرسید احمد، چراغ علی، سید امیر علی اور ابوالکلام آزاد نے عیسائیت کے حملوں کا جواب دیا اور یہیں سے سیرت نگاری میں مختلف رجحانات بھی نمایاں طور پر ابھرنا شروع ہوئے۔

1757ء میں جو مسلمانوں کا تنزل شروع ہوا تھا 1857ء میں انتہا کو پہنچ گیا۔ سیاسی انقلاب کے علاوہ جو انحطاط مسلمانوں کی اقتصادی اور تمدنی زندگی میں رونما ہوا وہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا۔ اس کی صحیح اور مفصل تصویر ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب میں کھینچی ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر ہنٹر نے لارڈ میو کے ایما پر 1871ء میں لکھی تھی۔ اس زمانے میں سرحد پر شورش جاری تھی اور ہندوستان سے بھی بعض مسلمان روپیہ اور آدمی سرحد پر بھیجتے تھے۔ لارڈ میو نے جنہیں مسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی، یہ معلوم کرنا چاہا کہ مسلمان حکومت سے کیوں بددل ہیں اور ان کی تسکین کے لئے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کی توضیح کے لئے ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے یہ کتاب لکھی۔ (1)

مسلمانوں کے مصائب اگر تمام تر اقتصادی ہوتے، تب بھی اُن کا حل آسان نہ تھا، لیکن اس زمانے میں انہیں جو نئے مسائل پیش آ رہے تھے، وہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق تھے۔ اقتصادی اور ذہنی پستی کی اصلاح کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں اور وہ اس سے بدکتے تھے۔ اب تک اُن کی ادبی زبان فارسی رہی تھی، لیکن اس زبان کا مستقبل تاریک تھا اور اردو میں غزل گو شعراء کے دواوین کے سوا کوئی قابل ذکر لٹریچر نہ تھا۔ نثر میں گنتی کی چند کتابیں تھیں اور ابھی اس میں عملی مسائل پیش کرنے کی صلاحیت نہ آئی تھی۔ اردو شاعری بھی نقائص سے پُر تھی اور قوم کی نشوونما میں کسی طرح کارآمد نہ ہو سکتی تھی۔ قوم کی اصلاح کے لئے ضروری تھا کہ ایک نئی زبان تیار ہو، جو فارسی کی جگہ لے۔ ایک نیا لٹریچر پیدا ہو، جو شاندار ماضی اور موجودہ زبوں حالی کی تصویر قوم کے سامنے کھینچ کر رکھ دے۔ شاعری اور شاعرانہ تنقید کے بالکل نئے اصول مرتب ہوں۔ ایک نئی نثر رائج ہو، جو زورِ انشا دکھانے کے لئے نہیں بلکہ عام روزمرہ کے واقعات بیان کرنے کے لئے کام آئے۔ علی گڑھ کی تحریک نے یہ سب کچھ کیا۔ سرسید احمد خان کی تعلیمی اصلاح کا زمانہ اردو ادب کا بھی شاندار عہد ہے۔ سرسید احمد خان اس تحریک کے علمبردار تھے۔ (2)

سرسید احمد خان

احوال و آثار:

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے عظیم محسن سرسید احمد خان 5 ذی الحج 1232 ہجری بمطابق 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ (3)

سلسلہ نسب:

خود فرماتے ہیں کہ میری پیدائش دہلی کی ہے اور میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔ (4) ایک خط میں لکھتے ہیں میں مسلمان ہوں۔ ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں۔ ان کا سلسلہ 36 واسطوں سے آنحضور ﷺ تک پہنچتا ہے۔ ان کے سلسلہ نسب میں سب سے آخر میں حضرت امام محمد تقی ہیں۔ (5)

ان کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت آدمی تھے اور دنیاداری کے مشغلوں میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ وہ مشہور نقشبندی بزرگ شاہ غلام علی کے مرید تھے اور اپنا بیشتر وقت ان کی صحبت یا تیراکی اور تیراندازی میں جس کے وہ بڑے ماہر تھے، صرف کرتے۔ سرسید کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ تھے، جو پہلے کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور پھر اکبر شاہ ثانی کے وزیر ہو گئے۔ وہ بھی صوفی منش آدمی تھے۔ لیکن سرسید کی تربیت زیادہ تر ان کی والدہ نے کی، جو بڑی دانش مند اور دوراندیش خاتون تھیں۔ (6)

تعلیم و تربیت:

سرسید کی تعلیم پرانے اسلامی اصولوں پر ہوئی۔ پہلے قرآن مجید پڑھا۔ پھر فارسی کی درسی کتابیں مثلاً کریما، آمدنامہ، گلستان، بوستان وغیرہ پڑھیں۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، مختصر معانی اور مطول کا کچھ حصہ پڑھا۔ ریاضی کا علم انہوں نے اپنے ماموں نواب

زین العابدین سے سیکھا اور طب حکیم غلام حیدر خاں سے۔ اس کے بعد وہ اپنے طور پر مختلف کتابیں پڑھتے رہے اور 1846ء سے 1855ء تک جب وہ دہلی کی منصفی پر مامور تھے انہوں نے تحصیل علم میں زیادہ ترقی کی۔ اس زمانے میں سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیزؒ کے جانشین محمد اسحٰقؒ اور مولانا قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن، مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام لئے جاتے ہیں۔ (7)

سرسید کہتے تھے کہ:

''مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا انہوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا''۔ (8)

انیس برس کی عمر میں پھر ابتداء سے پڑھی گئی کتابوں کو از سر نو پڑھا۔ دہلی کے مشہور واعظ مولوی نوازش علی سے کچھ فقہ قدوری وشرح وقایہ اور اصول فقہ میں الشاشی اور نور الانوار پڑھیں۔ مولوی فیض الحسن سے مقامات حریری کے چند مقالے پڑھے اور مولوی مخصوص اللہ سے مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزاء صحیح مسلم پڑھے۔ پھر قرآن مجید کی سند لی۔ خود فرماتے تھے کہ میں نے اس کے علاوہ استاد سے کچھ نہیں پڑھا۔ (9)

حالات زندگی:

1839ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی لیکن دہلی کے برائے نام شہنشاہ کے دربار سے بھی وابستہ رہے جس نے ان کو مختلف اعزازی خطابات عطا کئے تھے۔ بغاوت کے دوران انہوں نے برطانیہ کے ساتھ پوری وفاداری برتی۔ اس بغاوت کے موضوع پر ان کی تین تصانیف ہیں: ''تاریخ بجنور'' (1858ء) ''اسباب بغاوت ہند'' (1858ء) اور ''ہندوستان کے وفادار مسلمان'' (لائل محمڈنز آف انڈیا) (1860ء)۔

1859ء سے اپنی وفات 1898ء تک وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل میں زیادہ سے زیادہ منہمک ہوتے چلے گئے۔ 1868ء میں انہوں نے مغرب سے متاثر طرز زندگی اختیار کیا، برطانوی حکمران طبقہ سے پر خلوص معاشرتی تعلقات بڑھائے اور 1869۔1970ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ 1876ء میں انہوں نے ملازمت سے پنشن لے لی تاکہ اپنا تمام وقت علی گڑھ میں جدید تعلیم کے اداروں کی ترقی و تعمیر کے لئے وقف کر سکیں۔ 1869ء میں وہ کمانڈر آف دی اسٹار آف انڈیا (سی ایس آئی) ہو گئے اور 1888ء میں ان کو سر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ 1878ء میں وہ وائسرائے کی قانون ساز مجلس کے رکن مقرر کئے گئے۔

ان سیاسی مسائل کے علاوہ جن سے انہیں 1859ء سے مسلسل دوچار ہونا پڑ رہا تھا مغربی تہذیب کے جانچنے اور پرکھنے کا دینی و فکری مسئلہ بھی انہیں درپیش تھا اور دینی مسائل کے متعلق وہ عقلی مسائل بھی درپیش تھے جو نئی سائنسی معلومات کی وجہ سے سامنے آ رہے تھے۔ (10)

مذہبی تفکر:

مذہبی فکر کے ارتقاء کے حوالے سے سرسید احمد خان کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی روایتی مذہبی ماحول میں بسر ہوئی تھی۔ ان کے والدین واضح مذہبی میلان کے حامل تھے۔ مولانا حالی نے ان کے والد میر متقی کو آزاد طبیعت فرد قرار دیا ہے

جو اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے۔ (11)

سرسید احمد خان کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں ان کے ننھیال کا بھی گہرا اثر تھا۔ اس حوالے سے انہیں اپنے عہد کے دو اہم مقامی مذہبی مکاتیب سے اثرات قبول کرنے کا موقع ملا۔ ان کے والد اور دیگر اہل خانہ مولانا شاہ غلام علی کے عقیدت مند تھے۔ (12)

سرسید احمد خان مذہبی معاملات میں جدت پسندی کے سب سے بڑے علمبردار کی حیثیت سے ہندوستان بھر میں نامور ہوئے۔ تبدیلی کے اس عمل میں پس پردہ عوامل میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جب تک مسلمان اپنے مذہبی عقائد میں نئے دور کے علوم وفنون کے حوالے سے تبدیلی نہیں کریں گے ترقی نہیں کر سکتے۔ (13)

حالی لکھتے ہیں کہ:

''وہ نہ مفکر تھے نہ مصلح، نہ صوفی نہ رند، نہ عقلیت پرست نہ مثالیت پرست، نہ ماہر تعلیم نہ مجتہد، گوان میں سے ہر ایک کا جزو ان کی شخصیت میں ضرور جھلکتا تھا۔ وہ سرتا پا ایک مجاہد تھے جو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر لڑتے تھے۔ انہیں فوری اور زود آئندہ مسائل کا بھی ادراک تھا۔ اور دیر آئندہ مسائل کا بھی اور وہ ان کو مناسب اور بروقت توجہ دیتے تھے''۔ (14)

عیسائی مبلغین کے مناظروں کا وہ چیلنج بھی سامنے تھا جو مغربی مستشرقین کے سائنسی مطالعہ اسلام پر مبنی تھا۔ وہ شاہ ولی اللہ کی روایات کے عین مطابق کامل تبحر علمی رکھتے تھے۔ بایں ہمہ انہوں نے تثلیث کے منکر، عیسائی موحدوں کی تحریروں کے مطالعہ کی طرف بھی توجہ کی اور معتزلہ کے انداز میں عقلیتی متکلمانہ اصول کے تحت اسلام کی ازسرنو صحیح اور واضح سمت متعین کرنے کی کوشش کی اس کے تحت وہ مسیحیت کی بھی مدحت سرائی کرنے لگے۔ ایک طرح سے ان کی تمام ذہنی اور دماغی طاقت سائنس اور مذہب کے مابین تنازعہ کو سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھی اور نوجوان مسلم دانشور طبقہ کو متوجہ کرنے کے لئے وہ دونوں کی بہترین صفات میں ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا کرنے میں کوشاں رہے۔ (15)

تصانیف:

مذہبی حوالے سے سرسید کی مشہور تصانیف یہ ہیں:

- ☆ آثار الصنادید ☆ تفسیر القرآن
- ☆ رسالہ اسباب بغاوت ہند ☆ تحریر فی اصول التفسیر
- ☆ تبیین الکلام ☆ رسالہ طعام اہل کتاب
- ☆ رسالہ تہذیب الاخلاق ☆ ابطال غلامی
- ☆ الخطبات الاحمدیہ

اور اس کے علاوہ چند ایسے مضامین لکھے جن کے موضوعات مختلف ہیں ان میں سے کچھ کا تعلق وقتی مسائل سے تھا۔ مگر ان کی افادیت آج بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔ (16)

سرسید کی مذہبی تصانیف بہت زیادہ ہیں۔ ہم نے سرسید کے خاندان کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے حالی کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ ''مذہب ہی کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب کی گود میں ہوش سنبھالا تھا''۔ 1839ء سے لے کر جب انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے مختصر حالات لکھے، 1898ء تک جب وہ امہات المومنین کے متعلق ایک عیسائی مصنف کے اعتراضات کا جواب لکھتے لکھتے وفات پاگئے برابر ساٹھ سال مذہبی مباحث میں ان کی دلچسپی برقرار رہی۔

ان رسائل وکتب کے علاوہ سرسید نے کئی اور اہم کتابیں لکھیں۔ مثلاً (۱) تبیین الکلام، جس میں انہوں نے بائبل کی تفسیر نئے

اصولوں کے مطابق لکھنی شروع کی تھی۔ (۲) رسالہ طعام اہل کتاب۔ (۳) خطبات احمدیہ جس میں سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھا۔ (۴) تفسیر قرآن کی سات جلدیں اور کئی دوسرے مذہبی رسائل۔ (17)

سر سید احمد خان معاصرین اور متاخرین کی نظر میں

1۔ الطاف حسین حالی کے نزدیک:

سر سید احمد خان کی بے مثال سوانح ''حیات جاوید'' کے مصنف الطاف حسین حالی 1901ء میں لکھتے ہیں:

''اس عجیب وغریب شخص کی بائیوگرافی ایسی چیز نہیں ہے، جس کے لکھنے کا حق ایک آدھ مصنف سے ادا ہو سکے جس قدر زیادہ زمانہ گزرتا جائے گا اسی قدر سر سید کے کاموں کی زیادہ قدر اور ان کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی۔ متعدد لوگ ان کی بائیوگرافی پر قلم اٹھائیں گے اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا''۔ (18)

2۔ بینرجی (D.N. Banner Jea) کے نزدیک:

مشہور کانگریسی رہنما بینرجی (D.N. Banner Jea) اور ان کے ہم وطن لوگوں نے سر سید احمد خان کا ذکر ایسے مسلمان رہنما کی حیثیت سے کیا ہے، جس نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کر کے ملک کے سماجی اور تہذیب اتحاد میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ وہ سر سید احمد خان کو منضبط سیاسی مفہوم میں قوم پرور نہیں سمجھتے، یعنی ایسا شخص جو آزاد قومی حکومت کی وکالت کرتا ہے، لیکن بینرجی انہیں ایک اہم معمار ملک تسلیم کرتے ہیں۔ (19)

3۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک:

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مسلم قومیت کی تعمیر میں سر سید کی غیر معمولی عطا کا بتکرار ذکر کیا ہے۔ متصوفانہ غنائی شاعری سے مستعار زبان میں وہ کہتے ہیں:

''فرہاد کو شیریں سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا کہ انہیں اپنی قوم سے تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے یہی ان کا ورد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنا فی القوم کے درجے کو پہنچ گئے تھے۔ سر سید نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سید، شیخ، مغل، پٹھان تھی۔ سر سید نے اسے ''نیشن'' کا ہم معنی بنا دیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا''۔ (20)

4۔ بشیر احمد ڈار کے نزدیک:

بشیر احمد ڈار نے ایک مختصر جملے میں ان کی تصویر پیش کر دی:

''وہ عہد جدید کے پہلے آدمی تھے، جنہوں نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت محسوس کی، جو وسیع المشرب، جدید اور ترقی پسند ہو''۔ (21)

اس کے بعد کے زمانے سے موجودہ عہد تک سر سید احمد خان کے مخالفین ان پر جمال الدین افغانی (1839ء۔ 1897ء) کی تنقید کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ افغانی نے ان متعدد مضامین میں سر سید پر اعتراض کئے ہیں جو انہوں نے ہندوستان میں 1870ء کے اواخر میں لکھے، لیکن ان کا سب سے زیادہ اہم مضمون 1884ء میں عربی میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے سر سید کے متعلق لکھا:

''وہ ایک نیچری (دہریہ) کے بھیس میں ظاہر ہوا اور دعویٰ کیا کہ اندھی فطرت کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں اور یہ کہ اس دنیا کا کوئی عاقل خدا نہیں ہے۔ (یہ ایک صریح غلطی ہے) اور یہ کہ تمام پیغمبر نیچری تھے، جو آسمانی مذاہب کے بتائے ہوئے خدا پر یقین رکھتے تھے (خدا اپنی امان میں رکھے) اس نے خود کو نیچری کہا اور امراء کے نکمے نوجوان لڑکوں کو بہکانا شروع کیا''۔ (22)

عیسائی مبلغوں نے جس طرح سر سید احمد خاں کے کام کی قدر و قیمت کا تعین اس مفروضہ کی بنیاد پر کیا کہ عیسائیت مثالی مذہب

ہے۔ایسے ہی ماہرین اسلامیات نے اسلام کے تاریخی ارتقاء کے اپنے مخصوص تصور کی روشنی میں ان کے کام کا مطالعہ کیا۔(1850ء۔1921ء) نے مسلم تفسیر قرآن کے رجحانات پر اپنے آخری خطبہ میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو میں بعض اسلامی تحریریں ان کی دسترس سے باہر ہیں مثلاً سرسید احمد خان کی وہ ''جامع تفسیر'' جو اسلام کے متعلق ان کی نئی بصیرت کو یقینی طور پر قائم کرے گی۔پھر بھی سرسید کی تحریروں کے صرف انگریزی اور عربی ترجموں کی بنیاد پر نے ان کو ہند مسلم جدیدیت کے علمبرداروں میں روایتی اسلامی علوم کا سب سے لائق ماہر کہا ہے۔(23)

سرسید احمد خان اور خطبات احمدیہ

تعارف:

اصل کتاب اردو میں ہے اس کا انگریزی ترجمہ A series of essays on the life of Muhammad (سیرۃ رسول ﷺ) کے جواب میں لکھی۔ولیم میور نے چار جلدوں پر مشتمل اپنی ضخیم کتاب ۱۸۶۱ء میں شائع کی تھی۔ولیم میور نے یہ کتاب ایک یورپی پادری فنڈر کی فرمائش پر لکھی تھی جس سے اس کتاب کی محرکات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، سرسید کہتے ہیں کہ ''جب یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہنچی تو لوگوں نے اس کو نہایت شوق وذوق سے پڑھا مگر جب ان کو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آنحضرت ﷺ کے حالات کی نہایت سیدھی سادھی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کو اس وضع پر ڈھالا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پہلے ہی سے اس کتاب کو اس طرح لکھنا مقصود اور مذکور تھا تو ان کا وہ شوق بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔''(24)

سرسید کہتے ہیں کہ:

''میرے دل پر اس کتاب سے جو اثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اس زمانے میں میں نے ارادہ کر لیا کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق حالات میں ایک کتاب اس طرح پر لکھی جاوے کہ جو جو صحیح اور اصلی اور واقعیہ اور منقح ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے بخوبی ثابت ہیں ان کو بخوبی چھان بین اور امتحان کر کر ترتیب سے لکھا جاوے اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور ان کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے ان کو جداگانہ اسی ترتیب سے جمع کیا جاوے اور جو محض جھوٹ اور افترا د بہتان یا خودغرض یا احمق واعظوں اور چھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں، ان کو علیحدہ بہ ترتیب لکھا جاوے اور انہی کے ساتھ ان کے غلط اور ان کے نامعتبر ہونے کا ثبوت اور ان کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جاویں۔''(25)

سرسید احمد خان کے اس خط سے جہاں ان کے دلی جذبات اور اس والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے جو ان کو حضور انور ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ تھی وہاں ان مشکلات اور دشواریوں کا ایک نقشہ بھی نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے جو انہیں اس کتاب کی تالیف میں پیش آئی ایک خط میں اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

''میں شب وروز کتاب سیرِ مصطفیٰ ﷺ میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے۔لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب، ادھر فکر جواب کتاب، ادھر فکر تنقیح صحیح روایات صحیح میں مبتلا رہتا ہوں اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ انہیں لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آئے گا۔''الخطبات احمدیہ' ایک دیباچہ اور بارہ خطبات پر مشتمل ۸۰۲ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے، خطبے کی حیثیت ایک باب کی ہے، ہر خطبے کا عربی متن ہے جس کی تفصیل کچھ ایسے ہے۔(26)

یہ کتاب سرسید کے بارہ خطبات پر مشتمل ہے۔ان خطبات میں جو مضامین بیان کیے گئے ہیں وہ مجملاً مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا خطبہ:

ملک عرب کا جغرافیہ اور اس کی قوموں کا حال:

پہلے خطبہ میں جو سب سے بڑا اور بجائے خود ایک کتاب ہے، عرب کا نہایت مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے اُن بعض مُسلمات کے ثابت کرنے کے لئے جن کا سرولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے، بطور بنیاد مباحث آئندہ کے بیان کیا گیا ہے تا کہ آئندہ خطبات میں اس بات کا فیصلہ آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جَبَل فاران جس کا نام توریت کی ایک آیت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرتؐ کی نبوت کی بشارت نکالتے ہیں آیا وہ بقول اہل اسلام جبال عرب میں سے ہے یا بقول سرولیم میور کے جبال شام میں؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں، آباد ہوئے یا بقول سرولیم میور کے آباد نہیں ہوئے؟ یا یہ کہ آنحضرتؐ کا اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سرولیم میور کے ثابت نہیں ہے؟ اس خطبہ میں سرسید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے اپنے ہر ایک دعوے پر سرولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے بر خلاف استدلال کیا ہے۔

دوسرا خطبہ:

اسلام سے قبل عربوں کی رسمیں اور ان کی عادتیں:

دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و عقائد اچھے یا برے جہاں تک کہ شعرائے جاہلیت کے اشعار اور دیگر معتبر ذریعوں سے معلوم ہوئے بیان کئے ہیں اور جس قدر باتیں اشعار سے استنباط کی ہیں اُن کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیے ہیں جن سے ان باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ لوگوں کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام کے بعد اُن کے اخلاق اور عادات اور عقائد و خیالات کس درجہ تک تبدیل ہو گئے۔

تیسرا خطبہ:

اسلام سے پہلے عرب کے مختلف مذاہب اور ادیان کا ذکر:

تیسرے خطبہ میں اُن ادیان مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع ہوئے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیان میں کون سے دین سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے؟ اس خطبہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں منقسم تھے۔ بت پرست، خدا پرست، لا مذہب اور معتقدین مذہب الہامی۔ ان میں سے اول کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد عرب کے الہامی مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے (۱) مذہب صائبین (۲) مذہب ابراہیم اور دیگر انبیائے عرب یعنی ہودؑ، صالحؑ، اسمٰعیلؑ اور شعیبؑ کا (۳) مذہب یہود (۴) مذہب عیسوی۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا اور اُس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعۃً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر پور کر دیا'' اس کے بعد انہوں نے مفصل بیان کیا ہے کہ اسلام نے عرب کے مذاہب مذکورہ میں کیا کیا اصلاحیں کیں؟ کن باتوں کو قائم رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی؟ اس کے بعد جو اکثر عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام درحقیقت اصول و عقائد متفرقہ و منتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے۔ اُس کا اس طرح جواب دیتے ہیں کہ ''ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاکیزہ اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر متغیر اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس

طرح کہ اُس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو متناقض اصول و احکام اُس کی ذات سے صادر ہوں۔ مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد ﷺ کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہئے جنہوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا، جنہوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنہوں نے اپنے بایمان تبعیین کے لئے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے''۔ (27)

چوتھا خطبہ:

اسلام انسان کے لئے رحمت ہے اور تمام انبیاء کے مذاہب کی پشت پناہ:

چوتھے خطبہ میں اس بات کا نہایت شافی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور اس سے موسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔ اس خطبہ کو سر سید نے اس طرح شروع کیا ہے کہ ''یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا یا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہئے کیونکہ طرفدار دل سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانی مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اُس کو ظاہر کرتے ہیں، مگر جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرفدار دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا ہے اور اسی لئے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اُس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے''۔

خطبہ ۴ کا پہلا حصہ:

مصنف نے اس مضمون کو چار حصوں پر منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصہ میں وہ فائدے بیان کئے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اُس کے ثبوت میں اُن مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کئے ہیں جنہوں نے اسلام کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں جیسے سر ولیم میور جن کی نسبت سر سید لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔

دوسرا حصہ:

دوسرے حصہ میں اُن عیسائی مصنفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنہوں نے اسلام کو نوع انسان کی معاشرت کے حق میں مضر بتایا ہے اور اُس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حسن معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے۔

تیسرا حصہ:

تیسرے حصہ میں اُن فائدوں کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں مذہبوں کو بالاشتراک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ ''اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ منسوب کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اُن تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی اُن تمام تحریروں کو الہام ربانی اور اُن نبیوں اور مقدس لوگوں کو اُن افعال قبیحہ کا مرتکب یقین کرتے تھے۔ اسلام نے اُن معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو اُن تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے اُن پر لگائے تھے اُن کو عقلمندی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیا پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں توریت کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور جن وجوہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے اُن کو

بخوبی دریافت کیا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیم حضرت لوط ؑ اُن کی بیٹیوں، حضرت اسحٰق ؑ، یہودا، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹیوں، ہارونؑ، داؤدؑ اور سلیمان کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے وہ تمام دنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں یا اُن کے گناہوں کی سزا کے لئے اُن کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پہنچا دی جس کے وہ مستحق تھے''۔

چوتھا حصہ:

پھر اسی خطبہ کے چوتھے حصہ میں اُن فائدوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ'' دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں۔ عیسائی مذہب کی بنیاد اُس نیک اور حلیم شخص (یعنے حضرت یحییٰ ؑ پیغمبر) سے ہے جو خدا کا رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دارومدار اُس عجیب شخص پر ہے جس کو اُنہوں نے اتا بزرگ اور مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰ ؑ پر) مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادہ اور نڈر دل اور نہایت استوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرفدار رہا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی باپٹسٹ (یعنی حضرت یحییٰ ؑ) بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسیٰ ؑ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے پس کونسا مذہب اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اُس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے''۔

'' جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اس لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور اُن خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰ ؑ نے فرمائی تھیں۔ اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اُسی نے خدائے ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اُس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت نے کی تھی اسلام ہمیشہ اُس زمانے کے عیسائیوں کو اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی متنبہ کرتا رہتا ہے اسلام نے عیسائیوں سے اُسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا، جیسا کہ قرآن میں آیا:

"قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا''

بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی میں کھل گئیں اور اُس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہوئے جس میں مبتلا تھے اور اُنہوں نے پھر اُسی رتبہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے اُن کو حاصل تھا۔ یعنی انہوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہٗ لاشریک لہٗ اور عیسیٰ ؑ مسیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونیٹیرین (یعنی موحدین) سے معزز ہے''۔

اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے اٹھالیا جائے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ ''اگر سینٹ پیٹر یا سینٹ پال پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اُس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسے پُراسرار رسومات کے ساتھ اس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ آکسفورڈ یا جنیوا میں جا کر اُن کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر جامیں جا کر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول مفسروں نے ان کی تحریرات اور اُن کے مالک یعنی عیسیٰ مسیح کے کلمات کی تفسیر کی ہے اُس پر غور کرنا پڑے گا''۔

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ ''جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے اُن میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت

عیسیٰؑ کا پورا با اختیار نائب سمجھتے تھے اور اُس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ اُن کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ و اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے گناہوں کے بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ پوپ کو پورا اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ درحقیقت پوپ بلحاظ اُن اختیارات کے جو اُس کو حاصل تھے اور جن کو وہ کام میں لاتا تھا کسی طرح حضرت عیسیٰؑ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اُس سے پیدا ہوتی ہیں اُن کو بتلایا اور جا بجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی۔ اور اُن کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑ دیں اور خود آپ اپنے لئے سچ کی جستجو کریں:

چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا:

''قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' اور پھر دوسری جگہ فرمایا ''اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ''(28)

''جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم جو اُس وقت عیسائی تھے آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور اُن کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے عدی اس بُت کو اپنے گلے سے نکال پھینک۔ چنانچہ نکال ڈالی۔ جب وہ پاس آئے تو آنحضرت ﷺ قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے:

''اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ''

جب آپ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ ''ہم تو اُن کی پرستش نہیں کرتے''۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اُس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر تم بھی اُس کو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھہراتے ہیں وہ اُس چیز کو جسے خدا نے حرام کر دیا سو تم بھی اُس کو حلال سمجھنے لگتے ہو؟ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا بس یہی اُن کا پوجنا ہے''۔

''ایک مدت تک عیسائی اسلام کی عداوت سے دیکھا کیے اور اُس کے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے اُسے دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدس کے دل پر اُس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ اُن دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جن میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرے خدا یا جھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے اُن کے دل پر اثر کیا اور جیسی کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ پالیا پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں خود اور اُن کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اُس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے جس کی بدولت ہم کروڑوں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو یہ نعمت نہ بخشتا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بُت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھلک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم مورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں، پس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے''۔

''چوں کہ درحقیقت لوتھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لئے اس کے مخالف علانیہ اُس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔ کوارٹرلی ریویو نمبر 254 میں لکھا ہے کہ جینی برارڈ نے پوپ کی طرف سے جرمنی کے ریفارمروں اور خصوصاً لوتھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرا کسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کا میلان جو بت پرستی کے برخلاف ہے اُس پر غور کرو۔

مارٹینس، الفانسس اور والڈس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمد ﷺ نے انہیں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں'۔

تاہم لوتھر نے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخر کار اس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی، آزاد کر دیا ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلہ تثلیث کے مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی، جو درحقیقت حضرت عیسیٰ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اس نبی آخر الزمانؐ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا۔ پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہئے''۔(29)

پانچواں خطبہ:

مسلمانوں کی مذہبی کتابوں، کتب حدیث، کتب سیرہ، کتب تفسیر اور کتب فقہ کے بیان میں:

پانچویں خطبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب حدیث کتب سیر تفاسیر اور کتب فقہ کی تصنیف کا منشا اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چین جو اسلام کی نسبت آئندہ زمانہ میں کچھ لکھنا چاہیں اُن کو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ اُن مصنفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کے سبب غلطی میں پڑے ہیں گمراہ نہ ہوں اور اُن کی رہبری کے لئے ایک سیدھا راستہ بن جائے۔

چھٹا خطبہ:

مذہب اسلام کی روایتوں کی حقیقت اور ان کے رواج کی ابتدا:

چھٹا خطبہ مذہب اسلام کی روایت پر لکھا گیا ہے۔ یہ خطبہ کسی قدر طولانی ہے اس لئے صرف اُس کی سرخیاں لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اس میں اول روایت کی اصلیت اور یہ کہ اُن کے رواج کی ابتدا کیونکر ہوئی اور نیز یہ کہ دین اسلام صرف انہیں صحیح روایتوں پر منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دینوی امور سے بیان کیا ہے۔ پھر جھوٹی روایت کرنے کا امتناع اور اُس کی سزا جو اسلام میں مقرر ہے، درجات احادیث بلحاظ ثقہ ہونے رواۃ کے، راویوں کا درجۂ اعتبار بلحاظ حفظ کے یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو دی، اختلاف روایت کے اسباب، احادیث موضوعہ کا بیان، یہ تمام باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں اس کے بعد سر ولیم میور نے جن روایات سے استدلال کر کے اسلام اور بانی اسلام پر اعتراضات وارد کئے ہیں اُن اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اور مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے اُجالے میں کوئی غیر مذہب مصنف، بشرطیکہ اُس نے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔(30)

ساتواں خطبہ:

قرآن کریم رسول اللہ ﷺ پر کس طرح نازل ہوا:

ساتویں خطبہ میں اول قرآن مجید، اُس کا نزول، اُس کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، اُس کی مختلف قراءتیں، آیات ناسخ و منسوخ کی بحث، اُس کے جمع ہونے کا زمانہ اُس کی نقلوں کی اشاعت اور اُس کا کامل اور الہامی ہونا بیان ہوا ہے اور اُس کے بعد سر ولیم اور

دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو انہوں نے قرآن مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل منشاء وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ''مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے۔ یوروپ کی زبانوں میں بے شک اس کے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کئے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یوروپ میں ہوا اس کا بیان گاڈ فری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ ''اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شائع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل (یعنی محتمل المعنیین) متین اور شائستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنانے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی، تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا جس کی وساطت سے یوروپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی''۔

اس کے بعد سر سید نے سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض انہوں نے غلط فہمی سے قرآن پر وارد کئے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

آٹھواں خطبہ:

خانہ کعبہ اور اس کے گزشتہ حالات اسلام سے قبل:

آٹھواں خطبہ خانہ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ یقطان جس کا ذکر توریت میں جا بجا آیا ہے اہل عرب کا اس کی اولاد میں ہونا، حضرت اسمٰعیلؑ کا مکہ کے قریب آباد ہونا، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کی تمام مراسم کا ابراہیم و اسمٰعیل سے تعلق ہونا، یہ سب بناوٹ اور افسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور مؤرخانہ احتمالات و قیاسات سے نہایت بعید ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منا میں رمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم سے یا ان خیالات و اصول سے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہنچے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں۔ یا ان کو بت پرستی کے ان اصول سے جو جزیرۂ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا''۔ اس دعوے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جو آگے چل کر آنحضرت صلعم کے بنی اسمٰعیل ہونے سے انکار کیا ہے اور آپ کے نسب نامہ پر شہادت وارد کئے ہیں ان کے لئے ایک وجہ ہاتھ آئے۔

سر سید نے اس خطبہ میں نہ صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ تر یوروپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کا حجاز یا عرب میں آباد ہونا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ حجر اسود اور قربانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص ابراہیم اور ان کی اولاد سے تعلق ہے۔ انہوں نے توریت کے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد یعنی حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لئے ایک بن گھڑا پتھر مثل حجر اسود کے کھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اس کو بیت ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے اور تمام مراسم جو موسم حج میں خانہ کعبہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں ان سب کا تعلق حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر منصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

مثلاً وہ کعبہ اور حجر اسود کی نسبت کتاب پیدائش اور کتاب خروج کے متعدد بابوں اور آیتوں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ ''حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ بناتے تھے یہ سب بزرگ ایسے پتھر کی تعظیم کرتے تھے، یعقوب نے اس پر تیل ڈالا

جو اس زمانے کے دستور کے موافق غایت الغایۃ تعظیم پرستش کے قریب تھی یعقوبؑ نے کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی اور خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمہاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے۔ پس اب کونسا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیم میں جاری نہ تھا جس پر سر ولیم میور حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو بنی اسرائیل کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں''۔

''ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا، جیسے کہ کعبہ ہے اگر ابراہیم کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰ) جس نے بیابان میں خدا کا گھر بنایا اور وہ کون تھا (یعنی داؤد) جس نے خرمنگاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر و لکڑی و لوہا و پیتل اس کے بنانے کو جمع کیا اور وہ کون تھا (یعنی سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمنگاہ ارنان یبوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا پس کعبہ کی بنا کو اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیم کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے''۔

اس کے بعد عرفات کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ ''عرفات جس کو سر ولیم میور بت پرستوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیم اور اس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے۔ ہزاروں جگہ توریت میں آیا ہے کہ خدا ابراہیم کو مرئی ہوا، خدا اسحاقؑ کو مرئی ہوا، خدا یعقوبؑ کو مرئی ہوا، خدا موسیٰؑ کو مرئی ہوا، بس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں جس پہاڑ پر جو قریب مکہ کے ہے، خدا ابراہیم و اسمٰعیلؑ کو مرئی ہوا۔ اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے۔ معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے جبل عرفات کو کیا سمجھا جو اس کی نسبت کہا کہ اس کو ابراہیمی رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے''۔

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی عرفات کا استعمال بجز خاندان ابراہیم کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا یہی وہ مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں وہاں کوئی چیز نہیں ہے، پہاڑ تلے کا میدان ہے اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں، وہاں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیم سے''۔

اس کے بعد منا کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''منا کا مقام صرف قربانی کے لئے ہے، وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی۔ تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بیت اللہ بنا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا منا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے اس لئے قربانی نذر کرنے کے لئے وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ابراہیم و یعقوبؑ و اسحٰقؑ اور موسیٰؑ اور داؤد و سلیمانؑ کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اس قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اس کی خوشبو یعنی چراند پسند آتی تھی اور اسلام میں وہ قربانی غربت و محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منا کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ذی عقل اس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا''۔

اس خطبہ میں سر ولیم میور کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانہ کعبہ اور مکہ معظمہ کی تاریخ محققانہ طور پر مفصل بیان کی گئی ہے۔ (31)

نواں خطبہ:

رسول اللہ ﷺ کے نسب نامہ کے بیان میں:

نواں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ اس خطبہ کے لکھنے کا منشا یہ تھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلعم کے بنی اسمٰعیل ہونے سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرتؐ) اسمٰعیل کی نسل سے

ثابت کئے جائیں اُن کی حین حیات میں پیدا ہوگئی تھی اور اس طرح پر محمد (صلعم) کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے"۔ سرولیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب سے ہوئی کہ آنحضرت کا نسب سیَر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسمٰعیل تک جتنی پشتیں اہل سیَر نے لکھی ہیں ان میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

اسی بنا پر اس خطبہ کے اول میں سرسید نے ایک نہایت عمدہ تمہید لکھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں ان میں بے مثل تھیں، ایک شاعری، دوسرے علم الانساب۔ چونکہ اُن کے ہاں کتاب کا رواج نہ تھا اور صرف حافظہ پر مدار تھا اس لئے وہ اپنے اپنے قبیلہ کی تمام پشتیں تا بمقدور از بر یاد رکھتے تھے اور اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے مگر چونکہ بغیر کتاب کے کسی قبیلے کی تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اس لئے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے لیکن باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے اور کچھ بھول جاتے تھے مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ ان کے نام اور اُن کے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلہ اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا بتا سکے۔ اگرچہ کسی کو کسی قبیلے کی نسلیں بہ ترتیب یاد نہ ہوں مگر ہر ایک قبیلے میں جو نامور اور قابل فخر اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے۔ اسی لئے جب اسلام کے زمانہ میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مؤرخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا اُن کو ایسی دقتیں پیش آئیں جن کا حل کرنا بہت دشوار تھا کیونکہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے۔ شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اُس کا نام لے دیتے تھے۔ جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ "نسب نامہ عیسیٰ مسیح بن داؤد ابن ابراہیم" حالانکہ مسیح سے داؤد تک اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں درمیان تھیں مگر چونکہ داؤد اور ابراہیم نہایت مشہور اشخاص تھے اس لئے مسیح کو داؤد کا اور داؤد کو ابراہیم کا بیٹا بتا دیا۔

"عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کرسی نامہ بیان کرتے وقت جب آباؤ اجداد کے نام اُن کی یاد کے موافق ختم ہو جاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے۔ ان اسباب سے مؤرخوں کو اُن کے نسب نامے سلسلہ وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں"۔

آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ آپ کو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ تمام عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلہ قریش سے اور قریش کو معد ابن عدنان کی اولاد میں اور عدنان کو قیدار بن اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدر اُن کا جاننا آپ کے بنی اسمٰعیل ہونے کے لئے کافی تھا، گو کہ درمیان میں کتنی ہی پشتیں گزری ہوں۔ اسی لئے کوئی صحیح روایت آپ کے نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے سوا اس کے کہ آپ نے فرمایا "ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں"۔

"پس جب لوگوں نے آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ بہ ترتیب لکھنا چاہا تو ان میں اختلاف ہونا ایک ضروری امر تھا۔ آنحضرت ﷺ سے لے کر معد ابن عدنان تک کسی مؤرخ کا اختلاف نہیں ہے، جو کچھ اختلاف ہے وہ معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے"۔

اس کے بعد سرسید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے، کیونکہ اُن میں قطعِ نظر اختلافات کے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیم کے درمیان گزرا ہے وہ نو یا دس یا گیارہ پشتوں سے (یعنی فی صدی تین پشتوں کے) مسلمہ قاعدے کے موافق پورا نہیں ہوتا۔ اب دو نسب نامے باقی رہ گئے۔ ایک برخیال کاتب الوحی ارمیا نبی کا۔ دوسرا الجرا کا۔ ارمیان نبی جیسا کہ بائبل سے ثابت ہے خود معد ابن عدنان کے زمانے میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں انہوں نے معد کو بچایا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ اُن کو معد کا نسب نامہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس نسب نامہ کو مسعودی اور واقدی دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مگر اس نسب نامہ سے بھی اگر اس میں آنحضرت ﷺ سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں اُن کو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرت ﷺ سے ابراہیم تک ہے پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الجرا نے لکھا ہے وہ بھی اب تک ایک جدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سرسید نے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامہ کا تتمہ ہے کیوں کہ اس کو تتمہ فرض کرنے کی صورت میں آنحضرتؐ سے اسمٰعیل تک ستر پشتیں ہوتی ہیں جو فی صدی تین پشت کے مسلمہ قاعدے کے موافق اُس زمانہ پر بالکل منطبق ہو جاتی ہیں، جو اسمٰعیل کی ولادت اور آنحضرتؐ کی ولادت کے درمیان گزرا ہے یعنی دو ہزار چار سو چھتر برس کا زمانہ۔

سر ولیم میور بطور طعن کے لکھتے ہیں کہ ''آنحضرتؐ کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے''۔ اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ ''بلاشبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیل کی اولاد تھے اور بنی اسرائیل اسحٰق' کی۔ وہ اَن پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل آنحضرتؐ نے نہیں فرمائی اُس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی''۔

''پس جبکہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس کا کبھی مذکور آنحضرت ﷺ کی زندگی میں نہیں ہوا تو بلاشبہ اُنہوں نے اپنے بنی اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا اُن کے ہاں رواج تھا۔ مدد لی''۔

اس کے بعد سرسید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ''نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور از راہ طعن ہماری نسبت کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہے۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اسی طرح اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے ہم نہایت خوشی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اُس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و یعقوبؑ و اسحاقؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور محمد ﷺ سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ ''قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ''۔ ہم مسلمانوں کا فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنہوں نے نبی و عیسیٰ اور محمدؐ رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُن کی پیروی کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہودیوں نے اُن تینوں کو اور عیسائیوں نے ایس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا اور اُس کی سچی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی''۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''آنحضرتؐ کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے۔ خدا کے اُس وعدہ کا پورا ہونا جو اُس نے بنی اسرائیل سے موسیٰؑ کی زبانی کیا تھا کہ ''میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کرونگا، کچھ

اس بات پر منحصر نہ تھا کہ نبی اسمٰعیل کی نسلیں محمدؐ سے لے کر اسمٰعیل تک ہم کو ترتیب وار اور پوری پوری یاد ہوں اور نہ اس بات پر منحصر تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کی تحریروں سے لیں، وہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک کے لئے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مؤرخ خواہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ بنی ہاشم، قریش، اسمٰعیل ابن ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں۔ محمدؐ رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ اے تم ابراہیم جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے"۔

اس کے بعد ابوالفدا مسلمان مؤرخ اور مسٹر گبن اور ریورنڈ فاسٹر عیسائی مؤرخوں کی شہادتیں نقل کی ہیں جن میں سے گبن کا قول یہ ہے کہ "محمد ﷺ کو حقیر نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے اس سے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں اُن کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں۔ اسمٰعیل سے اُن کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف ونجیب ہیں۔ وہ قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانبردار اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے۔ یہی رائے مسلمان مؤرخ یعنی ابوالفدا کی ہے اور یہی گواہی ریورنڈ مسٹر فاسٹر نے دی ہے۔

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور چونکہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اسی آفتاب عالمتاب کے ذروں میں سے ہوں اس لئے اپنے نسب کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سردار دو جہان سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اس سرور عالم میں ہے اور جس کے سبب لَحْمُکَ لَحْمِیْ وَدَمُکَ دَمِیْ ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے معزز ہو جائے"۔

گرچہ خردیم نسبتیست بزرگ ذرۂ آفتابِ تابانیم

(32)

دسواں خطبہ:

رسول کی بشارات کے بیان میں جو توریت اور انجیل میں مذکور ہیں:

دسواں خطبہ اُن بشارتوں کے بیان میں ہے جو توریت اور انجیل میں آنحضرت صلعم کے نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں اس خطبہ میں اول سرسید نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ توریت وانجیل میں آپ کی نبوت کی خبریں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جن کے سبب سے اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیائے سابقین کی کتابوں کا پورا پورا اعتبار نہیں کیا اور اس لئے اُنہوں نے توریت وانجیل میں اُن بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور تحریف کا عذر پیش کر کے اُن بشارتوں کے نشان دینے سے جن کی قرآن میں جا بجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے پھر اُن محققین کا ذکر کیا ہے جنہوں نے نہایت کوشش اور استقلال سے اُن کی تفتیش کی، اور توریت وانجیل میں بہت سے ایسے مقامات دریافت کئے جہاں آنحضرتؐ کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چونکہ اُن کی نشاندہی ہوئی بشارتیں جو ہماری مذہبی کتابوں اور تفسیروں اور سیر وتواریخ میں مذکور ہیں اُن کی بابت کچھ پتا نہیں دیا گیا کہ وہ بائبل کی کونسی کتاب اور کون سے باب اور کون سے درسوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے جن میں کثرت سے اختلاف عبارت تھا اور جن کے جدا جدا نام تھے اُن میں سے کون سے نسخہ میں وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ جتایا گیا کہ بائبل کی بہت سی کتابیں، جواب مفقود

ہیں، یا جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وہ بشارتیں اُن میں سے لی گئی ہیں یا موجودہ مسلمہ کتابوں میں سے، اس لئے سرسید نے صرف چند بشارتیں جو آنحضرتؐ کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجودہ مسلمہ مجموعہ عہد عتیق و عہد جدید میں موجود ہیں، جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں اس خطبہ میں بیان کی ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے وہ طریقہ جس طریقہ سے کہ بائبل میں پیشین گوئیاں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوئی ہیں بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اُن کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہیلی یا معمے کا بیان ہوتا ہے۔ جب تک کی اُن کی تشریح نہ کی جائے اور اُن کا حل نہ بتایا جائے، اُن کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس لئے پہلے اس سے کہ آنحضرت صلعم کی بشارتیں بیان کریں، انہوں نے اول بطور مثال کے عہد عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جن کو حواریوں نے حضرت عیسٰی کے حق میں بتایا ہے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بائبل میں پیشین گوئی کس طریقہ سے بیان کی جاتی ہیں اور نیز حضرت عیسٰی اور آنحضرتؐ کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جائے کہ کونسی بشارتیں زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کونسی مبہم اور دھندلی۔

اس کے بعد انہوں نے چھ بشارتیں عہد عتیق سے اور تین بشارتیں عہد جدید سے آنحضرت صلعم کی نسبت بیان کی ہیں۔ از انجملہ عہد عتیق کی تین بشارتیں جن میں سے ایک توریت کتاب استشنا باب (۱۸) میں اور دوسری کتاب استشنا باب (۳۳) و کتاب حقوق نبی باب (۳) میں اور تیسری کتاب تسبیحات سلیمان باب (۵) میں مندرج ہے اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں سے ایک بشارت۔ یہ چار بشارتیں نہایت معرکۃ الآرا ہیں جن کی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلیں کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے اُن کے ترجموں میں عجیب عجیب کارستانیاں کی ہیں۔ سرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہیے اُس سے بھی کچھ بڑھ کر تحقیقات کی۔ بڑے بڑے عیسائی محققوں کے اقوال اور بائبل کے حوالوں سے اپنے استدلالات کو تقویت دی ہے اور اپنے بیان کو فی الواقع اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسٰی مسیح کی پیشین گوئیوں کے آنحضرت کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔

گیارہواں خطبہ:

شق صدر کی حقیقت اور معراج کی ماہیت کے بیان میں:

گیارہویں خطبہ میں معراج اور شق صدر کی حقیقت محققانہ طور سے بیان کی ہے اور اس باب میں جس قدر مختلف اور متناقض روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں اُن کا اختلاف اور تناقض دکھایا ہے اور اس لئے جس قدر کہ قرآن مجید میں معراج کی نسبت بیان ہوا ہے صرف اُسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہے اور معراج کو رویا پر محمول کیا ہے، جس کا ایک جزو شق صدر بھی تھا اور عیسائیوں کی طعن کا جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہے۔

یہ دونوں بحثیں یعنی معراج اور شق صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ ان سے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں اس لئے اُن دونوں بحثوں کو تفسیر میں دیکھنا چاہیے۔ (33)

بارہواں خطبہ:

رسول اللہ ﷺ کی پیدائش اور بچپن کے حالات ۱۲ سال کی عمر تک:

بارہویں خطبہ میں آنحضرت صلعم کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر کہ معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے بیان کیا ہے اور جو بیشمار رطب و یابس روایتیں اہل سیر نے اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور جن کی رو سے سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جا بجا تعریضیں کی ہیں اُن کی تضعیف کی ہے اور اکثر جگہ بر تقدیر اُن کی صحت کے نہایت لطیف جواب سر ولیم میور کی تحریرات کے دیئے ہیں۔ مثلاً سر

ولیم میور نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات تعریضاً بیان کئے ہیں۔ جیسے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ آنحضرتؐ کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا۔ اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلعم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے، اُنہوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ ''اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ'' پس ایسی باتیں اگر ہوئیں بھی تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں''۔

یا مثلاً سر ولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرتؐ کے سفرِ شام کا حال ابوطالب کے ہمراہ بیان کرنے بعد لکھتے ہیں کہ ''زمانہ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب وغریب بیانوں اور دل انگیز روایتوں نے اور بھی پُر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کی صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد (صلعم) کے خوض کنندہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پائیدار اثر کر دیا تھا''۔

سرسید اول تو سفرِ شام میں چچا کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بعد بر تقدیر تسلیم لکھتے ہیں کہ ''ہم نہایت ادب سے سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص (جیسا کہ سر ولیم میور نے آنحضرتؐ کی نسبت لکھا ہے) کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص خوض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے؟ اگر چہ یہ بیان سر ولیم کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی سے اس قدر اثر پذیر ہوا تھا، بعد کو انہیں چیزوں سے مخالفت اختیار کی، صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، اُن کی پرستش سے منع کیا اور بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں، تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا''۔

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے درحقیقت مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک شرک اور بت پرست لوگوں میں گھر رہا۔ صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گزرتی تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے، گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل وفہم وذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے اُن کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر حاضر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا۔ وہ بلاشبہ مادہ زاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہہ کر بشارت دی ہے کہ سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لئے ضرور ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط یعنی احمد مجتبیٰ تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا''۔ اس خطبہ میں بمقابلہ سر ولیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف مباحث ہیں جن کو خطبات احمدیہ میں دیکھنا چاہئے۔

یہ جو کچھ ہم نے خطبات احمدیہ میں پیش کیا ہے اس کو ایک بہت بڑے حوض یا تالاب میں سے چلو دو چلو پانی سمجھنا چاہئے۔ اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کہ اس میں لکھا گیا ہے اُس کی حقیقت جب تک کہ اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً اردو خطبات جو سرسید نے ولایت سے آکر بہت مدت کے بعد لکھی ہے اور جس میں بہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ لکھی ہے اُس سے مصنف کی محنت لیاقت اور اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سرسید کے ارادہ کے موافق پوری نہ ہو سکی۔ اُن کا ارادہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر، کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آکر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہو گئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں بآسانی میسر آ سکتی تھیں اُن کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا، وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا مگر جو مباحث

سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے اُن میں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی یا اجمالی جواب اسی ایک جلد میں آ گیا ہے۔ کیونکہ جس اصول پر سر ولیم میور نے اپنے تمام اعتراضات کی بنیاد قائم کی ہے خطبات احمدیہ میں اُس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور نہایت واضح طور پر جتا دیا گیا ہے کہ اسلام پر مخالفین کا کوئی اعتراض اس وقت تک وارد نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ قرآن ان حدیثوں کی سند پر جو اصول علم حدیث کے موافق واجب التسلیم قرار پائیں مبنی نہ ہو اور اس قاعدہ سے وہ اعتراضات یک قلم ساقط ہو جاتے ہیں جو عام تاریخ و سیر کی کتابوں یا اجتہاد فقہا یا اقوال علما و آرائے مفسرین کی رو سے مذہب اسلام پر وارد کئے جاتے ہیں۔

جس وقت سر سید نے خطبات احمدیہ لکھی ہے اس وقت تک مذہبی تحقیقات کے متعلق اُن میں وہ آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی تفسیر القرآن میں دیکھی جاتی ہے اور اس لئے خطبات احمدیہ میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے۔ البتہ دو ایک جگہ کسی قدر انہوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ علمائے محققین نے صدہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً معراج کے مضمون کو، جیسا کہ بعض صحابہ کا مذہب ہے، رویا پر محمول کیا ہے اور شق صدر اور براق کی سواری کو اسی رویا میں داخل کیا ہے یا اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی جمہور کے خلاف بیان کی ہے لیکن اس سے اصول کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ تعجب ہے کہ سر ولیم میور نے، جیسا کہ سر سید کی زبانی سنا گیا ہے، جس وقت خطبات احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ ”میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے بلکہ اُس اسلام پر اعتراض کئے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آتے ہیں“۔ یہ بعینہٖ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیر انداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اُس پر تیر برسانے شروع کرے اور جب اُدھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہے تیر اندازوں سے نہیں ہے۔ سر ولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک نئے طریقہ سے نکتہ چینی کی تھی اور چونکہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سنے تھے اس لئے سر ولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات اُنہوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کئے تھے اسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور پر استعمال کئے گئے ہیں جس کی اُن کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ اُن کی زبان سے نکلے جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتا سمجھ کر اس پر حملہ کیا تھا۔ (34)

آنحضرت ﷺ کے ابتدائی حالات زندگی ولادت سے بارہ سال کی عمر تک معتبر اور صحیح روایات سے بیان کیے ہیں۔ سر سید احمد خان نے ان روایات کی جن کی بناء پر سر ولیم میور نے آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ پر تعریض کی تھیں نہایت ہی مدلل طریقہ پر تردید کی ہے۔

بقول حالی ”خطبات احمدیہ“ کو علمائے اسلام کی کتابوں پر بوجوہ ذیل تفوق حاصل ہے۔

1۔ سر سید پہلے شخص نے جنہوں نے اس کتاب کیلئے یورپ کا سفر کیا اور اسے انگریزی کی زبان میں شائع کرایا۔

2۔ علماء کے محبوب انداز مناظرہ سے اجتناب کر کے دوستانہ ماحول میں مخالفین کی تردید کی۔

3۔ ولیم میور نے آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ پر نکتہ چینی کا نہایت پرفریب طریقہ اختیار کیا تھا اور وہ یہ کہ اسلامی کتب تفسیر حدیث و سیر کو درست تسلیم کر کے ان میں مندرجات کی بناء پر آنحضرت ﷺ پر اعتراضات کیے تھے۔ انہوں نے عام پادریوں کے عقلی دلائل کے بجائے تاریخی دلائل پر اعتماد کیا تھا۔ سر سید نے ان مغالطوں کو دور کرنے کی غرض سے دو خطبوں میں اسلامی کتب سیر، تفسیر و حدیث پر بے مثل تنقید کی اور ولیم میور کے پیش کردہ روایات کی محدثین کے مقرر کردہ اصول کی روشنی میں نامعتبری ثابت کی۔

4۔ عموماً علماء الزامی جوابات دیا کرتے تھے۔ سر سید نے خطبات احمدیہ میں ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب دیا۔ مثلاً تعدد ازدواج اور طلاق کے مسئلے میں انبیائے سابقین کی متعدد شادیوں کی مثالیں دیکر مخالفین کو خاموش کر دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس سر سید نے معاشرتی تاریخی اور جغرافیائی حقائق اور اخلاقی اقدار کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لیا۔ اس طرح مسئلہ طلاق پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ (35)

سر سید احمد خان سے پہلے مولوی رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولوی آل حسن ابرآبادی عیسائیوں کے رد میں متعدد

عالمانہ کتابیں لکھ چکے تھے۔لیکن ان کتابوں کا انداز مناظرانہ نہ تھا، دوسرے یہ کہ ان حضرات نے جو کچھ لکھا وہ اردو میں لکھا،علم کی میزان میں ان کتابوں کا وزن بہت بھاری تھا اردو میں ہونے کے سبب مغرب کے اعتراض کرنے والے اہل علم ان کتابوں کا براہ راست مطالعہ نہ کر سکے۔انہی کی زبان میں ان کا جواب دیا جائے۔اس میں پہلے کرنے والے بلاشبہ سرسید احمد خان تھے۔انہوں نے کوشش کی کہ مغربی مصنفین کو انہی کے دلائل سے قائل کیا جائے۔چنانچہ بہت سے اہل علم یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ''سرسید احمد کی کتاب متعصبانہ نفرت وحقارت اور گالیوں کی بوچھاڑ سے پاک،عقلی اور ادبی استدلال پر مبنی ایک سنجیدہ تحریر ہے۔(36)

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ سرسید احمد نے ولیم اور دوسرے مغربی مصنفین کے اعتراضات کو جواب دیتے وقت مناظرانہ، معاندانہ یا طنز آمیز انداز اختیار نہیں کیا بلکہ عالمانہ اور سنجیدہ لب ولہجہ میں گفتگو کی ہے۔انہوں نے جوابی الزامات سے بھی گریز کیا ہے۔لفظی صناعی اور عبارت کی آرائش وزیبائش کے بجائے سادگی اور روانی کو اپنایا ہے۔

جغرافیہ اور قبائل عرب کے بارے میں (خطبہ اول میں) سرسید احمد خان نے جو تحقیق کی ہے وہ اردو میں لکھی جانے والی دوسری کتب سیرت میں ہمیں نہیں ملتی۔اس کی ایک نمایاں اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ عبرانی بائبل کے حوالے سے بہت سے مقامات پر دیئے ہیں۔خصوصاً پہلے خطبہ میں،اور ایسے تمام حوالے عبرانی زبان اور حروف ہی میں دیئے ہیں۔اردو میں ان کا ترجمہ اور وضاحت کردی ہے۔

''الخطبات الاحمدیہ'' جہاں بعض منفرد خصوصیات کی حامل ہے،اور اس کے مصنف سرسید احمد خان نے اس کتاب کے مقدمہ اور اپنے بعض خطوط میں،اس کتاب کی تالیف کیلئے جس خلوص،جذبے اور لگن کا اظہار کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔وہاں بعض باتیں مصنف کے حوالے سے،اور بعض کتاب کے حوالے سے جمہوری علماء کی آراء سے مختلف بھی ہیں اور کسی حد تک قابل اعتراض بھی۔

مصنف نے اپنے مدمقابل ولیم میور کے بارے میں کسی مرحلے پر مناظرانہ اور معاندانہ یا طنز آمیز لب ولہجہ اختیار نہیں کیا۔ان کے اعتراضات کا جواب عالمانہ طریقے سے دینے کی کوشش کی ہے۔باوجود یہ کہ وہ اس کتاب کی تالیف سے پہلے خاصے جذباتی نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنے اسلاف پر جہاں تنقید کی ہے،وہاں انہوں نے شائستگی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔(37)

مثلاً امام محمد بن اسماعیل بخاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد اسماعیل بخاری مسلمانوں میں بہت بڑا عالم اور مقدس مصنف ہے۔ایک کتاب اس کی صحیح بخاری ہے، جو بلحاظ اس حیثیت کے جس حیثیت سے وہ تصنیف ہوئی ہے،نہایت معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے۔گو کہ دوسری حیثیت سے وہ ایسی نہ ہو۔دوسری کتاب اس کی تاریخ بخاری ہے جو کچھ بھی قدر کے لائق نہیں ہے''۔(38)

امام محمد بن اسماعیل بخاری کا پوری امت مسلمہ میں جو مرتبہ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ان کیلئے سرسید احمد خان نے جمع کا صیغہ (یعنی ان، تھے یا ہیں وغیرہ) استعمال کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔پھر ان کی الجامع الصحیح پر جو تبصرہ کیا وہ بھی بہت مبہم ہے۔اس حیثیت،اور دوسری حیثیت سے نہ جانے کیا مراد ہے؟ یہ بات محل نظر بن جاتی ہے کہ عام قاری تیسری صدی اور چوتھی صدی ہجری کے اکابر علماء اور محدثین کی اس رائے کو تسلیم کریں کہ امام بخاری کی الجامع الصحیح کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح تر کتاب ہے۔یا سرسید احمد خان کی بات کو مانیں۔(39)

سیرت کی معروف کتاب مواہب لدنیہ کے مصنف علامہ قسطلانی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''مصنف مواہب لدنیہ نے سب سے زیادہ نادانی کی ہے کہ ان مختلف روایتوں کو دیکھ کر بعوض ان کے ان کو نامعتبر ٹھہراتا، یہ تسلیم کیا ہے کہ شق صدر کا واقعہ پانچ مرتبہ پیش آیا''

ہم عصر علماء کے بارے میں بھی کئی مقامات پر غیر شائستہ زبان استعمال کی مثلاً:

''بعض احباب نالائق مثل مولوی زین العابدین نے مرا ارادہ درباب تحریر جواب کتاب ولیم میور صاحب جو نسبت آنحضرت لکھی

ہے سست کر دیا ہے، اور بر وقت روانگی سامان اور چندہ کرنے نہیں دیا''۔(40)

بعض مباحث میں انتہائی تحقیق اور تشخص کے باوجود الخطبات الاحمدیہ اہل علم کی نظروں میں ایک متنازعہ کتاب قرار پائی۔ میں اگر یہ کہوں تو شاید حقیقت سے انحراف نہ ہوگا کہ بہت سے امتیازی خصائص کے باوجود الخطبات الاحمدیہ سیرت کے موضوع پر اردو میں لکھی جانے والی تمام قابل ذکر کتابوں میں سب سے زیادہ ہدف تنقید بنی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ولیم میور یا دوسرے مستشرقین نے اسلام، اور پیغمبر کی ذات سے وابستہ جن واقعات پر اعتراض کیا تھا، سرسید احمد خان نے ان واقعات کی حقیقت اور سے ہی دست بردار ہو گئے۔

مستشرقین نے جسمانی معراج پر اعتراض کیا۔ سرسید احمد نے بجائے اس کے کہ دلائل سے یہ بات ثابت کرتے کہ ایسا ہونا ممکن ہے، دوسرے سے ان روایات ہی کا انکار کر بیٹھے جن سے اس واقعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ حالانکہ اب ایک صدی گزرنے کے بعد سائنسی تحقیقات ان منزل تک پہنچ گئی ہے کہ خود وہ طبقہ جو کل تک بہت سی ایسی باتوں کا انکار کرتا تھا جو پیغمبر اسلام کی ذات کے حوالے سے کہی جاتی تھیں، اب ان کا معترف نظر آتا ہے۔(41)

غیب پر از جان و یقین کی دولت سے محروم شخص تو مشاہدے کے بعد کسی چیز پر یقین کرتا ہے۔ وہ سب زیادہ عقل کا دعوے دار ہے لیکن عقل کو سب سے کم استعمال کرتا ہے لیکن جو لوگ اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والا علم ہزار ہا مشاہدوں اور تجربوں سے زیادہ یقینی ہوتا ہے۔ ان کیلئے اس اس قسم کے اعتراضات کی جوابدہی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے اور انہیں فرار کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اس سلسلے میں ایک بنیادی بات عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا، وہ یہ کہ سرسید احمد خان اور ان جیسے بعض دوسرے حضرات کو انبیاء کی ذات سے وابستہ بعض واقعات کو تسلیم میں دشواری اس لیے محسوس ہوتی ہے اور وہ شک اور تذبذب کا شکار اس بنا پر ہوتے ہیں کہ وہ ان واقعات کو عقل کے ترازو میں تولنے عقل گئتے ہیں اور ان واقعات کو بھی عام انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر قیاس کرتے ہیں اور یہیں سے بنیادی خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔

انبیاء کے ساتھ پیش آنے والے بعض خلاف عادت واقعات کو معجزہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ دوسرے کیلئے اس طرح کا عمل ممکن نہیں ہوتا، اور نہ اس جیسے عمل کا نبیوں اور رسولوں کی ذات کے علاوہ کسی اور ذات سے صدور ممکن ہوتا ہے۔ معجزہ تو حقیقت میں معرفت نبوت کا ایک ذریعہ ہے۔ اسے عقل کی ترازو میں کیسے تولا جا سکتا ہے۔ نبوت و رسالت کی حدیں تو شروع ہی وہاں سے ہوتی ہیں۔ جہاں انسانی عقل کی رسائی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے حواس، ادراک و شعور عاجز و ماندہ ہو جاتے ہیں۔(42)

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نبوت و رسالت سے پہلے شق صدر کا واقعہ پیش آیا، محدثین اور اسلاف کا اس بارے میں تو اختلاف ہوا کہ یہ واقعہ کتنی بار پیش آیا لیکن جمہوری علماء نے ہمیشہ اس کے وقوع کو تسلیم کیا، اس کے منکر نہیں ہوئے اور اس کا ذکر ایک معجزے کے طور کیا گیا۔ لیکن سرسید احمد خان نے شق صدر کا انکار کیا۔ اس انکار کی وجہ بھی یہی بنیادی غلطی بنی کہ ''عقل میں نہیں آتا'' عام انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے بہت سے واقعات یا عام انسانوں کی بہت سی تخلیقات بے شمار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ان باتوں کو مانتے ہیں۔ حالانکہ ان کا تعلق فنی مہارت اور کسب سے ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس کی سمجھ بھی ہوتی ہے اور قدرت بھی جب کہ معجزہ صرف ذات نبی کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ نبی کے علاوہ کسی اور کی ذات سے اس کا وقوع ممکن نہیں ہوتا۔

سرسید احمد ان نے شق صدر کو شرح صدر سے تعبیر کیا اور جمہور علماء کے بر خلاف یہ بات کہی کہ شق صدر سے مراد شرح صدر ہے۔ یہ بڑا عجیب موقف ہے۔ تیرہ صدیوں تک علما شق صدر اور شرح صدر میں فرق نہ کر سکے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

شق صدر کی روایات کو مسلم، ابوداؤد طیالسی، احمد بن حنبل، طبرانی، زرقانی، بیہقی، عسقلانی، ابن سعد، ابن ہشام اور سیوطی نے اپنی

اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد سر سید احمد خان کا کہنا کہ ''یہ سب روایات نا قابل اعتبار اور بے ہودہ افسانے ہیں'' نہ صرف یہ کہ ایک بے بنیاد اور بے دلیل بات ہے بلکہ غیر شائستہ انداز فکر وتحریر ہے۔ علمی طور پر سر سید احمد خان کے قد و قامت کو ان مذکورہ بالا افراد میں سے کسی ایک کے برابر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چہ جائے کہ ان سب کی معتمد روایات پر سر سید احمد خان کی بے دلیل بات کو ترجیح دی جائے۔ (43)

کتابِ احادیث کے بارے میں لکھنا کہ ''دو برس بعد کتابت حدیث شروع ہوئی'' بڑی بچگانہ سی بات ہے۔

مولانا محمد اسماعیل ندوی نے اس ضمن میں اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار اس طرح کیا:

سر سید احمد نے دو بڑی خامیاں بھی تھیں، جس نے ان کے پورے علم کلام اور اسلامی لٹریچر کی دینی و علمی قدر و قیمت میں بہت کمی پیدا کر دی۔ ایک تو اسلامی لٹریچر کی دینی و علمی قدر و قیمت میں بہت کمی پیدا کر دی۔ ایک تو اسلامی علوم میں ان کے بضاعتی اور قلت مطالعہ اور دوسری یہ کہ مغربی علوم سے ان کی براہ راست ناواقفیت اور سنی سنائی باتوں پر اعتماد اور بھروسہ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مستشرقین کے بالمقابل جو دلیلیں دیں، وہ اعتبار سے اتنی پھسپھسی ثابت ہوئیں کہ موجودہ زمانے میں اہل نظر انہیں دیکھ کر ہنس پڑیں۔ مثلاً تدوین حدیث کے بارے میں یہ لکھنا کہ امام بخاری کے دور تک عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا کتاب حدیث کا باقاعدہ آغاز دوسری صدی ہجری کے بعد ہوا۔ (44)

یہ کہنا تو شاید مبالغہ ہو کہ سر سید احمد نے اپنی کتاب کی بنیاد سنی سنائی باتوں پر رکھی اور ان پر اعتماد کیا۔ البتہ اگر انتہائی محتاط طریقے سے بھی بات کی جائے تو یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ ولیم میور اور مستشرقین کے مقابلے میں ان کا رویہ معذرت خواہانہ ہے۔

''الخطبات الاحمدیہ'' ایک مربوط اور باقاعدہ سوانح عمری کے بجائے بارہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اگر چہ ان تمام مضامین اور مقالات کا تعلق سیرت سے ہی ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اس کا نام سیرت کے بجائے خطبات رکھا۔

سر سید احمد خان کی ''الخطبات الاحمدیہ'' کے حسن و قبح میں ان کے تجدد پسندانہ نظریات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ برصغیر پاک و ہند میں سر سید احمد خان نے تجدد کی بنیاد رکھی۔ ''خطبات احمدیہ'' میں جو مدافعانہ معذرت خوانہ اور مرعوبانہ رویہ کا اظہار ہو رہا ہے وہ ان کے تجدد پسندی کا مظہر ہے، سید احمد خان کی تجدد پسندی صرف سیرت ہی میں نہیں بلکہ قرآن و تفسیر اور حدیث و تاریخ اور سیاست و معاشرت میں بھی نمایاں ہے۔ خطبات احمدیہ کو سیرت نگاری میں تجدد پسندی کے رجحان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سر سید اور سیرت رسول ﷺ:

سر سید سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر محض اس غرض سے نہیں کیا کہ وہاں جا کر اسلام کی حمایت کے لئے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹریل جمع کرے، وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے، یوروپ ہی کی کسی زبان میں جو تمام براعظم میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو، اس کا ترجمہ کرائے اور وہیں اس کو چھپوا کر شائع کرے اور اس طرح اسلام کی خوبیاں اُن قوموں کے کان تک پہنچائے جنہوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت برائی کے سوا کوئی بات نہ سنی ہو۔

ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے اُن پر اسلام کی حقیقت اور اُس کی خوبی ظاہر کرتے اُن کے ملکوں میں جا کر اُنہیں کی زبان میں وعظ کہتے، اور اُنہیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا نہیں''۔

مسٹر آرنلڈ جنہوں نے ابھی پریچنگ آف اسلام لکھی ہے اور اُس کے لکھتے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے مکمل واقفیت حاصل کی ہے ایک نہایت سچے اور پختہ عیسائی ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ''ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان

میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یوروپ میں جا کر یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو"۔ (45)

خطباتِ احمدیہ کی خصوصیات:

i۔ پہلی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سرسید نے اس کتاب میں مناظرہ کے اس مخاصمانہ طریقہ کی جگہ جو مسلمانوں میں عموماً دائر و سائر ہے اور جس سے فریق مخالف کے دل میں بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لئے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی۔

کرنل گریہام سرسید کی لائف میں خطباتِ احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مصنف کا غیر معمولی تعمقِ نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصولوں کا ادب" پھر اپنی قوم کے مذہبی لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ "جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ (46)

دینِ محمدی فی زمانناانگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت مُبہم دین ہے اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بوناپارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگدلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سرسید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنی دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں اور بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے" اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خطباتِ احمدیہ نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا اور جو کتابیں مذہبی مناظرہ کے متعلق برخلاف قدیم طریقہ کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر مفید اور کس قدر فریقِ ثانی کو انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔ (47)

ii۔ دوسری خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سر ولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ و بوسیدہ طریقہ جس کے بموجب مشنری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جس میں ان کو کبھی بمقابلہ اہلِ اسلام کے کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا اور اس کی جگہ اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاص کر تعلیم یافتہ لوگوں پر، خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو اور خواہ عیسائی، بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا۔ مثلاً قدیم مشنری مسلمانوں کی کتبِ سیَر واحادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے الہام سے نہیں لکھی گئیں اور اس لئے جن روایتوں سے آنحضرت ﷺ کے معجزات اور پیشین گوئیاں ثابت کی جاتی ہیں وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ مگر سر ولیم میور نے ان کے برخلاف تمام روایتوں کو جو مسلمانوں کی حدیثوں، تفسیروں اور سیَر کی کتابوں میں مندرج ہیں، صحیح تسلیم کر کے آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی۔ یا مثلاً پادری فانڈر وغیرہ اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے تھے اور اس کی تعلیم کو انبیا کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے، مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کی تھیں اور بجائے اس کے کہ اسلام کی تعلیم کو روحانیت کے برخلاف ثابت کریں، اس کو زمانہ حال کی شائستگی اور تمدن وحسن معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمان بادشاہوں کی ہوا پرستی وسفاکی وخونریزی کا جوابدہ اسلام کو ٹھہرایا تھا۔ یہ باتیں گو فی نفسہٖ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جادو کا کام کرنے والی تھیں۔ سرسید نے ان تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دلنشیں دلائل سے رفع کیا ہے

انہوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور اُن روایتوں کا جو اُن کتابوں میں درج ہیں مفصل حال بیان کیا ہے جو اُن لوگوں کے لئے جو سچائی اور انصاف سے اسلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں ہمیشہ کے واسطے ایک بے مثل رہنما ہے۔ ان خطبوں میں روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں اور جو معیار انہوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے اُن کی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اُس پر غور کرنے کے بعد اُن روایات کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی جن کی رو سے سر ولیم میور نے اسلام کی تعلیم اور بانی اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ اُنہوں نے نہایت صفائی اور روضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جن کے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں اُن کے جوابدہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام اور جو مباحث تاریخی یا جغرافی تحقیقات پر مبنی تھے اُن کا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کسی مصنف مزاج کو۔ اگر چہ وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو، اُس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں۔ (48)

iii۔ سب سے بڑی خصوصیت خطبات احمدیہ کی جو اس کو اگلے علماء کی کتابوں سے ممتاز ٹھہراتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس میں برخلاف دیگر علمائے اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے، بلکہ ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب جو عیسائی اور لامذہب دونوں کو برابر دیا جا سکے لکھا گیا ہے۔ الزامی جوابوں سے سوا اس کے کہ صرف مسلمانوں کی تسلی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں ان لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں سے الگ ہیں یا مطلقاً قید مذہب سے آزاد ہیں۔ یہاں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم چند مقامات خطبات احمدیہ کے اس غرض سے دکھاتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں سرسید کا طریق استدلال کیا ہے اور جنہوں نے اُن سے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں ان کا طریق استدلال کیا تھا؟ مگر ہم باوجود اس کے کہ سرسید نے اس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا ہے۔ مولانا رحمت اللہ اور مولوی آل حسن کے سرسید سے کچھ کم مداح اور شکر گزار نہیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشنریوں کے حملوں سے بچایا اور ان سے مناظرہ کرنے کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی اور جن کی کتابیں دیکھ کر پچھلوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔ (49)

سرسید احمد خاں اور مستشرقین:

1857ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے برسر اقتدار ہوتے ہی عیسائی مشنریوں نے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کر دیا، تو ان کے مقابلہ میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بحث و مناظرہ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دیں، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود تو ردعیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہ تھا، ان عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پیہم حملے کر کے یورپ میں اور پھر ہندوستان میں بھی اسلام کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، دوسری جانب یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں، جن کو جدید اسلوب میں دور کرنے کی ضرورت تھی، مستشرقین بھی علمی انداز میں اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے، ان الجھنوں کو دور کرنے اور مستشرقین کے اعتراضوں کا جواب دینے کے لئے جو لوگ ہندوستان میں آگے بڑھے ان میں سرسید احمد خاں مرحوم پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے زمانہ میں سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی تو یہ دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عیسائی مشنریوں کی مدد کے لئے تیار کی گئی تھی۔

چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

''پادری فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے مباحثہ میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی،

اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبرؐ کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لئے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں"۔(50)

سر ولیم میور اضلاع شمال مغرب (یوپی) کے لفٹنٹ گورنر تھے، جب کہ سرسید احمد خاں بنارس میں منصفی (جج اسمال کازکورٹ) کے منصب پر تھے، سر ولیم میور اور دوسرے انگریز افسروں سے دوستانہ مراسم کے علاوہ وہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ چکے تھے، جس سے وہ بدنام ہوئے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں، انہوں نے ''احکام طعام اہل کتاب'' لکھی، جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی روابط استوار کرنے کی ترغیب دی، اس لئے وہ ''کرسٹان'' سمجھے جانے لگے تھے، اور علماء کا ایک گروہ ان سے بہت بدظن ہو چکا تھا، لیکن سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' شائع ہوئی تو ان کی حمیت اسلامی بھڑک اٹھی، اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی سر ولیم میور کو بری، بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں، تو اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے وہ بے چین ہو گئے، وہ اکثر کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ ''اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں''۔(51)

1857ء میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہو چکے تھے، اور سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لئے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ یہاں دستیاب نہ تھیں، اس لئے سرسید کو ولایت جانے کا خیال ہوا، چنانچہ وہ بعض سرکاری عہدیداروں کے منع کرنے کے باوجود یورپ گئے، اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال دیا، برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کی پرواہ نہیں کی، سیاسی مصلحتوں کو نظرانداز کیا، ان کے لڑکے سید محمود لندن تعلیم کے لئے بھیجے جانے والے تھے، ان کے سرکاری وظیفہ کا مسئلہ درپیش تھا، اس کا بھی خیال نہیں کیا، اور وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لئے لندن پہنچ گئے، انڈیا آفس کے کتب خانہ اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے استفادہ کے علاوہ سیر و تاریخ کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپتی تھیں، وہاں سے منگوائیں، اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں، بہت گراں قدر قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ ایسیز (Essays) یعنی خطبے لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے، اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شائع کیا۔(52)

اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں اپنے جذبات اور مالی مشکلات کے بارے میں انگلستان سے مولوی مہدی علی خاں یعنی محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے، ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر اور بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کردی ہیں''۔(53)

ایک اور خط میں یہ لکھتے ہیں کہ ''مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا، ملنا جلنا سب بند ہے، آپ اس خط کے پہنچنے پر کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپے قرض لیجئے ہزار روپے بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے، اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو، کیا کہیں اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے، خدا مدد کرے''۔

ایک اور خط میں یہ لکھا ہے کہ میں شب و روز تحریر کتاب میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے، ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئے گا''۔

خطبات احمدیہ کی جلد اول تمام ہوئی تو اس کی طباعت میں چار ہزار کے قریب لاگت آئی، کچھ روپے ان کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے روانہ کیے، اور کچھ انہوں نے دوسروں سے قرض لیے، یہاں تک کہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے پاس زاد راہ کے لئے کچھ نہ تھا، اور وہ نہایت پریشان تھے، اسی عرصہ میں ان کی صاحبزادی یعنی ہمشیرہ حامد و محمود کا انتقال ہو گیا، کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اخراجات نے اور زیادہ فکر مند بنا رکھا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر (54)

وہ اس کتاب کی تالیف کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے، حصۂ اول کی تکمیل پر ایک خط میں اپنی کتاب کی غرض وغایت اس طرح بیان کرتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں، اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں''۔ (55)

مستشرقین کی تردید میں خطبات احمدیہ کا امتیاز:

لاہور ڈیوٹی کالج کے پرنسپل ریورنڈ ہوپر نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ کہا کہ:

''ہمارے نزدیک جو کام سر سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے، وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں، تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جا کر انہی کی زبان میں وعظ کہتے، اور ان ہی کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برسوں میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو''۔ (56)

اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناظرہ کے مخاصمانہ طریق کے بجائے دوستانہ اور غیر متعصبانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مخاطب کو خاموش کرنے کے لئے الزامی جواب دینے کے بجائے اس کو مطمئن کرنے کی راہ اپنائی گئی ہے اور تحقیقی جوابات دیئے گئے ہیں، چنانچہ کرنل گریہم نے سر سید کی لائف میں خطبات احمدیہ کے اس امتیاز کا اعتراف کیا ہے ان کے خیال میں اس کتاب سے ''مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب'' ظاہر ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہئے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں، دین محمدی انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول دین ہے، اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے، ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنی دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کی تحریروں کی مخالفت کی ہے، اور خوب چٹکیاں لی ہیں، اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے''۔ (57)

سر ولیم میور سے پہلے مستشرقین، اسلام کے روحانی اور الہامی پہلو پر اپنا زور تحقیق صرف کر رہے تھے، لیکن اس نے تاریخی شہادتوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات، جدید دور کی شائستگی، تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف ہیں، اس نے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا۔ (58)

یہ نکتہ چینی کا ایک نیا طریقہ تھا، جس میں غیر مستند روایتوں، کمزور تاریخی داستانوں اور رطب ویابس واقعات سے جن کے بیان کرنے

والے خواہ کم رتبہ اور غیر معتبر ہوں مدد لی گئی تھی، سرسید مرحوم نے دو طویل خطبوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں اور ان کی روایتوں کی تفصیل بیان کی ہے، روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں، اور جو معیار انہوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے ان کی تشریح کی ہے، جس سے سرولیم میور کے استدلال کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات میں مانع ہو، اور مسلمانوں کے اعمال و کردار جن کے نتائج وہ آج بھگت رہے ہیں ان کے جواب دہ خود مسلمان ہیں نہ کہ اسلام، انہوں نے سرولیم میور کے مغالطوں کا نہایت معقول دلائل اور دلنشیں پیرائے میں جواب دیا ہے۔ (59)

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کی سادگی، عام فہم انداز بیان اور منصفانہ طریق استدلال ہے، وہ اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے اپنی شرافت، نرم خوئی اور ہمدردانہ لب و لہجہ کو برقرار رکھتے ہیں۔

چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ ہی میں چند مستشرقین کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

"(میں) ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مورخوں کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جنہوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت ﷺ کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے، بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں انہوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کیے ہیں، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے"۔ (60)

انہوں نے اپنی کتاب میں مختلف موقعوں پر مستشرقین کے اقوال بھی اسلام کی حمایت میں نقل کیے ہیں۔

خطبات احمدیہ کی ایک اور خصوصیت جس کا مولانا الطاف حسین حالی نے بھی حیات جاوید ص 167 میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان خطبات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے، سوائے دو ایک مسئلوں کے جہاں بعض محققین نے بھی وہی لکھا ہے، جس کو سرسید احمد خاں نے ترجیح دی ہے، مثلاً معراج کے واقعہ کو جیسا کہ بعض صحابہ کا مسلک ہے، انہوں نے رویا پر محمول کیا ہے اور شق صدر اور براق کی سواری کو بھی اسی رویا میں داخل کیا ہے یا ایک آدھ بات اور، ورنہ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ تک سرسید مرحوم نے وہ بحثیں نہ کی تھیں جو ان کی تفسیر القرآن میں ملتی ہیں، اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مذہبی خیالات پر اعتراضات کیے گئے، خطبات احمدیہ میں انہوں نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علماء ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی اور اس نے اگر ایک طرف مستشرقین کے گروہ کو اور صاف ذہن عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ اور مطمئن کیا، تو دوسری طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے بارہ میں مختلف غلط فہمیوں کے دور کرنے میں مدد دی۔

مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات بحوالہ خطبات احمدیہ:

سرسید مرحوم نے مستشرقین کے اعتراضات کے جو جوابات دیئے ہیں ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوشش خشت اول کی حیثیت رکھتی ہیں، انہوں نے اپنی اس کتاب میں سرولیم میور کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے خیالات کا بھی جا بجا تجزیہ کیا ہے، مستشرقین نے سب سے پہلے تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے رسول اکرم ﷺ کی نسبی وابستگی کا انکار کیا ہے، وہ مکہ میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت سے انکار کرتے ہیں، قیدار کی عدنان سے اور عدنان کی حضرت اسماعیلؑ سے نسبت خاندانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے، اور اس بارے میں عربوں کی علم الانساب میں مہارت اور واقفیت کو مشکوک قرار دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تورات میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ ان سے رسول اکرم ﷺ کی شخصیت مراد نہیں ہے۔

سرسید مرحوم نے بائبل کے فارسی ترجمہ سے تورات کی پیشین گوئی نقل کی ہے، لیکن ہم یہاں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ 1958ء سے اردو ترجمہ درج کرتے ہیں:

''اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی، اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس کی بات مان کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے، تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا، سو وہ چلی گئی، اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی، اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا، تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا، اور آپ اس کے مقابل پر ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی، اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی، اور چلا چلا کر رونے لگی، اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی، اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے، اس کی آواز سن لی ہے، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا، اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑا ہوا، اور بیابان میں رہنے لگا، اور تیر انداز بنا، اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی۔ (61)

مذکورہ بالا پیشین گوئی واضح طور رسول اللہ ﷺ کی خبر دے رہی ہے، اسی لئے سر ولیم میور اور بعض مستشرقین نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی ہے، اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے نہ تھے، حضرت اسماعیلؑ یا ان کی اولاد مکہ میں آباد نہیں ہوئی اور فاران سے حجاز کی وادی یا مکہ کو مراد لینا درست نہیں۔

سر سید مرحوم نے سر ولیم میور کو جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ:

''عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے 1851ء میں بہ مقام لگڈنی بناور میں چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے، اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے۔ اور وہ عبارت یہ ہے، وسکن فی بریة فران (الحجاز) واخذت له امه امرأة من ارض مصر (عربی ترجمہ توراة سامری)(62)

اس کے بعد وہ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ ''عموماً عیسائی مورخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد ہے تسلیم نہیں کرتے، اس کے تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو اس بات کو تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے بلاشبہ اس سے محمد رسول اللہ ﷺ کا نبی ہونا مراد ہے''۔

فاران سے ایک قول کے مطابق وہ وسیع قطعۂ زمین مراد ہے، جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے، اور فاران کے نام سے مشہور ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں: شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور شرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے، اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علیحدہ علیحدہ ناموں سے معروف ہیں مثلاً شور، بیر شبع، ایثام، سین، زین، عیدام وغیرہ لیکن سر سید مرحوم کے خیال میں:

''اس بیان کی تردید کے لئے اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دیں، کیونکہ ان سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے، اور گردونواح کے بیابان اس میں شامل نہیں''۔ (63)

(الف) تب بنی اسرائیل دشت سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا۔ (64)

اس عبارت سے جن کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا، اور بیابان فاران میں مقام کیا، قرار واقعی ثابت

ہوتا ہے کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیحدہ اور جدا گانہ بیابان تھے۔

(ب) اور چودھویں برس کدرلاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائیم کو عستارات قرنیم میں اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ سعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے۔ (65)

پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے اس درس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔

مزید وضاحت کے لئے وہ توراۃ سے درج ذیل اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں:

(ج) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں، ان کے باپ دادا کے ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جوان کے ہاں کا رئیس ہو۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران سے ایسے آدمی روانہ کئے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (66)

(د) اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی اور اس ملک کا پھل ان کو دکھایا۔ (67)

(ھ) اور اس نے کہا، خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں (فارسی ترجمہ: با ہزار ہزاراں) قدسیوں میں سے آیا اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔ (68)

(و) خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے، سلاہ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے منور ہو گئی۔ (69)

(ز) اور وہ مدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لے کر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے۔ (70)

فاران کے بارے میں بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیم نے ایک کنواں بیر شبع کھودا تھا اور فاران ایک ہی جگہ ہے، سرسید مرحوم نے اس قول کی تردید میں گنتی باب 13 درس 26 (71) کے علاوہ توراۃ کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے:

''اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے، پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی قادس پہنچے اور حمالیقوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے مارا''۔ (72)

وہ لکھتے ہیں کہ (مذکورہ بالا اقتباس میں) جب تک قادیش اور فاران دو جداگانہ اور مختلف بیابان قرار دیئے جائیں درس مذکورہ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ (73)

فاران کے بارے میں تیسری بات مسٹر روپر وغیرہ کی بیان کردہ یہ ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے، کہ حضرت اسماعیل صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آ کر ٹھہرے تھے، اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسماعیل متوطن ہوئے تھے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسماعیل وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر تکوین (پیدائش) میں آیا ہے۔ سرسید مرحوم نے مذکورہ بالا رائے کی بھی تردید کی ہے، اور لکھا ہے کہ ''کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت اسماعیل نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی، ریورنڈ مسٹر فارسٹر جو اس مقام کو حضرت اسماعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں، اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں، مصنف موصوف نے سفر تکوین (74) پیدائش باب 25 درس 18 پر جس کی یہ عبارت ہے۔

''اور اس کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے، جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی''۔ سے استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ ''خدائے تعالیٰ کے وعدے ہی میں ایفا ہو گئے تھے، جبکہ اسماعیلیوں کی آبادی سور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں سرحد

مصر سے لے کر دہانہائے فرات تک پھیل گئی تھی''۔ اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانہائے فرات پر قرار دیا ہے، اصل حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب 10 درس 29 میں مذکور ہے، نواح یمن میں عرض بلد شمالی 17 اور یہ 30 دقیقہ اور طول بلد شرقی 42 درجہ 36 دقیقہ پر واقع ہے اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنے سے ہو سکتی ہے جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے، واکر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے، اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے، جن کا نقشہ روز کارڈٹ پی کیرے ایم اے نے مرتب کیا ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید میں ''شور'' کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے، جہاں صحرائے ایثام واقع ہے، اور یہ قطعی غلطی ہے، کیونکہ صحرائے ''شور'' سے توریت مقدس میں مراد وہ وسیع میدان ہے، جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے''۔ اس کے بعد وہ اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:

''اصل عربی توریت میں صرف دو نام ہیں شور اور اشورہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں، ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسیریا ہے، اس سے واضح ہے کہ بنی اسماعیل اس وسیع قطع میں آباد ہوئے تھے، جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے، یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے، اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے، ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی جانب عزیمت کرے، اور توریت مقدس کی اس آیت کی کما حقہ تصدیق ہوتی ہے، جہاں لکھا ہے جو کہ سامنے مصر کے ہی اگر تو اسیریا کی طرف روانہ ہو''۔ یعنی مصر کے سامنے ہے، اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسیریا تک کھینچو۔ (75)

انہوں نے کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع فاران کے بارے میں تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ کی کتب خمسہ میں ان کا کچھ بھی ذکر نہیں۔ سینا سے بنی اسرائیل کا سفر شرق کی جانب تھا، جس میں انہوں نے پہلی منزل تبعیرہ (76) پھر قبروت ہتاواہ آئے، اور وہاں سے مصروث پہنچے (77) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے۔ (78) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے:

جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے، اس لئے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰ کا سفر شمالی اور شرقی سمت میں تھا، یعنی قادیش کی طرف۔ (79) اس لئے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰ نے کیا ہے سینا کے مغربی جانب نہیں ہو سکتا، بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کے عیسائی علماء نے پانچ مختلف راستے بتائے ہیں۔ جن کے اختلاف کی صورت میں:

''اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا ہے جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں، بلکہ شرقی مورخ بھی اسی کے مؤید ہیں، تب حضرت موسیٰ کے کوچ کے تمام بیان کی تطبیق ہو جاتی ہے اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے''۔ (80)

توریت (81) پیدائش باب 21 درس 14,15 سے یہ بات سمجھنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ہاجرہ بیرشبع ہی میں پھرتی رہیں، اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیم نے ان کو دیا تھا، ان کے پاس تھا، اور وہی ختم ہو گیا تھا، سرسید مرحوم کے نزدیک دو وجہ سے اس درس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں، اول اس وجہ سے کہ بیرشبع جو حضرت ابراہیم نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا، اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصہ دراز تک رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنوؤں کا ہونا، حضرت ہاجرہ سے پوشیدہ نہ تھا، دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیرشبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا، کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیم ہی کے بنائے ہوئے کنویں نہیں تھے، بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کئے ہوئے بھی موجود تھے۔ (82)

سرسید مرحوم کے نزدیک اس عبارت کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ:

''مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ بیابان بیرشبع میں پھرتی رہیں، مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا، کیونکہ بیرشبع کے

اردگرد قوموں لڑاکا اور جھگڑالو تھیں اس لئے حضرت ہاجرہؓ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا، جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی پینے کی مشکل پیش آئی ہوگی، کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت نایاب تھا جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے، تو ان کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا خانہ بدوش عرب پانی کے چشمے کو چھپا دیتے تھے جس وقت حضرت ہاجرہؓ مضطربانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا، توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے: ''پھر خدا نے اس کی آنکھیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا''۔ (83)

بہر حال حضرت ہاجرہؓ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا، رہنا شروع کیا'' جب اور لوگوں کو اس چشمے کی خبر ہوئی تو بنو جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قرب و جوار میں آ کر آباد ہوئے''۔ (84)

سرسید مرحوم، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی اولاد در اولاد کی مختلف نسلوں اور ان کی متعدد شاخوں سے بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ تمام تلاش و تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی، اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار یمن (حویلاہ) سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں، اور اس طرح پر حضرت موسیٰؑ کی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو سفر تکوین باب 25 درس 18 میں مندرج ہے کہ ''وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے جو سامنے مصر کے ہے جب تو اسیریا کو روانہ ہو''۔ (85)

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ:

توراۃ کتاب پیدائش باب 21 آیت 10 میں ہے: ''تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا''۔ (86)

کئی مستشرقین نے حضرت اسماعیلؑ کے نسب نامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ ظاہر ہے، اور یہودی بھی حضرت اسماعیلؑ کی والدہ کو لونڈی کہتے تھے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسماعیل کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں، اور ضد و عداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسماعیل، بنی اسرائیل کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جائیں، منسوب کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہؓ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے، جو سراپا غلط اور تحریف کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس بحث کا نسب نامۂ نبوی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لئے سرسید مرحوم نے مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کی تحقیقات پر مشتمل ایک نفیس بحث بھی درج کتاب کی ہے چند اہم نکات یہ ہیں:

1۔ انہوں نے سفر اشعیا سے جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے یہ نقل کیا ہے کہ بابل کا ایک باشندہ رقیون تنگ دست اور مفلس تھا، جس نے مصر کی راہ لی، بادشاہ مصر نے اس کی قدر دانی کی، اعیان سلطنت میں اس کا اثر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ہوگیا، یہ پہلا شخص ہے، جس نے فرعون کا لقب اختیار کیا، پھر قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ اپنے گھر والوں کے ساتھ مصر گئے، تو اس نے حضرت سارہؓ سے نکاح کرنا چاہا، مگر پھر باز رہا، اور اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہؓ کو حضرت ابراہیمؑ کے نکاح میں دے دیا، رقیون عبرانی زبان کا لفظ ہے، اسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا اصل عبرانی نام ھاغا ہے، جو اس بات کا قرینہ ہے کہ بادشاہ مصر فی النسب نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے قبیلہ سے نسبت رکھتا تھا چنانچہ اس کے پاس سے حضرت ابراہیمؑ بڑے اعزاز اور سامان و ہدایا کے ساتھ روانہ ہوئے''۔ (87)

2۔ مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہؓ کو بادشاہ مصر کی بیٹی لکھتے ہیں، چنانچہ ربی شلومو اسحاق نے کتاب پیدائش باب 16 آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سرسید مرحوم نے اصل عبرانی تحریر اور اس کے عربی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل اردو ترجمہ بھی تحریر کیا ہے۔

''وہ فرعون کی بیٹی تھی، جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہو کر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ''۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لونڈی میراث نہیں پاتی تھی، تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہؓ کو یہی اندیشہ تھا کہ حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق ؑ کے ساتھ میراث پائیں گے، چنانچہ انہوں نے ہاجرہؓ کو الگ کر دینے کی درخواست کی، اور انہوں نے ہاجرہؓ کو جو لونڈی کہا تو یہ غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے تھا، جس سے دیگر تصریحات کی موجودگی میں استدلال کرنا درست نہیں، تورات میں اور دوسرے مقامات پر حضرت ہاجرہؓ کے لئے شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی خادمہ اور قبیلہ کی عورت کے ہیں، تورات (سموئیل باب 25 آیت 41) میں حضرت داؤدؑ کی بیوی کے بارے میں جو زوجہ شرعی تھیں، شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ اگرچہ لونڈی کیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ آزاد تھیں، اور یہ لفظ ان کے لئے خادمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔(88)

سرسید کے نزدیک:

''توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے، نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر جو ہم نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دوطرح پر ہوتے تھے، شرا (خریداری) سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے، جو لڑائی میں اسیر ہوکر آتے تھے اور شبوت حرب کہلاتے تھے یعنی غنیمت جنگ صیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے، جو خریدے جاتے تھے، اور ان کو مقنت کشف کہتے تھے، یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھے، یلید بایث ولیدا لبیت یعنی خانہ زاد، مگر حضرت ہاجرہؓ ان باتوں سے پاک تھیں، پھر وہ کیونکر لونڈی ہوسکتی تھیں، ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے''۔(89)

عربوں کا علم الانساب اور اس کی اہمیت:

حضرت ابراہیمؑ سے رسول اکرم ﷺ کے نسبی رشتہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے مستشرقین نے عربوں کے علم الانساب پر بھی اعتراضات کئے ہیں جن کو سرسید مرحوم نے ''ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے'' سے تعبیر کیا ہے، کہا یہ گیا ہے کہ:

''اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضروری نہیں ہے کہ ان کے انساب کا علم یا روایت خود ان قوموں میں بجنسہٖ چلی آتی ہے یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے، کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جس کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے، ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقرار رہی ہو''۔(90)

سرسید مرحوم نے اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے بارے میں ہیں، وہ نہایت معتبر ہیں، کیونکہ ''عرب اپنے آبائی رسوم اور اوضاع و اطوار کے بدرجۂ غایت پابند تھے، اور اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا جدا نام رکھتا تھا، اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلے کو بخوبی جانتا تھا، اور اپنے حسب و نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا۔ لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کا ان کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا، انہوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی تحریر بھی پیش کی ہے، وہ اپنے جغرافیہ عرب میں لکھتے ہیں کہ:

''عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص و عام ہے، تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے''۔(91)

پھر سرسید مرحوم یہ بیان کرتے ہیں کہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے، ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل ذریعوں سے ہوسکتا ہے، میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب و نسب بہ آواز بلند بیان کرے، تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا، کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا، جب کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا، تو اس کی پاداش میں قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا، جو اب شرع میں لفظ الدیة

علی العاقلہ مستعمل ہے۔اس قسم کے رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کا اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا،اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر اعتماد قائم ہوا اور برقرار رہا، وہ اپنی طویل بحث کے اختتام (92) پر ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قول فیصل نقل کرتے ہیں کہ:

''محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مؤید ہ شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو،مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریحاً غیر ممکن ہے،خود عربوں کے ہاں زمانہ نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے،کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداءً حجاز میں آباد ہوئے تھے،اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے،اور خود محمد (ﷺ) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے دعوؤں کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسماعیل کی اولاد وقیدار کے سلسلہ سے تھی،ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایہ کو پہنچ جاتا ہے جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے،جن سے قیدار کے اسی حصۂ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے،اور دوسری جانب اریانوس،بطلیموس،پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیڈری، درانی، کدرون ائی، پاکدیتی کی موجودگی کے غیر مشتبہ اور ناقابل اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے''۔(93)

اسلام کے ذریعہ تکمیل دین:

اپنی کتاب کے تیسرے خطبہ میں سرسید مرحوم نے ان مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے،اور یہ بتایا ہے کہ اسلام مختلف معاملات میں کن کن مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے،وہ لکھتے ہیں کہ ''ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مدبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا،اور اس کو حیرت انگیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا،اور دفعۃً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر دیا''،اس کے بعد انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام نے عرب کے مختلف مذاہب میں کیا اصلاحات کیں،ان کی کن باتوں کو برقرار رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی،اس کے بعد عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ ''اسلام درحقیقت اصول و عقائد متفرقہ ومنتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے''۔پیش کرنے کے بعد اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ:

''یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کے سب سے بڑی دلیل ہے تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر متناہی اور کامل ذات ہو،ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی،جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے،اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے،اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں، مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہئے جنہوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا۔جنہوں نے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی،اور جنہوں نے اپنے باایمان متبعین کے لئے بے بہا اور لازوال نور کے دورازے کھول دیئے''۔(94)

صدائے جنگ:

سرولیم میور نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اسلام کے محاسن بھی بیان کئے ہیں،جس پر سرسید مرحوم نے یہ لکھ کر بجا طور پر ان کی تحسین کی ہے کہ ''سرولیم میور ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں،اور جب تک علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔اس کے بعد شکرگزاری کے جذبہ کے ساتھ سرولیم میور کے خیالات نقل کئے ہیں،لیکن اس درمیان اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی

موقوف ہوگئی' کے جملہ پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سر ولیم کی اس تحریر پر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا، بلکہ اس سچے وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پرتاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا، اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے، اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی، اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے''۔(95)

ایڈورڈ گبن:

سر سید احمد مرحوم نے ایڈورڈ گبن کی تحریریں بھی اپنی تائید میں بڑی فراخدلی سے نقل کی ہیں لیکن وہ ان پر گرفت بھی کرتے جاتے ہیں، ایک جگہ وہ گبن کے اس جملہ پر چونک پڑے کہ ''(رسول اللہ ﷺ) نے عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں''۔(96) اس پر ان لفظوں میں تبصرہ کرتے ہیں:

''انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے، ان دیکھی، ان چکھی، ان چھوئی، ان سمجھی چیز کیونکر سمجھ میں آسکتی ہے، جس چیز کے لئے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہو، وہ کیونکر بیان ہو سکتی ہے، کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتلائی جا سکتی ہے، یہ تمام امور محالات سے ہیں، پس وحی یا الہام ان کو کیونکر بیان کر سکتا ہے، سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے: ''لا عین رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر'' پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی موذی چیز ہے، اور کچھ نہیں بتا سکتا، سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہو سکتا ہے، نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب و موذی چیز پر، اس لئے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب و موذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان کیا ہے، موسیٰ نے یہی فرمایا کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا، غلہ پیدا ہوگا، وبا نہ ہوگی، گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا، وبا پھیلے گی''۔(97)

چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات:

سر ولیم میور نے اسلام کے چند معاشرتی مسائل پر یہ اعتراضات کئے ہیں، کہ مذہب اسلام سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، اول یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا، طلاق دے دینا اور غلام بنا لینا وہ باتیں ہیں جو علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں، اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں، دوم یہ کہ مذہبی آزادی روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کر دی گئی ہے، تحمل کا نام و نشان بھی نہیں دکھائی دیتا، سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور اس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے''۔(98)

سر سید مرحوم کے خیال میں عیسائی مصنفین، مسلمانوں کی مخالفت میں سنجیدگی اور نیک نیتی کو برقرار نہیں رکھ سکے، اپنے عیب چینی کے مصمم ارادہ کی وجہ سے وہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے سکے کہ آب و ہوا، مرد و عورت کی تعداد اور مختلف طبعی اسباب کا گہرا اثر معاشرتی حالات پر پڑتا ہے۔

تعدد ازدواج:

سر سید احمد خان کی نظر میں اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا، مسلمانوں پر لازمی یا کچھ زیادہ کار ثواب کی بات ہے، حالانکہ یہ جائز صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن کو مختلف اسباب طبعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو، اس کے بعد وہ قانون قدرت، باہمی معاشرت اور مذہب کی رو سے، مسئلہ ازدواج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پہلے ہم اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دریافت کریں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا، پس ہم قانون قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے، جن میں سے ایک نر اور ایک مادہ پیدا ہوتا ہے، برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مائیں ہونی مقصود ہیں، ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں، اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادہ کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جاندار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں، وہ اکثر بلکہ تقریباً سب اسی قسم کے ہیں، پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے، مگر (چونکہ) وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق قدرت نے اس کو عطا کئے ہیں، ان کو احتیاط سے اور موقع بہ موقع بہ لحاظ امور طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی وقوانین حفظان صحت اور ملکی تاثیرات آب وہوا کے کام میں لائے، پس جیسے کہ کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے''۔ (99)

تعدد ازدواج کے معاشرتی پہلو کو سرسید نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے، انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، اسی بات کو توراۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''جب خدائے تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے، تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا، اور وہ عورت ہے، جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اور مرد کے ساتھ شریک ہو کر اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ ''بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو'' مدد دے۔ مگر جب وہ کسی سبب سے ان قدرتی فرائض کی ادائیگی میں قاصر ہو تو اس نقصان کے رفع کرنے کی تدبیر اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں بیویاں رکھنے کی اجازت ہو یا پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری سے نکاح کر لے یہ حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہئے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو یہ حق ہے، مگر سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے، مگر عورت کو پہلے قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہئے، اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی، تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا، اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا، تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس ضرورت کا کم ہونا تو ممکن ہے، لیکن اس کا مٹنا محالات سے ہے، اس لئے جہاں ضرورت ہو وہاں اس پر عمل پیرا نہ ہونے سے نقصانات ہوں گے، جو حسن معاشرت کے لئے سم قاتل ہیں۔ (100)

آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب اور اس کے گرد ونواح میں نکاح وشادی سے متعلق بہت سی اخلاقی خرابیاں پائی جاتی تھیں، سرسید مرحوم کے بقول ایران میں قوانین طلاق بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے، اور رشتہ داری کا پاس ولحاظ نہیں تھا، یہاں تک کہ بیٹے کو اس کی ماں ایسے ہی مباح تھی، جیسے باپ کو اس بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن، یہودیوں کے یہاں جو ایران کے گوشہ مغرب میں بکثرت آباد تھے، تعدد ازدواج کی رسم کسی قید اور حد کے بغیر بے روک ٹوک جاری تھی، عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں جاری تھیں، تعدد ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا مرتبہ یا عمر رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں، عیسائیوں کا حال ان سب کے برعکس تھا، ان کے یہاں ایک بیوی کرنی بھی کچھ نیکی شمار نہ ہوتی بلکہ رہبانیت اور تجرد محض کی عام ہدایت تھی، اور مرد وعورت دونوں کے لئے یہی نیکی کا کام متصور کیا جاتا، ایسے زمانہ میں جبکہ عقل ودل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اخلاق ومعاشرت اس قدر بگڑ چکی تھی، اسلام نے ایسا عمدہ قانون جاری کیا، جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے نہایت مکمل عقل کامل کے بالکل مطابق، انسان کی تندرستی، بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن ومرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لئے اس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔ (101)

سر سید مرحوم نے مذہبی نقطہ نظر سے بھی تعدد ازدواج کا جائزہ لیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازدواج کو روکا ہے، اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے، یہودیوں کے یہاں بکثرت اور بلاتعین حد ازدواج موجود ہے عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی۔

چنانچہ مسٹر ہلگنز لکھتے ہیں کہ:

''میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی نظیر پر جو خدا کی مرضی پر چلتے تھے، اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تکمیل کے لئے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰؑ مسیح نے بھی ان میں انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام کو قلمبند کرنے کے لئے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی''۔ (102)

جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے''۔ (103)

اس کے بعد سر سید مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

''اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے، ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا یہی ہوسکتا ہے کہ عموماً کثرت ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو، اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے، جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے۔ اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا، جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی، جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے، اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا، اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنگالنا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں، پس ایسے افعال پر اسلام کی خوبی وحقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے لئے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے''۔ (104)

طلاق:

سر ولیم میور نے اسلام میں اجازت طلاق کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا ہے جس کے جواب میں سر سید مرحوم اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے، اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ لیکن اس کے باوجود: ''اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد وعورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے، اور وہ علاج طلاق ہے، بطور ایک علاج کے، اسی حالت میں اس کی طرف رجوع کرنا جائز ہوسکتا ہے جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ قابل برداشت ہوں اور ایسے تردداتِ وتفکرات جو طلاق سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور رنجشیں پیدا کرنے والے ہوں دور ہو سکتے ہیں، اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے ایسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے''۔ (105)

انہوں نے طلاق کے بارے میں یہودی اور عیسائی مذہب کے طرز عمل کا بھی جائزہ لے کر یہ واضح کیا ہے کہ یہودیوں کے یہاں طلاق دینا، کسی شرط وقید کے بغیر مرد کے اختیار میں تھا، وہ جب چاہتا طلاق لکھ کر بیوی کو دے دیتا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا، حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں، سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا، یہ ایسا

سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی، اگر یہ حکم اس طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں، تو حسن معاشرت کے لئے نہایت ہی مضر ہے، اور جو رنج وہ امور زن وشوہر میں واقع ہو کر تمام ازدواجی مقاصد کی بربادی کا سبب بنتے ہیں، اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے، اس صورت میں تو زن ومرد دونوں کے لئے اور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے''۔(106)

چنانچہ جان ملٹن نے بائبل کی مختلف آیتوں سے طلاق کے جواز پر استدلال کیا ہے، نہ کہ اس کی ممانعت پر جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں۔

سرسید جان ملٹن کی یہ پوری بحث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے درسوں (آیتوں) پر ڈالی ہے، وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتادیا تھا کہ طلاق بطور معجون مفرح استعمال کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف ایک لاعلاج مرض کا علاج ہے مگر زن وشوہر کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اگر اس میں بیماری پیدا ہو جائے تو سوائے انہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا، کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے، اس لئے اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یا قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لئے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار پیدا ہوئی تھی''۔(107)

سرسید احمد خاں نے ان تعلیمات نبوی کو بھی نقل کیا ہے، جن میں مرد وعورت کی اخلاقی تربیت اور زن وشوہر میں یکجہتی اور محبت و انس کی ہدایات اور تدبیریں بتائی گئی ہیں، اور جن میں طلاق سے امکانی حد تک بچنے اور مجبوری کی صورت میں سوچ سمجھ کر مناسب وقفوں میں تدریج کے ساتھ تفریق کی اس کارروائی کو روبہ کار لانے کی ہدایت کی گئی، رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے، مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے ان کی سختی اور بدمزاجی کو برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی۔ور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کو روکنے کے لئے ہیں، اپنی اس بحث کے اختتام پر وہ بڑی جرأت کے ساتھ لیکن ہمدردانہ لب ولہجہ میں یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:

''اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن وشوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو، اور اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں، یا کم ہو جائیں، اور بغیر اس کے حالت معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو، وہ زن وشوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی، ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے، پس ان کے افعال کی نفریں انہی پر ہونی چاہئے نہ مذہب اسلام پر، جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے، وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا، اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے، جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لئے اس کا جوڑا پیدا کیا تا کہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو''۔(108)

مستشرقین کا نظریہ جہاد اور سرسید کی وضاحت:

جہاد کے طعن پر بھی ازالۃ الاوہام اور استفسار وغیرہ میں عہد عتیق کے بیشار حواریوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس شدت اور سختی کے ساتھ جہاد کا حکم انبیائے بنی اسرائیل کو دیا گیا اور جس طرح انبیاء نے اس حکم کی تعمیل کی، اسلام میں ویسی شدت اور سختی جہاد کے حکم میں نہیں ہے یہ جواب بھی بلاشبہ عام مسلمانوں کے اطمینان اور عیسائیوں کے ساکت کرنے کے لئے جو کہ تمام عہد عتیق کو الہامی جانتے ہیں، کافی تھا، مگر جو لوگ یہودی یا عیسائی مذہب کے قائل نہ تھے اور جہاد کو عموماً خواہ وہ کسی مذہب میں ہو، اصول تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف جانتے تھے اور مسلمان فاتحوں کے افعال کی بدولت خود اسلام کو سب مذہبوں سے زیادہ بنی نوع انسان کی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے ان کے لئے اور ان تعلیم

یافتہ مسلمانوں کے لئے جو ان معترضین کی تحریریں دیکھتے تھے، کافی نہ تھا''۔

سرسید نے خطبات احمدیہ میں اور اُس کے سوا اپنی اور بہت سی تحریروں میں اس مغالطہ کو اس طرح رفع کیا ہے کہ فی الواقع کسی انصاف پسند کو، خواہ وہ عیسائی ہو اور خواہ غیر عیسائی اسلام کے مسئلہ جہاد پر نکتہ چینی کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ مفصل بحث اُنہوں نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر میں کی ہے۔ مگر یہاں ہم صرف اُن کی اُس تحریر کا بہت مختصر خلاصہ جو خطبات میں درج ہے، لکھتے ہیں۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اُس نے مذہب کے معاملہ میں رائے کی آزادی بالکل روک دی بلکہ بالکل معدوم کر دی ہے۔ سرسید نے اُس کے جواب میں اول ایک لمبی تحریر میں اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ جیسی آزادی رائے کی روک عیسائی مذہب میں ہے ایسی دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''اگر عیسائیوں کے قول کے موافق اسلام میں آزادیٔ رائے نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کے قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے تو یہ اسلام پر اُن جھوٹے الزامات میں سے ہے، جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اُس پر لگائے ہیں۔ یا تو وہ لوگ اصول اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ و دانستہ حق پوشی کی نظر سے ایسا کیا ہے۔ جبکہ اسلام دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے تو کیونکر یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ وہ زبردستی منوایا اور قبلوایا جاتا ہے۔ جو لوگ اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الزام قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے کس قدر برخلاف ہے کہ:

''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ''

''یعنی دین کے معاملہ میں کچھ جبر نہیں کیونکہ ہدایت اور گمراہی میں صاف فرق ظاہر ہو گیا ہے''۔(109)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''جس اصول پر حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر استثنا کے قتل و غارت اور نیست و نابود کر دیں، اُس اصول پر اسلام نے کبھی تلوار میان سے نہیں نکالی، اُس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اُس نے بھی تلوار نکالی مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کی جان و مال کی حفاظت اور اُن کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو۔ اور یہ وہ منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا۔ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور اب بھی بقدر ضرورت وقت کے اُن پر فرض ہے کہ کافروں کے ملکوں میں جائیں اور خدا کی توحید کا یقین اُن کے دل میں بٹھائیں جہاں کوئی ایسے وعظ و نصیحت کا مانع نہیں ہے وہاں اسلام نے تلوار نکالنے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ مگر جب خدا کے نام کی منادی روک دی جائے اور موحدوں کو امن میسر نہ ہو، جیسا کہ مکہ میں کافروں نے کیا کہ جب مسلمان مکہ سے نکل گئے تو بھی اُن کا تعاقب نہ چھوڑا، اُس وقت بلاشبہ اپنے بچاؤں اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے''۔(110)

مذکورہ بالا مضمون کو نہایت مفصل و شرح بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''اس بیان سے اُن عیسائی مصنفوں کی بھی غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے''۔ پھر لکھتے ہیں کہ ''ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتحمندوں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی سے دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کیا، مگر مذہب کا اندازہ اُن کے افعال سے نہیں بلکہ اس بات سے کرنا چاہئے کہ آیا اُنہوں نے اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں؟ اُس وقت صاف کھل جائے گا کہ اُن کے افعال اسلام کے بالکل برخلاف تھے مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان فتحمند اپنے مذہب کے پابند تھے وہ دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلحاظ قوم و مذہب کے ہر طرح کا امن و آزادی بخشتے تھے''۔

اس کے بعد گاڈفری ہگنز کی رائے اس امر کے متعلق نقل کی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں ''کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسی کہ پادریوں کی زبانی اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اُس میں تعصب زیادہ ہے اور دوسرے مذہب کو آزادی

نہیں ہے یہ عجب زعم اور ریا کاری ہے، وہ کون تھا جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو بایں وجہ کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے جلاوطن کر دیا تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دے دیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے؟ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن وامان کے ساتھ اپنی مملکت پر قابض چلے آتے ہیں اور ان کے مذہب ان کے پادریوں ان کے بشپ، ان کے بزرگوں اور ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے جو لڑائی بالفعل یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے۔ وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ڈیمرارا کے حبشیوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہبی نہیں ہے"۔ (111)

"ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ "وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش وخرم تھے۔ اگرچہ بظاہر امور اس وجہ سے جلاوطن کئے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی مانک (راہب) سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہوسکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا"۔

"خلفا کی تمام تاریخ کی کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب نہ چھوڑنے کے سبب آگ میں جلایا گیا ہو اور نہ مجھ کو یقین ہے کہ زمانہ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا"۔ (112)

اس کے بعد جان ڈیون پورٹ کی کتاب اپالوجی سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں "خونریزی اور بربادی ان نو احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے تقریباً دوسو برس تک ترکوں پر کئے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔ پھر قتل کرنا ان شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے کہ انسان کو دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیرووں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائی شمال تک ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی میری کے حکم سے قتل ہونا فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا، چالیس برس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا، فرانسیس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جواب تک اس لئے قابل نفرین ہے کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا۔ علاوہ اس کے وہ بیس برس کی خرابیاں جبکہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے زہر خوانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا اور آخرکار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لئے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لئے قتل ہونا، اس میں شک نہیں کہ ایسا مکروہ اور گویا ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا"۔ (113)

اس کے بعد مشہور عیسائی مورخ مسٹر گبن کی رائے اس آزادی کی تائید میں جو اسلام نے غیر قوموں کو دی ہے نقل کی ہے۔ پھر ایک آرٹیکل سے جو کسی یوروپین مصنف نے ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں چھپوایا تھا، مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے "اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لئے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو جبراً تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبراً جاری نہیں کیا، اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے"۔ (114)

اس کے بعد فلسطین کے ایک عیسائی شاعر لامارٹین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں"۔ (115)

یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "دیکھو یہ سب رائیں بہت سے بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کیسے برخلاف ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے"۔ (116)

فصل دوم

مولانا ابوالکلام آزاد

احوال و آثار:

مولانا ابوالکلام آزاد جن کا اصل نام احمد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ ذی الحجہ 1305ھ یعنی اگست یا ستمبر 1888ء میں بمقام مکہ معظمہ پیدا ہوئے۔ (117)

آزاد تخلص، ابوالکلام کنیت تھی قلم کا سفر شروع ہوا تو محی الدین عنقا ہو گیا دستخط کرتے تو احمد لکھتے پھر ابوالکلام ہی نام ہو گیا۔ جب ہمہ گیر شخصیت ہو گئے تو پورا نام ابوالکلام آزاد ہو گیا۔ (118)

خود کہتے ہیں کہ میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو مذہبی رہبانیت و پیشوائی رکھتا تھا۔ ان کے خلاف خیالات میں تزلزل آرہا تھا اور میں اس سے نجات چاہتا تھا۔ المختصر دماغ مذہب سے متعلق منفی و مثبت خیالات کی گزرگاہ تھا اور دماغی حالت یہ تھی کہ تقلید و رسوم کی بندشیں ٹوٹ چکی تھیں۔ اکثر شکوک و شبہات سر اٹھا رہے تھے۔ ان کی مدافعت کا سامان نہ تھا بلکہ مطالعہ کی وسعت سے ان کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ طبیعت کا یہ عالم تھا کہ کسی نئی حالت کے لئے مضطرب تھی۔

پھر کہتے ہیں کہ:

''ان دنوں میں سرسید کی بت کی طرح پوجا کرتا تھا گو ان کے مطالعہ سے ترک تقلید کی راہ پر گامزن ہوا تھا لیکن تب ان کی تقلید ہی علم یا فکر کا منتہیٰ تھا کچھ عرصہ معتزلہ کی طرف رغبت ہوئی مگر یہ بھی ذہنی سفر کا ایک پڑاؤ تھا۔ غرض اس طرح چلتے چلاتے اپنے ہاتھوں ایک دروازہ کھولا اور قصر والحاد میں داخل ہو گیا۔ مختصر یہ کہ آبائی مذہب سے بغاوت کی اور اس نے پورے مذہب سے بغاوت کے راستے پر ڈال دیا''۔ (119)

خاندان:

آپ کے والد ایک صوفی بزرگ مولوی خیر الدین قادری نقشبندی تھے۔ اضلاع بمبئی و کلکتہ میں ان کے ''ہزارہا'' مرید پائے جاتے ہیں۔ آبائی وطن قصور اور دہلی اور مولانا کی ننھیال مدینہ منورہ تھی۔

سات آٹھ برس کی عمر تھی کہ 1895ء میں خاندان کے ہمراہ ہندوستان آگئے۔ اس رعایت سے مولانا کا مولد مکہ معظمہ اور متوطن ہندوستان ہے۔ چونکہ والد نے کلکتے میں قیام کیا اس لئے وہیں کے ہو گئے۔ ہندوستان کی مرکزی کابینہ میں وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالا تو کلکتہ چھوڑ کر دہلی کے ہو گئے۔ حتیٰ کہ موت کے بعد قلعہ معلیٰ اور جامع مسجد (دہلی) کے وسط گراؤنڈ میں دفن ہوئے۔ ادھر ''الہلال'' کے ابتدائی دور تک اپنے تئیں دہلی لکھا۔ ادھر جو لوگ نسلاً بعد نسلاً دہلی کے تھے انہیں آپ کے دہلوی ہونے میں کلام تھا۔ لیکن موت نے دہلوی بنا دیا اور اب ہمیشہ کے لئے دہلی ہی میں آسودہ خاک ہیں۔ البتہ آپ کے والد، اہلیہ اور بھائی قریں کلکتے کے ہیں۔ (120)

مولانا کے دادا محمد ہادی دہلی کے مشہور خاندان علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان میں بیک وقت درس و افتاء اور سلوک و طریقت کے پانچ پانچ اکابر پیدا ہوئے۔ مولانا کے جدی سلسلے میں مولانا محمد محسن پہلے بزرگ تھے جو دہلی میں مستقلاً رہ رہے تھے۔ مولانا کے والد خیر الدین تک آبائی وطن دہلی رہا۔ مولانا محمد محسن کے لخت جگر محمد افضل تھے۔ محمد افضل فرزند محمد احسن اور محمد احسن کے بیٹے محمد ہادی اور محمد ہادی کے نور نظر خیر الدین۔ (121)

کارہائے نمایاں:

مولانا آزاد اپنے دور کی ایک بہت بڑی شخصیت تھے۔ان کی شخصیت کے اندر بہت سی شخصیتیں تھیں مگر سب سلیقے سے ،قرینے سے اور مکمل،ان کی سیاسی زندگی کی طوفانی سرگرمیاں اگرچہ ان کے باقی پہلوؤں پر غالب رہیں لیکن انہوں نے ادبی،سماجی،صحافتی اور شعروسخن کے پہلوؤں کو بھی اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے ہمیشہ منور رکھا۔ (122)

عربی قریب قریب اُن کی مادری زبان تھی۔اردو والد سے وراثتاً ملی۔ان دونوں زبانوں میں کمال حاصل کرنے کے بعد فارسی کی قابلیت پیدا کرنا مشکل نہ تھا۔چنانچہ عربی، فارسی اور اردو تینوں پر اُن کو پورا عبور تھا۔

مولانا کی ایک خصوصیت ان کی اٹھان تھی۔ان کا شجر علم اس وقت پھل لایا، جب دوسروں کے ہاں ابھی بور لگنا شروع نہیں ہوتا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے شاعری کی طرف توجہ کی۔آزاد تخلص رکھا۔(123)

مولانا کو شاعری کا شوق ہوا پہلے اردو پھر فارسی میں شعر کہنے شروع کئے۔اسی زمانے میں ابن رشد، امام غزالیؒ، سرسید اور مولوی محمد حسین آزاد جیسے مصنفین کا مطالعہ شروع کیا اور مختلف علوم کی کتابیں اکٹھی کرنا شروع کیں۔ (124)

آزاد نے اپنی تعلیم 1907ء اور 1909ء کے درمیان عرب ممالک مصر، شام، عراق اور حجاز میں مکمل کی۔اس تعلیم نے ان کی دینی اور سیاسی فکر میں روایاتی اور اساسیاتی رجحانات کو پختہ تر کر دیا۔انہی برسوں کے دوران جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کے شاگردوں سے ان کے روابط قائم ہوئے۔ 1912ء اور 1930ء کے درمیان عرصہ میں آزاد نے وقفے وقفے سے دو ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' مرتب وشائع کئے۔ان رسالوں میں ان کا انداز تحریر نہایت درجہ عربی زدہ ہے لیکن ساتھ ہی نہایت زوردار، پُر از جذبات، پُرشکوہ اور مُرصّع ہے جس میں فارسی اور اردو اشعار جابجا استعمال کئے گئے ہیں۔آزاد نے اسی اسلوب میں مذہبی اور سیاسی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ان کے یہ دونوں رسائل ایک طرح سے بیسویں صدی کی آزاد خیال اساسیت کی صورت میں سرسید احمد خان کے انیسویں صدی کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا جواب تھے۔ بجائے غیر مفاہمانہ عقیدت پسندی کے آزاد نے انسانیت کی پیش کش کی اور محض نظریاتی مباحث کے بجائے روایت پسندی اور جدیدیت کا امتزاج پیش کیا۔(125)

پندرہ برس کی عمر میں لسان الصدق کے نام سے اپنا رسالہ جاری کیا جس کے حالی بہت مداح تھے۔لسان الصدق کی ادارت سے پہلے مولانا نے مشہور ادبی رسالے مخزن میں مضامین نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ 1904ء کے آخر میں یا 1905ء کے شروع میں قیام بمبئی کے دوران میں مولانا شبلی کی آزاد سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ کو ندوۃ العلماء بلایا، جہاں وہ چار سال ڈیڑھ سال مقیم رہے۔

مولانا شبلی نے آزاد کے سیاسی اور اجتماعی اعتقادات پر گہرا اثر ڈالا اور جس علمی اور سیاسی بلندی پر پہنچنے کے لئے مولانا شروع سے تگ ودو کر رہے تھے اس میں ان کی رہنمائی کی۔(126)

1912ء میں الہلال شائع کیا۔الہلال کا مقصد یہ تھا کہ:

''خدا تم کو اپنے کلام کے آگے سربلند کرتا ہے۔تم کیوں اس سے گردن موڑ کر انسانوں کے آگے ذلت کا سر جھکاتے ہو''۔ (127)

الہلال کے بعد مولانا نے البلاغ کو نئے رخ پر نکالا۔اس میں عملی نفسیات کا درس اور فکر وبصیرت اور روحانی عزم وثبات کا پیغام دینا شروع کیا۔ یہ سلسلہ بند ہونے پر کلکتے سے ایک اخبار ''پیغام'' جاری کیا۔(128)

روایت پرست باپ کا بیٹا (ابوالکلام آزاد) آزادیٔ فکر ونظر کا ایک بڑا حامی بن کر ابھرا۔(129)

مسلمان واقعی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔حکومت کو نہ صرف ان پر اعتماد نہیں تھا بلکہ وہ ان کے خلاف تھی۔ ملک کی بھاری اکثریت بھی زندگی کے ہر میدان میں ان سے کہیں آگے تھی۔قدرتاً وہ پریشانی میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ یہ صورت حال تھی کہ

ان کے کانوں میں سرسید کی آواز پہنچی ۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انہوں نے اسے بہت غنیمت خیال کیا اور یقین کیا کہ تمام مصیبتوں کا علاج سرسید کے تجویز کردہ نسخہ ہی میں ہے۔ لہٰذا انہوں نے اسے تسلیم کیا اور آنکھیں بند کر کے ان کی دکھائی ہوئی راہ پر چلے۔ یہ صورت حال تھی جب مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال منصہ شہود پر آئے۔ (130)

مولانا صاحب کہتے ہیں کہ:

''مجھے پہلے پہل سرسید احمد خان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جدید تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات سے میں بہت متاثر ہوا۔ یہ حقیقت مجھ پر روشن ہوگئی کہ جدید دنیا میں فلسفہ، سائنس اور ادب پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے طے کیا کہ انگریزی ضرور سیکھوں گا اور پھر میں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور خود کو تاریخ اور فلسفہ کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا۔ وہ خیالات جو میں نے اپنے خاندان اور ابتدائی تربیت کے توسط سے حاصل کئے تھے اب مجھے مطمئن کرنے سے قاصر تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنی راہ خود تلاش کی جائے اور اسی طرف لگ پڑا۔ پہلی بات جس نے مجھے پریشان کیا مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اختلاف تھا میں سوچتا تھا کہ اگر مذہب آفاقی صداقت کا اظہار کرتا ہے تو پھر الگ الگ مذہب کے ماننے والوں میں ایسا اختلاف کیوں ہے؟ ہر مذہب کیونکر صداقت کا دعویدار ہوسکتا ہے؟ اور پھر اسے حل کرنے میں لگا اور محسوس کیا کہ مجھے تمام رسمی بندشوں سے چھٹکارا مل گیا۔ اسی دور کے آس پاس میں نے آزاد کا قلمی نام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ظاہر ہو جائے کہ مجھ پر اب موروثی ایقانات کی کوئی گرفت نہیں ہے''۔ (131)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے تصورات مٹنے لگے اور نئے تصورات کی جستجو پیدا ہونے لگی۔ مذہب کے داخلی تضادات نے بین المذاہبی اختلافات کی طرف توجہ دلائی۔ یہ امتیازات اور اختلافات کی ایک ایسی وسیع دنیا تھی کہ اس میں داخل ہونے کے بعد کسی ایک عقیدے کی صداقت میں یقین برقرار رکھنا بہت دشوار ہوتا ہے حتیٰ کہ چند برسوں کے اندر مولانا کے افکار و عقائد کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے چنی تھیں متزلزل ہوگئیں۔ (132)

آزاد کی ذہنی تربیت و تعلیم بنیادی طور پر روایتی تھی۔ 1905ء میں جب ان کا شبلی کا ساتھ ہوا تو شبلی اس وقت تک علی گڑھ تحریک کی اطاعت شعاری (لالمزم) اور انتہا پسند جدیدیت سے برگشتہ ہو کر بغاوت کر چکے تھے۔ اس لئے علی گڑھ کی مخالفت اور اس کے ضمن میں جو کچھ المضاعف تھا، اس نے آزاد کی ذہنی سرگرمی کے لئے تختۂ زقند کا کام کیا۔ اس مخالفت نے مختلف سمتوں میں جلوہ گری کی۔ بنیادی طور پر اس نے انتہائی نظریاتی جدید پسندی کے بجائے ایک روشن خیال اسا سیت کو جگہ دینے کی کوشش کی۔ (133)

مذہبی خدمات:

مذہبی نقطۂ نظر سے مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے اہم کام جو ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، جدید علم کلام کی تردید و اصلاح ہے۔ زوردار طرز تحریر کے علاوہ، جس میں دلائل کی کمی ساحرانہ طرز تحریر سے پوری ہو جاتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد جدید علم کلام کی اصلاح کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ علم کلام کی مخالفت کے علاوہ دوسرا اہم کام جو مولانا نے کیا، وہ قرآن مجید کا غائر مطالعہ اور اس کی وسیع اشاعت ہے۔ مولانا کی تیسری اہم مذہبی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی تصنیف و تالیف کا معیار بہت بلند کر دیا۔ (134)

مولانا فرماتے ہیں کہ:

''لوگ قرآن کے مطالعہ سے سیرت کی طرف آتے ہیں میں سیرت کے مطالعے سے قرآن کی طرف آیا ہوں تو میرے دل و دماغ کا ہر کانٹا صاف ہو گیا اور میں بفضل تعالیٰ انکار و الحاد کے بیاباں سے باہر نکل آیا''۔ (135)

حالات و واقعات کی کسی بھی نوعیت کو وہ، جس مثبت اور ایجابی انداز فکر سے جانچتے تھے وہ دوست دشمن سب ہی کے لئے حیرت کا باعث ہوتا تھا ایک انسان جب تک کسی معاملے کو خالص عقل و دلیل کی راہ سے جانچتا ہے اس میں غلطی شاذ و نادر رہ جاتی ہے۔ غلط روی اسی

وقت نمایاں ہوتی ہے جب تنگ نظری ذہنی توازن پر غلبہ پالیتی ہے۔ (136)

ابوالکلام آزاد سر سید احمد خان کی طرح تقلید کے منکر ہیں اور تمام بنیادی مسائل کا حل مثلاً قوانین فطرت، انسان کا خدا اور انسان سے رشتہ، اصول زندگی، اخلاقیات کی اقدار و سیاسی اخلاق کے معیار سب قرآن کے اندر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (137)

قرآن نے کثیر مقامات پر تفکر و تعقل و تدبر پر زور دیا ہے اور اس کی اہمیت اس طرح واضح کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفکر و تعقل اسلام کی خاص چیز ہے اور مولانا نے اس خصوصیت کو اچھی طرح اپنایا اور اپنی تفسیر الفرآن کے نازک اہم معاملات کو اس کے سہارے سے اس طرح طے کیا کہ اسے پڑھ کر ایمان کو جلا ہوتی ہے۔ وہ قرآن کو سمجھنے کے لئے جدید فلسفہ اور جدیدیت کی بجائے قرآن ہی سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اسی سے معانی و حقائق کے گہر ہائے بیش بہا نکالتے ہیں۔ (138)

ہندوستانی مسلمانوں میں بھی آزادی کے لئے نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور ان میں انقلابی خیالات مقبولیت حاصل کرنے لگے۔ اس زمانے میں اس مذہبی گروہ کے نمایاں ترین نظریہ ساز مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا نے تخلیقی تحریک سر سید احمد خان ہی سے حاصل کی تھی۔ (139)

آزاد کی تاویلی انتخابیت کی تہ میں اترا جائے تو وہ اسلام میں مرتکز اور مضبوطی سے جڑ پکڑے ہے۔ انہوں نے جس مذہبی آفاقیت کی وکالت کی ہے وہ صوفیانہ نمونہ ہے، جسے موجودہ دور کی روایت پسندی میں پیوند کیا گیا ہے۔ تقابلی مذہب میں ان کا دائرہ سید احمد خان سے زیادہ وسیع ہے اور ان کا رجحان یہودیت اور عیسائیت کی جانب زیادہ مناظرانہ و مباحثانہ ہے۔ وہ سر سید کے مقابلے میں ہندوستانی مذاہب، بودھ مت اور ہندومت سے زیادہ رواداری برتتے ہیں۔ گاندھی سے متاثر ہونے سے بہت پہلے وہ بلاشبہ ہندوستان میں ایک کثیر المذاہب حیات باہمی کے قیام و وجود کی جانب راغب تھے اور غالباً اسی رجحان نے ان کو 1920ء میں ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے متعلق سیاسی نظریات قائم کرنے میں مدد کی۔ انہیں علماء کے اجماع کو اور خاص طور پر علمائے دیوبند کے اجماع کو، اپنے طرز پر ڈھالنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن برصغیر کے مسلم عوام اور زعماء میں اجماع کا موجودہ مفہوم کچھ اور تھا۔ انہوں نے آزاد کے سیاسی خیالات رد کر دیے، اگرچہ دانشوروں اور زعماء کا ایک طبقہ ان کے مذہبی خیال کا احترام کرتا تھا۔ (140)

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ مذہب کی صورت تغیر پذیر ہے اور ہر زمانے کے حالات کے مطابق تبدیلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب چونکہ نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں مذہب کے ابدی اور ازلی اصولوں کو نئی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مذہب عصر حاضر کے چیلنج سے عہد برآ ہو سکے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو متکلمین کا کام تجدید ہے تاسیس نہیں کیونکہ تاسیس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ نے ایک نئی عمارت تعمیر کی تجدید یہ ہوئی کہ مکان پہلے سے موجود ہے صرف شکست و ریخت کی درستگی مطلوب ہے۔

پس اپنے نقائص دور کئے گئے بلاشبہ ہمارا پہلا کام یہ ہوگا کہ نئے ڈھنگ اختیار کریں اور دیکھیں کہ پہلے سے موجود چیزوں کا کیا حال ہے ان کی خرابیاں کیونکر دور کی جائیں۔

یقیناً کوئی یہ نہیں کہے گا کہ ملت اسلامیہ کی اصلاح کے لئے قرآن و شریعت کی تعلیمات ہی کافی نہیں ہیں اور ہمیں غیروں کی تقلید کی ضرورت ہے پس یہ اصل متفق و مسلمہ ہے کہ اصلاح میں صرف تجدید کی ضرورت ہے تاسیس کی نہیں ہے۔ (141)

مولانا آزاد کی شخصیت کے داخلی تضادات بہت نمایاں صورت میں سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ اپنے ہم مذہبوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنے روحانی ورثے کی عظمت کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی فراموش نہ کریں کہ ہمیں زمانہ کی رفتار کو پیش نظر رکھنا ہی پڑے گا۔ زمانے سے قدامت پرستی ہمیشہ لڑتی رہی ہے مگر قدامت پرستی ہاری اور زمانہ جیتا ہے۔ ہم وقت سے لڑ نہیں سکتے۔ (142)

کہتے ہیں کہ جو لوگ رفتار زمانہ سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذاہب کی اصلاح و ترمیم کی طرف مائل ہیں جو گذشتہ 300 سال سے قائم ہے۔

عیسائیوں نے اس اصلاح کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ عیسوی مذہب کے احکام اقتضائے زمانہ وتغیر ماحول کا ساتھ نہ دے سکے۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے کہ وہ جب تک منوجی کے شاستر میں ترمیم نہ کریں زمانہ سے مقابلہ کے اہل نہیں ہو سکتے۔ مگر مسلمانوں کو مذہبی احکام میں اس طرح کی اصلاح وترمیم کی یکسر ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کی شریعت کے قوانین جامع ومکمل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شریعت کو مضبوطی سے پکڑیں اور قوانین اسلام کی شدت سے پیروی کریں۔ (143)

مولانا ابوالکلام آزاد کے مذہبی فکر پر شاہ ولی اللہ کے اثرات بھی ظاہر ہیں اور جہاں تک منہاجیات کا تعلق ہے سید احمد خان کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ''ترجمان القرآن'' میں انیسویں صدی کے اس مفکر کے عقلی، فطرت پسندانہ منہاج کے اثرات جا بجا ملتے ہیں اگرچہ سر سید احمد خان اور مولانا ابوالکلام آزاد میں بہت زیادہ فرق ہے کیونکہ دونوں جن نتائج تک پہنچتے ہیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں کہ اول الذکر کا مذہب مجہول مطابقت پذیری کی جانب لے جاتا ہے جبکہ موخر الذکر نے اسلام کی جو تعبیر پیش کی ہے وہ آزادی اور حریت پسندی سے عبارت ہے۔ (144)

مولانا مودودی ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

''ابوالکلام اور اقبال اس دور کے دماغ تھے''۔ (145)

ان دونوں کا پیغام ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولو اور اسلام کے اسم اعظم سے آفاق کی تسخیر کرو۔ (146)

غبار خاطر میں ایک خط کے چند پیراگراف کے اقتباس میں درج ہے کہ:

''انسان اپنی زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینا پڑیں ایک قید خانے کے اندر کی اور دوسری باہر کی۔ جن کی الگ الگ رنگ وروغن سے نقش آرائی ہوئی ہے جس سے ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچاننا مشکل ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ خود کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنا چاہتا ہوں''۔ (147)

یہی حال آج کل مسلمانوں کا ہے وہ حقیقت کی روشنی میں آنا پسند نہیں کرتے لیکن حقیقت ان کا پیچھا کب چھوڑنے والی ہے۔ وہ کچھ عرصہ بند دروازے میں بیٹھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ اب اندھیرا ہے مگر جب اس پر بھی کہیں نہ کہیں سے روشنی راستہ نکال لیتی ہے تو چونک اٹھتے ہیں کہ ایک نئی بات ظہور میں آ گئی حالانکہ نئی بات تو کوئی بھی نہیں ہوئی وہی سورج اب بھی چمک رہا ہے جو صبح سے تھا۔ (148)

مولانا آزاد نے سر سید کی تعلیمی پالیسی سے اتفاق کیا لیکن ان کی سیاسی پالیسی کی پر زور تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ قرآن فرماتا ہے:

''ان الحکم الا للہ'' (۱۲:۴۰)

''حکومت اللہ کے سوا کسی اور کا حق نہیں''۔

لہٰذا مسلمان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا فرمانبردار نہیں ہوگا۔ اس نص کی موجودگی میں وہ کسی دوسرے کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔ مسلمان تو پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ وہ اس روئے زمین پر خدائے وحدہٗ لاشریک کی حکومت قائم کرے اور اس نصب العین کے حصول کے لئے جہاد کرے۔ (149)

پھر کہتے ہیں کہ:

''سر سید کا یہ کہنا کہ انگریزوں کے دل وجان سے فرمانبردار رہو اور تلوار کا جہاد ترک کر دو کیونکر گردانا جا سکتا ہے سر سید کی یہ تلقین سراسر اسلام کے منافی ہے۔ مولانا آزاد نے جہاد کا صور اس بلند آہنگی سے (اور اس تواتر سے) پھونکا کہ لوگ سوتے سے چونک اٹھے۔ بڑے بڑے علماء نے اعتراف کیا کہ ہم اسلام کے اس بنیادی اصول اور حکم کو بھلا چکے تھے۔ مولانا آزاد نے ہمیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا''۔ (150)

ایک جگہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے حرام اور ناجائز ہوگیا فسق ہوگیا اور قریب قریب کفر ہوگیا کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت واعانت، وفاداری اوراطاعت کا کوئی تعلق رکھیں۔ اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے، تو ایک منٹ کے لئے ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔

اس لئے کہ گذشتہ کئی برس سے انگریزوں نے اسلامی ممالک کے خلاف جوروبیہ اختیار کر رکھا ہے جس میں عراق اور ہندوستان میں جو کچھ انہوں نے کیا ہے، اور کر رہے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی رو سے ''فریق محارب'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ (151)

مولانا آزاد محض سیاست دان ہوتے تو ممکن تھا حالات سے سمجھوتہ کر لیتے لیکن شدید احساسات کے انسان تھے اپنے دور کے سب سے بڑے ادیب ایک عصری خطیب، ایک عظیم مفکر اور عالم متجر ان لوگوں میں نہیں تھے جو صرف اپنے لئے سوچتے ہیں۔ وہ انسان کے مستقبل پر سوچتے تھے۔ انہیں غلام ہندوستان نے پیدا کیا اور آزاد ہندوستان کے لئے جی رہے تھے۔ ایک عمر آزادی کی جدوجہد میں بسر کی اور جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس کا نقشہ ان کی منشاء کے مطابق نہ تھا۔ انہیں مسلمانوں نے سال ہا سال اپنی زبان درازیوں سے زخم لگائے اور وہ ان تمام حادثوں کو اپنے دل پر گزارتے رہے۔ الغرض آزادی کے بعد یہی سائے دس سال کی مسافت میں ان کے لئے جان لیوا ہو گئے۔ 19 فروری 1958ء کو آل انڈیا ریڈیو نے خبر دی کہ مولانا آزاد علیل ہو گئے۔

مولانا کے بنگلہ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند، پنڈت جواہر لال نہرو وزیراعظم، مرکزی کابینہ کے ارکان، بعض صوبائی وزرائے اعلیٰ اور اکابر مسلم کے علاوہ ہزار ہا انسان جمع ہو گئے۔ آخر ایک بجے شب سورۃ یٰسین کی تلاوت شروع ہوگئی اور 22 فروری کے سوا دو بجے شب مولانا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (152)

سرسید اور مولانا ابوالکلام آزاد:

سرسید کی طرح مولانا بھی آزادیٔ فکر اور اجتہاد کے قائل تھے۔ کورانہ تقلید، توہم پرستی اور مذہبی امور میں غیر ضروری سخت گیری کے دونوں خلاف تھے۔ دونوں نے اپنے ماحول سے بغاوت کی اور اپنے لئے خود راہ تلاش کی لیکن سرسید آزادیٔ فکر کی تحدید نہ کر سکے اور بغاوت کی رو میں اتنے آگے بڑھے کہ مسلمات سے بھی انکار کر بیٹھے، لیکن ابوالکلام نے اپنی فکر کو اسلامی حدود کے اندر ہی رکھا اس لئے وہ کامیاب رہے۔

اس بنیادی اختلاف کے باوجود سرسید سے جو انہوں نے فیضان حاصل کیا تھا اور اس کے زیر اثر تلاش وجستجو کا جو ذوق اور جذبہ ان کے اندر پیدا ہوا تھا وہ ہمیں مولانا کے ترجمان القرآن میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ مولانا کا طرز استدلال سرسید کے انداز سے بہت مشابہ ہے۔ سرسید کی تفسیر میں ایک جہان معانی پنہاں ہے۔ مولانا بھی جہاں تفصیلات کو ضروری تصور کرتے ہیں وہاں تحقیق کے دریا بہا دیتے ہیں اسی لئے ترجمان القرآن کو اسلامی انسائیکلو پیڈیا قرار دے سکتے ہیں۔

مولانا آزاد نے بھی تعلق اور تفکر کو بنیادی اہمیت دی لیکن سرسید کے برخلاف وہ مذہب پر اس کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ (153)

سرسید کی طرح وہ بھی جدید تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اور اسے ترقی کا زینہ خیال کرتے تھے۔ سرسید کا یقین تھا کہ انگریزی حکومت کے زیر نگین رہ کر ہی ملک وقوم کی ترقی ہوسکتی ہے جبکہ مولانا کا ایقان تھا کہ غلامی کی فضا میں کسی بھی قوم کی ترقی ممکن نہیں یہی نظریہ ہمارے قوم پرور علماء کا بھی تھا۔ (154)

ابو الکلام آزاد مختلف شخصیات کے نزدیک

1۔ مہاتما گاندھی کہتے ہیں کہ:

''مولانا میں اپنے علم کی بے پناہی کے باعث ذہنی طور پر ایک ''انا'' ہے وہ بہت سے معاملات ایک مثالی اور نظری انسان کی حیثیت سے حل کرنا چاہتے ہیں وہ ہر چیز کو عقل، استدلال اور منطق سے دیکھتے ہیں''۔ (155)

2۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے نزدیک:

''ان کا ذہن مدلل اور سلجھا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم سکول سے تعلیم حاصل کی ہے ان کا عام رویہ معقولیت پسند ہے''۔ (156)

3۔ مولانا ظفر علی خان کہتے ہیں کہ:

''مولانا زمانہ حاضر کی فکری تحریکوں کو بخوبی سمجھتے اور قرآن کو ہر زمانے کی پیچیدگیوں کا حل قرار دے کر انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کی ابدی دعوت پر نظامِ کائنات کی اساس رکھتے ہیں''۔ (157)

4۔ شیخ محمد اکرام رقمطراز ہیں کہ:

''مذہبی نقطۂ نظر سے مولانا ابو الکلام آزاد کا سب سے اہم کام جو ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ہمیشہ یادر ہے گا جدید علم الکلام کی اصلاح ہے۔ سرسید کے نومعتزلہ عقائد سے مسلمان کبھی خوش نہ تھے لیکن شاید اس کا سدِ باب مولانا ہی نے کیا۔ یہ درست ہے کہ سرسید کی زندگی میں اور ان کے بعد علماء نے ان کے خیالات کی تردید میں کتابیں لکھیں مگر مولانا کا کام ان سب سے اہم تھا۔ قدیم علماء کو خدا نے زوردار قلم نہ دیا تھا جو مولانا کے ہاتھ میں تھا''۔ (158)

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا میں علم و جستجو کا ایک عنصر واقع تھا کہ وہ بہت سے معاملات کو مثالی اور نظری انسان کی حیثیت سے حل کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے دور کی فطری تحریکوں کو بخوبی سمجھا اور عصری تقاضوں کے مطابق معاشرے کو ڈھالنے کی کوشش کی۔ گویا مولانا ابو الکلام آزاد کا طرہ امتیاز تھا کہ انہوں نے انسانی کشمکش سے استحکام لانے کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لئے واضح لائحہ عمل کا تصور بھی دیا۔

رسول رحمت ﷺ کا تعارف

اگر ہم رسول رحمت پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو مولانا ابو الکلام کی سیرت پر لکھی گئی منفرد کتاب ہے۔ جس میں مولانا نے سیرت کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے مستشرقین کی موشگافیوں کا مدلل انداز میں جواب دیا ہے۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ کتاب ابو الکلام آزاد کی باقاعدہ کوئی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ ان کے وہ تمام مقالہ جات ہے جو انہوں نے مختلف مراحل میں لکھیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے مرتب مولانا غلام رسول کے تصورات کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے کہ وہ اس کتاب کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

رسول رحمت کے بارے میں مولانا غلام رسول کی رائے:

مولانا کہتے ہیں کہ: جب سے ہوش سنبھالا رسول اللہ ﷺ کی ذات پاک اور دین حق کے لئے ایک خاص تڑپ قلب و روح کی گہرائیوں میں برابر جزن رہی۔ اس کا تموج اس وقت بھی خاصا تیز تھا جب میں اس کی حقیقت سے بڑی حد تک ناآشنا تھا اور آج بھی خاصا تیز ہے، جب میں اس سے بالکل غیر متعارف نہیں رہا، یہی تڑپ ہے جس نے زندگی کی تاریک منزلوں میں امید کا چراغ لگاتار روشن رکھا۔

ہر کام میں میری رہنمائی کی، ہر سفر میں یہ میرے لئے توشہ وزادِ راہ بنی رہی۔ یہی تڑپ ہے جو عملِ حسن سے محرومی کی حسرتوں کے ہجوم میں بھی زندگی کا حاصل معلوم ہوتی ہے۔

مولانا آزادؒ فضائل و مکارمِ علم وفضل کا ایک عجیب پیکر تھے۔ ان کا ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' 1913ء میں ابرِ بہار کی طرح فضا سے کلکتہ پر نمودار ہوا۔ وہ ظاہر و باطن میں ہر ایسے جریدے سے جداگانہ تھا جو ملک میں جاری ہو چکے تھے اور چند ہی مہینوں میں ایسی شہرت و ہر دلعزیزی حاصل کر لی، جو نہ پہلے کسی کو ہوئی تھی اور نہ بعد میں حاصل ہو سکی۔ انہوں نے حقائق کتاب وسنت جس دلپذیر انداز میں پیش کیے اس کی کوئی مثال پھر نہ مل سکی۔ نیز علم وفضل سے ہر شعبے میں انہیں یگانہ حیثیت حاصل تھی۔ جو کچھ لکھتے تھے اس کی شان سب سے الگ ہوتی تھی اور علم وعمل کے ہر دائرے میں ان کا یہ امتیاز یگانگی برابر قائم رہا۔ ان کی وفات بڑا ہی الم انگیز حادثہ تھی۔ اس سے بھی بڑا المیہ یہ تھا کہ ان کے بے شمار علمی و دینی افادات بکھرے پڑے تھے جن کی فراہمی اور ترتیب کی فرصت انہیں جہادِ آزادی کی ہمہ گیر مشغولیتوں اور مصائب قید و بند کی بے پناہ مجبوریوں کے باعث نہ مل سکی بلکہ اس جہاد میں ان کے بہت سے علمی ذخیرے بھی تلف ہو گئے۔ انہوں نے آزادی کے بعد ہر چھوٹے بڑے علمی یا طباعتی ادارے کے لئے ہر ممکن امداد کا انتظام فرما دیا تھا۔ مگر وہ اپنے افادات کی ترتیب وتہذیب کے لئے کچھ بھی کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حالانکہ یہ ان کی نہیں، علم وفضل کے ایسے نوادر کی خدمت تھی جنہیں بندگانِ خدا کے لئے ہر دور میں بے شمار بصیرتوں اور ہدایتوں کا سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

ایسے اکثر مقالات ''الہلال'' دورِ اول و دوم یا ''البلاغ'' میں شائع ہو چکے تھے۔ اول ''الہلال''، ''البلاغ'' کی جلدوں تک عام شائقین کو دسترس ہی حاصل نہ تھی۔ یہاں تک کہ آخری دور میں خود مولاناؒ کے پاس بھی ان اخباروں کے فائل موجود نہ تھے۔ پھر ان کے افادات کو جس انداز میں مرتب کرنا چاہیے تھا اس کا اندازہ بہت کم اصحاب کو تھا۔

یقیناً مولاناؒ کے انتقال کے بعد حکومت ہند نے یہ کام ساہتیہ اکیڈمی کے حوالے کر دیا اور اکیڈمی اب تک ''تذکرہ''، ''غبارِ خاطر'' کے علاوہ ترجمان القرآن تین جلدوں میں نہایت اہتمام سے شائع کر چکی ہے۔ اگرچہ ترجمان کی ترتیب میں ایک ایسی تبدیلی کر دی گئی جو مولاناؒ کی تقسیم مطالب کے مطابق نہ تھی اور اسے کسی بھی اعتبار سے مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاہم یہ کتابیں تو پہلے بھی مرتب شدہ موجود تھیں۔ اصل اور حد درجہ اہم معاملہ تو مرحوم کے بکھرے ہوئے افادات کا تھا۔ میں 1959ء میں دہلی گیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ ''الہلال''، ''البلاغ'' اور ''لسان الصدق'' کے علاوہ بعض دوسرے مقالات کی اشاعت بھی اکیڈمی کے پیش نظر ہے مگر اول تمام مضامین کو یکسانی مطالب کے پیش نظر حسنِ ترتیب کے بغیر چھاپ دینا چنداں سود مند نہ تھا۔ دوم جو مضامین آج سے کم وبیش نصف صدی پیشتر ضبطِ تحریر میں آئے تھے اور ان میں جابجا وقت کے احوال وظروف کے بارے میں تلمیحات تھیں۔ اگر انہیں توضیحات وحواشی کے بغیر چھاپا جاتا تو وہ عہدِ حاضر یا دورِ آئندہ کے اربابِ ذوق کے لئے یسیر الفہم نہیں رہ سکتے تھے۔

مجھے یاد تھا کہ مولاناؒ نے ''الہلال'' و ''البلاغ'' میں سیرۃ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں بہت سے مقالے شائع کیے تھے۔ وہ ربیع الاول کی تقریب میں ضرور ایک یا دو یا زیادہ مقالے تحریر فرمایا کرتے تھے۔ علاوہ بریں لوگوں کی طرف سے استفسارات آ جاتے تھے جن کے مفصل اور تشفی بخش جواب دینا ان کا شیوہ خاص تھا۔ اسی طرح انہوں نے انبیاء کرامؑ کے متعلق بہت کچھ لکھا تھا۔ خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کے متعلق، میں نے ایک دوست کو تمام مقالوں کی نقل پر لگا دیا اور چند مہینے میں یہ کام پورا ہو گیا۔

میں نے سیرت طیبہ کے مقالے ترتیب سے رکھے اور ان کی فہرست مرتب کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کے متعلق نہایت قیمتی سرمایہ یکجا ہو گیا ہے۔ پھر مولاناؒ کا اندازِ بیان ایسا تھا کہ جو کچھ زبانِ قلم پر آتا، دامنِ دل کو یقین واعتماد کے گلہائے رنگارنگ سے بھر دیتا اور شک وتذبذب کو خلش کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ دراصل مولاناؒ فطرۃً داعیِ حق تھے۔ دل پذیری اور یقین افروزی

داعی کی تحریر وتقریر کا جوہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے نکلی ہوئی شاید ہی کوئی چیز ہو جو دعوت کے اس معنوی جوہر سے بھرپور نہ ہو۔

مولانا غلام رسول کہتے ہیں کہ: میں نے ان مقالوں پر ضروری حواشی لکھے۔ تمہیدی عبارتیں تحریر کیں۔ جہاں جہاں خلا محسوس ہوئے انہیں مختصر تحریروں کے ذریعے سے پر کر دیا اور ستمبر 1964ء میں کتاب طباعت کے لئے تیار ہوگئی لیکن دل اس پر مطمئن نہ تھا۔ حالانکہ اس کتاب کا مقدمہ بھی مولاناؒ ہی کے قلم سے تھا۔ یہ تو محسوس ہوتا تھا کہ ان مقالوں پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ جو خلا مختصر تحریروں کے ذریعے سے پُر کیے گئے ہیں۔ وہ دوسرے پہلوؤں کے متعلق مولاناؒ کی مفصل تحریروں کے مقابلے میں بدستور خلا ہی محسوس ہوتے رہیں گے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا صورت اختیار کی جائے اور کمی کیوں کر پوری ہونی چاہیے؟ اسی وجہ سے کتاب حوالہ طباعت نہ ہو سکی۔

پھر خیال آیا کہ مولاناؒ کے مقالات میں بعض مباحث نامکمل رہ گئے ہیں اور سیرت کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جو زیادہ مفصل تحریرات کے متقاضی ہیں۔ ہمارے اکثر سیرت نگار اپنی کتابوں میں جغرافیائی معلومات مہیا کرنے پر ضرورت کے مطابق توجہ نہ دے سکے اور گزشتہ بیس پچیس سال میں جغرافیائی معلومات کا جو قیمتی ذخیرہ فراہم ہوگیا تھا (اس سلسلے میں سب سے بڑھ کر سعی وکوشش ڈاکٹر حمید اللہ نے فرمائی تھی) اسے بھی کسی نہ کسی طرح جزو کتاب بنا دینا چاہیے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ان ضرورتوں کو کون پورا کرے؟ سیرت کی کتابوں میں جو کمی جا بجا محسوس ہوتی ہے اس کی تلافی کہیں سے کرائی جائے اور کتاب کا جو نقشہ ذہن میں جما ہوا ہے اس کی تکمیل کس کے سپرد ہو۔ خود میرے لئے اس باب میں توقف کے دو واضح سبب موجود تھے:

1۔ موضوع کی انتہائی اہمیت اور اس کا غیر معمولی تقدس حد درجہ ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا۔ ایسے شخص کے لئے جو علم وعمل دونوں کے اعتبار سے سراسر تہی دامن تھا۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے کا تصور بھی دل پر لرزہ طاری کر دینے کے لئے کافی تھا۔

2۔ مولاناؒ جو کچھ لکھ چکے تھے وہ اس درجہ پاکیزہ، دلربا اور ایمان پرور تھا کہ اس پر نظر پڑتے ہی عزم نگارش عرق انفعال بن کر بہ نکلتا تھا۔ نہ ویسا لکھنا آئے، نہ لکھنے والا ملے، آخر قدم آگے بڑھے تو کیونکر بڑھے؟

موضوع کی اہمیت کے متعلق عرفی جو کچھ کہہ گیا ہے اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست　　　آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

صحرا کی وسعت و پہنائی میں انسان جہاں چاہے قدم رکھے، جس طرف چاہے نکل جائے، پوری عمر بھی نئے نئے راستے اختیار کرنے کی کوششوں میں گزار دے تو حیات مستعار ختم ہو جائے گی اور دامن صحرا کی پہنائی بدستور بے پایاں رہے گی۔ پھر تلوار کی دھار پر کون چل سکتا ہے؟ دھار پر پاؤں دھرتے ہی اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اور چلنے والا معذور ہو کر بیٹھ جائے گا۔ عرفی اس حقیقت سے ناواقفیت نہ تھا مگر اس نے راستے کی مشکلات کا زیادہ سے زیادہ جامع اور موثر تصور پیدا کرنے کی کوشش میں یہ اسلوب اختیار کیا اور حق یہ ہے کہ مشکلات کا اس سے دل نشیں تر خاکہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ عمر بھی لکھنے ہی سے سروکار رہا۔ اوائل شباب سے اب تک جتنی خامہ فرسائی کی اس کے نتائج کی وسعت کا کوئی اندازہ ذہن میں موجود نہیں۔ میں نے اٹھائیس سال اخبار نویسی میں صرف کیے جو ذہنی اور بدنی قوتوں کے بہترین سال تھے اور وہ بھی روزنامہ نویسی میں۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے صرف افتتاحی مقالات کا سرسری حساب کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ متوسط سائز کی ہر جلد پانسو صفحے کی رکھی جائے تو میرے لکھے ہوئے مقالات افتتاحیہ کم وبیش 80 جلدوں میں سمائیں گے۔ تاہم مشاقی کے زعم میں سیرۃ طیبہ کے کسی حصے پر لکھنے کے لئے آمادہ ہو جانا بہت بڑی جسارت تھی۔ جو میرے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی اور شیخ سعدیؒ کا یہ حکیمانہ قول سامنے تھا: سپر اندازی کا اس سے بڑا مقام کیا ہو سکتا تھا جو مجھے درپیش تھا؟

غرض مولاناؒ کے مقالات بڑے شوق سے نقل کرائے تھے اور خیال تھا کہ جلد چھپ جائیں گے۔ لیکن میرے تصورات ترتیب میں

اس طرح اُلجھے کہ پانچ سال گزر گئے اور بظاہر ان کے طبع ہونے کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ آخر سوچا کہ یہ تعطل کب تک جاری رہے گا اور جو بیش بہا دینی وعلمی دولت میں نے مشقت سے جمع کی تھی وہ کب تک ''گنج بہ ویرانہ'' کی صورت میں شوق کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے گی؟ کیوں نہ خود ہی ہمت کر کے پہلے وہ ابواب مرتب کیے جائیں جو نسبتاً سہل ہیں اور ان میں زیادہ دقیق مباحث سے سابقہ نہیں پڑتا۔ جن میں ذرا سی لغزش بھی انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ اس طرح کام شروع ہوا تو رفتہ رفتہ بہت کچھ لکھا گیا۔ کئی معاملے ایسے بھی معرض تحریر میں آ گئے جو نئے ہونے کے باعث شاید اجنبی سے محسوس ہوں۔ لیکن میں نے اپنی دانست میں انہیں ضروری سمجھتے ہوئے مرتب کیا اور جو کچھ لکھا اس میں مولاناؒ ہی کی مہیا کی ہوئی روشنی میری رفیق طریق رہی یا کہنا چاہیے کہ کم از کم میرا تصور یہی تھا۔

پھر میں نے وہی ابواب لکھے جو یا تو مولاناؒ کے مقالات میں آئے ہی نہیں تھے اس لئے کہ وہ سیرت نہیں لکھ رہے تھے۔ سیرت کا جو حصہ اتفاقیہ ان کے سامنے آ جاتا، اس پر مقالہ لکھ دیتے یا کسی معاملے کے متعلق کہیں سے استفسار آ جاتا تو عادت شریف کے مطابق اسی کا مفصل جواب چھاپ دیتے یا ان کے بعض ضمنی اشارے کسی قدر تفصیل کے محتاج تھے۔ ان پر لکھا یا وہ کسی اہم مسئلے کی محض تمہید ہی لکھ سکے۔ پھر نظر بندی کی نوبت آ گئی اور مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی کہ متعلقہ موضوع کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دوں تاکہ زیادہ بالغ نظر اصحاب مزید غور وفکر کے بعد خوب تر تحریر کے لئے سفر شروع کریں تو میری مہیا کی ہوئی معلومات زادِ راہ کا کام دے سکیں۔

مولاناؒ کی تحریرات میں اپنی تحریریں شامل کر دینا ایسا ہی ہے جیسے حریر صد رنگ کی تہوں میں ٹاٹ کے ٹکڑے رکھ دیے جائیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ:

رشتہ بر قیمت از آمیزش گوہر نہ شود

لیکن ظاہر ہے کہ میں مجبور تھا اس لئے معذور سمجھیے۔ حالات ایسے پیش آ گئے کہ میرے لئے قدم آگے بڑھانے کے یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے اپنے لکھے ہوئے تمام ابواب کے ساتھ ''مولف'' کی تصریح کر دی ہے اور جہاں جہاں کوئی ایسا نشان نہیں، سمجھ لیجئے کہ وہ تمام مقالے اور تمام تحریرات مولاناؒ کی ہیں۔

علم وعمل کی کوئی قابلِ ذکر متاع دامن میں ہے ہی نہیں کہ دعویٰ سے کچھ کہا جا سکے اور ہوتی بھی تو آپ رحمتﷺ کی بارگاہِ اقدس کے آستانہ مبارکہ پر پہنچ کر کوئی دعویٰ زبان پر لانے یا دل میں رکھنے کا یارا کسے ہو سکتا ہے۔ عشق ومحبت سے روح وقلب سرشار سہی، لیکن جب اپنے غیر شایاں اعمال پر نظر پڑتی ہے تو یہ سرشاری بھی سراسر بے حیثیت ہی رہ جاتی ہے۔

آخر میں دردمندانہ التجا ہے کہ اگر میری تحریر کا کوئی بھی حصہ کسی دل میں حب رسولﷺ کے چراغ کو لو کسی قدر بھی تیز کر سکے تو وہ صاحب دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس روسیاہ کی عاقبت بخیر ہو۔ جہاں جہاں لغزشیں اور خطائیں، خامیاں اور افتادگیاں نظر آئیں، ہاتھ اٹھائیں کہ خدائے عرش عظیم اپنے لطف عمیم اور فضل جیم سے اس خطا کر کے گناہ بخش دے۔ ان میں قصد ونیت کا کوئی دخل نہ تھا۔

انہ ھو یبدی و یعید وھوا لغفور الودود ذوالعرش المجید، فعال لما یرشد:

به مسکنت نیشینیم یا قبول کنسند — طیفلیان سرخوان خواجه لولاکؐ (159)

اشاعت سیرت طیبہ:

مولاناؒ نے نومبر 1913ء کے ''الہلال'' میں مجالس ذکر مولد کے متعلق خود ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا۔ جس میں واضح کیا تھا کہ سیرۃ نبویﷺ کے لئے ایک ادارہ بن جانا چاہیے۔ جس میں مختلف رسائل ایک خاص اسلوب پر عوام کے لئے لکھے جائیں اور انہیں مجالس مولد میں پڑھا جائے۔

سیرۃ نبوی ﷺ کی اہمیت:

فقیر کا ایک مدت سے خیال ہے کہ سیرت نبوی ﷺ میں ایک محققانہ و مفصل کتاب کی تدوین کے علاوہ (جیسی سیرت کبیر مولانا شبلی نعمانی مرتب فرما رہے ہیں) اور بھی بہت سی صورتیں ترتیب و اشاعت کی مطلوب و ضروری ہیں۔

از انجملہ سخت ضرورت ہے ایسے مختصر رسائل کی، جن میں مباحث و مناظرات متعلق سیرۃ سے بکل چشم پوشی کی جائے۔ صرف حالات زندگی صحت و تحقیق کے بعد درج کیے جائیں۔ اختصار ہر جگہ ملحوظ رہے اور صرف وہی مواقع مفصل ہوں جن کی تفصیل ہماری موجودہ عملی زندگی کے لئے اسوۂ حسنہ کی دعوت رکھتی ہے اور جس کی نسبت ایک الہامی فکر نقاد کے ساتھ کہا گیا تھا کہ ''خلقه القرآن'' (آنحضرت ﷺ کا خلق تعلیم قرآنی کی تصویر ہے)

ان رسائل سے عام مطالعہ وواقفیت اور اثر و اصلاح کے علاوہ مخصوص پر مقصود یہ ہے کہ مجالس ذکر ولادت نبوی کی اصلاح ہو اور یہ جو ایک نہایت قومی رسم اجتماع و احتفال موجود ہے اس کی قوت سے اصلی و حقیقی فائدہ اٹھایا جائے۔

میں ایک بار اس کی نسبت لکھ چکا ہوں۔ میرے اعتقاد میں قرآن کریم جو ایک ''کتاب مسطور فی رق منشور'' ہے۔(160) اس کی لوح محفوظ حامل قرآن کی زندگی تھی اور میں ''قد جاءکم من اللہ نور و کتب مبین'' (161) میں ''نور'' کو کتاب کا وصف نہیں سمجھتا بلکہ اس وجود انسان کامل کی زندگی سمجھتا ہوں۔

جس کی نسبت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ:

''داعیاً الی اللہ باذنہ و سراجاً جامنیرا''(162)

وللناس فیما یعشقون مذاھب!

پس اگر ہمیں مسلمان بننے کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کی ضرورت ہے تو یقین کیجئے کہ اسے عملی زندگی کی صورت میں دیکھنے کے لئے اس ''اسوۂ حسنہ'' کے مطالعے کی ضرورت ہے: ''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ'' (163) اور یہ پچھلی ضرورت پہلی ضرورت ہی جتنی ہے، پہلی سے کم نہیں۔

مجالس ذکر مولد:

اس کا بہترین ذریعہ مجالس کی مولد نبوی ﷺ ہیں بشرطیکہ ان میں عام رسائل مولد کی جگہ جو بالعموم موضوعات و قصص اور غیر مفید ولا حاصل صرف عبارت و انشا کا مجموعہ ہیں۔ پیش نظر طریقے سے صحیح و محقق حالات نبوی بیان کیے جائیں۔

اس قسم کی چیزیں دراصل لکھنے اور پڑھنے کی نہیں۔ اس لئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو سیرۃ النبی ﷺ کے خطیب (لیکچرر) ہوں جنہوں نے اس موضوع خاص کا مطالعہ کیا ہو۔ جن کو اس میں صاحب فن کا درجہ حاصل ہو اور وہ ہر مجلس اور جماعت کے سامنے، اس مجمع کی حالت، ضرورت، گروہ پیش اور مخصوص داعیان و احتیاجات کے مطابق، سیرت نبوی پر خطبے دے سکیں کیونکہ ہر شہر، ہر محلے، ہر خاندان، ہر جماعت اور ہر مجلس کی ضروریات یکساں نہیں۔

احوال و ضروریات کا لحاظ:

کسی جماعت کے لئے سیرۃ نبوی ﷺ کا کوئی خاص حصہ زیادہ تفصیل چاہتا ہے۔ کسی کے لئے مخصوص وقتی حالات کسی خاص موقع کے اطناب کے طالب ہیں۔ کسی کو بدر کی فتح کا واقعہ سنانا چاہیے اور کسی کو احد کی ہزیمت کے مصالح کے ذریعے سے عزم و استقامت کی وصیت کرنی چاہیے۔ کسی کے لئے مجاہدات و غزوات کے عزائم ضروری ہیں اور کسی کے لئے فتح کا عفو و صلح اور درگزر و کرم۔ پھر ایک جماعت کے

واقعات وحالات کے لحاظ سے، اخلاق وخصائص نبوت میں سے کسی خاص خلق عظیم پر زور دینے کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لئے کسی دوسری حالت کی۔ اگر اس حیات طیبہ مقدسہ کا کوئی فعل ایسا نہ تھا جو محبوب نہ ہو، و کل مایفعله المحبوب محبوب:

ز فرق تا قدمش هر کجا که می نگرم   کرشمه دامن دل می کشد که جا این جاست

تاہم وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے اور ہر حصے کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ زندگی اور زندگی کے متعلقات کی صدہا صورتیں ہیں۔ کون ہے جو اس صحیفۂ نبوت کا اول سے آخر تک حق مطالعہ ادا کرسکتا ہے؟ پس بجز اس کے چارہ نہیں کہ اپنے چہرۂ اعمال کے حسن وآرائش کا جو حصہ سب سے زیادہ بگڑ گیا ہو، سب سے پہلے اسی کو اس آئینہ میں دیکھ کر سنوار لیں۔

رسائل خطبات سیرت:

لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے لوگ کہاں سے آئیں؟ اپنے جہل اور بے مایگیوں پر کہاں تک ماتم کریں؟ اگر یہ نہیں تو کم از کم اتنا تو ہو کہ سیرت نبوی پر مختلف مقاصد اور مختلف پیرایہ وترتیب سے چھوٹے چھوٹے رسائل لکھے جائیں اور انہی کو لوگ مجالس میں پڑھ دیا کریں یا یاد کر کے مثل خطبہ کے سنا دیں۔ ایک مجموعہ خطبات سیرت کا ہو جو صرف تعلیم یافتہ مجامع کے لئے مخصوص ہو۔ ایک مجموعہ صرف عام مجالس کے لئے اور ایک بطور درس ومطالعہ کے بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے لئے سب سے پہلے کم از کم ان تین قسموں کی سیرتیں علاوہ سیرت کبیر کے ضرور لکھنی چاہئیں۔

اسلوب وزبان:

لیکن نہایت مشکل اور اہم مسئلہ اس کی زبان اور طرز تحریر کا ہے علی الخصوص ایک ایسے عہد خیز مذاق میں جب لوگ فن بیان وانشا پردازی کا شوق تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن اس کے مواقع استعمال اور صحیح مفہوم بلاغت سے بے خبر ہیں۔ جو مجموعہ خطبات کا مجالس ومحافل ارباب علم وفکر کے لئے ہو، اس کا انداز تحریر اور ہونا چاہیے اور مجالس عامہ کے لئے اور۔

ایک میں تاریخ وسیرت کے اسلوب کے ساتھ اگر باعتدال وبلا اغراق تغلیب، طرز بیان میں انشا پردازانہ علو ورفعت بھی پیدا کی جائے تو مضائقہ نہیں کیونکہ موضوع کی بلندی خود مستحق رفعت ہے۔ لیکن لیکن دوسرے میں تاریخ کی جگہ اصلاح ودعوت کا مقصد پوشیدہ اور مخاطب عامۃ الناس، اس لئے نہ تو اسلوب بیان مورخانہ وفلسفیانہ ہو اور نہ بلند وعالمانہ، بلکہ نہایت عام فہم وسلیس اور محض سادہ سہل، با ایں ہمہ سادگی بیان کے ساتھ ضرور ہے کہ بغیر انشا پردازانہ پیچ وخم کے، اپنے اندر ایک ایسی بے امان تاثیر بھی رکھتا ہو کہ سننے والے اس کے ہر لفظ پر بے اختیار دل وجان سپرد کر دیں۔ ''وان من البیان لسحرا''۔ جس بات کو میں نے یہاں چند سطروں میں لکھا ہے غور کیجئے تو یہ ایک نہایت نازک اور دقیق نکتہ بلاغت ہے اور افسوس کہ اقلام عصر کا احساس نہیں۔

ایک ضروری نکتہ:

بڑی مشکل یہ ہے کہ ایک عرصے سے عام لوگ ذکر میلاد کی مجالس میں ٹھمری لچھے کے عادی ہو گئے ہیں۔ مجھ کو بہت سی ایسی صحبتیں یاد ہیں جہاں غزلوں کے مطالب اور صراحت خطاب وضمیر سے اگر قطع نظر کر لیا جاتا تو یہ بتلانا محال ہو جاتا کہ ایک مقدس ذکر دینی کی صحبت میں بیٹھے ہیں یا کسی نوآموز مگر صحیح معنوں میں خوش گل مغنیہ کے سامنے ہیں۔ میں یہ کہنے سے نہیں شرماتا کہ موسیقی کو نہایت محبوب رکھتا ہوں اور چونکہ دل رکھتا ہوں اس لئے اس شے سے قطع تعلق نہیں کرسکتا۔ جس کا تعلق دل کے ساتھ، جسم اور روح کے تعلق ہے تاہم یہ تو کوئی شخص بھی پسند نہیں کرسکتا کہ مجالس دعوت مقدسہ ومذاکرات دینیہ کو موسیقی جذبات سے آلودہ کیا جائے میرے خیال میں اس ذکر مقدس کے لئے یقیناً یہ ایک ناقابل تحمل گستاخی ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ نئے خطبات سیرت تو اس عنصر دلکش سے بالکل خالی ہوں گے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی روضہ خوانی کی طرح نہیں بلکہ ایک وعظ کی طرح بالکل تحت اللفظ ہوگا۔ اصلاح کے کاموں میں لوگوں کی دلچسپی کے قیام اور توجہ کی بقاء سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ورنہ اصل مقصود فوت ہو جائے۔ پس نہایت ضروری اور اساسی امر یہ ہے کہ ان کے اسلوب بیان وطرز تحریر میں کچھ ایسی باتیں بھی جمع کی جائیں جن کی تاثیر و کشش، تمام عوام پسند اجزائے میلاد کی پوری پوری تلافی کر دے اور طریق وآداب خطبات ورسم ومواعظ دعوت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

ادارۂ سیرت نبوی ﷺ:

ان خطبات کی ضرورت تو مجالس ذکر مولد کے خیال سے ہے لیکن ان کے علاوہ بھی مختلف انداز بیان وترتیب اور تلخیص مطالب ومسائل کے ساتھ سیرت نبوی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ جو طرح طرح کے اشکال دعوت واثر ہیں اس اسوۂ حسنہ الٰہیہ کو اہل اسلام وغیر اہل اسلام کے سامنے پیش کرے۔ ضرورت تھی کہ ایک خاص ادارہ ''سیرت نبوی ﷺ'' کی غرض سے قائم کیا جاتا جس کا کام مسلسل اور دائمی ہوتا اور جو اس بارے میں تحقیقات وانکشافات فن کی مصروفیت کے ساتھ، سیرت کے چھوٹے بڑے، مختلف اشکال ومقاصد کے ایڈیشن بھی شائع کرتا رہتا۔ کاش موجودہ ادارۂ سیرت شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے زیر ادارت قائم ہے۔ تکمیل سیرت کبیر کے بعد بھی اپنی کام جاری رکھے اور ایک باقاعدہ جماعت اس مقصد اعظم واقدم کو اپنے ہاتھ میں لے لے، جو اصلاح وبقائے ملت ودعوت دیانت حقہ اسلامیہ کے لئے بمنزلہ اساس کار وبنیاد جمیع مساعی ومبانی ہے۔

احتفال مولد نبوی:

مجھ کو کئی بار خیال ہوا کہ ایک دورسالے سیرت نبوی پر متذکرہ صدر اصول کے پیش نظر رکھ کر لکھوں اور آج اس بحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا بھی اس لئے تاکہ ارباب قلم ونظر کو اس طرف توجہ ہو اور ایک ابتدائی مشورہ ان کے سامنے آجائے۔ اگر ماہ ربیع الاول تادم تک کسی بزرگ نے اس طرف توجہ نہ کی تو چند خطبات سیرت پر لکھوں گا۔ نیز کوشش کروں گا کہ کسی بڑے شہر میں ایک احتفال عظیم اسی مقصد سے منعقد ہو اور اس میں صرف سیرت مبارکہ پر مختلف ارباب علم وخبر خطبات دیں یہ خیال بھی مجھے عرصے سے ہے۔ امسال لاہور یا لکھنو میں ماہ ربیع الاول کی ایک مرکزی مجلس ضرور منعقد کرنا چاہیے۔ وما توفیقی الا باللہ:

(یہ مقالہ نومبر 1913ء کے ''الہلال'' میں شائع ہوا تھا۔ آئندہ سال اگست میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوگئی اور ''الہلال'' کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی ضمانت مانگ لی گئی۔ اس وجہ سے پرچہ بند کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ کیونکہ اگر دس ہزار کی ضمانت داخل بھی کر دی جاتی تو امید نہ تھی کہ وہ زیادہ عرصے تک محفوظ رہتی۔ یوں یہ منصوبہ روئے کار نہ آسکا۔ ایک سال کے بعد مولاناؒ نے ''البلاغ'' جاری کیا جس میں زیادہ توجہ ''ترجمان القرآن''، ''مقدمہ تفسیر'' اور خود تفسیر (البیان) پر مبذول رہی۔ چند مہینے کے بعد مولاناؒ کو بنگال سے اخراج کا حکم ہوگیا اور انہیں کلکتہ چھوڑ کر رانچی جانا پڑا۔ وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا دسمبر 1919ء میں وہ رہا ہوئے۔ (164)

مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور مولاناؒ کی تصریحات

یہودی اور عیسائی:

سورۂ توبہ کی آیت میں عرب کے ان یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی تمام معاہدات فسخ کرنے کا حکم دیا ہے جنہوں نے یکے بعد دیگر معاہدوں کی خلاف ورزیاں کی تھیں اور مسلمانوں کے امن وعافیت کے خلاف ایک بہت بڑا خطرہ بن گئے تھے اور حکم دیا ہے کہ مشرکین عرب کی طرح ان کے خلاف بھی اب اعلان جنگ ہے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو حجاز میں یہودیوں کی متعدد جماعتیں آباد تھیں۔ لیکن عیسائیوں کی کوئی قریب آبادی نہ تھی۔ وہ یا تو یمن میں تھے یا عرب اور شام کے سرحدی علاقے میں، یہودیوں کا جو طرز عمل رہا اس کی طرف

اشارات گزر چکے ہیں ۔عیسائیون کی حالت یہودیوں سے مختلف رہی،ان کی طبیعت میں وہ جمود اور سختی نہ تھی جو یہودیوں میں طبیعت ثانیہ ہو چکی تھی ۔اس لئے جب انہوں نے اس دعوت کا حال سنا تو مخالفت کا جوش پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کی طرف مائل ہونے لگے ۔ چنانچہ یمن کے عیسائیوں نے ابتداء سے موافقانہ روش اختیار کی تھی اور اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کرلیا تھا ۔پھر اسلام نے خود بخود اپنی راہ وہاں نکال لی ۔

عرب سے باہر کے عیسائی:

عرب سے باہر کے جن عیسائیوں تک اسلام کی دعوت پہلے پہل پہنچی ان کا بھی یہی حال رہا ۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جو بادشاہ مسلمان ہوا وہ حبش کا عیسائی فرمانروا نیگوش تھا جسے عرب نجاشی کہا کرتے تھے ۔(165)

مسیحی ریاستوں کی جنگ وخون ریزی:

لیکن آگے چل کر جب اسلام کی دعوت زیادہ پھیل گئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقے میں قائم ہو گئی تھیں اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں ۔اس تحریک کی ترقی گوارا نہ کرسکیں اور رومی شاہنشاہی کی پشت گیری سے مغرور ہو کر آمادہ پیکار ہو گئیں ۔سب سے پہلا معاملہ حضرت حارثؓ بن عمیر کی شہادت کا پیش آیا ۔آنحضرت ﷺ نے انہیں دعوت اسلام کا خط دے کر موتہ بھیجا تھا ۔جہاں کا رئیس شرحبیل بن عمر وغسانی تھا ۔اس نے انہیں (حارثؓ بن عمیر کو) کو بغیر کسی جرم وقصور کے قتل کرادیا ۔اس صریح غدر وظلم نے پیغمبر اسلام کو جنگ پر مجبور کردیا اور ایک فوج 8ھ میں روانہ کی گئی ۔اس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ بھی شام میں مقیم تھا ۔اس سے رئیس موتہ نے مدد مانگی اور ساری فوج بھی میدان میں آ گئی تاہم فتح مسلمانوں ہی کی ہوئی ۔

شامیوں اور رومیوں کی عزم یورش:

اس واقعے کے بعد شام کے تمام عرب قبائل نے تہیہ کرلیا کہ مسلمانوں پر حملہ کردیں اور شہنشاہ قسطنطنیہ نے بھی ان کی اعانت کا فیصلہ کرلیا ۔ چنانچہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں اور پیغمبر اسلام ﷺ کو خود دفاع کے لئے نکلنا پڑا ۔ یہی دفاعی اقدام ہے جو غزوۂ تبوک کے نام سے مشہور ہوا ۔لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اس بے باکانہ اقدام نے دشمنوں کے ارادے سست کردیے اور اب حملے کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہے ۔ چونکہ اب مسلمانوں پر اس جانب سے سخت حملہ ہونے والا تھا اور دوسری طرف عرب کے یہودی بھی اپنی سازشوں میں سرگرم تھے اس لئے ناگزیر ہو گیا تھا کہ مشرکین عرب کی طرح ان کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کردیا جائے ۔

پس اس آیت میں ''جنگ کرو'' کے حکم سے مقصود جنگ کی یہی صورت ہے ۔ یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے تمام یہودیوں اور عیسائیوں پر محض ان کے یہودی اور عیسائی ہونے کی وجہ سے حملہ کردو ۔ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں یا جزیہ نہ دیں جیسا کہ معترضین اسلام نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ایسا مطلب صرف وہی قرار دے سکتا ہے جو پورے قرآن سے ،پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی سے ،صحابہؓ کے حالات سے اور تاریخ اسلام سے یک قلم آنکھیں بند کرلے ۔

حکم قتال کے ساتھ یہ بات بھی واضح کردی کہ ان جماعتوں کو دعوت حق سے کیوں بغض ہوا اور کیون راستی وعدالت سے منہ موڑ کر مسلمانوں کی ہلاکت وبربادی کے درپے ہو گئے ۔ چنانچہ پہلے اہل کتاب کا نام نہیں لیا بلکہ ان کے چار سلبی وصف بیان کئے ۔یعنی جن لوگوں کے اوصاف کا یہ حال ہے ان سے راستی وعدالت اور پاس عہد وقرار کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی اور وہ پیروان حق کی عداوت سے کبھی باز آنے والے نہیں ۔پس اگر ان سے جنگ نہ کی جائے تو چارہ کار کیا ہے؟

فرمایا: باوجود اہل کتاب ہونے کے اب ان کا حال یہ ہے کہ نہ تو اللہ پر ایمان باقی رہا ہے نہ آخرت پر، زبان سے دعوی کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، لیکن ان کا ہر عمل اعلان کرتا ہے کہ مومن نہیں پھر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو کچھ حرام کردیا تھا اب ان کے لئے حرام

نہیں رہا۔ کیونکہ اول تو جوا سے نفس سے حیلے نکال کرتنی ہی حرام چیزیں حلال کرلیں پھر حلت وحرمت کا حق بھی خدا اور رسول کی جگہ اپنے فقیہوں اور پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس دین کی حق کی انہیں حضرت موسیٰ اور مسیحؑ نے تعلیم دی تھی اسے یک قلم چھوڑ چکے ہیں۔ یہاں اہل کتاب کے ایمان کی اسی طرح نفی کی ہے جس طرح سورۂ بقرہ میں کی ہے کہ:

"ومن الناس من يقول امنا بالله وباليوم الآخر وما هم بمومنين"(166)

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مومن نہیں"۔

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور مستشرقین:

مولانا مسلمانوں کا احوال مستشرقین کی زبانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

مسلمانوں کے لئے درحقیقت یہ بات سخت قابل شرم ہے کہ جس میدان میں انہیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں، عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے، مسلمانوں کے تمام علوم وفنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں، درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ و ادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کو الگ کر دینے کے بعد عربی کا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آ رہی ہیں، صرف یہی نہیں کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخہ کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہو گئے، بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے ان کو ہمارے علماء کے دماغوں میں ایک لمحہ کے لئے جگہ نہ ملی ہوگی، عربی کی علم اللسان لغت صرف، نحو، عروض اور قوافی کے متعلق بیسیوں کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبان میں آ جائے، تو بیش بہا معلومات سے ہم مالا مال ہو جائیں۔(167)

ڈاکٹر لائٹنر ہماری اس افسوسناک غفلت کو محسوس کر کے لکھتے ہیں کہ مسلمان ہیں تو بہت مگر وہ جانتے کیا ہیں، گر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا کوئی عمدہ دیوان درکار ہو، تو یورپ سے مانگنا پڑے گا، ابن خلدون، ابن رشد، ابن بطوطہ، حاجی خلیفہ، ابن اثیر اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں، یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں، تابطشرا، امراءالقیس، بحتری اور ابوتمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہوگا، یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں اور ترجمہ قرآن تو لاکھوں۔(168)

ڈاکٹر لائٹنر کو تو صرف اس کا افسوس ہے کہ اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں، اور انہیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعہ علمائے اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں، جن کی بدولت آج انہیں، اس امر کا توقع حاصل ہے کہ اپنے علمی ذخیرہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں یہ دکھلایا ہے کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی اور صرف ونحو، لغت وادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں۔ دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے، جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شائع ہوئیں۔(169)

یورپ کو عربی اور عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی اور کیوں کر ہوئی، یہ بجائے خود ایک دلچسپ مضمون ہے، جس کے بیان کرنے کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت، صرف اس قدر بتلانا سلسلۂ مضمون کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا اور کیوں کر عربی علوم وفنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہو گئے، دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب وغریب ہے کہ یورپ کی شائستگی کی بنا ایک ایسی پولیٹکل خوں ریزی نے رکھی، جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کی گئی ہے، گیارھویں صدی

عیسوی میں جب کہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجہ تک پہنچ چکے تھے، یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکا یک یورپ کو موقع دیا کہ مسلمانوں کی شائستگی کا مطالعہ کرے، بیت المقدس اور اطالیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہوگئی، اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرائع وسعت کے ساتھ پیدا ہو گئے، تو یورپ کی آنکھیں کھلیں اور مسلمانوں کی شائستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا، شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جانبازوں نے مغرب کا رخ کیا تو یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے کہ مسلمان علمی و عملی ترقیات کی دنیا میں اکیلے مخزن ہیں اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شائستگی پر عام توجہ پیدا ہوگئی اور یہ توجہ برابر بڑھتی گئی، کیوں کہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کا اسلامی ممالک میں گزر ہوا اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی علمی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے، اس لئے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑہ اٹھایا، اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہوگیا۔ (170)

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ چوں کہ اس زمانہ میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی، اور لاطینی و یونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور ارکین سلطنت کے لئے مخصوص تھی، اس لئے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اول قدم اٹھا، وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا، حیرت یہ ہے کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشان خواب دیکھنے لگا اور اسلامی فلسفہ کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی، حالانکہ ابتداء میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارہویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم وفنون پر یورپ کی توجہ ہوئی، اور چودہویں صدی کے اواخر تک فلسفہ کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ (171)

ابتدا میں متعدد محکمے قائم کئے گئے کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کی جائیں، پھر یورپ اکلرمنڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لئے یورپ سے نوجوان طلبہ اندلس روانہ کئے گئے۔ (172)

اندلس میں چونکہ خود عیسائی اور یہودی فلسفہ میں مسلمانوں کے شاگرد رشید تھے، اس لئے یورپ کے طلبہ ان کی اعانت سے فائدہ اٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے، اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے۔ (173)

جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے ان کے نام آج تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، ان میں بہت سے طالب علم ایسے ہیں، جنہوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے قید سے خود کو ہمیشہ کے لئے آزاد کر لیا اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ مدرسوں اور قرطبہ کے دارالعلوموں میں صرف کر دی، کچھ طالب علم ایسے ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے اور ایک عرصہ کی تلاش و تحقیق کے بعد جب سر زمین مغرب میں قدم رکھا تو اسلامی علوم وفنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔ بارڈمن کریمون اس زمانہ کے مشہور طبیب اور ہیئت داں ہے یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا اور ایک عرصہ کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کر لی تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹر زمارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا، جس کو جغرافیہ کا شوق دامن گیر ہوا، اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا، افریقہ کی خاک چھانی اور مدت کی آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔ ڈینل مارلی اور پیٹر زماکر نے اسی طرح اندلس کا سفر کر کے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی آخرالذکر نے قرآن شریف کا لاطینی ترجمہ بھی کیا اور آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی۔ (174) ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں۔ (175)

ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کر دیا اور اسلامی فلسفہ نے عام طور پر مقبولیت حاصل کر لی۔

لیکن چونکہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درسگاہ نہ تھی، اس لئے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کر سکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کے کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولہویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہوگئی، 1622ء میں پندرہویں گری گورس پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقائد کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کی توجہ ہوگئی، اس کے بعد ہی 1627ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا تا کہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پا کر اشاعت مذہب کی غرض سے باہر جاسکیں، اس مدرسہ میں خاص طور پر عربی و سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کیے گئے تھے عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسہ کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں، تعلیم کے لئے ضرورت ہوئی کہ صرف ونحو اور ادب کی کتابیں بکثرت مہیا ہوں، اس لئے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے، اور کچھ کتابیں قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی دستیاب کیں اور انہیں اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا۔

عربی لٹریچر اور مولانا کی تصریح:

اس انجمن نے عربی کے لئے جو کچھ کیا، وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا، لیکن اسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے، جنہوں نے محض ذاتی کوشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی، اور پھر صرف ونحو اور ادب ولغت کی کتابیں لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا، ان لوگوں میں پہلا شخص آر۔ پی۔ نیوامی ایک عالم ہے، جو ہالینڈ کا باشندہ تھا، مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی اور متعدد زبانوں کو حاصل کر کے 1613ء میں ہالینڈ واپس آیا، ہالینڈ میں چونکہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی سے ہو چکی تھی، اس لئے ہالینڈ پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہوگیا، اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہوگئی اور صرف ونحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ ترتیب دیا۔ (176)

آر۔ پی۔ نیو کے بعد لافن وارز نامی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی، یہ عالم 1619ء میں پیدا ہوا اور 1665ء میں وفات پائی، 1640ء میں مشرقی ممالک کا سفر کر کے عربی کی نادر کتابیں جمع کیں اور لیڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں داخل کر دیں۔

سترہویں صدی کے اواخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوششوں سے عربی لٹریچر کا مذاق ترقی کرتا رہا، لیکن اٹھارہویں صدی کے اوائل سے یورپ میں عربی کا وہ نیا دور شروع ہوا جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنیاد رکھی، اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر سل وسٹر کی تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا، بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا، علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابل قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف ونحو ہے، جس کی دو ضخیم جلدیں 1810ء میں چھپ کر شائع ہوئیں، اس کتاب میں مصنف نے ایک مفید التزام یہ کیا ہے کہ جن جن صرف ونحوی مسائل کو لکھا ہے، ان کے متعلق بطور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کر دیئے ہیں۔ (177)

اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہو گئے، جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہوگئی، منجملہ ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے اگرچہ مسلمانان ہند کا یہ زمانہ انحطاط تھا، مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا، یہاں تک کہ لکھنؤ اور دہلی کے جو علماء آج زیادہ مشہور ہیں وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں، اس لئے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی، اس توجہ سے جو مفید نتائج پیدا ہوئے، ان میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا، یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ انگریز بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دوڑ میں برابر کے شریک رہے، مشہور انگریزی عالم لمڈن (178) نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک عمدہ کتاب صرف ونحو پر لکھ کر 1813ء میں شائع کی، اسی طرح کلکتہ میں دو اور رسالے اسی زمانہ کے قریب قریب شائع ہوئے، جن میں سے ایک رسالہ میں عربی کی چھوٹی بڑی حکایتیں جمع کی تھیں، اور دوسرے رسالہ میں الف لیلہ کے تیسرے حصہ کا انتخاب اور ترجمہ تھا۔

(179)اس دور میں صرف ونحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں۔

1۔ علامہ ای والڈ جرمنی کی صرف ونحو عربی، 1831ء سے 1832ء تک چھپ کر لیزگ سے شائع ہوئی۔

2۔ علامہ کاسیری کی صرف ونحو پہلی مرتبہ 1848ء میں چھپ کر لیپزگ سے شائع ہوئی، پھر علامہ اگسٹس نے ترمیم وتہذیب کے بعد 1852ء میں دوبارہ شائع کیا، یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ 1887ء تک اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔

3۔ پھر 1859ء میں ایک انگریز عالم رایٹ نے کاسیری کی صرف ونحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا، جو لنڈن میں چھپ کر شائع ہوئی۔

یورپ کے علماء نے جب عربی زبان پر توجہ کی، تو ان کو صرف ونحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی، جو ان کے لئے مفید ہوں، جب ایسی کتابیں نہیں ملیں، تو خود انہوں نے کوشش کر کے کتابیں تصنیف کیں اور آنے والے زمانہ کے لئے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا، اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ اسی کوشش پرمبنی ہیں۔

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا، وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے، جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی۔(180)

عربی لغات اور مغربی مصنفین:

سب سے پہلا لغت جو یورپ میں شائع ہوا، جیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے، جو اٹلی کا رہنے والا تھا، پھر علامہ جولیس نے اس کی تقلید کی اور 1852ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شائع کیا، یہ دونوں لغت چونکہ صرف عربی کے تھے، اس لئے علامہ مانینس نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں شرق کی تین مشہور زبانوں عربی، فارسی، ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا، اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمن دونوں زبانوں میں درج کیا، اس لغت کا نام کنز اللغات اشرفیہ ہے، 1680ء میں وانادارالسلطنت اٹلی سے چھپ کر شائع ہوا۔(181)

اس کے بعد علامہ فرائیٹگ نے چار جلدوں میں اور کازی مرسکی نے فرنچ میں اور باڈچر اور لین نے انگریزی میں چار لغت تیار کئے، جو 1837ء سے 1881ء تک چھپ کر شائع ہوئے، ان میں پہلا لغت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔

ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں، جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت نہیں پائی جاتی، لیکن ساتواں لغت علامہ لین کا اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس مصنف نے نہایت کوشش سے عربی کے تمام قاموس جمع کئے اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔

لیکن جس بےنظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لئے اپنا مرہون منت بنالیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر دوزی کا قاموس ہے، یعنی اضافہ لغت عربی پر، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے کتب خانہ میں یہ لغت میری نظر سے گزرا۔ دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور مصطلحات جمع کئے ہیں، جو عربی کی کسی لغت میں نہیں ملتے، کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے یہ بےنظیر لغت تیار ہوا، تاریخ وادب اور علوم وفنون کی سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کر کے نہایت کوشش سے ان کا سراغ لگایا، اور تحقیق وتنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا، اسے لفظ بلفظ درج کیا، پہلی جلد کی ابتداء میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے، جن سے اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی، اس کے دیکھنے سے اس محقق کی تلاش وتحقیق کا سرسری اندازہ ہوسکتا ہے کہ کون کون سی نایاب کتابیں جمع کیں اور کس طرح ان سے مبہم اور مشکوک الفاظ کا پتہ لگایا۔(182)

مسلمانوں نے جب اسپین فتح کر کے ایک متمدن سلطنت کی بناڈالی تو آٹھ سو برسوں کے اثر نے اسپین کی ملی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کر دیئے، یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں، مگر اختلاف لب ولہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے، پروفیسر دوزی نے مدت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے، جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع کئے ہیں اور دکھلایا ہے کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیوں کر اختیار کی اور عربی میں ان کی اصلی صورت کیا تھی۔ افسوس ہے کہ یہ دونوں بےنظیر لغت فرنچ میں

ہیں اور ہم براہ راست ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے منتخبات:

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور جز قابل ذکر ہے، یورپ نے عربی علم وادب کے نہایت مفید منتخبات ترتیب دیئے ہیں اور ان منتخبات میں ادب کی بعض ان کتابوں کا انتخاب ہے، جو اس وقت تک چھپ کر شائع نہیں ہوئیں، اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیئے ہیں، بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کی ہیں، اس قسم کی چودہ کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں، جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لندن، برلن اور پیرس وغیرہ میں چھپی ہیں۔(183)

لغت دارجہ کی صرف ونحو:

آج کل جو عربی عام طور پر نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں، یورپ نے دارجہ کے بھی صرف ونحو لکھے ہیں اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔

سب سے پہلے کانس نامی مستشرق نے 1857ء میں دارجہ کی صرف ونحو لکھی اور اسپین میں چھپ کر شائع ہوئی، پھر دوبے نے لکھ کر وائنا سے شائع کی، اسی طرح 1890ء تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی۔

لغت دارجہ کے مجموعۂ امثال:

صرف ونحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو بھی جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں، یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے، اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعے الگ الگ ترتیب دیئے ہیں، مثلاً علامہ لینڈ برگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں، باوجو نے صرف مکہ معظمہ کے امثال ترتیب دیئے ہیں، ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع ''مجموعۂ امثال'' ترتیب دیا ہے، جس میں عام طور پر دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کیے ہیں۔

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں عرب کے مختلف خطوں میں مشہور ہیں، اور جن سے ان کے اخلاق وعادات اور طرز معاشرت کا پتہ چل سکتا ہے، جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو بھی نہایت تلاش سے جمع کیا ہے، اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔

1۔ سوسین کا مجموعۂ حکایات، جس میں موصل اور ماروین کی حکایتیں جمع کی ہیں، یہ رسالہ مضمون کی صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔

2۔ سبی نابیک کا مجموعہ، جو 1883ء میں لیڈن سے چھپ کر شائع ہوا۔

3۔ لینڈ برگ کا مجموعہ، جو 1888ء میں شائع ہوا۔(184)

فصل سوم

مولوی چراغ علیؒ

وسعت علمی:

مذہبی بحثوں میں سرسید کے دست راست مولوی چراغ علی تھے۔ وہ صوبجات متحدہ میں سرکاری ملازم تھے۔ پھر حیدرآباد بلا لئے گئے اور نواب اعظم یار جنگ کے خطاب سے شرفیاب ہوئے۔ مولوی صاحب ہندوستان کے فاضل ترین علماء میں سے تھے۔ اُن کے علم وفضل پر سرسید ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''متعدد علوم میں نہایت اعلےٰ درجے کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلےٰ درجے کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے''۔

متعدد اردو رسائل ومضامین کے علاوہ جو رسائل چراغ علی کے نام سے شائع ہوئے ہیں، مولوی صاحب نے دو اہم کتابیں انگریزی میں لکھیں، جن کا ترجمہ تحقیق جہاد اور اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام کے نام سے اردو میں شائع ہوا ہے۔

ان کتابوں میں جو چیز سب سے نمایاں ہے، وہ مولوی صاحب کی وسعت علمی ہے۔ ''رسائل چراغ علی'' کی پہلی جلد کے آخر میں جو فہرست مآخذ شائع ہوئی ہے، اُس میں تقریباً ایک سو چونسٹھ کتابوں کے نام درج ہیں، جن سے مولوی صاحب نے اپنے مضامین اخذ کئے ہیں، اور جو بیشتر عربی میں ہیں۔ اسی طرح اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام میں انہوں نے ایک پادری کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اسلام انسانی ترقی کا مانع ہے۔ انہوں نے مغربی مصنفین کے اتنے حوالے دیے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے کہ ہندوستان میں بیٹھ کر مولوی صاحب کو مغربی لٹریچر اور مغربی رسائل پر اتنا عبور کس طرح حاصل ہوگیا۔ انہوں نے اپنے دعوے کی تائید میں غالباً کوئی مفید مطلب بات نہیں چھوڑی اور آج بھی پاک وہند میں شاید ہی کوئی ایسا عالم ہوگا جسے اس مسئلے کی تفصیلات اور باریکیوں سے اتنی واقفیت ہو، جتنی مولوی صاحب مرحوم کو تھی۔ (185)

نمایاں خصوصیات:

تحقیق جہاد میں مولوی صاحب نے ثابت کیا ہے کہ رسول کریمؐ کی تمام جنگیں مدافعانہ تھیں اور صرف مدافعت ہی کے لئے جہاد جائز ہے۔ (186)

ریاست حیدرآباد کے انتظامیہ کے ملازم اور سید احمد خان کے خاص رفیق کار چراغ علی نے اپنے چند افکار کو عالمانہ پختگی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا لیکن اُن کا ذہن سید احمد خان کے دماغ کا پھیکا عکس نہ تھا۔ اس کا امکان زیادہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے متاثر تھے اور ان دونوں میں چراغ علی عہدنامہ قدیم اور عبرانی زبان سے زیادہ واقف تھے۔ 1870ء کے لگ بھگ سید احمد خان نے انجیل کے ان اجزا کے تشریحی نظریہ کی بہت تعریف کی جو دونوں کے خیال میں حضرت محمد ﷺ کے مبعوث ہونے کے متعلق یقیناً پیش گوئی کے حامل تھے۔ (187)

ان کا جدید پسندی کا رجحان اس بنیادی نقطہ کو پروان چڑھاتا ہے کہ قرآن، فطرت اور قوانین فطرت کے متعلق حوالہ جات سے بھرا پڑا ہے اور ایک فطری علم دین کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ (188)

اسلامی ثقافت دوسری ثقافتوں سے ممتاز ہے:

اسلامی ثقافت دوسری ثقافتوں سے اس لئے ممتاز ہے کہ اس نے چند ذہنی و دماغی تربیتوں کی نشوونما کی، مثلاً سوانحی لغات کی محتاط تحقیق وتدوین، مذہبی روایات کے مطالعہ کے لئے معقول تنقید کے اصول (روایت) جس سے مذہبی روایت کا مطالعہ ہو سکے اور ایک عالمانہ

تھر جس نے یونانی سائنس کی نئی تشریح کی اور یورپ کو ایسا جدلیاتی طریقہ کار پیش کیا جس پر موجودہ یورپی تہذیب کا دارومدار ہے۔ اسلامی ثقافت میں بھی اس طریق کار کو کٹر روایت پرستی نے بے جان و بے اثر کر دیا جسے ان کے خیال میں صدیوں سے فقہاء کے پاکیزہ فریب (حیل) پرورش کرتے رہے۔

بارھویں صدی سے لے کر انیسویں تک یورپ میں جو قرآن کا مطالعہ ہوتا رہا اس نے ان کو خاصی قابل تعریف واقفیت تھی۔ انہوں نے اس یکسانیت اور یورپ کی زبانوں میں قرآن کے تراجم کے اندر مصنوعی انتشار کے تاثر کی شدید تنقید کی۔ وہ نہ صرف یہ کہ ہر اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں جہاں مغرب کے قرآنی علم سے ہم آہنگی، تصدیق یا اس کے غلط نتائج کے ابطال کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بلکہ کلاسیکی اسلام میں اس قسم کے متضاد استنباط نتائج کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس طرح ایک عالمانہ ٹھوس منہاجیات کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔ (189)

ان کی تاویلی عذر خواہیوں کی بنیاد نہایت مضبوطی سے، گو پوری طرح ٹھوس نہ سہی، عہد نامہ قدیم اور قرآن شریف کے تقابلی مطالعہ پر قائم ہے۔ مثلاً ''جن'' کے وجود کے معاملہ میں جبکہ سید احمد خان محض اس نفسیاتی حالت سے مطمئن تھے کہ جنات طاغوتی قوتوں کے ذہنی مرقع تھے، چراغ علی نے بظاہر اور عملاً اس کی تاریخی تشریح کی کہ یہ جن بھی ایک قدیم سامی النسل قبیلہ تھا جو اُردن کی پہاڑیوں میں آباد تھا اور جسے حضرت سلیمان نے اپنی عبادت گاہ کی تعمیر میں لگایا تھا۔

بظاہر تاریخی و تاویلی رجحان کی یہ بے لگام گرم جوشی شدید خطرات کی حامل تھی، مثلاً کم سے کم ایک مقام پر چراغ علی، بالکل نادانستہ طور پر، قرآن کو کلام الٰہی کے بجائے حضرت محمد ﷺ کا کلام کہہ گئے ہیں:

''لیکن حضرت محمد ﷺ نے تعدد ازدواج کی بڑھتی ہوئی معصیت، جو عرب قوم میں عام تھی، انسداد کے لئے جو آخری اور موثر قدم اٹھایا وہ قرآن میں اُن کا یہ اعلان تھا کہ کوئی فرد بھی ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ عدل نہیں کر سکتا''۔ (190)

تاریخی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ کے کار منصبی کے متعلق چراغ علی کا بیان بنیادی طور پر اسلام کے ہمدرد علمائے مغرب مثلاً سر ہملٹن گب کی نگارشات سے مختلف نہیں ہے۔ وہ نبی کو اولاً ایک مصلح قرار دیتے ہیں س نے قدیم عربوں کے توہمات کی جگہ وحدانیت کو دے دی، عربوں اور دوسری اقوام کے اخلاقی معیار کو بلند کر دیا اور تعدد ازدواج کو محدود کر کے عورتوں کے مقدر کو بہتر بنا دیا۔ غلامی کی حوصلہ شکنی کی اور بچوں کے قتل کا انسداد کیا۔ (191)

اس سے زیادہ حیران کن امر یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی احادیث کے بیشتر حصہ کو جعلی انداز میں مسترد کیا ہے اور اس میں انہوں نے ان نتائج اور منہاجات کی پیش گوئی کی ہے جن تک مغرب میں گولڈ زیہر بعد میں پہنچا۔ (192)

چراغ علی قانون کے منبع اول یعنی قرآن کے علاوہ جس کی ان کے خیال میں از سر نو توضیح کی ضرورت ہے، تمام دوسرے منابع مسترد کر کے مسلم قانون کی کسی نئی اساس کے امکانات کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ یہ اساس انسان پرستانہ ہونی چاہیے، کیونکہ انسان آزاد اور معصوم پیدا ہوتا ہے لیکن بعد میں اپنے معاشرتی ماحول میں آلودۂ معصیت ہو جاتا ہے۔ اسلام میں ترقی پذیری کی صلاحیت ہے اور وہ اپنے گرد و پیش کے سماجی اور سیاسی انقلابات کی صورت میں خود کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کافی صلاحیت اور لچک رکھتا ہے۔ عالم مسلم شرع کا اسلام نہیں بلکہ وہ ایمان جس کی تعلیم خود قرآن دیتا ہے ترقی اور بہتری کے لئے تبدیلی کی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے اندر تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے ترقی کے مدارج طے کرنے، عقلیت پسندی اور نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کا اہم اصول ودیعت ہے۔ محمد ﷺ نے نہ کوئی ضابطۂ قانونی، سماجی یا دینی مرتب کیا اور نہ مسلمانوں کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے معاشرتی یا شریعت کے ضابطۂ قانون بنانے کا عمل لوگوں پر چھوڑ دیا تھا اور ایسے نظام قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی جو ان کے گرد و پیش ہونے والے سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں سے، وقت کے

تقاضے کے مطابق ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔ کلاسیکل اسلامی قانون بنیادی ور پر شریعت نہیں ہے بلکہ وہ عام رواجی قانون ہے۔ اس کے اندر ایام جاہلیت کے عربی اداروں کے باقی ماندہ اجزا و عناصر شامل وموجود ہیں یا وہ زبانی احادیث ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب کر دی گئی ہیں جن میں اکثر جعلی ہیں یا اس میں انسانیت کا خیال، عقل، عام فہمی اور اخلاقی صحت مندی اور سماجی آسانی کے اصول بھی شامل ہیں۔ (193)

اسلامی شریعت کی متحرک اساس پر پہنچنے کے بعد چراغ علی قرون وسطیٰ کے متنازع فیہ اداروں، مثلاً جہاد اور تعدد ازدواج کا تاریخی تناظر میں اخراج کر سکتے تھے جو جدید اسلام کی ترقی سے غیر متعلق تھا، لیکن اس کے برعکس انہوں نے سید احمد خان کے زیر اثر ان کی تشریح کرنے کے لئے نظری بنیاد پسندی کو آلۂ کار بنایا۔ وہ جہاد کو صرف مدافعتی مقاصد کے لئے جائز سمجھتے ہیں اور آرنلڈ کی طرح لین کی لغات کی جہاد سے متعلق، اس سے متخرج اور اس سے مربوط لسانی اصلاحات سے بڑا وسیع استفادہ کیا ہے۔ (194)

اخوان الصفاء کے نظریات میں ایک جدید پسند عنصر شامل کر کے یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے جن مغازی میں حصہ لیا وہ سب دفاعی نوعیت کے تھے۔ (195)

اور تاریخی تسلسل کی زبان میں حملہ کا آغاز مکہ کے مخالف قبائل کی جانب سے ہوا جو پیغمبر اسلام ﷺ کے متبعین کو مسلسل ایذا پہنچاتے رہتے تھے اور ان کی تذلیل کیا کرتے تھے۔ فوجی حکمت عملی کا تقاضا یہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد دشمن اور اس کے معاون بدوؤں کے خلاف یورش میں پہل کی جائے۔ مدینہ کے یہودیوں کے خلاف، ان کی دغابازی اور اندرون مدینہ جاسوسانہ سرگرمیوں کے سبب، تعزیری اقدامات کئے گئے۔ بہرکیف، پیغمبر ﷺ کے مغازی کو تاریخی حوادث سے تعبیر کرنا چاہئے جو خاص حالات سے متعلق اور جائز تھے۔ ان واقعات کے متعلق جو قرآنی آیات نازل ہوئی ہیں وہ صرف مخصوص مواقع اور حالات سے تعلق رکھتی ہیں اور انہیں بعد میں کسی شرعی نظریہ کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (196)

نظریہ جہاد اور چراغ علی:

اگرچہ جہاد کے متعلق چراغ علی کے خیالات کا بیشتر حصہ مغربی مستشرقین مثلاً میور، رابرٹس، اسمتھ، جارج سیل اور اسپرنگر یا خاص طور پر عیسائی مبلغین مثلاً ٹی۔ پی ہیوز، سوئیل گرین وغیرہ کے دلائل کے ابطال پر مشتمل ہے جنہیں وہ گمراہ کن سمجھتے تھے لیکن اسلام میں غلامی کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسلامی ہند کے روایتی علمائے مذہب کے خلاف ہے، خاص طور محمد عسکری کے اس اعتراض کے خلاف جو سید احمد خان کے اس نظریہ پر کیا تھا کہ قرآن نے ایک خاص موقع پر (47:5) نئے غلام بنانے کی قطعاً ممانعت کی ہے۔ (197)

عسکری کے الزام کے جواب میں چراغ علی نے سید احمد خان کے خیالات پر اضافہ کیا ہے اور ان کی تصدیق کی ہے۔ غلامی کے متعلق قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ عمل عربوں میں رائج تھا اور اس کے جواز میں کوئی حکم الٰہی موجود نہیں ہے اور نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے۔ غلاموں کی آزادی نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک ناگزیر فرض ہے۔ تاریخی اسلام میں بھی جہاں غلامی برقرار رہی اس کو قرآن نے نہیں بلکہ فقہاء نے سیاسی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا ہے لیکن غلاموں کے ساتھ سلوک جس فیاضانہ اور ہمدردانہ طور پر اسلام میں کیا جاتا ہے کسی اور ثقافت میں موجود نہیں ہے۔

تعدد ازدواج:

نجی اسلامی قانون کو دور جاہلیت کے عربوں کے رواج کی روشنی میں پرکھا جانا چاہئے جس میں بچوں کا قتل، غیر محدود تعدد ازدواج اور عورتوں سے ہر ممکن طریقہ سے جائز اور ناجائز تمتع حاصل کرنا عام تھا۔ قرآن نے بتدریج عورتوں کے مرتبہ کو بلند سے بلند تر بنا دیا اور تعدد ازدواج کو چار تک محدود کر دیا اور اسے بھی عدل کا پابند کر دیا جسے جنسی تعلقات میں محبت کا مترادف سمجھنا چاہئے اور اس طرح فی الواقع تعدد

ازدواج کا انسداد کر دیا۔ مرد کے لئے محبت میں عدل، بیک وقت ایک سے زیادہ عورت کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ اُسے اس شرو طا جازت کے ذریعہ نفسیاتی طور پر ناممکن العمل بنا دینا قرآن کے تعدد ازدواج کے انسداد کے بتدریج غیر محسوس طور پر عمل پیرا ہونے کا نسخہ سمجھنا چاہیے۔ فقہاء نے لفظی مفہوم اور روح قرآنی کو شرعی عمل سے دبا دیا اور وہ ابتدائی مشرقی روایاتی رسمیں جاری کر دیں جنہیں قرآن مذموم قرار دے چکا تھا۔ (198)

اسی طرح اسلامی قانون طلاق کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو قدیم عربی بے اعتدالیوں اور محرمات کے دور میں آنے والے عہدو پیمان کی بتدریج اصلاحات کا محتاج ہے۔ اس مرحلہ پر جو کچھ بھی کہا جا سکتا تھا اور وہ بھی کسی حد تک وہ یہ تھا کہ مرد کی بالا رادہ علیحدگی کی ابتدائی آزادی اور عورت کی اقتصادی حالت تحفظ کے لئے جہیز اور دیگر قانونی یا اخلاقی پابندی، طلاق دینے والے شوہر پر عائد کر دی جائیں۔ عربوں کے دور جاہلیت، یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام نے عورت کے ساتھ زیادہ فراخ دلانہ سلوک کیا۔

شریعت موسی، عبرانی عورتوں کے سماجی اور اخلاقی مرتبہ کو معقول حد تک بلند کرنے میں ناکام رہی اور عہد نامہ جدید نے ان کی دنیاوی عزت افزائی اور سربلندی کے لئے مقابلتاً کچھ نہیں کیا۔ مغرب میں عورت کی آزادی رومی قانون کا ورثہ ہے اور عیسائی ثقافت کا عنصر ہونے کے بجائے قدیم یونانی رواداری کا ایک جزو ہے۔ عیسائیت میں بنیادی گناہ کا مذہبی نظریہ قرون وسطی کے مغرب میں، عورتوں کی بے مثال ذلت اور اہانت کی وضاحت کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے عورت کے ساتھ احترام، شرافت اور مرحمت کا سلوک کیا۔ مسلمانوں کا قانون وراثت عورت کو اس کی اپنی جائیداد اور مقبوضات کی ملکیت کا پورا حق دیتا ہے جس کا برطانوی قانون سے موافقانہ موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے مرد کی برتری صرف اس کی فطری جسمانی صلاحیتوں کے معاملوں میں تسلیم کی ہے۔ (199)

فصل چہارم

سید امیر علی

پس منظر:

سر سید اور ان کے رفقاء کی ایک نمایاں خصوصیت مدافعانہ اور معذرت آمیز انداز بیان تھا۔ اُن کی تمام کوششیں دوسروں کے اعتراضات کا جواب دینے میں صرف ہوتیں اور اُن کی مذہبی تحریروں کا نصب العین یہی تھا کہ کسی طرح مذہب اسلام کو مغربی اصول اور مغربی خیالات کے مطابق ثابت کر دیں یا بنا دیں۔ کسی حد تک تو یہ اسلوب خیال سیاسی حالات کا نتیجہ تھا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اگر چہ سر سید کو مسلمانوں کے نقائص سے پوری واقفیت تھی، لیکن یورپ اور عیسائیت کے تاریک پہلو انہوں نے اچھی طرح نہ دیکھے تھے۔ اب اسلام کی صحیح ترجمانی کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اسلام سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ سر سید سے کم دماغی قابلیت نہ رکھتا ہو۔ دوسرے مذاہب اور یورپ کے ازمنۂ ماضیہ کی تاریخ اور موجودہ حالات سے پوری طرح خبردار ہو اور ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کا موازنہ کرے اور اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کرے۔

جس شخص میں اللہ نے یہ سب خوبیاں جمع کر دی تھیں اور جس نے ان خوبیوں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا، اس کا نام امیر علی تھا۔ (200)

احوال و آثار:

سید امیر علی 6 اپریل 1849ء کو بنگال کے ایک گاؤں چنسورہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید سعادت علی ایک دور اندیش بزرگ تھے۔ انہوں نے ہونہار بچے کو پوری تعلیم دی۔

سید امیر علی نے 1867ء میں یعنی علی گڑھ کالج کے قیام سے قریباً آٹھ سال پہلے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے دوران میں ان کے مربی بنگال کے قابل تعظیم بزرگ نواب محمد لطیف تھے۔ جنہوں نے 1863ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کا آغاز کر کے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے وہ کوشش شروع کی تھی، جسے سر سید اور ان کے رفقا نے زیادہ زرخیز زمین میں کامیابی کے زینے تک پہنچایا۔ نواب صاحب نے سید امیر علی میں خاص دلچسپی لی اور محسن فنڈ سے جس کے ٹرسٹی مولوی کرامت علی تھے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ بی۔ایل کی ڈگری خاص کامیابی کے ساتھ حاصل کی۔ (201)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں کلکتے میں، جو برطانوی سامراج کا دارالسلطنت تھا، حکومت وقت کے ساتھ موافقت واطاعت شعاری اور دانش میں مغربی ذہنیت کا حامل ایک آزاد مسلم مسلک معرض وجود میں آیا جو علی گڑھ تحریک سے الگ تھا لیکن 1870ء کے عشرے میں وہ اس سے بلاشبہ متاثر ہو چکا تھا۔ اسلامی جدیدیت کے کلکتوی مسلک کو آگے بڑھانے والوں میں خاص طور پر عبداللطیف خان کا نام آتا ہے جنہیں بعد میں کرامت علی جونپوری کی معیت بھی حاصل ہوگئی۔ امیر علی متوفی (1928ء) کرامت علی کے شاگرد اور ان ہی کی طرح راسخ العقیدہ شیعہ تھے۔ (202)

سر سید احمد خان کے سفر یورپ (70-1869ء) سے شہ پا کر وہ مزید قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے عازم انگلستان ہو گئے جہاں تُم پل ان میں بیرسٹری کرنے لگے۔ اس سے انہیں ممتاز کیریئر بنانے کا موقع مل گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ کلکتے میں چیف مجسٹریٹ، امپیریل لجسلیٹو کونسل آف انڈیا کے رکن، اور بنگال کے نظام عدل میں عدالت عالیہ کے جج ہو گئے، اور بالآخر لندن میں پریوی کونسل کی عدلیہ کمیٹی کے رکن بن گئے۔ اگر چہ وہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے رکن رکین کی حیثیت رکھتے تھے اور اپنے آخری ایام میں لندن میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے، جہاں برطانوی سیاسی لیڈروں سے اُن کے بڑے قریبی تعلقات تھے لیکن انیسویں صدی کے آخری عشروں اور بیسویں

صدی کے ابتدائی عشروں میں وہ اسلام کے صف اول کے مناظرہ کرنے والوں میں سے تھے، جیسا کہ حالی نے اشارہ کیا ہے کہ وہ مغربی اہل الرائے سے اسلام کی عذر خواہیوں اور توضیحات میں وہ اسلامی معاشرتی اور مذہبی خیالات کے ڈھانچے کی از سر نو تعمیر اور جدید خیالات کی ترویج میں سید احمد خان کے پیرو تھے۔ (203)

سید امیر علی 1873ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان واپس آئے اور کلکتے میں پریکٹس شروع کی۔ 1874ء میں وہ کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو منتخب ہوئے اور اس سے اگلے سال پریذیڈنسی کالج میں محمڈن لا (شرع اسلامی) کے پروفیسر ہو گئے۔

1876ء میں انہوں نے سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی، جس کے وہ پچیس سال سیکرٹری رہے۔ 1868ء میں گورنمنٹ نے انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ متعین کیا اور جلد ہی وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے عارضی طور پر چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ ہو گئے۔ لیکن یہ کام ان کے دوسرے مشاغل میں حارج تھا۔ 1881ء میں انہوں نے استعفےٰ دے دیا اور پھر پریکٹس شروع کی۔ 1883ء میں بنگال لیجسلیٹو کونسل کے رکن بنا دیئے گئے۔ وہاں انہوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے کام کیا۔ مختلف معزز اسامیوں پر مامور رہنے کے بعد 1890ء میں ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے۔ سید محمود کے بعد وہ پہلے مسلمان تھے جنہیں اس ممتاز عہدے کے لئے چنا گیا۔ 1904ء تک وہ ہائی کورٹ کے جج رہے اور پچپن سال کی عمر میں ملازمت ختم کر کے کچھ تو اپنے بچوں کی تعلیم کی نگرانی کے لئے اور کچھ انگریزی بیوی کی کشش سے، جو انگلستان کے ایک معزز گھرانے کی رکن اور لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی سالی تھیں۔ (204)

گویا امیر علی کا نام بھی سر سید کی طرح سرفہرست محسوس ہوتا ہے جو انگریز سے متاثر تھے اور اسلام پر ہونے والی موشگافیوں کا جواب دینے کے لئے بےتاب تھے۔ چنانچہ انگریزی زبان میں مہارت ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس کام کو اپنا بنیادی مقصد بنایا۔

روح اسلام کا تعارف:

ان کا اصل کام، یعنی تاریخ اسلام کو مغرب میں کھپت کے لئے از سر نو مرتب کرنا، بہر حال اپنی جگہ پر رہتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ قابل لحاظ حد تک اثر انداز ہوا۔ ان کی تصنیف ''اسپرٹ آف اسلام'' کے، جو انگلستان میں طبع ہوئی، 1922ء سے 1961ء تک نو ایڈیشن شائع ہوئے اور ان کی دوسری تصنیف ''شارٹ ہسٹری آف دی سیرسینز'' 1889ء اور 1961ء کے دوران تیرہ مرتبہ شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں کے اس سے بھی گہرے اثرات برصغیر اور مصر کے مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر پڑے۔

سید امیر علی کی شہرہ آفاق کتاب "Sprit of Islam" (روح اسلام) ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی، پانچ سو ضخیم صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پہلا حصہ آنحضرت ﷺ کی حیات مقدم اور دوسرا حصہ آپ ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی سیرت اور پیغام کے سلسلے میں قرآن کو اپنا ماخذ بنایا ہے، انہوں نے اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور اس کے عالمگیر اور آفاقی پیغام کا عیسائیت اور دیگر مذاہب سے موازنہ کرتے ہوئے اسلام کی فوقیت اور برتری کو علمی، عقلی اور تاریخی طور پر ثابت کیا ہے۔

روح اسلام کے دیباچہ میں سید امیر علی اس بات کی وضاحت نہیں کرتے ہیں کہ اس کتاب روح اسلام کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ:

پیغمبر اسلامؐ کے سوانح حیات اور رسالت کا جو خاکہ مَیں نے کھینچا ہے وہ کسی حد تک ابن ہشام کی سیرۃ الرسولؐ پر مبنی ہے، جس نے پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے قریباً دو سو سال بعد (213 ہجری مطابق 828029 عیسوی میں) وفات پائی اور کسی حد تک ابن الاثیر کی ضخیم تاریخ (الکامل) طبری کی تاریخ الامم والملوک، الحلبی کی انسان العیون (المعروف بہ سیرۃ الحلبیہ) اور دیگر کتابوں پر مبنی ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں دو نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے، ایک امامت پر اور دوسرا اسلام کی مثالی اور صوفیانہ روح پر مقدمے میں اور حصہ دوم کے دسویں باب میں بھی مزید مواد شامل کیا گیا ہے۔ میں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنے محترم دوست کیمبرج کے پروفیسر ای۔ جی براؤن کا، جن کا شمار مستشرقین کی

صف اول میں ہوتا ہے شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کتاب کے آخری باب پر ناقدانہ نظر ڈال کر مجھے اپنے بیش بہا مشوروں سے مستفید فرمایا۔ میں مسٹر محمد اقبال کا بھی، جو کیمبرج میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ریسرچ سکالر ہیں، ممنون ہوں کہ انہوں نے نہایت تن دہی سے کتاب کے پروف پڑھے اور اس کا اشاریہ بھی تیار کیا۔ اسی طرح میں مسٹر عبدالقیوم ملک کا شکر گزار رہوں کہ انہوں نے نئے ابواب کی عربی عبارات کو پریس کے لئے نقل کیا اور قرآنی حوالوں کی تصدیق کی۔ میں اپنے پبلشروں کا بھی ممنون ہوں کہ ایسی کتاب کی طباعت میں جو دقتیں لازمی طور پر پیش آتی ہیں ان کے باوجود وہ میرے ساتھ ہر وقت خوش خلقی اور تحمل سے پیش آئے۔

کتاب مصروفیتوں کے ایک بے پناہ ہجوم کے درمیان چھپی ہے۔ اس بنا پر میں قارئین سے مستدعی ہوں کہ اگر کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو وہ براہ کرم ان سے چشم پوشی کریں۔ (205)

روح اسلام کے مقدمے میں سید امیر علی لکھتے ہیں کہ:

نوع انسانی کی دینی ترقی میں جو تسلسل پایا جاتا ہے وہ ایک ایسا موضوع ہے جو انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ نفس انسانی کا تدریجاً ایک ہمہ گیر ذات، ایک محیط کائنات ارادے کو پہچاننا! اندھیرے میں بھٹکتے پھرنے کی جو زحمتیں کیا افراد اور کیا اقوام دونوں نے جھیلی ہیں، اس سے پیشتر کہ ان کے ذہنوں پر ایک ایسی روح مطلقہ کا تصور جلوہ گر ہوتا جو تمام موجودات میں جاری و ساری اور نظام فطرت کو قاعدہ و قانون کے سانچے میں ڈھالنے والی ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نہایت معنی خیز سبق حاصل ہوتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ جس عمل کے ذریعے نوع انسانی اشیائے مادی کی پرستش سے ترقی کر کے عبادت الٰہی تک پہنچی ہے وہ معرض تعویق میں پڑ گیا۔ اقوام اور افراد کثیر تعداد میں شاہراہ ترقی سے منحرف ہو گئے اور اپنی خواہشات نفسانی کے غول راہ کا دھوکا کھا کر اپنے عہد طفولیت کے بتوں کی طرف لوٹ گئے جو محض ان کے جذبات کے تراشے ہوئے مجسمے تھے لیکن خدا کی آواز، چاہے کوئی اسے سنتا یا نہ سنتا، ہمیشہ دعوت حق دیتی رہتی ہے اور وقت آنے پر اس کے بندگان خاص نے اٹھ کر اعلان کیا ہے کہ انسان پر دوسرے انسانوں کی طرف سے اور اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ بندگان خاص خدا کے حقیقی پیغمبر تھے۔ وہ اپنی قوموں میں اپنے وقت کی پکار بن کر آئے، جس میں سچائی، پاکبازی اور انصاف کے وہ تمام ولولے تڑپ رہے تھے جو روح انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے روحانی تقاضوں کا ترجمان تھا۔ ہر ایک اس لئے آیا کہ ایک گری ہوئی قوم کو سدھارے، نکھارے اور ابھارے اور ایک بگڑی ہوئی مملکت کو بنائے۔ بعض ایک محدود تمدن کی تعلیم دینے کے لئے آئے، جو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محصور رہا۔ دوسرے ایک عالمگیر پیغام لے کر آئے، ایک ایسا پیغام جو کسی ایک نسل یا قوم کے لئے نہ تھا، بلکہ ساری نوع بشر کے لئے۔ محمد صلعم کا شمار موخرالذکر زمرے میں ہوتا ہے۔ آپ کا پیغام صرف عربوں کے لئے نہ تھا۔ آپ صرف ایک زمانے یا ملک کے لئے مبعوث نہ ہوئے تھے، بلکہ سارے بنی آدم کے لئے، اس دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنے بندگان خدا ہیں ان سب کے لئے۔ اس معلم اعظم کا ظہور، جس کے سوانح حیات اس کی بعثت کے لمحہ سے لے کر آخیر تک مصدقہ طور پر قلم بند ہو چکے ہیں، محض ایک اتفاقی حادثہ یا تاریخ عالم کے حاشیے پر لکھا ہوا ایک غیر متعلق اور ضمنی واقعہ نہ تھا۔ وہ اسباب، وہ زبان حال سے پکارتی ہوئی خرابیاں ساری کائنات میں جاری و ساری ایک قدرت مطلقہ پر یقین محکم پیدا کرنے کے وہ اندرونی داعیے جو قیصر آگسٹس کے زمانے میں گلیلی کے کنارے ایک ایسے پیغمبر کو وجود میں لائے تھے جس کی زندگی ایک المیہ تھی، وہی ساتویں صدی عیسوی میں دوبارہ بروئے کار آئے، اور اب کی پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جیسا کہ بجا طور پر کہا گیا ہے، ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا۔ اس میں جو مظاہر رونما ہوئے وہ ویسے ہی تھے جیسے مثبت ایمان وایقان کے کسی نئی صورت میں جلوہ گر ہونے کا باعث بنتے ہیں، تاکہ آوارہ و سرگرداں قوتوں کو مذہبی ارتقاء کے اس ناگزیر راستے پر لایا جائے جس کی منزل مقصود ذاتی عبادت کی تکمیل و تنظیم ہے۔ یہ تمام مظاہر اس پر دلالت کر رہے تھے کہ یہودیت یا عیسائیت نے خدا کی مملکت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس

سے کسی زیادہ مربوط مرقع کا صورت پذیر کیا جانا ضروری تھا۔ زرتشت، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسٰی نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لو انسانی خون کے چھینٹوں سے بجھائی جا چکی تھی۔ ایک بگڑی ہوئی زرتشتیت نے اور ایک اس سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی عیسائیت نے جو ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں، انسانی ضمیر کی ناطقہ بندی کر رکھی تھی اور کرۂ ارض کے بعض شاداب ترین خطوں کو لہو کی ندیوں کا سنگھم بنا رکھا تھا۔ بالادستی کی خاطر مسلسل رزم آرائیوں، دائمی خانہ جنگیوں اور مذہبوں اور فرقوں کی لگاتار چپقلشوں نے قوموں کا خونِ زندگی نچوڑ لیا تھا اور روئے زمین کے باشندے جو ایک بے جان مشائخ پرستی کی آہنی ایڑیوں سے کچلے جا رہے تھے، خدا سے اپنے آقاؤں کے مظالم کی فریاد کر رہے تھے۔ (206)

سر سید امیر علی کی قانونی اور تاریخی کتابیں بہت قابل قدر ہیں، لیکن اُن کا شاہکار اُن کی مشہور کتاب سپرٹ آف اسلام ہے۔

سید صاحب نے اس موضوع پر ایک کتاب اُسی زمانے میں لکھی تھی جب وہ حصول تعلیم کے لئے انگلستان میں مقیم تھے۔ یہ کتاب 1873ء میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی، لیکن بعد میں انہوں نے بہت اضافہ کیا اور انتقال سے چند سال پہلے سپرٹ آف اسلام کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا جو تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ سید صاحب نے اسلام کے متعلق انگریزی میں کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً ایک مختصر رسالہ اسلام اور اخلاقیات اسلام لیکن ان کی شہرت زیادہ تر سپرٹ آف اسلام پر مبنی ہے، جو رسول کریمؐ کی زندگی اور تعلیمات پر بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

سید امیر علی نے اس کتاب میں سر سید کی طرح اسلام کی آزادانہ ترجمانی کی ہے اور کئی اہم مسائل مثلاً غلامی، تعدد ازدواج اور معجزات وغیرہ کے متعلق وہی رائے ظاہر کی ہے جو سر سید کی تھی، لیکن سید امیر علی کی کتاب کو سر سید کے انگریزی خطبات پر کئی لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ سر سید کی کتاب نامکمل ہے اور سپرٹ آف اسلام ایک جامع اور مکمل کتاب ہے۔ اس کے علاوہ سر سید کے خطبات اردو سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ اس لئے زورِ عبارت اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے وہ سپرٹ آف اسلام سے کسی قدر پست ہیں، لیکن اہم ترین فرق جو سید امیر علی کی تصنیفات کو سر سید کی تصنیفات پر فوقیت دیتا ہے، اول الذکر کی وہ واقفیت ہے جو انہیں عیسائی، یہودی و ہندو مذاہب اور مسیحی ممالک کی تاریخ سے تھی۔ اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کرتے ہوئے اس واقفیت کا استعمال انہوں نے بڑی قابلیت سے کیا ہے۔ سر سید میں قابلیت اور حمیت اسلامی کی کمی نہ تھی، لیکن مسیحیت اور یورپ کی تاریخ، بالخصوص اس کے ناخوشگوار پہلوؤں سے انہیں پوری واقفیت نہ تھی۔ وہ یورپ کی کوئی زبان نہ جانتے تھے اور قیام انگلستان کے دوران میں انہیں وہاں کی اچھی چیزیں ہی نظر آئیں۔ سید امیر علی کو مسیحیت اور یورپ کی تاریخ سے خوب واقفیت تھی۔ اُن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ یورپ میں گزرا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر عیسائی مورخین اسلام بزور شمشیر پھیلنے کا غلط الزام لگاتے ہیں تو مسیحیت کی خونیں تاریخ کو بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ کانسٹنٹائن نے مسیحیت کی حمایت میں جس طرح تلوار اٹھائی اور اندلس کے مسلمان یا بیت المقدس کے مسلمان شہری مختلف وقتوں میں جس بے رحمی سے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے وہ بھی دنیا کو خوب معلوم ہے۔ اسی طرح اگر رسول کریمؐ کے چند مشہور معجزات کو خلاف عقل کہا جا سکتا ہے تو مسیحیت کی تو بنیاد ہی ایسے عقائد پر ہے جو عقل سے بعید ہیں۔

سید امیر علی نے تقلید سلف سے آزاد ہو کر اسلام کی ترجمانی کی۔ رسول اکرمؐ کی زندگی کے واقعات میں صرف معتبر روایات کو لیا اور اسلام کی روح کو آشکار کرنے کے لئے سب سے زیادہ زور قرآن پر دیا اور پھر مسیحیت اور دوسرے مذاہب سے اسلام کی تعلیمات کا مقابلہ کر کے اسلام کی فوقیت اس ناقابل تردید طریقے سے بتائی کہ مخالفین کو بھی اس کی صحت کا اقرار کرنا پڑا۔ ایک انگریز مستشرق نے "سپرٹ آف اسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام کی اس سے بہتر تصویر کھینچنا ناممکن ہے۔ اور جو کچھ اسلام کے حق میں کہا جا سکتا ہے، امیر علی نے کہہ دیا ہے۔ اس بات سے تو ہم متفق نہیں کہ مستقبل میں بھی اس مضمون پر اس سے بہتر کتاب کوئی نہیں لکھی جائے گی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ آج تک اس موضوع پر اس پائے کی اور کتاب کوئی نہیں لکھی گئی اور جہاں تک اسلام اور دوسرے مذاہب کے موازنے اور اسلام کے خلاف اعتراضات کے جوابات کا تعلق ہے اس سے زیادہ جامع اور مدلل کتاب آج تک نہ کسی عرب نے لکھی ہے نہ مصری نے۔ اور سید امیر علی کا یہ علمی کارنامہ ایسا

ہے، جس پر برصغیر کے تمام مسلمان فخر کر سکتے ہیں۔ (207)

وہ اپنے راسخ شیعی عقائد میں بہت پختہ تھے اور اسی بنا پر مکتبہ علی گڑھ کے مؤرخوں اور مفکروں سے مختلف تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے سنی تاریخی اسلام کی عظمت کو دوبالا کرنے کے لئے قابل لحاظ وسیع القلبی سے کام لیا۔ ''دی سپرٹ آف اسلام'' نے شیعہ حکمران خاندانوں مثلاً آل بویہ اور فاطمیوں نے جو ثقافتی خدمات انجام دی ہیں کسی حد تک ان کو اچھالا اور ان کے نقش ونگار کو ابھارا ہے لیکن ''ہسٹری آف دی سیریسنز'' میں پورا زور سنی خلافت پر صرف کیا گیا ہے۔ وہ پہلے دو خلفا حضرت ابوبکرؓ اور بالخصوص حضرت عمرؓ کے بہت مداح ہیں، حالانکہ ہندوستانی شیعیت خاص طور پر حضرت عمرؓ کے خلاف رجحانات کی حامل ہے اور اس کے باوجود امیر علی کا یہ ایمان ہے کہ پیغمبر ﷺ کے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین قرار دینے کے احکامات بالکل صاف اور غیر مبہم اور واضح ہیں۔ یہیں سے انہوں نے شیعی تصور رسولی امامت اور حضرت علیؓ کے پیشرو تین خلفاء راشدین کی منتہی خلافت میں امتیاز قائم کیا یعنی امامی خلافت اور پیغمبرانہ خلافت نہ صرف یہ کہ پہلو بہ پہلو قائم رہ سکتی ہے اور متضاد سمتوں میں عمل کر سکتی ہیں بلکہ اول الذکر، ثانی الذکر کو مشورہ دے سکتی اور اس کی تائید کر سکتی ہے۔ امیر علی سنیوں کے اسی نقطۂ نگاہ کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ واقعی پہلے دو خلفاء کے مشیر تھے اور 656ء میں جب وہ خلافت کے منصب پر قائم ہوئے تو خلافت ''پیغمبرانہ'' اور ''پاپائی'' خلافت کی جملہ اقسام ان کی ذات میں جمع اور مدغم ہو گئیں''۔ وہ شیعوں کی اس روایاتی تنقید کے خلاف تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرت ﷺ کا جانشین بنانے میں عجلت سے کام لیا گیا تھا اور اسے علت غائی کی بنیادوں پر جائز سمجھتے تھے۔ انہیں اسباب کی بنا پر وہ اس امر پر مُصر ہیں کہ حضرت علیؓ خود اپنے حق اور دعویٰ خلافت سے کریم الاخلاقی سے دست بردار ہو گئے اور مسلم قوم کی سالمیت اور اتحاد کے تحفظ کے لئے حضرت ابوبکرؓ کے معاون و مددگار ہو گئے۔ (208)

اور اس طرح راسخ شیعی عقیدہ کے علی الرغم وہ نہ صرف یہ کہ سنی اور شیعہ اسلام کے سب سے زیادہ متنازعہ فیہ نقطہ یعنی پیغمبر ﷺ کی جانشینی کے متعلق ایک صلح کارانہ نظریہ کا استنباط کر سکے بلکہ اس کا دائرہ 1924ء میں اپنے زمانے کی خلافت عثمانیہ تک وسیع کر دیا۔ شیعہ ہونے کی حیثیت سے وہ امام منتظر، امام محمد مہدی غائب کو ''پیغمبرانہ'' امام مان سکتے تھے۔ وہ شاہ ایران سے فرقہ وارانہ تعلق کی کشش محسوس کر سکتے تھے لیکن وہ عثمانیہ خلیفہ کو نہ صرف سنیوں کا دینی پیشوا خیال کرتے تھے بلکہ تمام مسلم قوم کا خلیفہ اور دینی پیشوا بھی سمجھتے تھے۔ (209)

اخلاقیات کی مرکزی اہمیت کے مقابلہ میں اسلامی مابعدالطبعیات یا علم کائنات یا علم ملائکہ پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے ''بے یقینی کو اختیارانہ معلق کر دینے کی حالت'' میں منتقل کر دینا چاہیے۔ اس ضمن میں وہ سید احمد خان کی مبالغہ آمیز خیالی عقلیت پسندی کے برخلاف عیسائی انفعالیت وعذر خواہی کی روایات پر اعتماد کر کے نیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ غالباً محمد ﷺ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے معلمین کی طرح، خدا کی جانب سے انسان کے پاس پیغام پہنچانے والی رابطہ کی ہستیوں کے قائل تھے۔ عہد حاضر میں ملائکہ کے وجود سے انکار ہمارے اسلاف کے تصورات سے تمسخر کا جواز پیش نہیں کرتا۔ ان کے ایقان کی طرح ہماری بے یقینی کو بھی تو ہم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ صرف ایک منفی ہے اور دوسرا مثبت۔ موجودہ دور میں ہم جنہیں اصول فطرت قرار دیتے ہیں، ہمارے اسلاف انہیں ملائک اور آسمانی معاون سے موسوم کرتے ہیں۔ بقول لاک کے آیا خدا اور انسان کے مابین رابطہ پیدا کرنے والی ہستیوں کا وجود ہے؟ بعینہٖ جیسے انسان اور جاندار مخلوق کے پست ترین طبقہ کے درمیان رابطہ کی ہستیاں موجود ہیں، یہ سوال اتنا دقیق ہے کہ عقل انسانی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ (210)

شیطان کی شناخت کا مسئلہ جو کائناتی ہونے سے زیادہ اخلاقی ہے، بہت ہی زیادہ پیچیدہ ہے اور یہاں امیر علی کی آواز سید احمد خان کے نظریات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے اگرچہ واضح تاریخی تناظر میں زیادہ روشن اور مبرہن ہے۔

چنانچہ اس مسئلہ پر ای۔ رینن Vie de Jesus میں رقمطراز ہیں:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت عیسیٰ کی طرح شاید اصول شر کے وجود پر بطور ایک نجی وجود کے یقین رکھتے تھے لیکن اُن کے الفاظ

کی تحلیل سے ایک زیادہ عاقلانہ عنصر، ایک داخلی تصور ایسی زبان کے جامے میں نظر آتا ہے جو ان کے پیروؤں کے لئے قابل فہم تھا۔ جب کسی نے اُن سے پوچھا کہ شیطان رہتا کہاں ہے تو اُنہوں نے جواب دیا قلب انسان میں، لیکن مسیحی مسلک نے اس فریبی (مکار) کو، جس نے حضرت عیسیٰ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی، دوزخ کا سچ مچ کا شاہزادہ بنادیا"۔(211)

امیر علی کا ذہنی نشو و ارتقاء اگر چہ "مغربیت" اور "جدیدیت" کے ماحول میں ہوا اور انہوں نے "اسلامی جدیدیت" کے تصور کو آگے بڑھایا اور وہ کرامت علی جونپوری کے شاگرد اور سید احمد خان کے رفیق تھے اور برطانوی سیاسی لیڈروں سے بھی قریبی تعلقات تھے(212)

تاہم امیر علی نے مغربی اہل الرائے سے اسلام کی عذر خواہیوں اور توضیحات میں اور اسلامی معاشرتی اور مذہبی خیالات کے ڈھانچے کی از سر نو تعمیر اور جدید خیالات کی ترویج میں سید احمد خان کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

سید امیر علی مکتبہ علی گڑھ کے جدید پسند انتہا پسندوں کی طرح احکام الٰہی کو تاریخی طور پر صرف پیغمبر اسلام کے وقت اور زمانوں کے مطابق سمجھتے ہیں۔ وہ اسپرٹ آف اسلام میں لکھتے ہیں "یہ فرض کر لینا کہ ہر اسلامی شعار کا غیر تغیر پذیر ہونا لازمی ہے تاریخ کے ساتھ اور انسانی ذہن کی ترقی کے لئے سراسر ناانصافی ہے۔

ایک ممتاز قانون دان کی حیثیت سے امیر علی کو قرآن، سیرت نبوی اور حدیث سے ایک گونہ تعلق اس لئے تھا کہ وہ شریعت اسلامیہ کو مسلم تاریخ کی از سر نو تعمیر میں بطور مواد استعمال میں لانے کے خواہش مند تھے۔ انیسویں صدی کے عیسائی مناظرہ کرنے والوں کے مانند نہ تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ابتدائی سیرت نگاروں مثلاً ابن اسحاق کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ مسترد کرتے ہیں بلکہ اُن کی تصانیف سے صرف وہی مواد اخذ کرتے ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ کا ایسا مرقع پیش کرنے میں معاون ثابت ہو جو جدید دور کے عظمتِ انسانی کے مغربی تصورات سے ہم آہنگ ہو۔ اکثر مغربی سیرت نگاروں کی طرح وہ بھی حضرت محمد ﷺ کی دو جداگانہ حیثیتوں یعنی پیغمبر اور مدبر ہونے کی دوسری شخصیت کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ کی حیات طیبہ اور انتظامی امور کی امیر علی نے ایک فہرست مرتب کی ہے جس میں انہوں نے فیصلوں کو بجائے پیغمبرانہ ہونے کے مدبرانہ گردانا ہے، خاص خاص مواقع پر آپ کے فیصلوں کے پیش نظر آپ کی حیات (طیبہ) اور ذہن (مبارک) کی اہمیت کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کا اندازہ آپ کے گہرے شعور و فراست کی خلاق قوت محرکہ سے لگایا جاسکتا ہے جو موجودہ عالمی حالات میں مسلمانوں کی راہنمائی کرسکتی ہے:

"اس غیر معمولی معلم محمد ﷺ کا ذہن اپنی دانش و فطانت اور ترقی پذیر آدرشوں میں، خصوصیت کے ساتھ جدید تھا۔ "ابدی سعی"، آپ کی تعلیمات میں انسانی وجد کے لئے لازمی تھی"۔ انسانی جہد مسلسل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

السعی منی و الاتمام من اللہ (کوششیں اپنی طرف سے اور اس کی تکمیل خدا کے ہاتھوں)"۔(213)

عیسائی مناظرین کی حرف گیریوں سے حضرت محمد ﷺ کو بحیثیت پیغمبر اور مدبر مدافعت کے لئے امیر علی کی ترکیب یہ تھی کہ مدافعت کرتے کرتے وہ جارحانہ روش اختیار کر لیتے تھے۔ یہ تکنیک سید احمد خان کی مذہبی تکثیریت کے بالکل متضاد تھی۔ امیر علی بار بار حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں تاکہ مؤخر الذکر کی تاریخی تناظر میں فوقیت ثابت کرسکیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی اگرچہ بدیر لیکن اُن کے ہم عصروں میں مقبولیت حاصل کرنے اور حضرت عیسیٰ ؑ اُن کے اعزہ واقارب کی جانب سے استرداد کا موازنہ کرتے تھے:

"حضرت مسیح کا اپنا ذاتی اثر اپنے قریب ترین اعزہ پر سب سے کم تھا۔ ان کے بھائیوں نے کبھی ان پر یقین نہیں کیا۔ ایک مرتبہ تو ان کو جسمانی طور پر قابو کرنے کی اس یقین کے ساتھ کوشش کی کہ وہ مجنوں ہیں۔ ان کے خاص تلامذہ بھی اپنے عقیدہ میں متزلزل تھے۔ عین ممکن ہے کہ ان کی یہ غیر استقامتی ان کے کردار کی کمزوری کے باعث ہو یا پھر جیسا کہ مسلمان کا خیال ہے حضرت مسیح کے تلون طرز گفتگو کی وجہ

سے ہو۔ بہر کیف یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے۔ حضرت محمد ﷺ سے ان کے قریبی اصحاب کی گرویدگی ان کے خلوص اور متعینہ مقصد میں کامل انہماک کا انتہائی نجیبانہ ثبوت ہے''۔(214)

عیسائیت نامکمل مذہب رہا کیونکہ حضرت مسیحؑ کی حیات بہت جلد منقطع ہوگئی تھی اور ان کے پیغام کی تکمیل حضرت محمد ﷺ کی ذات بابرکات سے ہوئی۔

''ایک امر یقینی ہے کہ اگر ان کو (مسیحؑ) زیادہ طویل وقفۂ حیات ملتا تو وہ اپنی تعلیمات کو زیادہ منظم بنیاد پر استوار کرتے۔ عیسائیت میں یہ بنیادی سقم، فی الواقع، کونسلوں کے اجتماع اور اصول واذعانی عقائد کے استحکام کے لئے اجلاس کے انعقاد کی وجہ سے پیدا ہوا جو خفیف سے خفیف آزادی فکر اور ذرا سے تعقل سے پارہ پارہ ہوجاتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کا کام ادھورا رہ گیا اور یہ ایک دوسرے معلم (محمد ﷺ) کے لئے مختص ہوگیا کہ وہ اصول وقوانین اخلاق کو منظم کریں''۔(215)

لہٰذا اسلام عیسائیت کے تسلسل، قبولیت اور تکمیل ہے۔ اسلامی روحیت اس فراریت اور رہبانیت کی اصلاح کرتی اور اسے متوازن بناتی ہے جسے عیسائیت نے مثالی بنا رکھا تھا۔(216) تاریخی اسلام کے خلاف عیسائی یا مغربی مبارزین مناظرہ کے جواب میں انہوں نے تاریخی مسیحیت کے خلاف نہایت تیز وتند حملے کیے ہیں۔

''شاہزادۂ امن (عیسیٰؑ) کے پیروؤں نے ابتدا سے آج تک بوڑھے، جوان، مرد وعورت کو بے دریغ قتل کیا اور غارت گری، لوٹنا جلانا ان کا شیوہ رہا اور ہے۔ اور اس کرۂ ارض پر اُن کے نائب پوپ، بطریق، اسقف، پادری اور بزرگان کیسا، ان مسیحیوں کے جُرموں کی منظوری دیتے رہے اور اکثر ان کے بدترین گناہوں اور جرموں کی مکمل معافی اور پاداش سے نجات کا اعلان کرتے رہے''۔(217)

انسانی تہذیب کی تاریخ کا بڑا المیہ عربوں کی دو معاملوں میں ناکامیابی کی وجہ سے ہوا۔ اول یہ کہ انہوں نے مکمل طور پر عیسائیت کو مغلوب نہیں کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کا دنیا کو مہذب بنانے کا مشن ناکامیاب ہوگیا۔

''عربوں کی دو ناکامیوں نے، پہلی قسطنطنیہ کے سامنے اور دوسری فرانس میں، دنیا کی ترقی کو مدتوں کے لئے روک دیا اور صدیوں کے لئے گھڑی کی سُوئی معکوس سمت میں گردش کرنے لگی نشاۃ الثانیہ تہذیب اور ذہنی آزادی کی نشوونما کم سے کم سات سو سال آگے بڑھ چکی ہوتی۔ ہم کو البیجیوں اور ہوجیناٹوں کے قتل عام پر لرزہ بر اندام نہ ہونا پڑتا اور نہ ٹیوڈروں اور پراکٹریٹ کے ماتحت انگریز پروٹسٹنٹ، آئرلینڈ کے کیتھلکوں کے بھیانک کُشت وخون پر کپکپاہٹ طاری ہوتی۔ نہ ہمیں کسی بدنویا سرویٹس کی بدنصیبی پر ماتم گُسار ہونے کی ضرورت پڑتی۔ آٹو ڈافے کی تاریخ انکویزیشن کے قتل عام، ایزٹکس اور انکاس کے قتلہائے عام وجنگ تیس سالہ کا قصہ مع اپنی گوناگوں تباہیوں کے یہ سب ان کی داستانیں رہ جاتیں۔ اگر مسلمہ قسطنطنیہ فتح کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو وہ تمام سیاہ اعمال آشوریوں، کامٹیوں اور پالکوجیوں کی تاریخ کو داغدار نہ کرتے۔ رومیوں کے بازنطین کی گرفتاری کے خوفناک نتائج سامنے نہ آتے اور ان سب سے بڑھ کر ان ناپاک جنگوں کا پھوٹ پڑنا جن میں مسیحی یورپ نے ایشیائی قوموں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی شاید کبھی رونما نہ ہوتیں بت شکنی کی تحریک بے نتیجہ ثابت نہ ہوتی اور مسیحی کیسا کا عمل اصلاح صدیوں پہلے مکمل ہوچکا ہوتا''۔(218)

بین الاقوامی اخلاقیات سے مکمل بے اعتنائی رومی ورثہ تھا جس کو تاریخی مسیحیت نہ بدل سکتی تھی اور نہ اس کی تطہیر کرسکتی تھی۔ برعکس اس کے مسیحی کلیسہ نے غارت گر بین الاقوامی بد اخلاقی کا عمل پورے ایک ہزار سال سے زیادہ تک اپنائے رکھا۔

''کیسا کی اجازت سے شارلمین کے پہلے قتل عام سے لے کر بے ضرر امریکی اقوام کے قتل عام اور غلامی تک بین الاقوامی فرائض اور انسانیت کے دعاوی کی خلاف ورزیوں کا مستقل اور ناقابل شکست سلسلہ آج تک جاری ہے انگلستان میں پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لینے کے بعد بزرگان کیسا کے قید کرنے، داغنے، ہاتھ پاؤں توڑنے، جلانے اور شکنجوں میں کسنے کا سلسلہ کئی حکومتوں تک جاری رہا۔ اسکاٹ لینڈ

میں ان لوگوں کا، مجرموں کی طرح، پہاڑوں پر شکار کیا جاتا تھا۔ ان کے کان جڑ سے اکھاڑ لئے جاتے تھے، گرم لوہے کی سلاخوں سے ان کو داغا جاتا تھا اور اُن کی انگلیاں زنبور کے ذریعہ اکھاڑ کر الگ کر دی جاتی تھیں اور ان کی ٹانگوں کی ہڈیاں جوتوں کے اندر چُور چُور کر دی جاتی تھیں اور آج بھی مسیحی امریکہ میں ایک عیسائی نیگرو کو عیسائی سفید فام عورت کے ساتھ شادی کرنے کے جرم میں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ اثرات جو عیسائیت نے پیدا کئے''۔ (219)

اس زبردست حملہ نے امیر علی کے لئے تاریخی اسلام کی معذرت خواہانہ مدافعت کو آسان تر بنا دیا۔ تاریخ اسلام کے بیشتر حصے میں ان کا یہی طریق نظر برابر کارفرما رہا، بجز چند مستثنیات کے، مثلاً المتوکل کے امتیازات کے بارے میں جو اسی نقطۂ نظر کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اسلام نے خلوت پسندی اور تنگ نظری کا ابطال کیا ہے۔ اس نے اپنے درمیان دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو ضمیر کی آزادی اور طریق عبادت کی پوری اجازت دی ہے۔ اس کے مختلف فرقوں اور طبقۂ اعلیٰ نے مذہب اور سیاست میں رواداری کی تبلیغ کی ہے۔ ہر مذہب اپنے دورِ فعال میں کسی نہ کسی منزل میں اپنے متبعین کے رجحانات کے باعث متشدد ہوتا ہے۔ اسلام کے ساتھ بھی یہی صورت رہی۔ عیسائیت میں عقیدہ کا فرق ایک جرم ہے مگر اسلام میں اس کی نوعیت محض ایک حادثہ کی ہے۔ اگر اسلام میں سیاسی امتیازی شقوں کے متعلق کسی نوع کے تصورات ہیں بھی تو وہ ملاؤں کے حیلہ ہائے شرعی ہیں جو ''مفاد پرست'' سازشی سرداروں کے عزائم کے آئینہ دار ہیں۔ دارالسلام اور دارالحرب کے تصورات اسی نوع کے ہیں لیکن یہ تصورات محض عیسائیوں کی عیسائیت اور کفر کے تصورات کے علی الرغم خیالات ہیں۔ (220)

اس سے اسلام میں عام طور پر ذمیوں کا سوال زیر بحث آ جاتا ہے۔ اسی نقطہ پر عیسائی مناظرہ طلب جماعت کے گزیدہ امیر علی پہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کے خلاف مواد سے اپنے دلائل منتخب کئے ہیں۔ وہ ان تاریخی حقائق کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہیں جو المتوکل نے غیر منصفانہ قوانین غیر مسلموں کے لئے وضع کئے ہیں، لیکن انہیں بھی وہ المتوکل کی ذاتی خباثت اور تعصب کی پیداوار سمجھتے ہیں اور یہ ایک ایسا نقطۂ نگاہ تھا جسے امیر علی بحیثیت شیعہ المتوکل کی ذمیوں کے خلاف قانون سازی سے مربوط کر سکتے تھے وہ اس نے حضرت پیغمبر ﷺ کے نواسے حسینؓ ابن علیؓ کے مقبرے کو غول بیابانی کی طرح مسمار کر دیا، معتزلین کو قتل کیا اور خود عیاشیانہ اور غیر اخلاقی زندگی بسر کی۔ (221)

مسئلہ غلامی اور امیر علی کا موقف:

جہاں تک غلامی کے سوال اور اس کی اسلام میں حوصلہ شکنی کا تعلق ہے امیر علی کا مؤقف وہی ہے جو سید احمد خان اور چراغ علی کا تھا۔

لیکن امیر علی کا مناظرانہ انداز استدلال غلامی کے سوال کو نسلی رواداری سے منطبق کرتا ہے جب کہ اسلامی تہذیب، دورِ متوسط اور موجودہ یورپ کی عیسائیت کے مقابلہ میں زیادہ قابل قدر اور موثر ہو سکتی ہے۔ اسلام میں آج کا غلام کل کا وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وہ بغیر تامل یا ناگواری کے اپنے آقا کی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے اور خاندان کا سربراہ بن سکتا ہے۔ کیا عیسائیت کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے؟ اس تاریخی جائزے میں عباسیوں کے خلاف زنگیوں کی بغاوت (870-883ء) اور ان کی پوشیدہ اقتصادی اور سماجی تحریک بڑی آسانی سے نظر انداز کی گئی ہے۔ (222)

تعدد ازدواج اور امیر علی کا موقف:

تعدد ازدواج اور اسلام میں عورت کے مقام کے الجھے ہوئے مسئلہ کی جانب توجہ منعطف کرتے ہوئے انہوں نے عورت سے متعلق مسیحی راہبانہ نقطۂ نظر سے اپنے حملہ کا آغاز کیا ہے کہ شہوانیت مسیحی راہبانہ نقطۂ نگاہ سے خاص طور پر ایک معصیت ہے چنانچہ اس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ مطلق جواز۔ (223)

تاریخی عیسائیت میں طبقۂ نسواں پر جو غیر انسانی مظالم کئے گئے اور جن ذلتوں کا ان کو تختۂ مشق بنایا گیا رہبانیت ان کی وضاحت کرتی ہے۔ عیسائیت اور طبقۂ نسواں کے باہم تعلق کے بارے میں جتنا کم سے کم کہا جائے بہتر ہے۔ ابتدائی ادوار میں جب ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم ہر نوع کے انسانوں کا مذہب صرف حضرت عیسٰیؑ کی والدہ محترمہ کی تعریف و توصیف تک محدود تھا، عیسائی کلیسا نے جنس پر پابندی لگا رکھی

تھی۔ بلکے بعد دیگرے پوپ اور پادری عورتوں کی فحاشیوں، ان کی پُر معصیت رجحانات اوران کے نا قابل بیان حسد، بغض و کینہ پر مسلسل لکھتے رہے۔ ترتولین اپنی تصنیف میں، جو عام جذبات کی عکاسی کرتی ہے عورت کو ''ابلیس کی گزرگاہ' شجرِ ممنوعہ کی مہر شکن قانون الٰہی سے ابا کرنے والی اور ظل الہ انسان کو تباہ و برباد کرنے والی گردانتا ہے۔ دوسری جانب ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمانوں کے حرم کی تعریف میں فان ہیمرا سے ایک پناہ گاہ قرار دیتا ہے جہاں اجنبیوں کا داخلہ ممنوع ہے اور وہ اس لئے یہیں کی عورتوں کی حرمت یا اعتماد میں کمی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ طریقہ اس زمانے کے رواج کے مطابق تھا۔

امیر علی نے یورپی جانبازی پر عربوں کے معاشرتی اورادبی اثرات کی تلاش میں نسبتاً محفوظ اساس پر قدم ثبت کئے ہیں۔ اگر چہ یہ بات واضح نہیں کہ مکمل طور پر یا کس حد تک وہ جولین ریبرا وغیرہ کی تحقیقات کے نتائج سے واقف ہیں۔ اسلام میں شجاعت و جانبازی کا موضوع امیر علی کی ''ہسٹری آف دی سیریسنز'' میں بار بار دہرایا گیا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے ابتدائی دور کے کلاسیکی اسلام میں دانشور عورتوں کی پذیرائی پر زور دیتے ہوئے اور دورِ حاضر سے قریب مغربی تحقیق اور دور متوسط کی متوہمانہ غیر رواداری سے اس کا تقابل کرنے کی صورت میں بھی امیر علی محتاط اور محفوظ مقام پر ہیں۔ لیکن ان کا تقابلی علم معاشرت اُس وقت صحیح نقطۂ نظر سے بھٹک جاتا ہے جب وہ دور متوسط کے عیسائیوں کے طبقۂ نسواں کے ساتھ بدترین سلوک اور نا روا برتاؤ کا اسلام میں عورتوں کے ایک مثالی اور تاریخی مرتبہ سے تقابل پیش کرتے ہیں جس کا کہیں وجود نہیں ہے۔

تعدد ازدواج کے سوال پر امیر علی ایک مدافعتی تاریخی تناظر سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآنی احکامات کا رجحان یہ تھا کہ اسلام میں جو یہ برائی تاریخی روایت کے ذریعے موروثی طور پر آئی تھی، پہلے اس کو محدود و مشروط کیا جائے اور بالآخر اسے بالکل ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے چراغ علی کے اس استدلال کو نقل کیا اور دہرایا ہے کہ نکاح میں محبت کے ساتھ انصاف ضروری ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ زیادہ روایتی مؤقف اختیار کرتے ہیں اور تعدد ازدواج کے اخلاقی جواز کے ضمن میں وہ بعض مخصوص حالات اور تاریخی مواقع کا سہارا لیتے ہیں۔ روایت پسند اسلام میں عورتوں کی مزید کمزوریوں اور معذوریوں کو وہ تاریخی ورثہ قرار دیتے ہیں جنہیں فقہاء نے قبول کرکے مؤخر کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں جو قرآنی احکامات میں عورتوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ محض وقتی تھے اور عربوں کے اس دور کے مسائل سے متعلق تھے۔ (224)

عرب کی جغرافیائی حدود:

اگر ہم عرب کی طرف متوجہ ہوں جو اب تک دنیا کی بڑی بڑی قوموں سے الگ تھلگ اور ان کی جنگی اور سیاسی کارروائیوں سے سروکار رکھے بغیر خاموشی و تنہائی کے پردے میں مستور رہا ہے۔ خسروانِ ایران اور قیصرانِ روم کی فوجیں ملک عرب کی صدیوں کی نیند میں خلل ڈالے بغیر قرنہا بعد قرن اُس کی سرحدوں کے پاس سے کوچ کرتی ہوئی گزرتی رہی تھیں۔ بازنطین اور ایران کو جو طوفان آئے دن اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے تھے اکثر اوقات اُن کی گھن گرج اس کے کانوں میں پڑی تھی، لیکن وہ اپنی گہری نیند سے بیدار نہ ہوا تھا۔ بہر حال اب اس کے جاگنے کا وقت آ گیا تھا اور جب وہ جاگا تو اس کے برگزیدہ ترین فرزند کی آواز نے اس کی بیداری کا اعلان کیا۔

پہاڑوں کا وہ سلسلہ جو فلسطین سے خاکنائے سویز تک پھیلا ہوا ہے اور جو بحیرۂ احمر کے متوازی چل کر جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی سرے کو جا چھوتا ہے اسے عربی زبان میں حجاز کہتے ہیں، اور یمن تک جس علاقے سے وہ گزرتا ہے وہ سارا علاقہ اسی کے نام سے موسوم ہے۔ کہیں کہیں تو پہاڑ سمندر کے قریب ہیں اور کہیں کہیں ساحل سے دور ہٹے ہوئے ہیں۔ اُن کے اور ساحل کے درمیان بنجر اور غیر آباد نشیبی زمینیں ہیں جن میں جابجا سرسبز وادیاں اور شاداب نخلستان ہیں، جو برساتی نالوں کی گزرگاہوں میں خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ سے پرے اور مشرق کی جانب نجد کا صحرا پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض سطح مرتفع ہے، جس میں بیاباں ہیں، گھاٹیاں ہیں اور کہیں کہیں اکا دکا ہرے

بھرے شجر زار ہیں جو آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ حجاز میں مکے اور مدینے کے مقدس شہر ہیں جو اسلام کا مولد اور گہوارہ ہیں۔(225)

یہ وسیع خطہ چار ملکوں میں منقسم ہے جن کی حدود بخوبی معین ہیں۔ شمال کی طرف عرب الحجر (Arabia Petraea) ہے، جس میں قدیم ارومیوں (Edomites) اور مدیانیوں (Midianites) کے ملک شامل ہیں۔ پھر خاص حجاز ہے جس میں یثرب کا مشہور شہر ہے، جو بعد میں مدینۃ النبی (مختصف مدینہ) کے نام سے سرفراز ہوا۔ خاص حجاز کے جنوب میں تہامہ (Tihama) ہے، جس میں مکہ اور جدے کی بندرگاہ ہے، جہاں حاجی جہاز سے اترتے ہیں۔ چوتھا اور سب سے جنوبی حصہ عسیر (Asyr) کہلاتا ہے اور اس کی سرحد یمن کی سرحد سے ملتی ہے۔ خاص یمن جزیرہ نمائے عرب کا جنوب مغربی گوشہ ہے، جس کے مغرب میں بحیرۂ احمر ہے اور جنوب میں بحرِ ہند، شمال میں حجاز اور مشرق میں حضر موت۔ یمن کے لفظ کا اطلاق اکثر من حیث العام جنوبی عرب پر ہوتا ہے۔ جب اس کا اطلاق یوں کیا جائے تو اس میں یمن خاص کے علاوہ حضر موت اور اس کے مشرق کا علاقہ مہرہ (Mahra) بھی شامل کیا جاتا ہے۔ مہرہ (Mahra) کے پرے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مشرقی گوشے میں عمان ہے۔ اس کے شمال میں بحرین یا احساء جو خلیج فارس کے کنارے واقع ہے۔ موخر الذکر علاقے کو ہجر (Hijr) بھی کہتے ہیں، جو اس کے سب سے بڑے صوبے کا نام ہے۔

نجد اس سطح مرتفع کا نام ہے جو حجاز کے کوہستان کے مشرقی حصے سے شروع ہو کر سارے وسطی عرب پر پھیلی ہوئی ہے۔ نجد کا وہ حصہ جو یمن کی سرحد پر واقع ہے نجد الیمن کہلاتا ہے اور شمالی حصہ صرف نجد۔ ان دو حصوں کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کا نام یمامہ ہے جو اسلام کی تاریخ میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ نجد کے شمال میں شام کا ریگستان ہے، جو فی الحقیقت عرب کا حصہ نہیں، لیکن اب اس میں عرب کے بدوی قبیلے اپنے قدیم ارامی پیشروؤں کی طرح خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے شمال مشرق میں عراق کے صحرا ہیں جن کی سرحد دریائے فرات کے دائیں کنارے پر کالدیہ (Chaldaea) کے علاقے سے ملی ہوئی ہے،

جسے وہ عرب کے مزروعہ حصے سے جدا کرتے ہیں۔ مشرق کی جانب نجد اور احساء کے درمیان حد فاصل اُن ریگستانوں میں سے ایک ریگستان ہے جنہیں اہل عرب نفود کہتے ہیں۔ جنوب کی طرف دہنا (Dahna) کا صحرا ہے جو نجد کو حضر موت اور مہرہ سے جدا کرتا ہے۔(226)

اس وسیع و عریض خطے میں، جو اپنے عروج کے زمانے میں فرانس سے دگنے رقبے پر مشتمل تھا، اس وقت بھی دو طرح کے باشندے تھے اور اب بھی ہیں، یعنی شہروں کے لوگ اور بادیہ نشین لوگ یا بدو۔ بدوؤں میں جو اچھائیاں اور برائیاں ہیں مثلاً ان کی اپنے قبیلے سے محبت، ان کی عجیب و غریب حمیت، ان کا منچلا پن، اُن کا جذبۂ انتقام اور ان کی انسانی زندگی کے بارے میں لاپروائی، ان سب کو برٹن (Burton) اور پُول (Poole) جیسے مشہور مصنفین نے بڑی عمدگی اور ہمدردی سے بیان کیا ہے۔ لیکن شہریوں اور بدوؤں میں چاہے کتنا بھی فرق ہو، عرب جبلۃً بادیہ زاد ہیں۔ اُن کی پُر جوش حُبِ آزادی اور ان کی روحانی بلند پروازی ان کے صحرائی مسکن کی کھلی ہوا اور بیکراں پہنائیوں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ مکے اور عکاظ میں ہر سال میلے ہوا کرتے تھے، عرب کے شعوب و قبائل میں کسی قسم کی وحدت نہ تھی۔ ہر قبیلہ مدنی نشو و نما اور مذہب میں دوسرے قبیلوں سے مختلف تھا۔ یہ تنوع ان کے مختلف الاصل ہونے کا نتیجہ تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں مختلف قومیں مختلف زمانوں میں آباد رہ چکی تھیں۔ ان میں سے بہت سی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھیں، لیکن اُن کے اچھے یا برے کارناموں کی یاد ان کے بعد آنے والوں کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ یہ روائتیں مجموعی طور پر قوم عرب کی تاریخ تھیں۔ خود عرب ان قوموں کو جو جزیرہ نمائے عرب میں آباد رہ چکی تھیں تین بڑے بڑے گروہوں میں تقسیم کرتے تھے۔

1۔ عرب البائدہ، یعنی وہ عرب جو معدوم ہو چکے تھے اور جن میں وہ حامی (کوشی) قبیلے جنہوں نے سامیوں سے پہلے عرب میں بود و باش اختیار کی تھی اور ان کے علاوہ شام، فنیشیا اور دوسرے علاقوں کی ارامی قومیں۔

2۔ عرب العاربہ یا متعاربہ، یعنی اصلی عرب اور خالص سامی قومیں، جو روایت کے مطابق قحطان یا یقطان کی اولاد سے تھے اور جنہوں

نے اپنی رو بہ جنوب نقل وحرکت کے دوران ابتدائی باشندوں کو تباہ کر دیا تھا۔ قحطانی عربوں نے، جو طبعاً خانہ بدوش تھے، ان ملکوں کے ابتدائی باشندوں پر، جو حامی النسل ستارہ پرست تھے، اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ ان کا اصلی گہوارہ وہ خطہ تھا جہاں سے نسل ابراہیم بھی آئی تھی اور اس کی حدود کا تعین قحطان کے دو اسلاف کے ناموں سے ہوتا ہے، یعنی ارفکشد (Arphaxad) جس کے معنی ہیں، ''سرحد کالدیہ'' اور عیبر یا عابر (Eber) جس کے معنی ہیں ''دریا پار سے آیا ہوا آدمی'' یعنی وہ آدمی جو دریائے فرات کے دائیں کنارے سے بابل یا عراق عرب میں آیا تھا۔ (227)

3۔ عرب المستعربہ یعنی وہ لوگ جو عرب میں آ کر آباد ہوئے۔ یہ لوگ ابراہیمی خاندان کے سامی تھے جو یا تو پرامن مہاجروں یا فوجی آباد کاروں کی حیثیت سے جزیرہ نمائے عرب میں آئے اور قحطانی عربوں کے ساتھ شادی بیاہ کر کے انہی کے ساتھ رہنے لگے۔ (228)

یہ تینوں الفاظ عاربہ، متعاربہ اور مستعربہ ایک ہی مادے سے ماخوذ ہیں اور ان کی صرف شکل سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مختلف گروہ کن کن زمانوں میں آ کر سرزمین عرب میں آباد ہوئے۔ (کوسین ڈی پرسیول (Caussin de perceval) بائدہ اور عاربہ او ایک ہی سمجھتا ہے اور متعاربہ کو دوسرا گروہ شمار کرتا ہے۔

تاریخی پس منظر:

اعراب العاربہ میں جو قومیں تاریخ اسلام کے ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ بنی عاد (خیال کیا جاتا ہے کہ قحطانی عربوں نے بنی عاد پر غلبہ پا کر انہیں معدوم کر دیا) اور بنی ثمود کو (جو ایک عجیب قسم کے غاروں میں رہنے والے لوگ تھے) خد الاحمر (Khqzar al-Ahmar) کے ماتحت اشوریوں نے ختم کر دیا۔) عمالقہ، بنی ثمود اور بنی جدلیس۔ بنی عاد، جو حامی الاصل تھے، جزیرہ نمائے عرب کے سب سے پہلے آباد کار تھے اور وہ زیادہ تر وسطی عرب کے اس حصے میں آباد تھے، جسے عرب مؤرخ اور جغرافیہ دان احقاف الرمال کہتے ہیں، اور جس کی سرحد یمن، حضرموت اور عمان کی سرحدوں سے ملتی ہے۔ اپنی تاریخ کے ایک دور میں بنی عاد ایک طاقت ور اور فاتح قوم تھے۔ ان کے ایک بادشاہ شداد نے، جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، اپنی حکومت عرب کی حدود کے باہر بھی قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے عراق فتح کیا، بلکہ ہندوستان کی سرحد تک جا پہنچا۔ اس روایت کا اشارہ غالباً بابل اور کالدیا پر عربوں کے حملے کی طرف ہے، جو دو ہزار سال قبل مسیح واقع ہوا، اور شاید اسی واقع کو ایرانی روایات میں حملۂ ضحاک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی شداد نے یا غالباً اس کے کسی جانشین نے جو اس کا ہم نام تھا مصر پر بھی چڑھائی کی، بلکہ اور بھی مغرب کی طرف جا نکلا۔ بعض مورخین کی رائے میں مصر پر عربوں کا یہ حملہ وہی واقعہ ہے جسے ہکسوں (The Hyksos) کا حملہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نظریے کی تائید کسی حد تک اس امر سے ہوتی ہے کہ ان خانہ بدوش حملہ آوروں کو بالآخر تھیبائد (The Thebaid) کے بادشاہوں نے اپنے جنوبی ہمسایوں یعنی حبشیوں اور کوشیوں کی مدد لے کر افریقہ سے نکالا۔ کہا جاتا ہے کہ بنی عاد کی بیشتر تعداد خشک سالی کا شکار ہو کر تباہ ہو گئی جو تھوڑے سے لوگ بچ رہے ان سے بنی عاد کی نئی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے یمن میں کچھ مدت خوشحالی کی زندگی بسر کی۔ بالآخر نئے بنی عاد بھی قحطینی لہر کی لپیٹ میں آ کر ختم ہو گئے۔ (229)

عمالقہ جنہیں لونرماں (Lenormant) نسلاً ارامی خیال کرتا ہے، بلاشک وشبہ وہی تھے جنہیں یہودی اور عیسائی کتب مقدسہ میں عمالقہ کے نام سے اور مصری آثار قدیمہ کے کتبوں میں شَشُو کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جنہیں اشوری بادشاہوں نے بابلیہ سے نکال باہر کیا۔ یہ لوگ عرب میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ یمن حجاز، فلسطین اور شام میں پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصر میں بھی جا پہنچے اور متعدد فراعنہ ان کی نسل سے تھے۔ حجاز کے عمالقہ بنی جُرہُم کے ہاتھوں یا تو تباہ ہو گئے یا ملک سے نکال دیئے گئے۔ بنی جُرہُم بنی قحطان کی ایک شاخ تھے۔ شروع میں یہ لوگ جنوب میں آباد ہوئے، لیکن بعد میں شمال کی طرف بڑھ کر عمالقہ پر غالب آئے۔

بنی ثمود جو بنی عاد کی طرح نسلاً کوشی یا حامی تھے، ادوم کے سرحدی علاقوں میں آباد ہوئے اور پھر حجر میں، جو عرب الحجر کے شرق میں حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ یہ لوگ چٹانوں میں غار کھود کر ان میں رہتے تھے۔ چنانچہ زمانہ جدید کے سیاحوں کے بیان کردہ

حالات اور جدید انکشافات سے عرب روایات کا مقابلہ کیا جائے تو بنی ثمود کے وطن کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ شام، نجد اور حجاز کے درمیان جتنی تجارت ہوتی تھی وہ سب بنی ثمود کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اس تجارت کی بدولت انہیں اچھی خاصی خوشحالی نصیب ہوئی۔ بالآخر ان کی بیشتر تعداد کو عظیم عیلامی فاتح خزار الاحمر نے شام اور عرب کی مہموں کے دوران ہلاک کر دیا۔ ان غار نشینوں پر جو اپنے سنگین مسکنوں میں رہ کر اپنے آپ کو خدا کے غضب سے محفوظ خیال کرتے تھے، جو ہولناک افتاد پڑی اُس کا ذکر قرآن میں قریش کی تنبیہ کی غرض سے اکثر کیا گیا ہے۔ (230)

اس مصیبت کے بعد جو بنی یہود بچ رہے وہ خلیج عیلام کے شمال میں جبل سعیر (Mount Seir) کے علاقے میں جا کر پناہ گزین ہوئے، جہاں ان کے آباؤ اجداد حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کے زمانے میں رہا کرتے تھے لیکن بہت جلد وہ ہمسایہ قبیلوں میں جذب ہو کر معدوم ہو گئے اور ان کی جگہ ادومیوں نے لے لی، جنہوں نے جبل سعیر پر کچھ مدت تک اپنا تصرف جمائے رکھا۔ (231)

معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر عربوں کے ایک گروہ نے، جسے بنی قحطان نے یمن سے دیس نکالا دیا تھا، ادومیوں کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ ڈیوڈورس سیکولس (Diodorus Siculus) کے زمانے میں یہ لوگ رومی فوجوں کے دستے مہیا کیا کرتے تھے۔

طسم، جدلیس اور دوسرے چھوٹے چھوٹے قبیلے کسی ذکر خاص کے مستحق نہیں۔ اس لئے ہم ان سے قطع نظر کر کے بنی جرہم کا حال بیان کرتے ہیں، جو عرب العاربہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور جنہوں نے حجاز میں عمالقہ کو مغلوب اور ہلاک کر کے اُن کی جگہ لے لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کے دو قبیلے تھے۔ ایک تو قدیم ترین قبیلوں میں سے اور بنی عاد کا ہمعصر تھا اور غالباً کوشی نسل سے تھا، دوسرا قحطان کی اولاد سے تھا، جس نے سخت خشک سالی کے زمانے میں یمن سے نکل کر حجاز پر قبضہ کیا اور عمالقہ کو وہاں سے ملک بدر کر کے خود اُن کی املاک پر قابض ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنی جُرہُم نے جو قحطانی النسل تھے، اس وقت خروج کیا جب اسمٰعیلی نسل کے عربوں نے عمالقہ میں، جن کے ملک میں وہ مدتوں سے رہتے چلے آ رہے تھے، نمایاں حیثیت حاصل کرنی شروع کی۔ اسمٰعیلی عربوں نے حملہ آوروں سے سمجھوتہ کر لیا، اور کچھ مدت تک دونوں قومیں امن وامان سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ آل اسمٰعیل کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بنی جرہم کا وادی پر قبضہ ڈھیلا پڑتا گیا اور ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ حجاز اور تہامہ کی ولایتیں اولاد ابراہیم کے ہاتھوں میں آ گئیں۔ مستعربہ عربوں کی ترقی شاہ بابل کی یورش کے باعث چندے رک گئی، لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ابراہیمیوں نے بہت جلد اپنی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ حاصل کر لی اور حجاز، نجد اور عراق وبین النہرین کے ریگستانوں میں پھیل گئے جہاں انہوں نے قحطانیوں کو، جو اُن کے پیش رو تھے، اپنے اندر جذب کر لیا۔ (232)

عرب المتعاربہ میں وہ قبیلے شامل تھے جو قحطان بن عابر کی اولاد سے تھے۔ (ابن الاثیر اسے عابر یا غابر کہتا ہے) اور جو زیادہ تر یمن میں مقیم تھے۔ قحطانی قبیلے عرب کے شمال شرقی کونے سے داخل ہوئے تھے اور پھر رفتہ رفتہ جنوب کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے جہاں وہ کچھ مدت تک تو کوشی النسل بنی عاد کے زیر سایہ بود وباش کرتے رہے اور پھر خود صاحب اقتدار بن گئے، لیکن قحطانی نسل کے باشندے صرف جنوبی عرب ہی میں نہ رہتے تھے۔ ان کا ابتدائی گہوارہ بین النہرین تھا۔ وہاں سے یمن میں نقل سکونت کرنے کے دوران انہوں نے جزیرہ نمائے عرب کے پورے طول کو عبور کیا ہوگا اور قدرتی طور پر اپنی کچھ بستیاں جا بجا چھوڑ گئے ہوں گے۔

عرب مؤرخین کا خیال ہے کہ مہاجرین کی جو لہر اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں امڈ کر آئی اس کے سردار دو بھائی تھے، قحطان اور یقطان جو عابر اور حابر کے بیٹے تھے۔ اُن کے نزدیک یمن کا پہلا بادشاہ قحطان کا بیٹا یعرب تھا جس کے نام پر اس کے تمام جانشینوں کا بھی اور سارے جزیرہ نما کا بھی نام رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یعرب کے بعد اُس کا بیٹا یشجب تخت پر بیٹھا، جس نے ولایت کے قدیم دار الحکومت مارب کی بنیاد رکھی اور جو مشہور عبد الشمس ملقب بہ سبا کا باپ تھا۔ اس لقب کے معنی ہیں "ملک گیر" اور یہ اسے اس کی فتوحات کے صلے میں دیا گیا۔ سبا کے اخلاف قحطانی نسل کے مختلف قبیلوں کے اسلاف بنے، جو عربی روایات میں مشہور ہیں۔ سبا کے دو بیٹے تھے حمیر (Himyar) جس

کے معنی ہیں سرخ (وہ فراعنۂ مصر کی طرح سرخ چونہ پہنا کرتا تھا) اور کُہلان (Kuhlan)۔ اول الذکر اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا۔ اسی کے نام پر خاندانِ سبا کا نام حمیری پڑا۔ (معلوم ہوتا ہے کہ یمن کے حمیری بادشاہ، جن کا لقب تبابعہ (Tobbas) تھا۔ قدیم الایام سے ایران اور بازنطین کے ساتھ راہ ورسم رکھتے تھے) اُس کے اخلاف اور اُس کے بھائی کُہلان کے اخلاف ظہورِ اسلام سے ایک صدی پہلے تک یمن پر باری باری حکمران رہے۔ عظیم بادشاہ ذوالقرنین اور مشہور ملکہ بلقیس، جو حضرت سلیمان کے عہد میں یروشلم گئی، دونوں اسی خاندان سے تھے۔ (233)

(ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں بہت شبہات ہیں۔ بہت سے مسلم مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جن ذوالقرنین کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ سکندر مقدونی تھا، لیکن یہ خیال محلِ نظر ہے۔ ''ذوالقرنین'' کے اصلی معنی ہیں ''دو سینگوں والا''۔ جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ قدیم سبائی بادشاہ ہلال کی شکل کا تاج پہنتے تھے، جو انہوں نے غالباً ذوالقرنین کے زمانہ میں فراعنۂ مصر سے مستعار لیا تھا تو اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن میں جو اشارہ ہے وہ کسی مقامی خاندان کے بادشاہ کی طرف ہے جس کی وسیع فتوحات کو آئندہ پشتوں کے تخیل نے بڑھا کر عالمگیر سلطنت بنا دیا۔

لنورماں (Lenormant) کا خیال ہے کہ شداد، ذوالقرنین اور بلقیس تینوں کُوشی نسل کے تھے۔

حمیری بادشاہ کی رعیت میں یہودیت کا بہت زور تھا۔ اگرچہ 343ء میں شہنشاہ قسطنطین کے سفیر کی فرمائش پر شاہان یمن نے اپنی مملکت میں متعدد عیسائی گرجا بنانے کی اجازت دی۔ لیکن آبادی کا بیشتر حصہ قدیم سامی مذہب کا پیرو تھا۔

پانچویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب ذونواس نے خونخوار غاصب ذوشناتر (Zu-Shinatir) کو قتل کر کے یمن اور اس کی مقبوضہ ولایتوں پر تسلط جمایا۔ اس نے یہودیوں کے ایما پر، جن کے مذہب میں وہ داخل ہو چکا تھا، عیسائیوں پر جو مظالم کئے اُن کا انتقام اس سے بازنطینی شہنشاہ نے لیا۔ قسطنطنیہ کا اشارہ پا کر حارث کے زیر قیادت ایک حبشی لشکر یمن کے ساحل پر اترا اور اس نے ذونواس کو قتل کر کے یمن پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ 525ء کا ہے۔

تھوڑی مدت بعد (537ء) میں ابرہہ الاشرم نے حارث کو قتل کیا اور حبشیوں کی طرف سے یمن کا وائسرائے مقرر ہوا۔ اسی ابرہہ کی قیادت میں عیسائی حبشیوں نے حجاز کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یمن تقریباً نصف صدی تک حبشیوں کے تصرف میں رہا۔ بالآخر معدی کرب (M'adi Karib) نے جو اس مشہور سیف بن ذی یزن (Zu'l yezen) کا بیٹا تھا، جس کے شجاعانہ کارناموں کے گیت بادیہ نشین عرب آج تک گاتے ہیں، کسریٰ انوشیروان سے فوجی امداد لے کر حمیری خاندان کو 573ء میں بحال کیا۔ جب 597ء میں عیسائیوں نے معدی کرب کو ہلاک کر دیا، تو یمن پر ایران کی براہ راست حکومت قائم ہو گئی اور دربار ایران کے مامور کئے ہوئے وائسرائے اس کے نظم ونسق کے مختار ہو گئے، انہیں مرزبان کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ پہلا مرزبان وہرز (Wahraz) تھا۔ اس کے تحت یمن، حضرموت، مہرہ اور عمان سلطنتِ عجم میں شامل کر دیئے گئے۔ آخری مرزبان بازان تھا، جسے خسرو پرویز نے 606ء میں مامور کیا۔ یمن میں اسلام کی اشاعت بازان کے عہد مرزبانی میں ہوئی اور وہ خود بھی مشرف بہ اسلام ہوا۔ ایرانیوں نے یمن پر بڑی نرمی سے حکومت کی۔ تمام مذاہب سے رواداری برتی جاتی تھی اور تمام قبیلوں کے شیخ مرزبان کے زیر نگرانی اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اپنے دستوروں کے مطابق انصرام امور کرتے تھے)۔

بنی اسمٰعیل نے عرب میں جو ابتدائی بستیاں بسائیں اُن کے بارے میں روایات کا سلسلہ حضرت ابراہیم کے کالدیا سے جلاوطن کئے جانے یا ترک وطن کرنے کے قصوں سے جا ملتا ہے۔ آل اسمٰعیل حجاز میں پھیلتی پھولتی اور بڑھتی رہی۔ آخر کار بابل کے ہیبت آفریں بادشاہ بنوخذ نصر (بخت نصر) نے اُسے بھی اور اس کے ساتھ بنی جُرہم کو بھی مغلوب کر لیا، بلکہ تقریباً تباہ کر دیا۔ جتنے بادشاہوں نے عرب کے دل پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی اُن سب میں یہ اکیلا بادشاہ ہے جو اس پر ضرب کاری لگانے میں کامیاب ہوا۔ مکہ معظمہ کا سنگ بنیاد غالباً اسی زمانے

میں رکھا گیا جب ابراہیمی عرب عربستان میں آ کر آباد ہوئے، کیونکہ عرب روایات کے مطابق اس کا مُوسس ایک جُرہُمی سردار مضاض ابن عمرو تھا، جس کی بیٹی نے عرب مستعربہ کے جدامجد حضرت اسمٰعیل سے شادی کی۔ اسی زمانے میں کعبے کی تعمیر ہوئی، جس نے مکے کو عرب کے باقی تمام شہروں پر فوقیت بخش دی۔ کعبہ جس کی تعمیر قدیم الایام میں حضرت ابراہیم کے ہاتھوں ہوئی ہمیشہ عرب قوم کا مقدس ترین معبد رہا ہے۔ اس میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے، گویا سال کے ہر دن کے لئے ایک بت۔ اُن کے مرکز میں ہُبل تھا، جو سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ غزالین تھے، ایک سونے کا اور ایک چاندی کا۔ اور تو اور، حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل کے بت بھی تھے، یہاں سب قبیلوں کے لوگ ہر سال آتے تھے اور آ کر سنگِ اسود کو بوسہ دیتے تھے، جو حضرت آدمؑ کے زمانے میں آسمان سے گرا تھا اور سرتا پا برہنہ ہو کر سات بار کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ ابتدائی ایام سے نہ صرف عربوں کی مذہبی عقیدت کا مرجع بلکہ ان کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ چونکہ وہ پرانے زمانے کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اس لئے ہمسایہ ملکوں کی ساری دولت اور ثقافت اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔ بابلی فاتح کو بھی اس کی مقدرت نہ ہوئی کہ مکے کی تجارتی خوشحالی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا، کیونکہ عربوں کو جو جغرافیائی حیثیت حاصل تھی اس کی بدولت اقوام عالم کے اموالِ تجارت کا نقل و حمل خاص طور پر ان کے حصے میں آیا تھا۔ (234)

عرب کی رسوماتِ جاہلیہ:

مکہ اس تجارتی سرگرمی کا مرکز تھا جس نے ہمیشہ عربوں کو دوسری ایشیائی اقوام سے ممتاز کیا ہے۔ مکے سے وہ قافلے روانہ ہوتے تھے جو یمن اور شہرۂ آفاق ہندوستان کی پیداوار اور مصنوعات لے جا کر بازنطینی ولایتوں اور ایران میں پہنچاتے تھے اور شام سے ایرانی شہروں کے ریشمی کپڑے لاتے تھے۔ لیکن وہ صرف تجارتی مال ہی نہیں لائے، ان کے جلو میں عیش و عشرت کی وہ تمام عادتیں اور وہ تمام خرابیاں بھی آئیں جنہوں نے ہمسایہ سلطنتوں کو زنگ کی طرح کھا لیا تھا۔ یونانی اور ایرانی کنیزیں، جو شام اور عراق سے لائی جاتی تھیں، نہ صرف رقص و سرود سے امیروں کے لئے مشغلۂ بیکاری مہیا کرتی تھیں بلکہ اُن کی نفسانی تسکین کا ذریعہ بھی بنتی تھیں۔ وہ شاعر جس کا کلام عربوں کا مایۂ افتخار ہے صرف موجودہ زندگی کی لذتوں کے گیت گاتا تھا اور لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کو شہ دیتا تھا۔ فکرِ فردا کسی کو نہ تھی۔

عرب اور بالخصوص اہل مکہ شراب، جوئے اور گانے کے والہ و شیدا تھے۔ دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح عرب میں بھی ناچ اور گانا ادنیٰ طبقے کی عورتوں کا پیشہ تھا۔ جنہیں قیان (Kiyan) صیغۂ واحد میں قنیۃ (Kayna) کہتے تھے اور جن کی عصمت فروشی ضرب المثل تھی۔ اس کے باوجود ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور بڑے بڑے سردار ان سے مفاخرانہ عشق بازی کرتے تھے۔ (لوگوں کی اخلاقی ذلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ عورتیں اپنے گھروں میں ضیافتیں دیا کرتی تھیں جن میں شہر کے روسا و امرا شامل ہوتے تھے۔

شہری عرب قمار بازی کے اتنے شوقین تھے کہ ٹیسی ٹس جن جرمنوں کا تذکرہ کرتا ہے، اُن کی طرح وہ اپنی آزادی بھی بد دیا کرتے تھے۔ یہ اِن برائیوں کی وجہ سے اور اُن کے ساتھ جو اخلاقی خرابیاں وابستہ تھیں اُن کی وجہ سے تھا کہ حضرت محمدؐ نے اپنے پیروؤں پر جوئے، ناچ اور شراب خوری کو حرام کر دیا)۔

ہندوؤں کی طرح عربوں میں بھی تعدد ازواج بے حد و حساب تھا۔ ماں کے سوا ہر بیوہ متوفی کے وارثوں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور لڑکے کے استعمال میں لائی جاتی تھی۔ نوزائیدہ بچیوں کو دفن کر دینے کا نفرت انگیز اور انسانیت سوز دستور بھی عام تھا۔ (235)

یہودیوں کو جنہیں اشوریوں، یونانیوں اور رومیوں نے یکے بعد دیگرے گھر سے بے گھر کیا تھا، عربوں کے یہاں امان مل گئی تھی۔ لیکن وہ اپنے ساتھ اپنا مذہب ہی نہ لائے تھے، بلکہ عربدہ جوئی کی وہ فطرت بھی جو اُن کی مصیبتوں کا سب سے بڑا سرچشمہ تھی۔ بہر حال انہوں نے عربوں میں سے بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا، چنانچہ جب حضرت محمدؐ نے تبلیغ اسلام شروع کی تو اس وقت کہلان کے دو بیٹوں حمیر اور کندہ کے جانشینوں میں سے ایک مقتدر گروہ یمن میں اور دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر (Nazir) جو بنی اسمٰعیل میں سے تھے

لیکن قدیم الایام سے عرب میں بودوباش کر رہے تھے۔ خیبر اور یثرب میں یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ نسطوریوں اور جیکی عیسائیوں نے بھی بستیاں بسا رکھی تھیں، ان دو حریف مذہبوں میں عرب پر تسلط حاصل کرنے کی خاطر جو کش مکش رہتی تھی، وہ جزیرہ نما کے سب سے زرخیز صوبوں میں خونریز لڑائیوں کا موجب بنتی رہتی تھی۔ (236)

ربیعہ ابن نزار کی نسل کے چند خاندان مثلاً بنی تغلب جو بین النہرین میں اور بنی عبد القیس جو بحرین میں آباد تھے، عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ نجران میں بنی حارث ابن کعب، عراق میں بنی عباد، شام میں آل غسان اور غزاعہ، دومۃ الجندل میں اور بنی کلب اس کے پیرو بن چکے تھے۔ جو قبیلے فلسطین اور مصر کے درمیان کے ریگستانوں میں بادیہ گردی کرتے رہتے تھے ان میں سے بعض بھی اس کے دائرے میں داخل ہو چکے تھے۔ مجوسیت اور صابیت کے نام لیوا بھی عربوں اور بالخصوص آل تمیر میں موجود تھے۔ بنی اسد عطارد کے، بنی جرہم مشتری کے، بنی طے سہیل کے اور قیس عیلان کے جانشین شعریٰ کے پجاری تھے۔ قریش کے چند گروہ تین چاند دیویوں، لات، منات اور عزیٰ کو پوجتے تھے اور انہیں بنات اللہ تصور کرتے تھے۔ مکہ اس وقت دور دور تک پھیلی ہوئی بت پرستی کا مرکز تھا، جس کی شاخیں جزیرہ نمائے عرب کے ہر قبیلے میں پائی جاتی تھیں۔ کنانہ، جو قریش سے خون کا رشتہ بھی اور سیاسی اتحاد بھی رکھتے تھے، ستارہ الدبران کے علاوہ عزیٰ کی پرستش کرتے تھے جو مکے سے ڈیڑھ دن کی مسافت پر ایک مقام نخلہ کے ایک درخت میں مجسم تصور کی جاتی تھی۔ ہوازن، جو مکے کے جنوب مشرق میں بادیہ گری کرتے پھرتے تھے، لات دیوی کی پوجا کرتے تھے، جس کا بت طائف میں نصب تھا۔ منات کو ایک چٹان میں مجسم سمجھا جاتا تھا جو مکہ اور شام کے درمیان کی سڑک کے کنارے تھی۔ ان بتوں کی پرستش میں زیادہ تر لنگ پوجا کی رسومات پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ قدیم سامیوں، فینیقیوں اور بابلیوں کی پوجا سے بڑی مشابہت رکھتی تھی۔ لیکن بیشتر عرب بالخصوص آل مضر کے لوگ، ایک نہایت ذلیل قسم کی بت پرستی کے عادی تھے۔ جانور، پودے، غزال، گھوڑا، اونٹ، کھجور کا درخت، چٹانیں، پتھر، یہ سب چیزیں ان کی معبود تھیں۔ بہرحال وہ ایک خدائے بزرگ و برتر کے تصور سے بھی نا آشنا تھے، لیکن یہ تصور معدودے چند لوگوں تک محدود تھا، جنہوں نے بت پرستی کی غلامی سے فرار کر کے ایک قسم کا فلسفیانہ تشکک اختیار کیا، جس میں ان کے ہمسایوں، صابیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے قصے کہانیوں کے رنگ بھرے ہوئے تھے۔ اس محدود طبقے کے بعض لوگ رب الاعلیٰ کے صراحتہً قائل تھے اور اپنے زمانے کی فحاشیوں اور مادہ پرستی سے متنفر ہو کر کسی نجات دہندہ کے لئے چشم براہ تھے جس کے جلد آنے کا ان کے دل میں یقین تھا۔ (237)

بعض قبیلوں میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کی قبر پر ایک اونٹنی ذبح کی جاتی یا بے آب و دانہ باندھ دی جاتی تاکہ بھوک اور پیاس کے مارے مر جائے۔ یہ اس عقیدے کی بنا پر کیا جاتا کہ اونٹنی مرے ہوئے شخص کی آئندہ زندگی میں اس کی سواری کا کام دے گی۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ روح جسم سے جدا ہو کر ایک پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جسے وہ ہامۃ یا صدیٰ کہتے تھے۔ اگر مرا ہوا شخص کسی کے ہاتھوں قتل کیا گیا ہوتا تو جب تک قتل کا قصاص نہ لیا جاتا پرندہ مقتول کی قبر کے اوپر اسقونی اسقونی کہتا ہوا منڈلاتا رہتا تھا۔ جنوں اور غولوں پر ایمان اور بتوں کے ذریعے غیب کی اطلاعات حاصل کرنے پر عقیدہ عام تھا۔ بتوں سے تیروں کے ذریعے بشارت لی جاتی تھی، جنہیں ازلام اور قداح کہتے تھے۔ ہر قبیلے کا جدا بت اور جدا بت خانہ تھا۔ ان بت خانوں میں جو پروہت ہوتے تھے انہیں بیش بہا ہدیے دیئے جاتے تھے، اور مختلف بت خانوں کے پرستاروں کے درمیان اکثر خونریز چپقلشیں ہوتی رہتی تھیں۔ (238)

(سب سے مشہور بتکدے یہ تھے: یمن میں بنی خثعم کا ذوالخلاصہ، نجد میں بنی ربیعہ کا روضہ، عراق میں ذوسبات اور ساحل بحر کے قریب قدید کے مقام پر منات کا مندر، جس میں اوس اور خزرج کے قبیلے قدید جو یثرب میں آباد تھے، اپنے دیوتا کی پرستش کرتے تھے)۔

لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کا معبد، یعنی کعبہ، سب قبیلوں کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت رکھتا تھا۔ یہودی اور صابی بھی کعبے پر نذریں چڑھاتے تھے۔

اس عبادت گاہ کی تولیت قبائل میں بڑی رقابت کا موجب تھی، کیونکہ اس کے ساتھ بہت سے ایسے اعزازات اور خصوصی حقوق وابستہ تھے جن کی عربوں کی نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ پیغمبر اسلام کی ولادت کے وقت آپ کا خاندان کعبے کا متولی تھا اور آپ کے دادا اس کی مملکت کے رئیس تھے۔ انسانی قربانیوں کا دستور عام تھا۔ کعبے میں جو خاص خاص بت نصب تھے ان کے علاوہ ہر خاندان کا ایک علیحدہ بت تھا جس کی عبادت کی رسوم سخت پابندی سے ادا کی جاتی تھیں۔

یہ تھی عربوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت۔ نہ یہودیت اور نہ عیسائیت ان میں انسانی خوبیاں پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ میور (Muir) کہتا ہے: ''اگرچہ عیسائیت کی تبلیغ پانچ صدیوں سے ہو رہی تھی، تاہم عیسائیوں کے صرف اکادکا گروہ کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے۔ یعنی بنی حارث نجران میں، بنی حنیفہ یمامہ میں، بنی طے کے چند خاندان تیماء میں، اور بس۔ یہودیت نے بھی، جو عیسائیت سے کہیں زیادہ طاقت ور تھی، ذونواس کے تحت وقتاً فوقتاً لوگوں کو اپنے دائرے میں داخل کرنے کی غیر مستقل سی کوششیں کی تھیں، لیکن اب اس کی تبلیغی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔

مختصر یہ کہ اگر اس کے مذہبی منظر کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت کی ضعیف کوششوں نے عربی زندگی کے سمندر کی سطح پر صرف خفیف سے ہلکورے پیدا کئے تھے۔ یہودیت کے نسبۃً زیادہ قوی اثرات ایک زیادہ گہرے اور زیادہ ہیجانی دھارے کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں، لیکن مقامی بت پرستی اور اسمٰعیلی توہم پرستی کا سیلاب جو ہر سمت سے اٹھ کر لگاتار امڈتا ہوا کعبے کی طرف رواں دواں رہتا تھا اس امر کی وافر شہادت بہم پہنچاتا ہے کہ مکے کے مذہب اور طریقِ عبادت نے نفسِ عربی کو مضبوطی سے اور حتمی طور پر اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ (239)

قبیلوں کے باہمی تفرقوں اور رقابتوں (یہ قبائلی مخاصمے اور خاندانی جھگڑے، جن کا مفصل بیان آگے چل کر آئے گا۔ عرب شہنشاہی کی بربادی کا باعث بنے) نے اور مذہبی اور نسلی اختلافات کے پیدا کئے ہوئے مخاصمانہ جذبات نے جو ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے خلاف آمادۂ پیکار رکھتے تھے، اشوریوں، بابلیوں، یونانیوں اور ایرانیوں کو شمال، جنوب، مشرق اور جنوب مغرب میں مختلف اقطاع پر متصرف ہونے کا موقع بہم پہنچایا تھا۔ حبشی تو یہاں تک آگے بڑھ آئے تھے کہ انہوں نے کعبے کو مسمار کرنے کے ارادے سے حجاز پر حملہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن عبدالمطلب کی حب الوطنی نے کعبے کے سامنے ان کی طاقت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ بیس سالوں تک انہوں نے یمن کو اپنی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنایا۔ اس کے بعد ایک مقامی حکمران، یعنی نامور سیف ذوالیزن کے بیٹے نے انہیں ایران سے امداد لے کر یمن سے نکالا۔ جب اس حکمران کو عیسائیوں نے قتل کر دیا تو اس کی ریاست، جس پر وہ نوشیروانِ عادل کے زیرِ سایہ حکومت کر رہا تھا، ایرانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور یمن شہنشاہ ایران کا باجگزار بن گیا۔ (240)

قسطنطنیہ اور ایران کی سلطنتوں نے عرب کے مختلف خطوں پر جو تسلط قائم کر رکھا تھا اس کے علاوہ دو سب سے بڑے عرب حکمران، یعنی غسان اور حیرہ کے بادشاہ، قیصروں اور خسروؤں کے باجگزار تھے، اور ان بے سود اور بے مقصد جنگوں میں جو ایرانیوں اور بازنطینیوں نے آپس میں لڑیں اور جن کی خاطر انہوں نے اپنی رعایا کا خون زندگی چوس لیا اہل غسان اور اہل حیرہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا یا ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوئے، اگرچہ بالعموم زرتشتی عیسائیوں کی بہ نسبت زیادہ حق بجانب تھے۔ (یمن، بحرین اور عراق کے شہری ایرانیوں کے تابع فرمان تھے۔ ان ملکوں کے بدو کسی کا حکم نہ مانتے تھے۔ شام کے عرب رومیوں کے مطیع تھے۔ بین النہرین کے عرب کبھی بازنطینیوں کے اور کبھی ایرانیوں کے۔ وسطی عرب اور حجاز کے بدو، جن پر حمیری بادشاہ مؤثر طور پر حکومت کرتے رہتے تھے، برائے نام ایرانیوں کے زیر اقتدار آ گئے تھے لیکن فی الواقع وہ آزاد تھے)۔

جزیرہ نمائے عرب کی آبادی نے یوں جن مختلف النوع عناصر سے ترکیب پائی تھی۔ انہوں نے ملک کی لوک کہانیوں میں بے انتہا

تنوع پیدا کر دیا ہے۔ غیر متمدن قوموں میں ہمیشہ یہ رجحان ہوتا ہے کہ وہ واقعات کو قصے کہانیوں کا جامہ پہنا تے ہیں۔ ان کا تخیل دور کی چیزوں کو نہ صرف خوشنما رنگوں میں رنگ دیتا ہے بلکہ انہیں اصل سے بڑا بھی بنا دیتا ہے اور اگر کسی قوم کا تمدن بھانت بھانت کے تمدنوں کا مرکب ہو تو اس میں ایسی لاتعداد کہانیاں رائج ہو جاتی ہیں جو کم وبیش واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ یمن اور جنوب مغربی خطوں میں جو حامی لوگ آ کر آباد ہوئے وہ خالص سامی جوان کے عقب میں آئے جیسے آریہ لوگ مشرق میں آئے تھے، یہودی، عیسائی یہ سب اپنی اپنی روایات، اساطیر اور داستانیں ساتھ لے کر آئے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ماضی کی ان باقیات میں ایک طرح کی مطابقت پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ بظاہر چاہے کتنی ہی بے بنیاد معلوم ہوں، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی سطح کے نیچے ہمیشہ واقعات کی ایک تہ دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً شداد اور اس کے باغ ارم کی بابت جو قصہ مشہور ہے اس کے دھند لے آئینے میں ہمیں ایک زبردست سلطنت کا عکس نظر آتا ہے جس نے مصر کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ یہ سلطنت ایک دولت مند قوم کی سلطنت تھی، جس نے شاندار عمارتیں بنائیں جس کی تہذیب کالدیہ کی تہذیب سے مشابہ اور ترقی یافتہ تھی اور جس کا مذہب بابل کے مذہب سے ملتا جلتا تھا۔ اس قوم کی مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو شدید قسم کی اخلاقی خرابیاں اور فحش رسوم تھیں۔ (241)

اسی طرح قوم عاد اور قوم ثمود کی تباہی کے بارے میں جو نیم افسانوی اور نیم تاریخی روایات ہیں۔ اُن میں ہمیں اشوریوں اور عربوں یعنی سامیوں کے سیلاب کے ہاتھوں نسل حامی کی تباہی کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ (242)

آل یعقوب جب اپنے بے پناہ دشمنوں سے بھاگ کر جزیرہ نمائے عرب میں آئی تو اپنے قصے اور روایات اپنے ساتھ لائی جنہوں نے عربی لوک کہانیوں میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔ سامی مہاجرین میں سے جو لوگ سب سے اخیر میں آئے وہ اپنے آپ کو اولاد ابراہیم کہتے تھے اور ان کے ہمسائے بھی اس امر کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ اعتقاد پشت بہ پشت روایۃً چلا آ رہا تھا اور اس نے ایک مسلمہ امر کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جب مانوی مذہب کے پاؤں ایران اور بازنطین سے اکھڑ گئے تو اس نے بھی سرزمین عرب کا رخ کیا۔ (243)

اس آزاد ملک میں دوسیتیوں (The Docetes) مارشونیوں (The Marcionites) ولینٹینیوں (The Valentinians) سب کے نام لیوا موجود تھے۔ ان سب نے اپنے خیالات اور اپنی روایات کی اشاعت کی، جو رفتہ رفتہ مقامی خیالات و روایات کے ساتھ خلط ملط ہو گئیں۔ یہ عیسائی فرقے تقلید پرستوں کے جبر وتشدد کے باوجود اس عقیدے پر مضبوطی سے قائم تھے کہ حضرت عیسٰی خدائے مجسم یا کم از کم خدا کے بیٹے اور خدا کا کلام تھے، جس نے ابدیت کے بطن سے جنم لیا اور جو نورِ عرش کا ایک صدور تھا اور جس کا صلیب پر مر جانا محالات میں سے تھا۔ ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ رنج وکرب کے وہ کلمات جو حضرت عیسٰی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں ہرگز ان کے لب پر نہیں آ سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ جس شخص نے صلیب پر کھینچے جانے کی اذیت سہی وہ خداوند عیسٰی نہ تھا اور حضرت عیسٰی جلادوں کے ہاتھوں سے بچ کر عرش بریں پر واپس چلے گئے۔ (244)

یہ نظریہ بظاہر چاہے کتنا ہی مستبعد کیوں نہ لگتا ہو، پھر بھی حضرت عیسٰی کے ابن اللہ ہونے کے عقیدے سے نسبۃً زیادہ مطابقت رکھتا ہے اور چند مضبوط قیاسات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ فلوطس (Pilate) کی، جس کی بابت ٹرٹلین (Tertullian) کہتا ہے کہ وہ درپردہ عیسائی تھا، یہ زبردست خواہش کہ حضرت عیسٰی کی جان کسی طرح بچا لے۔ (245)

ہیرودیس (Herod) کا اس پر آمادہ نہ ہونا کہ نبی ناصری کے قتل سے اپنے خلاف نفرت عام کو اور بڑھائے، جب یہ عظیم محسن انسانیت دن بھر کے ہولناک ہنگاموں کی تکمیل کی خاطر صلیب کی طرف لایا گیا تو اس وقت جو جھٹ پٹا ہوا تھا، وہ خارق عادت تاریکی جو اس ڈرامے کے سب سے دہشت ناک منظر کے وقت روئے ارض پر طاری تھی۔ (246)

یہ سب حالات وواقعات اس عقیدے کو قرین قیاس بنا دیتے ہیں کہ معصوم بچ گیا اور مجرم نے سزا پائی۔ (اگر اس عجیب وغریب عقیدے کو کوئی چیز اس سے بھی زیادہ قرین صحت بنا سکتی ہے تو وہ کتاب لوقس کا یہ بیان ہے کہ حضرت عیسٰی نے قبر سے اٹھنے کے بعد اپنے

شاگردوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ ان کے جسم کو چھو کر اپنی تسلی کر لیں کہ وہ فی الواقعہ زندہ ہیں اور جیسا وہ خیال کئے ہوئے تھے محض ایک روح نہیں ہیں اور پھر انہوں نے کچھ کھانے کو مانگا اور ایک ابلی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا)۔

ظہور محمدیؐ سے پہلے یہ روایات، جو واقعات پر مبنی تھیں لیکن خیالی رنگوں میں رنگی گئی تھیں، لوگوں کے عقائد میں مضبوطی سے گھر کر چکی ہوں گی اور ملک کی لوک کہانیوں کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہوں گی۔ جب حضرت محمدؐ نے تبلیغ اسلام شروع کی تو آپؐ نے ان روایات کو عرب کے لوگوں میں متداول پایا۔ آپؐ نے انہیں لے کر عربوں اور قرب و جوار کی قوموں کو معاشرتی اور اخلاقی پستی کے اس گڑھے سے نکالنے کی خاطر جس میں وہ گرے ہوئے تھے ایک بیرم کے طور پر استعمال کیا۔ وہ نور جو طور سینا میں چمکا تھا، وہ نور جس نے گلیلی کے کسانوں اور ماہی گیروں کی زندگیوں کو روشن کر دیا تھا، اب فاران کی چوٹیوں پر جلوہ نما ہوا۔

("جاء اللہ من سیناء و اشرق من ساعیرا و استعلیٰ من فاران" ۔یاقوت "معجم البلدان" میں لکھتا ہے: "ساعیر فلسطین کی اور فاران مکے کی ایک پہاڑی ہے")۔ (247)

مستشرقین کے اعتراضات اور امیر علی کا موقف

روح اسلام میں تعدد ازدواج:

امیر علی مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اپنا موقف واضح کرتے ہیں کہ: تعدد ازدواج کے سوال پر امیر علی ایک مدافعتی ومعذرت خواہانہ تاریخ تناظر سے قریب تر نظر آتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآنی احکامات کا رجحان یہ تھا کہ اسلام میں جو یہ پرائی تاریخی روایت کے ذریعے موروثی طور پر آئی تھی، پہلے اس کو محدود و مشروط کیا جائے اور بالآخر اسے بالکل ختم کر دیا جائے انہوں نے چراغ علی کے اس استدلال کو نقل کیا اور دہرایا ہے کہ نکاح میں محبت کے ساتھ انصاف ضروری ہے اس کے بعد وہ کچھ زیادہ روایتی مؤقف اختیار کرتے ہیں اور تعدد ازدواج کے اخلاقی جواز کے ضمن میں وہ بعض مخصوص حالات اور تاریخی مواقع کا سہارا لیتے اور روایت پسند اسلام میں عورتوں کی مزید کمزوریوں اور معذوریوں کو وہ تاریخی ورثہ قرار دیتے ہیں جنہیں فقہائے قبول کر کے مجبر کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں جن قرآنی احکامات میں عورتوں کو کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ محض وقتی تھے اور عربوں کے اس دور کے مسائل سے متعلق تھے۔ (248)

تعدد ازدواج کے بارے میں مولانا امیر علی روح اسلام میں لکھتے ہیں کہ:

معاشرتی نشوونما کے ایک مرحلے میں تعدد ازدواج (Polygyny)، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں تعدد ازواج (Polygamy) یعنی ایک مرد کا بیک وقت ایک سے زیادہ عورتوں کا شوہر ہونا، ایک ناگزیر امر ہوتا ہے۔ قدیم زمانوں میں آئے دن کی قبائلی جنگوں کے باعث مردوں کی آبادی میں جو کمی واقع ہو جایا کرتی تھی جس سے عورتوں کے عددی تناسب کا پلہ بھاری ہو جایا کرتا تھا، کچھ اس کی بدولت اور کچھ اس وجہ سے کہ قبائلی سرداروں کو جو مرد ہوتے تھے مطلق اختیار حاصل تھا یہ دستور وجود میں آیا، جسے ہمارے ترقی یافتہ زمانے میں بجا طور پر ایک ناقابل برداشت خرابی سمجھا جاتا ہے۔

پرانے وقتوں کی تمام شرقی اقوام کے یہاں تعدد ازدواج ایک مانا ہوا ادارہ تھا۔ چونکہ بادشاہ جو صفت الٰہیت سے متصف سمجھے جاتے تھے اس پر عمل کرتے تھے، لہٰذا یہ رواج عام لوگوں کی نظروں میں مقدس ہو گیا۔ ہندوؤں کے یہاں تعدد ازدواج چند زنی اور چند شوئی دونوں صورتوں میں قدیم ترین زمانوں سے رائج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مادیوں بابلیوں، اسوریوں اور ایرانیوں کی طرح ہندوؤں میں بھی ایک مرد بہ یک وقت لاتعداد عورتوں کا شوہر ہو سکتا تھا۔ اونچی ذات کے برہمن کو آج کل کے زمانے میں بھی جتنی بیویاں وہ چاہے اتنی بیویوں کی اجازت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت سے پہلے بنی اسرائیل کے یہاں بھی تعدد ازواج کا دستور تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے قائم رہنے

دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کی کوئی حد بھی مقرر نہ کی کہ ایک یہودی مرد بیک وقت کتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا تھا۔ بعد کے زمانے میں تلمود یروشلم نے یہ پابندی عائد کی کہ ایک مرد صرف اتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے جتنی عورتوں کو نان ونفقہ مہیا کرنے کی اس میں استطاعت ہو، اگرچہ ربیوں کی یہ ہدایت تھی کہ کسی مرد کے چار سے زیادہ بیویاں نہ ہونی چاہئیں، لیکن قرائین (Karaites) کو اُن سے کوئی اختلاف رائے تھا اور وہ تعیین حد کے قائل نہ تھے۔ ایرانیوں کے مذہب نے بیویوں کی کثرت کو قابل انعام قرار دیا۔(249)

سُوری فینیقی قوموں میں جنہیں بنی اسرائیل نے جلاوطن مسخر یا تباہ کیا، تعدد ازواج بہیمیت کی حد تک گر گیا تھا۔

تھریس (Thrace)، لیڈیا (Lydians) اور پیلاسگیا (Pelasgian) کی قوموں کے یہاں، جو یورپ اور مغربی ایشیا کے مختلف حصوں میں آباد تھیں، تعدد ازواج حد اعتدال سے اس قدر متجاوز ہوگیا تھا کہ کوئی دوسری قوم اس امر میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔(250)

اہل ایتھنز کے یہاں جو زمنۂ قدیم کی تمام قوموں سے زیادہ مہذب اور شائستہ تھے، بیوی محض ایک اثاثہ تھی جو خرید وفروخت کیا جا سکتا تھا، بلکہ وصیۃً منتقل بھی کیا جا سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک بری چیز سمجھی جاتی تھی، جو محض گھر بار چلانے اور بچے جننے کے لئے ضروری تھی۔ ایتھنز کے شہریوں کو بے حد وحساب بیویوں کی اجازت تھی، چنانچہ ڈیموستھینز (Demosthenes) فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس کی قوم میں عورتوں کے تین طبقے تھے۔ جن میں سے دو طبقے نکاحی بیاہی اور نیم نکاحی بیاہی عورتیں مہیا کرتے تھے۔(251)

اہل سپارٹا (The Spartans) کے یہاں مردوں کو خاص حالات کے سوا ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہ تھی، لیکن عورتوں کو بہ یک وقت متعدد شوہروں کی اجازت تھی اور اس اجازت سے تقریباً ہمیشہ فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔(252)

جن مخصوص حالات میں رومی مملکت قائم ہوئی انہوں نے غالباً اس امر کی اجازت نہ دی کہ شروع شروع میں تعدد ازواج کو قانوناً جائز قرار دیا جائے۔ سابی (Sabine) عورتوں کے استحصال بالجبر کے قصے کی تاریخی صداقت چاہے کچھ بھی ہو، اس قصے کا موجود ہونا ہی اُن اسباب کا شاہد ہے جن کی بناء پر رومیوں نے شادی سے متعلق اپنے غیر مہذب قوانین وضع کئے۔ آس پاس کی مملکتوں اور بالخصوص ایٹرسکنوں (The Etruscans) کے یہاں تعدد ازواج ایک ایسا رواج تھا جس کے ساتھ چند رعایات وابستہ تھیں۔ رومیوں کو اٹلی کی دوسری قوموں سے جو سابقہ پڑا اور جن جنگوں اور فتوحات میں وہ صدیوں تک مشغول رہے انہوں نے عیش وعشرت کی اُن عادتوں سے مل کر جو کامیابی اور خوشحالی نے پیدا کی تھیں، بالآخر رومیوں کے یہاں شادی کے تقدس کو محض ایک کہاوت بنا دیا۔ تعدد ازواج قانوناً جو جائز نہ تھا، لیکن "پیونک (Punic) جنگوں میں ظفر مندی کے بعد رومہ کی خواتین کے دلوں میں ایک آزاد اور خوشحال مملکت کی منفعتوں سے متمتع اندوز ہونے کی امنگیں پیدا ہوئیں، اور اُن کی امنگیں اُن کے خاوندوں اور عاشقوں کی نفس پرستیوں نے پوری کردیں"۔(253)

تھوڑی ہی مدت کے بعد شادی بے محابا داشتہ بازی کی ایک صورت بن گئی۔ قوانین مملکت کی تائید حاصل کر کے داشتہ بازی کا ایک ایسا ادارہ بن گئی جو مراعات خاص کا مستحق تھا۔ عورتوں کی کھلم کھلا آزادی، مردوں کے ساتھ اُن کا ڈھیلا ڈھالا رشتہ، بیویوں کے کثیر الوقوع تبادلے، یہ سب چیزیں تعدد ازواج پر دلالت کرتی ہیں، البتہ انہیں یہ نام نہیں دیا گیا۔

دریں اثناء جس ابتدائی عیسائیت کی تبلیغ گلیلی کے ساحل پر ہوئی تھی اس نے ساری رومی دنیا کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اسینیوں (Essenes) کے اثرات نے جن کا واضح ثبوت حضرت عیسیٰ ؑ کی تعلیمات میں ملتا ہے، اُن کی اس قوی امید سے مل کر کہ آسمانی بادشاہی قائم ہونے والی تھی، انہیں اس پر آمادہ کیا کہ ازدواجی زندگی کو مذموم قرار دیں، اگرچہ انہوں نے کبھی اسے صراحۃً منع نہیں کیا۔

جب تک جسٹینین (Justinian) کے قوانین نے تعدد ازواج کو ممنوع قرار نہ دیا اس وقت تک وہ ایک نمایاں صورت میں رائج رہا۔ بلکہ قانونی ممانعت نے بھی لوگوں کے اخلاقی خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ چنانچہ تعدد ازواج پر اس وقت تک عمل ہوتا رہا جب تک کہ جدید معاشرے کی رائے نے اسے معیوب قرار نہ دیا۔ پہلی بیوی کے سوا کسی بیوی کو کوئی قانونی حقوق حاصل نہ تھے۔ اُن حقوق اور مراعات

سے محروم رہ کر جو پہلی بیوی کو حاصل تھے، دوسری بیویاں اپنے خاوند کی من کی موج کی غلام ہوتی تھیں، اُن کے بچوں پر حرامزدگی کا کلنک کا ٹیکہ لگا ہوتا تھا، وہ باپ کی جائیداد میں سے ایک حصے کے بھی حقدار نہ ہوتے تھے اور سماج میں ذات پات سے خارج شمار کیے جاتے تھے۔

اونچے طبقے کے مردوں کی نیچے طبقے کی عورتوں سے شادیاں جن میں ایک شرط نکاح یہ ہوتی تھی کہ اولاد کو کوئی حق وراثت نہ پہنچے گا اور ایسی شادیاں جن میں اس امر کی علامت کے طور پر کہ بیوی کو اور اس کی اولاد کو کوئی حقوق وراثت نہیں، دولہا اپنا بایاں ہاتھ دلہن کو تھما دیتا تھا، دونوں کی طرح شادیاں صرف اعلیٰ طبقے ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ عام تھیں۔ اور تو اور، پادری لوگ بھی اپنے عہد تجرد کو بھول کر ایک سے زیادہ شرعی یا غیر شرعی شادیاں کیا کرتے تھے۔ تاریخ حتمی طور پر ثابت کرتی ہے کہ پچھلے چند سالوں سے پیشتر تعدد ازواج کو اتنا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا جتنا اب سمجھا جاتا ہے۔ اوروں کا تو تذکرہ ہی کیا، خود سینٹ آگسٹین (254)

(کو اس میں کوئی بنیادی خرابی ٔ اخلاقی یا معصیت نظر نہ آتی تھی، چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر وہ کسی ملک میں قانوناً جائز تھی تو اسے شرعی نواہی میں شمار نہ کرنا چاہیے۔ ہیلم (Hallam) کے قول کے مطابق جرمن مصلحین نے ابھی سولھویں صدی میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ ہونے کی صورت میں یا اسی طرح کے اور اسباب کی بنا پر دوسری شادی بلکہ تیسری بھی جائز ہے۔

بعض محققین، اگرچہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تعدد ازدواج میں کوئی بنیادی خرابی ٔ اخلاقی نہیں اور حضرت عیسیٰؑ نے قطعاً یا صراحتاً اس کی ممانعت نہیں کی، تاہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ یک زوجگی کا جو دستور یورپ میں آجکل عام ہے وہ عیسائیت پر جرمن اور یونانی و رومی خیالات کا پیوند لگ جانے کا نتیجہ ہے۔ (M. Barthelemy. St Hilaire)

یہ رائے تاریخی واقعات کے منافی ہے اور قابل تسلیم نہیں۔ جہاں تک جرمنوں کا تعلق ہے، اس دعوے کی تائید کہ اُن کے یہاں ہمیشہ سے یک زوجگی کا دستور تھا صرف دو ایک رومیوں کی غیر مصدقہ شہادت سے ہوتی ہے، جس کا اعتبار اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ واقعات کے معاملے میں رومی بالکل غیر معتمد گواہ تھے اور اگر اخفائے حقیقت سے انہیں کوئی ذاتی فائدہ متوقع ہوتا تو کبھی اس سے گریز نہ کرتے تھے۔ علاوہ بریں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ٹیسی ٹس (Tacitus) نے اپنی کتاب ''جرمنوں کے طور طریقے'' (The manners of the Germans) لکھی وہ کیا تھا۔ یہ کتاب خود رومیوں کی شہوت پرستی پر ایک حملہ تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ بربر قوموں کے فرضی محاسن سے رومیوں کے پست اخلاق کا موازنہ کر کے روم کے معاشرے کو بہتر خیالات سے روشناس کرایا جائے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ٹیسی ٹس کی رائے درست تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمنوں کے اعلیٰ طبقوں میں انیسویں صدی تک تعدد ازواج کا جو عام رواج تھا اس کی توجیہہ کیونکر کی جا سکتی ہے۔ (255)

ابتدائی زمانے میں رومیوں کے یہاں جو رواج بھی رہا ہو یہ واضح ہے کہ جمہوریت روما کے آخری ایام میں اور سلطنت روما کے آغاز میں تعدد ازواج یقیناً ایک تسلیم شدہ رواج تھا یا کم از کم خلاف قانون نہ سمجھا جاتا تھا۔ جس فرمان نے اس رواج کی عمومیت کو محدود کیا اس میں اس کا وجود اور اس کی مشق دونوں مفروض ہیں۔ یہ فرمان اس خرابی کو رفع کرنے میں یا رائے عامہ کی رَو کا رخ بدلنے میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ ایک طرف تو اس سے ظاہر ہے کہ شہنشاہان اونوریس (Honorius) اور آرکیڈیس (Arcadius) نے چوتھی صدی عیسوی کے اخیر میں اسے از سر نو جاری کیا اور دوسری طرف اس سے کہ قسطنطین اور اس کے بیٹے دونوں کے متعدد بیویاں تھیں۔ شہنشاہ ویلنٹینین ثانی (Valentinian) نے ایک نئے فرمان کے ذریعے سلطنت کے تمام مردوں کو متعدد بیویاں رکھنے کی عام اجازت دی۔ اس زمانے کی تاریخ کلیسا سے اس امر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ بشپوں اور عیسائی گرجاؤں کے سربراہوں نے اس قانون پر کوئی اعتراض کیا۔ (256)

کلیسا کا اعتراض کرنا تو بجائے خود رہا، ویلنٹینین کے بعد جتنے شہنشاہ آئے سب نے تعدد ازواج پر عمل کیا اور لوگوں نے ان کی مثال کی تقلید میں کوتاہی نہ کی۔ قانون کی یہ صورت حال شہنشاہ جسٹینین (Justinian) کے وقت تک برقرار رہی، جب اس دانشمندی اور تجربہ

کاری نے جو ترقی اور نشوونما کی تیرہ صدیوں کا جمع شدہ ما حصل تھی اپنے آپ کو توان قوانین کی صورت میں ظاہر کیا جنہوں نے اس شہنشاہ کے بدنام دورِ حکومت پر ایک جھوٹا ملمع چڑھا دیا۔ لیکن یہ قوانین کم از کم براہ راست عیسائیت کے مرہونِ منت نہ تھے۔ جسٹینین کا سب سے نمایاں مشیر ایک ملحد تھا۔ جسٹینین نے تعددِ ازدواج کو قانوناً تو منع کر دیا، لیکن اس کی طرف لوگوں کا جو عام رجحان تھا اس کی روک تھام نہ کر سکا۔ قانون فکری ترقی کا آئینہ دار تھا۔ اس کا اثر چند ارباب فکر تک محدود رہا۔ جہاں تک عوام کا تعلق تھا ان کے لئے وہ محض ایک تقدیم پارینہ تھا۔

یورپ کے مغربی حصے میں بربریوں کے زبردست ہنگامے اور ان کے اخلاقی خیالات کے مقامی لوگوں میں نفوذ کر جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ بعض بربریوں کے قانونی ضابطوں میں تعددِ ازدواج (تھیوڈورک کے قوانین کی طرح۔ لیکن یہ ضابطے بازنطینی تصورات پر مبنی تھے) سے متعلق پابندیاں تھیں۔ لیکن قول کی بہ نسبت عمل زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ ان کے بادشاہوں نے بہت سی بیویاں کرنے کی جو مثال پیش کی عوام الناس نے فوراً اس کی تقلید کی اور تو اور پادری لوگ بھی اس کے باوجود کہ کیسا انہیں تجرد کی تلقین کرتا تھا، متعدد نیم منکوحہ بیویوں کے رواج سے مستفید ہونے لگے۔ اس کے لئے مقامی بشپ یا مقامی (Diocese) کے سربراہ کی اجازت کافی ہوتی تھی۔ (257)

عیسائی مصنفین کو اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ تشنیع طلب یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے تعددِ ازدواج کی داغ بیل ڈالی یا اُسے قانونی حیثیت دی۔ یہ خیال کہ وہ اس کے موجد تھے محض جہالت کا نتیجہ اور ثبوت تھا اور تحقیق نے اس کی دھجیاں اڑا دی ہیں، لیکن یہ خیال اب بھی نہ صرف عیسائی دنیا کے عوام میں بلکہ بہت سے ارباب علم میں رائج ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس دستور کو اختیار کیا اور اسے قانونی جواز بخشا۔ اس سے بڑھ کر باطل کوئی عقیدہ نہیں ہو سکتا۔

تعددِ ازدواج نہ صرف عربوں کے یہاں بلکہ ہمسایہ ملکوں کے لوگوں کے یہاں رائج تھا اور مؤخر الذکر کے یہاں تو اس نے نہایت کریہہ شکلیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ بجا ہے کہ عیسائی مملکت کے قوانین نے اس خرابی کے رفع کرنے کی کوشش کی تھیں، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے تھے۔ تعددِ ازدواج کی رسم روک ٹوک کے بغیر جاری رہی۔ پہلی بیوی کے سوا، جسے محض تقدم زمانی کے طفیل ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوتی تھی باقی سب بیویوں کو عدم حقوق کی سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔

آنحضرت ﷺ کے ظہور کے وقت ایران میں خرابیٔ اخلاق نہایت افسوسناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ازدواج کے بارے میں کوئی مسلم قانون نہ تھا اور اگر تھا بھی تو اُس پر مطلق عمل نہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ ژند اوستا میں بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ کی گئی تھی لہٰذا ایرانیوں کے نہ صرف بہ یک وقت متعدد بیویاں ہوتی تھیں بلکہ ان کے علاوہ لاتعداد داشتہ عورتیں بھی۔ (258)

قدیم عربوں اور یہودیوں کے یہاں متعدد بیویوں کے علاوہ مشروط اور عارضی عقد بھی ہوتے تھے۔ عائلی اخلاق کے بارے میں اس ڈھیل نے معاشرے کے نظام پر نہایت مضر اثر ڈالا۔ آنحضرت ﷺ نے جو اصلاحات کیں ان سے عورتوں کی حیثیت بدرجہا بہتر ہو گئی۔ کیا یہودی اور کیا بدوی عرب دونوں کے یہاں عورتوں کی حالت نہایت خستہ وخراب تھی۔ ایک یہودی بدوی لڑکی اپنے والد کے گھر میں ایک نوکرانی کی حیثیت رکھتی۔ سن بلوغ سے پہلے اس کے والد کو اختیار ہوتا تھا کہ جی چاہے تو اسے بیچ ڈالے۔ باپ کی وفات کی صورت میں بھائیوں کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا تھا۔ بیٹی کو ورثے میں ایک حبہ نہ جڑتا تھا، الا اس صورت کے کہ کوئی مرد وارث ہی نہ ہو۔ (گنتی۔ ب 17-30) شہری عرب کفار کے یہاں، جن پر ارد گرد کی مملکتوں کے فاسد اور انحطاط یافتہ تمدن کا اثر ہو چکا تھا، عورت محض ایک چیز بست سمجھی جاتی تھی، اور اپنے خاوند یا باپ کی جائیداد کا ایک حصہ شمار کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک متوفی مرد کی بیوائیں دوسرے املاک کی طرف اس کے بیٹوں کو ورثے میں ملتی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھیں وہ سوتیلے بیٹوں اور سوتیلی ماؤں کی آپس میں شادیاں جنہیں اسلام نے نکاح المقت (شرمناک یا مکروہ نکاح) کے نام سے مطعون کر کے منع کر دیا۔ یمن کے نیم یہودی اور نیم صابی قبیلوں کے یہاں تو ایک عورت کے بیک وقت بہت سے

مردوں کی بیوی ہونے کا دستور بھی تھا۔ (259)

اعراب جاہلیت کو عورتوں سے اس درجہ نفرت تھی کہ وہ اکثر اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ یہ خوفناک دستور قریش اور کندہ کے قبیلوں میں سب سے بڑھ کر رائج تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے غضب آمیز الفاظ میں اس کی مذمت کی اور سخت سزائیں مقرر کر کے اس کا اسی طرح انسداد کیا جس طرح انہوں نے بچوں کو بتوں کی بھینٹ چڑھانے کی رسم کا قلع قمع کیا، جس پر قریش و کندہ کے قبیلے قدیم زمانے کی اکثر قوموں کی طرح عمل کرتے تھے۔

ایرانی اور بازنطینی مملکتوں میں عورتوں کا معاشرتی درجہ بے حد پست تھا۔ بہت سے مذہبی دیوانے جنہیں بعد کے زمانوں میں کیسا نے ولایت کا رتبہ بخشا، ان کے خلاف وعظ کرتے تھے اور ان کی خباثتیں بیان کرتے تھے۔ وہ یہ بھول جایا کرتے تھے کہ انہیں عورتوں میں جو برائیاں دکھائی دیتی تھیں وہ ان کے متعصب دماغوں کی پیداوار تھیں۔ ایسے وقت میں، جب معاشرے کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، جب وہ تمام رشتے جنہوں نے معاشرے کو استواری بخش رکھی تھی ٹوٹ رہے تھے، جب ہر طرف سے یہ شور اٹھ رہا تھا کہ تمام پرانے نظاموں کو تجربے کی ترازو میں تول کر دیکھا گیا اور سب کے سب ناقص پائے گئے ایسے وقت میں پیغمبر اسلام کی اصلاحات عورتوں کے حق میں ایک آیہ رحمت بن کر آئیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی مذہبی تعلیمات کا ایک بنیادی عنصر عورتوں کا احترام تھا۔ آپؐ کے متبعین کے دلوں میں آپؐ کی دختر نیک اختر کی جو عزت تھی اس کی بناء پر انہوں نے اسے "خاتون جنت" کا لقب دیا، جو صنف اناث کی خدمت میں ایک خراج عقیدت تھا۔ "فاطمہ الزہرا" ان تمام قدسی صفات کا مجسمہ تھیں جو خدا نے عورت کی ذات میں ودیعت کی ہیں، یعنی خلوص، صداقت اور پاکیزگی اور تمام وہ صفات محمودہ جو انسان کے مثالی کمال کی آئینہ دار ہیں ان سے ایسی خواتین کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جن کے محاسن وفضائل نے صنف اناث کو چار چاند لگا دیئے کون ہو گا جس نے ولیۂ رابعہ اور ان کی قبیل کی ہزاروں نیک بیبیوں کا نام نہ سنا ہو؟ (260)

جو قوانین رسول عربی ﷺ نے نافذ کئے ان میں آپؐ نے مشروط نکاحوں کا قاعدہ قطعاً ممنوع قرار دیا۔ جہاں تک عارضی نکاحوں کا تعلق تھا، اگرچہ شروع شروع میں علانیہ ممانعت نہ کی گئی، لیکن تیسرے سنہ ہجری میں یہ بھی حرام کر دی گئیں۔ (شیعوں کا ایک گروہ عارضی نکاحوں کو اب بھی مباح قرار دیتا ہے لیکن جن مجتہدین نے اس رائے کا اظہار کیا ہے، اگرچہ میں ان کا احترام کرتا ہوں، تاہم میں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ یہ رائے وقتی مذاق کی تسکین یا سلاطین وقت کو خوش کرنے کی خاطر ظاہر کی گئی تھیں۔ ان مجتہدین کی آراء میں جا بجا ذاتی میلانات کے آثار پائے جاتے ہیں)۔

حضرت محمدؐ نے اپنے آئینی نظام میں عورتوں کو ایسے حقوق عطا کئے جو اس سے پہلے انہیں کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ آپؐ نے انہیں ایسی ایسی خصوصی مراعات بخشیں جن کی قدرشناسی زمانہ کچھ اور ترقی کرنے کے بعد کرے گا۔ آپؐ نے تمام قانونی اختیارات و وظائف میں عورتوں کو مردوں کے برابر مرتبہ بخشا۔ انہوں نے بیویوں کی تعداد کی شرعی حد مقرر کر کے اور سب بیویوں سے مساوی سلوک کی شرط شوہروں پر عائد کر کے تعداد ازدواج پر پابندی لگا دیں۔ یہ قابل ملاحظہ ہے کہ قرآن کی جو آیت بیک وقت چار بیویوں کی اجازت دیتی ہے اس کے فوراً بعد ایک ایسا جملہ ہے جو اس آیت کے دائرہ اطلاق کو مناسب طور پر محدود کر دیتا ہے۔ آیت یہ ہے: "اور عورتوں میں سے جو تمہیں بھائیں دو، تین یا چار بیویاں کر سکتے ہو"، اس کے بعد کا جملہ یہ ہے: "لیکن اگر تم سب کے ساتھ عدل وانصاف کا سلوک نہیں کر سکتے تو تمہیں صرف ایک ہی عورت پر اکتفا کرنا چاہئے"۔ دنیائے اسلام کے اکابر مفکرین نے بالخصوص اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ لفظ "عدل" کے معنی محاورۂ قرآن میں کیا ہیں اس جملۂ شرطیہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ "عدل" سے عبارت صرف مکان، لباس اور دوسری خانگی ضروریات کے معاملے ہی میں مساوات سلوک نہیں، بلکہ محبت، شفقت اور عزت کے معاملے میں بھی مکمل مساوات۔ چونکہ جذبات کے معاملے میں کامل عدل وانصاف ناممکن ہے لہٰذا قرآن کا یہ حکم فی نفسہ ایک ممانعت ہے۔ یہ تفسیر زمانۂ حال کی نہیں، بلکہ تیسری صدی ہجری میں کی گئی۔ (ردالمختار

میں صراحۃً لکھا ہے: ''بعض حکماء (معتزلہ) یہ رائے رکھتے ہیں کہ عدل میں محبت و شفقت کی مساوات شامل ہے، لیکن ہمارے آئمہ اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں اور عدل کو نفقہ کے معاملے میں مساوی سلوک تک محدود خیال کرتے ہیں جس سے قانون کی زبان میں کھانا، کپڑا اور مکان مراد ہے'')۔

خلیفہ المامون کے عہد میں اولین حکمائے معتزلہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ تکمیل یافتہ شریعت قرآنی وحدت ازدواج کا تقاضہ کرتی ہے۔ اگرچہ خلیفہ متوکل کے مجنونانہ تعصب نے اس سے جو مظالم کروائے انہوں نے اس تعلیم کی اشاعت کو روک دیا۔ تاہم تمام ترقی یافتہ مسلم جماعتوں میں یہ یقین رفتہ رفتہ پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج تعلیمات محمدیؐ کے اسی قدر منافی ہے جس قدر وہ تہذیب و تمدن کی عموی ترقی کے منافی ہے۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعدد ازدواج کا وجود حالات پر منحصر ہے۔ بعض بعض اوقات اور بعض بعض حالات میں یہ عورتوں کو بھوک ننگ اور ناداری سے بچانے کی خاطر بالکل ناگزیر ہوتا ہے۔ اگر اخبار و اطلاعات اور اعداد و شمار واقعات کی سچی آئینہ داری کرتے ہیں تو مغرب کے تہذیبی مرکزوں میں جو فسق و فجور پایا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ انتہائی افلاس و ناداری کا نتیجہ ہے۔ (261)

فکر کی ترقی کے ساتھ ساتھ، حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ، تعدد ازدواج کی ضرورت ناپید ہوتی جاتی ہے اور اس کی مشق یا خود بخود متروک ہو جاتی ہے یا علی الاعلان ممنوع قرار پاتی ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان مسلم ممالک میں جہاں وہ حالات جنہوں نے اس کے وجود کو لازمی بنایا تھا معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ تعدد ازدواج کو مذموم اور تعلیمات قرآنی کے نقیض سمجھا جانے لگا ہے، لیکن جن ممالک میں معاشرے کے حالات مختلف ہیں اور جہاں عورتوں کو وہ وسائل مہیا نہیں جو ترقی یافتہ جماعتوں میں انہیں اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بخشتے ہیں، وہاں ناگزیر ہے کہ تعدد ازدواج کا وجود برقرار رہے۔ ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ چونکہ یہ آزادئ تاویل سوفسطائی دقیقہ سنجیوں کی گنجائش چھوڑتی ہے، اس لئے تعدد ازدواج کی مطلق ممانعت ایک مشکل کام ثابت ہوگی۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک زوردار اعتراض ہے، جو ان تمام مسلمانوں کی توجہ کا مستحق ہے جو اسلامی تعلیمات کو اس الزام سے بری کرنا چاہتے ہیں جو ان پر کیا گیا ہے اور ترقی تہذیب کے دوش بدوش قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ قوانین میں لوچ اور لچک کا ہونا ان کی منفعت و افادیت کا سب سے بڑا معیار ہے۔ یہی تعدد ازدواج کے موضوع پر قرآن کے حکم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ حکم متمدن سے متمدن معاشرے کے لئے بھی اور کم سے کم متمدن معاشرے کے لئے بھی موزوں ہے۔ یہ نہ ترقی پذیر جماعتوں کی ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے نہ اس امر کو فراموش کر دیتا ہے کہ دنیا میں ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں جن کے لئے یک زوجگی ایک بہت بڑی خرابی ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال تعدد ازدواج کا استیصال اتنا مشکل نہیں جتنا تصور کیا جاتا ہے۔ مسلمان جس لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں وہ محض اس قدماء پرستی کا نتیجہ ہے جس نے اجتہاد کو مسدود کر دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب معلم اسلام کے اپنے ارشادات سے رجوع اس مسئلے کا فیصلہ کر دے گا کہ آیا مسلمان ارشادات نبویؐ پر عمل کریں گے یا متقدمین فقہا کی تفسیروں پر، جنہوں نے اپنے من مانے خیالات منوانے کی خاطر یا جن خلفاء و سلاطین کے وہ بندگان فرمان تھے ان کی خود سرانہ آراء کی تائید کے لئے شارع کے الفاظ کا مطلب عمداً ماؤف کیا ہے۔ یورپ اس عمل میں سے گزر چکا ہے۔ اسے چاہئے کہ دین محمدی کو تمراؤں کا تختۂ مشق بنانے کی بجائے تجدید یافتہ اسلام کی ان کوششوں کا تحمل و ہمدردی سے مشاہدہ کرے جو وہ قدماء پرستی کے بندھنوں سے چھٹکارا پانے کے لئے کر رہا ہے۔ جب پرانے خیالات کی غلامی سے آزادی حاصل ہو گئی تو ہر مسلم مملکت کے ارباب فقہ کے لئے یہ ممکن ہو جائے گا کہ ایک مستند فتوے کے ذریعہ اپنی اپنی مملکت میں تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دے دیں۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہوگا جب حالات و واقعات اور پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کے سمجھنے میں عام ترقی ہوگی۔ جس نئی روشنی میں آپؐ کے ارشادات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے وہ تعدد ازدواج کو تاریکی کی طرح دور کر رہی ہے۔ (262)

پیغمبر اسلامؐ کی اصلاحات نے شرقی قانون سازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا۔ آپؐ نے مردوں کے اختیار طلاق پر پابندیاں عائد کیں، لیکن آپؐ نے عورتوں کو معتدل اسباب کی بنا پر خلع کا حق عطا کیا اور اپنی زندگی کے آخری دور میں تو آپؐ نے ثالثوں اور قاضی کی وساطت کے بغیر مردوں کے لئے حق طلاق کا استعمال عملاً ممنوع کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''خدا کے نزدیک تمام مباح اعمال میں سب سے زیادہ غیر مقبول عمل طلاق ہے''۔ کیونکہ وہ ازدواجی خوشی میں مخل اور بچوں کی صحیح تربیت کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے طلاق کی جو اجازت دی ہے، اگرچہ اُس نے قدیم رواج کی کسی حد تک تائید کی، تاہم ضروری ہے کہ اُس کی تفسیر شارع کے اعلانات و ارشادات کی روشنی میں کی جائے۔ اگر ہم یہ ملحوظ خاطر رکھیں کہ نظامِ اسلامی میں دین اور شریعت کا کتنا گہرا تعلق ہے تو ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ نبی کے ارشادات و اعلانات طلاق کے دستور کے لئے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ (263)

رسول عربیؐ کے قوانین و ہدایات کی بدولت عورتوں کی حیثیت میں جو بہتری ہوئی اُس کا اعتراف تمام غیر متعصب مصنفین نے کیا ہے لیکن متعصب کج بحث اب بھی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام نے عورتوں کی حیثیت کو پست کر دیا۔ اس سے جھوٹا الزام اسلام کے عظیم بانی پر نہیں لگایا گیا۔ انیس صدیوں کی مسلسل ترقی نے ایک قدیم تر تہذیب کے ورثے کے ساتھ مل کر اور انتہا درجے کے موافق نسلی حالات و آب و ہوا سے فائدہ اٹھا کر بیشتر عیسائی ملکوں میں عورتوں کو مردوں سے بلند تر معاشرتی درجہ عطا کر دیا ہے اور آداب و مراسم کا ایک ایسا ضابطہ قائم کر دیا ہے جو کم از کم بظاہر عورتوں کو یہ حق بخشتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں اُن کا زیادہ احترام کیا جائے، لیکن عیسائی دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ قوموں میں بھی عورتوں کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ ماضی قریب تک اور تو اور انگلستان میں بھی ایک شادی شدہ عورت کو اپنے خاوند سے علیحدہ کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ اگر مسلمان عورت نے آئندہ سو برس میں اپنی یورپین بہن کے برابر معاشرتی درجہ حاصل نہ کر لیا تو نظامِ اسلامی کے خلاف جوشیلی تقریریں حق بجانب ہوں گی۔ لیکن جس معلم نے ایک ایسے زمانے میں جب کوئی ملک، کوئی نظام، کوئی جماعت عورت کو، چاہے وہ کنواری ہو یا بیاہی ہوئی، ماں ہو یا بیوی، کسی قسم کے حقوق نہ بخشتی تھی اور ایک ایسے ملک میں جہاں بیٹی کی پیدائش کو ایک بلائے آسمانی سمجھا جاتا تھا، عورتوں کو ایسے حقوق عطا کئے جو بیسویں صدی میں بھی مہذب قومیں انہیں طوعاً و کرہاً اور بامرِ مجبوری دے رہی ہیں، وہ معلم نوعِ انسانی کے شکریے کا مستحق ہے۔ اگر پیغمبر اسلامؐ اور کچھ بھی نہ کرتے تو پھر بھی انہیں محسن انسانیت کہلائے جانے کا غیر متنازعہ حق پہنچتا تھا۔ فقہ کی کتابوں میں جس طرح قوانین اسلامی مندرج ہیں اگر انہیں اُس طرح بھی قبول کر لیا جائے تو اس صورت میں بھی مسلمان عورتوں کی قانونی حیثیت یورپی عورتوں کی قانونی حیثیت سے بہت بہتر ہے۔ ہم اس موضوع سے ایک اور جگہ تفصیلی بحث کر آئے ہیں۔ یہاں ہم صرف اتنا کریں گے کہ ضابطۂ اسلامی میں عورتوں سے متعلق جو قوانین ہیں اُن پر ایک اجمالی نگاہ ڈالیں۔ جب تک عورت ناکتخدا رہتی ہے وہ اپنے ماں باپ کے زیر سایہ بسر کرتی ہے اور جب تک وہ سن بلوغ کو نہیں پہنچتی وہ کسی نہ کسی حد تک باپ یا اُس کے نمائندے کے قبضۂ اختیار میں ہوتی ہے، لیکن جس دن وہ سنِ بلوغ کو پہنچے اُسی دن قانون اُسے وہ تمام حقوق بخش دیتا ہے جو ایک خود مختار فردِ انسانی کی حیثیت سے اُس کا پیدائشی ورثہ ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں کے دوش بدوش اپنے ماں باپ کی جائداد کی وارث ہوتی ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس کا حصہ نسبتاً کم ہوتا ہے، لیکن یہ امتیاز بھائی اور بہن کی اضافی حیثیت پر مبنی ہے۔ اگر کوئی عورت بالغ و عاقل ہو تو کسی قسم کے حالات میں بھی اُس کی شادی اُس کی علانیہ رضامندی کے بغیر ''کسی بادشاہ سے بھی'' (مسلم فقہاء کے یہ قانون وضع کرنے کے صدیوں بعد عیسائی دنیا کے بادشاہ و امراء اکثر اپنی رعایا عورتوں کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف کر دیا کرتے تھے) نہیں کی جا سکتی۔ (264)

شادی سے پہلے خاوند کا بیوی کو مہر دینا ایک لازمی شرط ہے، اور اگر وہ اپنی خوشی سے مہر نہ دے تو قانون اُس کی رقم عورت کی حیثیت کے مطابق مقرر کر دیتا ہے۔ مسلمانی طریقے کا نکاح ایک قانونی معاہدہ ہوتا ہے، جس کے لئے نہ کسی قاضی کا التزام ہے نہ کسی رسم کا۔ معاہدۂ عقد مرد کو عورت کے وجودِ جسمانی پر کوئی اختیار نہیں بخشتا، سوائے اس اختیار کے جس کی تخصیص قانون کرتا ہے۔ اور نہ وہ اُسے عورت کے احوال

واملاک پر کوئی اختیار بخشتا ہے۔ایک ماں کی حیثیت سے اُس کے جو حقوق ہیں وہ انفرادی قانعیوں کی من مانی رایوں پر مبنی نہیں ہوتے۔ نہ کسی مُسرف خاوند کو یہ اختیار ہے کہ وہ بیوی کی ذاتی محنت کی کمائی کو ضائع کرے، نہ کسی ظالم خاوند کو یہ قدرت ہے کہ بے خوف پاداش بیوی سے بدسلوکی کرے۔ اگر وہ بالغ و عاقل ہو تو اپنی ذات اور جائداد سے متعلق ہر معاملے میں وہ خاوند یا باپ کی مداخلت کے بغیر عمل کی مختار ہوتی ہے۔ وہ کھلی عدالت میں اپنے قرض داروں پر کسی رشتہ دار کو شامل کئے بغیر یا اپنے خاوند کے نام کی آڑ لئے بغیر بذاتِ خود دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔ جب وہ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر میاں کے گھر جاتی ہے تو وہ اُن تمام حقوق کی مالک رہتی ہے جو قانون مردوں کو دیتا ہے۔ عورت اور بیوی کی حیثیت سے اُسے جو خصوصی رعایات حاصل ہیں اُن کے ضامن محض معاشرے کے آداب و رسوم نہیں جن میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، بلکہ بہت سی باتوں میں یقیناً بہتر ہے۔ اس کی نسبتہً پس ماندہ حالت اسلامی جماعتوں میں تمدن و شائستگی کے عام فقدان کا نتیجہ ہے، نہ کہ قوانین اسلامی کی کسی خصوصیت کا۔ (265)

غلامی کے بارے میں مستشرقین کے اعتراضات اور امیر علی:

جہاں تک ''غلامی'' کا سوال ہے اور اس کی اسلام میں حوصلہ شکنی کا تعلق ہے امیر علی کا مؤقف وہی ہے جو سید احمد خان اور چراغ علی کا تھا لیکن امیر علی کا مناظرانہ انداز استدلال غلامی کے سوال کو نسلی رواداری سے منطبق کرتا ہے جب کہ اسلامی تہذیب اور متوسط اور موجودہ یورپ کی عیسائیت کے مقابلے میں زیادہ قابل قدر اور مؤثر ہو سکتی ہے۔

امیر علی اسپرٹ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ:

''اسلام میں آج کا غلام کل کا وزیر اعظم ہو سکتا ہے وہ بغیر تامل یا ناگواری کے اپنے آقا کی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے اور خاندان کا سربراہ بن سکتا ہے کیا عیسائیت کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے۔'' (266)

تعدد ازدواج اور اسلام میں عورت کے مقام کے الجھے ہوئے مسئلے کی جانب توجہ منعطف کرتے ہوئے امیر علی نے عورت سے متعلق مسیحی راہبانہ نقطۂ نظر سے اپنے حملہ کا آغاز کیا شہوانیت مسیحی راہبانہ نقطۂ نظر سے خاص طور پر ایک معصیت ہے چنانچہ اس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ جواز تاریخی عیسائیت میں طبقۂ نسواں پر جو غیر انسانی مظالم کیے گئے اور جن ذلتوں کا ان کا تختۂ مشق بنایا گیا رہبانیت ان کی وضاحت کرتی ہے۔ عیسائیت اور طبقۂ نسواں کے باہم تعلق کے بارے میں جتنا کم سے کم کیا جائے، بہتر ہے۔ ابتدائی ادوار میں جب ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم ہر نوع کے انسانوں کا مذہب صرف حضرت عیسیٰ کی والدہ محترمہ کی تعریف و توصیف تک محدود تھا۔ عیسائی کیسا نے نے جنس پر پابندی لگا رکھی تھی یکے بعد دیگرے پوپ اور پادری عورتوں کی فحاشیوں اوران کے پر معصیت رجحانات اوران کے ناقابل بیان حسد، بغض و کینہ پر مسلسل لکھتے تھے۔ تاہم امیر علی جب دور متوسط کے عیسائیوں کے طبقۂ نسواں کے ساتھ بدترین سلوک اور روا رکھا تاؤ کا اسلام میں عورتوں کے ایک مثالی مرتبہ سے تقابل پیش کرتے ہیں جس کا کہیں وجود نہ تھا تو بھٹک جاتے ہیں۔ (267)

روح اسلام میں مولانا امیر لکھتے ہیں کہ:

''جہاں تک تمہارے غلاموں کا تعلق ہے، انہیں وہی کھانا دو جو تم خود کھاتے ہو اور ویسے ہی کپڑے پہناؤ جیسے تم خود پہنتے ہو''۔

قول رسول مقبولؐ

غلامی کو بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے بجا طور پر تعدد ازدواج سے مشابہ کیا گیا ہے۔ تعدد ازدواج کی طرح وہ بھی ہر قوم میں رائج رہی ہے اور فکر انسانی کی ترقی اور اس کی حس عدل کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتی گئی ہے۔ تعدد ازدواج کی طرح وہ بھی اس نفس پرستی اور رعونت کا نتیجہ تھی جو اجتماعی و انفرادی ارتقاء کے بعض مرحلوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے لیکن جہاں تعدد ازدواج میں کوئی بنیادی بے انصافی نہ تھی وہاں غلامی ابتدا ہی سے اس لعنت میں مبتلا تھی۔

ابتدائی مراحل میں جب نوع انسانی کو انسانوں کے باہمی حقوق وفرائض کا پورا پورا فہم نہیں ہوتا، جب قوانین محض ایک شخص یا چند اشخاص کے احکام ہوتے ہیں جن کی اطاعت باقی سب لوگوں پر لازم ہوتی ہے، جب زبردستوں کی مرضی سب کے لئے اصول زندگی اور دلیل راہ ہوتی ہے اس وقت وہ عدم مساوات، خواہ وہ معاشرتی ہو یا جسمانی یا دماغی، جو فطرت نے نوع انسانی میں مقدر کی ہے ہمیشہ غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نتیجۃً ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جو اعلیٰ کو ادنیٰ پر مطلق اختیار بخش دیتا ہے۔(268)

کمزوروں کے یوں زبردستوں کے حلقہ گوش ہونے نے مؤخر الذکر کو یہ توفیق عطا کی ہے کہ انسان پر انجیل کے بیان کے مطابق جو لعنت عائد کی گئی تھی، یعنی یہ کہ ''جب تک تو مٹی میں مل کر مٹی نہیں ہوتا اس وقت تک تو اپنے ماتھے کا پسینہ بہا کر روٹی کھائے گا، وہ اس لعنت سے اپنے آپ کو مبرا کر لیں اور اس طرح جو فرصت انہیں حاصل ہو اسے مرغوب مشغلوں میں صرف کریں۔''قدیم آئین'' (Ancient Law) کا مصنف کہتا ہے کہ ''کسی اور کی جسمانی طاقت کو اپنے آرام وآسائش یا راحت ومسرت کے لئے استعمال کرنے کی خواہش ہی بلاشک وشبہ غلامی کی بنیاد ہے اور یہ خواہش تنی ہی قدیم ہے جتنی فطرت انسانی''۔(269)

غلامی کا دستور نوع انسانی کا ہم عمر ہے۔تاریخی اعتبار سے اس کے آثار ہر زمانے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔اس کا بیج اس وقت پڑا جب انسانی معاشرہ وحشت کے مرحلے میں تھا اور وہ اس وقت بھی پھلتا پھولتا رہا جب مادی تہذیب کی ترقی نے اس کی ضرورت کو رفع کر دیا تھا۔یہودی، یونانی، رومی اور قدیم المانی۔(270)

قوموں میں، جن کے قانونی ومعاشرتی اداروں نے جدید زمانے کے رسم ورواج اور شعائر پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، دونوں طرح کی غلامی، یعنی زرعی کمین پن بھی اور خانگی خدمت گزاری بھی، قانوناً جائز اور عملاً رائج تھی۔

جب سے عبرانی ایک ملت کی حیثیت سے وجود میں آئے اسی وقت سے ان کے یہاں دو قسم کی غلامی مروج تھی۔ایسے اسرائیلیوں کو جو پاداشِ جرم میں غلام بنتے تھے غیر نسل کے غلاموں سے اونچا درجہ دیا جاتا تھا۔اسرائیلی غلام چھ سال کی خدمت کے بعد قانوناً آزاد ہو جاتا تھا، البتہ اس کو اختیار تھا کہ اس قانونی حق سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، لیکن غیر ملکی غلام، چاہے وہ ان قوموں سے تعلق رکھتے ہوں جنھیں بنی اسرائیل نے بے رحمانہ جنگوں کے ایک باقاعدہ سلسلے کے ذریعے زرعی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، یا دغابازانہ حملوں میں گرفتار کئے گئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، بہر صورت آزادی حاصل کرنے کے اس حق سے محروم تھے۔یہ امتیاز قطعاً قومی جانبداری اور یہودیوں کی خصوصی علیحدگی پسندی پر مبنی تھا۔(271)

ان غلاموں اور لونڈیوں کو سخت سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔چاہے وہ زمینوں کے کمیرے ہوں، چاہے گھروں کے خدمت گزار، ان سے نفرت کی جاتی تھی، انہیں ذلیل سمجھا جاتا تھا اور وہ اپنے بے رحم آقاؤں کی خدمت میں دائمی محنت ومشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔عیسائیت نے نہ ایک معاشرتی نہ ایک مذہبی نظام کی حیثیت سے غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔اس نے اس فتنے کو کم کرنے کے لئے نہ کوئی قاعدہ نافذ کیا نہ کوئی اصول وضع کیا۔غلاموں کی نافرمانبرداری۔(272) نیا عہد نامہ۔ تمتھیس اول ب 4-2 کے بارے میں چند جملوں اور آقاؤں کو غلاموں کا معاوضہ ادا کرنے کی نصیحت کے سوا حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں، جیسے کہ وہ عیسوی روایات میں پیش کی گئی ہیں، غلامی کی مذمت میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔اس کے برعکس عیسائیت نے غلام اور لونڈی کو آقا کی مکمل اطاعت کی تلقین کی۔اس نے غلامی کو رومی سلطنت کا ایک مسلمہ ادارہ پایا اور اس کے مضر اوصاف کو کم کرنے یا اسے تدریجاً ختم کرنے یا غلاموں کی حالت بہتر بنانے کی ذرہ برابر کوشش کئے بغیر اس نے اس نظام کو اپنا لیا۔ملکی قانون کی رو سے غلام محض چیز بست کی حیثیت رکھتے تھے۔عیسائی اقتدار کے تحت بھی ان کی یہی حیثیت رہی۔رومیوں کے یہاں اولین ایام سے غلامی چلی آ رہی تھی۔غلام، خواہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، جنگ میں ہاتھ آئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، خانگی مال اسباب سمجھے جاتے تھے۔ان کے آقاؤں کو ان پر زندگی وموت کا اختیار تھا۔بہر حال اس تدریجی اصلاح کی

بدولت جس نے بارہ تختیوں (The Twelve Tables) کے فرسودہ قوانین کو ہیڈرین (Hadrian) کے جامع ضابطۂ قوانین میں تبدیل کیا۔ غلاموں کی حالت قدرے بہتر ہوگئی۔ لیکن اُن تبدیلیوں کے باوجود جو رومی شہنشاہوں کی انساں نوازی یا دانشمندی نے پرانے قوانین میں کیں غلام کا وجود جسمانی کلیۃً مالک کی مرضی کے تابع تھا۔ سلطنت کے ہر ذی اقتدار شخص کے یہاں ہزاروں غلام تھے، جنہیں ذرا ذرا سے قصور پر اذیت پہنچائی جاتی تھی اور کوڑے لگائے جاتے تھے۔

یورپ میں انسانوں کو محض چیز بست کی سی جو حیثیت حاصل تھی، عیسائیت کی آمد سے اس میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ صرف کیسائی منصب داری کے دائرے کے اندر رہوئی۔ ایک غلام راہبیت کا مسلک اختیار کر کے آزادی حاصل کر سکتا تھا، بشرطیکہ تین سال کے اندر کوئی شخص اس کی ملکیت کا دعویٰ نہ کرے۔ (273)

لیکن اور باتوں کے لحاظ سے غلامی کا دور دورہ اسی طرح برقرار رہا جیسا عہد شرکیت میں تھا۔ ایک عیسائی شہنشاہ کے زیر حکومت قوانین کا جو خلاصہ مرتب ہوا اُس نے اعلان کیا کہ غلامی قانونِ فطرت ہے اور ضابطۂ رومی نے غلاموں کی زیادہ سے زیادہ قیمت اُن پیشوں کے مطابق مقرر کی جن کے لئے وہ مطلوب ہوتے تھے۔ غلام اور لونڈی کی باہمی شادی قانوناً تسلیم نہ کی جاتی تھی۔ غلام مرد کی شادی آزاد عورت سے اور غلام عورت کی شادی آزاد مرد سے قطعاً ممنوع تھی اور شدید سزاؤں کی مستوجب سمجھی جاتی تھی۔ (اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کر لیتی تو اس کے لئے سزاؤں میں ایک سزا یہ تھی کہ وہ قتل کر دی جاتی اور غلام کو زندہ جلا دیا جاتا۔ (274)

Millman نے (v.ii) Latin Christianity میں اس موضوع پر جو شاندار باب لکھا ہے وہ اپنے مدافعانہ انداز کے باوجود قابل ملاحظہ ہے) اس کا نتیجہ تھا غیر محدود جاریہ بازی، جس پر کیسائی منصب دار بھی کاربند تھے۔ (275)

یہ تھی صورت حال غلامی کی اُس نظامِ قوانین کے تحت جو دنیائے قدیم کا سب سے ترقی یافتہ نظام تھا۔ یہ قانون تیرہ صدیوں کی دانشمندی کے آئینہ دار تھے اور اُن کے ارتقاء کے آخری دور میں دنیا کے بزرگ ترین معلمانِ اخلاق میں سے ایک معلم کی تعلیمات کا تھوڑا سا پیوند بھی اُن پر لگ چکا تھا۔

جب رومی سلطنت کے کھنڈروں پر مغربی اور شمالی وحشیوں کی حکومت کی بنا رکھی گئی تو انفرادی غلامی کے علاوہ علاقائی غلامی بھی، جس سے رومی ناآشنا تھے، نوآباد ملکوں میں عام ہوگئی۔ آقاؤں کو اپنی رعایات اور اپنے زرعی غلاموں پر جو مختلف اختیارات تھے وہ اخلاقی زبونی اور پستی کا ایک کراہت انگیز نقشہ پیش کرتے تھے۔ (276)

رومی ضابطے کی طرح بربری ضابطے بھی غلامی کو نوعِ انسانی کی ایک معمولی حالت تصور کرتے تھے اور اگر غلام کو کسی طرح کی امان و حفاظت میسر تھی تو محض اپنے آقا کے مملوک کی حیثیت سے، جو حکومت کے علاوہ اُس کی زندگی و موت کا واحد مختار ہوتا تھا۔

عیسائیت غلامی کو محو کرنے یا اُس کی خرابیوں کی اصلاح کرنے میں یکسر ناکام رہتی تھی اور تو اور، خود کیسا کے قبضے میں غلام تھے اور وہ صریح الفاظ میں اس مُضر دستور کو مطابق قانون تسلیم کرتا تھا۔ کیسا کے زیر اثر یورپ کے عظیم ترین مفکروں نے غلامی کی حمایت کی تھی اور اس پر اصرار کیا تھا کہ وہ نادار ی اور چوری کے انسداد کا ایک مفید وسیلہ ہے۔ (277)

اور کیسا کے زیر اثر ہی امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے اعلیٰ تمدن سے آراستہ عیسائیوں نے اُن بدقسمت انسانوں کو جو غلامی کی حیثیت سے ان کے قبضۂ اختیار میں تھے (اور جن میں بہت سے ان کے ہم نسل تھے) انسانیت سوز سلوک کا تختۂ مشق بنایا اور غلامی کی لعنت کو برقرار رکھنے کی خاطر لہو کی ندیاں بہائی ہیں۔ اگر کسی شخص میں کسی ادنیٰ نسل کے خون کا شائبہ بھی ہوتا تو چاہے اس کے کوئی آثار بھی نمایاں نہ ہوں وہ اسے غلاموں کی تمام عقوبتوں کا مورد بنانے کے لئے کافی تھا۔ نیگرو لونڈیوں کے ساتھ سفید رنگ مردوں کے ناجائز تعلقات سے جو بچے پیدا ہوتے اُن کے باپ انہیں کبھی قانوناً اپنی اولاد تسلیم نہ کرا سکتے تھے۔ کوئی سفید رنگ مرد اپنی نیگرو لونڈی سے عقد نہ کر سکتا تھا۔ اُس کے

ناجائز بچوں کی ماں کو بھی اور خود بچوں کو بھی اُس کی سفید رنگ بیوی جب چاہتی بیچ سکتی تھی۔ خدا کی نگاہوں میں انسانوں کی مساوات سے متعلق داعیٔ عیسائیت کی جو تعلیمات تھیں عیسائیت اُن کی روحِ رواں کو سمجھنے سے قاصر رہی۔

اسلام رنگ و نسل کے کسی امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا۔ سفید و سیاہ، شہری و فوجی، حاکم و رعایا، سب اس کے نزدیک نہ صرف نظری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی کاملاً مساوی ہیں۔ میدان کارزار ہو کہ مہمان خانہ، خیمہ ہو کہ شاہی محل، مسجد ہو کہ بازار، ہر جگہ مسلمان بلا تکلف و بلا اکراہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اسلام کا پہلا مؤذن، پیغمبر اسلامؐ کا ایک باوفا رفیق اور معزز صحابی، ایک حبشی غلام تھا۔ سفید فام عیسائی کے لئے اس کا سیاہ فام ہم مذہب آسمانی بادشاہی میں اس کا ہمسر ہو تو ہو، اس دنیا کی بادشاہی میں ہرگز نہیں۔ مسیح کی حکومت میں ہو تو ہو، مسیحیت کی حکومت میں مطلقاً نہیں۔ ممکن ہے قانون اسے مجبور کرے اور خون کی ندیوں میں بہ کر آیا ہوا ایک وسیع تر تصور انسانیت اس سے تقاضا کرے کہ اپنے سیاہ فام بھائی کو شہری حقوق عطا کرے لیکن نسل و رنگ کا غرور مساوات کا اعتراف نہیں کرتا۔ چنانچہ خدا کے گھر میں بھی سفید فام اور سیاہ فام ایک دوسرے سے علیحدہ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات نے غلامی کے رواج کو ایک ضرب شدید لگائی اور اگر ہمسایہ قوموں میں اُس کی جڑیں اتنی گہری نہ ہوتیں اور انسانی فطرت میں کج روی نہ ہوتی تو اُس وقت جو لوگ اس رواج پر کاربند تھے اُن کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی وہ خود بخود معدوم ہو جاتا۔

بجا طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ چونکہ اسلام کے قوانین، احکام اور تعلیمات کی اشاعت کو بیس سال لگے، اس لئے قدرتی طور پر زمانہ ماقبل اسلام کے بہت سے دستور جو بعد میں منسوخ ہو گئے شروع شروع میں یا تو خاموشی سے جاری رہنے دیئے گئے یا اعلانیہ قانوناً تسلیم کر لئے گئے۔ (278)

انہی میں ایک غلامی کا دستور تھا۔ یہ ایک برائی تھی جو عربوں کے گہرے سے گہرے باہمی تعلقات کے تار و پود سے گندھی ہوئی تھی۔ اسے محو کرنے کا طریقہ یہ نہ تھا کہ جتنے غلام اُس وقت موجود تھے اُن سب کو فی الفور آزادی دے دی جاتی (جو کہ اخلاقی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے ناممکن تھا) بلکہ یہ کہ باحکمت اور انسانیت نواز قوانین کے ذریعے اسے آہستہ آہستہ زائل کیا جاتا۔ چنانچہ بہت سے قوانین، سلبی بھی اور ایجابی بھی، غلاموں کی آزادی کو رفتہ رفتہ وجود میں لانے کی خاطر وضع کئے گئے۔ اگر اس کے مخالف کوئی طریق عمل اختیار کیا جاتا تو نوزائیدہ جمہوریت کی عمارت زمیں بوس ہو جاتی۔

پیغمبر اسلامؐ نے بار بار خدا کے نام پر اپنے تابعین کو تلقین کی کہ وہ غلاموں کو رہائی بخشیں "جس سے بڑھ کر کوئی عمل اللہ کو قبول نہیں"۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام سے متعلق بعض فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو اُس کی سزا یہ ہو کہ غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ آپؐ نے یہ حکم بھی دیا کہ غلاموں کو خدمت کی اجرت کے طور پر آزادی حاصل کرنے کا حق ہونا چاہئے اور اگر کوئی غلام جس کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لئے کافی رقم نہ ہو کسی اور جگہ کام کر کے فدیے کی رقم ادا کرنا چاہے تو آقا کو چاہئے کہ اس کے ساتھ معاہدہ کر کے اسے اس کی اجازت دے دے۔ (279)

آپؐ نے یہ مزید ہدایت کی کہ غلاموں کو فدیہ ادا کرنے کے لئے بیت المال سے قرض دیا جائے۔ بعض بعض صورتوں میں حکم دیا گیا کہ آقا کی مداخلت کے بغیر بلکہ ضرورت پر تو اُس کی مرضی کے خلاف غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ اگر کسی معاہدے یا بیان میں ذرا سے شک و شبہ کی بھی گنجائش ہوتی تو اس کی تعبیر غلام کے حق میں کی جاتی اور اگر آقا کی طرف سے آزادی کا تھوڑا سا وعدہ بھی ہوتا تو غلام کو آزادی دلانے کی خاطر اس پر عمل کرایا جاتا۔ نبی کریمؐ نے غلاموں سے مہربانی کو وہی درجہ دیا جو آپؐ نے "رشتہ داروں، ہمسایوں ہم سفروں اور مسافروں" کے حقوق ادا کرنے کو دیا۔ آپؐ نے آزادیٔ غلاماں کی تاحدِ امکان ہمت افزائی کی اور یہ ہدایت بھی کی کہ آزادی کے علاوہ "اس دولت کا جو تمہیں خدا نے مرحمت فرمائی ہے ایک حصہ انہیں دو"۔ علاوہ بریں آپؐ نے آقاؤں کو اس کی ممانعت کی کہ وہ غلاموں اور لونڈیوں پر اپنے

اقتدار کو شہوت رانی کی خاطر استعمال کریں اور وعدہ فرمایا کہ جن غلاموں اور لونڈیوں سے بیزیادہ کی جائے گی خدا اُن پر رحم کرے گا اور زیادتی کرنے والوں کو سزا دے گا۔ کسی مومن کے لاعلمی میں قتل کرنے کا یا بعض قسم کی دروغ گوئیوں کا کفارہ ایک غلام کو آزاد کرنا تھا۔ تعلیمات محمدی کا سارا مطلب و منشاء ہی یہ تھا کہ غلاموں کو محض چیز بست سمجھنے کو اور ذات پات کی تفریق کرنا ممکن بنا دیا جائے۔ "Slavery" غلامی کا لفظ جس معنی میں انگریزی میں استعمال ہوتا ہے اس معنی میں اسلامی قانون کے تحت اس کا اطلاق کسی شخص کی حیثیت پر نہیں ہو سکتا۔

شارع اسلام نے حکم دیا کہ اگر کوئی پناہ گیر اسلامی مملکت میں پناہ لے تو اُس میں قدم رکھتے ہی آزاد ہو جائے، لونڈی کی اولاد اپنے باپ کی حیثیت عطا کی جائے اور باپ کی موت پر لونڈی کو آزادی حاصل ہو جائے، غلام اپنی آزادی کے لئے آقا سے عہد و پیمان کر سکے اور زکوٰۃ کے محاصل کا ایک حصہ غلاموں کا فدیہ ادا کرنے کی خاطر استعمال کیا جائے۔ آقاؤں کو اپنے غلاموں سے اُتنا ہی کام لینے کی اجازت تھی جتنا از روئے انصاف اُن سے لیا جانا چاہئے تھا اور جتنا اُن کی حدِ مقدور کے اندر تھا۔ انہیں تاکید کی گئی تھی کہ غلاموں سے غلام کہہ کر خطاب نہ کریں، بلکہ ''میرا بچہ'' اور ''میری بچی'' کے شفقت آمیز الفاظ سے پکاریں۔ اور انہیں اسی طرح کا لباس پہننے کو دیں جیسا وہ خود پہنتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ کسی حالت میں بھی ماں کو بچے سے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے اور ایک رشتے دار کو دوسرے رشتے دار سے جدا کرنے کی اجازت نہ تھی۔

معلم عربیؐ نے غلاموں سے سلوک کے بارے میں جو اخلاقی قوانین بنائے اُن میں آقا و غلام کے باہمی فرائض اُس یک طرفہ طریقے پر مقرر نہ کئے گئے تھے جو اکثر دوسرے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ (280)

انسانی فطرت کے ایک نسبتہً زیادہ عمیق اور زیادہ صحیح علم کی مدد سے آپؐ نے محسوس کیا کہ طاقت وروں سے متعلق جو فرائض کمزوروں پر عائد ہوتے ہیں اُن کی تعیین اتنی ضروری نہیں جتنی اُن فرائض کی جو طاقت وروں پر کمزوروں کے بارے میں واجب ہیں۔ اسلام کے نزدیک غلام ہونے میں کوئی عار نہیں، غلام ہونا محض ایک اتفاقی حادثہ ہے، نہ کہ فطرت کا ایک انتظام، جیسا کہ ملکی قوانین اور آبائے کلیسا تصور کرتے ہیں۔ رسولؐ خدا کے آزاد کردہ غلام حضرت زید کو اکثر فوجوں کی قیادت پر مامور کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے اشراف طیب خاطر اُن کے تابع فرمان ہوتے تھے۔ حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ اس لشکر کے سپہ سالار تھے جو حضرت ابوبکرؓ نے یونانیوں کے خلاف مہم پر بھیجا۔ قطب الدین ایبک دہلی کا پہلا مسلمان بادشاہ اور اس اعتبار سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا اصلی بانی، ایک غلام تھا۔ اسلام میں جس غلامی کی اجازت تھی وہ اس غلامی سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھی جو کل تک دنیائے عیسائیت میں رائج تھی یا جو امریکہ میں 1865 تک رائج تھی جب کہ ایک مذہبی جنگ نے اُس لعنت کا خاتمہ کر دیا۔

اسلام میں آج کا غلام کل کا وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وہ کسی کی چہ میگوئیوں کے بغیر اپنے آقا کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے اور خاندان کا سربراہ بن سکتا ہے۔

غلاموں نے سلطنتوں پر حکومت کی ہے اور شاہی خاندانوں کی بناء ڈالی ہے۔ محمود غزنوی غلام زادہ تھا۔ کیا عیسائیت اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ کیا عیسائیت اپنی تاریخ کے اوراق میں غلاموں کے ساتھ اس قسم کے انسانیت نواز سلوک کی کوئی روداد دکھا سکتی ہے؟

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ شارع اسلام نے غلامی کو ایک عارضی رواج تصور کیا اور آپؐ کو یقین تھا کہ ترقی افکار اور تغیر حالات کی بدولت اس کا ایک دن خاتمہ ہو جائے گا۔ قرآن غلاموں کا تذکرہ ہمیشہ ان الفاظ میں کرتا ہے کہ غلام وہ ہیں ''جنہیں تم نے اپنے داہنے ہاتھ سے حاصل کیا ہے''۔ قرآن کے نزدیک غلام یا لونڈیاں حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اس کے نزدیک صرف ایک قسم کی غلامی جائز تھی، یعنی جہادِ شرعی میں اسیر کئے ہوئے لوگوں سے خدمت وصول کرنا۔ تمام وحشی اقوام میں اسیرانِ جنگ کی جاں بخشی محض خود غرضانہ مقاصد سے کی جاتی ہے۔ (281)

قدیم قانون سازوں کے نزدیک جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا حق انہیں قتل کر دینے کے حق پر مبنی تھا۔ اس بارے میں Grotius, Albericus Gentilis (De Jur) Gent. cap. de Survitude اور Pufendorff نے ان کا تتبع کیا۔ Montesquieu پہلا قانون ساز تھا جس نے جنگی قیدیوں کو ہلاک کرنے کے اس فرضی حق سے انکار کیا۔ الا اس صورت میں کہ یہ قطعاً اگزیر ہو یا تحفظ نفس کے لئے ضروری ہو۔ Spirit of laws کے مصنف نے اس کا انکار اس لئے کیا کہ وہ کلیسا کی غلامی سے آزاد تھا۔)

دوسری قدیم قوموں کی طرح اعراب جاہلیت بھی اپنے قیدیوں کی جاں بخشی صرف نفع اندوزی کے مقصد سے کرتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کو عربوں میں متداول پایا۔ اس موضوع پر نظریہ بازی یا حکمت فروشی کرنے کے بجائے آپؐ نے عربوں کی ہدایت کے لئے سخت قاعدے وضع کئے اور حکم دیا کہ صرف ایسے لوگ غلام بنائے جا سکتے ہیں جو ایک جائز جنگ یعنی جہاد شرعی میں گرفتار کئے گئے ہوں اور وہ بھی اس وقت تک جب تک اُن کا فدیہ ادا نہ کیا جائے یا وہ خود خدمت کی اجرت کی شکل میں اپنی آزادی کی قیمت ادا نہ کر دیں۔ بلکہ جب کبھی یہ طریقے بھی پوری طرح کامیاب ثابت نہ ہوتے تھے تو آپؐ مسلمانوں کے جذبۂ اتقاء کو حرکت میں لاتے اور انہیں غلاموں کے مالکوں کے بھاری بھر کم فرائض یاد دلاتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آقا غلاموں کو آزادی عطا کر دیتے تھے۔ بردہ اندوزی اور بردہ فروشی کو، جس کی سرپرستی عیسائیت کرتی تھی (کرامویل کے ہاتھوں ڈروہیڈا کے قتل عام اور آئرلینڈ کی بغاوت کے فرو کئے جانے کے بعد انگلستان کے پروٹسٹنٹوں نے آئرلینڈ کے مردوں اور عورتوں کو ورجینیا، پینسلوانیا اور دوسرے مقامات کے نوآبادکاروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا Monmouth کی بغاوت کے بعد پھر یہی ہوا۔) اور جس کی اجازت یہودیت نے دی تھی، مطلقاً مردود و نامحمود قرار دیا گیا۔ غلاموں کی تجارت کرنے والے کو مطعون خلائق کہا گیا۔ غلاموں کو آزادی دینے کو ایک افضل کار ثواب بیان کیا گیا۔ (امام جعفر صادق کی ایک مشہور اور مسلم الثبوت روایت کے مطابق) کسی مسلمان کو غلام بنانے کی قطعی ممانعت کی گئی، لیکن یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ بہت سے مدعیان اسلام نے اسلامی قوانین کی ظاہری تعمیل تو کی مگر معلم اسلامؐ کی ہدایات کی روح سے کامل تغافل برتا اور ان ہدایات کے علی الرغم غلامی کی گرم بازاری کو خرید و فروخت اور دوسرے ذرائع سے برقرار رکھا۔ قرآنی آئین کے تحت کسی غلام کو قبضے میں لانے کی بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ کسی ایسی لڑائی میں ہاتھ آیا ہو جو خلوص نیت سے دفاع ذات کی خاطر کافر و مشرک جارحین سے لڑی گئی ہو اور اس کی اجازت اس مقصد سے دی گئی تھی کہ وہ جنگی قیدیوں کی حفاظت و سلامتی کی ضمانت بنے۔ آس پاس کی قوموں اور قبیلوں کی دشمنی کی بدولت امت مسلمہ ابتداء جس حالتِ جنگ و جدال میں مبتلا تھی، اُس حالت کی تبدیلی خود بخود غلامی کا خاتمہ کر دیتی، کیونکہ نئے غلام قبضے میں لائے جاتے اور جو موجود تھے وہ رفتہ رفتہ آزاد ہو جاتے، لیکن یا تو مشرق و مغرب کی اخلاقاً زوال یافتہ قوموں اور شمال کی وحشی نسلوں سے مس کے باعث یا اس وجہ سے کہ لعنتِ غلامی کی جڑیں معاشرے کے ہر طبقے میں گہری گڑی ہوئی تھیں، بہت سے مسلمانوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح غلامی کی رسم کو جائز سمجھا اور اب بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن وحشی ترکمان یا افریقی عرب، جو غلام اندوزی کی فخریہ مشق کرتے ہیں، اسی قدر اسلام کے نمائندے ہیں جس قدر جنوبی امریکہ کے گیاہستانوں کی بادیہ نوردی کرنے والے گواچو (Guacho) عیسائیت کے نمائندے ہیں (ترکمان (جو متشدد سنی تھے) شارع اسلام کے حکم کی لفظی خلاف ورزی سے بچنے کی خاطر اپنے قیدیوں کو (چاہے وہ سنی ہوں یا شیعہ) اپنے آپ کو کافر کہنے پر مجبور کرتے تھے۔ اسی طرح افریقی عرب کافر حبشیوں کی بستیوں پر جو چھاپے مارتے ہیں انہیں وہ جہاد کا نام دیتے ہیں۔ مشہور افریقی سیاح Mr. Joseph Thompson لنڈن ٹائمز کے شمارہ مورخہ 14 نومبر 1887ء میں ایک خط میں مشرقی افریقہ میں غلامی کے موضوع پر یوں رقمطراز ہیں:

''میں کسی پس و پیش کے بغیر کہتا ہوں اور آپ کے تمام نامہ نگاروں کے مقابلے میں مشرقی مرکزی افریقہ کے زیادہ تجربے کی بناء پر کہتا ہوں کہ اگر ان علاقوں میں غلاموں کی تجارت جاری ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اسلام کی اشاعت نہیں ہوئی: ''اسلام کی اشاعت کے معنی یہ ہوتے کہ غلاموں کی تجارت بالکل بند ہو جاتی''۔ جن پُرامن طریقوں سے اسلام مغربی افریقہ اور مرکزی سوڈان میں پھیلا ہے ان کی جو

کیفیت مسٹر تھامپسن نے بیان کی ہے وہ ہر قاری کی توجہ کی مستحق ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''یہاں اسلام ایک زندہ اور فاعل قوت ہے، جس میں وہی ابتدائی ایام کی توانائی اور تب وتاب ہے اور اسے اپنی تبلیغ میں اسی طرح کی کامیابی حاصل ہو رہی ہے''۔ (282) یعنی ان کے زرِ فروخت یا اُن کی محنت کے ذریعے انفرادی یا قومی دولت میں اضافہ کرنے کی خاطر۔ (283)

تعدد ازدواج کی طرح غلامی کی رسم بھی جو نوعِ انسانی کی نشوونما کے کسی نہ کسی مرحلے میں ہر قوم میں رائج تھی، اب کم از کم ان قوموں میں جو تہذیب یافتہ ہونے کی مدعی ہیں غیر ضروری ہو گئی ہے، کیونکہ جن مقاصد کے لئے وہ وجود میں آئی تھی وہ اب معدوم ہو چکے ہیں اور یقین ہے کہ جلد یا بدیر وہ غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسلام نے جیسا کہ از روئے مخاصمت دعویٰ کیا جاتا ہے، غلامی کو ''تقدس'' نہیں بخشا، بلکہ غلاموں کی ملکیت کو تنگ ترین دائرے کے اندر محصور کر کے اس رسم کے نیست ونابود کرنے کا ہر ممکن اہتمام کیا ہے۔ اسلام نے کسی من مانے حل سے اس اہم مسئلے کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ جب اس نے تمام افرادِ انسانی کی فطری مساوات کا شد ومد سے اعلان کیا تو اس نے یہ نہیں کیا کہ اسی وقت، نتائج سے بے نیاز ہو کر، تمام غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا اعلان بھی کر دے۔ ابھی دنیا انسان کی اخلاقی وذہنی آزادی کے اس درجے کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس قسم کا اعلان بڑی خرابیوں کا باعث ہوتا۔

انسانی جسم کے قطع اعضاء کی بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صریح الفاظ میں ممانعت کی اور اس دستور کی، جو ایرانی اور بازنطینی دونوں سلطنتوں میں رائج تھا، سخت الفاظ میں مذمت کی۔ خلفاء راشدین کے زمانے میں غلاموں کی خرید وفروخت کا دستور نہ تھا۔ کم از کم اس امر کی کوئی مستند تحریری شہادت موجود نہیں کہ اُن کے عہد میں کسی شخص کو خرید کر غلام بنایا گیا ہو، لیکن بنوامیہ کے برسرِاقتدار آتے ہی اسلام کی روح میں ایک تغیر واقع ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے لوگوں کو خرید کر غلام بنانے کے دستور سے دنیائے اسلام کو روشناس کرایا۔ اسی طرح وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے حرمِ شاہی کی حفاظت پر خواجہ سرا مامور کئے۔ ابتدائی خلفائے عباسی کے عہد میں امام جعفر صادق نے غلامی کے خلاف تبلیغ شروع کی۔

اب وقت آ گیا ہے جب نوعِ انسانی کو بحیثیتِ مجموعی چاہئے کہ غلامی کے خلاف، چاہے وہ کسی شکل یا نام کے بھیس میں ہو، صدائے احتجاج بلند کرے۔ بالخصوص مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے عظیم پیغمبر کی عزت کی خاطر اپنی تاریخ سے اس سیاہ صفحے کو محو کر دیں۔ یہ صفحہ چاہے دوسرے مذاہب کے مدعیوں کے خوفناک نامۂ اعمال کے مقابلے میں کتنا ہی روشن کیوں نہ دکھائی دیتا ہو، پھر بھی ایک سیاہ صفحہ ہے اور اگر مسلمان اسلامی قوانین کی روح کی خلاف ورزی نہ کرتے تو یہ کبھی نہ لکھا جاتا۔

وہ دن آ گیا ہے جب وہ آواز جس نے ساری نوعِ انسانی کی حریت، مساوات اور اخوت کا اعلان کیا تھا چودہ صدیوں کی روحانی زندگی اور روحانی امور سے حاصل کی ہوئی قوت کے ساتھ دوبارہ سنی جائے۔ یہ مسلمانوں کے کرنے کا کام ہے کہ صریح الفاظ میں یہ اعلان کریں کہ غلامی کو اُن کے مذہب نے مطعون اور اُن کے ضابطۂ قانونی نے ممنوع قرار دیا ہے اور اس طرح اُن الزامات کو رد کریں جو اُن کے عظیم اور خیر البشر نبی پر لگائے گئے ہیں۔ (284)

عیسائی مناظرین کی حرف گیریوں سے حضرت محمد ﷺ کو بحیثیت پیغمبر اور مدبر مدافعت کے لئے امیر علی کا انداز مدافعت کے ساتھ جارحانہ بھی تھا یہ تکنیک سید احمد خان کی مذہبی تکثیریت کے بالکل متضاد تھی۔ (285)

امیر علی بار بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں تاکہ موخر الذکر کی تاریخی تناظر میں اہمیت وفوقیت کو ثابت کر سکیں وہ کہتے ہیں کہ عیسائیت نامکمل مذہب رہا کیونکہ حضرت مسیح کی حیات بہت جلد منقطع ہو گئی تھی اور ان کے پیغمبر کی تکمیل حضرت محمد ﷺ کی ذات بابرکت سے ہوئی وہ کہتے ہیں کہ:

''ایک امر یقینی ہے کہ اگر ان کو (مسیح) زیادہ طویل وقفہ حیات ملتا تو وہ اپنی تعلیمات کو زیادہ منظم بنیاد پر استوار کرتے عیسائیت میں

یہ بنیادی سقم فی الواقع، کونسلوں کے اجتماع اور اصول واذعانی عقائد کے استحکام کے لئے اجلاس کے انعقاد کی وجہ سے پیدا ہوا جو خفیف سے خفیف آزادیٔ فکر اور ذرا سے تعقل سے پارہ پارہ ہوجاتے ہیں حضرت مسیح کا کام ادھورا رہ گیا اور یہ ایک دوسرے معلم (محمد ﷺ) کے لئے مختص ہوگیا کہ وہ اصول وقوانین اخلاق کو منظم کریں۔" (286)

امیر علی نے تاریخی اسلام کے خلاف عیسائی یا مغربی مبارزین مناظرہ کے جواب میں تاریخی مسیحیت کے خلاف نہایت تیز وتند حملے کیے ہیں وہ اسپرٹ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ:

"شاہزادۂ امن (عیسیٰ) کے پیرووں نے ابتدا سے آج تک بوڑھے جوان، مرد وعورت کو بے دریغ قتل کیا اور غارت گری، لوٹنا جلانا ان کا شیوہ رہا اور ہے اور اس کرۂ ارض پر ان کے نائب پوپ، بریق، اسقف، پادری اور بزرگان کیسا ان مسیحی مجرموں کی منظوری دیتے رہے اور اکثر ان کے بدترین گناہوں اور جرموں کی مکمل معافی اور پاداش سے نجات کا اعلان کرتے رہے"۔ (287)

امیر علی دبستان علی گڑھ کی طرح قرآن کے "وقتی" اور "دائمی" احکامات کے مابین امتیاز کے قائل ہیں یعنی تاویلی حل کے جسے جدید پسند بار بار اختیار کرتے ہیں جسے وہ وقتی سمجھتے ہیں اسے صرف تاریخی رنگ دے کر قبول کر لیتے ہیں اور وہ خفیف سے خفیف جز جس میں اسلامی عقیدہ کی روح یا جوہر موجود ہے اس کو انتخاب اور تشریح کے ذریعے دائمی قرار دیتے ہیں۔ (288)

خلاصہ:

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستشرقین کے افکار سے متاثر ہونے کے باوجود ان سیرت نگاروں نے اسلام کی اصل روح کو واضح کیا اور مستشرقین کے اعتراضات کا جواب انہیں مآخذ سے دیا جن مآخذ کو انہوں نے بنیاد بنا کر اعتراضات اٹھائے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی جو تعلیمات محدود ہوتی جا رہی تھیں ان سیرت نگاروں نے نہ صرف ان کی تطہیر کی بلکہ آنے والے مسلم سکالرز کو ایک پیغام دے کر واضح کر دیا کہ اسلام کی تعلیمات کو کوئی بھی محدود نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ کی ذات نے خود لیا ہے اور ہر دور میں ایسے لوگ آتے رہیں گے جو مستشرقین کی ان چالبازیوں کا جواب دیتے رہیں گے اور ان سیرت نگاروں کی سیرت پر لکھی جانے والی کتابیں بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

حوالہ جات

1۔ ولیم ہنٹر، سر، ڈاکٹر، ''اور انڈین مسلم''، 1871ء
2۔ محمد اکرام، شیخ، ''موج کوثر''، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، 1997ء، ص 75-73
3۔ قاسم محمود، سید، ''اسلامی انسائیکلو پیڈیا''، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ص 155
4۔ سید احمد خان، سر، ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' رسالہ، جلد اول، ص 15
5۔ پانی پتی، محمد اسماعیل، مولانا، ''مکتوبات سرسید''، مجلس ترقی ادب لاہور، 1959ء، ص 15
6۔ محمد اکرام، شیخ، ''موج کوثر''، ص 78
7۔ محمد اکرام، شیخ، ''موج کوثر''، ص 80
8۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، ''حیات جاوید''، لاہور آرٹ پریس، 1971ء، ص 293
9۔ شاہد مختار، ''نظریات سرسید''، شاہد پبلشرز نظامی پریس لاہور، 1992ء، ص 7
10۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، ''حیات جاوید''، ص 133,134
11۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، ''حیات جاوید''، ص 66,67
12۔ لوررومان، پروفیسر، ''اقبال اور مغربی استعمار''، بزم اقبال لاہور، 1989ء، ص 29,30
13۔ پانی پتی، محمد اسماعیل، مولانا، ''مکتوبات سرسید''، مجلس ترقی ادب لاہور، 1959ء، ج 16، ص 788,789
14۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، ''حیات جاوید''، ص 652
15۔ جرجی زیدان، ''حیات سید احمد''، اردو ترجمہ کے۔ ایم۔ فریق، علی گڑھ، 1903ء، ص 17-1
16۔ عبدالحق، مولوی، ''سرسید احمد خان حالات وافکار''، انجمن ترقی اردو کراچی، 1975ء، ص 163
17۔ محمد اکرام، شیخ، ''موج کوثر''، ص 83,84
18۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، حیات جاوید، ص 23

19_ D.N. Banner Jea: India's Nations Builders, London: Headley, 1919, pp.104-105. ibid, p.114, CF. Indian Nation Builders, pt.III, 3rd ed, Madras: Ganesh, 1918, p.214۔ یہ کتاب اس وقت اشاعت پذیر ہوئی جب ہندو مسلم اختلافات عروج پر تھے۔

20۔ عبدالحق، مولوی، ''سرسید احمد خان حالات وافکار''، انجمن ترقی اردو کراچی، 1975ء، ص 76

21_ B.A. Dar: Religious Thought of Sayyid Ahmad Khan, Institute of Islamic Culture Lahore, 1971, p.262 (1st ed. 1957)

22۔ جمال الدین الافغانی اور محمد عبدہٗ، "الدھریون فی الھند، در: العروۃ الوثقی والثورۃ التحریریۃ"، الکبریٰ، طبع لو، قاہرہ: دار العرب، 1957ء، ص 372,373

23_ Ignaz Goldziher: Di Richtungen der Islamischen Koranauslegung, Leiden: Brill, 1920, pp.319-320

24۔ پانی پتی، شیخ محمد اسماعیل، ''مکتوبات سرسید''، مجلس ترقی ادب لاہور 1952ء، ص 2
25۔ ایضاً، ص 36
26۔ ایضاً، ص 56,59

27۔ صدیقی، علی محسن: ''سر سید کی تاریخی تصنیفات''، مجلہ، برگ گل، ص170
28۔ القرآن، آل عمران: 64
29۔ پانی پتی، شیخ محمد اسماعیل: ''مکتوبات سر سید''، ص65
30۔ ایضاً، ص70
31۔ ایضاً، ص73-75
32۔ سید احمد خان، سیر: ''سیرۃ محمدی''، مقدمہ، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، 1957ء، ص55-60
33۔ ایضاً، ص61,62
34۔ ایضاً، ص63-67
35۔ صدیقی، علی محسن: ''سر سید کی تاریخی تصنیفات''، مجلہ برگ گل، ص168
36۔ احمد، عزیز: ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1989ء، ص60
37۔ صدیقی، میاں محمد، ڈاکٹر: ''اردو زبان میں چند اہم کتب سیرت''، سہ ماہی فکر و نظر، اسلام آباد، جولائی، دسمبر، 1992ء، ص277، ج30، ص1,2
38۔ ایضاً، ص278
39۔ ایضاً
40۔ ایضاً
41۔ ایضاً، ص279
42۔ ایضاً
43۔ ایضاً، ص280
44۔ ایضاً
45۔ آرنلڈ، ٹی، ڈبلیو: ''پریچنگ آف اسلام''، لندن، 1896ء

46. Hubert, Grimme, "Mohammad, Des Leban Nachden Quellen (Minister 1892-95)

47۔ سید احمد خان، سر: ''خطبات احمدیہ''، ص22
48۔ ایضاً
49۔ ایضاً، ص23,24

50. William Muir, Sir, "The Life of Mohamamd", Pom original sourca, London, 1877

51۔ حالی، الطاف حسین: ''حیات جاوید''، 1901ء، ج2، ص120،
52۔ حالی، الطاف حسین: ''حیات جاوید''، ص120
53۔ ایضاً، ص121
54۔ ایضاً، ص122
55۔ ایضاً، ص123
56۔ ایضاً، ص124
57۔ ایضاً، ص126
58۔ سید احمد خان، سر: ''خطبات احمدیہ''، ص237

59۔ ایضاً،ص292

60۔ ایضاً،ص20

61۔ پیدائش،باب 21، ورس 21-9، بحوالہ، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، اردو ترجمہ،لاہور،1958ء

62۔ آر،کوئی جن، ''عربی ترجمۃ توراۃ سامری''، گلڈنی بشاور،1851ء

63۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''،ص112

64۔ گنتی باب 10 ورس 12

65۔ پیدائش باب 14، ورس 5 تا 7

66۔ گنتی باب 13 ورس 1 تا 3

67۔ گنتی باب 13 ورس 26

68۔ استثنا باب 33 ورس 2

69۔ حبقوق باب 3 ورس 2

70۔ سلاطین اول باب 11 ورس 18

71۔ گنتی باب 13 ورس 26

72۔ پیدائش باب 14 ورس 7,8

73۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص116

74۔ باب 25 ورس 18

75۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''،ص119

76۔ گنتی باب 11 ورس 3

77۔ گنتی باب 11 ورس 34,35

78۔ باب 12 ورس 16

79۔ باب 13 ورس 26

80۔ سید احمد خان سر، ''خطبات احمدیہ''،ص125

81۔ پیدائش باب 21 ورس 14,15

82۔ پیدائش باب 26 ورس 18 تا 22

83۔ پیدائش باب 21 ورس 19

84۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''،ص129

85۔ ایضاً،ص141

86۔ توراۃ کتاب پیدائش باب 21 آیت 10

87۔ پیدائش باب 13 ورس 1-6

88۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''163-175

89۔ ایضاً،ص167

90۔ ایضاً،ص38

91۔ ایضاً،ص36

92۔ ایضاً،ص137

93. Forster Charles, "Mahomtani SM Unveiled", London 1829

94۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص223

95۔ ایضاً،ص226

96. Gibbon, Edward, "LIfe of Mahomet", New York1879

97۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص229

98۔ ایضاً،ص237

99۔ ایضاً،ص239

100۔ ایضاً،ص241

101۔ ایضاً،ص244

102. Higgins, Godfray, "An Apology for the Life and character of the celebrated Prophet of Arabia", called Mohammad or the illustraious, London, 1829

103. Davenport, John, "Apology for Mohammad and the Quran", Lodon, 1879, reprint Lahore, 1975

104۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص249

105۔ ایضاً،ص251

106. Johns, "Militent Islam", London, 79, p85

107۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص260

108۔ ایضاً،ص263

109۔ ایضاً،ص36,37

110۔ ایضاً

111. Higgins, Godfray, and Apology for the Life and character of the celebrated Prophet of Arabia, called Mohammad or the illustrious, Lond 1829

112۔ ایضاً

113. Devenport, John, "Apology for the Mohammad and the Quran", London 1879

114. Gibbion, Edward, "Life of Mohammad", New York, 1879

115. Lomartine A. M. , "Mohamet in les Crand, Bmmes-De Orient, paris, 1889

116۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص41

117۔ محمد اکرام،شیخ،''موج کوثر''،ص250

118۔ کاشمیری،شورش،ابوالکلام آزاد،الفیصل ناشران وتاجران لاہور،1994ء،ص22

119۔ ایضاً،ص27

120۔ ایضاً،ص22

121۔ ایضاً،ص22

122۔ ہمایوں کبیر،''مرتبہ آزادیٔ ہند ابوالکلام آزاد''، ارشد بک سیلرز آزاد کشمیر، 1994ء، دیباچہ

123۔ محمد اکرام، شیخ:''موج کوثر''، ص251

124۔ بلیک ووڈ، ایلین،''دنیا کی نامور شخصیات قبل مسیح سے زمانہ حال تک''، ترجمہ ملک اشفاق، فکشن ہاؤس لاہور، 1999ء، ص97-98

125۔ تذکرہ ہمایوں کبیر (مرتب)''ابوالکلام آزاد''، ایک یادگار مجلہ بمبئی، 1956ء

126۔ محمد اکرام، شیخ:''موج کوثر''، ص252

127۔ کاشمیری، شورش:''ابوالکلام آزاد''، ص390

128۔ بلیک ووڈ، ایلین، دنیا کی نامور شخصیات قبل مسیح سے زمانہ حال تک، ترجمہ ملک اشفاق، فکشن ہاؤس لاہور، 1999ء دیباچہ

129۔ عارف، انور، (مرتب) آزاد کی تقریریں، ص36

130۔ مالک رام:''کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں''، جنگمس بکس لاہور، 1990ء، ص94

131۔ ہمایوں کبیر،''مرتبہ آزادیٔ ہند ابوالکلام آزاد''، ارشد بک سیلرز آزاد کشمیر، 1994ء، ص3-5

132۔ آزاد، ابوالکلام، غبار خاطر، ص115

133۔ ہمایوں کبیر، انڈیا فریڈم، 1959ء، ص71

134۔ محمد اکرام، شیخ:''موج کوثر''، ص263-261

135۔ کاشمیری، شورش، ابوالکلام آزاد، ص31

136۔ شاہجہانپوری، ابوسلمان، ڈاکٹر:''مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ''، مکتبہ اسلوب کراچی، 1986ء، ص17-18

137۔ عزیز احمد، پروفیسر:''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' ترجمہ جمیل جالبی ڈاکٹر، ص255

138۔ شاہجہانپوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، ص37-38

139۔ قاضی، جاوید:''سرسید سے اقبال تک''، نگارشات لاہور، 1986ء، ص231

140۔ الہلال، اگست 1927ء، ص62

141۔ آزاد، ابوالکلام:''خطبات ابوالکلام آزاد''، ص96-97

142۔ عارف، انور:''مرتب آزاد کی تقریریں''، ص162-163

143۔ ایضاً، ص64-65

144۔ قاضی، جاوید:''سرسید سے اقبال تک''، نگارشات لاہور، 1986ء، ص231

145۔ تونسوی، طاہر:''اقبال اور عظیم شخصیات''، شاہ عالم گیٹ لاہور، 1979ء، ص138

146۔ بٹ، عبداللہ:''مقالات ابوالکلام''، قومی کتب خانہ لاہور، 1943ء، ص90

147۔ ہمایوں کبیر،''مرتبہ آزادیٔ ہند ابوالکلام آزاد''، ارشد بک سیلرز آزاد کشمیر، 1994ء، دیباچہ

148۔ آزاد، ابوالکلام، مولانا:''تحریک آزادی''، علمی پرنٹرز لاہور، سن ندارد، ص90

149۔ مالک رام، کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں، جنگمس بکس لاہور، 1990ء، ص94-95

150۔ ایضاً،ص95

151۔ ایضاً،ص98

152۔ الہلال، اگست 1927ء،ص62

153۔ خلیق انجم، ڈاکٹر،''مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے''، طیب پبلشر لاہور، 2005ء،ص246-247

154۔ ایضاً،ص260

155۔ کاشمیری،شورش،''ابوالکلام آزاد''،ص466

156۔ ایضاً،ص469

157۔ ایضاً،ص483

158۔ محمد اکرام،شیخ،''موج کوثر''،ص261,262

159۔ ابوالکلام،آزاد،''رسول رحمت''،ص22

160۔ القرآن،طور:3,2

161۔ القرآن،مائدہ:17

162۔ القرآن،احزاب:46

163۔ القرآن،الاحزاب:21

164۔ ابوالکلام،آزاد،مولانا،ص29

165۔ ایضاً،ص421

166۔ القرآن،البقرۃ:20

167۔ ابوالکلام،آزاد،مولانا،''مسلمانوں کا ذخیرہ علوم وفنون اور مستشرقین''،بحوالہ اسلام اور مستشرقین،مرتب،ڈاکٹر محمد عارف عمری،دارالمصنفین،اعظم گڑھ،ج7،ص107

168. Leitner G.W, "Muhammadism SM", working, 1889, reprint Lahore1893

169۔ ابوالکلام،آزاد،مولانا،''مسلمانوں کا ذخیرہ علوم وفنون اور مستشرقین''،بحوالہ اسلام اور مستشرقین،مرتب،ڈاکٹر محمد عارف عمری،دارالمصنفین اعظم گڑھ،ج7،ص161

170۔ ایضاً،ص162

171۔ سیاحۃ المعارف،ص297

172۔ ایضاً،ص297, 321

173۔ ایضاً

174۔ ایضاً،ص300

175۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا

176۔ سال ولادت 1584ء اور وفات 1624ء ہے،صرف ونحو کے علاوہ اور تصنیفات حسب ذیل ہیں عربی تعلیم کا ابتدائی رسالہ،عربی اور عبرانی کا باہمی تعلق،عہد جدید کا عربی میں ترجمہ۔چند کتابوں کا عربی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا،لیکن ان کا تفصیلی حال معلوم نہیں۔

177۔ اس کا پورا نام ان ٹوان آئزک سیل وسٹر دے ساسی ہے، بچپن میں صحت کی حالت اچھی نہ تھی، اس لئے ابتدائی تعلیم ایک پرائیویٹ استاد سے حاصل کی، باوجود اس کے ذہن اس قدر تیز تھا کہ کم عمری ہی میں یونانی اور لاطینی میں کافی لیاقت پیدا کرلی، بارہ برس کی عمر میں ایک فاضل راہب کی ملاقات ہوئی، جس کا نام لے۔ ئی۔ ڈیگ۔ نائین تھا، اس راہب کی صحبت سے مشرقی زبانوں کا شوق پیدا ہوا، اور دس برس کی محنت اور مطالعہ سے مشرق کی سات مشہور زبانوں میں غیر معمولی قابلیت حاصل کرلی، 1780ء میں جب کہ اس کی عمر صرف 30 برس کی تھی، انجیل کے بعض حقیقی مسائل کا پتہ لگایا اور 1785ء میں اکاڈیمی آف انس کرپ شن (یعنی قدیم کتبہ جات کی انجمن) کو دو قابل یادگاریں نذر دیں، ان دو کارناموں نے اس کی شہرت دور دور تک پہنچادی، اور یورپ کی تمام علمی انجمنیں اس کی قدردانی کے لئے آمادہ ہوگئیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانس میں ہر طرف پولیٹکل بے چینی پیدا ہوگئی تھی، اور عنقریب بغاوت کی آگ مشتعل ہونے والی تھی، 1800ء میں یکا یک یہ آگ بھڑکی اور فرانس میں انقلاب ہوگیا، اس بے اطمینانی کے زمانہ میں وہ مشرقی لٹریچر کی بعض اہم تحقیقات میں مشغول تھا، کچھ عرصہ کی خوں ریزی کے بعد جب دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی، تو گورنمنٹ کی طرف سے اس کی خاص طور پر قدردانی کی گئی، اور جنیوا بھیجا گیا تا کہ ان مشرقی نسخوں کا مطالعہ کرے، جو اس شہر میں محفوظ تھے، 1806ء میں جنیوا سے واپس آیا، اور اپنی تحقیقات کی رپورٹ اکاڈیمی میں پیش کی، پھر 1808ء میں فارسی لٹریچر کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور نپولین اول شاہ فرانس نے بیرن کے عہدہ پر سرفراز کیا، اس عرصہ میں فرانس کی پولیٹکل حالت میں دوبارہ انقلاب شروع ہوا، اور 1811ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہوکر نئے سرے سے بوربون قائم ہوئی، اس زمانہ سے دے ساسی کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے، اول سررشتہ تعلیم کی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا، پھر ایشیاٹک سوسائٹی پیرس کا پریذیڈنٹ منتخب ہوا، یہ ایک ایسی علمی جماعت تھی، جس کی بالذات بھی وہ بہت کچھ مدد کیا کرتا تھا، دی فلپ کے عہد میں شاہی توجہ پھر مبذول ہوگئی اور شاہی کتب خانہ کے مشرقی حصہ کا محافظ اور اکاڈیمی آف انس کرپ شن کا لائف سیکرٹری مقرر کیا گیا، اس ممتاز محقق نے منجملہ دیگر کتابوں کے عربی صرف ونحو پر ایک ضخیم کتاب لکھی جو پندرہ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے، اس کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی کی کوششوں سے پیرس میں اردو وسنسکرت اور چینی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی کی تجویز و ہدایت سے روس اور جرمنی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع ہوئی، سال ولادت 1785ء اور سال وفات 1838ء صرف ونحو کے علاوہ دیگر تصنیفات حسب ذیل ہیں، تذکرہ شعرائے عجم، اصول عامہ صرف ونحو، اس میں مختلف مصنفین عرب کے کلام نظم ونثر کا انتخاب ہے، ایک عربی قصہ کا ترجمہ، قدامت فارس، مذہب دروز کے حالات، یہ آخری تصنیف ہے، اس میں شام کے ایک پراسرار مذہب کے حالات درج کئے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور ٹیل)

178۔ اس کا پورا نام لمسڈن میتھو ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ہے، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا عربی اور فارسی کا پروفیسر تھا، عربی کے علاوہ فارسی میں بھی اس کی ایک صرف ونحو موجود ہے، 1830ء میں ایسٹ انڈیا کی ملازمت ترک کر کے انگلستان گیا، اور علمی مشاغل میں مصروف رہا، ولادت 1707ء، وفات 1835ء۔

179۔ وقالو ولیم ناسولیس، مصنفہ مولوی کبیر الدین احمد مرحوم کا دیباچہ

180۔ ابوالکلام آزاد، مولانا، ''مسلمانوں کا ذخیرہ علوم وفنون اور مستشرقین''، بحوالہ اسلام اور مستشرقین، مرتب، ڈاکٹر محمد عارف عمری، دار المصنفین اعظم گڑھ، ج 7، ص 167

181۔ ماثینس، علامہ، ''کنز اللغات وشرقیہ''، وانکا دار السلطنت، اٹلی، 1680

182۔ ابوالکلام آزاد، مولانا، ''مسلمانوں کا ذخیرہ علوم وفنون اور مستشرقین''، بحوالہ اسلام اور مستشرقین، مرتب، ڈاکٹر محمد عارف عمری، دار المصنفین اعظم گڑھ، ج 7، ص 167,168

183۔ ایضاً، ص 168

184۔ ایضاً، ص 169

185۔ محمد اکرام، شیخ، ''موج کوثر''، ص 166

186۔ ایضاً،ص167

187۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،آگرہ،1870ء،ص207

188۔ سید احمد خان،سر،''رسالہ تہذیب الاخلاق''،انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ،ص74,75

189۔ ایضاً،ص105-124

190۔ چراغ علی،مولوی،''دی پروپوزڈ پولیٹیکل،لیگل اینڈ سوشل ریفارمز ان دی آٹومن ایمپائر اینڈ محمڈن اسٹیٹس''،بمبئی،1883ء،ص128

191۔ چراغ علی،مولوی،تحقیق الجہاد،حیدرآباد،ص87

192۔ اے۔گوئیلویم،''دی ٹریڈیشن آف اسلام''،آکسفورڈ،1924ء،ص94-97

193۔ چراغ علی،مولوی،''دی پروپوزڈ پولیٹیکل،لیگل اینڈ سوشل ریفارمز ان دی آٹومن ایمپائر اینڈ محمڈن اسٹیٹس''،بمبئی،1883ء،ص10-12

194۔ چراغ علی،مولوی،''تحقیق الجہاد''،حیدرآباد،ص187,188

195۔ رسالہ''دفع الزام فی غزوات الاسلام''،لکھنو،1847ء،ص3-5

196۔ چراغ علی،مولوی،''تحقیق الجہاد''،حیدرآباد،ص187,188

197۔ سید محمد عسکری،''حقیقت الاسلام''،کانپور،1874ء،ص13

198۔ چراغ علی،مولوی،''دی پروپوزڈ پولیٹیکل،لیگل اینڈ سوشل ریفارمز ان دی آٹومن ایمپائر اینڈ محمڈن اسٹیٹس''،ص112,113

199۔ ایضاً،ص117,118

200۔ محمد اکرام،شیخ،''موج کوثر''،ص168

201۔ مخزن لاہور،بابت ستمبر1928ء،ص2

202۔ امیر علی کی حیات وکردار کا ایک خاکہ،امیر علی از W.C اسمتھ،انسائیکلوپیڈیا آف اسلام،جلد دوم،ص443,444

203۔ حالی،الطاف حسین،مولانا،''حیات جاوید''،ص143

204۔ محمد اکرام،شیخ،''موج کوثر''،ص170

205۔ ایضاً،ص 4

206۔ ایضاً،ص6,7

207۔ ایضاً،ص173-175

208۔ امیر علی،''دی اسپرٹ آف اسلام''،لندن،1961ء،ص37

209۔ ایضاً،ص122-132

210۔ ایضاً،ص64

211۔ Vie de Jesus،پیرس،1867ء،ص17

212۔ احمد،عزیز،پرویز،''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''،ترجمہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،ص133

213۔ امیر علی،''دی اسپرٹ آف اسلام''،لندن،1961ء،ص81,82,121

214۔ ایضاً،ص22

215۔ ایضاً،ص173

216۔ ایضاً،ص202,203

217۔ ایضاً،ص87

218۔ ایضاً،ص398,399

219۔ ایضاً،ص211-219

220۔ ایضاً،ص211-213,218

221۔ ایضاً،ص257

222۔ ایضاً،ص262

223۔ ایضاً،ص142

224۔ ایضاً،ص251

225. Dazy, Hist, des Muslumansd, Espagne, vol ii, p.87

226۔ ایضاً

227. Lenormant, "Ancient History of the East", Vol.II,P.293

228۔ ابن الاثیر، جلد اول،ص55-58

229۔ امیر علی، سید،''روح اسلام''، ترجمہ، محمد حادی حسین،ص56

230۔ ایضاً،ص57,58

231۔ کتاب پیدائش16،4اور6

232۔ امیر علی، سید،''روح اسلام''، ترجمہ، محمد حادی حسین،ص59

233۔ ایضاً،ص60

234۔ ایضاً،ص61

235۔ ایضاً،ص62,63

236۔ ابن الاثیر، جلد اول،ص308

237. Gibbon, Decline and fall of the Roman Empire, vol vi, pp 114,115 caussin de perceval Hist des Arabs, vol i, pp 128-131

238۔ ایضاً

239۔ ولیم میور،''لائف آف محمدؐ''، مقدمہ، ج1

240۔ ابن الاثیر، جلد اول،Caussin de perceval, vol.i, p.138،طبری

241. Lenormant, Ancient History the East, vol.ii, p.296

242۔ ابن الاثیر، جلد اول

243. Beausobre, Hist.du Manicheisme, pt.i.i ii, chap.iv

244. Mosheim and Gibbon, in loco

245. Tertullian, Blunt, "History of the Christian Church", p.138

246. Milman, "Hist. of Christianity", pp.398-362

247۔ امیر علی، سید،''روح اسلام''، ترجمہ، سید حادی حسین،ص70

248۔ احمد، عزیز، پروفیسر،''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی،ص134

249. Dollinger, The Gentile the Jew, Encyclopedia Universal art, pp.405, 406
250. Mariage,Dollinger, The Gentile and the Jew, vol.ii, p.333
251. Dollinger, The Gentile and the Jew, vol.ii, p.233-238
252. Grote, "History of Greek", vol.vi, p.136
253. Gibbob; Decline and Fall of the Roman Empire, vol.ii, p.206
254. St. Augustine, lib.ii cont, Faust ch.xvii
255. Encyclopedia Universelle, art, Mariage
256. Enc univ, Art. Mariage and Devenport Apology for Mahomet
257. Hallam. Cone. Hist of England, vol.i, p.87, and note, Middle Ages, p.353 (vol.ed.)
258. Dollinger, The Gentile the Jew, vol.i, p.406
259. Lenormont, Ancient Hist. of the East, vol.ii, p.318

260۔ امیر علی، سید، ''روح اسلام''، ترجمہ، سید حادی حسین، ص367
261۔ ایضاً، ص369
262۔ ایضاً، ص370
263۔ ایضاً، ص386
264۔ ایضاً، ص403
265۔ ایضاً، ص403
266۔ امیر علی، سید، روح اسلام''، ترجمہ، سید محمد حادی حسین،
267۔ احمد، عزیز، پرویز، ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص142

268. L' Influence des Croisades sur, L, Etat dest Europe, peuples de L, by Maxime de Choiseul D' Aillecourt, Paris, 1809
269. Maine, Ancient law, p.104
270. Caesar, De Bell. Gall. lib. vi, Tacitus, De Moribus German, cap.24,25 and Pothier, De Stat. Servor apud Germ. Lib,i

271۔ احبار ب25-44-45
272۔ نیا عہد نامہ۔ تمیتھیس اول ب2-4

273. Milman, Latin Christianit, vol.i, p.358
274. Millman, Latin, Christianity v.ii
275. Milman, Latin Christianit, vol.ii, p.369, Du Cange, Concubina
276. Stephan, "Commentaries on the Laws of England", book, ii, part I, Chapter, II

277. Pufendorff, Law of Nature and Nations, book vi, C 3,5,10 Ulricus Huberus, Praelect Jur. Cire. l.i.tit.4,5,6, Pothier, De statu Servorum, and Grotius, De Jure Bell, 1,ii.c.5,s

278۔ تہذیب الاخلاق، 15 رجب 1288ھ، صفحہ 118

279۔ القرآن، النور:33

280۔ نیا عہد نامہ کلیسوں کے نام خطاب 3-22 تمیتھیس کے نام پہلا خطاب 6-1

281. Milman, Latin Christianity, vol.ii, p.387

282. Milman: Hist. of the Jews, vol.iii, p.48

283. Mr. Joseph Thompson, "Times", Journal, London 14 Nov, 1887

284۔ امیر علی، سید، ''روح اسلام''، محمد ہادی حسین، ص 417

285۔ احمد، عزیز، پرویز، ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص 134

286۔ امیر علی، سید، ''روح اسلام''، محمد ہادی حسین، ص 419

287۔ ایضاً

288۔ احمد، عزیز، پرویز، ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص 138

﴿...... باب چہارم ......﴾

مستشرقین کے افکار کے ناقدین سیرت نگار

باب چہارم

مستشرقین کے افکار کے ناقدین سیرت نگار

فصل اول: شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار:

فصل دوم: مولانا ادریس کاندھلوی بحیثیت سیرت نگار

فصل سوم: مولانا حکیم عبد الرؤف داناپوریؒ بحیثیت سیرت نگار

فصل چہارم: قاضی محمد سلیمان منصورپوری بحیثیت سیرت نگار

فصل اول

تمہید:

1919ء سے 1947ء، سیرت نگاری کے عروج کا دور ہے۔ زیر نظر عہد یورپی ومغربی استعماریت کے سیاسی وتہذیبی غلبہ و اثرات سے عبارت ہے۔ عالمی جنگوں کے اصل متاثرین مسلمان تھے یہ ایک پرآشوب دور تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اس پرآشوب دور میں اپنے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس کو اپنے لئے جائے عافیت جانا اور ان ہی کے دامن کو تھام کر مستقبل کا سفر شروع کیا۔ چنانچہ علی گڑھ سے دیوبند تک اور ندوۃ العلماء سے دارالمصنفین تک سیرت سے روشنی اور رہنمائی حاصل کی گئی۔ علماء اور مورخین نے سیرت نگاری کو نیا اسلوب دیا۔ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی ''سیرۃ النبی ﷺ'' اور ''خطبات مدارس'' پروفیسر نواب علی کی ''سیرت رسول اللہ ﷺ'' مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کی ''اصح السیر'' مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی ''سیرت المصطفیٰ ﷺ'' مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم ﷺ اور چوہدری افضل حق کی محبوب خدا سمیت درجنوں کتب سیرت نے مطالعہ سیرت میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور نگارشات سیرت کا رنگ اور آہنگ یکساں نہ تھا۔ انداز اور سوچ بھی مختلف تھا۔ چنانچہ سیرت نگاری کے نئے رجحانات بھی سامنے آئے۔

شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار

احوال و آثار:

برصغیر پاک و ہند میں سیرت نگاری کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی کا نام سنہری حروف میں لیا جاتا ہے۔ یہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مستشرقین کے افکار کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ذیل میں ہم پہلے شبلی نعمانی کا تعارف پیش کرتے ہیں:

سلسلہ نسب:

بندول میں راجپوتوں کی آبادی تھی جس کے مورث آج سے تقریباً ساڑھے چار سو قبل مسلمان ہوئے۔ اس خاندان میں شبلی کی پیدائش ہوئی شبلی کا سلسلہ نسب وہی نومسلم راجپوتوں کا ہے جو راوت کہلاتے ہیں۔ سہراب کوان کے مرشد نے شیخ کے لقب سے سرفراز کیا اس لئے راجپوتوں کے دستور کے خلاف یہ لوگ ''خان'' کی بجائے شیخ کہلائے ان کا ننھیال انصاری شیخ تھا۔ (1)

شبلی کی ولادت:

آپ کا نام محمد شبلی تھا مئی 1857ء میں اعظم گڑھ کے نواحی گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے آپ کے والد شیخ حبیب اللہ اپنے علاقے کے بہت بڑے آدمی تھے۔ مولانا شبلی کی پیدائش بڑے ناز ونعم سے ہوئی کیونکہ شیخ حبیب اللہ اپنی اولاد کی محبت میں گھر لوٹا دینے والے تھے۔ (2)

علامہ شبلی کے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی ''حیات شبلی'' میں رقم طراز ہیں:

''علامہ شبلی کا بچپن بڑے ناز ونعم میں گزرا''۔ (3)

اس لئے علامہ شبلی کے بچپن کے اکا دکا جو واقعات ملتے ہیں ان میں آرام و آسائش اور سہولیات کا پہلو واضح نظر آتا ہے۔ شبلی نے ایک دیندار گھرانے میں جنم لیا آپ کے والدین صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور معاشرے میں ان کی عزت کو نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ابتداء میں اپنا نام محمد شبلی لکھتے تھے لیکن بعد میں صرف شبلی کر دیا اور اس کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔ (4)

والدہ سے محبت:

شبلی نعمانی اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے اور جب ان کے والد نے دوسری شادی کر لی تو انہیں اپنے والد کا یہ فعل سخت ناگوار گزرا شبلی کی ماں سے محبت کا تقاضا یہ تھا۔

''کہ جب تک سگی والدہ زندہ رہیں اس وقت تک سوتیلی والدہ سے بات تک نہ کی''۔(5)

تعلیم وتربیت واساتذہ:

علامہ شبلی نعمانی نے ایک مذہبی گھرانے میں پرورش پائی آپ کے والدین صوم وصلوۃ کے پابند تھے۔آپ کے والد شیخ حبیب اللہ عالم فاضل تھے اس لئے آپ کے والدین نے انہیں دینی تعلیم کے لئے وقف کردیا۔ابھی آپ چھ برس کے تھے کہ تعلیمی سلسلہ شروع ہوگیا۔ انسائیکلو پیڈیا کے مطابق آپ نے ''ابتدائی تعلیم اپنے والد اور مولوی شکر اللہ سے حاصل کی''۔(6)

آپ نے قرآن مجید اور فارسی کی کتابیں اپنے آبائی گاؤں بندول میں پڑھیں۔سید سلیمان ندوی کے نزدیک علامہ شبلی کے سب سے پہلے معلم حکیم عبداللہ صاحب تھے جو علامہ شبلی کے آبائی گاؤں کے ساتھ جیراجپور کے رہنےوالے تھے۔انہوں نے 1980ء میں وفات پائی۔(7)

اعظم گڑھ کے مدرسے میں مولوی فیض اللہ سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔اعظم گڑھ سے فراغت کے بعد جون پور میں مولوی ہدایت اللہ خان سے کچھ روز تک اکتساب علم کا سلسلہ جاری رہا۔علامہ شبلی نے فاروق چریا کوٹی سے بہت سے علوم میں اکتساب کیا۔

انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:

''مولانا نے چریا کوٹی سے فلسفہ ریاضی اور ادب میں مہارت حاصل کی''۔(8)

علامہ شبلی اپنے استاد چریا کوٹی کی نسبت لکھتے ہیں:

''میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد حمد اللہ، شرح مطالع صدرا، الشمس البازغہ انہیں سے پڑھیں'' اور میری تمام تر کائنات انہیں کے افادات ہیں''۔(9)

مولانا چریا کوٹی کہا کرتے تھے:

''انا اسد وانت شبلی'' ''یعنی میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ ہے''۔(10)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین کی وسعت نظر اور اصابت رائے اور مجتہدانہ نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا۔مولانا ارشاد حسین نہایت سخت حنفی تھے مولوی نذیر حسین کی ایثار الحق کے جواب میں انتصار الحق انہوں نے لکھی اور علامہ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غالی تھے۔غالباً یہی وجہ انتخاب ہوئی کہ علامہ شبلی آپ کے حلقہ درس میں فقہ واصول کی تعلیم حاصل کرتے رہے یہ تعلیم تقریباً سال بھی جاری رہی''۔(11)

رام پور سے فارغ ہونے کے بعد شبلی لاہور آئے اس وقت مولانا فیض الحسن سہارنپوری اورینٹل کالج لاہور میں ادب کے پروفیسر تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا اس پایہ کے ادیب تھے کہ سرزمین ہند نے کئی صدیوں تک شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام ادب پیدا کیا ہو''۔(12)

مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے سند حدیث:

''انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ''مولانا نے جناب احمد علی محدث سہارنپوری سے حدیث کی سند حاصل کی''۔(13)

قانون کی تعلیم 1879 تا 1880ء:

مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ اور استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کامیاب وکیل تھے۔اس لئے شبلی کو بھی وکالت کی تعلیم دلوائی ان دنوں شبلی کے ماموں بھی اعظم گڑھ میں وکیل تھے۔شبلی نے 1880ء میں وکالت کا امتحان پاس کرلیا۔

اعظم گڑھ میں وکالت:

آپ نے اعظم گڑھ میں 1881ء میں وکالت شروع کی آپ کی دلی خواہش وکالت نہ کرنے کی تھی۔ مگر والد کے اصرار پر ایسا کیا آپ نے عزم کر رکھا تھا کہ ایک حرف بھی حق وصداقت کے خلاف نہ بولوں گا۔ اسی بناء پر آپ کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانے میں ضلع بستی میں مولوی محمد کامل صاحب ولید پوری اعظم گڑھ آئے اور آپ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ 1886ء میں چند مہینے ایک بستی میں وکالت کی۔ (14)

سرسید سے ملاقات:

1881ء کا سال شبلی کی زندگی کا اہم سال تھا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کی تحریک اپنے عروج پر تھی مولوا شبلی نے سرسید کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اس قصیدہ کو دیکھ کر سرسید شبلی کی زبان اور طرز انداز سے بہت متاثر ہوئے۔ (15)

علی گڑھ کالج سے وابستگی:

علامہ شبلی 1883ء میں علی گڑھ کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے اس طرح سرسید کے رفقاء میں شامل ہو گئے۔ ایک وقت تھا علامہ شبلی کی تنخواہ چالیس روپے تھی جس وجہ سے آپ غمگین رہتے تھے پڑھانے کا سلسلہ ایف۔ اے، بی۔ اے کے طالبعلموں کو فارسی پڑھانے سے ہوا اور میٹرک کے لڑکوں کو عربی پڑھاتے تھے۔ آپ کالج کے علاوہ بھی شہر کے لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ بعد میں آپ کی ترقی ہو گئی اور کالج میں پروفیسر بن گئے تو آپ کی تنخواہ 100 روپیہ ہو گئی اس کے بعد آپ قرآن اور دینیات کا درس بھی دینے لگے۔ جب سرسید کے ساتھ تعلقات بڑھے تو سرسید نے اپنے بنگلے کے ساتھ والا مکان علامہ شبلی کو رہنے کے لئے دے دیا۔ (16)

اس طرح شبلی کو سرسید کے کتب خانے سے فائدہ پہنچا۔ شبلی کے لئے سرسید کی رفاقت بہت مفید تھی۔ انہوں نے سرسید کے کتب خانے سے بہت استفادہ کیا''۔ (17)

شبلی سرسید اختلافات:

جب تک سرسید زندہ رہے شبلی علی گڑھ کے پروفیسر رہے شبلی 16 برس تک علی گڑھ کالج میں خدمات سرانجام دیتے رہے لیکن سیاسی (Political) مسائل میں ہمیشہ ان کے مخالف رہے اور سرسید سے بار بار رنجشیں ہوئیں۔ (18)

شبلی پر عقلی پسندی کا جو رنگ چڑھ چکا تھا وہ اتارنا آسان نہ تھا اس بناء پر اختلافات بڑھتے گئے ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

عربی کی ترقی اور اصلاح کا مسئلہ:

سرسید عربی کی تعلیم کو ثانوی حیثیت دیتے تھے، نیز سرسید چاہتے تھے کہ:

''مسلمان مذہب کے علاوہ ہر چیز میں انگریز ہو جائیں''۔ (19)

سرسید جدید تعلیم کے حامی تھے اور علامہ شبلی اس کے خلاف تھے۔ علامہ شبلی 1892ء میں قسطنطنیہ سے سرسید کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ عربی کا پیانہ یہاں بھی جھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا بھی عکس نہیں جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے۔ لیکن دونوں کی حدود جدا جدا رکھی گئی ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی نہ ہو سکے گی اور یہی کم ہمارے ملک میں بھی ہے جس کا رونا ہے''۔ (20)

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

''کہ سرسید اور شبلی کے نظریہ دینی میں بظاہر یہ فرق ہے کہ سید صاحب قدیم کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اس سے تمدن اور

زندگی کے نئے رجحانات کی تائید ہو سکے۔اس کے برعکس شبلی جدید رجحانات کی تاویل اس طرح کرتے تھے کہ اس سے قدیم عقائد کی تائید نکلتی ہو۔شبلی کا اشارہ پیچھے کی طرف اور سرسید کا آگے کی طرف''۔(21)

جدید تعلیم کے بارے میں شبلی کی رائے:

آپ کے خیال میں جدید تعلیم مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ کر دے گی۔کیونکہ سرسید کا یہ فقرہ ہمیشہ شبلی کے سامنے آیا۔''کہ مسلمانوں کو مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز کر دیں''۔(22)

سیاسی اختلافات:

سیاست میں دونوں کی راہیں جدا جدا تھیں۔علامہ شبلی کانگرس میں تھے اور سرسید انگریزوں کو مسلمانوں کے لئے باعث فخر سمجھتے تھے شبلی خود لکھتے ہیں:''میں سرسید کے ساتھ 16 برس تک رہا (سیاسی Political) مسائل میں ہمیشہ ان کے مخالف اور سرسید سے بار ہا بحثیں ہوئیں''۔(23)

علی گڑھ کالج سے استعفیٰ:

ڈاکٹر سید عبداللہ طیف نثر میں لکھتے ہیں کہ شبلی کے نزدیک اس نئی تعلیم کا مقصد یہ تو نہ تھا کہ مسلمان دینداری اور معاشرت کو بھلا دیں گے۔بلکہ اس وقت تو یہ کہا گیا تھا کہ نئی تعلیم سے مسلمانوں کی حالت سدھر جائے گی۔ان کا مستقبل روشن ہوگا اور وہ پہلے سے بہتر اور دیندار ہو جائیں گے۔مگر 96-1895ء میں شبلی کو پورا یقین ہو گیا کہ نئی تعلیم مغرب کے زیر اثر دی جا رہی ہے اس لئے شبلی نے سرسید کی زندگی میں علی گڑھ کالج سے استعفیٰ دے دیا۔(24)

ندوۃ العلماء لکھنو سے وابستگی:

ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی علی گڑھ کے زمانے سے ہی دلچسپی رکھتے تھے اور ندوہ کے جلسوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔لیکن مکمل طور پر وابستگی ڈاکٹر سر سید عبداللہ کے بیان کے مطابق 1905ء سے شروع کی۔(25)

1892ء میں ندوہ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں دوسرے علماء کے علاوہ شبلی نے بھی شرکت کی۔1903ء میں مجلس انتظامیہ نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ علامہ شبلی کو ندوہ کا سرپرست بنایا جائے اور شبلی سے فرمائش کی وہ ندوہ آ کر اس کی سرپرستی قبول فرمائیں۔لیکن علامہ شبلی کسی وجہ سے نہ آ سکے لیکن مولوی حمید اللہ کو لکھا:

''یہاں سے چھوٹا تو اعظم گڑھ نہیں بلکہ ندوہ رہوں گا یا کالج''۔(26)

ندوہ میں مولانا کی سرگرمیاں

1۔ قدیم اور جدید تعلیم کا مرکز:

علامہ نے جب ندوہ کی سرپرستی قبول کی اس وقت ہندوستان میں دو گروہ تھے۔ان میں سے ایک جدید تعلیم کا حامی تھا اور دوسرا گروہ قدیم تعلیم کا۔یہ کشمکش جاری تھی علامہ خود پہلے قدیم تعلیم کے حامی تھے لیکن علی گڑھ میں سرسید کی رفاقت میں رہ کر علامہ نے اس بات کو اصولی طور پر قبول کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے انگریزی سے انکار بے معنی ہے۔اس لئے علامہ شبلی چاہتے تھے کہ جدید اور قدیم تعلیم کا ایسا نصاب ہونا چاہیے جس سے یکساں فوائد حاصل ہوں۔لیکن ندوہ میں کام کرنے کے باوجود علماء کا ایک طبقہ شبلی کو علی گڑھ کالج کا سفیر سمجھتا تھا اور ان کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔

جناب مفتون احمد رقمطراز ہیں:

''بعض علماء کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ علامہ شبلی کالج کے سفیر بن کر ندوہ آئے ہیں''۔(27)

شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں کہ:

''علامہ دراصل ندوہ کو جدید اور قدیم تعلیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے''۔(28)

نصاب میں تبدیلی:

علامہ شبلی کو ندوہ سے عشق تھا وہ اسے ایک مثالی درس گاہ بنانا چاہتے تھے اور یہ اس وقت ممکن تھا کہ اس کے نصاب میں تبدیلی کی جاتی۔ اس لئے علامہ نے اس کے نصاب کو تبدیل کرنے کا مسئلہ اٹھایا تا کہ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مشرقی تعلیم کے لئے بھی جگہ نکل سکے۔(29)

لیکن ایک علماء کا گروہ اس کی مخالفت کرتا رہا اس کے باوجود 1905ء میں انگریزی تمام طلباء کے لئے لازمی کر دی گئی۔ اس سے ندوہ کی شان وشوکت اور وقار میں اضافہ ہوا۔ شیخ محمد اکرم رقمطراز ہیں کہ ''شبلی انگریزی سکھانے کے پرزور حامی تھے''۔(30)

ندوہ کی اندرونی اصلاح اور استعفیٰ:

علامہ شبلی کے نزدیک ندوہ کے قیام کا مقصد اصلاح تھا۔ لیکن کچھ شر پسند عناصر نے اپنے ذاتی مفاد پر ندوہ کو داؤ پر لگا دیا۔ علامہ اکثر ان علماء پر برہم رہتے تھے جس کا ذکر وہ اپنے مکتوب میں کرتے ہیں۔ ''درحقیقت اب وہ لونڈوں کا مکتب رہ جائے گا''۔

آخر کار جب ندوہ کے مولوی خلیل الرحمٰن نے علامہ شبلی کے خلاف اپنا سازشی حلقہ وسیع کر دیا تو شبلی نے 1913ء میں استعفیٰ دے دیا۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''سب کا استعفیٰ آسانی سے منظور ہوا اب تنہا مولانا سہارنپوری فرمانروائے مطلق ہیں''۔(31)

علامہ نے ندوہ کی زیادہ خدمت اپنے قلم سے کی۔ اس کا موقعہ ان کو الندوہ سے ملا۔ ''وہ اگست 1904ء سے مئی 1912ء تک ندوہ سے شائع ہونے والے ایک رسالے کے ایڈیٹر رہے۔ جس کا ذکر وہ ایک مکتوب میں کرتے ہیں جو انہوں نے نواب علی حسن کو لکھا:

''ندوۃ العلماء کی طرف سے میری ایڈیٹری میں ایک ماہوار علمی رسالہ نکلنے والا ہے انشاءاللہ زور کا پرچہ ہوگا۔ آپ بھی اس میں اظہار خیال فرمائیں''۔(32)

علامہ شبلی کو دارالمصنفین کی تجویز کا خیال 1910ء میں آیا اور 1910ء میں ہی انہوں نے دارالعلوم کی سہ سالہ رپورٹ لکھ کر اجلاس دہلی میں پیش کی اور اس میں دارالمصنفین کا ذکر بھی کیا۔(33)

شبلی کی خواہش تھی کہ دارالمصنفین ایک اونچے درجے کا کتب خانہ ہو اس لئے انہوں نے مصر اور ترکی کے کتب خانوں کا دورہ کیا شبلی چاہتے تھے کہ یہ کتب خانہ ایسا ہونا چاہیے جس میں تصنیفی اور تالیفی کاموں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کو قائم کہاں کیا جائے۔ علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ یہ ندوہ میں پھلے پھولے لیکن تعصب پسند لوگوں کو یہ بات ہرگز گوارہ نہیں تھی۔ اس کا ذکر علامہ شبلی نے اپنے ایک مکتوب میں کیا ہے۔

''وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں کہ میں بناؤں میری اصل خواہش بھی یہی ہے مگر کیا کیا جائے''۔؟(34)

اصولی طور پر دارالمصنفین کا کام شروع ہو گیا تھا شبلی کی خواہش تھی کہ چند اصحاب کو تکلیف دوں گا کہ وہ دارالمصنفین کا کام دیکھیں۔ لیکن افسوس کہ شبلی دارالمصنفین میں شبلی کی زیارت گاہ بن گئی۔ کیونکہ یہ شبلی کی خواہش تھی کہ اسے دارالمصنفین میں دفن کیا جائے۔(35)

سیرت النبی ﷺ از شبلی نعمانی کا تعارف:

مولانا کی تصنیف لاتعداد ہیں جن میں زیادہ مشہور شعر العجم (5 جلدیں)، الفاروق، سیرت النعمان، المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، سفرنامہ روم و مصر وشام، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ہیں اور سیرت النبی ﷺ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ جو بوجوہ نا تمام رہ گئی تھی جسے بعد ازاں ان کے لائق شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ (36)

کہا گیا کہ:

''رفقائے سرسید میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی بھی تھا یعنی شبلی نعمانی''۔ (37)

ان سب کے باوجود شبلی کی عقل پسندی مسلم ہے اور یہ وہ عقل پسندی ہے جسے ہم سرسید کی عقلیت کی ایک معتدل شکل کہہ سکتے ہیں۔ (38)

شبلی کا درجہ عقل پسندی کی تحریک میں وہی ہے جو معتزلہ اور متکلمین میں امام ابوالحسن اشعری کا تھا۔ شبلی نے سرسید کی ہمہ گیر عقل پسندی کو معتدل بنانے کی کوشش کی اور عقل و وجدان کے درمیان ایک معقول رابطہ پیدا کرنے کی سعی کی۔

سرسید اگر امام غزالی کے افکار کی تجدید تک محصور رہتے تو شاید ان کے اور شبلی کے درمیان فکری اختلاف اتنا وسیع نہ ہوتا مگر ہوا یہ کہ سرسید امام غزالی سے دور ہو کر جتنے مغرب کی تحریکوں سے قریب ہوتے گئے اتنے ہی شبلی امام غزالی کے منوتف سے ہٹ کر امام تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے مطمع نظر کی طرف بڑھتے گئے۔ شبلی کے تصورات میں ان دونوں بزرگوں کے افکار کا اجتماع نظر آتا ہے۔ (39)

شبلی انیسویں صدی میں پیدا ہونے کے باوجود پرانے رنگ کے عالم تھے اور سرسید سے مذہبی معتقدات میں سخت اختلاف رکھتے تھے۔ (40)

وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روایتی الٰہیات کا جو حصہ آج بیکار ہے وہ پہلے بھی ناکافی تھا اور جو حصہ اس وقت بکار آمد تھا وہ آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا کیونکہ کسی شے کی صحت اور وقعت زمانہ کے انقلاب سے نہیں بدلتی۔ لہٰذا اسلامی فکر کی نئی تشکیل دراصل پرانی تشکیل ہی کی نئی توجیح ہے۔ (41) شبلی جدید علم الکلام کو اس لئے مرتب کرنا چاہتے تھے کہ جو نئے فکری مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا قدیم اصولوں کی روشنی میں حل تلاش کیا جا سکے۔ (42) برصغیر میں علم الکلام کی تشکیل نو کے علمبرداروں سے اختلاف کے باوجود شبلی ان کے اس بنیادی تصور کو مسترد نہیں کر سکے کہ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے اور یہ کسی قسم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

''بے شک اکثر مذاہب نے انسان کے ہر ہر جزئی فعل کو مذہب کے شکنجہ میں جکڑا ہے۔ لیکن اسلام اس غرض سے آیا کہ اس قسم کی تنگ درزیوں کو مٹادے۔ یہودیوں کے یہاں ایک ایک چیز مذہب کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی تھی۔ خدا نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ قرار دیا کہ یہ قیدیں اور بندشیں اٹھادی جائیں''۔ (43)

شبلی نے سرسید کے علم الکلام اور فلسفہ سیاست کی منوثر مخالفت کی اگرچہ مدرسہ دیوبند اپنے رنگ میں "قال اللہ و قال الرسول" کی شمع کو روشن کیے ہوئے تھا مگر شبلی نے اپنے مذہبی فکر کو جارحانہ سیاسی نصب العین سے ہم آہنگ کر کے اس کے لہجے میں شدت پیدا کی کیونکہ شبلی مقصد تھا کہ مسلمانوں میں تاریخی احساس پیدا کیا جائے۔ (44)

شبلی ایک ایسے شخص ہیں جن کے کارنامے اگر سرسید کے کارناموں کو بے رنگ نہیں کر دیتے تو خود بھی بے نور نہیں ہو جاتے۔ ان کے جانشین ان کے نظریوں کی تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں اور جو کام وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے اسے انہوں نے مکمل کیا اور مکمل کر رہے ہیں اور جس خلوص نیت اور لگن سے کام جاری وساری ہے وہ اس کی تکمیل کی ضمانت کے لئے کافی ہے۔ (45)

ابتداء میں شبلی نعمانی بھی سید کے رفقاء کار میں سے تھے مگر اس خیال سے کہ کہیں نیچریت تعلیم یافتہ طبقے میں شائع نہ ہو مولوی شبلی

نعمانیؒ اوران کے رفقاء کار نے ندوۃ العلماء کی طرح ڈالی ۔ دیوبند میں وہی پرانی روش پر دینیات کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ (46)

مولانا شبلی کی جامع شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے ممتاز سوانح نگار سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ :

''مولانا کا رنگ قدیم علمائے دین کا نہ تھا جن کا پاک مشغلہ صرف خانقاہوں میں رشد وہدایت اور مدرسوں میں درس وتدریس ہے۔ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیا دپڑی۔ اس لئے وہ قدیم اور جدید کے ایسے سنگ بنے جن میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے۔اسی لئے ان کی زندگی کے کارنامے گذشتہ علمائے دین کے کارناموں سے نسبتاً مختلف ہیں۔ وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے کے عالم بھی تھےاورجدید علوم کے بہت سے آراء وخیالات سے واقف بھی تھے۔قدیم علماء کی صحبت میں بھی رہےاورجدید تعلیم کے ارکان اورجدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھےاور ساتھ ہی محقق فن بھی تھےادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے،انشا پرداز بھی تھے،خطیب بھی تھے،مورخ بھی تھےاوراس کے ساتھ ساتھ ماہر تعلیم اور نئے زمانے کے مطالبات کے مقابلے میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے۔ یہ سب گونا گوں صفات ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں''۔ (47)

ہمارے ممدوح کی زندگی میں وہ حادثہ پیش آیا جس نےان کی پوری زندگی کو سرتاپا بدل ڈالا۔اس حادثہ کاتعلق 1881ء سے ہے جب مولانا شبلیؒ اپنے بھائی مہدی سے ملنے علی گڑھ کالج گئے تو اس سے بہت متاثر ہوئے۔ (48) تاثر پذیری کا یہ عمل یک طرفہ نہ تھا۔ خود سرسیداحمد خان بھی چھبیس سالہ نوجوان شبلی کی ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہوئے تھےجس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوری 1983ء میں شبلی کوعلی گڑھ میں عربی کا استادمقرر کردیا گیا ۔ (49)

جلد ہی مولانا شبلی نے ماحول میں زبردست تبدیلی کے باوجودعلی گڑھ کی صورت حال کوقبول کرلیا۔ان کے سوانح نگار کے بقول:

''محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندواور مسلمان ہرقسم کے استاداور شاگرد تھے۔ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کاایک حرف بھی نہیں پڑھاتھا جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی ۔ جو نئے تہذیب وتمدن کے سائے میں کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ یکا یک آیااوراسی پورے ماحول میں رہ کراس طرح سب سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا۔ یہ بجائے خودایک کمال ہےاورکالج میں قدیم ورجدید کی اس ہم آہنگی سے کبھی کوئی چپقلش نہ ہونے پائی جس کاایسے ماحول میں ہوا ضروری تھا''۔(50)

مذہب اس دور کا وقیع ترین موضوع تھا۔ مذہب میں فلسفیانہ انداز نظر اور عقلی استدلال کا رجحان سرسید کے علاوہ بہت سے دوسرے مصنفوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ نیچر کی فوقیت اور عقلی استدلال کی اہمیت ان سب میں قدرمشترک ہے۔شبلی ،نذیراحمد،محسن الملک اور دوسرے بزرگ سب اس میں شریک ہیں ۔ (51) سرسیدجدید تعلیم کے حامی تھےاورعلامہ شبلی اس کے خلاف تھے۔ علامہ شبلی 1892ء میں قسطنطنیہ سے سرسیدکوایک خط میں لکھتے ہیں :

''افسوس ہے کہ عربی کا پیانہ یہاں بھی چھوٹا ہےاور جوقدیم طریقہ تعلیم تھااس میں یورپ کا ذرا بھی عکس نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہےلیکن دونوں کی حدودجداجدا رکھی گئی ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی نہ ہو سکے گی اور یہی کمی ہمارے ملک میں ہےجس کا رونا ہے''۔(52)

ڈاکٹرسید عبداللہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''شبلی کے نزدیک اس نئی تعلیم کا مقصد یہ تو نہ تھا کہ مسلمان دینداری اورمعاشرت کوبھلادیں گے بلکہ اس وقت تو یہ کہا گیا تھا کہ نئی تعلیم سے مسلمانوں کی حالت سدھر جائے گی اس سےان کا مستقبل روشن ہوگااور وہ پہلے سے بہتر اوردیندار ہوجائیں گے''۔(53)

مگر 96-1895ء میں شبلی کو پورایقین ہوگیا کہ نئی تعلیم مغرب کے زیراثر دی جارہی ہےاس لئے شبلی نے سرسیدکی زندگی میں علی گڑھ کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ (54)

علامہ نے جب ندوہ کی سرپرستی قبول کی اس وقت ہندوستان میں دوگروہ تھے ان میں سے ایک جدید تعلیم کا حامی تھا اور دوسرا قدیم تعلیم کا۔ یہ کشمکش جاری تھی علامہ خود پہلے قدیم تعلیم کے حامی تھے لیکن علی گڑھ میں سرسید کی رفاقت میں رہ کر علامہ نے اس بات کو اصولی طور پر قبول کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے انگریزی سے انکار بے معنی ہے اس لئے علامہ شبلی چاہتے تھے کہ جدید اور قدیم طریقہ تعلیم کا ایسا نصاب ہونا چاہیے جس سے یکساں فوائد حاصل ہوں۔(55) علامہ شبلی نے نصاب کو تبدیل کرنے کا مسئلہ اس لئے اٹھایا تا کہ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ شرقی تعلیم کے لئے بھی جگہ نکل آئے۔(56)

شبلی کی بات سرسید کی بات سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ معنوں کا فرق کم ہے۔ لب ولہجہ کا فرق زیادہ ہے۔ وہی بات سرسید کی زبان سے ادا ہو کر مخاطبوں کو متوحش کر دیتی ہے جب کہ شبلی سے وہی بات ادا ہو تو نہایت مانوس معلوم ہوتی ہے کیونکہ شبلی قدیم روایتوں کے پاسدار اور قومی رواج کے شناسا ہیں وہ بھی سرسید کی طرح جدید علم الکلام یا نئے علم کلام کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں مگر ان کا اصول کار یہ ہے کہ:

''بزرگان سلف کے مقرر کردہ اصول کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے''۔(57)

شبلی خود قوت فیصلہ نہ رکھتے ہوتے تو وہ بھی حالی، محسن الملک اور وقار الملک کی طرح سرسید کی شخصیت میں ضم ہو جاتے۔ اس احترام کے باوجود جو ان کو سرسید سے تھا اور جو ان کی تقریروں اور تحریروں سے ظاہر ہے وہ سرسید کے اندھے مقلد نہ تھے۔ سرسید کی جس رائے کو غلط سمجھتے تھے اس سے برملا اختلاف ظاہر کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے علی گڑھ اور سرسید سے بہت فیض پایا اور ان کے خیالات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

تعلیم کے مسئلہ میں سرسید جدید تعلیم کے حامی تھے۔ انگریزی کو لازمی سمجھتے تھے جب کہ شبلی مذہب کی تعلیم کو مسلم جانتے تھے مگر ان کی تجویز کردہ اسکیم میں انگریزی کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ سرسید ترقی کے میدان میں مغربی طور پر طریقوں کی تقلید ضروری خیال کرتے تھے۔ شبلی اصولاً اور عملاً اس کے خلاف تھے اور یہی اختلاف ندوہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سرسید کے تعلیمی خاکے کے خلاف شبلی کا مقصد مذہبی تعلیم ہے اور انگریزی کی حیثیت ثانوی ہے۔ انگریزی صرف مذہبی علماء کو زمانہ کی تند و تیز آندھیوں کے مقابلہ کے لئے ضروری تھی تا کہ وہ ثابت قدمی سے قائم رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ندوہ قائم ہے جو کہ دارالمصنفین کی صورت میں ہے جب کہ سرسید کے کسی اور رفیق کو یہ شرف حاصل نہ ہو سکا کہ ان کی زندگی کے مقصد کی تکمیل میں ان کے بعد ان کے تربیت کردہ سپاہی اسی طرح سرگرم عمل رہیں۔(58)

ان سب باتوں کے باوصف شبلی کے ذہنی ارتقاء میں سرسید کا ذوق مل گیا تھا مگر عقلیت کے نئے طلسمات سے انہیں سرسید ہی نے متعارف کرایا۔ علوم جدیدہ کی اہمیت، فلسفے اور علوم طبیعی کی ضرورت، مذہب اور تمدن کا رابطہ ان سب میں شبلی نے سرسید سے استفادہ کیا۔(59)

معجزات (شبلی کے نزدیک) ناممکنات میں سے نہیں بلکہ یہ ایسے واقعات کا نام ہے جن کے اسباب ہم نہیں جانتے (ان سب کے اسباب ہوتے ضرور ہیں) اور اسی طرح وقوع محالات سے انکار کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں کہ:

''حاشا ہم ان کے امکان کا دعویٰ نہیں کرتے''۔(60)

گویا شبلی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام نہ صرف ترقی پسند مذہب ہے بلکہ ہر قسم کی ترقی کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ انہوں نے یہ بات جدید متکلمین سے زیادہ اعتماد سے کہی ہے جو عام طور پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام تمدنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

''سرسید اور شبلی کے نظریہ دینی میں بظاہر یہ فرق نظر آتا ہے کہ سید صاحب قدیم کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اس سے تمدن اور زندگی کے نئے رجحانات کی تائید ہو سکے اس کے برعکس شبلی جدید رجحانات کی تاویل اس طرح کرتے تھے کہ اس سے قدیم عقائد کی تائید نکلتی ہو شبلی کا اشارہ پیچھے کی طرف اور سرسید کا آگے کی طرف''۔(61)

حاصل بحث:

اس تمام بحث سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ شبلی پر سرسید احمد خان کے خیالات کا بہت اثر تھا۔ وہ جدید علوم سے واقفیت ضروری خیال کرتے تھے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتے تھے کہ قدیم علوم کا دامن نہ چھوڑا جائے اور قدیم علوم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے مذہب کو ہر حال میں مقدم رکھا جائے جب کہ سرسید مذہب کو زمانہ حال کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔

جب علامہ شبلی نے جدید تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تو اس کی ابتداء رسول ﷺ کی سیرت سے شروع کی۔ آپ نے سب سے پہلے ''بدء الاسلام'' کے نام سے عربی رسالہ لکھا یہ رسالہ علی گڑھ کالج کے نصاب میں شامل ہوا۔

محمد مقتدی خان شیروانی بدء الاسلام کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ بدء الاسلام درحقیقت اس تناور درخت کا گویا ایک ننھا سا تخم تھا جیسے برگد کے درخت کا ہوتا ہے''۔ (62)

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ ''شبلی نے آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اظہار کیا ہے شبلی سیرت نگاری میں اپنے پیش رو سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہیں کہ پچھلے سیرت نگاروں کے برعکس جو نبوت اور الوہیت کو خلط ملط کر دیتے تھے۔ جب کہ انہوں نے آنحضور ﷺ کو ان کی جامعیت کبری کے باوجود انسان اور بشر ہی تصور کیا ہے۔ اگر چہ آپ کی ذات روحانیت کامل اور پاکیزگی کا ارفع و اکمل نمونہ بھی تھی''۔ (63)

علامہ شبلی کی سیرت النبی ﷺ پہلی بار 1918ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اب تک سیرت النبی ﷺ کئی بار شائع ہو کر مقبول عام و خاص کا مقام ارجمند حاصل کر چکی ہے۔ مجموعی صورت میں سیرت النبی ﷺ سے بہتر کتاب کوئی بھی پیش نہیں کر سکا۔ ''قاموس الکتب میں اس پر تبصرہ یوں لکھا گیا ہے کہ: ''اس میں آنحضور ﷺ کی ولادت سے تاختم سلسلہ غزوات فتح مکہ، مصر مقدمہ مشتمل نقد و بصرہ سیرت و تاریخ عرب قبل از بحث وغیرہ ہیں''۔ (64)

وفات:

علامہ شبلی کو پیچش کے دورے پڑتے تھے۔ جس کی وجہ سے شبلی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ نومبر 1914ء میں اسہال کا دورہ پڑا جس سے آپ کی صحت خراب ہوگئی۔ 7 نومبر 1914ء کو عیدالضحیٰ کی تقریب میں بندول تشریف لے گئے۔ 17 نومبر کو سید سلیمان ندوی عیادت کے لئے تشریف لائے علامہ شبلی نے ندوی صاحب سے کہا: ''سیرت، سیرت، سیرت اور انگلی سے اشارہ کر کے کہا سب کام چھوڑ گئے''۔ (65)

علامہ شبلی کو اگر چہ فطرت نے گونا گوں، وصاف سے متصف کیا تھا جس کی وجہ سے وہ علوم اسلامیہ کے منفرد عالم و محقق ہوئے، لیکن درحقیقت ان کا اصل میدان فن تاریخ تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کا تاریخ نگاری کی جان رجحان اس وقت کے مخصوص مذہبی، سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے تھا وہ جس وقت فن تاریخ کی جانب متوجہ ہوئے تو انہوں نے یورپ کی کذب وافتراء کا عجیب و غریب منظر ضرور دیکھا ہوگا انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اس وقت کرنے کا اصل کام اسلام کی سچی علمی خدمت ہے کہ یورپ نے اسلام پر جو اعتراضات اور الزامات عائد کیے ہیں ان کا ان ہی کے اسلوب و انداز میں رد لکھا جائے اور نہایت زور و شور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے چنانچہ وہ علمائے یورپ کے اسلام پر لگائے گئے الزامات واعتراضات اور ان کی بے اعتدالیوں کے رد ابطال میں مصروف ہو گئے۔

علامہ شبلی کے سامنے تاریخ نویسی کے متعدد مقاصد تھے لیکن ان کی تاریخ نویسی فکری محور و مقصد اسلام کے اصول وعقائد اسلامی علوم وفنون، تاریخ و تہذیب، سلاطین اسلام اور سیرت طیبہ ﷺ پر اہل یورپ کے اہل قلم اور مورخین نے اپنے تعصب کی وجہ سے جو الزامات عائد کئے تھے ان کا ان ہی کے انداز اور اسلوب پر جواب دیا جائے اور ان کے کذب وافتراء کی نہایت پر زور تردید کی جائے تاکہ ان کے

اعتراضات والزامات کی کم مائیگی عیاں ہو اور اسلام کی سچی اور صحیح تعلیمات لوگوں پر واضح ہو جائیں۔ شبلی یہ بھی چاہتے تھے کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں پر جو تنقید و تنقیص کی یلغار کی جس نے نئی نسل کو اسلام سے بیزار کر دیا اور وہ یورپ کی ہر اچھی بری ادا پر جان دیتے ہیں ان کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کے قابل فخر پر عظمت اور عظیم الشان کارناموں کو پیش کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اسلام کے فیض و برکت کے فرح بخشش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کس طرح دوبالا کیا اور مسلمان حکمرانوں نے کیسے کیسے کارنامے انجام دیے۔ ہمارا موضوع شبلی کے تاریخی نظریات یا تاریخی تصانیف نہیں بلکہ اس عہد کے ساتھ ہم شبلی کی معرکۃ الاراء سیرت کی کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' کا پس منظر پیش کرنا چاہتے تھے۔

سیرۃ النبی ﷺ علامہ شبلی نعمانی کی آخری مگر سب سے زیادہ مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے وہ خود بھی اسے اپنی زندگی کا حاصل اور اپنے لئے وسیلہ نجات خیال کرتے تھے۔ علامہ شبلی کو حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے ابتدا ہی سے خاص عقیدت و محبت اور والہانہ شیفتگی تھی مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول ''اس نام نامی کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد پایاں نہ تھی۔ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ سے پہلے سیرت کے موضوع پر تاریخ بدء السلام لکھی، یہ مختصر رسالہ تھا عربی زبان میں درسی ضروریات کے لے سید احمد خان کی فرمائش پر لکھا بعد میں ان کا فارسی اور اردو میں ترجمہ ہوا۔ اس رسالے نے نہ صرف طلبہ کے دلوں میں حضرت محمد ﷺ کے لئے عقیدہ و محبت کے جذبات پیدا کیے بلکہ خود مصنف کے دل میں عشق کی قندیل روشن کردی۔ مولانا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں میں سریت نبوی پر کے کسی پہلو پر تقریر کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور بعد میں میلاد کی یہ تقریبات نہایت شان و شوکت کے ساتھ سالا رمنزلمیں منعقد ہونے لگیں۔ یہ فکر و ذہن کا میلان اور دیگر متعدد اسباب وو جوہ تھیں جس کی بناء پر سیرت نبوی ﷺ کی تالیف کا عزم مصمم کر لیا اور جنوری ۱۹۱۲ء میں ماہنامہ الندوہ میں مجلس تالیف سیرت کے قیام کا اعلان کیا اور قوم اس سے اس میں معاونت کی خواہش کی۔ (66)

علامہ شبلی کے پیش نظر سیرت مقاصد اور ضرو ریات یہ تھی۔

(۱) تالیف کا پہلا سبب حضور اکرم ﷺ سے علامہ شبلی کی عقیدت و محبت کا بے پایاں جذبہ تھا اور اس کو سعادت دارین اور وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔

(۲) تالیف سیرت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس اردو زبانمیں سیرت پر کوئی معتبر، مستند اور جامع کتاب نہ تھی اور جو کتابیں تھیں علامہ شبلی کے الفاظ میں انہیں سیرت نبوی ﷺ کہنا آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کو آزردہ کرنا ہے اس لئے یہ ایک اہم قومی اور دینی ضرورت تھی کہ اردو میں سیرت نبوی ﷺ پر ایک مکمل و مفصل اور مستند جامع کتاب لکھی جائے۔

(۳) جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ضرورت کے لئے ایک ایسی سیرت کی کتاب کی ضرورت تھی جو عربی نہیں جانتے تھے اور انگریزی تصانیف سیرت مستشرقین کی گمراہیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

(۴) علامہ شبلی کے نزدیک سیرت نبوی ﷺ کی ضرورت صرف تاریخی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ مستشرقین جب اس کو اپنا موضوع بنایا تو انہوں نے اس کے جلو میں عقائد کی بحثیں بھی شامل کر لی تھیں گویا سیرت جدید علم الکلام کا ایک اہم موضوع ہو گیا تھا۔

چنانچہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی علم الکلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراضات کا نام ہے تو یہ بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن اگر اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے۔''(67)

دراصل سیرت نبوی ﷺ کی تالیف کا یہ نہایت اہم سبب ہے اور علامہ شبلی اس کو تمام دینی و دنیوی ضروریات کا مجموعہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ ضروریات صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت بلکہ ایک علمی ضرورت ہے ایک اخلاقی ضرورت ہے ایک تمدنی ضرورت ہے ایک

ادبی ضرورت ہے مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات دینوی و دینوی ہے۔''

(۵) علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کا بنیادی مقصد اور اس کی اصل غرض و غایت نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل بتایا ہے اور اسے وہ کائنات کا سب سے اہم اور مقدس فریضہ تصور کرتے تھے ان کے نزدیک اس کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو۔ دنیا کی تاریخ میں ان کے نزدیک ایسی جامع اور کامل ہستی صرف حضور اکرم ﷺ کی ہے کیونکہ نفوس انسانی میں صرف آپ ہی کے حالات اور کارنامہ زندگی نہایت وسعت و تفصیل اور صحت و صداقت کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی۔

(۶) علامہ شبلی کا یہ بھی خیال تھا کہ علوم و فنون میں سیرت کا ایک خاص درجہ ہے اور اس کی غرض و غایت پذیری اور نتیجہ رہی ہے اس لئے وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت نہ صرف ہم مسلمانوں کی ہے بلکہ تمام عالم کو اس کی ضرورت ہے اور غالباً اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ سیرت میں ہر قسم کے مطالب آجائیں اور وہ صرف سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہو۔

(۷) نفوس انسانی کی تربیت و اصلاح کی غرض سے علامہ شبلی مورخین یورپ کے کذب و افتراء اور ان کی غلطیوں کی تردید کرنا چاہتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں حضور اکرم ﷺ سے ان کی عقیدت و محبت اور ان کی دینی حمیت و غیرت کو بھی بڑا دخل تھا، تاہم اس کے لئے پس پشت اصل مقصد اسلام کی حقیقی عظمت و بلندی کے ساتھ مورخین یورپ کے خیالات کی اصلاح ہی تھا اور اس لئے وہ سیرۃ النبی ﷺ کے انگریزی ترجمے کے بھی خواہش مند تھے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سیرت نبوی ﷺ کی اشاعت کی ضرورت سب سے زیادہ یورپ میں ہے تاکہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو۔''(68)

اس قدر بلند معیار پر سیرت نبوی کی تالیف و تدوین علمی و مالی معاونت کا اہتمام کیا گیا ایک مجلس تالیف سیرت نبوی قائم کی گئی علمی معاونت کے لئے مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی، مالی ضروریات تک کا بھی بندوبست مخیّر و موثر افراد نے کیا۔ ۱۷جون ۱۹۱۴ء آستانہ رسالت سیرۃ النبی ﷺ کی ابتداء کی، سیرت کی عظیم الشان تالیف کا جو خاکہ علامہ شبلی کے پیش نظر تھا اس کا ذکر سیرت کے مقدمہ میں اس طرح کیا ہے۔

''اس کتاب کے پانچ حصے ہوں گے پہلے حصے میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک کے عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں اسی حصے کے دوسرے باب میں آنحضرت ﷺ کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے آل و اولاد اور ازواج مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیم، عقائد اور امر و نواہی اصلاح اعمال و اخلاق ہے اس بناء پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصے میں کی گئی ہے اس حصے میں فرائض خمسہ اور امر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے اسی میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصے میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصے میں معجزات کی تفصیل ہے قدیم سیرت کی کتابوں میں الگ باب باندھے ہیں لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی بھی ضرورت پیش آئے گی البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سن متعین ہے مثلاً معراج یا تکثیر طعام وغیرہ اس کو سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے۔ یعنی یورپ نے آنحضرت ﷺ اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا؟ اس ضمن میں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف وتدوین کا کام ضعیف العمری، خرابی صحت اور خانگی مسائل اور سب سے بڑھ کر قومی وملی درد سے چور ہو کر لکھا۔

ہماری علمی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ علامہ شبلی سیرۃ النبی ﷺ مکمل نہ کر سکے دو جلدیں ان کی وفات کے وقت مسودہ کی حالت میں طباعت کی منتظر تھی۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں یہ جلدیں شائع ہوئیں، بقیہ پانچ ضخیم جلدوں کو ان کے شاگرد عزیز اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے بحسن وخوبی مکمل کیا۔

سیرۃ النبی کا اسلوب ومنہج:

''سیرۃ النبی ﷺ'' کے تفصیلی تعارف سے قبل اگرچہ تمہیدی کلمات میں علامہ شبلی نعمانی اور سیرۃ النبی ﷺ کے بارے میں چند امتیازات وخصوصیات کی جانب نشاندہی کی تھی، اب تفصیلی تعارف ومطالعہ کے بعد علامہ شبلی اور سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے چند نکات کا مطالعہ سیرت نگاری کے رجحانات کے تعین کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

(۱) شبلی نے اردو میں اسلامی تاریخ نویسی کی روایت قائم کی لیکن احیائے اسلام کا گہرا قدامت پسند رنگ شبلی کے ہاں نمایاں ہے۔

(۲) شبلی نے اسلامی تاریخ نویسی میں جو منہاجیات قائم کیں وہ بحیثیت مجموعی روایتی اسلامی وقائع نگاری سے مرکب اور سوانحی اسلوب کا حامل ہے۔

(۳) شبلی کے نزدیک تاریخی اسلام میں افراد زیادہ توجہ کے مستحق ہیں، وہ تابندہ ہستیاں جن کے وجود سے روشنی پھیلتی ہے اور جو تاریخ کی نشوونما میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں، جن میں رسول پاک ﷺ کی حیات طیبہ کو سرفہرست رکھتے ہیں۔

(۴) علامہ شبلی علم الکلام کو صحیح مواد کا سرچشمہ اور ''ترقی پذیر قدامت پسند'' عقلیت کے لئے طاقتور ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(۵) علامہ شبلی کو اگرچہ مغربی مستشرقیت، میں اسلام کے خلاف پوشیدہ رو کی موجودگی پر سخت اعتراض تھا لیکن وہ جدید مسلم ہندوستان کے مورخین میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی علم وفضل کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اسلام کی ثقافتی اور مذہبی سرچشموں کے متعلق تحقیق وتجسس اور اسے تلاش، جمع ومرتب کیا، مخطوطات کی تدوین کی اور مطالعہ اسلام کے لئے ایک تاریخی اور سائنٹفک تناظر قائم کرنے میں کی کوشش کی۔ مغربی مستشرقیت کی مبارزانہ دعوت (چیلنج) جس سے وہ کبھی جوش میں آجاتے ہیں اور کبھی ناراض ہو جاتے تھے۔ اس کا اندازہ ''سیرۃ النبی ﷺ'' کے مواد سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ شبلی کے خیال میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں مغربی مستشرقین کے خیالات معاندانہ اور متعصبانہ تھے وہ اس پر متفکر تھے مغربی تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان نوجوانوں کا ان مغربی تصانیف سے متاثر ہونا لازمی تھا، کیونکہ اپنے تنقیدی شعور وفہم کے ساتھ، بنیادی عربی ماخذ تک ان کی رسائی ممکن نہیں تھی، علامہ شبلی نے اس احساس کی بناء پر کلاسیکی روایت میں سیرت پاک کے ابتدائی مواد کو لدادریا نہاندزم میں دیکھنے اور پرکھنے کے نئے عنصر کا اضافہ کیا اور اس کے بعد سیرت کے ادب میں جو قابل اعتماد عناصر ملے ان کی بالترتیب درجہ بندی کی اور آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ کو شامل کیا۔

(۶) علامہ شبلی نے انتقاد سیرت کے چار اصول مقرر کیے، اول یہ کہ رسول پاک ﷺ کی حیات مبارکہ کے متعلق قرآن کو جو کچھ بیان کرتا ہے اسے مغز اور روحقائق سمجھنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ صحاح ستہ میں جو شہادتیں ملتی ہیں اور بالخصوص بخاری شریف میں جو روایتی مواد ہے اسے، ادب سیرت میں، دوسرے یکساں روایتی مواد پر تقدم حاصل ہونا چاہیے۔ ابتدائی ماخذ میں ابن اسحاق، ابن سعد اور طبری ہی اس قابل ہیں کہ جن پر ایک حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے اور بقیہ کو چھوڑ دینا چاہیے، یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ غیر انتقادی ادب سیرت کی اغلاط کو اور مغربی مؤرخین کے انتہائی نظری مفروضات کو درست کرنا چاہیے۔

(۷) علامہ شبلی کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ عقیدہ، اصول عمرانیات اور اسلامی اخلاقیات کے لئے کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔

(۸) علامہ شبلی پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت نگاری میں تمثیلی حکایات کی سخت ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں۔

علامہ شبلی کے ان افکار و نظریات کا ''سیرۃ النبی'' میں جابجا اظہار ہوتا ہے۔ اگر شبلی کے مذکورہ بالا نظریات کو ملحوظ رکھا جائے تو ''سیرۃ النبی ﷺ'' کی مندرجہ ذیل خصوصیات اور رجحانات سامنے آتے ہیں۔

(۱) ''سیرۃ النبی ﷺ'' برصغیر پاک و ہند میں اردو زبان میں اپنے طرز کی ایک ایسی منفرد، مفصل اور جامع تصنیف ہے جو نہ اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ اس کے بعد اب تک پیش کی گئی۔ شبلی نے محمد امین زبیری کے نام اپنے جس خط میں لکھا تھا کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی''۔ ہمارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ اب تک (سیرۃ النبی ﷺ کی اشاعت ۸۷ برس بعد) شبلی کے اس دعوے کی لاج رکھی ہے۔

(۲) شبلی نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' تاریخ و سیر کے ان ہی مسلمہ اصولوں کے مطابق لکھی جو انہوں نے خود متعین کیے تھے، سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف میں انہوں نے قرآن کریم اور حدیث نبوی ﷺ کو تمام ماخذ مقدم اور مقدس رکھا، شبلی اور ان کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' کی تلاش میں امکانی حد تک کوئی اہم کتاب نہیں چھوڑی، یہ شبلی کی تاریخ نویسی کا اصول اور ثبوت تھا، اگر پوری کتاب کے ماخذ، مصادر اور حوالوں پر نظر ڈالی جائے تو کتب حوالہ کا ایک سمندر ہے اور اگر ان حوالوں کو جمع کر دیا جائے تو بذات خود ایک کتاب بن سکتی ہے۔

(۳) علامہ شبلی نے عربی سیرت نگاروں، مورخوں اور ارباب روایت سے جو جو فروگزاشتیں ہوئیں ان کو ہدف تنقید بنایا اور اس کی فی الامکان اصلاح اور تلافی کی کوششیں کی شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ میں مغربی مورخین اور مستشرقین کے افکار باطلہ کی تردید بھی کی۔ علامہ شبلی کو یہ تقدم حاصل ہے کہ انہوں نے چند مستشرقین کو ہی نشانہ نہیں بنایا بلکہ انہوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرت رسول ﷺ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کے آغاز ہی میں ''یورپین تصنیفات'' کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات ان کے اسباب و محرکات، ان کے اصول مشترک اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا اور مشہور مستشرقین کی فہرست بھی پیش کی سیرۃ النبی کا یہ حصہ نہایت وقیع اور نہایت اہم کوشش ہے۔

(۴) ''سیرۃ النبی'' کی زبان و بیان سادگی کے ساتھ ایسا دلنشین ہے جس میں وقار، پاکیزگی اور واقعیت ہے، سادگی اور دلنشینی کے باوجود سیرۃ النبی کے عالمانہ اور پختہ اسلوب میں کہیں جھول محسوس نہیں ہوتا ہے۔

(۵) سیرۃ النبی ﷺ میں واقعات سیرت کو تاریخی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ایک ہی نظر میں عہد نبوی ﷺ کی مکمل نظروں کے سامنے آجاتے ہیں انہوں نے اس تسلسل اور ترتیب میں اس بات کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا کہ کوئی واقعہ نامل ہونے سے نہ رہ جائے۔

(۶) علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کی پہلی دو جلدوں میں اور مولانا سید سلیمان ندوی نے آخری پانچ جلدوں میں مطالعہ سیرت کو جس گہرائی و گیرائی اور وسعت کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اس کی انفرادیت ہے۔

(۷) سیرۃ النبی ایک رجحان ساز کتاب ہے، علامہ شبلی نے سیرۃ النبی میں جو اصول، ترتیب، مزاج، معیار اور اسلوب پیش کیا بعد میں آنے والے سیرت نگاروں نے اب تک اس کی پیروی کی ہے۔ (69)

سیرت النبی ﷺ کے نمایاں رجحانات:

(۱) احیائے اسلام کا قدامت پسندانہ رجحان غالب ہے۔

(۲) عقیدت مندانہ جذبات کی عکاس ہے۔

(۳) وقائع نگاری اور سوانحی رجحان نمایاں ہے۔

(۴) مشاہیرانہ رجحان بھی شامل ہے۔

(۵) عقلیت پسندی کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور علم الکلام کا رجحان بھی مستظہر ہے۔

(۶) جدید تحقیقی رجحان نمایاں ہے۔

(۷) ترمیتی اور تبلیغی رجحان کو نمایاں اہمیت دی ہے۔

(۸) جدیدیت کا اثر و رجحان بھی شامل ہے۔

مدافعانہ معذرت خوانہ اور جدیدیت:

اردو ادب کے فاضل نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ جو شبلی کے بڑے مداح اور ان کے کارناموں کے ثناخواں ہیں، وہ سیرۃ النبی ﷺ کی جامعیت کو اس کی صفت اور اردو میں لکھی جانے والی کتب سیرت میں منفرد اور ایک عاشق رسول ﷺ کے والہانہ عقیدت و محبت کا نمونہ قرار دیتے ہیں بعض کمزور پہلوؤں کو علمی بنیادی پر تنقید بھی کرتے ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

''سب سے پہلے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے بار بار کے دعوے کے باوجود بہت سے مقامات پر شبلی کی رائے معذرت خوانہ اور مدافعانہ ہے، شبلی نے مورخین یورپ کے اعتراضات سے دب کر آنحضرت ﷺ کے غزوات کے سلسلے میں ضرورت سے کچھ بہت زیادہ معذرت کا لہجہ اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں انیسویں اور بیسویں صدی کے مخصوص علمی نظریات اور افکار کا خاص اثر نمایاں اس کے علاوہ مسلمانوں نے تعلیم یافتہ طبقے کے بعض رجحانات بھی کتاب میں چھائے ہوئے ہیں، اسلامی لڑائیوں کا، خصوصاً آنحضرت کے غزوات کا مدافعانہ ہونا، یہ عقیدہ اس دور میں نہایت راسخ اور محکم تھا۔۔۔ شبلی نے اسی کو اصول اور اساس بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پیغمبر تھے، سپہ سالار نہ تھے اور یہ بھی کہ آپ ﷺ نے جنگ کو جو بظاہر ظالمانہ کام ہے اس قدر پاک و منزہ کر دیا کہ وہ افضل عبادت بن گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کا مقصد ملک گیری نہ ہو بلکہ انسانی ہمدردی اور مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت اس کی غایت ہو'' ۔ ڈاکٹر عبداللہ نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' کے چند اور کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''اسی طرح غلامی اور تعدد ازدواج کے مسئلے کے تجزیہ میں بہت کچھ دبے دبے نظر آتے ہیں اور ہر چند کہ وہ پیغمبر کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں، بار بار مغربی نقادوں کی اس رائے سے مرعوب ہو کر چلتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ہر قول و فعل عام بشریت کے مطابق تھا، حالانکہ حضور عام بشر نہ تھے، خاص بشر تھے کتاب کا وہ حصہ بھی قدرے تحقیق طلب ہے جس کا تعلق غزوات کے جغرافیہ سے ہے شبلی کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ ان مقامات کا کو دمشاہدہ کرتے جہاں جنگیں ہوئیں۔ بعد کے مصنفین ڈاکٹر حمید اللہ، بریگیڈیر گلزار احمد اور قدرے ہیکل نے تلافی کی کوشش کی اور غزوات و سرایا کے محل وقوع کے تعین کا اہتمام کیا ہے۔''

علامہ شبلی کی سیرۃ النبی ﷺ میں واقعہ ''شق صدر'' اور ''واقعہ معراج'' سے احتراز پر تنقید کی گئی ہے۔

غزوات کو دفاعی جنگ قرار دینے اور سر سید احمد خان کی طرح عیسائیوں کے اعتراضات کے مقابلے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر اردو کے دو قابل ذکر سیرت نگاروں مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے ''اصح السیر'' میں اور مولانا محمد ادریس کاندہلوی نے ''سیرۃ

المصطفیٰ'' میں سخت گرفت کی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے ''دارالمصنفین'' کی تاریخی خدمات'' میں سیرۃ النبی ﷺ پر تنقید کے معاندانہ اور غیر معاندانہ تنقید کا جواب دیا ہے انہوں نے ڈاکٹر عبداللہ کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یہ اعتراضات دراصل سیرۃ النبی ﷺ کے بنیادی مقصد تصنیف پر نظر نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے، علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کی تصنیف سے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ'' میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تا کہ ان کے تائیدی بیان حسب بیان حسب موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انہوں نے غلطی اور بددیانتی کی ہے نہایت زور وشور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے اس پردہ دری کو معذرت اور مدافعت سمجھنا درست نہیں، ڈاکٹر صاحب نے عام بشر اور خاص بسر کے ذریعہ جو اعتراض کیا ہے غالباً اس کی حقیقت سے وہ خود بھی واقف نہیں اور جہاں تک مقام غزوات کے جغرافیے کے مشاہدہ کا تعلق ہے بلاشبہ علامہ شبلی نے ان مقامات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا لیکن ایک مورخ کے لئے تمام مقامات جنگ کا بچشم خود معائنہ کرنے کا اصول فن تاریخ میں لازمی نہیں ہے اس لئے یہ اعتراض بھی غور وفکر سے خالی اور بے وزن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سیرۃ النبی پر جو اعتراضات کیے گئے ان میں بیشتر جانبدارانہ مطالعہ اور معاندانہ روش کا نتیجہ ہیں، واقفیت اور معقولیت سے ان کوئی تعلق نہیں ہے۔''(70)

سیرۃ النبی ﷺ پر اور بھی اعتراضات کی جا سکتے ہیں اور آج تک کیے جاتے ہیں ان میں بعض اعتراضات بلاشبہ معاندانہ ہیں لیکن بعض علمی، فکری اور تاریخی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ علمی، فکری اور تاریخی اختلافات علمی ارتقا کا حسن اور سیرۃ رسول ﷺ سے عقیدت و دلچسپی اور فن سیرت نگاری میں توسیع کا ذریعہ ہیں، شبلی یقیناً انسان تھے انہوں نے اپنے علم اور مطالعہ کی حد تک جو کوشش کر سکتے تھے وہ کی اور کوشش بھی ایسی جو بلاشبہ کامیاب کوشش قرار دیے جانے کی مستحق ہے اب اس سے آگے اور اس میں کوئی اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا راستہ محدود اور مسدود نہیں ہے۔

دارالمصنفین کے سیرت نگاروں میں علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی مشترکہ کاوش ''سیرۃ النبی ﷺ کا ذکر آ چکا ہے تاہم علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت پر دو مزید کتابیں لکھیں ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کا اسلوب سیرت نگاری:

اردو میں سیرت نگاری کی روایت عربی اور فارسی سے آئی ہے۔ کئی عربی کتب سیرت کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ کئی اسلامی ممالک میں سیرت کی بعض کتابوں کو ادب کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں نصابی کتابوں میں علامہ شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی'' کے بعض منتخب حصے یقیناً شامل کئے گئے ہیں لیکن ادب کی تنقید اور ادب کے لوازم کا ایک حصہ بنا کر سیرت نگاری کے ادبی اسالیب پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اردو کی جدید نثر کا آغاز سرسید احمد خان اور ان کے اہم رفقائے کار کی تحریروں سے ہوا۔ سرسید نے ضرور تاً ولیم میور کی ''لائف آف محمد'' پر تنقیدی مقالات لکھے اور اس طرح سیرت نگاری کا ایک نیا دور اردو اور برصغیر میں شروع ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی بھی اپنی تمام تر انفرادی افتادِ طبع کے باوجود سرسید ہی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔(71)

سرسید احمد خان کا اسلوب تحریر افادیت اور مقصدیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی ساری توجہ نفس مضمون کی افادیت پر مرکوز رہی۔ شبلی کے اسلوب میں موضوع کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اسلوب کی جمالیات بھی ہم رشتہ ہوتی ہے۔ شبلی نے اپنی تمام تحریروں میں یہ جمالیاتی اسلوب برقرار رکھا ہے۔ سیرت النبی ان کے آخری دور حیات کا کارنامہ ہے۔ کیونکہ وہ تحقیق اور کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے سب سے پہلی کوشش تو یہ کی کہ سیرت پر جتنی اہم کتابیں دستیاب تھیں ان کا غائر مطالعہ کیا اور پھر اپنے ذہن کو اس بنیاد پر واضح کیا کہ وہ سیرت النبی کن خطوط پر لکھیں گے۔

شبلی چونکہ جدید علم الکلام سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے اس لئے علم الکلام پر مستقل اظہار خیال کے علاوہ انہوں نے ''سوانح مولانا روم'' میں بھی اس سے کماحقہٗ کام لیا۔

سیرت نگاری کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی۔علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا''۔

آگے چل کر شبلی لکھتے ہیں:

''میں نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ کام بظاہر بہت آسان تھا۔عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا،لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی''۔(72)

اگرچہ سیرت کا لفظ اور اس کا اصطلاحی مفہوم بہت واضح ہے لیکن شبلی نعمانی کو اس امر کا احساس بھی تھا کہ ایک طرف تو عام افراد عربی سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور دوسرے علمی سطح بھی پست تر ہوتی جا رہی ہے۔ جسے انہوں نے ''علت علم اور''نا آشنائی فن'' سے تعبیر کیا۔ جو کتابیں فن حدیث اور ارباب رجال کے حوالے سے مرتب کی گئیں انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا شبلی نے مغازی اور سیرت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے اور اس امر پر بھی توجہ دلائی ہے کہ بعض مؤرخین مغازی اور سیرت میں فرق نہیں کرتے۔ ہر زاویے سے فن سیرت نگاری کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

''سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہٖ فن حدیث نہیں ہے۔اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجے کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے۔یا ان دونوں کے ہم پایہ ہے''۔(73)

شبلی نعمانی نے سیرت نگاری کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور جرح وتعدیل سے ایسے خطوط متعین کر دیئے جو آئندہ سیرت نگاروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور ہوں گے۔عموماً تحقیق اور شواہد و دلائل سے مزین تحریریں خشک اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہیں لیکن یہ شبلی کے اسلوب کا وصف ہے کہ نہایت فنی اور اساسی نوعیت کے مباحث چھیڑنے کے باوجود ان کی تحریر شگفتہ شستہ اور دلچسپ ہوتی ہے اور ان کا ادبی اسلوب ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔

اسلوب کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ''آدمی ہی اسلوب ہوتا ہے''،لیکن بسا اوقات اسلوب تحریر کا نقص بھی بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مصنف کو محاورہ بندی کا شوق ہو تو کبھی کبھی ان کا استعمال بے محل اور بے جا بھی ہو سکتا ہے اور سوئے ادب کا پہلو بھی نکل سکتا ہے۔اسی طرح داستان گوئی کا اسلوب ہر موضوع کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔شبلی نعمانی کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ادبی لوازم کے ساتھ ساتھ موضوع کے عین مطابق ہوتا ہے اور موضوعات کے تنوع کے باوجود اس میں اپنی شناخت کو گم کرنے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

کسی علمی تصنیف یا تالیف کے لئے ذہن کا صاف اور واضح ہونا ضروری ہے۔اپنے موضوع کی اہمیت،وسعت اور مواد کی فراہمی اور اپنی تصنیفی سکت کا بھی پورا اندازہ ہونا چاہیے۔سیرت النبی کی جلد اول کے ابتدائی صفحات کے مطالعہ ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی کو ان سب امور کا مکمل شعور تھا۔ جہاں انہوں نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ حضور ﷺ کے افعال واقوال کی تحقیق کے لئے آپ کے دیکھنے اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلم بند کئے گئے ہیں،اس کا کہ لئے ان کا یہ کہنا درست تھا کہ اداروں کی ضرورت ہوتی ہے پھر بھی انہوں نے تن تنہا یہ ذمہ داری قبول کی جو کمی ان کے اپنے علمی پس منظر میں تھی اس کا بھی اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ضرورت یہ تھی کہ یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی

سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا اس لئے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی جس میں قابل عربی داں اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں۔ خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔(74)

اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے کے بعد سیرت نگاری کے مختلف سلسلوں کا جائزہ لیا۔ انبیائے سلف کے حالات زندگی کا موازنہ سیرت محمدی ﷺ کی ضرورت سے کیا اور ارباب سیر کی روایات کا موازنہ کیا۔ اور خاص طور پر حافظ زین الدین عراقی کی اس تحریر کا اقتباس پیش نظر رکھا کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔

علامہ شبلی نے چونکہ علم کلام کو سیرت نگاری کے کسی مرحلے پر بھی ترک نہیں کیا۔ اس لئے انہوں نے قابل انکار روایات کو شامل کرنے سے احتراز کیا اور یہی اس سیرت کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

اس پس منظر کے بعد جب ہم علامہ شبلی کی تحریر کے محاسن کی طرف آتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اختصار، جامعیت اور ایجاز میں اعجاز پیدا کرنا ان کے قلم کا خاصہ ہے۔ انہوں نے موسیو لیبان کے اصول عمرانی کا اقتباس سامنے رکھ کر عرب کی قدیم تہذیب وتمدن کا جائزہ معروضی انداز میں لیا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانے میں اوج کمال تک پہنچ چکا تھا کیونکہ اصول ارتقا کی رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجے کی تہذیب وتمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

علامہ شبلی نے لیبان کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے "یہ ایک قیاسی استدلال ہے"۔ پورا باب ہی مثالاً پیش کرنے کے لائق ہے لیکن چند سطور ہی تنگی داماں کے سبب پیش کی جا سکتی ہیں۔(75) چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کے رہ گئیں۔

"لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر وباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم ، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ ، جاں نوازی مسیح سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارض شاہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے"۔(76)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی اسلوب پوری تحریر میں نمایاں ہے اور شگفتگی، دلکشی، شعریت اور جمالیاتی اظہار کے باوجود عبارت کہیں بھی اپنے موضوع سے باہر نہیں نکلتی۔ اسلوب کی یہی خوبی نہ صرف علامہ شبلی نعمانی کو اپنے پیش رو سیرت نگاروں سے ممتاز ومیز کرتی ہے بلکہ اپنے بعد آنے والے سیرت نگاروں کی مکمل رہنمائی کرتی ہے۔

فصل دوم

مولانا محمد ادریس کاندھلوی بحیثیت سیرت نگار

احوال وآثار:

ذیل میں ہم پہلے مولانا کا تعارف پیش کرتے ہیں:

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کا آبائی وطن کاندھلہ تھا۔ جو کہ ضلع مظفر گڑھ (یو۔پی) میں شاہدرہ دہلی اور سہارنپور ریلوے لائن پر ایک بارونق قصبہ ہے۔ (77) آپ کا گھر ایک مذہبی گھر تھا۔ آپ کے والد بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ آپ نے اپنی ولادت کے بارے میں خود لکھا ہے کہ ولدات لثلاثی عشر من سہر الربیع الثانی سنہ سبع عشر بعد معضی الفاوثلث مائۃ فی بلدۃ بھوپال (78)

آپ کی جائے پیدائش بھوپال ہے۔ کیونکہ حافظ محمد اسماعیل ریاست بھوپال میں محکمہ جنگلات میں مہتمم تھے دوران قیام آپ کی پیدائش ہوئی۔ اور کاندھلہ کی طرف نسبت صرف وطن کی وجہ سے ہے۔ (79)

مظفر نگر سے ۳۲ میل دہلی سے ۵۲ میل اور سہارنپور سے ۲۵ میل ہے۔ کاندھلولہ کے شرق میں نہر جمن شرقی ہے۔ دریائے جمنا کی وجہ سے یہ قصبہ علاقہ پنجاب کے ضلع کرنال سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اس قصبہ کی مٹی بڑی زرخیز ہے۔ یہاں پر کھیتی باڑی اچھی کی جاتی ہے۔ آموں کے باغات بھی ہیں۔ بعض تاریخی حوالوں سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد تغلق رجب ۷۹۳ء میں کاندھلہ میں شکار کھیلنے کیلئے آیا تو اس وقت کاندھلہ معمولی سا قصبہ تھا۔ یہاں پر کوئی جامع مسجد نہیں تھی سلطان محمد تغلق نے جامع مسجد کی بنیاد ڈالی۔

اکبر کے دور حکومت میں کاندھلہ ایک نمایاں مقام رکھتا تھا جب مسلمانوں کا دور حکومت ختم ہوا اور انگریزوں نے قبضہ جما لیا تو اس وقت کاندھلہ کی آبادی اکیاون دیہات پر مشتمل تھی۔ ۱۸۴۷ء میں کاندھلہ کی آبادی ۷۰۶۲ نفوس پر مشتمل تھی۔ ۱۸۵۳ء میں دس ہزار ہوگئی۔ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے وقت کاندھلہ کی آبادی چالیس ہزار کے قریب ہوگئی تھی۔ جس میں چودہ ہزار مسلمان تھے۔ (80)

سہارنپور اور مظفر نگر کے اضلاع میں اگرچہ بعض قصبے کاندھلہ سے بڑے بھی تھے مگر بارھویں۔ تیرھویں اور چودھویں ہجری میں جس قدر اہل علم وفضل اس قصبے کی خاک سے اٹھے وہ شرف کسی اور قصبہ کو حاصل نہیں ہے۔

احسان دانش کے نزدیک:

"کاندھلہ میں متعدد شاعر بھی تھے اور جید مولوی بھی۔ انگریزی کے فارغ التحصیل فضلا بھی اور اصول وعقیدہ سے انگریزی کو گناہ خیال کرنے والے صاحب نظر بھی نیز پرانے فیشن کے وہ علماء بھی جن کی علمیت کے باعث بڑی بڑی درسگاہیں اور دنیا بھر کے دارالعلوم "کاندھلہ" کے نام عزت سے لیتے ہیں۔

جس روشن ضمیر شاعر نے مثنوی مولانائے روم کا ساتواں دفتر لکھا وہ بھی اس قصبہ کی خاک سے اٹھا تھا۔ (81)

مولانا عبدالحئی جنہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی دامادی کا شرف حاصل ہوا اور جو تحریک آزادی میں حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کے دست بازو بنے اس سرزمین "کاندھلہ" سے تھے ان تمام باتوں کے علاوہ بھی اد دور میں بھی بہت سے علماء نے کاندھلہ کی سرزمین سے جنم لیا۔ جن میں مولانا محمد یحیٰی کاندھلوی، مولانا مفتی اشفاق الرحمٰن، مولانا حافظ محمد اسماعیل، مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث، مظاہر علوم سہارنپور مولانا حکیم محمد صدیق کاندھلوی، مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت، مولانا محمد یوسف امیر تبلیغی جماعت اور مولانا محمد مالک کاندھلوی جیسے نامور علمائے فضلاء شامل ہیں۔ (82)

نام ونسب:

آپ کا نام مولانا محمد ادریس کاندھلوی ادریس ہے۔کاندھلوی اس لئے کہلوائے کہ آپ کی نسبت کاندھلہ نام قصبہ کی طرف تھی۔

آپ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے آپ کے جد امجد علماء وفضلاء کی صف اول میں رہ چکے ہیں۔آپ کے دادا مفتی الٰہی بخش تھے۔جنہوں نے مثنوی مولانا ئے روم کو مکمل کیا تھا۔آپ کے اجداد میں مولانا مظفر حسین کاندھلوی،مولانا کمال الدین،مولانا حکیم شیخ الاسلام اور حکیم محمد اشرف جھنجھانوی قابل ذکر ہیں۔الفاروق بین المنقار والماق میں آپ کا شجرہ نسب یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

''بندہ ناچیز سراپا تقصیر راجی رحمتہ الرب القدیر محمد اسماعیل بن صاحب الصدق والصفا الحاج محمد اسحاق بن صاحب العلم والفضل الاتم المولوی محمد ابوالقاسم بن جامع کمالات صوری ومعنوی صاحب تالیفات الکثیر ۃ والتصنیفات المفید ۃ المشہور بالامام بالمفتی الٰہی بخش کاندھلوی غفر اللہ۔''(83) آپ کا نسب نامہ بغیر کسی انقطاع کے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے۔اس لئے والدہ کی طرف سے آپ صدیقی النسب تھے اور والدہ کی جانب سے فاروقی النسب تھے۔(84) آپ کا یہ نسب نامہ مولانا محمد علی الصدیقی (سیالکوٹ) کے پاس محفوظ ہے۔(85)

خاندان:

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے خاندان میں بہت بڑے بڑے علماء،فضلاء پیدا ہوئے ہیں۔ہم زیل میں میں آپ کے خاندان کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

مولانا محمد اسماعیل کاندھلوی کے صاحبزادگان میں سب سے بڑے مولانا محمد ادریس کاندھلوی تھے۔مولانا محمد ادریس کے چار بھائی اور چار بہنیں تھیں۔جنکے نام یہ ہیں۔(۱)مولانا حافظ محمد انیس (۲)مولوی حافظ محمد موسیٰ (۳)مولوی محمد ایوب (۴)مولوی زبیر الاسلام اور چار بہنوں کے نام یہ ہیں۔امت اللہ،سعیدہ،مسعودہ،صالحہ۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے اپنی اولاد میں چھ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

صاحبزادگان:

1۔ مولوی حافظ محمد نعمان	2۔ مولانا حافظ محمد مالک کاندھلوی	3۔ مولوی محمد میاں صدیقی

4۔ مولوی قاری محمد عثمان	5۔ مولوی قاری محمد عمران،	6۔ مولوی قاری محمد احمد

دختران:

1۔ عائشہ بیگم	2۔صادقہ بیگم (86)

تعلیم وتربیت:

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کا خاندان ایک مذہبی خاندان تھا اس لئے خاندانی روایات کے مطابق مولانا صاحب کو بھی تعلیم کی ابتدا قرآن شریف سے کرائی گئی آپ کا حافظہ بہت ہی قوی تھا۔(87)

چھوٹی عمر میں ہی قرآن مجید کو حفظ کرلیا تھا۔مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے قرآن مجید کو 9برس کی عمر میں حفظ کرلیا تھا اس پر تمام متفق ہیں۔(88)

آپ کا خاندان صدیوں سے علم ودین کا گہوارہ چلا آرہا تھا۔آپ کے گھرانے کے صرف فرد ہی تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ عورتیں بھی حد سے زیادہ دینداری نماز روزہ کی پابند تھیں۔آپ نے خالص مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔بچپن ہی سے اپنے خاندان کے لوگوں کو خدا کی طرف راغب دیکھا اس لئے آپ کے دل میں بھی خدا ترسی پیدا ہوگئی اور دین کا علم حاصل کرنے کا لگاؤ پیدا ہوگیا۔

آپ کی تربیت نہایت اچھے انداز میں ہوئی کیونکہ آپ کے والد جید عالم دین تھے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور مولانا محمد اشرف علی تھانوی بھی مہاجر مکی کے بیعت تھے اس لئے پیر بھائی تھے۔ حفظ قرآن کرنے کے بعد آپ کے والد حافظ محمد اسماعیل آپ کو حضرت اشرف علی تھانوی کے پاس لے گئے ان دنوں اشرف علی تھانوی تھانہ بھون میں قیام پذیر تھے۔ آپ کے والد آپ کو جب اشرف علی تھانوی کے پاس لائے تو کہنے لگے۔

''مولوی اشرف علی میں ادریس کو خانقاہ میں داخل کرنے کیلئے لایا ہوں اب یہ آپ کے سپرد ہے''۔

حضرت تھانوی نے برجستہ فرمایا: حافظ اسماعیل یہ نہ کہیے کہ خانقاہ میں داخل کرنے کیلئے لایا ہوں بلکہ یوں کہیے کہ مدرسہ خانقاہ میں داخل کرنے کیلئے لایا ہوں''۔(89)

جب مولانا اشرف علی تھانوی نے مولانا محمد ادریس کو دیکھا تو جان گئے کہ یہ لڑکا خانقاہ ہی نظام کیلئے پیدا نہیں ہوا بلکہ خدا تعالیٰ نے اس لڑکے سے ایسی عظیم خدمت لینی تھی جو کہ کسی کسی کا نصیب ہوتی ہے۔ اسی لیئے مولانا اشرف علی نے آپ کو مدرسہ اشرفیہ میں داخل کیا۔ ابتدائی تعلیم مولانا اشرف علی کی زیر نگرانی مدرسہ اشرفیہ میں حاصل کی۔ یہاں پر انہوں نے بعدالرہ گنگوہی سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا اشرف علی سے صرف ونحو کی پہلی کتاب کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت اشرف علی تھانوی کے مدرسہ میں صرف ابتدائی دینی تعلیم کا انتظام تھا اس لئے کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد آپ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لئے گئے جہاں پر انہوں نے مولانا خلیل احمد سہارنپوری۔ مولانا ثابت علی حافظ عبداللطیف جیسے نامور اساتذہ سے حدیث، فقہ، تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔(90)

اگر چہ آپ نے ۱۹ برس کی عمر میں سند فراغ حاصل کر لی تھی۔ مگر آپ نے دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند علم وادب کا مرکز بنا ہوا ہے اور پورے عالم اسلام میں مشہور ہے۔ اس لئے آپ دارالعلوم دیوبند چلے آئے۔ آپ نے یہاں کے علماء سے تعلیم حاصل کرنا چاہی اور دوبارہ دورہ حدیث پڑھا۔

یہاں پر آپ نے بڑے ہی مشفق، مہربان، قابل، مایہ ناز اساتذہ جن میں علامہ انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین اور مفتی عزیز الرحمٰن سے دورہ حدیث کیا۔ تعلیم سے لگن اور شفیق کا اندازہ آپ کا اس واقعہ سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جسے آپ بار بار اپنے احباب اور تلامزہ میں بیان کرتے تھے۔

''جس زمانے ہم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھتے تھے اس وقت وہاں مطبخ نہ تھا طلبہ خود اپنے کھانے کا بندوبست کرتے تھے ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ کھانا پکانے یا کھانے کی وجہ سے کوئی سبق ناغہ نہ ہو جائے اس لئے ہم اکثر یہ کرتے کہ کوئی گھنٹہ خالی ہوتا یا کوئی سبق گھنٹہ ختم ہونے سے قبل ختم ہو جاتا تو جلدی سے کمرے میں آ کر انگیٹھی پر کھچڑی چڑھا دیتے اور دوسرے سبق میں چلے جاتے جب سبق ختم ہو جاتا تو پھر کمرے میں آتے اور کھچڑی کو انگیٹھی پر سے اتارتے جیسی بھی ہوتی تھی کھا لیتے تھے۔ کبھی کچی ہوتی کبھی جل جاتی کبھی کبھی بہت زیادہ بچ بچ ہو جاتی۔ بہر حال جیسی کیسی ہوتی کھا لیتے۔ سبق ضائع نہ کرتے۔(91)

عشق رسول ﷺ:

نبوت ورسالت پر ایمان لانے کا لازمی جز و ایک یہ بھی ہے کہ انسان خصوصاً مسلمان آنحضور سے اپنے مال وعیال سے زیادہ محبت کا اظہار کرے۔ آپ سے والہانہ محبت عشق اور آپ کی پیروی کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنے رسول کی جیسی پیروی چاہتے ہیں اور وہ اس وقت ممکن ہے جب آدمی کا دل نبی کی محبت وعشق میں سرشار ہو اگر کوئی شخص آپ کو نبی تو مانتا ہے لیکن دل میں آپ کی محبت نہیں ہے تو ایمان مشتبہ ہے کیونکہ کامل محبت کے بغیر اطاعت وفرمان برداری کی منزلیں طے نہیں ہوتیں۔

خود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ کسی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب وہ مجھے اپنے، اپنی اولاد، اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرے"۔ (92)

حقیقت یہ ہے کہ اصل عشق رسول یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو اسوہ رسول کے تابع بنادے۔ کسی معاملے میں اپنے رائے اور ارادے کو باقی نہ رکھے اس کے پیش نظر ہر وقت یہ بات ہو کہ حضور اقدس کا عمل کیا تھا محض زبان سے عشق کے دعوے کرنا اور عمل سے اسکی نفی کرنا کسی صورت میں عشق رسول نہیں کہلاتا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اپنے اعمال کے ذریعے عشق رسول کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی زندگی سیرت رسول کے مطابق ڈھلی ہوئی دکھائی دیتی ہے آپ کے آنحضور ﷺ سے عشق کا ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مکمل سیرت لکھی ہے جو کہ سیرت مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے مشہور ہے۔ زندگی بھر حدیث رسول اور سنت رسول کی مختلف انواع سے خدمت کی ہے۔ خود اپنی زندگی کو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسوہ اور نمونہ کے مطابق ڈھالا۔ مولانا صاحب نے آنحضور کے مقام کو شعر اور قصیدہ کی زبان میں بھی بیان کیا ہے۔ آپ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جو سب سے پہلے قصیدہ کہا اس میں آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اسما گرامی کا ذکر کیا ہے یہ نعتیہ قصیدہ شرح مقامات حریری کی ابتدا میں درج ہے جو کہ عربی زبان ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب نے چار جلدوں میں سیرت طیبہ لکھی اس کا ایک ایک لفظ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مولانا صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت وعقیدت ظاہر ہوتی ہے۔

"سرور دو عالم سید ولد آدم محمد مصطفی احمد مجتبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتاریخ ۸ ربیع الاول یوم دوشنبہ مطابق ماہ اپریل ۵۷۰ عیسوی مکہ مکرمہ میں صبح صادق کے وقت ابوطالب کے گھر میں میں پیدا ہوئے ولادت باسعادت کی تاریخ میں مشہور قول تو یہ ہے حضور پر نور ۱۲ ربیع الاول کو پیدا ہوئے لیکن جمہور محدثین اور مؤرخین کے نزدیک راجح اور مختار قول یہ کہ ۸ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔"

عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ، فاطمہ بنت عبداللہ فرماتی ہیں کہ میں آنحضرت کی ولادت کے وقت حضرت آمنہ کے پاس موجود تھی تو اس وقت یہ دیکھا کہ تمام گھر نور سے بھر گیا ہے اور دیکھا کہ آسمان کے ستارے جھکتے جاتے ہیں یہاں تک کہ مجھ کو یہ گمان ہوا کہ یہ ستارے مجھ پر آن گریں گے۔ (93)

اس پیراگراف سے صاف طور پر واضح ہورہا ہے کہ آپ نے آنحضور کی سیرت لکھتے وقت کتنی اچھی اور عزت واحترام استعمال کی ہے اس میں ہر ایک لفظ سے محبت رسول دکھائی دیتا ہے یہی وجہ تھی کہ آپ نے کئی سال تک حدیث کی تعلیم دی اور باقاعدہ طور پر آپ نے حدیث پر کتب لکھیں ہیں۔ الغرض آپ کو آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت تھی اسی وجہ سے آپ نے چار مرتبہ حج کیا اور روضہ رسول پر حاضری دی آپ ہر وقت اس عمل میں کوشاں رہتے تھے جس میں شریعت محمدی کا حکم ہوتا تھا اپنی سیرت کو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں ڈھالنا چاہتے تھے۔

علالت:

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اپنی تمام زندگی میں درس وتدریس میں گزاری حیات مبارکہ کے آخری چند سالوں میں جب کمزوری زائد ہوگئی تب بھی صبح کے وقت صحیح بخاری کا درس دیتے رہے۔ دوپہر کا کھانا تناول فرمانے کے بعد دس بیس منٹ آرام فرماتے پھر درس وتدریس میں مشغول ہوجاتے حتی کہ ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہتا آخری چند سال ایسی ناقابل تحمل محنت کے بجٹ نہایت کمزوری کے گزرے لیکن آپ کی زندگی کا آخری سال ۱۹۷۴ تقریباً تمام کا تمام علالت وبیماری میں گزرا۔ ۱۲ اگست ۱۹۷۴ء کی شب میں بیماری نے شدت

اختیار کرلی رات اچانک ہچکیاں شروع ہوگئیں ڈاکٹر میاں بشیر احمد کو بلایا گیا۔ انہوں نے تشخیص کیا کہ جسم اور خاص کر آنتوں میں پانی کی کمی ہوگئی ہے تین چار روز کے علاج کے بعد طبیعت ٹھیک ہوگئی لیکن کمزوری بہت بڑھ گئی اور کھانا کھانا دشوار ہوگیا چند روز کے بعد پھر طبیعت خراب ہوگئی ڈاکٹر منیر الحق نے تجویز کیا کہ ایکسرے کرایا جائے ایکسرے کرایا گیا تو اس میں معدہ کے نیچے پتھری تھی مگر کئی روز کے تشخیص کے باوجود پتہ نہ چل سکا کہ تکلیف کیا ہے مگر بنیادی طور پر ڈاکٹر اس بات پر متفق ہوگئے کہ معدہ نے کام چھوڑ دیا ہے اور جگر بھی خراب ہے کئی ماہ تک علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹر انور چوہدری اور ڈاکٹر احسان الحق صاحب قریشی نے پوری توجہ اور لگن سے علاج کیا کبھی طبیعت سنبھل جاتی اور کبھی تکلیف بڑھ جاتی اسی اثنا میں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے حکیم محمد شریف جگرانوی کو دکھایا انہوں نے محبت اور خلوص کے ساتھ علاج کی پیشکش کی حکیم محمد شریف نے علاج شروع کیا اور ہر دوسرے تیسرے تشریف لاتے طبیعت کی بالکل غیر یقینی کیفیت ہوگئی تھی کمزوری حد سے بڑھ گئی اور کھانا پینا چھوٹ گیا چائے بھی اکثر واپس کر دیتے۔

ڈاکٹر انور چوہدری اور احسان الحق قریشی نے خون دینے کا مشورہ دیا مگر اس کیلئے مولانا صاحب نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں اس کو ناجائز سمجھتا ہوں بالآخر یہ طے ہوا کہ مولانا صاحب کو بتائے بغیر خون دیا جائے لہذا صوفی عبدالرشید صاحب نے دو مرتبہ خون دیا لیکن اس کے اثرات بھی چند روز رہے اور ظاہر ہے کیسے رہتے کیونکہ جب اندر ہی کام کرنا چھوڑ دے تو باہر کی چیز کیسے افاقہ کرسکتی ہے آپ کو میو ہسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دیا مگر آپ نے انکار کردیا کہ وہاں تو نرسیں ہوں گی اور وہ میرے لئے نامحرم ہیں آپ اس بات پر آمادہ ہوئے اور فرمایا کہ مرنا برحق ہے اگر میو ہسپتال میں مرنا ہے تو گھر میں کیوں نہ مروں۔

بہر حال تمام ڈاکٹر انتہائی محنت اور عقیدت کے ساتھ علاج معالجے میں مصروف رہے اور ہر ممکن کوشش کی مگر تقدیر کے آگے بندہ عاجز ہے۔ طبیعت گرتی رہی اور کمزوری بڑھتی گئی اور کمزوری اس درجہ بڑھتی گئی کہ نماز کیلئے مسجد تک جانا محال ہوگیا مسجد تک جانے میں دو یا تین جگہ بیٹھنا پڑتا تھا۔

۱۲ اگست ۱۹۷۳ء سے لیکر جولائی ۱۹۷۴ء تک عرصہ اسی بیماری وعلالت میں گزرا باوجود کمزوری اور بیماری کے درس بخاری کا سلسلہ منقطع نہیں فرمایا دیکھنے والے بھی حیرت کا اظہار کرتے کہ ایسا شخص جو چل پھر نہیں سکتا مگر درس کی محنت بڑے جذبہ کے ساتھ برداشت کر رہا ہے آخر کار جون میں بیماری نے شدت اختیار کی مولانا محمد مالک صاحب بھی ٹنڈو اللہ یار سے لاہور تشریف لے آئے ۲۶ جولائی جمعہ کا روز تھا۔ اس روز بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی جمعہ کیلئے تشریف نہ لے جاسکے نماز جمعہ کے بعد آپ کے بیٹے اور داماد سب آپ کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک تقریباً تین بجے کے قریب ایک کیفیت طاری ہوئی شام کو ڈاکٹر احسان الحق صاحب آئے انہوں نے آپ کو دیکھا اور کچھ نہ کہا مگر چہرے سے تاثرات عیاں تھے کہ ایک علم کا سورج غروب ہونے والا ہے۔

وفات:

۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء کی پوری رات انہیں کیفیات میں گزری تمام رات اہل خانہ چارپائی کے اردگرد جمع رہے یہاں تک صبح کی نماز کے بعد پانچ بجکر دس منٹ پر داعی رب کو لبیک کہتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد کر دی ''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ (94)

سیرت المصطفیٰ ﷺ کا تعارف:

معروف عالم دین مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت المصطفیٰ ﷺ تین مجلدات اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے جدید ایڈیشن میں صفحات کی تعداد ۱۵۲۳ ہے۔ مؤلف نے کتاب (سیرت النبی ﷺ) کی ابتدا میں جو مقدمہ لکھا اس میں سب سے پہلے یہ بات کہی:

''ایک مسلمان اور مومن کے لئے اتنا جاننا ضروری نہیں جتنا محمد رسول اللہ ﷺ کا جاننا ضروری ہے جو شخص محمد رسول اللہ ﷺ کو نہیں

جانتا وہ اپنے ایمان اور اسلام کو کیسے جان سکتا ہے مومن اپنے وجود ایمانی میں سراسر وجود پیغمبر کا محتاج ہے۔'' جبکہ سیرت المصطفیٰ ﷺ کی تصنیف کی وجہ مولانا کاندھلوی خود یہ بیان کرتے ہیں:

''اس دور میں اگرچہ سیرت نبوی ﷺ پر چھوٹی اور بڑی بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن ان کے مولفین اور مصنفین زیادہ تر فلسفہ جدیدہ اور یورپ کے فلاسفروں سے اس قدر مرعوب اور خوفزدہ ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ آیات و حدیث کو توڑ مروڑ کر کسی طرح فلسفہ اور سائنس کے مطابق کر دیں اور انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یہ باور کرا دیں کہ معاذ اللہ آنحضرت ﷺ کا کوئی قول اور فعل مغربی تہذیب و تمدن اور موجودہ فلسفہ اور سائنس کے خلاف نہ تھا۔'' (95)

یہی وجہ ہے کہ جب معجزات اور کرامات کا ذکر آتا ہے تو جس قدر ممکن ہوتا ہے اس کو ہلکا کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں راویوں پر بس چلتا تو جرح و تعدیل کے ذریعے سے محدثانہ رنگ میں ان روایات کو ناقابل اعتبار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسماء الرجال کی کتابوں سے جرح کر کے اقوال تو نقل کر دیتے ہیں اور توثیق و تعدیل کے اقوال نقل نہیں کرتے جو سراسر امانت اور دیانت کے خلاف ہے اور ''قراطیس تبدونہا و تخفون کثیرا'' کا مصداق ہے اور جہاں راویوں پر نہیں چلتا وہاں صوفیانہ اور محققانہ رنگ میں آکر تاویل کی راہ اختیار کی جاتی ہے جس سے آیت اور حدیث کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے اور جب خداوند ذوالجلال کے باغیوں سے جہاد و قتال کا ذکر آتا ہے تو بہت پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اس کو اسلام کے چہرے پر بدنما داغ سمجھ کر دھونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس لئے ناچیز نے یہ ارادہ کیا کہ سیرت میں ایک ایسی کتاب لکھی جائے کہ جس میں اگر ایک طرف غیر مستند اور غیر معتبر روایات سے پرہیز کیا جائے تو دوسری طرف کسی ڈاکٹر یا فلاسفر سے گھبرا کر نہ کسی روایت کو چھپایا جائے اور نہ کسی حدیث میں ان کی خاطر کوئی تاویل کی جائے اور نہ راویوں پر جرح و تعدیل کر کے اس حدیث کو غیر معتبر بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس ناچیز کا مسلک یہ ہے کہ جو آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ (96)

''سیرت المصطفیٰ ﷺ'' میں حوالوں کا انداز قدیم کتابوں کی طرح ہے جہاں عبارت ختم ہوتی ہے وہیں ماخذ کا حوالے دے دیا تاہم جدید ایڈیشن میں حوالے فٹ نوٹ میں دیے گئے ہیں۔ (97)

کتاب کی اساس و بنیاد ذخیرہ حدیث پر ہے اس کا اعتراف بایں الفاظ کرتے ہیں۔

''اس سیرت میں جتنا بھی علمی سرمایہ اور ذخیرہ آپ دیکھیں گے وہ سب حضرات محدثین کا ہے اور وہی اس کے مالک ہیں۔ اس لئے آپ انشاء اللہ العزیز اس کتاب میں کسی جگہ حضرات محدثین کے اصولوں سے انحراف و سرتابی نہ پائیں گے۔ سیرت المصطفیٰ اگرچہ اردو زبان میں ہے اور اردو میں سیرت کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا اسلوب و انداز بیان عربی میں لکھی جانے والی کتاب سیرت سے مختلف ہے لیکن سیرت المصطفیٰ ﷺ کا انداز بیان اور بطور خاص طرز استدلال تقریباً وہی ہے جو عربی میں لکھی جانے والی امہات الکتب سیرت کا ہے خود مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں محدثین حضرات کے اصول و طرز استدلال سے سرتابی نہیں کی''۔

مولف نے اکثر مقامات پر اپنا موقف پیش کرتے وقت، جس کو انہوں نے ذخیرہ حدیث کی روشنی میں مستند سمجھا، کسی خاص سیرت نگار کا نام لیے بغیر، معذرت خواہانہ رویہ کی علی الاطلاق مخالفت کی اور کسی مخالفت کی پروا کیے بغیر تمام واقعات کو محدثانہ رنگ میں پیش کیا البتہ بعض مقامات پر انہوں نے علامہ شبلی کا نام لے کر ان کے موقف کی مخالفت کی۔

مثلاً علامہ شبلی نے اس روایت کا انکار کیا کہ جس رات حضور ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی اس رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگر گر گئے اور آتش فارس بجھ گئی۔ علامہ شبلی نے اس کی دلیل یہ پیش کی کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ روایت مذکور نہیں ہے مولانا کاندھلوی نے علامہ شبلی پر بایں الفاظ جرح و تنقید کی۔

سبحان اللہ یہ اس حدیث کے موضوع ہونے کی عجیب دلیل ہے کیا کسی حدیث کا بخاری، مسلم اور صحاح ستہ میں موجود نہ ہونا اس کے موضوع اور ضعیف ہونے کی دلیل ہو سکتا ہے امام بخاری اور امام مسلم نے مثلاً بلا شک صحیح حدیثوں کے لانے کا التزام کیا مگر استیعاب اور احاطہ نہیں کیا، اور کون کر سکتا ہے، امام بخاری وغیرہ نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ صحیحین یا صحاح ستہ کے علاوہ کوئی حدیث صحیح اور معتبر نہیں بلکہ کتب اصول میں امام بخاری اور امام مسلم سے اس کے برعکس منقول ہے۔

''امام بخاری کہتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب میں سوائے صحیح حدیث نہیں لایا اور بہت بہت سی صحیح حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے امام مسلم کہتے ہیں کہ جو حدیثیں اس کتاب میں لایا ہوں وہ سب صحیح ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ جس کو میں چھوڑ دیا وہ ضعیف ہیں۔ ایوان کسریٰ میں زلزلہ آنا، فارس کا آتش کدہ بجھ جانا اور دریائے ساوہ کا خشک ہو جانا، اس پورے واقعہ کو مولانا زرقانی شرح موطا امام مالک، الاستیعاب لابن عبدالبر اور عیون الاثر (ابن سید الناس) کے حوالوں سے خاص تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔''

اردو کے بہت کم اہم سیرت نگاروں نے شق صدر کی بحث کو چھیڑا ہے، اس کو نہ چھیڑنے میں بھی یہی ذہنی خلش اور فکری دباؤ کارفرما ہے کہ معترضین اور اہل مغرب کے سامنے کیسے ثابت کریں گے کہ کسی شخص کا سینہ چاک کیا جائے۔ اسے دھویا جائے اور پھر اسے سی دیا جائے اور ایسا ایک بار نہیں متعدد بار رہوا۔ اور یہ سب کچھ کسی طبی امداد کے بغیر ہو۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی سیرۃ النبی ﷺ میں واقعہ شق صدر کا بالکل نہیں کیا مولانا کاندہلوی نے اس واقعہ کو بڑے شرح و بسیط اور مضبوط دلائل کے ساتھ لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ چار مرتبہ پیش آیا اور اپنی اصل اور ظاہر پر محمول ہے اس میں کسی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی اسے تمثیل قرار دیا جا سکتا ہے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''یہ چار مرتبہ کا شق صدر تو روایات صحیحہ اور احادیث معتبرہ سے ثابت ہے اور بعض روایات میں پانچویں مرتبہ بھی شق صدر کا ذکر آیا ہے کہ بتیس سال کی عمر میں حضور ﷺ کا شق صدر رہوا مگر یہ روایات باجماع محدثین ثابت اور معتبر نہیں۔ جہاد کے بارے میں بھی بعض اردو سیرت نگاروں کا رویہ مخالفین اسلام کے سامنے خاصا معذرت خواہانہ ہے انہوں نے اسلامی جہاد کو دفاعی جنگ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کاندہلوی نے یہاں بھی دوٹوک انداز میں بات کی ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ جہاد اقدامی بھی ہوتا ہے دفاعی بھی۔ جہاد کی بحث میں مولانا نے یہ بات بھی واضح کی کہ جو جنگ اللہ کے وفادار اللہ کے دشمنوں سے صرف اس لئے کریں کہ وہ اللہ کے احکام کی بے حرمتی کر رہے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ مسلمانوں کی جان و مال کو ان سے خطرہ ہے ایسی جنگ جہاد کہلائے گی، اسلامی حکومت قائم کرنے یا اس کے تحفظ کے لئے جو جنگ کی جائے گی وہ جہاد ہے قوم و وطن کے نام پر جنگ کی جائے گی وہ جہاد نہیں کہلائے گی''۔(98)

سیرت المصطفیٰ ﷺ اپنی تکنیک، اسلوب بیان اور طرز فکر کے اعتبار سے ''اصح السیر'' حکیم دانا پوری سے خاصی مشابہت رکھتی ہے لیکن ضخامت میں اس سے دوگنی ہے دونوں نے اپنی تصانیف کی بنیاد احادیث نبوی ﷺ پر رکھی ہے دونوں اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کے دعویدار ہیں دونوں شبلی پر یکساں انداز میں تنقید کرتے ہیں اور دونوں کو فقہی مسائل سے یکساں دلچسپی ہے اور دونوں کو اس بارے کوئی دلچسپی نہیں کہ مغربی دنیا آنحضرت ﷺ کے بارے میں کن کن غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ مولانا ادریس کاندہلوی کو بعض امور میں البتہ حکیم دانا پوری پر فوقیت حاصل ہے، ان کی سیرت کے بنیادی ماخذوں تک رسائی حکیم صاحب کی نسبت زیادہ ہے انہوں نے حکیم صاحب سے زیادہ فقہی مسائل پر بحث کی ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور اس سے قبل مولانا حکیم عبدالرؤف دانا پوری کی سیرت نگاری میں حدیث کا تقدم و ترجیح نظر آتی ہے اس کی وجہ سرسید احمد خان اور علامہ شبلی کی تاویلی عقلیت پسندی اور علی گڑھ کی جدیدیت پسندی ہے جسے علمائے حدیث قبول نہیں کرتے مذکورہ علمائے کرام کا سرسید احمد اور علامہ شبلی کی سیرت نگاری کے بعض واقعات و توجیہات سے علمائے حدیث کا اختلاف، جوابی ردعمل کی صورت میں

ان کی سیرت نگاری میں صاف ظاہر ہے۔اہل حدیث پیغمبرﷺ کی ان تمام حدیثوں کو تسلیم کرتے ہیں جو کلاسیکی مجموعوں میں محفوظ ہیں اور علی گڑھ کے جدید پسندوں کی نظری تشکیک پسندی کو مسترد کرتے ہیں کہ جو احادیث صحیحہ کو سائنسی انداز میں غلط احادیث سے تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ،جدیدیت پسندوں کے نزدیک حدیث کا علم تنقیدی علم کے بجائے تکراری ہے یہ وہ بنیادی نظریاتی اختلاف ہے جو مذکورہ علمائے کے سیرت نگاری میں واضح ہے اس لئے ہم مولانا ادریس کاندہلوی کی سیرت المصطفیٰ کو روایتی و دینی سریت نگاری کے رجحان کا تسلسل سمجھتے ہیں جو مولانا حکیم عبدالرؤف دانا پوری کی اصح السیر کے آغاز سے نظر آتا ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں جدیدیت کے مکاتب فکر علماء کے مقابلے میں قدیم روایت پسندی اور دینی مکتب فکر کی نمائندگی کرتی ہیں جس کا ترجمان دیوبند ہے۔

سیرت المصطفیٰ کی خصوصیات:

سیرۃ المصطفیٰ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت نبوی کے موضوع پر بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کو علماء اور طلباء نے یکساں پایا ہے۔ اور ان کے نزدیک بڑی مقبولیت کی حامل رہی ہے کیونکہ یہ کتاب دراصل سیرت کی تمام کتابوں کا جوہر اور لباب ہے اس کتاب میں واقعات کی تحقیق وتردید آیات قرآنیہ اور حدیث نبویہ پر مبنی ہے سیرت المصطفیٰ معنوی خوبیوں اور علمی عظمتوں سے آراستہ ہے اور اس میں ظاہری محاسن بھی جمع ہیں۔ اس سیرت کی ایک عظیم تر علمی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی بڑی کاوش کے ساتھ تخروج کی گئی ہے۔ اور حاشیہ پر آیات نمبر اور سورتوں اور احادیث کے ماخذ کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے سیرت المصطفیٰ کو بہت ہی خوبصورت انداز میں تحریر فرمایا ہے اس سیرت میں سب سے پہلے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعثت کے قبل کے حالات بیان کئے ہیں جو کہ بہت ہی اچھے انداز میں بیان کئے ہیں اس کتاب میں آنحضور اکرم صلی اللہ وآلہ وسلم کے متعلق جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا بڑی خوبی اور دلائل کے ساتھ جواب دیا ہے۔

مولانا صاحب اپنی کتاب میں تین آئمہ سیرت پر بہت ہی اچھے انداز میں تبصرہ فرمایا ہے۔ مولانا صاحب نے اپنی کتاب میں جن لوگوں نے اسلام کو قبول کیا تھا ان کا بڑے اچھے انداز میں تحریر کیا جو مختلف ممالک کی طرف روانہ ہوئے تھے اس کے ساتھ ساتھ بشارتوں پر بھی تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔

گویا آپ نے سیرت المصطفیٰ بہت ہی اچھے اور خوبصورت انداز میں تحریر فرمائی ہے ہر طبقہ اس کتاب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دوسری کتابوں کی نسبت اس کو ترجیح دیتے ہیں سب سے آخر میں لکھے جانے کی وجہ سے اس میں عصر حاضر کے موجودہ مشکلات کا بھی تو کدہ کیا ہے۔ آپ کی اس کتاب کے بارے میں علماء کی بہت ہی اچھی آراء ہیں جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ سیر المصطفیٰ کو میں نے خود محمد ادریس کاندھلوی کی زبان سے سنا۔ جس کے سننے کے وقت بالکل یہ منظر سامنے تھا۔

یستزیدک وجهه حسنا　　　اذا ما زادته نظرا

مولانا صاحب نے سیر کی جتنی ضروری حقوق ولوازم ہیں ماشاءاللہ ان کو خاص طور پر پورا کیا گیا ہے۔(99)

مولانا محمد شفیع صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''سیرت المصطفیٰ'' سیرت نبوی پر تین جلدوں میں بہترین کتاب ہے۔ مولانا بنوری فرماتے ہیں کہ حضرت نے تصانیف سیرت المصطفیٰ نہایت عمدہ، منقح اور قابل اعتبار سیرت نبوی اردو میں تالیف فرمائی۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں کہ ''سیرۃ المصطفیٰ'' کے نام سے کئی جلدوں میں محققانہ سیرت لکھی جس میں آزاد خیال مصنفین پر علمی انداز سے تنقید کی ہے اور ان کے بہت سے شکوک وشبہات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔(100)

اس موضوع ''مولانا محمد ادریس کاندھلوی بحیثیت سیرت نگار'' پر مین میں ایک مقالہ لکھا ہے۔ سیرت نگاری ہو دو میں ہوتی رہی

ہے۔ آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو جاننا ہر ایک مسلمان کیلئے بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام انسان کو پیغمبر کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور آنحضور اکرم صلی اللہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ پر قرآن مجید نازل ہوا۔ جو کہ وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ جبرائیل علیہ السلام کیا پیغام لائے ہیں۔ مگر ہم آپ کی صداقت کی وجہ سے یقین کر لیتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ جس پر قرآن نازل ہوا اس ہستی کے حالات ہمیں سیرت کی کتب ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں کیونکہ آپ قرآن مجید کا عملی نمونہ ہیں۔ جو احکامات قرآن کے بتائے ہیں ان پر عمل کر کے ہمیں دکھایا گیا ہے۔ تاکہ مسلمانوں پر اسلام کی کوئی بھی خوبی مخفی نہ رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر کام میں قرآن کی جھلک نظر آتی ہے۔

اسی وجہ سے قرآن نے آپ کے بارے میں فرمایا ہے:

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ" (101)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی ہستی بہترین نمونہ ہے۔ لہٰذا ان کی تقلید کرنا ہمارے لئے دینوی اور آخروی زندگی میں فلاح کا سبب ہے۔ سیرت کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں تمام سیرت کی کتابوں میں ایک ہی طرح کی روایتیں ملتی ہیں۔ اتنی کتابیں لکھی جانے کی وجہ سے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کا کوئی گوشہ بےنقاب نہیں رہا جب بہت سے لوگ ایک ہی روایت پر قائم ہوں تو ان کا جھوٹ پر اکٹھا ہونا محال ہو جاتا ہے۔ لہذا آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شب و روز کسی پر مخفی نہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بھی آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات زندگی پر قلم اٹھانے کی جرات کی اور سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے کتاب لکھی۔

میں نے مولانا صاحب کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے مولانا صاحب کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں پایا۔ انہوں نے جو بات کہی اسے پورا کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کی۔ مولانا صاحب نے اپنے شب و روز آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کے مطابق گزارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مولانا صاحب ایک درویش، صوفی اور باعمل بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی اسلام کے اصولوں پر گزار دی۔ مولانا صاحب کے بارے میں تمام علماء اور فضلاء کی بہت اچھی آراء ہیں۔ کسی بھی عالم نے آپ پر اعتراض نہیں کیا۔ مولانا صاحب کو سیرت کے علاوہ تفسیر اور حدیث پر بھی پورا پورا عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا صاحب کو شیخ الحدیث او رمفسر کہا جاتا ہے۔

مولانا صاحب کی تصانیف اپنے اندر اسلوب اور بیان کی بہت سی خوبیاں رکھتی ہیں۔ جو انہوں نے بہت سے فرقوں کا بھی رد کیا۔ اپنے دور میں اٹھنے والے ہر فتنہ کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں خاص طور پر مرزائیت اور عیسائیت کا بھرپور رد پیش کیا۔ ان دونوں فرقوں کے رد میں مولانا صاحب کا واقعی محققانہ اور عالمانہ انداز نظر آتا ہے اس کے علاوہ فتنہ افکار حدیث کے خلاف بھی آپ نے حجیت حدیث کے نام سے کتاب لکھی جس میں بھرپور انداز میں احادیث کا انکار کرنے والوں کا رد پیش کیا ہے۔

مولانا صاحب نے علم الکلام اور عقائد پر بھی بہت اچھی کتابیں لکھیں ہیں گویا آپ کی ہر کتاب میں علمیت دکھائی دیتی ہے اور ان کا انداز محققانہ ہے۔ لیکن ان تمام کتابوں کے علاوہ آپ نے "سیرۃ المصطفیٰ" لکھ کر ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ سیرۃ المصطفیٰ میں آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیرت کے تمام لوازمات کا پورا پورا خیال رکھا۔ مولانا صاحب نے سیرۃ المصطفیٰ میں تین آئمہ سیرت کے بارے میں بہت مفصل گفتگو کی ہے اور موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ اور واقدی کے بارے میں جو لکھا ہے، کہ وہ ضعیف تھے اور جھوٹ نہیں بولتے تھے میرے نزدیک یہ بھی صحیح ہے۔ مولانا صاحب نے سیرۃ المصطفیٰ میں غزوات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر غزوہ بدر کے بارے میں جو علامہ شبلی نعمانی نے جو رائے دی ہے اس کا اچھے انداز میں جواب دیا ہے۔ اور حقیقت

بھی یہی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قافلہ اسی لئے روانہ کیا تھا کہ ابوسفیان سے مال ومتاع حاصل کیا جا سکے مولانا صاحب نے بھی یہی رائے قائم کی ہے۔ کیونکہ آیات قرآنیہ سے بھی یہی ثابت ہے۔

مولانا صاحب نے جہاد کے بارے میں بہت ہی اچھے انداز میں لکھا ہے کہ جہاد صرف اور صرف خدا کی راہ میں کرنا چاہیے اس سے کسی قسم کی ذاتی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ ہونا چاہیے نہ کہ دنیا کے حصول کی غرض سے ہو۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ بھی اسی جہاد کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کی غرض سے کیا جائے لہذا مولانا صاحب نے اسلام اور جبر اور مسئلہ غلامی کے بارے میں بھی اپنے موقف کو صحیح انداز میں بیان کیا ہے کہ اسلام کسی طرح سے تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنے اخلاق کے زور پر پھیلا ہے کیونکہ اس کی تبلیغ کرنے والی ہستی کا اخلاق بہت ہی بلند ہے اور آپ کے اخلاق کے بارے میں قرآن نے بھی کیا ہے۔

"انک لعلی خلق عظیم" (102)

میں نے معجزات نبوی کے بارے میں بھی ناقدانہ جائزہ لیا ہے جو مولانا صاحب نے اپنی کتاب سیرۃ المصطفیٰ میں بیان کئے ہیں۔ مولانا صاحب نے معجزات نبوی کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا صاحب نے معجزات کو دیگر کتب سیرت کی طرح اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے اور تقریباً معجزات کی تعداد بھی دوسری کتب سیرت کی طرح بیان کی ہے۔ معجزات کے بیان کے بارے میں انہوں نے کوئی منفرد انداز نہیں اختیار کیا۔

شیعہ حضرات نے اسلام پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب نے بڑے عالمانہ انداز میں جواب دیا ہے۔ واقعہ قرطاس کے بارے میں شیعہ حضرات نے جو اعتراض کیا ہے حقیقت میں وہ غلط ہے کیونکہ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ شیعہ حضرات نے اس کو خود گھڑ لیا ہے۔ اس کے باوجود بھی مولانا صاحب نے ان کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسی طرح شیعہ حضرات نے مسئلہ خلافت اور متعہ کے بارے میں جو اعتراض لگائے ہیں ان کا بھی بہت ہی اچھے انداز میں جواب دیا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرۃ المصطفیٰ میری نظر میں بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ جو کہ سیرت کی دوسری کتب پر اس وجہ سے بھی فضیلت رکھتی ہے کہ یہ موجودہ دور میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں موجودہ دور کی مشکلات کا بھی ذکر ہے۔ اور ان کا حل بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ "سیرۃ المصطفیٰ" کے بارے میں دیگر علماء کی بھی اچھی آراء ہیں۔ مولانا صاحب نے یہ کتاب سادہ الفاظ میں لکھی ہے۔ اس میں مولانا صاحب نے آیات اور احادیث کا بھی خاص اہتمام کیا ہے۔ اقوال صحابہ کو بھی زیر بحث لائے۔ لہذا موجودہ دور میں لکھی گئی تمام کتب میں سے منفرد مقام حاصل ہے۔

فصل سوم

مولانا حکیم عبدالروف داناپوریؒ بحیثیت سیرت نگار

احوال و آثار:

مولانا حکیم عبدالروف دانا پوریؒ ۱۸۷۴ء میں صوبہ بہار کے شہر دانا پور متصل پٹنہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام عبدالقادر تھا، جو ایک صاحب علم کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم دانا پور اور آگرہ میں ہوئی، اور لکھنؤ اور حیدرآباد میں تکمیل کو پہنچی۔ (103)

شخصی اوصاف:

مولانا میں بہت سے اوصاف ایسے ہیں جو ہمیں ان کی شخصیت میں واضح نظر آتے ہیں اور جن کی عکاسی ان کی کتب سیرۃ میں ہوتی ہے۔

زمانہ کے حالات سے مکمل آگاہی:

مولانا حکیم عبدالرؤف دانا پوری مختلف علوم پر مہارت کے ساتھ ساتھ زمانہ کے نشیب و فراز سے بھی پوری طرح آشنا نظر آتے ہیں۔ علوم دینیہ کے علاوہ آپ زمانہ کے حالات و خیالات سے پوری طرح باخبر تھے، جس کا ثبوت ان کے وہ مختلف خطبات ہیں جو آپ نے مختلف موقعوں سے کبھی جمیعۃ العلماء کے صدارتی خطبہ کی صورت میں کبھی مذہبی اور تبلیغی جلسہ کی نسبت سے دیا، جو آپ کی سیاسی بصیرت اور فہم و تدبر کا آئینہ دار ہے۔

اعلیٰ سیاسی بصیرت فہم و تدبر کے حامل:

آپ کی شخصیت کا ایک منفرد پہلو ان کی اعلیٰ سیاسی بصیرت فہم و تدبر ہے، جس کا اعتراف ان کے ہم عصروں اور بعد کے جید علماء نے کیا ہے۔ مولانا آزادؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے آپ کے علمی تجربے کا اعتراف کیا ہے۔

ممتاز طبیب:

آپ اپنے وقت کے مشہور اطباء میں سے تھے، بہار میں جب طبی کالج کا قیام عمل میں آیا تو پرنسپل کے عہدہ کے لیے پیش کش ہوئی جس کو آپ نے ٹھکرا دیا۔ طب میں آپ کو خصوصی مہارت حاصل تھی، کلکتہ میں جب انجمن اطباء قائم ہوئی تو آپ ہی اس کے صدر منتخب کیے گئے، اور برسوں اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ مسلمانوں کے نہ صرف جسمانی طبیب تھے بلکہ آپ مسلمانوں کے روحانی امراض اور ان کے علاج کے بھی ماہر تھے۔

خوش بیان خطیب و مقرر:

آپ ایک خوش بیان خطیب و مقرر تھے۔ آپ کے بیانات میں امت مسلمہ کے زوال اور انگریز سامراجیت کے مظالم کا تذکرہ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ آپ انگریزی سامراجیت کے سخت مخالف تھے ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد، سبھاش چندر بوس اور مولانا دانا پوریؒ دوسرے لیڈروں کے ساتھ گرفتار کیے گئے۔

سادہ مزاج اور خلیق:

ابوالبرکات دانا پوریؒ ایک سادہ مزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ مولانا اونچا سنتے تھے، اس لیے ہمیشہ ایک آلہ ساتھ رکھتے تھے، جس کو لگا کر دوسروں کی بات سنتے تھے، تاہم ان سے ملنے جلنے والوں کا بڑا حلقہ تھا، اور کلکتہ ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اہل علم اور اہل سیاست دونوں میں ان کا خیر مقدم تھا، وہ متواضع، سادہ مزاج اور خلیق تھے، چھوٹے بڑے سب سے یکساں ملتے تھے۔

حنفی عالم اور مورخ:

آپ اپنے وقت کے بہت بڑے حنفی عالم اور مورخ تھے۔ آپ ایک جید عالم تھے، احادیث، سیرت و تاریخ پر آپ کی نظر وسیع تھی۔ آپ کا شمار ان علماء میں ہوتا ہے جو قدیم علوم و اعتقادات فقہ کو جدید خیالات و افکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ایک مدت تک سیاست میں جمعیۃ العلماء کے ساتھ رہے اور بعض جلسوں کی آپ نے صدارت بھی کی، لیکن پھر اس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں منسلک ہو کر جمعیت علمائے اسلام میں داخل ہو گئے، یوں بنگال کی اسلامی سیاست پر آپ کا بہت اثر رہا۔

فکری ارتقاء:

مولانا ایک وسیع النظر عالم دین تھے، علمی مباحث میں شرکت کرتے اور علماء کی آراء کا مطالعہ کرتے تھے۔ یہ ایک بیدار ذہن اور کامیاب محقق کی شخصیت کا لازمی حصہ ہوا کرتا ہے۔ آپ مذہب میں جمود اور تقلید کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے جیسا کہ درج ذیل واقعہ سے ظاہر کرتے ہیں۔

"۱۹۱۶ء میں ہندوستان میں ایک مسئلہ زیر بحث تھا، اور وہ یہ کہ پنجاب کی ایک مسلمان عورت نے جو اپنے شوہر کے مظالم اور عدم نفقہ سے تنگ آچکی تھی، اس سے چھٹکارے کے لیے علماء سے استفادہ کیا تھا، مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی نے حنفیہ کے مسلک کے مطابق اس کو جواب دیا، کہ اسلام میں اس کے لیے کوئی مخلص نہیں، اس پر آریہ اخباروں نے اسلام کو اس کی تنگ دامانی کا طعنہ دیا، اس کو پڑھ کر مولانا ابوالکلام نے بعض فقہائے تابعین اور ائمہ فقہ کے مسلک کے مطابق مولانا ٹونکی کے فتوں کی تردید کی، اور لکھا کہ تین ماہ کے انتظار کے بعد بھی اگر شوہر اپنی بیوی کے نان نفقہ کا انتظام نہ کرے اور بیوی مطالبہ کرے تو قاضی زوجین میں تفریق کر سکتا ہے مولانا داناپوریؒ نے مولانا ابوالکلام کے فتویٰ کی تغلیط کی اور کلکتہ کے اخبارات میں ایک مفصل مضمون اس کے جواب میں لکھا، یہ معارف کی اشاعت کا پہلا سال تھا، خاکسار نے ان تینوں صاحبوں کے فتوں پر ایک محاکمہ لکھا، جو معارف کی پہلی جلد میں زوجہ غیر متفق علیہا کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اور جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ نہ تو مطلقاً مولانا ابوالکلام کا فتویٰ صحیح ہے اور نہ مولانا عبدالرؤف صاحب کا، اور نہ تو مولانا ابوالکلام کی وسعت صحیح ہے اور نہ مولانا داناپوری کی تنگی، بلکہ یہ سب فتوے الگ الگ مختص حالات سے مخصوص ہیں، کسی کہنے والے نے مجھ سے نقل کیا، کہ مولانا داناپوریؒ نے میرے اس مضمون کو پڑھ کر فرمایا کہ ہاں! یہ مضمون ایک پڑھے لکھے شخص کا ہے" (104)

یہ پورا واقعہ مولانا داناپوریؒ کی وسعتِ نظر اور غیر متعصب شخصیت کی عکاسی کرتا ہے اصح السیر میں آپ نے جو فقہی مسائل بیان کیے ہیں ان پر حنفی فقہ کا رنگ غالب ہے چنانچہ معروف میں حنفی مقلد ہونے کے باوجود خاص حالات میں وہ فقہ حنفی کے برعکس فتویٰ کو پسند کرتے تھے اور اپنی آراء سے رجوع کر لیتے تھے جیسا کہ اہل علم کا شیوہ رہا کہ وہ کسی فقہ کے پابند نہ رہے بلکہ دلیل و حکمت کو ترجیح دیتے رہے۔

داناپوری کے علمی کاموں کا مختصر جائزہ

مشہور تصانیف:

"اسلام اور موجودہ مدنی مسائل" "اصح السیر" اور آپ کے مشہور خطبات ہیں۔

ذیل میں داناپوری کے خطبات میں سے ایک خطبہ دیا جا رہا ہے جو ہمیں بذریعہ انٹرنیٹ ملا۔

غزوات نبوی ﷺ:

محسن انسانیت ﷺ کی پاکیزہ سیرت کے پیرایہ میں اسلامی تعلیمات ایک جامع و مکمل دستور حیات ہیں۔ پیغمبر اسلام کی روشن سیرت سے انسانی معاشرہ میں ایک حیرت انگیز انقلاب اور انسانیت کی خشک کھیتیوں میں سرسبزی و شادابی آئی، لیکن آپ کے بے مثال اخلاق

وکردار اور انسانیت نوازی انتہائی روشن ونمایاں ہے۔

یوں تو آپ پوری دنیا کے لئے سراپا رحمت بن کر آئے تھے لیکن جنگ جیسے نازک موڑ پر بھی بجائے اس کے کہ رحم وکرم۔ عدل وامن اور عفو ودرگذر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا، ایسے مواقع پر آپ کی یہ صفات اور زیادہ روشن ہو کر سامنے آتی ہیں۔ چناں چہ آپ کا جنگی رویہ اور قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا تھا اور آپ کے ذریعہ طے شدہ جنگی اصولوں میں انسانی جان کی کس قدر اہمیت لوگوں کے دلوں پر بٹھائی گئی، اور آج امن ومساوات کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی مہذب ومتمدن قوم کا نظریہ جنگ کیا ہے؟ ان کے پاس چند دفعات قابل ستائش ہیں بھی تو کس کی دین ہیں اور اس کے پس پردہ قوت تنفیذ کس قدر کارفرما ہے ذیل کی سطور میں انھیں حقائق سے پردہ اٹھایا جائے گا۔

غزوات نبوی اور اسیرانِ جنگ:

یوں تو آپ کی ذات انسانیت کے لیے سراپا رحمت اور مردوں کے مسیحا تھی لیکن آپ کی انسانیت نوازی جنگ جیسے نازک موڑ پر بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے بلکہ ایک قدم آگے ہی۔ غزوات نبوی کی تو ایک طویل فہرست ہے لیکن جنگی قیدیوں کے حوالہ سے یہاں صرف دو غزوے ہی کا تذکرہ کیا جائے گا جو اس سلسلے میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ غزوہ بدر اور فتح مکہ۔ اس لیے کہ یہ قیدی ہی نہیں بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حضور اور ان کے ساتھیوں کو پل بنا کر تیرہ چودہ سال کی طویل مدت تک ظلم وتعدی کے تمام سرحدوں کو پار کر کے وطن سے بے وطن کر دیا، جب یہ پردیسی اجنبی شہر میں اطمینان کی سانس لینے لگے تو اس کو بھی قریش قوم ہضم نہ کرسکی اور مدینہ پر بھی کاٹ کھانے کے لیے مار کھانے کے لیے چڑھ آئی لیکن رب برحق نے انھیں اوندھے منہ گرا کر انتہائی شرمناک شکست سے دوچار کیا اور ستر قید ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ غزوہ بدر! لیکن قربان جایئے اس محسنِ انسانیت پر جس نے ان کی دوہری دشمنی کے باوجود ان کے ساتھ اچھے سلوک کی تلقین کر کے اپنے مختلف ساتھیوں میں تقسیم کر دیا، تاریخ شاہد ہے کہ نبی کے ان دیوانوں نے مہمانوں کی طرح ان قیدیوں کی دیکھ بھال کی، خود کھجور پر اکتفا کر کے انھیں روٹی کھلائی، ایک قیدی ''ابوعزیز'' کا بیان طبری نقل کرتے ہیں، میں جن انصاریوں کے پاس قید تھا جب وہ لوگ صبح وشام میرے سامنے کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے، خود کھجوریں اٹھا لیتے مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس کر دیتے۔

جب یہ قیدی مسجد میں لا کر باندھے گئے اور بندھے قیدی رات کو بندش کی تکلیف سے کراہ رہے تھے جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند اڑ گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات کروٹیں بدل رہے تھے صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ یہ بے چینی چچا کی وجہ سے ہو رہی ہے عباس کی بندش ڈھیلی کر دی لیکن اس محسنِ اعظم نے تمام قیدیوں کے لیے یہ حکم جاری کیا اس لیے کہ درحقیقت اس کی بے تابی کے پس پردہ خونی رشتہ نہیں بلکہ انسانی ناطہ کارفرما تھا۔ ایک قیدی سہیل بن عمرو نہایت فصیح وبلیغ شخص تھا حضور کے خلاف ہمہ وقت زہر افشانی کرتا رہتا، حضرت عمرؓ نے ان کے دانت اکھڑوا دینے کا مشورہ دیا حضور نے سختی سے منع فرمایا، ان قیدیوں کے گندے کپڑوں کے بدلنے کا حکم دیا۔ جب ان اسیروں کے متعلق مشورہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے تمام کو تہِ تیغ اور عبداللہ بن رواحہؓ نے نذر آتش کر دینے کا مشورہ دیا اور حضرت صدیقؓ نے فدیہ لے کر رہا کر دینے کی رائے دی، محسنِ انسانیت نے آخری مشورہ پر فیصلہ فرمایا لیکن رحم وکرم کی بارش یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سراپا رحمت نے فدیہ میں بھی ان قیدیوں کی حیثیتوں کا مکمل لحاظ رکھا، چنانچہ جو صاحب ثروت تھے ان کا فدیہ مال طے ہوا، جو صاحب علم وفن تھے ان کی رہائی کا معاوضہ لکھانے پڑھانے کا کام سپرد ہوا اور جو اس قابل بھی نہ تھے اور بالکل تہی دست تھے ان کو عفو ودرگزر کا تحفہ دے کر ویسے ہی رہا کر دیا۔

علماء کا خراج عقیدت:

ندوۃ العلماء لکھنو کے استاذِ محترم عبدالعظیم ندوی صاحب سے بذریعہ انٹرنیٹ آپ کی شخصیت سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ جس کی اہمیت کے پیشِ نظر ذیل میں من وعن بیان کیا جاتا ہے۔

" آپ کا تعلق صوبہ بہار کے شہر دانا متصل پٹنہ سے تھا۔ ۱۸۷۴ء دانا پور پٹنہ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد کا نام عبدالقادر تھا، جو ایک صاحبِ علم کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم دانا پور اور آگرہ میں ہوئی اور لکھنو اور حیدرآباد میں تکمیل کو پہنچے۔ آخر میں ایک عرصہ تک کلکتہ میں قیام رہا، اور وہیں وفات پا گئے۔ طرزِ تحریر اور اندازِ گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم دینیہ پر آپ کو مکمل دسترس حاصل تھی، البتہ آپ کے اساتذہ کے تعلق سے کوئی بات نہیں ملتی۔ کلکتہ میں رہ کر اور سیاسی مجلسوں میں شرکت کے سبب وہ زمانے کی ضروریات اور عصری خیالات وافکار سے پوری طرح آگاہ تھے۔ آپ ایک جید عالم تھے، احادیث، سیرت وتاریخ پر آپ کی نظر وسیع تھی۔

آپ کا شمار ان علماء میں ہوتا ہے جو قدیم علوم واعتقادات فقہ کو جدید خیالات وافکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ایک مدت تک سیاست میں جمعیۃ العلماء کے ساتھ رہے اور بعض جلسوں کی آپ نے صدارت بھی کی، لیکن پھر اس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں منسلک ہو کر جمعیۃ علمائے اسلام میں داخل ہو گئے، یوں بنگال کی اسلامی سیاست پر آپ کا بہت اثر رہا۔ آپ انگریزی سامراجیت کے سخت مخالف تھے، ۱۹۱۶ء سے برابر انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں شریک رہے۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد، سبھاش چندر بوس اور مولانا دانا پوری دوسرے لیڈروں کے ساتھ گرفتار کیے گئے۔ (105)

علوم دینیہ کے علاوہ آپ زمانہ کے حالات وخیالات سے پوری طرح باخبر تھے، جس کا ثبوت ان کے وہ مختلف خطبات ہیں جو آپ نے مختلف موقعوں سے کبھی جمعیۃ العلماء کے صدارتی خطبہ کی صورت میں کبھی مذہبی وتبلیغی جلسہ کی نسبت سے دیا، جو آپ کی سیاسی بصیرت اور فہم وتدبر کا آئینہ دار ہیں۔ مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاری، اور مولانا مفتی عتیق الرحمن نے آپ کے تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔ آپ ایک ممتاز طبیب تھے طب میں آپ کو خصوصی مہارت حاصل تھی کلکتہ میں جب انجمن اطباء قائم ہوئی تو آپ ہی اس کے صدر منتخب کیے گئے، اور برسوں اس عہدہ پر فائز رہے۔ بہار میں جب طبی کالج کا قیام عمل آیا تو پرنسپل کے عہدہ کے لیے پیشکش ہوئی تھی، جس کو آپ نے قبول نہیں کیا۔

ایک مشہور عالم، خوش بیان خطیب اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک مصنف بھی تھے۔ آپ کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب "اصح السیر" ہے، یہ دو جلدوں میں ہے، آپ کی وفات سے یہ عظیم الشان کتاب ناتمام رہ گئی۔ اس میں آپ نے بزعم خود صحیح ترین روایتوں کا التزام کیا ہے۔ علمی ہی نہیں سیاسی حلقہ میں بھی آپ کا خاصا اثر ورسوخ تھا، اور دونوں یکساں طور پر آپ کا ہر موقع پر خیر مقدم کرتے تھے۔ سادہ مزاج، متواضع اور خلیق انسان تھے، چھوٹے بڑے سب سے یکساں ملتے تھے۔ مختصر علالت کے بعد ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آپ نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ (106)

شاہ معین الدین احمد ندوی نے آپ کو ایک ممتاز طبیب مشہور عالم خوش بیان خطیب اور مفکر قرار دیا۔ بحیثیت مجموعی اصح السیر وضع قدیم کی کتب سیرت میں اعلیٰ مقام کی حامل کتاب ہے۔ اسکے مندرجات اصح ترین روایت سے ماخوذ ہیں بقول حسن مثنیٰ ندوی حکیم عبدالروف دانا پوری بڑے حنفی عالم اور مورخ ہیں وہ جابجا معتدل انداز کی تحقیق وتشریح سے کام لیتے ہیں۔ اور اپنے استدلال کو روایات سے تقویت پہنچاتے ہیں۔ (107)

وفات:

۱۹فروری۱۹۴۸ء کی صبح کو جمعرات کے دن ۸ بجے کے قریب انکی علالت کی ابتداء ہوئی، ساڑھے سات بجے شام سے حالت بگڑی، یہاں تک کہ رات کو ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم کی وفات سے کلکتہ کی سرزمین علم وعرفاں کے نور سے محروم ہوگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن کرے۔(108)

مولانا داناپوریؒ کی خدمات سیرت نگاری

وجہ تصنیف:

اصح السیر اردوادب سیرت نگاری کی ایک ایسی شاندار کتاب ہے کہ اس میں صحیح ترین روایات سیرت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ واقعات سیرت سے فقہی مسائل اخذ کیے گئے ہیں۔ ضعیف اور موضوع روایات پر تنقید کی گئی جزئیات نگاری کا اہتمام کیا گیا، مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات دیے گئے۔ اس طرح کی اور بہت سی خصوصیات ہیں جن کو واضح کرنا ایک اہم تحقیقی عمل ہے۔ کتاب کی صحت، اسلوب مقاصد تحریر، کتاب کا سیرتی ادب میں مقام کتاب کے ماخذ ومصادر یہ وہ تمام علمی وتحقیقی سنگ ہائے میل ہیں کہ جن کا تتبوع کرتے ہوئے اس کتاب کے خصائص واوصاف کا تحقیقی وتنقیدی، تحلیلی اور تاریخی جائزہ ایک بنیادی تحقیقی عمل ہے۔ یہ موضوع مذہبی، تاریخی نوعیت کا ہے اس لیے اس میں منہج تحقیق بھی تاریخی اور بیانیہ ہے۔ اور بوقت ضرورت ادبی منہج تحقیق بھی اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ خالص اردو ادب کے لحاظ سے بھی اس کتاب کا بھی اہم مقام ہے کیونکہ مولانا داناپوریؒ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ عربی اردو اور فارسی کے ادیب بھی تھے۔

زمانہ تصنیف:

ابوالبرکات حکیم عبدالرؤف داناپوری کا زمانہ ۱۸۷۴ء تا ۱۹۴۸ء ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں سیرۃ پر کئی کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی جاچکی تھیں۔ مولانا داناپوری کی کتاب ''اصح السیر'' ۱۹۳۲ء میں تحریر کی گئی۔ خطبات احمدیہ رحمت للعالمین، سیرۃ النبی ﷺ اور خطبات مدراس کے بعد ''اصح السیر'' ۶۵۶/۶۱۴ صفحات کی شکل میں ہمارا سابقہ پہلی بار ایک وسیع ٹھوس اور عالمانہ کتاب سے پڑتا ہے۔ اس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد مستند احادیث پر رکھی گئی ہے اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مغازی کی ترتیب صحیح ترین ہے۔(109)

اصح السیر فی ہدی خیر البشر ﷺ کا تعارف:

ازمولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف قادری داناپوری (1874ء۔1948ء)

اردو زبان میں سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر لکھی جانے والی اس عہد کی کتابوں میں مولانا عبدالرؤف قادری داناپوری م(1948ء) کتاب اصح السیر کا نام بہت نمایاں ہے۔ 1932ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اولین اور مرکزی ماخذ حدیث کو قرار دیا ہے اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ترتیب عام کتب سیرت سے بالکل مختلف ہے۔ 656 صفحات کی اس ضخیم کتاب کے آغاز میں چار صفحات پر مشتمل کتاب کے مختصر تعارف کے بعد چوالیس صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ ہے۔ مقدمہ محققانہ اور عالمانہ شان کا حامل ہے۔ مقدمہ کی ابتداء بعثت انبیاء کے مقاصد سے کی ہے قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کے اجمالی تعارف کے بعد، سیرت، اصحاب اور ضرورت سیرت پر بحث ہے۔ سیرت کا تحریری مواد کیسے جمع ہوا۔ اس کی ترتیب تدوین کس طرح ہوئی اس پر مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے یہ بحث سیرت پڑھنے والے سے زیادہ سیرت لکھنے والے کے لئے مفید ہے۔ انہوں نے شبلی سے اختلاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ محض عقل کو درایت نہیں کہتے۔ مقدمہ حسب ذیل اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔(110)

1۔ قرآن حکیم وسنن رسول ﷺ

2۔ سیرت اور سیرت کا تحریری مواد

3۔ سیرت کی تدوین اور اصح السیر کی ترتیب وتدوین

4۔ درایت اور عقل اور عقل کی گمراہی

5۔ نصاریٰ کا اعتراض

6۔ عقل سلیم

7۔ قدیم عرب، سلاطین سبا، حمیر و تبع

8۔ تبصرہ وخلاصہ

مغرب کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر جن سیرت نگاروں بطور خاص سرسید احمد خان اور علامہ شبلی نے غزوات اور بعض دوسرے واقعات سیرت میں جو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کا نہ صرف علمی انداز میں رد کیا بلکہ علمائے اہل سنت کا جو مسلمہ متوقف چلا آرہا ہے اس کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ مولانا نے ابتدائی کلمات میں اس بات کی وضاحت کی کہ:

''مولانا شبلی نے مغازی پر جو کچھ لکھا خصوصاً غزوہ بدر کے حالات میں تو انہوں نے عجیب وغریب جدت کی تمام واقعات کو پلٹ کر رکھ دیا اور روایات صحیحہ کو ترک کر دیا۔ قرآن مجید سے غزوہ کے حالات کو مرتب کرنے کا دعویٰ اور قرآن پاک سے مطالب ایسے لئے ہیں اور اس سے وہ باتیں پیدا کی ہیں جواب تک کسی نے نہ کی تھی۔ مولانا کی نیت خراب نہ تھی واقعات میں الٹ پھیر اور مطالب میں ردوبدل انہوں نے اس لیے کیا کہ عیسائیوں کا جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ غزوہ بدر اس لئے نہیں ہوا تھا کہ رسول اللہ ﷺ قریش کے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔ بلکہ اس لئے ہوا کہ خود قریش مدینہ پر حملہ کرنے آئے تھے''۔

مولانا دانا پوری نے سرسید احمد خان اور علامہ شبلی کے اس تسامح یا معذرت خواہی کی تلافی کو ششیں بایں طور کی کہ عام کتب سیرت کی ترتیب یا یوں کہیے کہ زمانی ترتیب سے ہٹ کر بالکل مختلف ترتیب کو اپنایا، ولادت باسعادت کے ذکر کے بعد ہجرت کا بیان شروع کیا اور اس کے بعد غزوہ کی ابتداء کی، اور کتاب کے ابتدائی اور تعارفی کلمات میں اس کی طرف اشارہ کیا کہ میرا خیال ہے کہ اہل علم اس کتاب میں المغازی کو جامع مکمل اور بہترین ترتیب پائیں گے۔ چنانچہ اصح السیر کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ مولف نے سب سے زیادہ تفصیل اور جامعیت کے ساتھ غزوات کو بیان کیا ہے۔ غزوات کا بیان 268 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ غزوہ بدر سے پہلے جو چھوٹے چھوٹے جنگی معرکے پیش آئے اور جن کی نوعیت جنگی نظر سے بہت اہم تھی ان کا بھی ذکر کیا ہے اور اس پورے تاریخی پس منظر کی نقاب کشائی کی ہے جس کے نتیجے میں غزوہ بدر کبریٰ پیش آیا۔ غزوات میں بطور خاص غزوہ بدر کو بہت تفصیل سے بیان کیا اور تاریخی واقعات وروایات سے یہ ثابت کیا کہ علامہ شبلی کے بقول یہ دفاعی جنگ نہ تھی بلکہ اس کی نوعیت قدامی جنگ کی تھی۔ غزوات کے علاوہ سرایا پر بھی کھل کر بحث کی ہے۔ صلح حدیبیہ کے نہ صرف واقعہ کو نقل کیا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اسے فتح مبین کیوں کہا گیا ہے۔ کفر واسلام کے معرکوں میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ ہجرت مدینہ، اس کے اسباب اور نتائج کو بیان کیا کہ وہ کس طرح مسلمانوں کی مادی قوت وشوکت کا ذریعہ بنی۔ (111)

مولانا دانا پوری کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کریں پہلے حصے میں ان حالات کا ذکر کیا جائے جن کا تعلق اسلام کی تبلیغ واشاعت اور قوت وشوکت سے ہے۔ دوسرے حصے میں حضور ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی ہے۔ یعنی معجزات، دلائل نبوت، معراج شمائل اور فضائل ومناقب، مصنف کے نزدیک پہلا حصہ حضور ﷺ کی مجاہدانہ زندگی پر مشتمل ہے۔ اور یہ وہ حصہ ہے جو اصح السیر کی صورت میں موجود ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ وہ ہے جو لکھا نہ جاسکا۔ اصح السیر میں بعض ایسے مباحث بھی ہیں جو عام طور پر سیرت کی کتابوں میں نہیں ہوتے۔ مثلاً

زکوۃ،عشراور جزیے کے احکام۔ کتاب الاموال کے نام سے ایک مستقل باب رکھا جس میں غنائم زکوۃ وعشر نے جزیہ ہدایااوراموال مھورہ کے مسائل بیان کیے۔ یہ باب علماء،اساتذہ اورطلباء کے لئے انتہائی مفید ہے۔

غزوات کے بعد وفود کا بیان بھی پوری وضاحت اورتفصیل سے ہے۔بعض نزاعی مسائل پر محققانہ گفتگو کی ہےاوران کوان کے پورے پس منظراورسیاق وسباق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جیسے خطبہ تحریم اسے عام طور پراس کے پس منظراوراصلی اسباب سے الگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔مولانا نے سیاق وسباق سے جوڑکرحضورﷺ کے خطبے کا حوالہ دیا ہے۔

جن ضروری فقہی مسائل کا سیرت کے کسی خاص پہلو یا واقعہ سےتعلق تھاان اس مقام پر بحث کی ہے۔مثلاً فتح مکہ کے ذکر میں اراضی حرم کاحکم،عمرۃ القضاۃ میں نکاح محرم کا مسلہ،غزوہ خیبر کے موقع پر متعہ کی بحث،ازواج مطہرات کے حالات میں شرعی پردے کاحکم، حجتہ الوداع کے آخر میں خلافت وامامت کی بحث، تعارفی کلمات میں وہ لکھتے ہیں:بعض معرکتہ الاراء مسائل پرایسی جامع مکمل اورمبسوط بحث لکھ دی ہے کہ اہل انصاف کوان شاءاللہ اس مسئلے مین کسی اشتباہ کی ضرورت باقی نہ رہےگی۔

قرآن حکیم نےان صحابہ کی تعریف کی ہے جو پہلے پہل ایمان لائے،مکی زندگی میں نبی کریمﷺ کے ساتھ رہےاور ہر مصیبت میں ان کےمعین ومددگارہوئے۔انہیں قرآن نےالسابقون الاولون سےتعبیر کیا۔ عام طور پر سیرت کی کتابوں مین ان کاذکرنہیں ہوتا اوراگر ہوتا بھی ہےتواجمالی واختصار کےساتھ اور برسبیل تذکرہ ہوتا ہے۔مولانا داناپوری نےالسابقون الاول کےتحت باون ناموں کاذکرکیا ہے۔

اصح السیر کی تصنیفی محرکات،مواداورطرزاسلوب کی روشنی میں اسے روایتی رجحان کی تصانیف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جوفی الحقیقت عقلیت پسندی جدیت اورمعذرت خواہانہ سیرتی ادب کے جواب میں لکھی گئی کتاب میں جس پختہ روایت پسندی کااظہار کیا گیا ہے۔ اس کی بناءپراسے روایتی پسند سیرت کی نمائندہ کتاب کہاجاسکتا ہے۔

اصح السیر کی خصوصیات:

مولانا ابوالبرکات حکیم عبدالرؤف داناپوریؒ ایک جید عالم تھے،احادیث،سیرت وتاریخ پرآپ کی نظر وسیع تھی۔آپ کا شماران علماء میں ہوتا ہےجوقدیم علوم واعتقادات فقہ کوجدید خیالات وافکارسےتطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

ایک مدت تک سیاست میں جمعیتہ علماء کے ساتھ رہےاوربعض جلسوں کی آپ نےصدارت بھی کی،لیکن پھراس سے الگ ہوکر مسلم لیگ میں منسلک ہوکر جمعیت علمائے اسلام میں داخل ہوگئے۔مولانا آزاد،مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی،مولانا عبدالماجد دریابادی،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری اورمولانا مفتی عتیق الرحمٰن نےآپ کےتبحرعلمی کااعتراف کیا ہے۔

داناپوریؒ کی کتاب "اصح السیر فی ہدیٰ خیر البشرﷺ" ۱۹۴۲ء میں تحریر کی گئی۔ "خطبات احمدیہ"، "رحمت للعالمین"، "سیرۃ النبیﷺ"،اورخطبات مدراس کےبعد "اصح السیر" (۲۵۶ ص) کی شکل میں ہمارا سابقہ پہلی بارایک وسیع ،ٹھوس اور عالمانہ کتاب سے پڑتا ہے۔جس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیادمستنداحادیث پررکھی گئی ہےاوردوسری خصوصیت یہ کہ اس میں مغازی کی ترتیب صحیح ترین ہے۔اردو میں سیرت کی کتابیں اوربھی ہیں لیکن مصنف کا یہ دعویٰ بڑی حدتک صحیح ہے کہ "اہل علم اس کتاب میں کتاب المغازی کوجامع ،مکمل اوربہترین ترتیب پر پائیں گے"۔شبلی کی "سیرۃ النبیؐ" سے قطع نظر کسی اوراردوکتاب میں غزوات کی اتنی تفصیلات نہیں ملتیں جتنی "اصح السیر" میں پائی جاتی ہیں۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں احادیث اورفقہ کی مدد سے کتاب الاموال کومرتب کیا گیا ہے۔کہیں کہیں سیرت کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہےاورجن جن مقامات سے ارکان اسلام کاتعلق ہےوہ بھی بیان کیے گئے ہیں۔مثلاً حجتہ الوداع کی جزئیات کی پوری تفصیل یہاں درج ہے۔اس کتاب کی ایک اورخوبی یہ ہے کہ جن فقہی مسائل کا سیرت کے کسی خاص پہلو سےتعلق تھاانھیں

اپنے متعلقہ مقام پر ہی حل کیا گیا ہے اور بعض اہم فقہی مسئلوں پر جامع، مکمل اور مبسوط بحثیں کی گئی ہیں، مثلاً اراضی حرم کا حکم، نکاح محرم کی بحث، متعہ، قنوتِ نازلہ اور قنوتِ فجر کی بحثیں، خلافت اور امامت کا مسئلہ اور پردہ شرعی کی بحث ہے۔

داناپوری نے واضح کیا ہے کہ اس نے ابن سعد کی جن روایتوں کا اپنی کتاب میں حوالہ دیا ہے انہیں محض طبقات ابن سعد (مطبوعہ یورپ) کے بھروسہ پر نقل نہیں کیا بلکہ اس کی صرف وہی روایتیں لی ہیں جن کو اصحاب نقل میں سے کسی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ مثلاً زادالمعاد (ابن قیم)، شرح مسلم (نووی)، فتح الباری شرح بخاری (ابن حجر)، عمدۃ القاری شرح بخاری (عینی) اصابہ، اسدالغابہ، شرح مواہب (زرقانی) ارشاد الساری شرح بخاری (قسطلانی)، شرح سفرالسعادۃ (عبدالحق محدث دہلوی) اور مدراج النبوۃ (عبدالحق محدث دہلوی)۔ اس کتاب کے ماخذات میں سیرت ابن ہشام، زادالمعاد، صحاح ستہ، تفسیر کبیر امام رازی، تفسیر معالم التنزیل لغوی، تفسیر بیضاوی اور الاتقان (سیوطی) کے نام معروف ہیں۔ (112)

الفاظ کی تعریف وتصحیح میں زیادہ تر امداد نہایہ ابن اثیر اور قاموس فیروزآبادی سے لی گئی ہے۔ اور بعض جگہوں پر زرقانی کی شرح مواہب، قاضی شوکانی کی نیل الاوطار، اصابہ، فتح الباری اور مغنی سے بھی امداد لی گئی ہے۔ مصنف نے "السیر" کی ترتیب بھی نئے انداز سے کی ہے۔ حکیم صاحب نے آنحضرت ﷺ کے حالات کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا ہے، پہلے حصے میں (جو موجودہ کتاب پر مشتمل ہے) ولادت سے وفات تک حضورؐ کے حالات ہیں۔

مصنف کے نزدیک یہ حضور ﷺ کی مجاہدانہ زندگی ہے۔ دوسرے حصے میں (جو لکھا نہ جا سکا) مصنف کا ارادہ تھا کہ حضورؐ کی پیغمبرانہ زندگی ہو۔

موجودہ کتاب کی ابتداء میں فنِ سیرت پر ۴۴ صفحات کا مقدمہ ہے۔ جو شبلی نعمانیؒ کے "سیرت النبیؐ" (جلد اوّل) والے مقدمہ کے بعد حصے کی چیز ہے اس میں مصنف نے سیرت کے اولین منابع قرآن وسنت سے ابتداء کی ہے اور پھر تدوین حدیث کی تاریخی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے فن سیرت اور فن حدیث کے تعلق پر بحث کی ہے۔ بعد ازاں درایت اور عقل کی بحث چھیڑی گئی ہے۔ قدیم عرب کی تاریخ اور جغرافیہ کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کا حسب ونسب، پیدائش، یتیمی، رضاعت، شام کے سفر، حضرت خدیجہؓ سے عقد، بعثت، نزولِ وحی، سابقین اولین، مسلمانوں کو تعذیب، دعوتِ دین، کفار کے مظالم، ہجرتِ حبشہ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام، قریش کا مقاطعہ، عام الحزن، سفر طائف، معراج، ہجرت، تحویل قبلہ، مواخات، جہاد وقتال، مغازی وسرایا، فتح مکہ، جنگ حنین، جنگ موتہ اور غزوہ تبوک وغیرہ واقعات سلسلہ وار بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد کتاب الاموال کے عنوان سے مالی انتظامات کا بیان ہے جن میں پہلے زکوٰۃ، غنائم اور فئے اور پھر جزیہ، ہدایا وتحائف، اموال مہجورہ اور عشر وخراج کے مباحث ہیں پھر سریہ، اسامہ بن زیدؓ، آنحضور ﷺ کی وفات اور تجہیز وتکفین کے حالات ہیں۔ پھر آنحضرتؐ کے متروکات (رقم، زمین، مکانات)، لباس، سواری کے جانوروں، مویشیوں، اسلحہ، موالی خدام، مؤذنین، ازواجِ مطہرات اور کنیزوں کی تفصیلات ہیں۔ (113)

"اصح السیر" کے موضوعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے علمِ سیرت اور علم فقہ کے ڈانڈے آپس میں ملا دیے ہیں۔ یوں حکیم عبدالرؤف صاحب کی یہ کتاب حضور ﷺ کی زندگی کے دلچسپ واقعات کا مرقع ہی نہیں بلکہ دینی معلومات کی وجہ سے کتاب ہدایت بھی بن گئی ہے۔ مصنف نے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل یا دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ یا غیر مسلموں کے اعتراضات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ان کے پیش نظر "حضور ﷺ کیا تھے اور آپؐ نے کیا کیا"۔

مغازی پر اردو میں جامع کتاب:

اصح السیر مغازی پر اردو میں ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے، مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات داناپوری نے محسوس کیا کہ مغازی کے باب میں مستشرقین نے بہت سے اعتراضات کیے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مغازی پر خاص توجہ دی اور اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی

کتابیں ہیں ان کے مقابلے میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے جتنی مولانا داناپوری نے کی ہے۔ پھر مغازی سے جو سبق نکلتے ہیں یعنی فقہیاتِ سیرت پر بھی بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ کتاب میں فقہیات پر بہت مستند مواد دیا ہے اور حدیث کی مستند ترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے، یعنی نبوت، معجزات، معراج پر مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔ لیکن کتاب کی دوسری جلد لکھنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ ہم تک ایک ہی جلد پہنچی ہے اور وہ بہت مستند اور انتہائی معتبر کتاب ہے۔

فقہیات سیرت:

اصح السیر کے موضوعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ داناپوریؒ نے علم سیرت اور علم فقہ کے ڈانڈے آپس میں ملا دیے ہیں۔ یوں حکیم عبدالرؤف صاحب داناپوری کی یہ کتاب حضورﷺ کی زندگی کے دلچسپ واقعات کا مرقع ہی نہیں بلکہ دینی معلومات کی وجہ سے کتاب ہدایت بھی بن گئی ہے۔ داناپوری نے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل یا دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ یا غیر مسلموں کے اعتراضات کو در خور اعتنا نہیں سمجھا ان کے پیش نظر حضورﷺ کیا تھے اور آپؐ نے کیا کیا۔ محاضراتِ سیرت میں ڈاکٹر محمود احمد غازی واقعاتِ سیرت سے فقہی مسائل اخذ کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فقہ اور سیرت میں انتہائی گہرا اور قریبی ربط پایا جاتا ہے۔ سیرت سے واقفیت شریعت کے بہت سے احکامات کو جاننے کے لیے ضروری ہے۔ شریعت کے بہت سے احکام کی تفسیر جانے بغیر سیرت کی نزاکتوں اور حکمتوں کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ ایک اعتبار سے سیرت کی عملی تطبیق کا نام فقہ ہے۔ اور فقہ سیرت ہی کی گہری فہم کا نام ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ فقہ کی اصطلاح بہت عمومی، جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتی تھی۔" (114)

داناپوریؒ حوالہ جات میں بہت زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔ آپؒ مستند ترین ماخذ قرآن اور احادیث سے معاونت لیتے ہیں، جہاں ضرورت پڑے وہاں سیرت کے ان واقعات سے رجوع کرتے ہیں جو قرآن اور احادیث صحیحہ کے خلاف نہ ہوں۔ وہ کسی بھی مسئلے پر مستشرقین کو در اعتنا نہیں سمجھتے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے داناپوریؒ کی کتاب اصح السیر کے بارے میں فرمایا:

"بحیثیت مجموعی اصح السیر وضع قدیم کی کتب سیرت میں اعلیٰ مقام کی حامل کتاب ہے۔ اس کے مندرجات اصح ترین روایت سے ماخوذ ہیں"۔ (115)

بقول حسن مثنیٰ ندوی:

"حکیم عبدالرؤف داناپوریؒ بڑے حنفی عالم اور مؤرخ ہیں وہ جا بجا معتدل انداز کی تحقیق و تشریح سے کام لیتے ہیں۔ اور اپنے استدلال کو روایات سے تقویت پہنچاتے ہیں" (116)

قوت بیان:

داناپوریؒ کا اندازِ بیاں محققانہ اور مدلل انہ ہے، وہ اپنی ہر بات کو تحقیقی انداز میں قاری کو سمجھاتے ہیں۔ آپ کی تحریر میں بلا کی خود اعتمادی ہے، کیونکہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں وہ قرآن اور احادیث صحیحہ کے عین مطابق ہوتا ہے۔ داناپوری سیرت کے عنوان میں اپنی ذاتی رائے نہیں ٹھونستے۔ اگر چہ انھوں نے اصح السیر کے مقدمہ میں ایک عنوان "درایت اور عقل" پر مدلل انداز میں بحث کی ہے۔ اس بحث میں وہ درج ذیل مضامین شامل کرتے ہیں:

"درایت اور عقل کا موازنہ، عقل کو معیار بنانے کا غلط مفہوم، عقل اور اندھی تقلید میں فرق، جنگ اور جہاد فی سبیل للہ میں فرق، جہاد کا حقیقی مقصد، یہود و نصاریٰ کی چشم پوشی، جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ، جہاد بالسیف پر اعتراض کا جائزہ عقل سلیم"۔(117)

ایجاز و اختصار:

ایجاز و اختصار مولانا داناپوریؒ کی تحریروں کی چوتھی بڑی خصوصیت ہے۔ ایجاز و اختصار کو نظم و نثر دونوں کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ ایجاز و اختصار سے مراد یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو مختصر سے مختصر انداز میں اس طرح بیان کیا جائے کہ قاری کا ذہن بھی فوراً اُس کے مفہوم کو پا جائے۔ داناپوریؒ کو یہ فن آتا ہے ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ جہانِ معنی پوشیدہ ہوتے ہیں جو کئی پیراگرافوں میں بھی نہیں سما سکتے۔ بیان کے اختصار کے لئے وہ شاعرانہ وسیلوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ داناپوریؒ اپنی مستند کتاب "اصح السیر" میں فرماتے ہیں کہ:

"خدا کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اور اس کے اس انعام کا کن لفظوں میں ذکر کروں کہ آج جناب سرورِ دو عالم ﷺ کی سیرت کا ایک حصہ پیش کرنے کے لائق ہوا۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور میری محنت کا سب سے بڑا اندوختہ ہے اور خداوند عالم اگر قبول فرمائے تو میری نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اتنی کثیر تصنیفات کے باوجود مغازی کی ترتیب اور اس کی تمثیل جس قدر مشکل ہے۔ اس سے اہلِ نظر واقف ہیں، جو ترتیب مغازی کی میں نے اس کتاب میں رکھی ہے وہ اصح ترین ترتیب ہے اور اہم مواضع اختلاف کے موقع پر میں نے اس کے وجوہ دلائل کی طرف اشارات بھی کر دیے ہیں۔ گو طوالت کے خوف سے اکثر تفصیلی مباحث سے اعتراض کیا ہے"۔(118)

مقصدیت:

داناپوریؒ بھی ایک مقصدی ادیب ہیں۔ علماءِ حق سے تعلق رکھنے والے داناپوری صاحب نے بھی مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ جہاں تک میری تحقیق ہے آپ مسلمانوں کے کسی خاص مذہبی فرقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ایک پکے سچے مسلمان تھے اور مسلمانوں کے تمام مسالک کو صحیح سمجھتے تھے۔ ایک مدت تک سیاست میں جمعیۃ علماء کے ساتھ رہے اور جلسوں کی آپ نے صدارت بھی کی لیکن پھر اس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں منسلک ہو کر جمعیۃ علمائے اسلام میں داخل ہو گئے۔ مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے آپ کی دینی اور ملی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

تہذیبی احساس:

مولانا داناپوریؒ کی تحریر میں مشرقی مسلمان اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کی تہذیب کو برتر ثابت کرنے کے لیے آپؒ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ آپ کا دور مشرقی اور مغربی تہذیب میں شدید تصادم کا دور تھا۔ انگریزی تہذیب کی چمک دمک نے عام مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے عزت مآب لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ یہ داناپوری ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو احساسِ کمتری سے نجات دلائی۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی کو سامنے رکھا۔ مسلمانوں کو اسوۂ رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عملی نمونہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ آپ ہمیشہ اپنے خطبات میں مسلمانوں کو غیرت دلاتے تھے کہ محکوم نہیں اسلام حاکمیت کے لیے آیا ہے، اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلیے جہاد فرض ہے۔

تنقید نگاری:

داناپوریؒ کا اندازِ تحقیق اگرچہ بڑی حد تک مشرقی ہے مگر انھوں نے غیر جانب داری کے ساتھ علمی تحقیقی انداز اختیار کیا ہے۔ آپؒ جو بات کہتے ہیں وہ بڑی مدلل اور واضح ہوتی ہے۔ مولانا داناپوری، شبلی پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اردو میں سیرت پر بہتر کتاب صرف ایک ہی اب تک لکھی گئی ہے۔یعنی مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ،مگر انھوں نے مغازی پر جو کچھ لکھا ہے با دل نا خواستہ۔اس میں جو کچھ خامیاں ہیں اہل علم سے مخفی نہیں ہیں۔خصوصاً غزوہ بدر کے حالات میں تو انھوں نے عجیب وغریب جدت کی ہے۔تمام واقعات کو پلٹ دیا ہے تمام روایات صحیحہ کو ترک کر دیا ہے قرآن پاک سے غزوہ کے حالات کو مرتب کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔اور قرآن پاک کے مطالب ایسے لیے ہیں اور اس سے وہ باتیں پیدا کی ہیں جو اب تک کسی نے نہ کی تھیں۔مولانا کی نیت خراب نہ تھی واقعات میں الٹ پھیر اور مطالب میں رد و بدل انھوں نے اس لیے کیا کہ عیسائیوں کا جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ غزوہ بدر اس لیے نہیں ہوا کہ رسولؐ اللہ قریش کے قافلہ تجارت پر حملہ کی نیت سے نکلے تھے بلکہ اس لیے ہوا کہ خود قریش مدینہ پر حملہ کرنے آئے تھے۔مگر مولانا کی یہ تکلیف بیکار ہے۔صرف بدر کے واقعات کو بدلنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔اسلام نے محارب قوم کی تجارت روکنے کی اجازت دی ہے۔حضور ﷺ کا تعامل کثرت سے اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔اور دنیا کی تمام مہذب قوموں کا اس پر عمل ہے۔معترضین سے کہتے کہ اسلام کی تعلیم محض تخیلات پر قائم نہیں ہے، یہ عملی تعلیم ہے۔اور محارب قوم کے مقابلہ میں بغیر اس عمل کے چارہ نہیں ہے"۔(119)

مورخانہ عظمت:

اگرچہ اردو میں سیرت نگاری کی ابتدا مولانا حالی نے کی لیکن مولانا دانا پوری بھی اس میدان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔آپ نے کئی کتابچے بھی لکھے، جس میں ایک "اسلام اور موجودہ مدنی مسائل" اور دوسری کتاب جس نے بہت شہرت حاصل کی وہ "اصح السیر" ہے۔دانا پوری کی اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی رقم طراز ہیں:

"ایک قابل ذکر کتاب جو اردو میں لکھی گئی، مصنف اس کو دو جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے لیکن ایک ہی جلد لکھ پائے تاہم جو لکھا وہ بہت قابل ذکر اور انتہائی مستند ہے۔اس کتاب کا نام ہے اصح السیر۔مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات دانا پوری ایک بزرگ تھے۔انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ان کا خیال یہ تھا کہ مستشرقین جو اعتراض کرتے ہیں کہ سیرت کے ماخذ غیر مستند یا غیر معتبر ہیں، اس اعتراض سے نپٹنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جو مستند ترین ماخذ ہیں، یعنی قرآن پاک اور حدیث۔ان سے کام لے کر مستشرقین کے الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔لیکن شاید ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ مستشرقین کا کام محض اعتراض کرنا ہے۔اعتراض کے جواب سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔آپ ایک اعتراض کا جواب دیں گے وہ دس مزید اعتراض کر دیں گے۔آپ دس کا جواب دے دیں گے وہ بیس اعتراض اور کر دیں گے"۔(120)

تحقیقی رنگ:

دانا پوری کی تحریروں میں ایک خاص محققانہ شان پائی جاتی ہے۔ان کی تصنیف سے ان کے عمیق مطالعے، تحقیقی اسلوب اور علمی بصیرت کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔انہوں نے اپنی تاریخی، تنقیدی اور ادبی تصنیفات میں اپنی تحقیقی کاوش کا حق پوری طرح ادا کیا ہے۔مولانا ایک وسیع النظر عالم دین تھے، علمی مباحث میں شرکت کرتے اور علماء کی آرا کا مطالعہ کرتے تھے۔جو ایک بیدار ذہن اور کامیاب محقق کی شخصیت کا حصہ ہوا کرتا ہے۔دانا پوری نے اپنی مشہور تصنیف "اصح السیر" میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ حدیث کی مستند ترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔اور سیرت کے واقعات امام ابن شہاب زہریؒ، عروہ بن زبیرؓ، سعید ابن المسیبؒ، علقمہ ابن وقاصؒ، عبید اللہ بن عبداللہ، امام شعبیؒ، حسن بصریؒ، امام مکحول، امام السیر والاخبار محمد بن اسحاق بن یسار، موسیٰ ابن عقبہ، واقدی محمد بن سعد اور سیرت ابن ہشام سے لیے ہیں۔

دانا پوری اصح السیر کے صفحہ نمبر ۱۵ پر لکھتے ہیں:

"طبقات ابن سعد (مطبوعہ یورپ) خود کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی ساری روایتیں قابل قبول ہوں۔ تاہم چونکہ یہ پوری کتاب ہمیں یورپ کے واسطہ سے ملی ہے اس کے بھروسہ پر ابن سعد کا حوالہ بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس کی سند متن اول کتابوں سے نہ مل جائے۔ حدیث، سیرت اور تفسیر کی اور کتابیں بھی عیسائیوں نے چھاپی ہیں۔ ان کتابوں کی بھی کوئی سند نہیں ہے۔ اور نہ ان پر اعتماد ہے ان میں سے صرف وہی باتیں قابل قبول ہوں گی جس کی سند متن اول کتابوں میں مل جائے"۔(121)

محاضرات سیرت میں ڈاکٹر محمود احمد غازی، دانا پوری کے محققانہ انداز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات دانا پوری نے محسوس کیا کہ مغازی کے باب میں مستشرقین نے بہت سے اعتراضات کیے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مغازی پر خاص توجہ دی اور اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی کتابیں ہیں ان کے مقابلے میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے۔ مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے جتنی مولانا دانا پوری نے کی ہے۔ پھر مغازی سے جو سبق نکلتے ہیں یعنی فقہیات سیرت پر بھی بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ کتاب میں فقہیات پر بہت مستند مواد دیا ہے اور حدیث کی مستند ترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے، یعنی نبوت، معجزات، معراج پر مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔ لیکن کتاب کی دوسری جلد لکھنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ ہم تک ایک ہی جلد پہنچی ہے اور وہ بہت مستند اور انتہائی معتبر کتاب ہے"۔(122)

اسلوب نگارش:

محاضرات سیرت میں ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"ایک قابل ذکر کتاب جو اردو میں لکھی گئی، مصنف اس کو دو جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے لیکن ایک ہی جلد لکھ پائے، تاہم جو لکھا وہ بہت قابل ذکر اور انتہائی مستند ہے۔ اس کتاب کا نام ہے اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات دانا پوری ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مستشرقین جو اعتراض کرتے ہیں کہ سیرت کے ماخذ غیر مستند یا غیر معتبر ہیں، اس اعتراض سے نپٹنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جو مستند ترین مآخذ ہیں، یعنی قرآن پاک اور حدیث۔ ان سے کام لے کر مستشرقین کے الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن شاید ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ مستشرقین کا کام محض اعتراض کرنا ہے۔ اعتراض کے جواب سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ ایک اعتراض کا جواب دیں گے وہ دس مزید اعتراض کردیں گے۔ آپ دس کا جواب دے دیں گے وہ بیس اعتراض اور کردیں گے۔(123)

مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات دانا پوری نے محسوس کیا کہ مغازی کے باب میں مستشرقین نے بہت سے اعتراضات کیے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مغازی پر خاص توجہ دی اور اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی کتابیں ہیں ان کے مقابلے میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے۔ مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے جتنی مولانا دانا پوری نے کی ہے۔ پھر مغازی سے جو سبق نکلتے ہیں یعنی فقہیات سیرت پر بھی بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ کتاب میں فقہیات پر بہت مستند مواد دیا ہے اور حدیث کی مستند ترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے، یعنی نبوت، معجزات، معراج پر مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔ لیکن کتاب کی دوسری جلد لکھنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ ہم تک ایک ہی جلد پہنچی ہے اور وہ بہت مستند اور انتہائی معتبر کتاب ہے۔ محاضرات سیرت میں ڈاکٹر محمود احمد غازی واقعات سیرت سے فقہی مسائل اخذ کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فقہ اور سیرت میں انتہائی گہرا اور قریبی ربط پایا جاتا ہے۔ سیرت سے واقفیت شریعت کے بہت سے احکامات کو جاننے کے لیے

ضروری ہے۔شریعت کے بہت سے احکام کی تفسیر جانے بغیر سیرت کی نزاکتوں اور حکمتوں کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ایک اعتبار سے سیرت کی عملی تطبیق کا نام فقہ ہے۔اور فقہ سیرت ہی کی گہری فہم کا نام ہے۔ایک زمانہ تھا کہ فقہ کی اصطلاح بہت عمومی، جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتی تھی۔"(124)

عمدہ طرز تالیف:

مولانا دانا پوری کو قدرت نے تحریر و تصنیف کا ایک خاص سلیقہ ودیعت فرمایا تھا اور وہ اس خاص وصف میں اپنے تمام معاصرین کے درمیان ممتاز تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف میں عموماً اور اصح السیر میں خصوصاً بے ربطی انتشار اور بے ترتیبی کا شائبہ بھی نہیں گزرتا۔اصح السیر کا موازنہ اردو کی کسی بھی دوسری کتاب سیرت سے کیا جائے تو مولانا کے سلیقہ تحریر و تصنیف کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہوا نظر آئے گا۔دانا پوری اپنی کتاب "اصح السیر" صفحہ نمبر ۲۴، ۲۵ پر لکھتے ہیں:

"اسلام سے قبل دنیا کی ایک بڑی لعنت وطنیت بھی تھی۔دنیا میں جس قدر خون ریزیاں ہوئیں اس میں بہت زیادہ حصہ اسی وطنیت کا ہے۔آج بھی جتنی لڑائیاں ہو رہی ہیں وہ اسی وطنیت کی برکت ہے۔وطنیت کا بڑا اغلبہ یورپ میں ہے۔اور اسی وجہ سے بہترین علم، عقل اور فہم کے باوجود ہر وقت سارا یورپ آمادہ پیکار ہے۔اسلام نے وطنیت کی بنیاد اکھیڑ دی تھی، ہر ملک میں انسان دو طرح کے ہیں۔اچھے انسان۔اور برے انسان۔تمام دنیا کے اچھے انسان ایک قوم ہیں اور برے ایک قوم"۔

ارشاد ہے:

"کونو عباد اللہ اخوانا"۔اور فرمایا الکفر ملۃ واحدۃ"(125)

جدید عقلاء کو اس سے تسکین نہیں ہوتی۔کیونکہ یورپ میں قومیت کا معیار وطنیت ہی ہے۔بڑے زور شور سے یہ لعنت پھر مسلمانوں کے سر منڈھی جا رہی ہے۔جس لعنت سے دنیا نے بمشکل جزوی نجات حاصل کی تھی وہی پھر دنیا پر مسلط کی جا رہی ہے اور اس کے لیے حب الوطن من الایمان اور اسی طرح کی دوسری من گھڑت حدیثیں شائع کی جاتی ہیں۔انتہائی بے باکی سے اعلان کیا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ نے ملکی آزادی کے لیے جہاد کیا۔حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو مقاتلہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کیا جائے وہی جہاد ہے۔

ردِ استشراق:

اصح السیر کی تصنیف سے مولانا دانا پوری کا اصل مقصد یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت و شخصیت سے متعلق مستشرقین یورپ کی غلط بیانیوں کا رد و ابطال کیا جائے اور خاص طور پر ان مسلم نوجوانوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے جن کے ذہن میں ذات نبوی کے متعلق مؤرخین یوروپ کی زہر افشانیوں سے مسموم ہو چکے ہیں۔

چنانچہ مولانا مقدمہ سیرت میں خود رقم طراز ہیں:

"یورپ کے اس پروپیگنڈا کی وجہ سے آج مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کو بہت برا سمجھتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کے غزوات کو اسلامی تاریخ پر بدنما داغ سمجھتی ہے۔اور اپنے دانست میں وہ اسلامی خدمت اسی کو سمجھتی ہے کہ اسلامی تاریخ سے یہ داغ مٹا دیا جائے مگر آیات قرآنی کی کثرت احادیث صحیحہ کا دفتر اس کو یہ کرنے نہیں دیتا۔لہٰذا اس نے تاویل پیدا کی ہے کہ یہ سارے غزوات مدافعت اور حفاظت خود اختیاری کے لیے تھے۔اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے نہ تھے"۔(126)

محدثانہ اصولوں کا اطلاق:

روایاتِ سیرت، راویانِ سیرت اور کتبِ سیرت کی محدثانہ اصولوں کے مطابق تحقیق وتفتیش اور پھر ان کے استناد کی بحث مولانا دانا پوری نے اٹھائی ہے اور مقدمہ اصح السیر انھوں نے اس پہلو پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ کتب سیرت اور روایات سیرت بالعموم معتبر نہیں ہیں۔ مولانا دانا پوری اپنی کتاب اصح السیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"مصنف نے واضح کیا ہے کہ اس نے ابن سعد کی جن روایتوں کا اپنی کتاب میں حوالہ دیا ہے انہیں محض طبقاتِ ابن سعد (مطبوعہ یورپ) کے بھروسہ پر نقل نہیں کیا بلکہ اس کی صرف وہی روایتیں لی ہیں جن کو اصحاب نقل میں سے کسی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ مثلاً زادالمعاد (ابن قیم)، شرح مسلم (نووی)، فتح الباری شرح بخاری (ابن حجر)، عمدۃ القاری شرح بخاری (عینی) اصابہ، اسدالغابہ، شرح مواھب (زرقانی) ارشاد الساری شرح بخاری (قسطلانی)، شرح سفرالسعادۃ (عبدالحق محدث دہلوی) اور مدراج النبوۃ (عبدالحق محدث دہلوی)۔ اس کتاب کے ماخذات میں سیرت ابن ہشام، زادالمعاد، صحاح ستہ، تفسیر کبیر امام رازی، تفسیر معالم التنزیل بغوی، تفسیر بیضاوی اور الاتقان (سیوطی) کے نام معروف ہیں۔ الفاظ کی تعریف وتصحیح میں زیادہ تر امداد نہایا یا بن اثیر اور قاموس فیروزآبادی سے لی گئی ہے۔ اور بعض جگہوں پر زرقانی کی شرح مواہب، قاضی شوکانی کی نیل الاوطار، اصابہ، فتح الباری اور مغنی سے بھی امداد لی گئی ہے۔ (127)

نقلی علوم میں دانا پوریؒ کا منہج:

اصح السیر کے مقدمہ میں ابوالبرکات عبدالروف دانا پوریؒ رقم طراز ہیں:

اب انبیاء ورسل کی تعلیمات اور احکام خداوندی کے جاننے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ اور وہ وہی ہے جو خاتم النبیین جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ نے بتایا۔ قرآن پاک حفاظت کا ذمہ خود خداوند پاک نے لیا ہے۔ اور اس کے الفاظ میں ردوبدل کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہوگیا۔ یہ تو قرآن پاک کا حال تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے احکام اس کے سوا اور بھی ہیں۔ اور وہ بھی وحی اور حکم خداوندی ہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

"ما ینطق عن الھوی ان ھو الاوحی یوحیٰ" (128)

یعنی رسول اللہ ﷺ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، وہ وہی کہتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے۔ ابوداود، ابن ماجہ اور دارمی میں حضرت مقداد بن معدی کربؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو آگاہ ہو جاؤ جس طرح مجھ کو خدا کی طرف سے قرآن دیا گیا اسی طرح اور احکام بھی دیے گئے ہیں۔ ایسا ہوگا کہ آسودہ لوگ اپنی گدیوں پر بیٹھ کر کہیں گے کہ قرآن میں جو حلال یا حرام کیا گیا صرف اسی حلال یا حرام سمجھو۔ حالانکہ بہت سی چیزیں رسول اللہ ﷺ نے حرام بتائیں اور وہ بھی اسی طرح حرام ہیں جس طرح خدا کی بتائی ہوئی چیزیں۔

اصحاب حدیث دراصل تین امور کو جمع کرتے ہیں (۱) رسول ﷺ نے کیا فرمایا (۲) رسول ﷺ نے کیا کام کیا (۳) رسول اللہ ﷺ کے سامنے یا رسول اللہ ﷺ کے وقت میں کیا کیا گیا۔ اصحاب سیرۃ بھی انھیں تین امور کو جمع کرتے ہیں۔ اس لیے اصل کام دونوں کا ایک ہے۔ مگر باوجود اس کے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ان کی بحث ضمناً یا التزاماً ہوتی ہے۔ اور اصحاب سیر کا مقصود بالذات رسول اللہ ﷺ کو جاننا ہے۔ احکام پر ان کے یہاں بحث ضمناً ہوتی ہے۔ اس لیے محدثین کا مدار بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا قول رسول ﷺ کا ہے یا نہیں۔ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق میں صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح ہے یا نہیں لیکن اصحاب سیرت کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے سوا اس کے ساتھ دو باتیں اور معلوم کرنی پڑتی ہیں، ایک یہ کہ حضور ﷺ نے کب ایسا کہا یا کیا۔ دوم یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی۔ اصحاب سیرۃ حضور ﷺ کے

اقوال وافعال کو مسلسل ومربوط بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔اور اس کے اسباب وعلل کو بھی جاننا چاہتے ہیں۔اصحاب حدیث کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ قول یا فعل رسول اللہ ﷺ کا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا طریقہ ہوگیا۔گویا یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کب؟ کس دن؟ کس تاریخ ایسا کہا یا ایسا کیا۔

درایت اور عقل:

یورپ نے جو سطحی تعلیم ایشاء میں پھیلا دی ہے اس کا ایک اثر ہمارے نوجوانوں پر عجیب وغریب پڑا ہے۔ان کا دعویٰ ہے کہ ہر بات کو عقل کے معیار پر جانچ کر قبول کرنا چاہیے۔اور جو بات عقل کے خلاف ہو اس کو رد کر دینا چاہیے۔ بظاہر یہ بہت معقول بات ہے۔مگر اسے کے ساتھ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ہر ایسی بات کو جس کو اپنی بے علمی اور ناواقفیت کی وجہ سے سمجھ نہ سکیں خلاف عقل کہتے ہیں۔اور ہر اس چیز کو جوان کی رائے میں صحیح نہ ہو خلاف عقل کہتے ہیں وہ علم۔سمجھ۔رائے۔وہم۔قیاس وغیرہ کے فرق سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں تو پھر ایسے لوگوں کا عقل کو معیار بنانا کس قدر مضحکہ خیز ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ اسی فرضی عقل کے دھوکہ میں مبتلا ہو کر بہت سی مذہبی روایات اور تعلیمات کے متعلق تذبذب ہو گئے ہیں۔اور شکوک وشبہات میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

جو چیزیں عقلا اور حکماء کے نزدیک محال عادی ہیں ان کا بھی ہونا اور عادت کا ٹوٹ جانا ممکن ہے مثلاً یہ ہوسکتا ہے کہ آگ پانی کا کام دے اور پانی آگ کا۔ کیونکہ مادیات میں تغیرات جاری ہیں۔اس کے ثبوت میں بے حد وحساب تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔اور یہ محض تاریخی مسئلہ ہے۔کیونکہ خرق عادت تاریخ ہی سے ثابت ہوسکتا ہے۔اس کے خلاف عقلی دلائل پیش کرنا طفلانہ حرکت ہے اس لیے کہ کلام محالات عقلیہ میں نہیں ہے۔محالات عادیہ میں ہے۔

لیکن ان کے مباحث کا دائرہ اب محالات عقلی یا محالات عادی تک محدود نہیں رہا انھوں نے بت پرستوں کی صحبت میں پرورش پائی اور مشرکوں اور عیسائیوں سے تعلیم حاصل کی۔اور انھیں کے زیر اثر بہت سی چیزوں کو اچھی اور بہت سی چیزوں کو بری سمجھنے لگے اب ان کی عقل قبول نہیں کرتی کہ جس کو وہ برا سمجھتے ہیں اس کو رسول اللہ ﷺ نے اچھا کہا ہو یا جس کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اس کو رسول اللہ ﷺ نے برا کہا ہو۔اور محض اسی بنا پر بہت سی حدیثوں کو وہ خلاف عقل قرار دے کر رد کرتے ہیں۔اور بہت سے موضوعات کو صحیح قرار دے کر قبول کرتے ہیں۔ان لوگوں پر مسلمانوں کے بدعات ورسومات کا تو کوئی اثر نہ ہو اس لیے کہ ایسی صحبتوں میں نہ پلے نہ پرورش پائی۔نہ تعلیم حاصل کی۔مگر ان پر مشرکوں اور بت پرستوں کے خیالات غالب ہو گئے ہیں تو حید ورسالت کی عزت ہی ان میں باقی نہ رہی۔ یہ اچھائی یا برائی کا معیار رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہندوستان یا یورپ کے قائم کردہ معیار کے موافق رسول اللہ ﷺ کو بنانا چاہتے ہیں۔ایسے لوگ جو بدعات اور رسوم ورواج کے احاطہ کے اندر صاحب تمیز ہوئے ان کی حالت اس کے برعکس ہے ان کی عقل انھیں احادیث کو قبول کرتی ہے جو رواج کے موافق ہو گوسنداً موضوع ہو اور جو اس کے خلاف ہو وہ قابل رد ہے گوسنداً صحیح ہو۔

کاش یہ حضرات سمجھتے کہ کوئی ذی عقل یہ حکم نہیں دے سکتا کہ ایسی خیال آرائیوں سے شہادتیں رد کر دی جائیں۔سندیں شہادت کے مثل ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وہی ہے جو صحیح اسناد سے ثابت ہو گو وہ ان کے عقل کے خلاف ہو یا وہ ان کے عقل کے۔ان لوگوں کو جناب مولانا شبلیؒ کے ایک بیان سے بڑی مدد ملی ہے۔مولانا شبلیؒ کے نسبت یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ ہر شخص کو اختیار دیں کہ کسی روایت کا محض اس بنا پر انکار کر دے کہ وہ اس کو عقل کے خلاف سمجھتا ہے۔مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیان سے یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے۔

مولانا سیرت میں بھی اور اپنی دوسری تصنیفات میں بھی بسط وتفصیل سے لکھتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک احادیث کو پرکھنے کا ایک اصول درایت بھی ہے جس طرح قرآن کریم کے خلاف کوئی روایت ہو تو رد کر دی جائے گی۔اور یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس کی سند کیسی ہے۔اس طرح جو روایت عقل کے خلاف ہو وہ بھی رد کر دی جائے گی سند دیکھنے کی ضرورت نہیں۔(129)

درایت اور عقل کا موازنہ:

مولانا عبدالرؤف دانا پوریؒ فرماتے ہیں کہ مولانا شبلیؒ سے تسامح یہ ہوا ہے کہ وہ درایت اور عقل کو ایک چیز سمجھتے ہیں۔ دوئم درایت کو اسناد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور کسی محدث کا یہ مسلک نہیں ہے۔ بلکہ صریح البطلان ہے۔ درایت کے معنی عقل نہیں ہے علم اور تجربہ کے بعد جو ملکہ حاصل ہوتا ہے اس کو درایت کہتے ہیں محدثین کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ سے پوری واقفیت ہو اور اس بارہ میں جتنی روایات صحیح ہیں وہ اس کے پیش نظر ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے وقت کے واقعات اور حالات پر عبور رکھتا ہو ایسے شخص کو ایک طرح کی معرفت اور بصیرت حاصل ہو جائے گی۔ اسی کو درایت کہتے ہیں۔ ایسے شخص کے سامنے جب کوئی روایت آئے گی اور اس کی سند نہ معلوم ہو تو وہ اپنی اسی بصیرت کی بنا پر کہہ سکے گا کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی ہو سکتی ہے یا نہیں۔

عقل کو معیار بنانے کا غلط مفہوم:

عقل کو معیار بنانے کا اگر یہ مطلب ہے، کہ جو بات عقل و سمجھ سے باہر ہو اس کا انکار کر دیا جائے، تو بڑی مشکل ہے معاد کی باتیں اکثر ایسی ہیں جن کا ادراک عقل نہیں کر سکتی۔ حشر۔ نشر۔ عذاب۔ قبر۔ اعمال کا حساب و کتاب۔ جزا۔ سزا۔ جنت۔ دوزخ ایسی چیزیں ہیں جن کا ادراک صرف عقل سے نہیں ہو سکتا۔ اعتقادات کی اکثر باتیں ہیں جن میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ یہ سب باتیں انبیاء کرام کی تعلیم سے معلوم ہوئی ہیں۔ کیا ان چیزوں کا اس لیے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتیں۔

عقل کی گمراہی اور اندھی تقلید میں فرق:

انسان میں بہترین جوہر عقل ہے۔ اور کسی چیز کی خوبی یا خرابی کی اصل تمیز عقل ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ مختلف مذاہب کے درمیان حق و باطل کا امتیاز بھی عقل ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ مگر عقل اس کا نام نہیں ہے کہ ہر چیز میں ہر شخص بلا سمجھے بوجھے مداخلت شروع کر دے۔ اور جس کا جو دل چاہے کہنے لگے۔ عقل کا منشا یہ ہے کہ جس علم یا جس فن میں کسی کو کمال ہو اس کی بات اس علم کے متعلق قبول کی جائے۔ مرض کے متعلق طبیب ہی کی رائے قبول کی جائے وکیل کی نہیں۔ تعمیر کے متعلق انجینیر کا مشورہ قبول کیا جائے فلسفی کا نہیں اسی طرح مذہبی اور اخلاقی مسائل میں انہیں علماء کی رائے قابل قبول ہوگی۔ جنھوں نے اس کی تعلیم و تحقیق میں اپنی عمر کا معقول حصہ صرف کیا ہو۔ ایسے لوگ اگر کسی روایت یا کسی مسئلہ کو عقل سلیم کے خلاف بتائیں۔ تو ان کی بات یقیناً قابل قبول ہوگی۔ مگر جس شخص نے نہ مذہبی تعلیم حاصل کی ہو نہ اخلاقی۔ اس کی عقل اس وادی میں کیا کام دے گی۔ بسا اوقات جس کو ہم عقل سمجھتے ہیں وہ بے عقلی اور نادانی ہوتی ہے۔ غلط علم۔ اور غلط تجربہ کی وجہ سے انسانی عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ اچھی چیز کو بری اور بری چیز کو اچھی سمجھنے لگتی ہے۔ یورپ کو ایشیا کے مقابلہ میں اس وقت جو مادی تفوق حاصل ہے اس کا سب سے خراب نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایشیا کی ذہنی قابلیت تقریباً مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اپنے لیے خود اپنا راستہ تجویز کرنے کی صلاحیت ہم میں باقی نہ رہی۔ عام غلامانہ ذہنیت ہم میں پھیل گئی ہے۔ یورپ کی اندھی تقلید کا نام ہم نے عقل مندی رکھا۔ شکل۔ صورت۔ لباس۔ کھیل کود۔ فسق و فجور میں یورپ کی نقل ہمارے نزدیک حریت و آزادی ہے۔ اپنے مذہب۔ اپنی معاشرت۔ اپنی تاریخ۔ اپنی تہذیب کی مخالفت اور عفت۔ عصمت۔ حیا۔ ادب۔ مروت سے دست برداری کا نام روشن خیالی ہے۔ اور اس حریت و روشن خیالی کے خوبی کی دلیل ہمارے پاس صرف یہ ہے کہ یورپ میں یہ ہوتا ہے یا یورپ کے فلاں فلاسفر نے اس طرح کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایشیا کے ممالک اور علاقہ جات پر یورپ کا اس وقت جتنا قبضہ ہے۔ اس سے بہت زیادہ ہمارے عقول و اذہان پر اسکی حکومت ہے۔ تم دیکھو اس وقت اکثر محکوم ممالک کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارا ملک یورپ کے دست تظلم سے نجات حاصل کرے۔ مگر ذہنی غلامی کا یہ حال ہے کہ کوئی ملک آزادی کا راستہ خود اپنے لیے اپنے مناسب حال تجویز نہیں کرتا۔ جن کی گرفت سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں کی ہدایات کو ذریعہ نجات بھی سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں کی ذہنی غلامی کا یہ عالم ہو۔ ان سے کیونکر امید کی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح عقلی نتائج حاصل کر سکیں گے۔

جہاد فی سبیل اللہ اور دنیوی جنگ کے مابین فرق:

مولانا داناپوریؒ جہاد فی سبیل اللہ اور دنیوی جنگ کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اسلام سے قبل دنیا کی ایک بڑی لعنت وطنیت بھی تھی۔ دنیا میں جس قدر خون ریزیاں ہوئیں اس میں بہت زیادہ حصہ اسی وطنیت کا ہے۔ آج بھی جتنی لڑائیاں ہو رہی ہیں وہ اسی وطنیت کی برکت ہے۔ وطنیت کا بڑا غلبہ یورپ میں ہے۔ اور اسی وجہ سے بہترین علم، عقل اور فہم کے باوجود ہر وقت سارا یورپ آمادہ پیکار ہے۔ اسلام نے وطنیت کی بنیاد اکھیڑ دی تھی، ہر ملک میں انسان دو طرح کے ہیں۔ اچھے انسان۔ اور برے انسان۔ تمام دنیا کے اچھے انسان ایک قوم ہیں اور برے ایک قوم"۔ ارشاد ہے "کونو عباد اللہ اخوانا"۔(130)

اور فرمایا: ''الکفر ملۃ واحدۃ''۔(131)

جدید عقلاء کو اس سے تسکین نہیں ہوتی۔ کیونکہ یورپ میں قومیت کا معیار وطنیت ہی ہے۔ بڑے زور شور سے یہ لعنت پھر مسلمانوں کے سر منڈھی جا رہی ہے۔ جس لعنت سے دنیا نے بمشکل جزوی نجات حاصل کی تھی وہی پھر دنیا پر مسلط کی جا رہی ہے اور اس کے لیے "حب الوطن من الایمان" اور اسی طرح کی دوسری من گھڑت حدیثیں شائع کی جاتی ہیں۔ انتہائی بے باکی سے اعلان کیا جاتا ہے کہ "نعوذ باللہ" رسول اللہ ﷺ نے ملکی آزادی کے لیے جہاد کیا۔ حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو "مقاتلہ اعلاء کلمۃ اللہ" کے لیے کیا جائے وہی جہاد ہے۔

داناپوریؒ اپنی کتاب "اصح السیر" کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

"غزوہ احد کی روایتوں میں آتا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص قزمان تھا جس کو رسول اللہ ﷺ نے جہنمی کہا تھا مگر غزوہ احد کے روز نہایت شجاعت سے بڑے معرکہ کی لڑائی لڑا۔ صحابہ کو حیرت ہوئی کہ ایسے شخص کو رسول اللہ ﷺ نے جہنمی کیسے کہا۔ وہ زخمی ہوا تو صحابہ نے اس کو نجات کی بشارت دی۔ مگر اس نے کہا کہ نجات کی بشارت کیسی میں تو قوم کے لیے محض قومیت کی پاسداری میں لڑا ہوں۔ صحابہ کو تسکین ہوگئی اور سمجھ گئے کہ رسول اللہ ﷺ اس کو کیوں جہنمی کہتے تھے"۔(132)

رسول اللہ ﷺ نے توحید کا اعلان کیا اور تیرہ برس تک لوگوں کو وعظ و پند کے ذریعہ سمجھاتے رہے کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا ہے۔ ہر شخص رشد و غی کو سمجھ گیا۔ حق و باطل واضح ہوگیا، حجت و دلیل کی تمام منزلیں طے ہوگئیں۔ لیکن باطل پرستی فنا نہ ہوئی۔ تب آپ ﷺ نے حق کی حمایت میں تلوار اٹھائی باطل کے ابطال پر عملی اقدام شروع کیا۔ اور ساری دنیا کے سامنے اعلان کیا۔

"تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"(133)

نتیجہ یہ ہوا کہ دس برس کے اندر وہ ملک جو تمام تر شیطانوں کی آبادی تھی فرشتوں کی بستی بن گئی۔ ہر شخص بھلائی و نیکی کا مجسمہ تھا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اصحاب رسول اللہ ﷺ اوامر کا ترک اور نواہی پر عمل دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ظلم دنیا سے مٹ گیا۔ فسق و فجور رفا ہوگیا۔ شرک و بت پرستی کالعدم ہوگئی۔ ہمت، دلیری، عدل و انصاف سے سینے معمور ہو گئے۔ شیاطین کی ہمتیں پست ہوگئیں، باطل کا بازار سرد ہوگیا۔ اور ہر طرف ''جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا''(134) کا عملی اعلان ہوگیا۔

غزوات کے یہ عملی نتائج ہمارے سامنے واضح ہیں۔ تاریخیں علی الاعلان اس کی شاہد ہیں مگر جدید عقلا کہتے ہیں کہ مذہب کے لیے جنگ نہیں چاہیے۔ ملک کے لیے لڑو، روپیہ کے لیے لڑو، اپنے بنائے ہوئے قانون کو رائج اور قائم کرنے کے لیے لڑو۔ مگر خدا کی توحید اور خدا کا قانون رائج کرنے کے لیے نہ لڑو۔ نیکی کی معاونت اور بدی کی مخالفت کے نہ لڑو۔ کیونکہ یورپ کے عقلا مذہب کے لیے جنگ کو منع کرتے ہیں۔

جہاد کا حقیقی مقصد:

جب یہ معلوم ہو گیا کہ خدا کی مخلوق دو حصوں پر خود بخو د تقسیم ہے، نیک اور بد۔ تو خداوند کریم نے حکم دیا کہ نیکوں کا یہ بھی فرض ہے کہ نیکی کو دنیا پر غالب رکھیں ۔اور اس کی حمایت میں اپنی تمام تر قوت صرف کر دیں۔ قرآن کریم کی صد ہا آیتیں ۔احادیث صحیحہ کا بڑا دفتر اس حکم سے بھرا پڑا ہے۔ کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد فرض ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ اس حکم کے بعد کس طرح توحید کا غلبہ ہوا۔ کس طرح شیطان مغلوب ہوا۔ کیونکر بت پرستی فنا ہوئی۔ کس طرح دنیا خدا کی حمد وستائش سے بھر گئی۔ کس طرح وہ باتیں پوری ہوئیں جس کی تمنا میں حضرت ابراہیم ۔حضرت موسیٰ ،حضرت عیسیٰ اور تمام انبیاء کرام نے اپنی عمریں صرف کر دیں تھیں ۔عرب جو بت پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا ۔وہاں سے شیطان مایوس ہو گیا۔ کہ اب اس سرزمین پر سوائے خدائے ذوالجلال کے کسی کو سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ ایران جہاں ایک شخص بھی خدائے قدوس کا نام لینے والا نہ تھا وہاں لکھوکھا اور کروڑہا سر خدا کے سامنے جھک گئے ۔ شیطانی قوانین کو حضور ﷺ نے اپنے پیروں کے نیچے روند دیا۔اور خدائی احکام پر ہر جگہ حکومت ہونے لگی۔

یہود ونصاریٰ کی خاموشی:

مولانا دانا پوریؒ رقم طراز ہیں کہ " بت پرستی کی یہ شکست ایسی باتیں نہ تھیں جس پر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی امت اور انبیاء کے ماننے والوں کو سچی خوشی حاصل ہوتی ۔اور کیا اگر خود حضرت عیسیٰؑ موجود ہوتے تو ان کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور بات ہو سکتی تھی ۔ آخر کس چیز نے یہود ونصاریٰ کو اس خوشی میں شرکت سے باز رکھا ۔ بلکہ یہود کو علانیہ بت پرستی کی حمایت پر آمادہ کر دیا۔ جیسا کہ غزوہ احزاب کے وقت ہوا۔ اسی نسلی تفریق اور وطنیت کی لعنت نے ۔ یہود کہتے تھے کہ نبوت بنی اسرائیل ہی کے لیے خاص ہے۔ عیسائیوں میں سے ہرقل نے بھی اور مقوقس نے بھی صاف کہہ دیا کہ میرا خیال تھا کہ نبی آخرالزماں کا ظہور شام میں ہو گا بس یہ چیز تھی جو ان کو توحید کی حمایت سے بھی روکے ہوئے تھی"۔ (135)

جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ:

عیسائیوں کو جہاد فی سبیل اللہ پر بڑا اعتراض ہے۔اور اس پر انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھ ڈالیں ۔اعتراض کا ما حاصل یہ ہے کہ مذہب کے لیے لڑنا نہیں چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ کیا وہ سکندر اور تیمور جیسے فاتحوں کے مناسب تو تھا۔ مگر انبیاء کی شان کے مناسب نہ تھا۔ان بدنصیبوں کی شاید یہ غرض ہے کہ انبیاء کی یہی شان ہے کہ وہ ہمیشہ مغلوب رہیں ۔قوتیں ہمیشہ ان کے مخالفین اور شیاطین کے پاس رہیں ۔وہ جب چاہیں انبیاء کو تکلیفیں پہنچائیں، پریشان کریں، قتل کریں، آگ میں ڈالیں ۔انبیاء بالکل بے دست وپا ۔مجبور ۔محتاج۔اور ان کے مظالم کے سامنے سرنگوں رہیں۔

یہ الزامات ان کے ہیں جو انبیاء کی اتباع اور حمایت کا دعویٰ کرتے ہیں ۔مگر فی الواقع اس اعتراض والزام کا منشا کچھ اور ہے۔ خدائے ذوالجلال نے جب اپنے خاص بندوں کو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے تلوار ہاتھ میں لینے کا حکم دیا۔

اور رسول اللہ ﷺ سے کہا:

''حرض المومنین علی القتال "(136)

کہ مومنین کو قتال پر آمادہ کرو تو دنیا کا نقشہ بدل گیا ۔جن لوگوں نے حق کی حمایت میں تلوار اٹھائی ان کی دلیری ۔ ہمت اور جوہر شجاعت نے دنیا میں تہلکہ ڈال دیا ۔مظالم اور بت پرستوں کے گھروں میں ماتم پڑ گیا۔فتوحات کا راستہ ان کے لیے صاف ہو گیا۔ ایشیاء اور یورپ کی طاقتیں ان کے سامنے سرنگوں ہو گئیں ۔ایشیاء کی یہی بڑھتی ہوئی طاقت تھی جس کو یورپ کی وطنیت برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔مگر

مردان خدا کے راستہ میں حائل ہونا بھی ان کے بس کی بات نہ تھی اس لیے یہ پروپیگنڈا کیا گیا۔ جس نے ایشیا اور خصوصاً مسلمانوں کے تمام شریفانہ جذبات کو فنا کر دیا۔ اس پروپیگنڈا کے خوف سے مسلمانوں نے وہ باتیں اختیار کیں جس کو وہ اپنی اصطلاح میں عجز۔ انکسار۔ قناعت اور صبر کہتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ چیزیں بھی صفات حسنہ میں اس وقت داخل ہوتی ہیں جب قوت اور طاقت حاصل ہونے کے بعد اختیار کی جائیں۔ بے اختیار۔ محتاج۔ فقیر تو یہ کرتا ہی ہے۔ وہ یہ نہ کرے تو اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

جہاد بالسیف پر اعتراض کا جائزہ:

یورپ کے اس پروپیگنڈا کی وجہ سے آج مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کو بہت برا سمجھتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوات کو اسلامی تاریخ پر بدنما داغ سمجھتی ہے۔ اور اپنے دانست میں وہ اسلامی خدمت اسی کو سمجھتی ہے کہ اسلامی تاریخ سے یہ داغ مٹا دیا جائے مگر آیات قرآنی کی کثرت، احادیث صحیحہ کا دفتر اس کو یہ کرنے نہیں دیتا۔ لہٰذا اس نے تاویل پیدا کی ہے کہ یہ سارے غزوات مدافعت اور حفاظت خود اختیاری کے لیے تھے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے نہ تھے۔

یہ جواب اس مذہب کی طرف سے دیا جاتا تو شاید کسی حد تک صحیح بن سکتا جس میں رہبانیت کی تعلیم دی گئی ہو۔ مگر وہ مذہب ہاتھ میں تلوار لینے سے کیونکر انکار کر سکتا ہے۔ جس میں قتل وقصاص اور حدود وقضا بھی جزو مذہب ہو۔ اور جس مذہب میں صاحب حق کو حق دلانا۔ ظالم ومظلوم میں انصاف کرنا فرض کیا گیا ہو۔ یہ چیزیں بغیر حاکمانہ اختیار کے پوری نہیں ہو سکتیں اور حاکمانہ اختیار صرف مواعظ حسنہ سے حاصل نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ اور انبیاء شیطانی حکومتوں پر صابر وشاکر رہے ہوں مگر اسلام کے ساتھ ساتھ خدا کا یہ اعلان بھی آیا:

''وکتبنا فی الزبور ان الارض یرثها عبادی الصلحون''(137)

یعنی ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کی بادشاہت انبیاء اور انبیاء کے متبعین کے لیے ہے۔ اسلام کے یہ جدید وکلا فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد نہیں کیا۔ توحید کے قیام کے لیے جہاد نہیں کیا۔ بت پرستی کو مٹانے کے لیے جہاد نہیں کیا۔ دنیا میں نیکی پھیلانے کے لیے جہاد نہیں کیا۔ جتنے غزوات رسول اللہ ﷺ نے کیے، اور جتنی لڑائیاں صحابہ لڑے وہ صرف اپنی حفاظت اور اپنے بچاو کے لیے انھوں نے مدافعت کی تھی۔ یہ جواب کیوں دیا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ ذہنی غلامی نے ہم کو اس قابل نہیں رکھا اور ہمت وشجاعت کے وہ شریفانہ جذبات ہمارے اندر باقی نہ رہے۔ جس سے ہم سمجھ سکیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے متبعین پر اعلاء کلمۃ اللہ کا حق اپنی حفاظت اور مدافعت سے زیادہ ضروری ہے، وہ اپنے تمام مخالفین اور بڑے سے بڑے دشمن کو معاف کر سکتے تھے۔ مگر خدا کی مخالفت اور بت پرستی وشرک کی اشاعت کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔

عقل پرستوں کے متضاد رویے:

عقل ایک نعمت ہے۔ اور بلاشبہ کسی چیز کے حق یا ناحق ہونے کا ثبوت براہین ودلائل ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مگر عقلیں متفاوت نہ ہوتیں تو عقلاء کے اندر اختلافات ہی کیوں ہوتے۔ تم غور کرو گے تو دنیا کا ہر کندہ ناتراش اپنی عقل کو سارے جہان سے بڑھ کر جانتا ہے۔ ایک احمق بھی ایک بڑے فلسفی کے خلاف آوازے کستا ہے۔

جن لوگوں نے عقلی تحقیقات میں عمریں صرف کر دیں۔ وہ بھی کسی ایک عقلی بحث پر متفق نہ ہو سکے فیثاغورث نے ایک زمانہ میں زور تقریر اور قوت استدلال سے تمام دنیا کو نظام شمسی کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس کے بعد جب بطلیموس کی باری آئی تو اس فیثاغورث کے تمام نظام کو الٹ کر رکھ دیا اور ساری دنیا سے اپنی بات منوالی۔ اب یورپ نے بطلیموس کی تمام تحقیقات کو باطل ثابت کر دیا۔ اور وہی فیثاغورث کے فرستودہ نظام کو حق سمجھ کر قبول کیا۔

اخلاقیات کا بھی یہی حال ہے۔ ہندوستان کے بت پرستوں کی اتنی بڑی قوم یہ پسند نہیں کرتی کہ جس عورت ومرد میں خون کا کچھ بھی لگاؤ ہو۔ اُن میں ازواج کا تعلق اور شادی بیاہ ہو اس کے برعکس آتش پرست پارسی ہیں۔ جو عقل میں کسی طرح ان بت پرستوں سے کم نہیں کہے جا سکتے وہ اپنے خاص عزیزوں اور حقیقی بہن سے بھی زن وشوئی کے تعلقات میں برائی نہیں سمجھتے۔ یورپ جس نے عقلی ترقی کے دعووں سے آج آسمان وزمین ایک کردیا ہے اور وہ ہر قسم کے اخلاقی قید سے بھی نجات حاصل کر کے آزادی میں حیوانیت سے بھی بڑھے جارہے ہیں۔ وہ تو بیاہ وشادی کے قید ہی کو اٹھا دینا چاہتے ہیں تا کہ عورت ومرد بلا قید جس کا جس سے دل چاہے مل سکیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا تم اسلام کو ان میں سے کسی ایک کی عقل کے موافق بنا دینا چاہتے ہو۔ یا خود اسلام کی تعلیم کو سمجھنا چاہتے ہو۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے اس کی تحقیق کی جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تعلیم دی اور اسلام نے کیا بتایا۔ اور یہ محض نقلی بحث ہے اپنی رائے ملا دینے سے وہ خاص رسول اللہ ﷺ کی تعلیم باقی نہ رہے گی۔ ہاں اس کے بعد اگر خدا نے عقل وفہم عطا فرمایا ہے۔ تو غور کر سکتے ہو کہ دلائل وبراہین عقلی اسلامی تعلیم کے موافق ہیں یا ان گم کردہ راہ کنار کے موافق ہیں۔ قرآن پاک نے ہر جگہ کنار کو مخاطب کیا ہے اور یہی کہا ہے کہ تم پہلے میری تعلیم سن لو۔ پھر مظاہر قدرت پر تدبر وتفکر کی نگاہ ڈالو۔ خداداد عقل سے کام لو۔ تو اسی تعلیم کو حق پاؤ گے۔ اور تمھاری عقلیں بھی انہیں باتوں کے حق ہونے کی ہدایت کریں گی۔ مگر غلطی یہ ہے کہ ہمارے نوجوان پہلے بطور خود کسی بات کے اچھی یا بری ہونے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اور اس کو عقل کے موافق سمجھتے ہیں تو اس کو اسلام یا رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں یا انھوں نے کسی فلسفی کا قول سنا۔ یا ڈارون کی تھیوری ان کے کان میں پڑی اور پسند آ گئی تو کہہ دیا کہ یہی اسلام کی تعلیم بھی ہے۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ انبیاء متقدمین کے تعلیم میں جو تحریف ہوئی وہ بھی اسی طرح۔ اور مسلمانوں میں جس قدر بدعات۔ مکروہات وخرافات رائج ہو گئے ہیں اس کا بھی زیادہ حصہ اسی طرح آیا ہے۔

فصل چہارم

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری بحیثیت سیرت نگار

احوال و آثار:

ذیل میں ہم پہلے قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا تعارف پیش کرتے ہیں:

حسب و نسب:

قاضی محمد سلیمان سلمان پوری کا حسب و نسب بالاتفاق مشہور و معلوم نہیں ہے۔ مختلف روایتوں میں مختلف بیان کیا گیا ہے ان کے پوتے کا بیان ہے کہ قاضی صاحب کا سلسلہ حسن حضرت عباس بن علیؓ تک پہنچتا ہے لیکن انہوں نے اس کے دلائل و شواہد نقل نہیں کئے۔ آگے وہ تشریح کرتے ہیں کہ قاضی کی راجپوتوں سے کثیر رشتہ داری کی بنا پر ان کے خاندان والے اپنے آپ کو کھوکھر راجپوت سمجھتے تھے۔

قاضی صاحب کے پوتے کی روایت ہے کہ قاضی صاحب کے مورث اعلیٰ اور قاضی خاندان کے جد امجد عون بن الاعلیٰ عرف قطب شاہ ہندوستان کے علاقہ بھٹنیر میں آ کر آباد ہوئے۔ وہ حضرت عبدالقادر جیلانی کے خالہ زاد تھے۔ (138)

آباؤ اجداد:

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے حالات کا کماحقہ منصۂ شہود پر نہیں آ سکے۔ صرف ان کے پوتے نے قاضی مرحوم کی کتاب ''سفر نامہ حجاز'' کے آخیر میں مختصر حالات نقل کئے ہیں۔ چونکہ قاضی صاحب کے حالات زندگی کے دیگر مصادر موجو نہیں اسی لئے ان کے پوتے کے بیان کردہ حالات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کے پردادا کا نام معز الدین تھا۔ جو تحصیل فاضلکا ضلع فیروز پور کے بڑھی مال میں رہائش پزیر ہو گئے تھے اور حضرت شاہ غلام علی دھلوی کے مریدین میں سے تھے اور بعد ازاں شاہ غلام علی نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا اور ساتھ ہی منصور پور جا کر اسے مرکز بنا کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا اس طرح قاضی صاحب کا خاندان مستقل طور پر منصور پر میں مقیم ہو گیا''۔ (139)

خاندان کا لقب ''قاضی'' پڑ جانے کی وجہ تسمیہ:

قاضی صاحب کے پوتے کا بیان ہے کہ'' قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے دادا کا نام پیر محمد تھا اور یہی پیر محمد شاہان مغلیہ کے عہد سلطنت میں دہلی کے قاضی مقرر ہوئے اس پر لوگ انہیں قاضی کہنے لگے اور ان کا خاندانی نام 'خاندانی'' مشہور ہو گیا۔ (140)

حضرت قاضی معز الدین کو ان کے مرشد نے منصور پور میں تبلیغ پر مامور فرمایا تھا انہوں نے منصور میں تدریس کو تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور کسب معاش کیلئے کاشکاری کا کام اپنایا وہ ایک نیک سیرت انسان تھے اور عوام کو ان سے عقیدت ہو گئی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کے مزار پر قبہ بنا دیا تھا۔ یہی قاضی معز الدین کے یہاں قاضی باقی باللہ پیدا ہوئے جو قاضی سلیمان سلمان منصور پوری کے جد گرامی ہیں اور ریاست کے محکمہ مال میں ملازم تھے۔ (141)

قاضی سلیمان کے والد گرامی کا نام قاضی احمد شاہ تھا جو ایک عامل باعمل اور شب زندہ دار بزرگ تھے انہوں نے دو حج کئے تھے انہوں نے منصور پوری کی رہائش ترک کر کے صدر مقام ریاست پٹیالہ میں سکونت اختیار فرمائی تھی اور وہیں فوت ہوئے۔ (142)

منصور پور:

قاضی سلیمان کے مورث اعلیٰ منصور پور میں آباد ہوئے تھے پھر خاندان کا سلسلہ یہیں پر آگے بڑھتا رہا تا آنکہ حضرت قاضی احمد شاہ نے (جو قاضی سلیمان کے والد گرامی تھے) منصور پور کو چھوڑ کر ریاست پٹیالہ کے صدر مقام میں سکونت اختیار کر لی تھی چونکہ اس خاندان کا وطن مالوف منصور پر ہی تھا اس لئے یہ لوگ اپنے آپ کو منصور پوری کہنے لگے۔ (143)

ولادت:

علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان ولد قاضی احمد شاہ ولد قاضی باقی باللہ ولد قاضی معزالدین ۱۸۶۷ء،۱۲۸۴ھ میں منصور پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ جو اس وقت ریاست پٹیالہ میں تھا۔ (144)

قاضی سلیمان کے والد قاضی احمد شاہ اور والدہ مائی اللہ جوائی جو کہ انتہائی نیک پابند صلوٰۃ وعبادت گزار تھے انہوں نے اپنے ہر دو فرزندان قاضی سلیمان اور قاضی عبدالرحمٰن (المعروف وکیل) کی تربیت اچھے اور پاکیزہ ماحول میں کی اور اس کی طرف خصوصی توجہ دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ مائی اللہ جوائی نے کبھی بھی بغیر وضوع کے آپ کو دودھ نہیں پلایا تھا۔

قاضی سلیمان سلمان منصور پوری کے حلیہ مبارک کے بارے میں جو معلومات ملی ہیں وہ کچھ اسطرح ہیں'' آپ قد وقامت کے لحاظ سے بلند وبالا اور متناسب الاعضاء تھے رنگ گورا اور چہرہ نورانی تھا۔ ستوان ناک، کشادہ پیشانی، داڑھی گھنی تھی جو آخری عمر میں سفید ہو کر اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ آپ ہمیشہ شیروانی اور چست پاجامہ زیب تن کرتے تھے پگڑی کھڑکی دار پٹیالہ وضع کی ہوتی تھی پاؤں میں سلیم شاہی جوتا پہنتے تھے۔ آپ کا لباس صاف ستھرا اور خوراک انتہائی سادہ ہوتی تھی کسی خاص قسم کے کھانے سے کوئی رغبت نہ تھی بلکہ جو بھی میسر آتا اسی پر گزارہ کر لیتے تھے۔ (145)

قاضی سلیمان کا بچپن انتہائی سادہ ماحول میں گزرا کیونکہ آپ کا تعلق دیندار گھرانے سے تھا اس لئے آپ کی تربیت بچپن ہی سے اسلامی اصولوں کے مطابق کی گئی جس کی وجہ سے آپ بچپن ہی سے دینی علوم کی طرف مائل تھے بیان کیا جاتا ہے کہ قاضی سلیمان کو شیر خواری کے ایام میں آپ کے والد محترم آپ کو شاہ جی نجم الدین صاحب وفات ۱۹۴۹ء بعمر تقریباً سو سال سائیں تو کل شاہ صاحب نقشبندی مجددی مزاد انبالہ شریف ہندوستان'' (146) کی خدمت میں لئے گئے۔ شاہ جی نے آپ کو اپنی گود میں لیا اور آپ کا منہ چوما اور دعا دی۔

قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارے میں کسی قسم کی معلومات میسر نہیں ہیں بلکہ قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارے میں بھی ان کے پوتے جناب عبدالباقی کی تحریر پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ'' قاضی صاحب قرآن مجید اور عربی کی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی تھی جو کہ ماہر عربی ادب وماہر علوم قرآن تھے اور ان کا شمار اس وقت کے مشہور علماء میں ہوتا تھا اس کے بعد مولانا عبدالعزیز صاحب ساکن کوم متصل لدھانہ سے بھی عربی بہت کچھ سیکھا۔ فارسی قاضی سلیمان نے منشی سکھ لال (کالتھ) سے پڑھی۔ منشی سکھل لال پٹیالہ فارسی کے استاد تھے اور آتش یا ناسخ کے شاگرد میں سے تھے ۱۸۸۴ میں قاضی صاحب نے مہندرا کالج پٹیالہ سے منشی فاضل کا امتحان دیا اور پوری یونیورسٹی میں اول آئے''۔ (147)

قاضی صاحب کی بزرگوں سے عقیدت:

قاضی بزرگوں کا بہت ہی زیادہ احترام کرتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ علامہ اسلم جیراجپوری (مرشد غلام احمد پرویز صاحب) جامعہ ملیہ کیلئے چندہ جمع کرنے تشریف لائے تو قاضی صاحب نے اپنے گھر میں ان کو ٹھہرایا اور آپ کے اہل خانہ کا بیان ہے کہ ان کی خاطر ومدارات میں آپ اپنی روایتی مہمان نوازی سے بھی بڑھ گئے تھے۔

اس طرح دوسرے بزرگ بھی آپ کا خاص احترام کرتے تھے بیان کیا گیا ہے کہ مجذوب حافظ عبداللہ ناہھ والے عموماً برہنہ رہتے تھے اور کالی گلوچ کرتے رہتے تھے مگر بے حد صاحب فیض واکرام تھے اگر قاضی صاحب ان سے ملنے جاتے تو ان کے آنے سے چند لمحے قبل چادر لپیٹ کر خاموش بیٹھ جاتے اور پھر اپنے حجرے میں قاضی صاحب کو لے جاتے اور گھنٹوں تک مکالمہ رہتا۔ اسی طرح سائیں عبداللہ شاہ کمبھلی مقیم پٹیالہ ایک صاحب حال بزرگ تھے ایک عظیم الشان مسجد اور مسافر خانہ کی تکمیل کی۔ قاضی صاحب شہادت کربلا پر ہر سال اس مسجد

میں خطاب کرتے تھے۔ وہ آپ سے ملنے کیلئے خود آتے اور گھنٹوں ہمکلام رہتا۔ (148) حضرت مجدد الف ثانی سے قاضی صاحب کا خصوصی روحانی تعلق رہا ہے۔

حسن معزالدین کا بیان ہے یہ قاضی سلیمان کے پوتے ہیں اور آج کل ۸۴ گارڈن ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں اور تا حال حیات ہیں میں فیصل آباد مولانا ابوالحسن ندوی مصنف ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کی ملاقات کیلئے حاضر ہوا جب وہ اپنے شیخ مولانا عبدالقادر رائے پوری کی عیادت کیلئے ہندوستان سے تشریف لائے میں اپنے دوست کے ہمراہ ندوی صاحب کی زیارت کیلئے گیا ان دنوں رائے پوری کا معمول تھا کہ روزانہ رحمت اللعالمین سے اقتباس پڑھواتے خود صاحب فراش تھے مریدان باصفا فرش پر ان کی چارپائی کے ساتھ بیٹھے رہتے اور درس خواندگی ہوتا رہتا ندوی صاحب کو میرے ہمراہی نے از خود بتا دیا کہ میں منصور پوری ہوں وہ یکدم کھڑے ہو گئے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے کر دیر تک اس طرح رہے کہتے تھے منصور پوری مرحوم کی عزت کے پیش نظر آداب کا تقاضا یہی تھا۔ میں بہت نادم ہوا کہ ننگ اسلاف ہوں۔ اس طرح ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں سید علاءالدین شاہ صاحب نقشبندی قادری چشتی خلیفہ مجاز حضرت عبدالغفور مدنی عباسی ساکن دارالسلام ضلع شیخوپورہ کے وعظ میں پہلی دفعہ بغیر تعارف کے شامل ہوا آپ نے تقریر کرتے کرتے قاضی صاحب (یعنی مرحوم) کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ ان کے ایک عزیز ایک کونہ میں آئے بیٹھے ہیں شاید ان کے پوتے ہیں پھر میری نشاندہی کروا کر حاضرین مجلس کو میری طرف متوجہ کرا کے مجھے شرمندہ کیا۔ (149)

یہ قاضی صاحب کے کمالات کی مثالیں ہیں کہ بزرگوں نے ان کی عقیدت میں ان کی بھی عزت افزائی کی قاضی حسن معزالدین واحد شخص ہیں اور قاضی حسن معزالدین واحد شخص ہیں اور قاضی خاندان کے فرد ہیں جو بعد از تقسیم، دسمبر ۱۹۸۱ء میں پٹیالہ آئے۔

غیر مسلموں کی قاضی صاحب سے عقیدت:

قاضی احمد سلمان کے غیر مسلم عقیدت مندوں میں مسٹر ڈلپ سمتھ پرائیویٹ سیکورٹی لارڈ منٹو والا رڈ کنڈن واند سوائے ہندا ور سرجو گھندر سنگھ معروف ہیں۔ قاضی صاحب کی وفات حسرت آیات پر سب سے قبل سرجوگندر سنگھ نے شملہ سے (مہاراجہ کو جو اس وقت لندن میں تھا) تار دیا جسکی بناء پر قاضی صاحب کی دختر کی پنشن تا حیات اور آپ کے فرزند ارجمند قاضی عبدالعزیز صاحب بی اے (علیگ) انسپکٹر آف سکولز کی ترقی کی گئی۔ (150)

اسطرح بیان کیا جاتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں مہاراجہ بھوپندر سنگھ نے لارڈ چھسفورڈ وائسرائے سے قطعہ برھتروہ میں قاضی صاحب کا تعارف کروایا لارڈ چھسفورڈ نے پروٹوکول کے خلاف اٹھ کر قاضی صاحب سے ہاتھ ملایا کرسی پیش کی اور مہاراجہ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں ان سے واقف ہوں۔ اسی قسم کا دوسرا واقعہ بزبانی شیخ علامہ صابر بیان میاں بیان کیا گیا ہے کہ لارڈ منٹو آیا تھا قاضی صاب اس وقت منتظم تھے یہ قاضی صاحب سے پہلی ملاقات تھی پھر پٹیالہ میں بطور وائسرائے دورے پر آیا۔ قاضی صاحب کے متعلق اس نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں مزاج پرسی کیلئے خود گھر پر آیا۔ (151)

قاضی صاحب آغوش رحمت میں:

قاضی صاحب کو وفات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ واپسی کے سفر کا سب سے زیادہ دردناک واقعہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری کی وفات کا ہے مولانا سفر حج میں قاضی سلیمان کے ہمسفر تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو قاضی صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ میں ان کی عیادت کیلئے گیا تو بہت کمزور ہو چکے تھے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے نہ پہچان سکے پھر دوسرے روز دوبارہ مزاج پرسی کیلئے گیا تو آپ کی حالات قدرے بہتر تھی۔

اس ملاقات کے بعد ہم سب حج پر روانہ ہو گئے عرفات میں ملاقات ہوئی اسکے بعد حرم میں ملاقات ہوئی ہم نے پوچھا کہ کب تشریف لے جائیں گے تو جواب دیا کہ میں بہت جلد واپس چلا جاؤں گا۔ کیونکہ مدینہ کی زیارت میں پہلے ہی کر چکا ہوں پھر چند روز بعد معلوم ہوا کہ آپ ابھی یہیں پر ہیں۔ ہم ۲۹ مئی کو جہاز پر پہنچے تو خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ قاضی صاحب اسی جہاز پر ہوں گے۔(152)

قاضی صاحب کی علالت:

مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ ’’۳۰ مئی کو میں اپنی سیٹ پر لیٹا ہوا ابن روحانی کی تاریخ بجد پڑھ رہا تھا کہ قاضی صاحب کے رفیقوں میں سے عبداللطیف نامی ایک صاحب نے آ کر کہا کہ قاضی محمد سلیمان صاحب کی طبیعت بہت ناساز ہے میں فوراً وہاں پر پہنچا مگر دل میں حیران تھا کہ قاضی صاحب اس جہاز پر کیسے آ گئے میں نے اسماعیل کو اطلاع دی اور جب قاضی صاحب کے کیبن میں پہنچا تو دیکھا کہ قاضی صاحب اپنے کیبن میں اوپر کی سیٹ پر بے ہوش پڑے ہیں۔ آنکھیں بند تھیں میں فی الفور ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے ساتھ لے آیا۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ نبض بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ میں دوبارہ دس بجے انہیں چیک کروں گا اس کے بعد میں پھر اسماعیل کے پاس آیا اور انہیں قاضی کی طبیعت کے بارے میں آگاہ کیا اور ان کے ساتھ ساتھ پروفیسر عبدالحئی عرب کو بھی اطلاع دی وہ دونوں میرے ساتھ قاضی صاحب کو دیکھنے آئے۔ اسماعیل نے کہا کہ ہمارے پاس دو کیبن ہیں ہم ایک کیبن خالی کر دیں گے اور قاضی صاحب کو اوپر لے آ گئے اور قاضی صاحب کے رفقاء کے کہنے پر قاضی محمد سلیمان کے اکلوتے فرزند قاضی عبدالعزیز صاحب انسپکٹر مدارس پٹیالہ تار دیا جس کا مضمون یہ تھا۔ ’’قاضی صاحب سخت بیمار ہیں‘‘۔(153)

وفات:

تار دینے کے بعد ہم نے قاضی صاحب کے رفقاء کو تاکید کی کہ وہ ہر گھنٹہ بعد ہمیں قاضی صاحب کی طبیعت کے بارے میں آگاہ کرتے رہیں۔ چنانچہ ۹ بجے کے قریب عبداللطیف صاحب صاحب دوبارہ آئے اور بتایا کہ حالت ابھی وہی ہی ہے۔ ہم پھر نیچے گئے اور ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو وہ کہنے لگا کہ میں انہیں دیکھ چکا ہوں اور میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ انہیں ہسپتال میں رکھوں۔

میں سیٹھ شکور اور اسماعیل ہسپتال میں رک گئے اسماعیل نے ڈاکٹر سے کہا کہ یہ مریض علم وفضل میں ہندوستان میں ممتاز ہے اور ہماری بیش قومی دولت ہے خدا کیلئے اس کی طرف کاس توجہ دیں ہم وہیں کھڑے تھے کہ قاضی صاحب کو تین آدمی اٹھا لائے۔ ہسپتال کے دروازے پر رکھ دیا اور کہ مریض کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔ ڈاکٹر فی الفور دروازے پر پہنچا ہم سب پریشان ہو گئے۔ ڈاکٹر نے آدمیوں سے کہا کہ مریض کو اٹھا کو ہسپتال کے اندر بستر پر لٹاؤ۔ بستر پر لٹایا گیا تو پھر آہستہ آہستہ سانس چلنے لگا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ مریض کے دل پھیپھڑے اور نبض وغیرہ سب ٹھیک ہیں صرف کمزوری ہے فی الفور دوائیاں منگوائی گئیں اور آپ کو پلائی گئی اس کے بعد طاقت کا ٹیکہ لگایا تیا ہم سب وہیں بیٹھ گئے مگر ہمارے دل ٹوٹے ہوئے تھے قاضی کے جانبر ہونے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھیں۔ چند لمحے بعد آپ کو لمبے لمبے سانس آنے لگے میں اٹھ کر پاس کھڑا ہو گیا آپ کے لبوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ حلق سے کراہنے کی مدھم سی آواز نکلی۔ ہاتھ میں ایسی حرکت ہوئی جیسے کوئی آدمی قلم لے کر کچھ لکھتے وقت کرتا ہے۔ یہ یاس وناامیدی کے آخری لمحے تھے قاضی صاحب کے رفقاء میں سے ایک صاحب صبر نہ کر سکے اور پکار اٹھے کہ ’’ہندوستان کا چراغ گل ہو رہا ہے‘‘ اور ہم سب کے آنسو نکل پڑے۔ اس اثناء میں قاضی صاحب کی پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں پڑیں جو ایک منٹ تک رہیں اور ایک منٹ تک سانس نہ آیا ہم نے غور سے دیکھا تو علم وفضل اور زہد وتقوی کا یہ آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہو چکا تھا۔ ہاتھ خود بخود اس طرح دل پر آ کر بندھ گئے تھے کہ جیسے کوئی انسان نماز کے وقت باندھتا ہے چند منٹ رونے دھونے میں مصروف رہے پھر ڈاکٹر کو اطلاع دی اس نے آ کر دیکھا تو واقعی جان نکل چکی تھی۔

’’انا للہ وانا الیہ راجعون‘‘۔(154)

قاضی صاحب اہل علم کی نظر میں

علامہ سید سلیمان ندوی:

علامہ قاضی محمد سلیمان ندوی اپنے زمانے کے اہل لوگوں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے آپ کا اعزاز بیان انداز تحریر اپنے لحاظ سے ممتاز مقام کا حامل ہے سید سلیمان فرماتے ہیں کہ قاضی صاحب نے اسلام کے فضائل میں اور تفسیر و تاریخ میں اپنی متعدد یادگاریں چھوڑی ہیں۔ افسوس کہ یہ چشمہ فیض اب ہمیشہ کیلئے خشک ہوگیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندوستان میں اسلام کا دریا لہریں لیتا رہے گا اس وقت تک قاضی مرحوم کا نام رہے گا۔ (155)

حکیم محمد عبداللہ:

برصغیر کا وہ کون سے پڑھا لکھا مسلمان ہے جو قاضی صاحب کے اسم گرامی سے ناواقف ہے۔ میں قاضی صاحب کے زمانے میں بالکل نوعمر تھا مجھے کئی مرتبہ قاضی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا علامہ مرحوم نیک سیرت خوبصورت اور پرہیزگار انسان تھے آپ کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے ملت اسلامیہ کی خدمت کی جائے اور مرحوم اس کوشش میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ مرحوم کی زندگی ہر قسم کے عیب سے پاک تھی آپ کو غیر شرعی کاموں سے سخت نفرت تھی۔ مرحوم کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ (156)

عبدالشکور قریشی:

عبدالشکور قریشی صاحب حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان کے نواسے ہیں۔ وہ اپنے نانا کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ نانا جی انتہائی شفیق اور پرخلوص انسان تھے نانا جی مرحوم کو اللہ غریق رحمت کرے نہ تو ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج ہے اور نہ ان کی دینی خدمات وہ علم کے سمندر تھے جس میں موضوع پر لکھنا شروع کیا تو پھر لکھتے گئے جس موضوع پر بولنا شروع کیا بولتے گئے۔ الغرض وہ ایسے آدمی تھے جن کی زندگی اسوہ رسول کے مطابق تھی آپ نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے ناروا سلوک نہیں کیا ہمیشہ ہر ایک سے بلا امتیاز ذات پات کے ملتے تھے۔ آپ مہمان نوازی میں اہل عرب سے دو ہاتھ آگے تھے۔ میری دعا ہے کہ اللہ نانا جی کو اپنی آغوش رحمت میں لے۔ (157)

مولانا عبدالباقی صاحب:

قاضی عبدالباقی قاضی سلیمان کے پوتے ہیں اور آپ کے اکلوتے فرزند ارجمند کے چشم و چراغ ہیں ان کا بیان ہے کہ قاضی صاحب کا اہل خانہ سے سلوک ہمیشہ شفقت سے لبریز ہوتا تھا علامہ نے اپنے فرزند یعنی میرے والد محترم کی پرورش اسلامی اصولوں کے مطابق کی تھی۔ مرحوم دادا جی صاحب بصیرت بزرگ تھے شریعت، طریقت اور علم عرفان پر آپ کو مکمل ادراک حاصل تھا۔

آپ کو اپنے والدین سے بہت زیادہ محبت تھی اور مہاراجہ سے جو خلعت آپ کو ہر سال ملتی تھی آپ وہ پوری کی پوری اپنے والد کے حوالے کر دیتے تھے اپنے چھوٹے بھائی یعنی (دادا عبدالرحمٰن) سے اتنی محبت کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپ کے بڑے بھائی ہیں اور آپ ان کے چھوٹے بھائی۔ علمائے کرام کا احترام بھی اسطرح کرتے تھے جیسے وہ سب آپ سے بڑے ہوں مصلحت دینی اور دوراندیشی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ اپنی ترقی کیلئے کبھی کوشش نہ کی۔ اپنے جائز حقوق کیلئے بھی کبھی تگ و دو نہ کی۔ صرف حق و صداقت کا ساتھ دیتے تھے اور حکومت کی طرف سے جو بھی ذمہ داری سونپی گئی اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ غیر مسلموں کا احترام بھی حد سے زیادہ کرتے تھے۔ (158)

علامہ مرحوم کی وفات پر ۱۹۳۰ء میں دہلی باغ کے بشارت صاحب نے ایک مرثیہ ''رحلت سلیمان'' کے نام سے لکھا تھا جس سے ان کی قاضی سلیمان سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اب دعا ہے اے خدائے کارساز وذوالجلال — اب دعا ہے اے خدائے مالک ورب جمال
حکم میں تیرے بلا چوں کا چرا کی کیا مجال — التجا کرتا ہے تجھ سے یہ بشارت خستہ حال
روح پر مرحوم کی الطاف ہوا کرام ہو — ہوں مراتب خلد میں بالا تیرا انعام ہو(159)

تصنیفات:

حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مرحوم متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں رحمت اللعالمین خاص شہرت کی حامل ہے۔ اخلاص، للہیت، علمی گہرائی تحقیق اور دقت نظر ان کی تصانیف کا نمایاں جوہر ہیں۔ وہ ریاست پٹیالہ کے جج تھے اور عہدہ کے اعتبار سے ان کی زندگی بڑی مصروف تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ملکہ عطا فرمایا تھا اس کو انہوں نے نہایت بہتر طور سے استعمال کیا اور اہم مضوعات پر متعدد کتب تصنیف کیں۔ ان کی تصانیف کی نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ انہیں ہر حلقے میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ''رحمۃ اللعالمین'' کے سوائی سال سے ان کی تصانیف نا پید ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید وہ ان کی زندگی میں ہی ۱۹۳۰ء سے پہلے طبع ہوئیں اور پھر اس کے بعد دوبارہ طباعت کی نوبت نہیں آئی جس کے پاس کوئی نسخہ ہے وہ دینے کو تیار نہیں اس چیز کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ان کے علمی جواہر پاروں کو دوبارہ زیور طبع سے آراستہ کیا جائے۔

قاضی صاحب مرحوم کی تصانیف کی نایابی کے بارے میں ان کے اپنے نواسے (عبدالشکور قریشی) کا بیان ہے کہ ''نانا جی مرحوم کا لٹریچر ان کی وفات کے بعد کسی نہ کسی طریقے سے مختلف ناشرین کے ذریعے چھپتا رہا ہے مگر ان کی تمام کتب مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہیں۔ ہماری کم ہمتی سمجھیں یا بے توجہی کہ ہم اپنے نانا محترم کی اس میراث کو زندہ نہ رکھ سکے۔ بہر حال اب ہم نے عزم کر لیا ہے کہ قاضی مرحوم کی میراث کو پھر سے زندہ کریں گے اور جستہ جستہ بالاستیصاب ان کی تمام کتب کو انشاء اللہ منظر پر لائیں گے۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں تاکہ ان کی تصانیف کو منظر عام پر لاسکیں۔(160)

حضرت قاضی محمد سلیمان کی تصانیف کی مجملہ خوبیوں کے ایک خوبی یہ ہے کہ آپ کی کتابیں ہر حلقہ میں پسند کی جاتی ہے آپ مسائل کو بڑے آسان طریقہ سے حل کرتے ہیں اور مختلف فیہ مسائل کو ایسے خوبصورت انداز میں حل فرماتے ہیں کہ اصل مسئلہ پر بھی زد نہیں پڑتی اور اختلاف رکھنے والا آدمی مشتعل نہیں ہوتا بلکہ مزید ومعتقد ہو جاتا ہے۔

رحمت اللعالمین کا تعارف:

ریاست پٹیالہ کے ایک غیر معروف سے گاؤں منصور پور سے علمی دنیا کا کوئی شخص بھی واقف نہ ہوتا اگر اس دور افتادہ سرزمین کی گود میں قاضی محمد سلیمان جیسے مؤرخ زمانہ اور محقق یگانہ نے جنم نہ لیا ہوتا اس ہنلد فضل وکمال نے یوں تو متعدد دینی موضوعات پر علم ودانش کے موتی لٹائے۔ لیکن حضور کی مفصل سوانح حیات ''رحمۃ العالمین ان کا ایک ایسا بیش بہا کارنامہ ہے جسے وہ صرف مسلم وغیر مسلم اصحاب فکر ونظر نے انتہائی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا بلکہ خود حضور نے بھی شرف قبولیت عطا فرمایا اس حقیقت کے شاہد وہ خطوط ہیں جو رحمۃ اللعالمین کی اشاعت کے بعد کچھ ایسے اصحاب کی جانب سے قاضی صاحب کو موصول ہوئے جنہیں رحمۃ اللعالمین کے بارے میں کسی قسم کا کوئی علم نہ تھا اور نہ ان کے بارے میں کوئی اشتہار دیا گیا تھا بلکہ انہیں آنحضور نے بنفس نفیس خواب میں اشاعت کی بشارت دی۔

رحمۃ اللعالمین اپنی جگہ سیرت کی تمام کتابوں میں بلند مقام رکھتی ہے اور قاضی صاحب کی مشہور تصانیف میں سے ہے۔ یہ کتاب کل تین جلدوں پر مشتمل ہے اس کے دو حصے آپ کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے تھے اور آخری حصہ آپ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ رحمۃ اللعالمین سے قبل قاضی صاحب نے سیرت پر ایک اور کتاب لکھی تھی جس کا نام ''مہر نبوت'' تھا مگر آپ کی خواہش تھی آپ کی سیرت پر جامع کتاب لکھیں جو مختصر، متوسط اور مطول ہو۔ چنانچہ اس خواہش کی بناء پر آپ نے ''رحمۃ اللعالمین'' لکھیں۔

رحمۃ اللعالمین لکھنے کی ضرورت:

آپ نے خود اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میری یہ کتاب آنحضرت کے محاور ومحاسن کا اظہار اسی قدر کر سکتی ہے جس قدر رزرہ بے مقدار عالمتاب کے انوار کو آشکار کر سکتا ہے۔ تاہم میں اس کتاب کے پیش کرنے کی جرات صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ شاید کسی ایک انسان ہی کو اس کے مضامین سے فائدہ پہنچ سکے مضامین کتاب کی نسبت اسی قدر عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے صحیح روایات کے ہی اندارج کرنے میں پوری کوشش اور سعی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے میری التجاء ہے کہ وہ میری اس محنت کو قبول کرے اس کا ثواب میرے والد ماجد کے نامۂ اعمال میں ثبت فرمائے۔(161)

جلد اوّل:

کتاب رحمۃ اللعالمین کی جلد اول ۱۹۱۲ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔

یوم اشاعت سے اس کتاب کو محدثین ومؤرخین، ادباء اور فضلاء نے جس محبت اور عزت سے دیکھا اور جس کثرت سے اس کے مضامین کو کتابوں، رسالوں اور مضامین میں نقل کیا گیا اور جس شغف سے طالبعلموں، واعظوں اور خطیبوں نے اس پر توجہ کی اور اقصائے ملک تک جس طرح اس کی اشاعت ہوئی اس کی نظیر دنیا میں بہت ہی کم ملتی ہے۔ یہ صرف اور صرف رحمۃ اللعالمین کی خصوصیت تھی کہ اسے ہر طبقے نے قبولیت کی نظر سے دیکھا۔ حتیٰ کہ جلد اول کو اس وقت کے کئی مدرسوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں نے اپنے نصاب میں شامل کر لیا۔

جلد دوئم:

رحمۃ اللعالمیں جلد دوم ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد کے دیر سے طبع کرنے کے بارے میں مصنف مرحوم خود بیان کرتے ہیں۔"کہ جلد دوم کیلئے جنگ عظیم (اگست ۱۹۱۴ء تا نومبر ۱۹۸۱ء) کے شروع ہو جانے کی وجہ سے کاغذ دستیاب نہ ہوا اور یہ مسودہ پڑا ہی رہا۔ ۱۹۱۶ء میں جلد اول کا دوسرا ایڈیشن ضرور شائع ہوا تھا لیکن اس کا شائع کرنا اضطرارا تھا جلد دوم کیلئے کاغذ کا انتظار کیا جاتا رہا۔ بالآخر جیسا کاغذ مل سکا اسی پر کتاب کو شائع کر دیا ہے۔"(162)

جلد دوم میں ایسے مضامین ہیں جن میں سے بعض کو علمائے سیرت آغاز کتاب میں جگہ دیتے ہیں مگر قاضی صاحب جلد اول میں صرف ایسے مالابدمنہ حالات مبارک پر اختصار کے ساتھ محتوی رکھا تھا کہ اگر بقیہ جلدیں شائع نہ بھی ہوتیں تو پھر بھی جلد اول نامکمل نظر نہ آتی۔

جلد سوم:

جلد سوم حضرت قاضی محمد سلیمان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی یہ مسودہ بعد میں سید سلیمان ندوی نے مقدمہ اپنی طرف سے لکھ کر شائع کرایا۔ جلد سوم کہنے کو تو حضور کے خصائص پر مبنی ہے مگر درحقیقت اس میں اسلام کے اس امتیازات اور خصوصیات کا ذکر ہے جس کی بناء پر اس کو دین کامل کا خطاب ملا۔ اسی طرح اس جلد میں آنحضرت کے وہ فضائل اور محاور درج ہیں جن کی بنیاد پر آپ کو خاتم الانبیاء اور مکمل دین کا پرفخر خطاب باری تعالیٰ سے عطا ہوا۔ مصنف کے دلائل ایسے دلنشین اور طرز ادا ایسا متعین ہے کہ اس کی یہ تصنیف ہر صاحب ذوق کے لئے باعث تسکین ہو سکتی ہے۔

زمانہ حال نے خیالات میں جو تغیر اور طرق تبلیغ میں انقلاب پیدا کیا ہے مصنف مرحوم نے اس کی پوری نگہداشت کی ہے اور اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام امتیازات اور محاسن جو اس دور میں کسی حیثیت سے بھی پیش کرنے کے لائق تھے۔ مرحوم ومغفور نے ان کا پورا پورا استقصا کیا ہے۔ اور کہیں سے کسی کارآمد نکتہ کو جانے نہیں دیا۔ الغرض ان کی یہ سعی اور کوشش دنیائے اسلام کیلئے ایک عظیم کارنامے سے کم نہیں اور اسکی اس تصنیف کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ اور دل آویان بھی قابل ستائش ہیں صرف تین جلدوں میں سیرت نبوی

کے بحر بے پایاں کو بند کر کے صحیح معنوں میں کتاب کو دریا اور کوزہ کے مصداق بنایا ہے۔

رسول اکرم کی حیات طیبہ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ آپ کی ذات اتنی جامع اور بزرگ و برتر ہے کہ کسی ایک مصنف کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کی حیات طیبہ کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کر سکے اگر چہ قاضی سلیمان منصور پوری نے ''رحمۃ اللعالمین'' کے علاوہ کئی کتابیں لکھیں ہیں لیکن ان سب میں ''رحمۃ اللعالمین'' کو زیادہ مقبولیت ملی ہے۔

''رحمۃ اللعالمین کی تین جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۱۲ء میں لکھی دوسری جلد ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی اور تیسری جلد اپنی زندگی کے آخری سال یعنی ۱۹۳۰ء میں مکمل کی لیکن تیسری جلد آپ کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی بلکہ آپ کی وفات کے بعد شائع کی گئی اس کا مقدمہ حضرت سید سلیمان نے لکھا تھا''۔ (163)

رحمۃ اللعالمین میں حضرت قاضی سلیمان نے سریہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''وہ نقل و حرکت جو کسی مسلمان نے (ایک ہو یا ایک سے زائد) کی ہو اس کا نام سریہ ہے''۔ (164)

خصائص و امتیازات:

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

پیش نظر حصہ کہنے کو خصائص محمدی ﷺ کے بیان میں ہے مگر درحقیقت میں اس اسلام کے ان امتیازات اور خصوصیات کا خاکہ ہے۔ جس کی بناء پر اس کو ''دین کامل'' خطاب ملا۔ اس طرح اس میں آنحضرت ﷺ کے وہ فضائل و محامد درج ہیں جن کی بناء پر آپ کو خاتم النبیین اور مکمل دین کا پر فخر خطاب باری تعالیٰ سے عطا ہوا مصنف کے دلائل ایسے دل نشین اور طرز ادا ایسا متین ہے کہ اس کی یہ تصنیف ہر صاحب ذوق کیلئے باعث ہوسکتی ہے۔ زمانہ حال نے خیالات جو تغیر اور طریق تبلیغ میں انقلاب پیدا کیا ہے، مصنف مرحوم نے اس کی پوری طرح نگہداشت کی ہے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے وہ تمام امتیازات و محاسن جو اس دور میں کسی حیثیت سے پیش کرنے کے لائق تھے۔ مرحوم نے ان کا پورا احاطہ کیا ہے اور کہیں سے کوئی کارآمد نکتہ نہیں چھوڑا۔

''رحمۃ اللعالمین'' کی تیسری جلد بلکہ یوں کہیے کہ پوری کتاب کا اہم حصہ باب خصائص النبی ﷺ کا ہے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ عربی میں متقدمین کی چند کتابیں اس موضوع پر اگر چہ موجود ہیں مگر سیرت النبی ﷺ پر جو کتابیں لکھی گئیں اور جن میں پوری سیرت رسول اللہ ﷺ کو بیان کرنے کی کوشش کی، ان میں یہ موضوع سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو بہت اجمال اور اختصار کے ساتھ۔ اُردو میں لکھی جانے والی کتب سیرت میں عام طور پر اس موضوع کو شامل نہیں کیا جاتا۔ بعض کتب سیرت میں اگر ہے تو بہت مجمل و مختصر جیسے شبلی کی سیرت النبی ﷺ اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت المصطفیٰ ﷺ میں اُردو میں اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی نہیں ہیں۔

''رحمۃ اللعالمین'' اردو میں لکھی جانے والی (سیرت کے موضوع پر) پہلی کتاب ہے جس میں خصائص النبی ﷺ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس بحث کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے خصائص کا استنباط زیادہ تر قرآنی آیات سے کیا ہے کیوں کہ اللہ سے بڑھ کر حضور علیہ السلام کے خصائص نہ کوئی جانتا ہے اور نہ جان جا سکتا ہے۔ مصنف نے اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں وجود گرامی کی بحث ہے اور دوسرے حصے میں خصائص نبوت کا تذکرہ ہے اور آخر میں اسمائے مبارکہ میں سے چند اسمائے عالیہ لکھ کر باب کو ختم کر دیا ہے۔

تاریخ و سیرت نگاری کا یہ بنیادی اصول ہے کہ موضوع سے متعلق جس قدر کتابیں دستیاب ہوں ان کا بے لاگ مطالعہ کیا جائے اور ان میں سے صرف وہی واقعات اخذ کیے جائیں جو معیار تحقیق پر پورا اتریں ''رحمۃ اللعالمین'' کی تالیف کے وقت قاضی صاحب نے یہی اصول سامنے رکھا۔ انہوں نے نہ تو عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس لگنے دی اور نہ حقائق کو مسخ کیا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ کے ساتھ اپنی محبت و شیفتگی برقرار رکھتے ہوئے کتب تاریخ و سیرت میں صرف ایسے واقعات چنے ہیں جو ہر لحاظ سے مستند ہیں۔ مراجع و مصادر کے مطالعے سے پتہ

چلتا ہے کہ قاضی صاحب نے صرف اسلامی علوم پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ غیر مذاہب کی مقدس کتابوں کی بھی ورق گردانی کی ہے۔ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے بھی مضبوط شواہد بہم پہنچا کر حضور ﷺ کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

بقول سید سلیمان ندوی:

''رحمت اللعالمین'' کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ذوق کے مطابق سوانح اور واقعات کے ساتھ غیر مذاہب کے اعتراضات کے جوابات اور دوسرے صحائف آسمانی کے ساتھ موازنہ اور خصوصیت سے یہود ونصاریٰ وعادی کا ابطال بھی اس میں جا بجا موجود ہے۔ مصنف مرحوم کو تورات اور انجیل پر مکمل عبور حاصل تھا اور عیسائیوں کے مناظرانہ پہلوؤں سے جامع پوری واقفیت تھی۔ اسی بناء پر ان کی یہ کتاب ان تمام حلومات کا جامع خزانہ ہے۔'' (165)

قاضی سلیمان منصور پوری نے جس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے اس کے ثبوت میں وہ بے شمار ثبوت اور حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں جو ''رحمۃ اللعالمین'' کی تینوں جلدوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے اثبات کے لئے انہوں نے اس کتاب کا ورق ورق کھنگالا، اس لیے کہ صرف یہی کتاب عیسائی پادریوں کیلئے قابل حجت تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جا بجا بشارات موجود تھیں اور ان سے قرآن مجید، احادیث، کتب سیر کے بیانات کی تصدیق ہوتی تھی۔ چنانچہ ''رحمۃ اللعالمین'' میں ابتداء سے ہی یہودیوں اور کی اس مذہبی کتاب کے حوالے سے شروع ہوجاتے ہیں۔

بائبل سے غیر معمولی شغف کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قاضی صاحب نے سیرت رسول اللہ ﷺ کے اصل منابع یعنی قرآن حکیم، کتب، حدیث، کتب سیر ومغازی اور کتب شمائل کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید احمد خان کے بعد ان سے زیادہ قابلیت اور جامعیت کے ساتھ اردو کتب سیرت میں قاضی صاحب نے سیرت رسول ﷺ کے بنیادی مراجع اور منابع تک رسائی حاصل کی ہے۔

''رحمۃ اللعالمین'' کے بعض تبصرہ نگاروں نے یہ بات کہی کہ ''قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری سرسید احمد سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ بات نہ صرف بے دلیل ہے بلکہ بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ سرسید احمد خان معجزات کے قائل نہیں ہیں جبکہ قاضی صاحب نے ''رحمۃ اللعالمین'' کی جلد سوم میں پوری ایک فصل ان کیلئے وقف کی ہے۔ سرسید احمد خان معراج کو صرف رویا تسلیم کرتے ہیں جبکہ قاضی صاحب کا ایمان ہے کہ معراج کا واقعہ عالم بیداری میں اور جسم وروح کے ساتھ ہوا۔ سرسید مغرب سے مرعوب ہیں اور ہر اس بات کا انکار کر دیتے ہیں یا تاویل سے کام لیتے ہیں جو یورپ کے نظریہ عقلیت، نظریہ فطرت، نظریہ تہذیب وتمدن اور نظریہ ارتقاء کے خلاف ہو، لیکن قاضی محمد سلیمان منصور پوری عقائد کے معاملے میں کسی رورعایت کے قائل نہیں۔ سرسید تمام مشہور سیرت نگاروں (مثلاً ابن اسحٰق، ابن ہشام، واقدی، طبری، الشامی، ابوالفداء، مسعودی اور قسطلانی) کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ان کی کتابیں سچی، جھوٹی، صحیح اور غلط حدیثوں کا ملغوبہ ہیں۔ مگر قاضی سلیمان صاحب کے ہاں ان سب کی نہ صرف روایات موجود ہیں بلکہ ان کی حیثیت ان کے نزدیک مستند ماخذ کی ہیں۔ (166)

رحمۃ اللعالمین مذکورہ ذیل خصوصیات کی حامل ہیں۔

۱۔ یہ کتاب پوری عالمانہ تحقیق سے لکھی گئی ہے (اور) جو روایت جہاں سے لی گئی ہے وہاں حاشیہ پر اس کا پورا حوالہ بھی درج ہے۔

۲۔ تمام واقعات جو سیرت سے متعلق ہیں، سنہ وار ترتیب سے لکھے ہیں۔

۳۔ جہاں کوئی عمدہ نتیجہ مستنبط ہوسکتا ہے اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق ہے وہ بھی لکھ دیا ہے۔

۴۔ بائبل سے ہر جگہ اسناد کر کے اہل کتاب پر حجت قائم کی گئی ہے۔

۵۔ زبان اُردو ہر زبان معیاری تو نہیں، لیکن لب ولہجہ انتا متین، سنجیدہ اور پر اثر ہے کہ مخالف پڑھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مناظرانہ اور مستندانہ انداز سے پرہیز کیا گیا ہے۔

۶۔ مصنف نے اس کے صفحات پر دماغ کے ساتھ دل کے ٹکڑے بھی رکھ دیے ہیں ایک ایک لفظ عشق نبوی ﷺ اور حب انسانیت نمایاں ہے۔

۷۔ مصنف اپنے دور کی تمام جدید تحریکات اور عملی و تحقیقی اقدار سے بھی واقف ہے اور جا بجا اسلامی اقدار سے ان کا مقابلہ کرتا جاتا ہے نبوی غزوات، نظام زکوٰۃ، قانون طلاق وغیرہ کا ذکر آتا ہے تو وہ ان کا ذکر کر کے آگے نہیں بڑھ جاتا بلکہ وہیں متن یا حاشیے پر ایسے اسلوب سے بحث کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے تمام شکوک خود بخود درفع ہوتے چلے چلے جائیں، خواہ وہ کسی قوم اور کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔

۸۔ تفحص و جستجو کا یہ عالم ہے کہ غزوہ احد میں جس انصاری خاتون کے چار اعزا (شوہر، فرزند، باپ، بھائی) شہید ہوئے اور اس نے کوئی پروا نہ کی، اس کا نام تلاش کرنے کیلئے انصار کے تمام انساب کو چھان مارا اور بالآخر اس خاتون کا نام ''ہند'' تلاش کر ہی لیا۔ ارباب تاریخ وسیر نے قاضی صاحب سے پہلے اس خاتون کا نام درج نہیں کیا تھا۔ (167)

جہاں تک مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی اس رائے کا تعلق ہے اردو زبان ہر جگہ یکساں نہیں ہے نا قابل فہم ہے۔ ان کی تحریر میں ایک سوانح نگار کی سی عقیدت مندی، مورخ کی سی بے تعصبی، ایک عالم اور محقق کا سا وقار اور مومن صادق کا سا انکسار ہے۔

''رحمۃ اللعالمین'' اُردو میں لکھی جانے والی ایک مکمل سیرت رسول ﷺ ہے اور اُردو کے سیرت لٹریچر میں ایک جامع اور مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ زیر نظر عہد میں سیرت نگاری میں کثرت و تنوع مختلف حوالوں سے سامنے آیا ہے اس کی روشنی میں بجا طور پر اس عہد کو سیرت نگاری کے ارتقاء سے تعبیر کیا جانا چاہیئے۔ رحمۃ اللعالمین کی اہمیت صرف اپنے موضوع کی عظمت اور مصنف کی علمی قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کا شمار سیرت پر لکھی گئی مقدس کتابوں میں ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کا اہم کارنامہ رحمت اللعالمین کی تصنیف ہے کتاب کی دیگر خصوصیات کے علاوہ اس کی قابل ذکر جو خصوصیت ہے وہ مصنف کا نیا نقطۂ نظر ہے جس میں بالغ نظری، رواداری اور بلند نگاہی جھلکتی ہے۔ رحمۃ اللعالمین کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسے ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

علمی گہرائی تحقیق اور دقت نظر ان کی تصانیف کا نمایاں جوہر ہیں۔ رحمۃ اللعالمین میں قاضی صاحب نے جہاں دوسرے مسلمان سیرت نگاروں کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے وہاں انہوں نے ان سیرت نگاروں کے غلط نظریوں پر بھی بحث کی ہے اس کے علاوہ ان کی کتاب کا سب سے بڑا مقصد مغربی معاندین کے خیالات کا رد ہے۔ آپ نے رحمۃ اللعالمین میں جناب ''سرسید'' کی طرح جدید مغربی کتابوں کی فائدہ مند معلومات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً ''عرب قبل از اسلام'' جو طویل باب ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے یورپین سیاحوں اور جغرافیہ دانوں کے بیانات اور انسائیکلوپیڈیا جیسی مستند کتابوں کے اقتباسات نقل کر کے نفس مضمون واضح کیا ہے غرض کہ قاضی صاحب نے یہ کتاب لکھتے وقت قدیم اور جدید تمام نظریات کو پیش نظر رکھا ہے جس کی مثال ان کی تحریر سے واضح ہے۔ رحمۃ اللعالمین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی سلیمان کا علم رجحان معلومات میں اضافے کا ہے۔ بلاشبہ ذات مبارک کی نسبت جتنی بھی مصدقہ معلومات ہو سکیں وہ فائدہ مند ہیں لیکن قاضی صاحب کو ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ فنی تقاضوں کا بھی خیال ہے۔

سیرت نبوی پر جتنی بھی اردو میں کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں رحمت اللعالمین کو اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے۔ قاضی صاحب نے سیرت نبوی پر مختلف کتابوں سے اچھے انداز میں اقتباسات نقل کئے ہیں اور تاریخ نگاری کا بھی یہی اصول ہے کہ جس موضوع پر بھی تحقیق کی جائے اس موضوع کے متعلق جتنی بھی کتابیں جس قدر زبانوں میں مل سکیں سب کا بے لاگ مطالعہ کیا جائے اور صرف وہی واقعات اخذ کیے جائیں جو تحقیق کے معیار پر پورے اتریں۔ رحمۃ اللعالمین کے مطالعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب قاضی

صاحب کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ انتہائی عقیدت وشفتگی ہے وہاں یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دوران تحریر تحقیق وتوفیق کے آئندہ سے مصدقہ ومستند واقعات کی تفصیل میں نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ قاضی صاحب نے اسلامی کتابوں کے علاوہ غیر مذہب کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے سیرت کے علاوہ دوسرے اہم مذہبی مسائل پر بھی تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔

قرآن کریم کا دوسری کتاب سے موازنہ اور غیر مسلموں کے اعتراضات کے جواب رحمۃ اللعالمین کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نا قابل تردید دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آنحضرت کی ذات اقدس تمام انبیائے کرام کے محاسن جامع ہے۔ رحمۃ اللعالمین میں زبان سادہ، انداز بیان شستہ وشگفتہ اور طرز استدلال علم فہم اور دلچسپ ومتین ہے۔ قاضی صاحب رحمۃ اللعالمین کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

''کافی عرصے سے میری یہ آرزو تھی کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت کتابیں لکھوں جو مختصر متوسط اور مطول ہوں چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کتاب ۱۸۹۹ء میں ''مہد نبوت'' کے نام سے لکھ چکا ہوں اب یہ متوسط کتاب جس کا نام رحمۃ اللعالمین ہے شروع کی ہے میرا ارادہ ہے کہ اسے تین جلدوں میں لکھوں''۔ (168)

''رحمۃ اللعالمین'' قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی اپنی نوعیت واہمیت اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک بے نظیر وبے پایاں تصنیف ہے مصنف نے اس کی تالیف میں اپنی بے پناہ ذہنی کاوشوں کو بروئے کار لایا ہے اور اسے ہر طرح سے ایک جامع ثابت کرنے کا ثبوت دیا ہے اور اس کے لکھنے میں بے حد احتیاط سے کام لیا ہے اس کتاب میں ختم المرسلین کی سیرت مبارکہ ٹھیک ٹھیک اور مکمل اہتمام وانصرام کے ساتھ پیش کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اس کتاب کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں۔

رحمۃ اللعالمین ﷺ کا منہج واسلوب:

سیرت وتاریخ کی کتابوں کی خصوصیت ہے کہ ان کی زبان علم فہم اور سلیس ہونی چاہیے انہیں خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ''رحمۃ اللعالمین'' میں قاضی صاحب نے یہی اصول اپنایا ہے قاضی صاحب نے کسی واحد فرقے کی حمایت نہیں کی بلکہ اس چیز سے بالاتر ہو کر اس کتاب کو لکھا ہے اور اپنی ذاتی رائے اور خیال کو کسی واقعے میں بیان کرنے کے بارے میں استعمال نہیں کیا واقعات کے بیان میں طوالت اور اختیار سے پرہیز کیا ہے۔

بعض مؤرخین ہوتے ہیں کہ وہ تاریخ وسیرت کو بعض شخصی حالات اور بعض حروف وفتوحات اور بعض اہم انقلاب کے بیانات میں محصور کر دیتے ہیں اور ان کے متعلق بعض طویل وبے سروپا قصے اور کہانیاں بھر دیتے ہیں جس سے مقصدیت کافی حد تک مفقود ہو کر رہ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بعض مصنفین سیرت نے فن سیرت کو آنحضرت ﷺ کے فضائل وخصائل اور خاص تاریخی واقعات کے بیان تک محدود رکھا ہے۔ لیکن قاضی صاحب کا طرز تحریر اس کے برعکس ہے کیونکہ انہوں نے اپنی تصنیف ''رحمۃ اللعالمین'' میں انہوں نے رسول کریم کی سیرت مبارکہ کے فضائل وخصائل اور مزید سیاسی وتاریخی واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام اور اس کی مناسبت سے آیات قرآنیہ کے نزول کو بآحسن طریقے سے بیان کیا ہے گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ضمناً ایک پہلو میں قرآن شریف کے بعض مقالات کی تفسیر کا کام دیتی ہے بعینہ کہ سیرت ابن ہشام اور امام ابن قیم کی ''زاد المعاد'' ہے۔

تمہید نگاری:

ایک معیاری اور جامع تصنیف جس کیلئے یہ لازم ہوتا ہے کہ اس کی تمہید اچھے انداز میں خوب صورت طریقے سے کی گئی ہو رحمۃ اللعالمین اس وصف اور معیار پر پوری اترتی ہے اور ان اوصاف حسنہ کے بیان کا پوری طرح خیال کیا گیا ہے محترم قاضی صاحب نے آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک کو لکھنے سے قبل آپ کے شجرہ نسب کے بارے میں مکمل بحث کی ہے۔ اور اس کا آغاز حضرت مسیح سے دو ہزار

سال پیشتر سے شروع کیا ہے اس وقت کے انبیاء اور رسولوں کے بارے میں مکمل حالات پیش کیے ہیں اور ان کے ساتھ پیش آنے والے حالات وواقعات پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ حضرت مسیح سے قبل کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ:

حضرت ابراہیم کی بعثت سے قبل بابل ایک مضبوط حکومت تھی وہاں کے حکمران وقت نے ایک مورتی بنوا کر ایک جگہ اسے نصب کر دیا اور لوگوں کو اس کی پوجا کرنے کا حکم دیا تو اس حاکم وقت کی اصلاح و تعلیم کیلئے اللہ رب العزت نے حضرت ابراہیم کو مبعوث فرمایا۔ آنحضور کے نسب سے متعلق بحث کرتے ہوئے ''رحمۃ اللعالمین'' میں وضاحت کرتے ہیں کہ آپ کا شجرہ نسب ۹ واسطے سے حضرت نوح علیہ السلام سے جاملتا ہے۔

اس کے علاوہ ''رحمۃ اللعالمین'' کی ایک خصوصیات یہ بھی ہے کہ قاضی صاحب نے عبارت میں ایک خاص ربط اور تسلسل برقرار رکھا ہے اور مقدمے میں حضرت ابراہیم سے لیکر آنحضورﷺ تک تمام حالات وواقعات کو ترتیب سے پیش کیا ہے۔ یعنی حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ حضرت ابراہیم کا ان دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ کیسا سلوک تھا اور حضرت ابراہیم نے دونوں کو کن کن علاقوں میں بھیجا۔ رحمۃ اللعالمین کی یہی خصوصیات وتصہید نگاری اسے دوسری تمام کتب سیر تے سے ممتاز بناتی ہے۔

''رحمۃ اللعالمین'' کی یہ خصوصیات اسے سیرت مقدسہ پر لکھی گئی تمام کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کتاب میں قاضی صاحب نے آنحضورﷺ کی زندگی کو کھول کر تفصیلاً بیان کیا ہے۔ خصوصیات نبویﷺ کے متعلق متقدمین کی بھی چند کتابیں ہیں جو اسی زمانہ کے خاص گروہ کے سامنے پیش کرنے کیلئے موزوں وبہتر کہی جاسکتی ہیں۔ قاضی صاحب کا بذات خود بیان ہے۔

''خصائص النبیﷺ کو اگر پوری وسعت کے ساتھ لکھا جائے تو ایک ضخیم دفتر بن جائے لہذا جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ صرف ماحضر کے تحت ہے''۔ (169) قاضی صاحب نے خصائص نبوی کو زیادہ تر قرآن کریم کی آیات کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔

آنحضورﷺ کے جد امجد کے حالات اور ان کا پس منظر:

رحمۃ اللعالمین کی جلد اول میں قاضی سلیمان سلمان نے حضرت محمدﷺ کے آباؤ اجداد کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے ان کی یہ آنحضور سے شدید وابستگی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے تحریر میں بھی کوئی ایسا نقطہ نظر انداز نہیں کیا جس سے ان کی تھوڑی سی بھی کوتاہی ظاہر ہوتی ہو۔ مثلاً جب انہوں نے حضرت محمدﷺ کے جد امجد اور جد ماجد پر بحث کی ہے تو محض سنی سنائی باتوں کو مدنظر نہیں رکھا اور نہ ان سے کام لیا ہے بلکہ سیرت وتاریخ، الہامی کتابوں اور پرانے تذکروں سے بھرپور کام لیتے ہوئے حضرت محمدﷺ کے خاندان کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے دیئے ہوئے تاریخی کوائف اور ثبوت اتنے مستفید ہیں کہ انہیں کسی بھی حوالے سے جھٹلایا نہیں جاسکتا انہوں نے اپنے دلائل کے حق میں زبور وغیرہ جیسی مستند اور مشہور کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔

ذات محمدی کے اوصاف کی بحث:

حضرت محمدﷺ کی ذات اقدس منفرد اخلاقیات کی حامل تھی ان کی سیرت وسرون کیلئے مشعل راہ تھی چونکہ آپ تمام جہانوں کیلئے رشد وہدایت کا پیغام لیکر آئے ہیں۔ اس لئے ان کی ذات پیکر اخلاق ہے اور اسی بات کو قاضی سلیمان سلمان نے بڑی گہرائی کے ساتھ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ان کی مذکورہ کتاب ''رحمۃ اللعالمین'' اصل میں حضرت محمدﷺ کے اوصاف حمیدہ پر بحث ہے انہوں نے حضرت محمدﷺ کی ذات کے تمام پہلوؤں کی مکمل جزئیات بیان کی ہیں حضرت محمد صلعم کے بچپن، لڑکپن، نوجوانی اور بڑھاپا کے تمام حالات بیان کرنے کا اصل مقصد ہی ان کی ذات کے ان اوصاف کا بیان ہے جن کی وجہ سے وہ ایک مبلغ اور ایک انقلابی بنے اور پوری دنیا میں اسلام کو دیکھتے ہی دیکھتے قلیل مدت میں متعارف کرادیا۔ محمد سلیمان سلمان آپ کی ذات کے اوصاف بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

''نبی ﷺ کی زندگی کے مبارک واقعات ہر ملک اور ہر طبقہ کے فرد اور جماعتوں کیلئے بہترین نمونہ اور مثال ہیں''۔(170)

قاضی محمد سلیمان نے آنحضور اکرم ﷺ کی تمام خصوصیات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ کی زندگی کے ایک واقعے کو دل کھول کر بیان کیا ہے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں:

''آنحضرت مویشیوں کو چارہ خود ڈالتے تھے اونٹ خود باندھتے تھے گھر میں میں صفائی خود کرتے بکری کا دودھ خود دوہتے خادم کے ساتھ بیٹھ کھانا کھا لیتے اور خادم کو اس کے کام کاج میں مدد دیتے تھے۔''(171)

قاضی محمد سلیمان نے آپ کے حالات زندگی اور آپ کی ذات کے اوصاف بڑے مدلل اور وضاحت کے طور پر بیان کیے ہیں اور اپنے دلائل صحابہ کرام کے اقوال اور معرکۃ الآرا تاریخ کی کتب کے حوالوں سے بڑے ٹھوس اور جامع انداز میں پیش کئے ہیں۔

حضرت محمد ﷺ کے نام پر بحث:

قاضی صاحب نے رحمۃ اللعالمین جلد سوم میں حضرت محمد کے نام پر تفصیلاً بحث کی ہے اور نام پر بحث کرنے کے بعد نام مبارک کا دوسرے انبیاء علیہ السلام کے ناموں کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ محمد، حمد سے مبالغہ کیلئے ہے یہ اس لئے کہ نبی اللہ تعالیٰ کے ہاں محمود بھی ہیں۔ حضور اکرم کا ذاتی نام محمد بھی ہے اور احمد بھی۔ ہر دو اسمائے ذاتی میں وحدت مادہ کی موجود ہے یعنی حمد سے بنے ہیں۔ واضح ہو کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے کسی نبی کا نام بھی ایسا نہیں پایا جاتا کہ وہ نام ہی اپنے کمالات نبوت کا شاید عدل ہو۔ لفظ محمد پر بحث کرتے ہوئے قاضی صاحب نے مختلف پیغمبروں کے ناموں سے موازنہ کیا ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے نام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آدم کے معنی گندم گون ہیں۔ یہ نام ان کے جسمانی رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ نوح علیہ السلام کے نام کے معنی آرام کے ہیں۔ یعنی باپ نے ان کا آرام وراحت کا موجب قرار دیا ہے۔ اسحاق کے معنی مناحک یعنی ہنسنے والا ہیں۔ یعقوب پیچھے آنے والا، موسیٰ پانی سے نکلا ہوا، یحییٰ عمر دراز۔ اگر ان اسماء پر غور و فکر کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان ناموں میں عظمت روحانی یا نبوت کی طرف ذرا سی بھی اشارت نہیں''۔(172)

قاضی صاحب لفظ محمد کی شان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ مگر اسم محمد کی شان الگ ہے۔

''محمد و احمد کے معانی الگ الگ ہیں کہ وہ محمد ہے جس کی حمد و نعت جملہ اہل الارض والسما نے سب سے بڑھ کر کی ہو۔ اور احمد وہ ہے جس نے رب السموات والارض کی حمد و ثنا، جملہ اہل الارض والسموات سے بڑھ کر کی ہو۔ لہذا اسم پاک علم بھی ہے اور صفت بھی وہ اپنے معانی کے اعتبار سے کمالات نبوت پر دلالت کرتے ہیں یہ خصوصیت جس سے دیگر انبیاء علیہ السلام کے اسماء ساکت و خاموش ہیں۔ رحمۃ اللعالمین کی یہ خصوصیت اسے سیرت نبوی پر لکھی گئی کتب پر فوقیت دلاتی ہے۔

خصوصیات کا دوسرے انبیاء علیہ السلام سے موازنہ:

رحمۃ اللعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی یہ خصوصیات ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ قاضی صاحب نے رحمۃ اللعالمین کی تیسری جلد میں خصوصیات نبوی کا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور ان کا موازنہ دوسرے انبیاء سے کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کن خصوصیات کی بناء پر حضرت محمد ﷺ کو دوسرے نبیوں پر فضیلت ہے۔ ان خصوصیات کو دلائل سے ثابت کیا ہے مثلاً اپنی رائے کی تائید کیلئے وہ آنحضور اکرم ﷺ کی اس حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوں۔

''جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ ۱۔ ابھی ایک ماہ کی مسافت ہو کہ دشمن پر میرا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ ۲۔ ساری زمین میرے لئے مسجد اور پاکیزہ بنادی گئی ہے۔ ۳۔ غنیمت کا مال میرے لئے حلال کر دیا

گیا ہے۔۴۔ مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔۵۔ پہلے نبی اپنی قوم کیلئے خاص ہوتے تھے لیکن میں ساری دنیا کے لئے نبی ہوکر آیا ہوں''۔(173)

خصوصیات نبوی کا باب دو فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں قاضی صاحب نے خصوصیات وجود گرامی پر بحث کی ہے اور ان کا موازنہ دوسرے انبیاء کرام کی خصوصیات سے کیا ہے۔ دوسری فصل میں خصوصیات نبوت جس میں عالم بھی داخل ہیں پر بحث کی ہے۔

خصوصیات کے بیان میں اگر کہیں کسی نے اعتراض یا اختلاف کیا ہے تو قاضی صاحب نے پہلے ان کے اختلاف کو بیان کیا ہے پھر ان کے اعتراض یا اختلاف کا رد قرآنی دلیل سے کیا ہے۔''نبی اکرم ﷺ تو کبھی قبل از نبوت بھی امور جاہلیہ میں سے کسی امر میں الودہ نہ ہوئے تھے لہذا ا کردہ فعل کے غفران کے کیا معنی ہو سکتے ہیں''۔(174)

''زمخشری اور بیضاوی نے ذنب سے مراد معمولی لغزشیں بتلائی ہیں اور بنایا ہے کہ رب العالمین نے ایسی حرکات کو بھی محل لطف وعنایت بنا دیا''۔(175)

قاضی صاحب نے اس اعتراض کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے۔

امام سبکی کا اعتراض ہے کہ ایسی لغزشوں کا بھی ثبوت کچھ نہیں اور بالمقابل اس کے عصمت انبیاء السلام کا مسئلہ مسلمہ ہے انبیاء سے نہ صدور کبائر ہوا ہے نہ صدور صغائر۔ لہذا میرے نزدیک یہ توجیہ درست نہیں ہے۔ متعدد علماء کے اقوال کو دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں مزید معنی بیان کرنے کی گنجائش ہے۔

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کہ الفاظ فتحا مبینا سے مراد مکہ لینا ہی غلط ہے۔ صحیح بخاری ومسلم اور ترمذی میں انس ؓ سے روایت ہے کہ ان کا نزول صلح حدیبیہ کے انجام پر ہوا تھا۔''(176)

ان جملہ امور کو سامنے رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت زیب عنوان میں ذنب بمعنی الزام قوم ہے اور ما تقدم سے مراد زمانہ قبل از ہجرت اور ما تاخر سے مراد زمانہ بعد ہجرت ہے۔

لفظ رحمۃ اللعالمین پر بحث:

قاضی سلیمان منصور پوری''رحمۃ اللعالمین'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''جب میں نے قرآن مجید کی آیت''وما ارسلناک کو ذیب عنوان کیا تو مجھے فوراً خیال آیا کہ قرآن مجید کو دیکھنا چاہیے کہ للعالمین'' کا لفظ کن کن اشیاء یا اشخاص کے متعلق آیا ہے۔''(177)

قاضی صاحب نے رحمت اللعالمین کی جلد دوم میں تفصیلاً''رحمۃ اللعالمین''پر بحث کی ہے کہ یہ لقب کن کن انبیاء کو ملا ہے اور پھر آپ کے حالات بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ رحمۃ اللعالمین کا لقب صرف اور صرف آپ ہی کو ملا ہے اور کسی کو نہیں ملا۔

قاضی صاحب کا بیان ہے۔

''لفظ رحمت ایسا لفظ ہے جس کا استعمال صرف نبی اکرم ہی کیلئے ہوا ہے حضور اکرم کے سوا کسی دوسرے کیلئے نہیں ہوا''۔(178)

قاضی صاحب نے دلائل وشواہد سے ثابت کیا ہے کہ رحمۃ اللعالمین کا لقب صرف آنحضور ہی کیلئے تھا یہ دلائل صرف اور صرف اپنی رائے سے نہیں دیئے اور نہ ہی سنی سنائی باتوں سے دیئے ہیں بلکہ سیرت پر لکھی گئی مستند کتابیں اور الہامی کتابوں (زبور۔ انجیل) وغیرہ سے دلائل دیئے ہیں۔

قاضی صاحب نے رحمۃ اللعالمین کے بارے میں مختلف مسائل بھی بیان کئے ہیں اس باب میں جن مسائل کا ذکر کیا ہے وہ ایسے مسائل ہیں کہ مسلم وغیر مسلم ہر دو برابر ان سے مستفید ہو سکے ہیں۔ ان مسائل کے ترک کر دینے کے بعد تمدن کے قیام اور شائستگی کے وجود کی بقا ہی نہیں رہ سکتی۔ لہذا اس لئے اہل دنیا کو ماننا پڑے گا کہ نبی اکرم ﷺ فی الواقع رحمت اللعالمین تھے۔

مختلف اخبارات کی رائے

ماہنامہ المعارف لاہور (دسمبر ۱۹۶۹ء):

حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مرحوم متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں رحمۃ للعالمین خاص شہرت کی مالک ہے۔ علمی گہرائی، تحقیق اور دقت نظر ان کی تصنیف کا نمایاں جوہر ہے ان کی تصنیفات کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہیں ہر طبقے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور (۷ جون ۱۹۷۶ء):

حضرت مولانا قاضی محمد سلمان منصور پوری بیسویں صدی عیسوی کے جید علماء میں سے گزرے ہیں ان کی کتاب رحمۃ للعالمین نے پورے عالم اسلام سے خراج تحسین حاصل کیا ہے اور سعودی عرب اسلامی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل رہی ہے یہ کتاب اپنے مضامین کے لحاظ سے منفرد مقام رکھتی ہے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور (۱۸ اگست ۱۹۷۶):

قاضی صاحب کی تصانیف کا جواب نہیں لیکن ان میں رحمۃ للعالمین تو انتہائی بلند مقام کی حامل ہے۔ آج تک اس جیسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

رحمۃ للعالمین کا سیرت کی دیگر کتب سے موازنہ

سیرۃ النبی (شبلی نعمانی):

سیرۃ النبی حضرت مولانا شبلی مرحوم کی آخری تالیف ہے جسے وہ اپنے بےوقت وفات کی وجہ سے ختم نہ کر سکے۔ سیرۃ النبی کی پہلی دو جلدوں کے بارے میں بھی جو ان کے قلم سے ہیں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی ہیں جسے مولانا جسے مولانا شبلی نے تالیف کیا تھا۔ (179)

یہ صحیح ہے کہ سیرت النبی کی اپنی عظمت اور اپنا مرتبہ ہے علمی، ادبی اور فنی اعتبار سے شبلی کو کچھ کچھ قاضی مرحوم پر فوقیت حاصل ہے لیکن عشق رسول کے معاملے میں اس قاضی زادہ کا نام شبلی سے پہلے ہی آئے گا جس نے نا مساعد حالات کے باوجود ''رحمۃ للعالمین'' کی تالیف کے سلسلے میں کسی دوسرے شخص یا حکومت سے کوئی مالی امداد نہیں لی۔

سیرت النبی میں انیسویں صدی عیسوی کے مخصوص علمی نظریات اور افکار کا خاص اثر نمایاں ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے بعض رجحانات بھی کسی حد تک کتاب پر چھائے ہوئے ہیں۔ اسلامی لڑائیوں کا شبلی کے زمانے میں ہوا یہ عقیدہ اس دور میں نہایت راسخ اور مستحکم تھا۔ شبلی نے بھی اپنی تصنیف سیرۃ النبی میں اسی اصول کو اپنایا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت پیغمبر تھے۔ سپہ سالار نہ تھے۔ سیرۃ النبی کے سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب ایک لحاظ سے اجتماعی کوشش ہے گویا سیرت النبی کی تالیف کے وقت مصنف ایک فرد واحد نہ تھا بلکہ ایک ٹیم کا کپتان تھا۔ شبلی نے سیرت محمدی پر بہت ہی کم بحث کی ہے بلکہ اس کے برعکس دوسری غیر ضروری بحثوں پر اکتفا کرتے تھے۔

سیرۃ النبی کی البتہ یہ خصوصیت کہ سیرت محمد سے پہلے سیرت نگاری کے اصول وضوابط تمام سیرت پر لکھی گئی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ سیرۃ النبی میں علامہ شبلی کے نظریات پر جگہ جگہ سید سلیمان ندوی نے تنقید کی ہے اور ان میں بہت سے اضافے کئے ہیں۔

سیرت میں یورپ کے معترفین کے جوابات کا مولانا نے کوئی جواب نہیں دیا یا شاید انہیں اپنے نقطہ نظر کو بیان کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سیرۃ النبی کی مقبولیت میں دوسرے علماء کا بڑی حد تک ہاتھ ہے۔ دوسرے مولانا نے اس کو لکھنے سے قبل پورے ملک میں اس کے بارے میں چرچا کیا تھا اور لوگوں سے چندے کی اپیل کی تھی۔ حضرت علامہ شبلی نے اپنی کتاب میں ان لوگوں پر طنز کیا ہے جن نے ان کی

سیرت نگاری کے اصول پر اعتراض کیا ہے بلکہ بعض اوقات تو حد سے بھی بڑھ جاتے ہیں ۔(180)

کتاب میں اکثر جگہوں پر عددی غلطی پائی جاتی ہے کتاب میں اکثر حوالے نہیں دیئے گئے اور دوسری کتب سے پورے پڑھے بغیر حوالوں کے سیرت النبی میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ سیرۃ النبی میں غزوہ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر مصنف مرحوم یا حضرت سید سلیمان ندوی مرحوم سے حضرت کعب بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب الفاظ میں تنقید کی گئی ہے۔(181)

غرض سیرۃ النبی اگرچہ ایک بلند پایہ کتاب ہے لیکن رحمۃ اللعالمین مصنف قاضی محمد سلمان سے اس کا درجہ بعد کا ہے۔

سیرۃ المصطفیٰ (حضرت ابراہیم میر سیالکوٹی):

سیرۃ المصطفیٰ ایک مختصر کتاب ہے جس میں ہادی عالم محمد کے حالات وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے کتاب کی تالیف کے وقت دوسرے فرقوں پر سخت تنقید کی ہے اور لکھتے ہیں انبیاء سابقین کی سیرت تو کجا ان کی کتاب بھی ان کے امتیوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔

سیرۃ المصطفیٰ سیرت محمدی کے لحاظ سے ایک بہتر کتاب ہے لیکن علامہ موصوف نے دوسری کتب سے حوالہ جات اتنے زیادہ نقل کئے ہیں کہ سیرت المصطفیٰ۔ سیرت ابن ہشام اور مغازی کا اردو ترجمہ محسوس ہوتی ہے مصنف نے اس میں بہت ہی مشکل الفاظ (زبان) استعمال کئے ہیں جو ایک عام فہم قاری کی ذہنی پہنچ سے بہت بلند ہیں اس لئے وہ اس کو پڑھنے کے باوجود یہ نہیں سمجھا سکتا کہ مصنف مرحوم بتانا کیا چاہتے ہیں۔ مصنف نے آنحضور اکرم کے حالات میں مختلف فرقوں کے اقوال بھی کتاب میں درج کر دیئے ہیں جو کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ سیرۃ المصطفیٰ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

سیرت مصطفیٰ (مولانا محمد ادریس کاندھلوی):

سیرۃ المصطفیٰ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی کی تصنیف ہے یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اپنی پوری استطاعت اور احتیاط سے اس کتاب کو لکھا ہے۔ لیکن مصنف نے سیرت محمد پر کم اور دوسرے معاملات پر طویل بحث کر دی ہے۔ جو سیرت نگاری کے اصولوں کے منافی ہے۔ مولانا نے آنحضور ﷺ کا جو شجرہ نسب بیان کیا ہے وہ وہی ہے جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے بیان کیا ہے۔

سیرۃ المصطفیٰ میں معجزات نبوی پر اور غزوات نبوی پر مکمل بحث کی گئی ہے جس کی وجہ سے دوسری کتب سیرت کے مقابلے میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے جہاد کے موضوع پر بھی کتاب میں بحث کی ہے جو سیرت محمد کے مضامین میں شامل نہیں ہے۔ لیکن موصوف نے اسے بھی سیرت محمد کا حصہ بنا دیا ہے۔ مصنف نے اعتراضات کا جواب نہایت ہی اچھے انداز میں دیا ہے جو ان کی تحقیق اور علمی گہرائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قاضی سلمان اور مستشرقین:

آج تک یہ بات علم میں نہیں آئی یا اردو ادب میں ایسی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی جس میں مستشرقین کے پیدا کردہ شکوک وشبہات اور الزامات واعتراضات کو یکجا کیا گیا ہو اور پھر ان کے جوابات دیئے گئے ہوں۔ البتہ متفرق طور پر چند الزامات کو سیرت کی کتابوں میں بالعموم اور مولانا شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی اور قاضی محمد سلیمان کی رحمۃ اللعالمین میں بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ تعدد ازواج افکار حدیث نظم قرآن وغیرہ کے بارے میں مفصل مضامین موجود ہیں تاہم حضور اکرم ﷺ کی شخصیت وکردار کے حوالہ سے تمام الزامات یکجا نہیں ملتے۔

قاضی سلیمان ایک مضبوط عقیدے کے مالک تھے اور غیرت مند مسلمان۔ قاضی صاحب نے باور خاص غیر مذاہب کے اعتراضات کا جواب اور یہود ونصاریٰ کے دعاوی کا ابطال کیا ہے۔ عموماً حضور اکرم ﷺ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں سب سے پہلا اعتراض حسب ونسب کے بارے میں ہے۔ قاضی صاحب نے غیر مسلموں کے اس اعتراض کا بڑی وضاحت سے جواب دیا ہے اور ان

کی اپنی کتابوں سے ہی ان کو شرمندہ کیا ہے۔ مثلاً حسب ونسب کے بارے میں تورات، انجیل اور زبور کے حوالہ جات دیئے ہیں۔

دوسرا اعتراض آپ کے نام کے متعلق کیا گیا ہے کہ آپ کا نام محمد یا احمد نہیں تھا بلکہ ماہومٹ تھا بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں کے ساتھ ماھودر یعنی بقول ان کے شہزادہ تاسحکی کا نام تجویز کیا۔ قاضی صاحب نے اس اعتراض کا جواب قرآن مجید سے دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ آپ کا نام مبارک محمد ہی تھا اور اس سلسلے میں مختلف انبیاء علیہ السلام کے اقوال جو قرآن میں موجود ہیں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ (182)

تیسرا اعتراض آپ پر یہ کیا جاتا ہے کہ آپ خود عیسائی تھے خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً رومی کیسا سے تعلق منقطع کر لیا اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب ''اسلام'' کو ایجاد کر لیا۔

قاضی صاحب نے اس اعتراض کے بارے میں قرآن کی آیات رسولاً منکم وہ رسول تم میں سے ہے۔ (۴) کی مثال دیکر ثابت کیا ہے کہ نہ تو آپ عیسائی تھے اور نہ ہی آپ پوپ بننے کی تمنا رکھتے تھے بلکہ آپ کو خدائے بزرگ کی طرف سے تمام دنیا کیلئے نبی کر بھیجا گیا ہے۔ قرآنی آیت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نہیں ہوں میں مگر بشر اور رسول'' (183)

ان اعتراضات کے علاوہ مندرجہ ذیل مزید اعتراضات آپ پر کئے جاتے ہیں۔ کثرت ازدواج اور میل الی النساء۔ عورتوں کے دوست سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن بہت شادیاں کرنے والے تھے۔ لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا۔

تائی بی کے خیال میں آنحضرت محض حقیر عرب تھے ایک سیاسی لیڈر تھے۔ آپ (نعوذ باللہ) راہزنوں قزاقوں کے سردار تھے۔

قاضی صاحب نے ان تمام اعتراضات کا جواب رحمۃ اللعالمین میں وضاحت اور دلیلوں سے دیا ہے۔ مثلاً تعداد ازواج کے بارے میں قاضی صاحب نے ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔ اس وقت عرب میں کثرت ازدواج کا رواج پہلے سے تھا اور کوئی پابندی نہ تھی کہ ایک مرد ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے۔ مستشرقین اعتراض کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے شادیاں زیادہ کی تھیں کیا وہ عقل سے نہیں سوچتے کہ ایک شخص عین جوانی کے عالم میں اپنے سے پندرہ برس بڑی اور بیوہ عورت سے شادی کرتا ہے اگر وہ میل الی النساء ہوتا تو وہ ایسا کیوں کرتا جبکہ وہ جوان تھے اور حضرت خدیجہ بیوہ اور ان سے پندرہ برس بڑی تھیں اور آپ نے پچیس سال تک صرف ایک بیوی سے نباہ کیا اور پھر ان کی وفات کے پانچ سال بعد تک اور کوئی اور نکاح نہ کیا، کیا جو پچیس سال تک ایک عورت سے بناہ کرتا ہے اور پچاس پچپن سال کی عمر میں دوسری تیسری شادی کرتا ہے۔ تو اس میں کوئی میل الی النسا نہیں۔ اس طرح دلیلوں سے قاضی صاحب نے مستشرقین کے اعتراضات کا رد کیا ہے کہ ان کے جواب کے بعد کوئی اعتراض یا شکوک وشبہات باقی نہیں رہتے۔

یہ اعتراض کہ آنحضور اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ غلام اور لونڈیاں بناؤ اس کی کوئی حقیقت نہیں بھلا وہ شخص جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ غلاموں سے اچھا سلوک کرو اور لوگوں سے غلاموں کو خرید کر آزاد کرتا پھرتا ہے لونڈیوں کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ انہیں تعلیم دو ان سے اچھا برتاؤ کرو وہ بھلا یہ حکم کیسے دے سکتا ہے کہ لوگوں کو غلام اور لونڈیا بنایا جائے۔ (184)

قرآن وصاحب قرآن پر اعتراضات اور قاضی سلمان کا رد:

جس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اس وقت بھی سب سے زیادہ مخالفت اہل کتاب (یعنی یہود اور عیسائیوں) نے کی۔ ان کا کہنا اس وقت بھی یہی ہوتا تھا کہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ پر کسی آسیب یا جادو کا اثر ہو گیا ہے یا آپ (نعوذ باللہ) بڑے جادوگر ہیں۔ اور جادو کا کلام پڑھتے اور سناتے ہیں جس کی وجہ سے سننے والے پر جادو کے کلام کا اثر ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ قرآن سوائے پرانے وقتوں کے قصے کہانیوں کے کچھ بھی نہیں۔ اس اعتراض کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف پہلے وقتوں کی کہانیاں ہیں''۔ (185)

موجودہ دور میں بھی سب سے زیادہ مخالفت وتنقید قرآن وصاحب قرآن پر یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے ہو رہی ہے عیسائی پادری کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے یہ کلام کسی عیسائی عالم سے سیکھا تھا۔ قاضی محمد سلمان نے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے کئے گئے ان اعتراضات کے مدلل ومفصل جوابات دیئے ہیں اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید اکرم کا اپنی طرف سے گھڑا ہوا کلام نہیں بلکہ یہ رب العزت کا کلام ہے جو اس نے اپنے نبی پر حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور عیسائیوں کی طرف سے کئے گئے اعتراضات کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ لغت میں اساطیر فسانہ نما قصوں کو کہتے ہیں جن میں حقیقت کم ہو مگر دلچسپی زیادہ ہو۔ کفار عرب جو علوم سے بے بہرہ، خط و کتابت سے عاری، احوال عالم سے بے خبر تھے وہ تو اپنی جہالت اور ناواقفیت کی وجہ سے بہت کچھ قابل ترحم تھے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ ان وحشی بت پرستوں کے ان لفظ کو اہل کتاب نے نہایت پسندیدگی سے دیکھا اور اپنی کتابوں میں بار بار مختلف پیراؤں میں دہرایا ہے۔(186)

قاضی صاحب نے عیسائیوں کے اندر اعتراضات کا جواب انہیں کی مقدس کتابوں سے دیا ہے اور ان کے ان غلط نظریات کو دور کیا ہے مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں قاضی بیان کرتے ہیں۔

بائبل کی کتاب پیدائش کے باب ۲-۳ میں ادم علیہ السلام کی پیدائش۔ باغ عون کا قیام درخت سے پھل کھانے اور باغ سے نکالے جانے کا ذکر ہے لیکن تمام بائبل میں اس بات کا ذکر نہیں کہ گناہ کرنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی معافی بھی قبول ہوئی تھی یا نہیں لیکن قرآان مجید نے ان فضائل کا ذکر کیا ہے جن سے بائبل خاموش ہے"۔(187)

یعنی اس قسم کے فضائل کے بیان کرنے کو یہ لوگ پرانے وقتوں کے قصے کہانیاں کہتے ہیں یہ صرف اور صرف تعصب کی بناء پر ایسے کرتے ہیں حالانکہ حقیقت کو یہ جانتے ہیں۔

تعدد ازدواج پر قاضی سلمان کا نقطہ نظر:

قاضی محمد سلیمان منصورپوری نے مسئلہ تعدد ازدواج پر تفصیلاً بحث کی ہے اور آنحضرت پر عیسائیوں کی طرف سے کئے گئے اعتراضات کا جواب انہیں کی مقدس کتابوں سے دیا ہے۔ مسئلہ تعدادازدواج پر بحث کرنے سے پہلے ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ یورپ اور ایشیاء کے قوانین میں اس کی حیثیت کیا ہے یورپ اور ایشیاء کے قوانین کا مطالعہ کرنے سے یہ علوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہندوستان میں تمام اعلیٰ درجے کی عدالتیں ایک سے زیادہ بیوی کی حیثیت کو قوانین دیوانی اور فوجداری دونوں تسلیم کرتے ہیں اور عدالتوں میں جب دو بیویوں سے زائد پر جائیداد کی تقسیم کے متعلق کوئی مقدمہ پیش ہوتا ہے تو زیادہ بیویوں کے حقوق کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر ڈگریاں بھی دیتی ہیں۔ جبکہ ہندوستان کی ہائی کورٹوں کا یہ متفقہ اور مسلمہ رویہ انگلستان کے قانون ہائی کمی کے بالکل خلاف ہے۔(188)

قانونی نقطہ نظر کے بعد جب ہم مذاہب کا تعداز دواج کے بارے میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مختلف مذاہب میں اس مذہب کے پیش رؤوں کی کئی کئی بیویوں کا ذکر ملتا ہے۔ قاضی سلیمان مختلف مذاہب میں تعداز دواج پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے ہندومذہب پر بحث کرتے ہیں وہ ہندومذہب میں مختلف اوتاروں کی بیویوں کی تعداد کے بارے میں رقمطراز ہیں۔" جب ہم ہندومذہب میں دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اوتاروں کی کئی کئی بیویاں تھیں۔ مثلاً سری رام چندر جی کے والد کی تین بیویاں تھیں سری کرشن جی کی جو اوتاروں میں سولہ کلاں سپورن تھے سینکڑوں بیویاں تھیں"۔(189)

اس طرح جب ہم عیسائی مذہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنے انبیاء کی بیویوں کی تعداد کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں کیا حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کی تین ازدواج تھیں اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار ازدواج تھیں۔ قاضی سلیمان عیسائی مذہب پر بحث کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

''بائبل میں حضرت داؤد کی نو (۹) بیویوں کا ذکر ملتا ہے اور اس طرح حضرت سلمان کی ایک ہزار عورتوں کا ذکر ہے۔'' (190)

آنحضور اکرم ﷺ پر مستشرقین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ (نعوذ باللہ) اپنے نفس کے تابع تھے۔ جس کی وجہ سے آپ نے بہت زیادہ شادیاں کیں حالانکہ اس کی وجوہات بالکل مختلف ہیں۔ ہم جب آنحضور اکرم کے حالات مبارک کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے ۵۰ سال تک صرف ایک بیوی سے نباہ کیا۔ پہلا اس اعتراض میں کہاں تک حقیقت ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اپنی جوانی میں تو صرف ایک بیوی سے نباہ کرتا ہے اور وہ بیوی بھی ایسی کہ جو آپ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں اور اس کے ساتھ بیوہ بھی تھیں۔ اور آپ کی زندگی کا (۵۵ ھ سے لیکر ۵۹) تک کی درمیانی مدت) زمانہ ایسا ہے جب ازواج مطہرات سے حجرات آباد ہوئے تھے اس لئے ہر عقل مند شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان وجوہات پر غور وفکر کرے کہ آپ نے اس عرصے میں زیادہ شادیاں کیوں کی تھیں جبکہ آپ کا اس بارے میں فرمان ہے کہ (مالی فی النساء من حاجۃ)۔ (191) مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں

قاضی سلیمان آنحضور اکرم کی تعداد ازدواج مطہرات کے بارے بیان کرتے ہیں۔

''آنحضور اکرم ﷺ نے جس قدر بھی نکاح کئے ان کی بنیاد فوائد کثیرہ دین اور مصالح جملہ ملک اور مقاصد حسنہ قوم پر قائم تھی''۔ (192)

زیادہ جاہلیت عرب میں یہ رواج عام تھا کہ جب کوئی شخص کسی قبیلے میں شادی کر لیتا تھا وہ قبیلہ اس کی ہر قسم کی امداد کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ قاضی صاحب بیان کرتے ہیں۔

''کہ ام المومنین حضرت صفیہ کے نکاح پر غور کرو کہ اس سے پیشتر جس قدر لڑائیاں مسلمانوں کے ساتھ کفار نے کیں ان میں سے ہر ایک میں یہود کا تعلق یا علامیہ ضرور ہوتا تھا مگر تزویج صفیہ کے بعد یہود مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شامل نہ ہوئے''۔ (193)

اسی طرح ہم جب حضرت ام حبیبہ کے نکاح پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تزویج محمد سے پہلے ان کا باپ ابوسفیان حاروین قریش میں سے تھا اور قوم کا نشان جنگ اس کے گھر میں رکھا ہوتا تھا وہی ابوسفیان جو حضرت ام حبیبہ کے نکاح سے پہلے اس نشان کو لئے ہوئے جنگ میں ہمیں آگے آگے نظر آتا ہے جب آپ کا نکاح حضرت ام حبیبہ سے ہو جاتا ہے تو وہ ہمیں کسی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف فوج کشی کرتا نظر نہیں آتا بلکہ خود بھی اسلام کے جھنڈے کے نیچے آکر پناہ لیتا ہے۔

اسی طرح جب ہم آپ کی دوسری زوجات کے قبائل کے بارے میں غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کے نکاح کرنے سے بعض پورے کے پورے قبیلے مسلمان ہو گئے تھے۔ قاضی صاحب اس بارے میں وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

''اس سے معلوم ہوتا ہے تعداد زوجات سے نبی اکرم ﷺ کا مقصد انبیائے سابقین کی سنت پر عمل کرنے کے علاوہ ضروریات ملکی اور مصالح دینی پر بھی مشتمل تھا'' (194)

ان وضاحتوں کے بعد آپ پر تعداد ازواج کے بارے میں کئے گئے تمام اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں کہ آپ نے زیادہ شادیاں کیوں کی تھیں۔

فصل پنجم:

مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ بحیثیت سیرت نگار

احوال وآثار:

ذیل میں ہم پہلے میر سیالکوٹی کا تعارف پیش کرتے ہیں:

ولادت:

مولانا حافظ محمد ابراہیم میرؒ اپریل 1874ء میں سیالوٹ محلہ میانہ پورہ میں پیدا ہوئے۔(195)

خاندانی حالات:

آپ کے والد قادر بخش میر سیالکوٹ کے رئیس اعظم تھے اور ایک دینی ذہن کی حامل شخصیت تھے۔ اُن کا اٹھنا بیٹھنا بھی اہل علم حضرات کے ساتھ تھا۔ اور صاحب علم وفضل کی انتہائی طور پر دلی قدر کرتے تھے۔ محلہ میانہ پورہ میں موجود مسجد ابراہیمی کے اصل بانی وہی تھے اور انہوں نے یہ مسجد خود ذاتی خرچ سے تعمیر کروائی تھی۔

تعلیم وتربیت:

والدین کی صلاحیت اور دینی تربیت کی وجہ سے مولانا میرؒ نے قرآن مجید گھر پر ہی پڑھا۔ سات سال کی عمر تک نماز اور پارہ عـمّ کی آخری دس سورتیں والد ماجد نے حفظ کرادی تھیں۔ اس کے بعد مشن ہائی سکول گندم منڈی میں داخل ہوئے۔(196)

مولانا غلام حسنؒ کی خدمات میں:

1895ء میں آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کے لئے سیالکوٹ کے فاضل اجل مولانا ابو عبداللہ عبید اللہ غلام حسن سیالکوٹی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے۔ جن سے آپ کو خاندانی تلمذ کا شرف حاصل رہا۔ چنانچہ حضرت مولانا کے دادا مرحوم میاں حیات بخش میرؒ جنہوں نے سو سال سے زیادہ عمر پائی وہ حضرت مولانا غلام حسن کے پردادا کے شاگرد رشید تھے۔ میٹرک کے بعد مرے کالج سیالوکٹ میں داخل ہوئے۔ کالج میں علامہ اقبالؒ آپ کے ہم جماعت تھے۔ ان دونوں کو شمس العلماء مولانا میر حسنؒ جیسا استاذ کامل سے خوب جی بھر کر اکتساب علم کا موقع ملا۔(197)

ابھی کالج میں ایک ہی سال گزرا تھا کہ 1896ء میں خواب میں آپ کی حضرت علامہ مولانا عبدالحکیم سے ملاقات ہوئی۔ بس پھر اکیس بائیس برس کی عمر میں قرآن مجید کے شوق اور جذبۂ تحصیل دینی علم کی بنا پر کالج سے سلسلہ تعلیم منقطع ہوگیا۔(198)

ایک مرتبہ شعبان المعظم کی آخری تاریخ کو آپ کی والدہ ماجدہ کے دل سے ایک خواہش اٹھی کہ کاش میں اپنے خاوند کی بنا کردہ مسجد میں اپنے جگر گوشہ محمد ابراہیم سے تراویح میں قرآن مجید سن سکوں۔ سعادت مند ذہن وفطین بیٹے کی ذہانت وفطانت نے اس کام کو اگلے سال پر اٹھانا گوارا نہ کرتے ہوئے حفظ قرآن شروع کر دیا۔ رمضان المبارک میں روزانہ ایک پارہ یاد فرماتے اور رات کو تراویح میں سنا دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اور کتنی جلدی آپ کی والدہ محترمہ کی خواہش کو پورا فرما دیا۔ مولانا میر مرحوم نے ایک ماہ میں پورے قرآن مجید کو حفظ کرنے کے اس محیر العقول واقعہ کو ھذا من نوادر النعم علی ھذا العبد کے الفاظ سے ذکر فرمایا ہے۔(199)

شیخ پنجاب کی خوشہ چینی کے بعد مولانا میرؒ دہلی میں شیخ الکل مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ سے سند واجازت حدیث حاصل کی۔ 1916ء میں آپ نے تکمیل تعلیم کی۔(200)

مدرسہ دار الحدیث کا اجراء:

1918ء میں سیالکوٹ واپس آ کر دار الحدیث کے نام سے ایک دینی مدرسہ جاری فرمایا۔ کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد 1926ء میں پھر اس کا اجراء ہوا۔ اس مدرسہ میں تقریباً ساٹھ ستر طلباء آپ سے کسب فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک سال کے بعد یہ مدرسہ آپ کی مصروفیات کی بناء پر بند ہو گیا۔(201)

اسی دوران آپ نے ''الھدیٰ'' اور ''الھادی'' کے نام سے رسالے جاری فرمائے۔ لیکن یہ رسالے بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکے۔ ہجوم کار کی بناء پر اپنے دوست حاجی عبدالرحمٰن مرحوم کی خواہش پر آپ نے اپنے مدرسہ کو ''دار الحدیث رحمانیہ'' کے نام سے دہلی منتقل کر دیا۔ اور وہاں کچھ عرصہ خود تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے۔ وہاں سے جب واپس سیالکوٹ تشریف لائے تو یہاں آپ نے منتہی اور فارغ التحصیل طلباء کو حدیث وتفسیر کی بڑی کتب پڑھانا شروع کیں۔ اور ان کی مناظرانہ تربیت کی۔ لیکن تبلیغی دوروں، مناظروں اور جلسوں میں مصروفیات کی بناء پر یہ کام زیادہ دیر نہ چل سکا۔ 1919ء میں جلیانوالہ باغ کے المناک خونی ڈرامے نے آپ کے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس سے متاثر آپ نے ملکی سیاست میں بھر پور حصہ لینا شروع کیا اور ان کی شمولیت مسلم لیگ میں اجمل خان کے زیر صدارت اجلاس میں ہوئی۔ اس جلسہ کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ تھے۔(202)

سیاسی زندگی:

مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی 17-1916ء میں شروع ہوئی جبکہ انہیں اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ وہ مولانا عبید اللہ سندھی کو مواد مہیا کرتے ہیں۔ آپ 21-20 دن گرفتار رہے۔ ابتدائی ایام اسیری سیالکوٹ جیل میں گزرے۔ اس کے بعد آپ کو لاہور منتقل کر دیا گیا۔ اکثر وکلاء حضرات آپ کے عقیدت مند تھے۔ اس لئے بالآخر ضمانت پر رہا ہوئے۔

24-1923ء کے زمانہ تحریک خلافت میں آپ نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر بڑا زور دیا جانے لگا۔ حکومت کی طرف سے متعدد مصالحتی اور رابطہ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ سیالکوٹ میں گرین وڈ سٹریٹ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ سٹیج پر درمیان میں مولانا سیالکوٹیؒ تشریف فرما تھے۔ جبکہ دائیں طرف ڈاکٹر کشن چند اور بائیں طرف مسٹر فلپ بیٹھے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد پر تقریریں فرمائیں۔ ہندوؤں نے اتحاد کے قیام کے لئے مسلمانوں کو کہا کہ وہ گائے کی قربانی نہ کیا کریں۔ مگر مولانا میر مرحوم نے سختی سے ان کی اس شرط کو رد کر دیا اور فرمایا کہ گائے کی قربانی ضرور ہوگی اور ہم کسی مصلحت کی بناء پر اس اسلامی شعار سے پہلو تہی نہیں کر سکتے۔(203)

کانگریسی مسلمانوں نے آپ سے کہا کہ وقتی نزاکت کے پیش نظر گائے کی قربانی سے منع ہو جانا چاہئے لیکن آپ سختی سے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔

خواجہ محمد اقبال ولد وہاب دین، غلام محمد ولد چوہدری فضل دین، مسٹر عزیز اور ماسٹر رشید صاحب (والد ماجد جناب عبدالمجید ڈار ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر) کی موجودگی میں آپ نے جلسۂ عام میں قرآن وحدیث سے گائے کی قربانی کو الم نشرح کیا۔

اس وقت آپ کا لال اور سفید رنگ انتہائی سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا مرحوم کے حامیوں اور ہندوؤں میں لڑائی جھگڑا بھی ہوا۔ گائے کی قربانی اگرچہ اس سال کم ہوئی لیکن بالکل ختم نہ ہوئی۔ مولانا مگر ہمیشہ ہر سال بکرے کی قربانی دیا کرتے تھے اور اس دفعہ انہوں نے خود گائے خرید کر قربانی دی۔ اس پر بہت شور اٹھا لہٰذا رام تلائی سیالکوٹ میں مسلمانوں کا ایک فقید المثال جلسہ منعقد ہوا۔ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی موجود تھے اور فرما رہے تھے ہم نے گائے کی دم پکڑ کر جنت میں جانا ہے۔(انشاء اللہ)

پھر مولانا میر مرحوم نے اس جلسہ میں والنجم اذا ھوی پر ایسی فاضلانہ تقریر فرمائی کہ شاہ صاحب بھی جھوم اٹھے۔ اختتام تقریر پر اٹھ کر فرمانے لگے کہ شاہ جلسہ میں موجود ہے اور مولانا میر کے جوتے اٹھانے میں سعادت سمجھتا ہے۔ مولانا کی تقریر اتنی جامع مفصل اور مدلل تھی کہ کسی قسم کے سوال و جواب کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ اس پر تمام حاضرین جلسہ مولانا کی علمی ثروت پر داد تحسین دیتے ہوئے گھروں کو واپس لوٹے۔

ہوتے ہوئے مصطفیٰؐ کی گفتار مت دیکھ کسی کا قول و قرار

ذوق مطالعہ:

مولانا کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ وسعت مطالعہ میں کم ہی لوگ آپ کے ثانی ہوں گے۔ کتابوں کے ساتھ آپ کو والہانہ عقیدت تھی۔ غنائے خانگی کی وجہ سے کسی کتاب کا حصول آپ کے لئے مشکل نہیں تھا۔ مختلف بلاد و اعصار کی مطبوعہ کتب آپ فوراً حاصل کر لیتے تھے اور مختلف احباب سے کتب سے متعلق استفسار کرتے رہتے تھے۔ آپ کی ہمیشہ یہ خواہش و جستجو ہوتی تھی کہ نئی طبع ہونے والی کتاب سب سے پہلے حاصل کی جاتی تھی۔ (204)

پھر آپ کی یہ عادت تھی کہ آپ کتاب کا بنظر عمیق مطالعہ فرماتے اور کتاب کے حسن و قبح کے بارے میں اپنے تاثرات لکھتے تھے۔ گھریلو آسودگی کی بنا پر آپ کو کسب معاش کی بھی کوئی فکر نہ تھی۔ اس لئے آپ نے خوب تک کر مطالعہ کتب کیا اور بحر علم کی غواصی کی۔ ایسے ایسے نکات اور رموز بیان کئے جو اخلاف کے لئے مینارۂ نور ثابت ہوئے۔ آپ کی نکتہ آفرینی اور رمز شناسی تو ضرب المثل تھی۔ فکر و فن کے علمی نوادرات ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے۔ گویا آپ علم کے جوہری اور کتب کے شناسا تھے۔

آپ کا کتب خانہ برصغیر کے کتب خانوں میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت کا حامل تھا۔ جس میں آپ نے قرآن، علوم قرآن، تفسیر، اصول تفسیر، مختلف زبانوں میں تراجم قرآن، حدیث، علوم حدیث، اصول حدیث، شروح حدیث، فقہ، اصول فقہ، شروح فقہ، تقابل، تصوف، فلسفہ، منطق، علم کلام، صرف و نحو، بلاغت و معانی، لغات، اسماء الرجال، جرح و تعدیل، سیر و سوانح، مواعظ و نصائح، تاریخ اسلام، تاریخ اقوام، علوم جغرافیہ، ریاضی اور فرق باطلہ کی ہزاروں کتب کا ایک نادر ذخیرہ جمع فرمایا۔

علوم و فنون عربیہ و اسلامیہ کا یہ عظیم الشان سرمایہ آج بھی محفوظ ہے اور اپنے جمع کرنے والی شخصیت کی جلالت علمی کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ اس کتب خانہ میں آپ کے مفید مکرم حضرت مولانا پروفیسر ساجد میر نے جدید کتب کا شاندار اضافہ کیا ہے اور روز بروز اضافہ جاری ہے۔ یہ کتب خانہ مسجد ابراہیمی کے ساتھ ملحق ہے اور آپ نے اسے وقف فرمایا تھا۔ بہت سے لوگ اگرچہ اس سے استفادہ کر رہے ہیں تاہم اس کا فیض مزید وسعت کا متقاضی ہے۔ (205)

تبلیغی خدمات و مناظرات:

حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ ایک قادر الکلام، بلیغ البیان، فصیح اللسان مبلغ و خطیب اور اعلیٰ پایہ کے مناظر تھے کہ جن کے منہ سے علم و عرفان کے موتی جھڑتے تھے۔ تلاوت قرآن پاک کا انداز ایسا سہانا اور دلربا ہوتا تھا کہ آیات قرآنی کے مفہوم و مطالب کی منظر کشی محسوس ہوتی تھی۔ اس لفظی منظر کشی میں سامعین پر حقیقی مشاہدہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کسی مسئلہ و بیان کو حاضرین کے ذہن نشین کرانے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک خاص ملکہ سے نواز رکھا تھا۔ آپ کا خطاب معلومات و نکات سے آراستہ اور اسرار و رموز کا ایک بیش بہا گنجینہ ہوتا تھا۔ برصغیر کا شاید ہی ایسا کوئی شہر یا نگر ہو گا جہاں آپ کے خطابات کا غلغلہ بلند نہ ہوا ہو۔ آپ میدان مناظرہ کے نامور شہسوار تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی طرح کوئی مخالف آپ کے سامنے ٹک نہیں سکتا تھا۔ علمی گرفت اتنی مضبوط ہوتی کہ بڑے بڑے مخالف

مناظرین دم بخود رہ جاتے۔میر سیالکوٹیؒ کا نام سنتے ہی ان پر حواس باختگی کا سا عالم طاری ہو جاتا۔آپ نے قادیانیوں،آریوں اور عیسائیوں سے کامیاب اور یادگار مناظرے کئے۔(206)

ان مناظروں کا سلسلہ بہت طویل ہے جس کے تفصیل اگر یہاں لکھی شروع کر دی جائے تو ایک مکمل کتاب جتنا مواد نکل آئے۔ لیکن چند مشہور مناظرات وخطابات درج ذیل ہیں۔

1۔ 6,7 جون 1925ء کو موضع مومال ضلع سیالکوٹ میں احناف سے مناظرہ ہوا۔مولانا میرؒ صدر تھے اور مولانا محمد اسمٰعیل سلفی مناظر تھے۔انہیں آپ نے تربیت دینے کی غرض سے مناظرہ کرنے پر مامور فرمایا تھا۔(207)

2۔ 17 اکتوبر 1946ء آپ نے سیالکوٹ میں ایک شاندار جلسہ عام کا انعقاد کیا جس میں حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ ایڈیٹر ''توحید'' امرتسر،مولانا عبدالمجید خادم سوہدری ایڈیٹر ''مسلمان'' سوہدرہ،حضرت مولانا محمد ایڈیٹر ''محمدی'' اور مولانا حافظ عنایت اللہ اثری وزیرآبادی نے تقاریر کیں۔جلسہ رات گئے تک جاری رہا۔اس بھرپور جلسہ کا یہ فائدہ ہوا کہ عوام کے دلوں میں اہل حدیث سے متعلق جو شکوک وشبہات تھے وہ رفع ہو گئے۔(208)

3۔ 30-28 مارچ 1929ء کو انجمن اہل حدیث کے زیر اہتمام لاہور میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔اس جلسہ میں مولانا میر نے مولانا حشمت علی چکڑالوی سے کامیاب مناظر کیا۔(209)

4۔ 1926ء میں سر گنگا رام ہندو وکیل سے آسٹیریلشیا بنک والی جگہ پر انگریزی میں مناظرہ کیا۔کئی آریہ یہ مناظرہ سن کر مسلمان ہو گئے۔یہ اتنا فیصلہ کن مناظرہ تھا کہ آریہ سیالکوٹ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئے۔اسی سال سلطان پال پادری عبدالحق سے قلعہ پر چھ دن تک مناظرہ ہوتا رہا۔بالآخر عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی۔(210)

5۔ 13-9 اکتوبر 1929ء کو آریہ سماج گجرات نے اپنا جلسہ منعقد کیا۔جس میں انہوں نے مسلمانوں کو چیلنج کیا اور مقابلہ کے لئے للکارا۔اس پر مولانا حافظ عنایت اللہ اثری کے متعلق کہنا شروع کر دیا کہ یہ ہمارے خلاف تو بہت لکھتا بولتا ہے لیکن اب آریوں کے مقابلے میں جرأت نہیں رکھتا۔چنانچہ حافظ صاحب نے میر صاحب کو دعوت مناظرہ دی اور خود آریوں سے شرائط مناظرہ پر بات چیت شروع کر دی۔شرائط مناظرہ میں اختلاف کی بنا پر مناظرہ رک گیا۔اس کے باوجود مولانا اثری صاحب کو چھٹی حس نے بیدار رکھا اور انہوں نے مولانا موصوف کو اطلاع دی کہ اگرچہ مناظرہ رک گیا ہے تاہم آپ ضرور تشریف لائیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی آریہ کی کوئی چال یا شرارت ہو۔چنانچہ مولانا میرؒ تشریف لے آئے۔لیکن مولانا نے اغیار تو کیا اپنے معتمد اور قریبی ساتھیوں کو بھی مولانا کی آمد کی خبر نہ ہونے دی اور آپ کو ایک علیحدہ مخفی جگہ پر ایک مکان میں ٹھہرائے رکھا۔جلسہ کا آخری دن تھا اور ادا ت مغرب کا وقت ہوا چاہتا تھا کہ آریہ کی طرف سے پیغام آیا کہ آپ کی پیش کردہ شرائط پر مناظرہ کرنا منظور ہے اور آج رات ہی مناظرہ ہو گا۔

پہلے آپ کا وقت ہو گا اور بعد میں ہم اپنا مؤقف ثابت کریں گے۔بس پھر کیا تمام شہر میں یہ خبر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔اپنی جماعت کے افراد اور دوسرے مسلمانوں کی پریشانی دیدنی تھی اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔صرف یہی فکر دامن گیر تھی کہ اب کیا ہو گا؟ کیا کیا جائے؟ وقت بہت تنگ ہے اتنی عجلت میں یہ کام نہیں ہو سکے گا۔نامعلوم آج کتنی ندامت اور رسوائی اٹھانا پڑے گی وغیرہ وغیرہ۔اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مرزائیوں نے فائدہ اٹھانا چاہا اور کہا کہ ہمارا مبلغ آیا ہوا ہے اور پرانا مناظر ہے۔سنسکرت میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔وہ حافظ صاحب کی طرف سے مقررہ شرائط پر مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہے۔کچھ اپنے احباب بھی اس بھرے میں آ گئے لیکن حافظ صاحب خاموش رہے اور آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔عام لوگوں کا یہی خیال تھا

کہ یہ خود کھڑا ہوگا۔ حافظ صاحب نے ساج میں مسلمانوں کی طرف سے سٹیج لگوادی اور ضروری کتابیں بھی رکھوادیں۔ عین وقت پر حضرت مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی ؒ سٹیج پر جلوہ افروز ہوئے تو لوگ مجسمۂ حیرت بن گئے کہ آخر مولانا کب سے تشریف لائے ہوئے ہیں؟ غرضیکہ مناظرہ ہوا، خوب ہوا مناظرہ ہونے کا حق ادا ہو گیا۔ آریہ صدر نے مولانا کے طرز بیان انداز استدلال اور طریق استنباط واستخراج کی بے حد تعریف کی بلکہ اس مناظرہ کا یہ اثر ہوا کہ چند دنوں کے بعد آریہ مناظر خود مسلمان ہو گیا۔ اس مناظرہ میں ''ینگ اہل حدیث'' کا قیام عمل میں آیا اور دور دور تک مسلک اہل حدیث کی دھاک بیٹھ گئی۔ (211)

6۔ 20,21 مارچ 1932ء کو بمقام روپڑ ضلع انبالہ میں اہل حدیث اور مرزائیوں کے درمیان مناظرہ ہوا۔ حضرت مولانا میر نے مناظر اہل حدیث کے طور پر مرزائیوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ اس کامیاب مناظرہ کی روداد بھی شائع ہوئی۔

7۔ سیالکوٹ کے کچھ مرزائیوں نے فاضل سیالکوٹی کو مناظرہ کا چیلنج دیا۔ آپ نے مرزائیوں کا چیلنج قبول کر لیا۔ لیکن مرزائی تاب مقابلہ نہ رکھتے ہوئے فرار ہو گئے۔ (212)

27,28 مئی 1932ء کو آپ نے سیالکوٹ میں جلسۂ عام منعقد کیا اور مرزائیوں کے خلاف خوب تقریریں کیں۔

8۔ سیالکوٹ میں مرزائیوں کے ساتھ متعدد مناظرے ہوئے بعض اہل حدیث سے بعض احناف سے اور کچھ عیسائیوں سے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل اور ختم نبوت کا اعزاز کہیے کہ ہر مرتبہ مرزائیوں کو روسیاہی نصیب ہوئی۔ ہر میدان میں مرزائیوں کو شرمناک ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ان پے در پے ذلت آمیز شکستوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مرزائی بالکل بدحواس ہو گئے اور ان کی کمر ہمت ایسی ٹوٹی کہ مناظرے کا چیلنج تو درکنار انہوں نے اپنا سالانہ جلسہ کرنا بھی بند کر دیا۔ شروع شروع میں تو سب مسلمان الب واحد اور جسد واحد کی طرح مرزائیوں کے خلاف متحد اور چوکس تھے لیکن کچھ فرقہ وارانہ اختلافات نے کچھ عرصہ بعد وہ فضا باقی نہ رہنے دی۔

سیالکوٹ میں میونسپل کمیٹی کے تازہ انتخابات میں کچھ خود غرض اور حریص لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کا نظم منتشر ہو گیا۔ اس کی وجہ سے احرار اسلام کا رعب کافی حد تک ماند پڑ گیا۔ قادیانی جماعت نے اس صورتحال کو اپنے مذموم پر از مفاسد و معائب مقاصد کی تکمیل کے لئے نیک شگون سمجھتے ہوئے بغلیں بجائیں اور دوسری بات یہ کہ حضرت مولانا ابراہیم میرؒ ایک ماہ سے قبل سے تبدیلی آب وہوا کے لئے ریاسی وانڈیا میں مقیم تھے۔

مرزائیوں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے فوراً جلسے کا اشتہار شائع کر دیا اور مسلمانوں کو دعوت مناظرہ دی۔ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ بھی بارہ سال پرانے شکاری تاک میں تھی۔ اسد الغابہ کی طرح لپکی اور مرزائی چیلنج کی منظوری کا اشتہار شائع کر دیا۔ (213)

چند دنوں بعد حضرت مولانا میرؒ ریاسی سے تشریف لائے۔ اب مرزائی مناظرہ سے راہ فرار کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ انجمن اہل حدیث کی طرف سے شائع شدہ اشتہار مجریہ 19 مئی 1933ء کا جواب انہوں نے کئی دن بعد 23 مئی 1933ء کو دیا اور اس میں یہ شرط عائد کی کہ مناظرہ تحریری ہوگا۔ اہالیان شہر سمجھ گئے کہ مرزائی مناظرہ کا چیلنج دے کر اب پچھتا رہے ہیں۔

مرزائیوں نے یہ شرائط عائد کیں:

1۔ مباحثہ تحریری ہوگا (حالانکہ مرزائیوں کا جلسہ تبلیغی تھا جیسا کہ اُن کے سابقہ اشتہار سے معلوم ہوتا تھا کہ اس جلسہ میں تمام مضامین تقریری طور پر بیان ہوں گے) یہ کس قدر عجیب بات تھی کہ تقریری مضامین پر جرح و نقد تحریری ہو۔

2۔ ہر اجلاس کے بعد بشرط گنجائش بیان کردہ مضمون سے متعلق معقولیت سے سوال کرنے والے کو پانچ منٹ بمنظوری صاحب صدر دیئے جائیں گے۔ (سوال کرنے والے کو تین گھنٹے کی تقریر کے بعد صرف پانچ منٹ چہ معنی دارد؟ اور پھر وہ بھی بشرط گنجائش) گویا کہ مناظرہ سے پہلوتہی کی کوششیں اور تاب سخن نہ رکھنے کے بہانے تھے۔

3۔ جلسہ بالائے قلعہ ہوگا تا کہ کاشتگان شجر خبیثہ پڈا اور خداوند ان نعمت کے حفظ وامان میں مسلمانوں نے مرزائیوں کی پہلی شرط کو مسترد کر دیا اور جلسے کا بائیکاٹ بھی کر دیا۔ مرزائیوں نے متوقع حاضرین وسامعین کے لئے کافی وسیع وعریض انتظامات کر رکھے تھے۔ جب انہوں نے اپنے منصوبے کو خاک میں ملتے دیکھا تو انہوں نے اپنے لمبے چوڑے انتظامات کرنے پر حسرت اور افسوس کا اظہار کیا۔ ادھر مسلمانوں کی طرف سے اشتہار پر اشتہار کا تانتا بندھ گیا۔ چنانچہ مجبوراً اس شرط پر آ گئے کہ ہم جلسہ کے بعد تقریری مباحثہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جلسۂ مناظرہ کے دو صدر ہوں گے۔ ایک مسلمانوں کی طرف سے اور دوسرا ہماری طرف سے۔ پہلے تو مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ یہ کیا حماقت ہے کہ مجلس ایک ہو اور صدر دو ہوں۔ لیکن مرزائی اس بات پر بضد رہے کہ اس شرط کے بغیر ہم مباحثہ ومناظرہ نہیں کریں گے۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ شکار جانے نہ پائے۔ اُن کی ہر شرط مان کر فرار کی راہیں مسدود کر دیں اور خدا خدا کر کے مباحثہ کے لئے تین چار جون 1933ء کی تاریخیں متعین ہوئیں۔ دو روز میں چار مضمون اور چار مجلس طے پائیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

3 جون 1933ء

پہلی مجلس صبح 8 بجے تا 10 بجے قبل دوپہر	مسلمان مناظر (مجیب ومعترض)
بحث: محمدی بیگم کے نکاح کی پیشگوئی	مولانا احمد دین گکھڑوی
مدعی: قادیانی مناظر	دوسری مجلس شام 5 بجے تا 7 بجے
قادیانی صدر: مولوی علی محمد	بحث: حیات حضرت مسیح علیہ السلام
مسلمان صدر: شیخ عبدالقادر بیرسٹر	مدعی: اہل حدیث مناظر
قادیانی مناظر (مدعی)	مسلمان صدر: شیخ عبدالقادر بیرسٹر
مولوی عبدالرحمٰن گجراتی	مسلمان مناظر: مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی
	قادیانی مناظر (مجیب) مولوی علی محمد

4 جون 1933ء

پہلی مجلس صبح 8 بجے تا 10 بجے قبل دوپہر	دوسری (آخری) مجلس شام 5 بجے تا 7 بجے
بحث: صدق وکذب مرزائے قادیانی	بحث: ختم نبوت
مدعی: قادیانی مناظر	مدعی: اہل حدیث مناظر
قادیانی صدر: مولوی محمد سلیم قادیانی	مسلمان صدر: شیخ عبدالقادر بیرسٹر
قادیانی مناظر: مولوی عبدالرحمٰن بی اے	مسلمان مناظر: مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی
مسلمان صدر: شیخ عبدالقادر بیرسٹر	قادیانی صدر: مولوی عبدالرحمٰن بی اے
مسلمان مناظر (مجیب ومعترض)	قادیانی مناظر (مجیب)
مولانا لال حسین اختر لاہوری	مولوی محمد سلیم (214)

پہلے روز کی پہلی مجلس کے مناظرے میں حضرت مولانا میرؒ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر موجود ہیں اور آپ نے تمہیداً قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت تلاوت کی:

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا"(215)

اور پھر اپنے دعویٰ کی تائید میں درج ذیل دلائل پیش کئے:

(۱) "ينزل عيسى ابن مريم الى الارض فيتزوج ويولد له ويمكث خمسا واربعين سنة ثم يموت فيدفن معي في قبري فاقوم انا و عيسىٰ ابن مريم في قبر واحد بين ابي بكرؓ و عمرؓ "(216)

(الف) حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے۔ زمین پر موجود نہیں ہیں تبھی تو اتریں گے۔ اگر پہلے سے زمین پر موجود ہیں تو "اتریں گے" کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ نیز اس کے بعد "اتریں گے" آپ کی حیات کو متضمن و مستلزم ہے۔

(ب) ثم یموت سے ظاہر ہے کہ آپ نزول کے بعد 45 سال دنیا میں رہ کر فوت ہوں گے۔ اب چونکہ نہ تو عیسیٰ علیہ السلام اترے ہیں اور نہ ہی انہیں پینتالیس سال گزرے ہیں۔ اس لئے فوت بھی نہیں ہوئے۔

(ج) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آکر نکاح کریں گے صاحب اولاد ہوں گے۔ واضح ہو کہ اس حدیث سے مرزا قادیانی نے محمدی بیگم سے نکاح کرنے اور اس سے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ (217) لہٰذا یہ حدیث مرزا کے نزدیک بھی صحیح ہے۔

(د) (فيدفن معي في قبري) سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پہلے وفات پانے والے ہیں جبکہ عیسیٰ علیہ السلام بعد میں۔ نیز چونکہ نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ تک تو عیسیٰ علیہ السلام فوت نہ ہوئے بلکہ زندہ ثابت ہوئے۔

(۲) روضہ اطہر میں ابھی تک ایک قبر کی جگہ موجود ہے۔

(۳) قرآن مجید میں ہے:

"وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا" (218)

استدلال:

(الف) لیومنن مستقبل کے لئے ہے کہ یہ بات آئندہ وقوع پذیر ہوگی۔

(ب) بہ اور موتہ ہر دو جگہ مجرور ضمیریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹائی گئی ہیں۔

(ج) اس جگہ اہل کتاب سے وہ یہودی مراد ہیں جو آپ کے نزول کے وقت حاضر ہوں گے۔

(د) جو یہود آپ کے نزول کے وقت آپ پر ایمان لائیں گے۔ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن ان کی رسالت پر ایمان لانے کی گواہی دیں گے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ چونکہ ابھی تک نہ تو حضرت عیسیٰؑ نازل ہوئے تھے اور نہ سب یہود آپ کی رسالت پر ایمان لائے تھے۔ اس لئے آپ ابھی تک فوت نہیں ہوئے۔ اس نتیجہ کی تائید میں آپ نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ترجمہ اور حاشیہ ضمیمہ انجام۔ آتھم از مرزا قادیانی، فصل الخطاب از حکیم نور الدین بھیرویؒ، براہین احمدیہ از مرزا قادیانی کی عبارات پیش کیں۔ حضرت کی اس تقریر پر سامعین پر ایک وجد کی سی کیفیت جاری تھی اور وہ آپ کی پیش کردہ ایک ایک دلیل و استدلال پر ہدیہ تحسین و تبریک پیش کررہے تھے۔

مولانا کی اس تقریر کے جواب میں قادیانی مناظر نے بے قاعدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مولانا کے اٹھائے ہوئے نکات کا جواب تو نہ دیا لیکن زائد از بحث ادھر ادھر کی باتیں کیں اور دلائل حیات مسیح پر شہادت دلائل جرح کرنے کی بجائے حق نقض و منع کا دعویٰ کیا اور تمام تر کوشش یہ کی کہ بحث کو خلط ملط کر دیا جائے۔ بہر حال مولانا نے قادیانی مناظر کی فیصلہ کن شکست کے لئے رشید یہ کنز العمال بر حاشیہ مسند امام احمد مرزا قادیانی کی کتب براہین احمدیہ، ازالہ اوہام، تحفہ قیصریہ، فریاد درد، ضرورت الامام، مواہب الرحمٰن، ریویو، کتاب الفصل از علامہ بن حزمؒ

ترجمہ شاہ ولی اللہ، تفسیر فیضی، تفسیر خازن، مرقات از ملا علی قاری شرح عقائد نسفی اور حاشیہ خیالی از مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حوالوں کی بھرمار کردی اور جابجا قادیانی مناظر کے غلط طرز استدلال اور علمی خیانتوں کو طشت ازبام کردیا۔ مرزائیوں کے چہرے ترھقھم ذلۃ کی تصویر بنے ہوئے تھے اور ذلت اور رسوائی کے باعث گردن جھکائے ہوئے تھے۔ جبکہ فضا مسلمانوں کے نعرہ ہائے تکبیر سے گونج رہی تھی۔ (219)

دوسرے روز کی دوسری اور آخری مجلس مناظرہ میں مولانا سیالکوٹیؒ نے حمد و صلوٰۃ کے بعد ختم نبوت کا دعویٰ پیش کیا اور اس آیت کی تلاوت کی۔

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" (220)

پھر آپ نے حضرت شاہ رفیع الدین کے ترجمے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حاشیے اور لغت کی کتابوں لسان العرب، التہذیب، امام بغوی کی تفسیر، بخاری، مسلم، ترمذی، منتہی الادب، مصباح کتب مرزا قادیانی، ازالہ اوھام خط مرزا مطبوعہ الحکم، آئینہ کمالات، ایام الصلح، حقیقت الوحی، حمامۃ البشریٰ، فیصلہ آسمانی، نجم الھدیٰ، فتح الاسلام اور انجام آتھم سے خاتم اور معنیٰ ختم نبوت کو روز روشن کی طرح آشکار کر دیا۔ جب مولانا یہ دلائل پیش فرما رہے تھے تو مرزائی مناظر کی حالت دیدنی تھی۔

مولانا کی پیش کردہ قرآنی، حدیث، لغوی دلائل اور شہادات ائمہ تفسیر و حدیث و لغت و اقوال و عبارات کے جواب میں ناحق اجرائے نبوت کے دلائل بیان کرنا شروع کئے۔ نقض کرنے یا تصحیح کرنے کی بجائے کم علمی اور بداعتقادی پر مبنی چند شبہات کو بطور دلائل پیش کیا۔ چنانچہ مولانا میر نے جواب الجواب کے طور پر قرآن مجید کی اُن تمام آیات کی مستند تفاسیر سے تفسیر پیش کی جو قادیانی مناظر نے پیش کی تھیں اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں خود مرزا کی اپنی تصنیف حقیقۃ الوحی صفحہ 154، آئینہ کمالات صفحہ 177، ازالہ وھام صفحہ 19، شہادۃ القرآن، چشمۂ معرفت، سرمہ چشم آریہ، انجیل برنباس، ایام صلح، تفسیر بغوی کشاف، معالم التنزیل، کنزالعمال، فتح الباری عینی شرح بخاری سے شہادات پیش کر کے اپنے مؤقف کو ثابت کرنے کا حق ادا کر دیا۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ قادیانی مناظر نے مولانا کا پیش کردہ حوالہ از فتح الباری دیکھنے کے لئے کتاب طلب کی۔ اگرچہ مولانا میرؒ سے مولانا احمد دین گکھڑوی نے کتاب انہیں نہ دینے کی گزارش کی لیکن مولانا نے کتاب اُن کو دے دی۔ چند دنوں کے بعد مولانا نے جب فتح الباری کو دیکھا تو متعلقہ ورق واقعی پھاڑ لیا گیا تھا۔

مجالس مناظرہ کی مکمل روئیداد بنام کشف الحقائق انجمن اہل حدیث سیالکوٹ نے مختلف علماء کی تصدیقات کے ساتھ 1933ء میں شائع کی تھیں۔

8۔ میں نے کشف الحقائق کا ہی ملخص پیش کیا ہے۔ (221)

9۔ 34-1933ء میں عیسائیوں نے مرے کالج سیالکوٹ میں مرزائیوں کے دانت کھٹے کردیئے اور عیسائیوں نے فخریہ طور پر اعلان کیا کہ ہم نے مسلمانوں کو زیر کردیا ہے اور اُن کو جھوٹا ثابت کردیا ہے۔ حضرت میرؒ نے مغرب کی نماز مرے کالج میں جا پڑھی اور آدھ گھنٹہ انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے عیسائیوں کو للکارا کہ تم نے مسلمانوں کو نہیں مرزائیوں کو شکست دی ہوگی۔ مرزائی مسلمان نہیں ہیں۔ تم نے اسلام پر حملہ کیا ہے لہٰذا میں مقابلے کے لئے آیا ہوں۔ اس پر عیسائی پادری نے فرار ہی میں عافیت سمجھی اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ (222)

10۔ 7-6 نومبر 1954ء کو موضع مراکیول ضلع سیالکوٹ میں اہل تشیع اور اہل سنت کے درمیان اختلافی موضوعات حضرات خلفائے راشدین اور اہل بیت کے درمیان محبت و مؤدت، قضیۂ باغ فدک، تزویج ام کلثوم، آنحضرت ﷺ کی اولاد از بطن مبارک حضرت خدیجہؓ جنازہ سرور کائنات کی نظر میں، ائمہ اہل بیت کی روایات کا اعتبار، پر دو دن اور ایک رات میں ساڑھے چار یا پانچ گھنٹہ میں تین تقریریں کیں اور ایسی تحقیق انیق پیش کی کہ مخالفین کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔

الفضل ما شهدت به الاعداء حضرت نے یہ تمام تقریریں الکواکب المضیہ الاذالۃ شبہات الشیعہ کے نام سے ایک کتاب میں شائع کردی تھیں۔ (223)

تلک عشرۃ الکاملہ والدینا مزید

مولانا ابراہیم میر کا سفر آخرت:

مولانا مرحوم بروز جمعرات بتاریخ 12 جنوری 1956ء بوقت پانچ بجے شام داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ (224) انا للہ وانا الیہ راجعون۔اُن کا دَم نیازمندوں کے لئے غنیمت تھا۔موصوف جماعت اہل حدیث کے نامور عالم باعمل تھے۔ بہت سی کتب کے مصنف تھے۔

مرحوم نہس مکھ اور مرنجان مرنج مزاج کے مالک تھے۔ ہر فرقہ کے لوگوں سے ملتے تھے۔ مزاج میں تصوف کی چاشنی تھی، موذن تھے، ایک دفعہ ایک صاحب نے دفتر میں سراج الائمہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا نام بے ادبی سے لیا تو آپ اس پر سخت ناراض ہوئے اور ان کے مناقب پر ایک گھنٹہ تقریر فرماتے رہے۔ قیام پاکستان سے پہلے جب مسلم لیگ کو نئی زندگی ملی تو آپ اس وقت کلکتہ میں تھے۔ مسلم لیگ کو مستحکم کرنے میں بڑا کام کیا۔

آہ! جماعت اہل حدیث کے اکابر علماء میں سے غالباً یہ آخری ہستی تھی جو اپنے محبوب حقیقی سے جا ملی۔ مولانا کی اولاد نہیں تھی ہاں البتہ شاگردان رشید کا سلسلہ بہت وسیع تھا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں سے آپ کی بیوہ تھیں۔ یا مولوی ظفر اقبال وڈاکٹر ریاض قدیر صاحب اور ماسٹر عبدالقیوم صاحب، ان کے علاوہ آپ کے شاگردان رشید مولانا اسمٰعیل گوجرانوالہ، مولانا محمد عبداللہ ثانی امرتسری (جھڑانوالہ)، حافظ محمد شریف سیالکوٹی اور حکیم محمد صادق ہیں۔ عاجز دست بدعا ہے کہ اللہ کریم مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

13 جنوری 1956ء جمعہ کے بعد تین بجے حضرت مرحوم کا جنازہ اٹھایا گیا اور لاتعداد لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ جنازہ کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے اور ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک بانس کے ذریعے بڑی مشکل سے بیک وقت تیس تیس چالیس چالیس آدمی جنازہ کو کندھا دیتے تھے۔ جنازہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مولانا کی نیکی وتقویٰ کا دامن کتنا وسیع ہے اور ان کا حلقہ اثر کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ نماز جنازہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی مدظلہ العالی نے پڑھائی اور ایک عظیم ہجوم نے آپ کی متابعت میں نماز جنازہ ادا کی اور پانچ بجے شام علم وعمل کا یہ خزانہ سیالکوٹ میں عید کے میدان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آسماں تیری لحد پہ شبنم فشانی کرے

تصانیف:

حضرت مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی جہاں ایک فصیح وبلیغ خطیب میدان مناظرہ کے بطل جری اور غواص بحر العلوم الاسلامیہ تھے وہاں آپ صاحب طرز ادیب کثیر التصانیف اور یگانہ روزگار مصنف بھی تھے۔ آپ کے قلم کے استعمال کو ایک خاص سلیقہ ودیعت تھا۔ کسی ایک موضوع کو لے کر اُس پر اس طرح سے لکھا کہ مالہ ماعلیہ کا حق ادا ہو گیا۔ اس طرح موضوع کو دلائل اور براہین سے آراستہ وپیراستہ دیکھ کر آپ کی وسعتِ علم اور جودت طبع کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔

آپ نے جو تحریری کارنامے سرانجام دیئے اُن میں سے جو سیرت نبوی سے متعلقہ ہیں اُن کا مختصر سا تعارف درج ذیل سطور میں دیا گیا ہے۔

سلم الوصول الی اسرار اسراء الرسول ﷺ:

یہ کتاب 48 صفحات پر مشتمل ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے نبی اکرم ﷺ کے معراج جسمانی کا انکار کیا ہے کیونکہ اُسے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفع الی السماء کے انکار میں اس کی ضرورت تھی۔

کتاب ہٰذا مرزا کے اس گمراہ کن عقیدہ کے جواب میں تالیف کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ایک مقدمہ ایک وصل اور دو فصلیں ہیں۔

مقدمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بالخصوص انبیاء علیہم السلام روحانی وجسمانی قوت اور استعداد وخلقت کے لحاظ سے دیگر انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ وصل میں آیات قرآنی: ''سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا ''(225) سے متعلق مرزا کے مغالطات کا رد کرتے ہوئے بلند مرتبہ توضیح وتشریح اور تفسیر کی گئی ہے۔ فصل اول میں کتاب وسنت کے دلائل وبراہین واقوال ائمہ وعلماء امت سے معراج جسمانی کو ثابت کیا ہے اور فصل ثانی میں منکرین ومعترضین معراج جسمانی کے جملہ وارد کردہ اعتراضات وشبہات کا بطریق احسن کافی معقول جواب دیا گیا ہے۔(226)

اخلاق محمدیؐ:

یہ کتاب 126 صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب ہذا دو مقدموں اور ایک باب پر مشتمل ہے۔ عیسائیوں کی طرف سے صاحب خلق عظیمؐ پر بے جا اور بیہودہ اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ پہلے مقدمہ میں مراتب سعادت وشرف اور دوسرے مقدمہ میں روایت علم حدیث پر قابل قدر بحث کی گئی ہے اور باب میں نبی اکرم ﷺ کی عبادات میں انہماک اور تعظیم واجلال الٰہی میں ہمہ وقت اور ہمہ جہت لگے رہنا اور قائم رہنا بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں عبادات بدنی ومالی دلی تفکر اور ذکر قلبی کی وضاحت انتہائی مؤثر پیرائے میں کی گئی ہے۔(227)

عصمت انبیاء:

یہ کتاب 120 صفحات پر مشتمل ہے۔

عیسائیوں کی طرف سے ''بے گناہ نبی'' ایک رسالہ لکھا گیا ہے۔ بعدازاں پادری اکبر مسیح ساندہ صوبہ آگرہ کی کتاب ''انکار عصمت انبیاء'' شائع ہوئی۔ ان دونوں مذموم کتابوں میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور نبی اکرم ﷺ کو (معاذاللہ) گناہ گار لکھا۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بے گناہ ثابت کیا۔

کتاب ہذا میں جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت یعنی ہر قسم کے گناہ سے پاک ہونا ثابت کیا گیا ہے اور عیسائی کتب کے مدلل جوابات دیئے گئے ہیں۔(228)

عصمت النبی ﷺ:

یہ رسالہ 12 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ عیسائیوں کے ان اعتراضات کے رد میں ہے جو انہوں نے جناب سرور کائنات ﷺ پر کیے تھے اور قصہ الغرانیق العلی کا عقلی ونقلی دلائل سے ابطال کیا گیا ہے۔ جس قصہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ (معاذاللہ) ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے بتوں کی تعریف کی تھی۔ نیز آپ ﷺ کے فضائل وکمالات سورۃ نجم کی روشنی میں آشکار کیے گئے ہیں۔(229)

سراجاً منیراً:

یہ کتاب 128 صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب ہذا مولانا میرؒ کے ایک دوست ماسٹر محمد حسین کی خواہش پر لکھی گئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے فیض وبرکت کی مناسبت سے کتاب کا نام ''سراجاً منیراً'' رکھا گیا ہے۔ کتاب میں برکات درود شریف، درود شریف پڑھنے کے طریقے، طریقت وشریعت کی وضاحت، کثرت استغفار، نبی اکرم ﷺ کی برکات، حضرات انبیاء کرام کے استغفار، ازواج النبی ﷺ اور ذکر الٰہی جیسے موضوعات پر پُرسیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔(230)

زاد المتقین:

یہ رسالہ 48 صفحات پر مشتمل ہے۔

اس رسالہ کا مکمل نام "زاد المتقین مشتمل بر احوال امہات النبی الامین وفضائل زواجہ امہات المومنین" ہے اور اس میں نبی اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ آپ کی رضائی ماؤں اور آپ کی ازواج مطہراتؓ کے حالات واخلاق اور تقویٰ وغیرہ کا بیان ہے۔ (231)

جلد اول: سیرت المصطفیٰ ﷺ کا تعارف:

یہ کتاب 200 صفحات پر مشتمل ہے۔

فن سیرت میں بے مثل کتاب ہے۔ اس میں سے بہت سے مباحث ایسے ہیں جن سے متعلق دیگر کتب سیرت بالکل خاموش ہیں۔ مثلاً نبی اکرم ﷺ کے آباؤ اجداد اور اُن کے مذہب کی تحقیق کہ وہ مشرک نہ تھے بلکہ دین ابراہیمؑ پر قائم تھے۔ دایہ حلیمہ سعدیہ کے گھر میں پرورش پانے کے بعض واقعات، آپ کی رضائی ہمشیرہ کی لوریاں آپ کے والدین حضرت عبداللہ اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ کے حالات اور یہ کہ وہ بھی دین ابراہیمی پر قائم تھے۔ آپ کی چچی اور حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہ اسدیہؓ کے حالات اور اُن کا نبی اکرم ﷺ کی پرورش کرنا جیسے جملہ واقعات وحالات۔ اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ کے فضائل وخصائل اور سیاسی وتاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام اور اُس کے مناسب حال آیات قرانیہ کا نزول ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ کی بعثت سے اصل مقصود اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب ضمناً قرآن مجید کے بعض مقامات کی تفسیر کا کام بھی دیتی ہے۔ جس طرح کہ سیرت ابن ہشام اور امام ابن قیمؒ کی کتاب "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" کا انداز ہے۔ جلد اول اخبار "اہل حدیث" امرتسر میں بالاقساط مسلسل شائع ہوتی رہی۔ (232)

جلد دوم سیرت المصطفیٰ ﷺ:

یہ کتاب 208 صفحات پر مشتمل ہے۔

جلد دوم: غار حرا میں عطا نبوت سے غار ثور میں سفر ہجرت تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ یعنی رمضان 1ھ نبوت سے 3 ربیع الاول 13ھ نبوت تک کے جملہ حالات وواقعات سیرت اس کتاب میں سمودئے گئے ہیں۔ انداز تصنیف یہ ہے:

اول: قرآن مجید کی سات آیات میں نبی اکرم ﷺ کی ساری تبلیغی زندگی کے سب عنوانات ذکر کر کے اُن آیات کے مطابق واقعات و حالات نبویہ کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

دوم: حالات وواقعات نبویہ کے متعلق جو قرآنی آیات نازل ہوتی رہیں اُن کے ساتھ ان واقعات کی حقیقی مناسبتیں دلنشین انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ گویا کہ تفسیری معلومات کی بھی حامل کتاب ہے۔

سوم: مخالفین اسلام (آریہ، عیسائی، خصوصاً سر ولیم میور) نے بعض واقعات کے متعلق جو اعتراضات یا غلط بیانیاں کی ہیں اُن کا بھرپور جواب دیا گیا ہے۔

چہارم: بعض دیگر فضلاء ہم عصر اور علمائے دہر جنہوں نے اردو زبان میں سیرت نبوی پر کتب لکھی ہیں اور اُن سے بتقاضائے ضعف بشری بعض مقامات پر کچھ تسامحات ہو گئے ہیں اُن کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

پنجم: کتاب ہذا میں بہت سے ایسے ضروری مباحث ہیں جن پر دیگر مصنفین نے قلم نہیں اٹھایا۔ کتاب کے شروع میں فاضل جلیل عالم نبیل شیخ یوسف عبداللہ الغزاوی المصری کا "العقیدہ المنظومۃ" جو انہوں نے تقریظ کی صورت میں لکھا ہے مولانا میرؒ کے تبحر علمی کے اعتراف کے لئے کافی ہے۔ (233)

وہ نبی اور عہد کا رسولؐ:

یہ چھبیس صفحات پر مشتمل ہے۔مولانا میرؒ نے جب سورۃ ''البینۃ'' کی تفسیر لکھی تو اس میں ضمناً بعض اُن بشارتوں کا ذکر آ گیا جو نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق کتب سابقہ میں مذکور ہیں۔

آپ کے ایک عقیدت مند حکیم عبدالرحمٰن لقمانی وزیر آبادی نے اشتیاق ظاہر کیا کہ اگر اس حصہ بشارات کو مستقل طور پر کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو بہت مفید ہوگا۔لہٰذا مولانا نے نظام آباد (متصل وزیر آباد) میں اس کتاب کو شروع کیا اور ''وہ نبی اور عہد کا رسول'' کے نام سے یہ تالیف لطیف مکمل کی۔آپ نے بائبل کتب سیرت واحادیث اور ملک عرب کے تاریخی وجغرافیائی سندات سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُن جملہ بشارات کے مصداق صرف اور صرف محمد ﷺ ہی ہیں۔

انجیل کی کتاب استثناء کی بشارت:

''خدا سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک ''آتشی شریعت'' اُن کے لئے تھی کو مدار گفتگو بنایا گیا ہے''۔

فاران اور دس ہزار قدوسیوں کے تحقیق کے لئے تاریخ عرب اور فتح مکہ جیسے مباحث پر بلند پایہ تحقیقی مواد شامل ہے۔اس موضوع پر یہ رسالہ ایک انمول اور نادر دستاویز ہے اور مسیحی علماء آج تک اس کا جواب لکھنے سے عاجز ہیں۔(234)

ختم نبوت:

اس کے 32 صفحات ہیں اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے رسالہ ہذا ختم نبوت سے متعلق ہے اور آیت قرآنی الم تـر الـی الذین اوتو نصیباً من الکتاب کی شاندار علمی وتحقیقی تفسیر ہے اور ایک نئے انداز سے ختم نبوت کو پیش کیا گیا ہے۔(235)

تاریخ نبویؐ:

سیرت النبی ﷺ پر ایک مختصر اور جامع کتاب ہے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ کتاب ہذا ''رحمۃ للعالمینؐ'' از قاضی سلیمان منصوری اور ''سیرت النبیؐ'' از مولانا شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی سے بھی پہلے اشاعت پذیر ہوئی۔(236)

اصلاح عرب:

نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل خطۂ عرب کی حالت انتہائی ابتر تھی۔قتل وغارت،شراب نوشی،لوٹ مار،چوری،جوا،باہم صدیوں تک لڑائی،عورت کی تذلیل،بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا،بتوں کی پوجا و دیگر صدہا برائیاں ان میں راسخ ہو چکی تھیں۔تہذیب نام کی کوئی چیز نہ تھی۔شرافت ایک کمزوری بن چکی تھی۔اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی انقلاب آفرین تعلیمات نے صدیوں کے بگڑے ہوؤں کو ایک منظم ومتحد اور مہذب قوم بنا دیا۔اس تفصیل وتشریح کے ساتھ ساتھ تاریخ عرب پر محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔(237)

حبیب خدا:

یہ ایک غیر مطبوعہ قلمی کتاب ہے۔

پورا نام ''اوجز السیر فی احوال سید البشر'' یعنی کتاب مستطاب حبیب خدا صلوٰت اللہ علیہ وسلامہ ہے۔آپ کا ارادہ تھا کہ اس کتاب میں مختصر طور پر حضور اکرم ﷺ کی پوری حیات طیبہ سن وار ولادت مبارک سے وفات تک چھوٹے بچوں اور کم علم مرد خواتین کے لئے آسان پیرائے میں لکھ دی جائے تاکہ وہ اسے تھوڑے وقت میں یاد کر کے آپ ﷺ کے حالات سے واقف ہو جائیں لیکن آپ صرف ''تاریخ ولادت وخاندان'' سے ''حضور کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح'' تک ہی لکھ سکے۔(238)

العجالة الخضريه فی جمع الرساله و البشريه:

یہ کتاب 124 صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب کس طرح مرتب ہوئی یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ سیالکوٹ میں ایک مولوی عبدالغنی تھے جو انتہائی غالی اور متشدد قسم کے بریلوی تھے۔ انہوں نے اہل حدیث اور دیوبندی حضرات کے خلاف ایک زبردست مخالفانہ اور معاندانہ محاذ کھولا اور یہ کہنا شروع کیا کہ یہ دو گروہ نبی اکرم ﷺ کو بشر کہتے ہیں۔ اس لئے یہ سب کافر ہیں۔ مولوی صاحب کے اس پرچار نے ایک فتنہ کی صورت اختیار کر لی۔ اس پر پولیس انسپکٹر احمد یار خاں صاحب نے ہر دو فریق کے سرکردہ افراد کو قلعہ پولیس اسٹیشن پر بلایا۔ حضرت مولانا میرؒ سیالکوٹی ان دنوں علیل رہتے تھے۔ اس قلعہ کی مجلس میں جانے کا کوئی ارادہ تو نہ تھا لیکن آپ کے دو مخلص ساتھیوں مستری فضل دین ریکھی اور ملک محمد صالح نے آپ سے گزارش کی آپ کا اس مجلس میں جانا از حد ضروری ہے۔ خواہ اس کے لئے کچھ تکلیف گوارا کرنی پڑے۔ لہٰذا آپ نے ان ساتھیوں کی فرمائش کو رد نہ کیا اور آپ باوجود علالت طبع اس مجلس میں شریک ہوئے۔ وہاں آپ کی مولوی عبدالغنی سے پوری بات ہوئی۔ جسے حاضرین نے باشتیاق تمام سماعت کیا۔ چونکہ یہ گفتگو انتہائی معلوماتی اور پرمغز اور اس موضوع پر سیر حاصل تھی لہٰذا آپ نے اسے مذکورہ نام سے شائع کیا۔

کتاب کے ابتدائی حصہ میں بتایا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پیشتر بھی مختلف انبیاء کرام کے متعلق لوگ مختلف قسم کے مغالطوں کا شکار تھے۔ کچھ لوگوں کا مؤقف یہ تھا کہ جو نبی ہو وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ اور کچھ لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ جو بشر ہو وہ نبی نہیں ہو سکتا۔ آپ نے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ مذکورہ دونوں موقف غلط ہیں اور جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے وہ سبھی بشر تھے اور وحی نبوت بشر پر اولاد آدم سے مخصوص ہے۔

بعد ازاں بشر کے معنی اور اس کی لفظی بے نظیر تحقیق کی ہے۔ قرآن و حدیث کے علاوہ ''قاموس'' مصباح المنیر، لسان العرب، منتھی العرب، نہایہ ابن اثیر، مجمع البحار، مفردات راغب، اسرار اللغۃ سے یہ نتیجہ و خلاصہ مطلب واضح کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بشریت سے انکار کرنا متواترات، مشاہدات اور لغت و احادیث کی تصریحات کا انکار ہے۔ اس کے بعد غالیوں کے چند مغالطات اور ان کے جوابات ہیں۔ ضمناً محبت و غلو کی خوب وضاحت کی گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مولوی عبدالغنی بریلوی کے بیان کردہ خود ساختہ ترجمہ: ''قل انما ان بشر مثلکم'' کہہ دو تحقیق نہیں ہوں میں بشر مانند تمہاری'' پر مولوی صاحب مذکور کی جہالت کو آشکار کیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ مولانا حافظ محمد علی کاندھلوی کے رسالہ اعصام اور مفتی کفایت اللہ کے فتویٰ (جو حکیم محمد صادق سیالکوٹی کے استفتاء پر دیا گیا) اور رسالہ سید البشر شائع کردہ دائرۃ الارشاد سیالکوٹ نے کس طرح بریلوی مولوی صاحب کا ناطقہ بند کر دیا جس کی وجہ سے عقائد شرکیہ و رسوم بدعیہ میں ہم آہنگ ساتھیوں نے بھی خود تراشیدہ معنی (تحقیق نہیں ہوں میں بشر) کی تحریر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد مولانا میر کی بریلوی مولوی صاحب سے گفتگو کی تفصیلات درج کی گئی ہیں جن میں سب سے پہلے لفظ ''انما'' کی تحقیق ہے۔ علامہ جمال الدین ابن ہشام نحوی صاحب مغنی اللبیب، مولانا شاہ رفیع الدین، علامہ قزوینی صاحب، تلخیص المفتاح، علامہ مجد الدین لغوی فیروز آبادی صاحب قاموس علامہ جار اللہ زمخشری صاحب مفصل فخر سیالکوٹ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور دوسرے دیگر مسلمہ اردو و فارسی تراجم کی شہادت سے یہ ثابت کیا کہ جو حروف مشبہ بالفعل ''ان'' وغیرہ پر آکر ان کو عمل سے روک دیتا ہے زائد ہوتا ہے۔ جملہ میں اس کے معنی اور عمل کچھ بھی نہیں لئے جاتے۔

لہٰذا اس آیت کے معنی یہی ہیں کہ ''سوائے اس کے نہیں کہ میں تم جیسا بشر ہوں'' بعد ازاں مولوی عبدالغنی کی طرف سے دئے گئے آٹھ مغالطات کا ذکر کر کے مسکت و شافی جواب دئے گئے ہیں اور آخر میں حنفی کتب عقائد میں سے عقائد نسفی قصیدہ امالی از ملا علی قاری حنفیؒ

مسایرہ از شیخ کمال الدین ابن ہمام و دیگر کتب شرح مقاصد از علامہ تفتازانی کتاب الشفاء فی حقوق المصطفیٰ از قاضی عیاض، قصیدہ بردہ از اشرف الدین بوصیری کی تصریحات سے بشریت انبیاء کو ثابت کیا گیا ہے۔ جس سے مولوی عبدالغنی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ (239)

اُسوہ حسنہ:

یہ رسالہ 16 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ میں لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ عن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیراً (احزاب) کی تشریح بڑے دلنشین انداز میں کی گئی ہے اور اتباع اسوہ حسنہ کی اہمیت وضرورت کو واضح کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے نبی اکرم ﷺ نوع انسانی کے لئے زندگی کے ہر ہر شعبہ میں راہنمائے کامل ہیں۔ یہ رسالہ اخبار اہل حدیث (امرتسر) 5 فروری 1937ء میں بھی شائع ہوا تھا جبکہ اکتوبر 1937ء میں آپ کے شاگرد رشید مولانا محمد عبداللہ ثانیؒ نے اسے جمعیت تبلیغ اہل حدیث ہی سے شائع کیا۔ (240)

تردید مغالطات مرزائیہ:

رسالہ ہذا میں مرزائیوں کے مندرجہ ذیل مغالطات کی تردید کی گئی ہے جو مرزائیوں نے دو اشتہاروں کی شکل میں شائع کئے۔

1۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرزند ابراہیم کی وفات کے موقع پر فرمایا تھا: ''لو عاش ابراهيم لكان صديقا نبيا'' (ابن ماجہ) یعنی اگر ابراہیم زندہ ہوتا تو صدیق نبی ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت جاری ہے ورنہ آنحضرت ﷺ ایسا نہ فرماتے۔

2۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: انا اخر الانبياء و مسجدى اخر المساجد (مسلم) یعنی میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے۔

پس جس طرح آنحضرت ﷺ کے بعد مسجدیں بنا بند نہیں ہوگیں اسی طرح آپ کے بعد نبوت بھی بند نہیں ہوئی۔ مولانا میرؒ نے ان دونوں اشتہاروں کا جواب 19 ستمبر 1952ء کے خطبۂ جمعہ میں سامعین کو سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ جون 1933ء کے مباحثہ میں بمیدان قلعہ سیالکوٹ مرزائی مولوی محمد سلیم کی انہی مغالطات کے شافی اور مفصل جواب دے دئے گئے تھے جو رسالہ ''کشف الحقائق'' کی صورت میں شائع ہو گئے تھے اور جن کے جواب الجواب کی مرزائیوں میں سکت نہ رہی تھی۔ اور بیس سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود قادیانی جماعت اُس رسالہ کا جواب نہیں دے سکی۔

مختصراً یہ کہ مولانا میرؒ نے ابن ماجہ ہی کے حوالہ سے لو عاش ابراهيم لكان صديقا نبيا کی تضعیف کو ثابت کیا اور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد مبارک: ''لو قضى ان يكون بعد محمد ﷺ نبي عاش ابنه ولكن لا نبي بعده''۔ یعنی اگر خدا کی قضا میں یہ بات ہوتی کہ محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کا بیٹا (ابراہیم) زندہ رہتا۔ لیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا کی نشاندہی کر کے اس کی صحت کو ثابت کیا ہے اور آخر میں قادیانیوں کے دوسرے مغالطے کی تردید میں آپ نے کنز العمال میں سے ''انا خاتم الانبياء و مسجدى خاتم مساجد الانبياء'' یعنی میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد انبیاء کی مساجد میں سے آخری مسجد ہے پیش کی ہے۔ (241)

فصل خاتم النبوۃ:

یہ 32 صفحات پر محیط ہے۔ رسالہ ہذا کا پورا نام ''فصل خاتم النبوة بعموم الدعوة و جامعية الشريعة'' ہے اور ختم نبوت سے متعلق ہے۔

فصل اول میں قرآن مجید سے دلائل ختم نبوت بیان کئے گئے ہیں اور نتیجۃً ثابت کیا ہے کہ جب قرآن مجید حرفاً حرفاً محفوظ ہے اور پیغمبر قرآن کا طریق عمل اور آپ کے صحابہ کے آثار بھی من وعن بلاکم وکاست مکتوب ومسطور ہیں تو اس امر کی ضرورت کہ خدا کی وحی نبوت اور

اُس کے پیغمبر کی سنت کو قائم کرنے کے بعد اس امر کی ضرورت بالکل نہیں رہی کہ کوئی نیا نبی پیدا کیا جاتا۔

فصل دوم شبہات قادیانیہ کے رد میں ہے جس میں قادیانیوں کی طرف سے اجرائے نبوت کے خود ساختہ دلائل کی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے اور ان کا علمی محاکمہ کر کے تغلیط کی گئی ہے۔ ایسے عقلی و نقلی استشہادات پیش کئے گئے ہیں کہ قاری داد تحسین دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ (242)

ختم نبوت اور مرزا قادیان:

رسالہ ہٰذا کا موضوع ختم نبوت ہے۔ مرزا قادیانی اس مسئلہ کو خواہ مخواہ الجھانے، پیچیدگیاں ڈالنے اور ادھر ادھر سے کھینچ تان کر کے اپنے مذموم دعویٰ نبوت کی راہ نکالنے کی سعی لا حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ مسئلہ ختم نبوت نصوص قرآنیہ و حدیثیہ سے ثابت ہونے کی وجہ سے مسلم کل ہے اور منصوصات شرعیہ محل نظر نہیں ہوتے بلکہ وہ اہل شرع کے نزدیک ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے اہل منطق کے نزدیک۔ بدیہیات اور علوم میں بدیہیات پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ بعد میں مرزا قادیانی کے اُن استنباط عجیبہ کو خلاف نص قرآنی اور خلاف احادیث صحیحہ ہونے کی وجہ سے سراپا باطل ثابت کیا ہے جو مرزا نے ''صراط الذین انعمت علیھم'' اور ''ومن یطع اللہ والرسول واولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقاً'' (النساء) سے اجرائے نبوت کے لئے کئے ہیں۔ ان کی تردید کے لئے عقلی و نقلی دلائل کے علاوہ مولوی محمد علی لاہوری کی اردو تفسیر ''بیان القرآن'' میں سے صراط الذین انعمت علیھم کے ضمن میں عبارت نقل کی گئی ہے۔

پس مقام نبوت کے لئے دعا کرنا ایک بے معنی فقرہ ہے اور اسی شخص کے منہ سے نکل سکتا ہے جو اصول دین سے ناواقف ہو۔

اس ''گھر کی گواہی'' سے بھی مرزا قادیانی کے دعویٰ اجرائے نبوت کی قلعی کھل جاتی ہے۔ (243)

سیرت محمدیہ:

یہ رسالہ 24 صفحات پر مشتمل ہے۔

حضرت مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کے ایک پرانے دوست سیٹھ داؤد مہ پارہ نے جزیرہ جاوا کے شہر سورابیہ سے ایک تحریر جواب کے لئے حضرت کی خدمت میں ارسال کی جو وہاں جاوا زبان میں شائع ہوئی تھی۔ جہاں مضمون نگار نے اپنی تمام کوشش اس نتیجے کے لئے صرف کر دی ہے کہ دین اسلام کے قائم کرنے سے آنحضرت ﷺ کا مقصد صرف یہ تھا کہ (جائز و ناجائز وسائل کی تمیز کو نظر انداز کر کے) مال و دولت جمع کریں اور اپنی زندگی کے ایام خوشحالی میں گزاریں معاذ اللہ۔

مولانا میرؒ نے اس تحریر کے جواب میں ''سیرت محمدیہ'' رسالہ لکھا جس میں آپ نے مضمون نگار کی غلط بیانیاں ظاہر کر کے اور باطل کا پردہ چاک کر کے حقیقت امر منکشف کر دی اور لوگوں کو بتایا کہ مضمون نگار نے جو واقعات بیان کئے ہیں اُن میں سے بعض تو از روئے سند ٹھیک نہیں۔ پس اُن کی بنا پر جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی باطل ہے۔ اور بعض صحیح تو ہیں لیکن اُن کو کم علمی یا کم فہمی یا بد نیتی سے غلط طریق پر بیان کر کے غلط نتیجہ نکالا ہے اور لوگوں کی نظر میں اُن کا خود ساختہ تاریک پہلو دکھانا چاہا ہے حالانکہ واقعہ کی صورت وقوع اور اُس کی حقیقت مضمون نگار کے بیان کے خلاف ہے۔ بلکہ آپ نے اُس کی اُن باتوں کی بھی نشاندہی کر دی ہے جو اُس نے خود لکھی ہے اور جو اس کے اخذ کردہ نتائج کا ابطال کرتی ہیں۔ گویا اس کی تردید اُس کے ہاتھ سے ہو گئی ہے۔ یقیناً یہ قدرت کے تصرف غیبی کا کمال ہے۔ (244)

حاصل بحث:

ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا سیالکوٹیؒ میخانۂ علم وزیر آباد میں پہنچے۔ دبستان وزیر آباد سے فراغت کے بعد مولانا سیالکوٹیؒ نے علمی بغداد ہندوستان کی راجدھانی دہلی کا رخ کیا۔ حضرت میاں سید نذیر حسینؒ کا یہ آخری دور تھا۔ مولانا سیالکوٹیؒ کو بھی حضرت میاں صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ دہلی سے تکمیل کے بعد مولانا سیالکوٹیؒ نے سیالکوٹ کو ہی اپنی دینی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا میدان بنایا۔ مولانا سیالکوٹیؒ نے کچھ عرصہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں تدریسی فرائض بھی سرانجام دیئے۔ مولانا سیالکوٹیؒ نے کچھ عرصہ ایک علمی و تحقیقی رسالہ ''الہادی'' جاری کیا۔ مولانا سیالکوٹیؒ کو اللہ تعالیٰ نے علوم قرآن، معارف قرآن اور معارف حدیث پر بہت وسعت نظر دی تھی۔

مولانا سیالکوٹیؒ کا میدان عمل پورا برصغیر تھا۔ درہ خیبر سے راس کماری تک کوئٹہ سے رنگون برما تک یہ وسیع و عریض خطہ آپ کی تبلیغی جولان گاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میر سیالکوٹیؒ کو ذہانت، خطابت، وجاہت، شجاعت، جرأت، حق گوئی و بے باکی، راست بازی، حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی ایسے گوناگوں اوصاف سے متصف فرمایا تھا۔ مولانا کے قلم کی توانائیاں لسانی صلاحیتیں دماغی قوا علم وفضل کی رعنائیاں تحقیق ودانش کی دلربائیاں علمی واخلاقی جلوہ طرازیاں سب دین اسلام کی تبلیغ واشاعت اور فروغ سنت کے لئے وقف تھیں۔ مسلک اہل حدیث کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز مولانا سیالکوٹیؒ کے شباب سے ہوا۔ حق یہ ہے کہ مولانا سیالکوٹیؒ نے برصغیر پاک و ہند میں بالعموم اور سیالکوٹ میں بالخصوص تحریک اہل حدیث کو چار چاند لگائے۔ مولانا سیالکوٹیؒ کے خاراشگاف قلم سے حدیث، تفسیر، احکام ومسائل کے موضوع پر بیسیوں فاضلانہ اور محققانہ کتب لکھیں۔ قادیانیت، تشیع اور آریہ سماج کے موضوع پر مولانا سیالکوٹیؒ کے اشہب قلم نے خوب جولانیاں دکھائیں۔

فصل ششم:

مولانا مودودیؒ بحیثیت سیرت نگار

احوال و آثار:

ذیل میں ہم پہلے مولانا مودودی کا تعارف پیش کرتے ہیں:

ایران اور افغانستان کی سرحد جہاں سے شروع ہوتی ہے۔ بالکل اس کے قریب ایک چھوٹا سا مقام چشت ہے۔ اس مقام پر تیسری صدی ہجری میں سادات کے ایک شاخ آ کر آباد ہوئی تھی۔ اور اسی خاندان کے نامور بزرگ ابو احمد ابدال تھے۔ انہیں سے صوفیائے کرام کا ایک مشہور سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے نواسے ان کے جانشین تھے۔ جن کے بڑے بیٹے حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی تھے۔ جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری شیخ الشیوخ تھے۔ یہی بزرگ خاندان مودودیہ کے مورث اعلیٰ تھے۔

ان کے خاندان کی ایک شاخ نویں صدی ہجری میں سکندر لودی کے زمانے میں چشت سے ہجرت کر کے ہندوستان آئی۔ اور کوال کے ایک قصبہ براس میں آباد ہو گئی۔ اس شاخ کے پہلے بزرگ کا نام ابوالاعلیٰ مودودی تھا۔ یہ خاندان شاہ عالم کے زمانے میں دہلی میں سکونت پذیر ہو گیا۔ پھر مستقلاً وہیں رہ گیا۔ آٹھ سو سال سے اب تک یہ سلسلہ رشد و ہدایت فقر و درویشی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا مودودی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ (245)

ننھیال:

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نانا ترقی النسل تھے۔ جن کا نام قربان علی بیگ تھا۔ ان کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مگر وہ شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے۔ اور سالک ان کا تخلص تھا۔ اور مرزا غالب کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا مکان دہلی میں غالب کے مکان سے متصل تھا۔ (246)

والد گرامی:

مولانا سید مودودی کے والد کا نام سید احمد حسن تھا۔ اپنے والد صاحب کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے ایک مضمون (میر بچپن) میں رقمطراز ہیں۔ میرے والد مرحوم سید احمد حسن 1857ء کے ہنگامے سے دو سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ سر سید مرحوم نے جب مدرسہ قائم کیا تھا۔ تو اپنے خاندان اور رشتے داروں میں سے بہت سے لڑکوں کو چن چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چونکہ میری دادی صاحبہ مرحمہ سے ان کی قرابت ہوتی تھی۔ اس لئے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اس سلسلہ میں ہوا تھا۔

اس زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں شدید نفرت کی تھی۔ مگر ہمارا خاندان اس نفرت میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھا ہوا تھا۔ چونکہ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ میرے دادا صاحب کو والد کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت ناگوار تھا۔ مگر سرسید کی وجہ سے چپ تھے۔ ایک دفعہ ان کا کوئی عزیز علی گڑھ گیا۔ اور مولانا کے والد صاحب کو انگریزی لباس پہنے کرکٹ کھیلتے دیکھا اور گھر آ کر اطلاع دی کہ تمہارا بیٹا کافر کرتی پہنے ہوئے تھا۔ یہ سن کو مولانا مودودی کے دادا نے اپنے بیٹے کو واپس بلا لیا۔ اور اس طرح وہ تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔

اس کے بعد کئی سال تک وہ گڑھ میں ولی عہد کے اتالیق رہے۔ اس کے بعد وکالت کا پیشہ اپنا لیا۔ بعد میں وکالت چھوڑ دی۔ مگر اس وقت تک ان پر انگریزی خیالات اور انگریزی معاشرت کا غلبہ تھا۔ اور مذہبیت کی چنگاری راکھ میں دبی ہوئی تھی ان کے چچا مولوی محی

الدین صاحب بڑے صوفی منش انسان تھا۔ان کی صحبت نے مولانا کے والد کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ان کی زندگی پر جو فرنگی اثرات تھے وہ باطل ہو گئے۔اور اسلامی رنگ چڑھ گیا۔مگر ابھی اتنا رنگ نہیں چڑھا تھا کہ وکالت چھوڑ دیتے۔(247)

چار سال کے بعد دینی مشاغل کا اتنا غلبہ ہوا کہ وکالت کو خیر باد کہہ دیا ان کے مرشد محی الدین کی نصیحت پر کہ رزق حلال شرط ہے اور ترک دنیا خدا کے قرب کیلئے شرط نہیں۔دوبارہ وکالت شروع کر دی۔مگر جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔اور مقدمہ لینے سے پہلے نقد جرح کرتے کہ موکل سچا ہے کہ نہیں؟اس سے مالی مشکلات میں اضافہ ہو گیا اور ان کا مذہبی رنگ صبغۃ اللہ کا مصداق بنتا چلا گیا۔یہاں تک تا ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ اسے کبھی فرنگی تہذیب نے چھوا ہو گا۔(248)

ولادت:

مولانا مودودی کا سن ولادت تین رجب 1321 بمطابق 25 ستمبر 1903 ہے ان کی جائے پیدائش اورنگ آباد (دکن) ہے۔ جہاں ان کے والد نے آ کر دہلی سے آ کر رہائش اختیار کر لی تھی۔چونکہ ہندوستان میں مودودی خاندان کے سلسلے کا آغاز کرنے والے بزرگ کا نام بھی ابوالاعلیٰ تھا اس لئے آپ کے والد نے انہیں کے نام کی مناسبت سے آپ کا نام بھی ابوالاعلیٰ رکھا۔مگر لوگ اس نام کی عربیت کو دیکھ آپ کی کنیت سمجھ لیتے تھے۔حالانکہ یہ ان کی کنیت نہیں بلکہ والدین کا رکھا ہوا نام ہے۔(249)

ابتدائی تعلیم:

سید مودودی نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ مکمل مذہبی گھرانہ تھا۔چنانچہ آپ کے والد صاحب نے آپ کی تعلیم کی ذمہ داری خود لی۔اور اپنی نگرانی میں مذہبی تعلیم دینا پسند کیا۔والد صاحب کی اس تربیت اور صحبت کا فیضان تھا کہ سید مدودی میں بہت جلد برے بھلے کی تمیز پیدا ہو گئی۔

وہ چار سال کی عمر میں اپنے والد محترم کے ساتھ پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھنے کے عادی ہو گئے۔اور پانچ سال کی عمر میں ہی قرآن مجید کی تیس آیات کو بامعنی زبر کر لیا۔اور ابی روزے فرض نہیں ہوئے تھے۔کمسنی ہی میں روزے باقاعدگی سے رکھنے شروع کر دیئے۔(250)

چونکہ ان کے والد صاحب کو مولوی بنانا چاہتے تھے۔اس لئے ان کی تعلیم بھی اسی طریقے پر کی۔اردو، فارسی اور عربی کے ساتھ فقہ کی تعلیم بھی اتالیق کے ذریعے گھر پر دلوانے کا بندوبست کیا۔آپ کے والد صاحب نے کسی سکول میں داخلہ اس لئے نہیں دلوایا کہ سکول کا ماحول اچھا نہیں ہوتا۔اور چھوٹے بچے کے اخلاق پر اس کے نتائج اچھے مرتب نہیں ہوتے۔

اس کے بارے میں سید مودودی خود لکھتے ہیں۔

مادی لحاظ سے والد صاحب نے میرے لئے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا، لیکن ان کا بہترین ورثہ جو میرے حصے میں آیا ہے وہ ان کی اخلاقی تربیت ہے۔(251)

مدرسہ کی تعلیم:

اس زمانے میں ریاست حیدرآباد میں ایک نیا نظام تعلیم تھا۔اس میں ہائی سکول کو مدرسہ فوقانیہ کہتے تھے۔مڈل سکول کو رشدیہ اور میٹرک کو مولوی کہا جاتا تھا۔مدرسہ میں مدراس یونیورسٹی کے تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔اور اس کے ساتھ ساتھ سلیبس میں حدیث فقہ، لغت عربی اور منطق کے مضامین بھی تھے۔(252)

جب انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی آٹھویں جماعت میں داخل کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ اکثر مضامین

میں اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ معلومات رکھتے تھے حالانکہ سب سے کم عمر تھے۔اس دوران دوسرے لڑکے کھیلوں میں دلچسپی لیتے تھے مگر مولانا مودودی کو کھیلوں سے واجبی دلچسپی تھی۔

مولانا ابھی آٹھویں جماعت میں ہی تھے کہ ان کے بڑے بھائی مولوی (میٹرک) کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔مولانا مودودی نے کہا کہ میں بھی امتحان دونگا۔سب حیران تھے کہ یہ اس کمسنی میں کیسے امتحان دے گا اور تیاری بھی کیسے کرے گا۔اور ایک دقت یہ تھی کہ قانونی طور پر اتنی عمر کا امیدوار امتحان نہیں دے سکتا تھا۔بڑی مشکل سے قانون میں گنجائش پیدا کی گئی اور مولوی کے امتحان میں بٹھائے گئے۔اس طرح گیارہ سال کی عمر میں 1914ء میں انہوں نے (میٹرک) کا

امتحان پاس کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔(253)

والد صاحب کا انتقال:

سید صاحب نے جب میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تو ان کے والد صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہو گئے۔اور سید صاحب کو دارالعلوم کالج میں وہی داخل کروادیا۔اور خود بھوپال چلے گئے۔

سید صاحب چھ ماہ تک اسی دارالعلوم میں زیر تعلیم رہے۔ایک دن اچانک اطلاع آئی کہ ان کے والد پر فالج کا حملہ ہوگیا۔اس وجہ سے مولانا کو تعلیم کا سلسلہ ختم کرنا پڑا۔اور اپنے والد کے پاس بھوپال جانا پڑا۔والد صاحب کی بیماری بڑھتی گئی آخر 1920ء میں اسی مرض میں انتقال ہوگیا۔مولانا مودودی کو والدہ کی خدمت میں رہنا پڑا۔اس لئے باقاعدہ کسی کالج میں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔

لیکن چونکہ دل میں علم حاصل کرنے کا جذبہ موجزن تھا۔اس لئے جو چیز مدرسہ میں نہ مل سکی۔انہوں نے ذاتی مطالعے سے حاصل کرلی اور بہت جلد ہی عربی، فارسی اور انگریزی کتب کا مطالعہ کرنے کے قابل ہو گئے۔

اس بارے میں مولانا مودودی خود لکھتے ہیں۔

''کہ انہوں نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں انگریزی سیکھ لی تھی۔اور بائیس سال کی عمر میں انگریزی کتابوں کا مطالعہ بڑی آسانی سے کرنے لگے تھے۔''(254)

علم الکلام کی تعلیم:

مولانا مودودی نے فلسفہ منطق اور علم کلام کی تعلیم مولانا عبدالسلام نیازی سے حاصل کی۔

مولانا مودودی نے فرمایا تھا۔''میں نے فن استدلال مولانا عبدالسلام سے حاصل کیا ہے۔خود مولانا عبدالسلام فرمایا کرتے تھے کہ میرے شاگرد ڈھائی ہیں۔سید ابوالاعلیٰ مودودی، ایک اور صاحب۔

عبدالسلام نیازی صاحب سریانی، عبرانی، تھلدانی، حمیری، عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، لاطینی اور سنسکرت بہت اچھی جانتے تھے۔اور آپ علامہ اقبال کے استاد سر آرنلڈ کے بھی استاد تھے۔(255)

علمی زندگی

صحافت سے آغاز:

والد کے انتقال کے بعد چھوٹی سی عمر میں پہلی بار سید مودودی کو یہ احساس ہوا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کیلئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ضروری ہے۔اللہ نے انہیں لکھنے کی قابلیت سے سرفراز کیا تھا۔چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ قلم کے ذریعے اپنے خیالات لوگوں تک پہنچائیں گے۔اس طرح مسلمانوں کی بھلائی اور معاشی مسئلہ دونوں حل ہو جائیں گے۔چنانچہ انہوں نے صحافت سے اپنی

عملی زندگی کا آغاز کیا۔اس وقت مولانا کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

مولانا نے بہت سے اخبارات میں بطور ایڈیٹر کام کیا۔جن میں اخبار مدینہ (بجنور) بھی ہے۔مگر صحیح معنوں میں ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہفتہ روزہ (تاج) سے ہوتا ہے۔ 1921ء سے 1925ء تک انہوں نے جمعیت علماء ہند کے اخبار (المسلم) کی ادارت بھی کی۔ اور جب یہ بند ہوگیا تو دوسرے روزنامہ (الجمعیۃ) کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔اور 1925ء سے 1928ء تک اپنے فرائض احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے۔(256)

ایک بار محمد علی جوہر نے بھی سید مودودی کو اپنے اخبار (ہمدرد) میں کام کرنے کی دعوت دی تھی مگر کرلی تھی۔کیونکہ الجمعیت والوں سے اپ کے تعلقات بہت پرانے تھے۔

تصنیف وتالیف:

1926ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے سید صاحب کی زندگی ایک نیا موڑ مڑ گئی۔یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند کو جو کہ مسلمانوں کو ہندو بنانے کی شدھی تحریک کا بانی تھا۔عبدالرشید نامی مسلمان نے غیرت ایمانی کے جوش میں آکر قتل کردیا۔کیونکہ اس نے اپنی کتاب میں نبی کریم پر ناروا حملے کرنے کی جسارت کی تھی۔اس کے بعد ہندو پریس اخبارات اور رسائل نے اس واقعے کو بنیاد بنا کر ایک طوفان کھڑا کرلیا۔اور اسلام کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

اور یہ پروپیگنڈا شروع کردیا کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے اسلام عقلی استدلالی مذہب نہیں ہے۔بلکہ صرف اس کا تکیہ تلوار پر ہے اور لوگوں کو زبردستی کلمہ پڑھوا کر مسلمان کرتے ہیں۔

ادھر مولویوں کے انداز میں بڑی بیچارگی پائی جاتی تھی۔وہ کہتے تھے کہ اسلام جارحانہ جنگ نہیں سکھاتا وہ صرف دشمن سے مدافعت کرنے کو جہاد کہتا ہے۔مگر ہندوؤں کو اس سے تسلی نہ ہوئی اور انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ جب تک دنیا میں قرآن کی تعلیم موجود ہے۔اس وقت تک امن قائم نہیں ہوسکتا۔

گاندھی جی یہاں تک کہہ دیا کہ اسلام میں فیصلہ کن چیز پہلے بھی تلوار تھی اور اب بھی تلوار ہے۔(257)

انہی دنوں جب یہ طوفان برپا تھا مولانا محمد علی جوہر جامع مسجد دہلی میں جمع کا خطبہ دیا کرتے۔ایک جمعہ کے خطبہ میں انہوں نے فرمایا۔

''اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اسلام کے صحیح تصور جہاد پر ایک مبسوط کتاب لکھے جس میں جہاد کے خلاف اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات اور الزامات کے مدلل جوابات دیئے گئے ہیں''۔(258)

جس خطبے میں یہ بات کہی اس میں لاکھوں مسلمانوں نے اس بات کو سنا مگر ایک نوجوان نے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا اور ارادہ کہ اس موضوع پر ضرور کتاب لکھے۔یہ نوجوان سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔

مولانا مودودی نے جہاد کے موضوع پر الجہاد فی الاسلام کے نام سے معرکۃ آراء کتاب لکھی۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1927ء میں مولانا سلیمان ندوی نے شائع کیا۔اس وقت سید صاحب کی عمر چوبیس برس تھی۔جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو ہر طرف سے سید صاحب کو داد ملی۔اپنے تو اپنے غیر بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے۔اس کتاب نے ہندوؤں کے پروپیگنڈے کا منہ بند کردیا اور مسلمانوں میں اعتماد کی فضا کو بحال کردیا۔

مولانا مودودی نے اس کتاب میں عقلی طور پر ثابت کیا ہے کہ اسلام کا جہاد چاہے دفاعی ہو یا اقدامی وہ بنی نوع انسان کیلئے سراسر رحمت ہے۔(259)

ترجمان القرآن کا اجزاء:

سید مودودی کے دل میں اصلاح قوم کی بہت زیادہ فکر تھی وہ اس کیلئے دن رات سوچتے تھے کہ مسلمان قوم جو اسلام سے دور جا چکی ہے اس کو کیسے دوبارہ اسلام کی اصل تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ وہ الجمعیۃ کو چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے۔ کچھ عرصہ سوچ بچار کے بعد آخر اصلاح قوم کے مقصد کیلئے 1934ء میں حیدرآباد سے رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا۔ سید ابوالاعلیٰ نے اس ادارے کی ابتداء ہی میں اس ادارے کی غرض وغائیت بیان کر دی تھی۔

''ادارہ ترجمان القرآن کوئی تجارتی ادارہ نہیں ہے ہمارے پیش نظر ایک مقصد ہے اور وہ مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے۔''(260)

چونکہ اس وقت مسلمان مرعیت کا شکار تھے اس لئے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے مغربی قوموں کے ثقافی اور یورپ کے خیالات اور ان کے طور طریقوں کو نکالا جائے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جائے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہر مسئلے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اسلامی نظام حیات کو قائم کرنے کی دعوت دی جائے اور جو لوگ تیار ہو جائیں۔ ان کو جمع کر کے ملک میں آئینی اور جمہوری طریقے پر جدوجہد کی جائے اور مسلمان عوام کو بتایا جائے کہ ان کے موجودہ زوال کا سبب اسلامی کلام سے محرمی ہے۔ چنانچہ 1935ء میں مولانا مودودی نے (پردہ) کے نام سے اسلامی پردے کی حمایت میں ایک کتاب لکھی۔ اور ان لوگوں کا مدلل جواب دیا جو اسلامی پردے پر فرنگی تہذیب کی مرعربیت کی وجہ سے اعتراض کرتے تھے۔

اس طرح ترجمان القرآن ایک رسالہ ہی نہیں تھا بلکہ دعوت مشن اور ایک پیغام بھی تھا۔ ترجمان القرآن نے برصغیر کے مسلمانوں کے اندر سے اسلام کے متعلق شکوک وشبہات دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ (261)

حیدرآباد دکن میں قیام کے دوران مولانا نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ اس دور کی تصانیف میں سے اہم کتاب (دینیات) ہے۔ یہ کتاب انہوں نے مشہور عالم دین مولانا مناظر احسن گیلانی کی تحریک پر نظامت تعلیمات کیلئے لکھی تھی اور صرف پندرہ دن میں مکمل کر لی تھی۔ اگر چہ یہ لکھی تو طلباء کیلئے گئی تھی مگر مولانا کی مقبول کتاب کی حیثیت اختیار کر گئی۔ یہ کتاب برصغیر کے مدرسوں کے نصاب کے علاوہ بعض اسلامی ممالک کے مدرسوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ دنیا کے بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ (262) اب تک اس کے بتالیس ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ جن کی مجموعی اشاعت ایک لاکھ چالیس ہزار ہے۔ یہ کتاب علم الکلام کا بہترین شاہکار ہے۔ یہ کتاب اشاعت اسلام کے سلسلے میں بھی بہت اہم ثابت ہوئی اور کئی غیر ملکی شخصیتوں نے اسلام قبول کیا۔ (263)

جن زبانوں میں ترجمہ ہوا مشہور زبانیں یہ ہیں۔

عربی، فارسی، ترکی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی، جاپانی، بنگلادیشی، پشتو، سندھی، گجراتی، سواحلی، انڈونیشی، ملائشی، تلگو، ملیالم اور ہندی۔

علامہ اقبال اور مولانا مودودی:

رسالہ دینیات اور ترجمان القرآن نے مولانا مودودی کو پورے برصغیر میں متعارف کروا دیا تھا۔ اور علامہ اقبال جیسی شخصیت بھی ان کے مداحوں میں شامل ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ ترجمان القرآن بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ علامہ اقبال ان دنوں فقہ اسلامی کی تدوین جدید کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کیلئے انہوں نے مولانا سے خط وکتاب کی دونوں کے نظریات میں ہم آہنگی پائی گئی۔

مولانا مودودی کو دعوت پنجاب:

علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو حیدرآباد دکن سے پنجاب آنے کی دعوت دی تھی۔مولانا مودودی نے ایک انٹرویو میں خود فرمایا تھا کہ!

''ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے پٹھان کوٹ میں آنے کو لکھا تھا اور مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ تم اس جگہ آکر بیٹھ جاؤ میں بھی سال میں چھ مہینے وہاں گزارہ کرونگا۔اس میں ایک ایسی جاذبیت تھی کہ میں نے فوراً ہی اس جاذبیت کو قبول کرلیا۔''(264)

مولانا مودودی اس بارے میں مزید فرماتے ہیں کہ!

''1937ء کے آخر میں نے دکن چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور کسی دوسرے مستقر کی تلاش میں حیدرآباد سے نکلا۔تو علامہ مرحوم سے مشورہ کرنے کیلئے لاہور حاضر ہوا۔اور ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ آئندہ میرے لئے پنجاب میں قیام کرنا زیادہ مناسب ہے۔''(265)

چنانچہ مولانا مودودی سولہ مارچ 1938ء پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور) شرقی پنجاب میں لبتی دارالسلام میں آگئے۔مولانا مودودی مارچ 1938ء تک دارالسلام میں رہے۔اس عرصے کے دوران گاؤں گاؤں اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔اس تعلیم سے لوگوں میں دین کا شعور پیدا ہونے لگا۔مولانا مودودی دسمبر 1938 میں واپس دارالسلام چلے گئے۔اور اگست 1947 تک وہیں رہے۔(266)

1939ء میں لاہور میں قیام کے دوران کچھ مدت مولانا مودودی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں اسلامک سٹڈیز کے اعزازی پروفیسر بھی رہے۔لیکن جب انتظامیہ نے تنخواہ مقرر کرنا چاہی تو انہوں نے یہ سلسلہ ختم کردیا۔(267)

دارالسلام میں قیام کے دوران کئی اہم تقریروں کے علاوہ اپنی مشہور کتاب (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش) لکھیں۔(268)

جماعت اسلامی کا قیام:

1935ء سے 1947 کے درمیانی دور میں ہندوستان کے حالات بہت نازک تھے۔خصوصاً مسلمان بہت پریشان تھے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی طاقت کافی زیادہ تھی اور اثر ورسوخ بھی مسلمانوں سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کی کوششیں بھی ہو رہی تھیں اگر انگریز ہندوستان کی اکثریت کو یہ ملک حوالے کر جاتے تو مسلمانوں کی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔کہ ان کی کیا حالت ہوتی۔اور اگر مسلم لیگ کے مطالبے پر پاکستان بن گیا تو سوال یہ تھا کہ جو ایک تہائی مسلمان رہ جائیں گے ان کا کیا بنے گا۔اور پھر پاکستان بننے کے بعد اسلامی نظام حکومت قائم ہونے کی کیا امید تھی۔

کیونکہ جو لوگ تحریک کو چلا رہے تھے۔ چند کو چھوڑ کر باقی تو فرائض کی ادائیگی بھی پوری نہیں کر رہے تھے۔اور بعد میں سید مودودی کا یہ اندیشہ سچ بھی ثابت ہوا۔ چنانچہ ایسے حالات میں ایک جماعت کی ضرورت تھی جو پاکستان بننے کے بعد اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے اور اگر پاکستان نہ بن سکے تو دوسری دفاعی لائن ثابت ہو۔مولانا مودودی 1939ء اسلامی انقلاب کیلئے ذہنوں کو تیار کر رہے تھے۔ یہ کام کافی حد تک اب مکمل ہو چکا تھا۔اب فضا اس حد تک ہموار ہو چکی تھی کہ اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کیلئے ایک جماعت تشکیل کی جا سکے۔

چنانچہ مولانا مودودی نے ترجمان القرآن کے ذریعے ایک پابند اسلام جماعت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ جو لوگ اس تجویز سے رکھتے تھے وہ لاہور میں جمع ہو گئے اور جماعت کے قیام کے متعلق غور وخوض شروع کرنے لگے۔اس مختصر اجتماع میں چھبیس اگست 1941ء کو جماعت اسلامی تشکیل دی گئی۔اور مولانا مودودی کو جماعت کا امیر منتخب کیا گیا۔جس وقت جماعت اسلامی قائم ہوئی تو اس وقت پورے ہندوستان میں سے صرف پچھتر آدمی شامل ہوئے تھے۔(269)

مولانا مودودی کی پاکستان میں آمد:

مولانا مودودی 28 اگست 1947ء کو پاکستان پہنچے۔ دوسرے ہی دن وزیر اعلیٰ پنجاب نواب افتخار حسین ممروٹ سے ملاقات کی اوران کی توجہ کشمیر کی طرف مبذول کرائی۔ اور بتایا کہ گورداسپور کا علاقہ جو ریڈ کلف میں ہندوستان کو دیا ہے وہ اس لئے دیا ہے کہ کشمیر پر پٹھان کوٹ کے راستے قابض ہو سکیں۔ اور سابقہ فوجیوں کو بلا کر جلد سے جلد کشمیر بچانے کی فکر کیجئے۔ ان فوجیوں کے پاس کچھ نہ کچھ اسلحہ ہوتا ہے۔ اس وقت اس سے ہی کام حل جائے گا۔ آپ اس مسئلہ کی طرف توجہ دیں اور کوئی معاہدہ نہ کریں۔ (270)

مطالبہ نظام اسلام:

پاکستان جو خالص لا الہ کی بنیاد پر وجود میں آیا اس پاکستان میں اسلامی نظام کا مطالبہ کرنا اگرچہ بڑی تعجب کی بات تھی۔ اس وقت مولانا مودودی کی جماعت کے ارکان کی تعداد تین سو پچاس تھی۔ اگرچہ یہ لوگ تعداد میں کم تھے مگر چونکہ مولانا کے پیش نظر حکومت الٰہیہ کا قیام تھا اس لئے انہوں نے سب سے پہلے اسلامی ملک میں مسلم حکمرانوں سے نظام اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کر دیا۔ پاکستان کے مسلم حکمرانوں کو چاہئے تو یہ تھا کہ مطالبہ سنتے ہی پورا کر دیتے۔ مگر انہوں نے اس کا ردعمل کچھ اور ہی دکھایا۔ (271)

زندگی کی پہلی جیل:

جب قائد اعظم حیات تھے تو انہوں نے مولانا مودودی کو اسلامی نظام کی وضاحت کیلئے ریڈیو پاکستان پر تقریر کروائی تھی۔ مگر قائد اعظم کی وفات کے چند ہی روز بعد پاکستان میں نظام اسلامی کے نفاذ کو مطالبہ کے جرم میں مولانا مودودی اوران کے ساتھیوں کو چار اکتوبر 1947ء کو انگریز نوز لیڈروں نے گرفتار کر کے ملتان جیل منتقل کر دیا۔ ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ان کی جماعت کے اخبارات کوثر، جہاں نو اور روزنامہ تسنیم بھی بند کر دیئے گئے تا کہ کوئی آواز احتجاج بلند نہ ہو۔ حکومت نے مولانا مودودیہ اوران کے ساتھیوں کو بیس ماہ قید میں رکھنے کے بعد 28 مئی 1950ء کو جیل سے رہا کیا۔ مولانا مودودی نے عرصہ جیل میں پڑھنے لکھنے کا خاصہ کام کیا۔

(1) مسئلہ ملکیت زمین مرتب کی۔

(2) تفہیم کا مقدمہ لکھا۔

(3) حدیث کی کتاب ابوداؤد کا انڈکس تیار کیا۔

(4) مشہور کتاب سود بھی وہی لکھی۔

(5) اسلام اور جدید معاشی نظریات بھی جیل ہی میں مکمل کی۔ (272)

دوسری جیل اور سزائے موت:

مولانا مودودی نے رہائی کے بعد جب نئی مہم شروع کی تو اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ قرار داد مقاصد جو 12 مارچ 1949ء کو منظور کی گئی تھی اس کا نفاذ کیا جائے اور دستور کو مکمل کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اسلامی دستور اور اسلامی ریاست پر اعتراض کرنے والوں کو مدلل طریقہ سے جواب دیا جائے۔ یہ فرض انہوں نے تحریر اور تقریر علمی اور ادبی دونوں سطح پر انجام دیا۔ اسی دوران قادیانیوں کے خلاف مہم چل رہی تھی۔ مولانا نے اس مسئلے کو آئینی طور پر حل کرانے کی کوشش کی۔ مگر حکمران طبقاء نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر 6 مارچ 1953ء کو لاہور میں مارشل لا لگا دیا۔

مولانا مودودی نے قادیانیوں کی اصل حقیقت کو منظر عام پر لانے کیلئے (قادیانی مسئلہ) نامی کتاب لکھی اور حکومت وقت کو اس مسئلہ کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ یہ کتاب ایک ماہ کی مدت میں دو لاکھ کی تعداد میں شائع ہوئی۔ یہ چھوٹی سی کتاب تھی جس کا بہانہ بنا کر حکومت نے مولانا مودودی کو 28 مارچ 1953ء میں گرفتار کرلیا۔

سزائے موت:

مولانا کو گرفتاری کے بعد جیل میں بھیج دیا گیا۔ اس سے پہلے قلعے میں دوسو سولہ گھنٹے قید تنہائی میں رکھے گئے۔ (273)

11 مئی کو مارشل لاء کورٹ میں مولانا مودودی کو سزائے موت سنادی، لیکن اس کے ساتھ ہی زبردست ہنگامے شروع ہو گئے۔ پوری دنیا نے اس سزا کے خلاف احتجاج کیا، آخر میں بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے یہ سزا چودہ سال کی قید میں تبدیل ہو گئی۔

جرأت اور ثابت قدمی:

مولانا مودودی کو موت کی سزا سنانے کے بعد پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اور ان کے کپڑے اتروا کر پھانسی کے مجرم والے کپڑے پہنوا دیئے گئے۔ شلوار کے اندر ازار بند بھی نہ تھا یہ اس لئے کہ مجرم خودکشی نہ کر لے۔ مگر یہاں مولانا نے توکل علی اللہ کی جو مثال پیش کی اس سے اسلاف کی یاد تازہ ہوئی۔ رات کو جو پہرے دار مولانا کی کوٹھڑی کا پہرہ دے رہا تھا اس کا بیان ہے کہ میں نے آج تک کوئی مجرم ایسا نہیں دیکھا، جو رات کو خراٹے بھر کو سوتا رہا ہو۔ مگر مولانا رات کوٹھڑی میں حسب معمول آرام سے سور ہے تھے۔ اسی دوران جب پھانسی کا حکم مل چکا تھا۔ مولانا کے صاحبزادے عمر فاروق ملنے کیلئے گئے تو مولانا نے سلاخوں کے پیچھے سے ان سے کہا!

''بیٹا ذرا نہ گھبرانا اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا۔ اور اس کا حکم ابھی نہیں ہے تو پھر چاہے یہ لوگ الٹے لٹک جائیں تو مجھے پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے''۔ (274) اور جب ان سے رحم کی اپیل کے متعلق پوچھا تو انہوں نے پھانسی کے کوٹھڑی میں کھڑے ہو کر فرمایا!

''نہیں ہرگز نہیں، میں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے یا میرے خاندان کے کسی فرد کی طرف سے یا جماعت کی طرف سے کوئی رحم کی درخواست پیش کی جائے۔ اگر ظالم حکمرانوں کے سامنے میں بھی دب گیا اور اپلیں کرنے لگا تو پھر اس ملک سے انصاف کا جنازہ اٹھ جائے گا۔'' (275)

مولانا مودودی نے تین دن پھانسی کی کوٹھڑی میں نو دن شاہی قلعہ لاہور میں اور قید باقی عرصہ لاہور، ملتان، میانوالی جیلوں میں گزارا۔ آخر مولانا مودودی کو حکومت نے عوام کی زبردست احتجاج پر 29 اپریل 1955ء کو رہا کر دیا۔

اسلامی دنیا اور مولانا مودودی:

مولانا مودودی دینی فکری اور اصلاحی تحریروں اور کاموں کی وجہ سے قیام پاکستان کے وقت تک کافی متعارف ہو چکے تھے۔ لیکن بعد میں ان کی تنظیم جماعت اور علمی بصیرت کی بدولت پوری دنیا اسلام میں ان کا مقام بہت ممتاز ہو گیا تھا۔ اس لئے اہم مسائل میں سید مودودی کے شہرت بیرون ممالک کے حکمران بھی طلب کرتے تھے۔

مولانا مودودی نے اسلامی دنیا کے تقریباً دس سفر کیے ہیں۔

(۱) مولانا کو پاکستان سے باہر پہلی دعوت 1957ء میں موتمر عالم اسلامی کے پہلے اجلاس میں شرکت کیلئے دی گئی تھی۔ لیکن نظر بندی کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ مولانا نے اسلامی دنیا کا پہلا سفر کے دمشق کے اجلاس میں شرکت کیلئے کیا۔ اور اس موقعہ پر اجلاس کی صدارت بھی کی۔ موتمر کی تبلیغ ودعوت اسلامی کی کمیٹی کے صد بھی منتخب کئے گئے۔

(۲) سفر ارض القرآن مولانا نے شرق وسطی کا دوسرا سفر 1959ء میں کیا۔ یہ ان کا تحقیقی سفر تھا۔ جس کے دوران میں انہوں نے آثار مشاہدہ کیا، جن کا قرآن مجید میں تذکرہ آیا ہے۔ ان مقامات کو دیکھنے کیلئے مولانا نے سعودی عرب، اردن، فلسطین اور شام کا دورہ کیا، ان کے علاوہ مصر بھی گئے۔

(۳) شاہ مسعود کی دعوت پر 1969ء میں مولانا نے تیسرا سفر سعودی عرب کا کیا۔ انہوں نے مدینہ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مولانا مودودی کو مشورے کیلئے بلایا تھا۔ مولانا مدینہ یونیورسٹی کی مشاورتی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے، اور یونیورسٹی کیلئے جو خاکہ انہوں نے پیش کیا تھا اس کی بنیاد پر نصاب تیار کیا گیا۔

(۴) 1962ء میں مولانا نے چوتھا سفر رابطہ عالم اسلامی کے سلسلے میں کیا۔ اور اس غرض سے اسلامی دنیا کے چار سو سے مندوب مکہ میں جمع ہوئے۔ مولانا رابطہ کی مجلس تاسیسی کے رکن منتخب ہوئے۔

(۵) مولانا نے پانچواں رابطہ اسلامی کے اجلاس میں شرکت کیلئے کیا۔ یہ اجلاس سعودی عرب میں ہوا تھا۔

(۶) 1963ء میں پاکستان میں تیار کئے جانے والے غلاف کعبہ کے موقع پر مولانا نے چھٹا سفر کیا۔ یہ غلاف شاہ مسعود کی ہدایت پر مولانا مودودی کی نگرانی میں تیار ہوا

(۷،۸) 1966ء میں ایک سفر اپریل میں اور دوسرا ماہ نومبر میں کیا۔ یہ دونوں سفر رابطہ عالمی کے اجلاس میں شرکت کیلئے کیا۔

(۹) نواں سفر حکومت مراکش کی دعوت پر تعلیمی کانفرنس میں شرکت کیلئے کیا۔

(۱۰) رباط کانفرنس کے دو ماہ بعد مولانا نے رابطہ میں اجلاس میں شرکت کیلئے مکہ معظمہ تک سفر کیا، اس موقعہ پر مولانا نے فسادات ہندوستان پر ایک رپورٹ بھی پیش کی۔

مولانا مودودی کو اس دوران میں لیبیا اور مشرقی افریقہ سے متعدد بار دعوت نامہ ملے۔ لیکن مولانا صحت کی خرابی مصروفیت یا پاکستان کی حکومت کی پابندیوں کی وجہ سے ملک سے باہر نہ جا سکے۔

سفر آخرت:

مولانا مودودی کافی عرصہ سے کمزوری محسوس کر رہے تھے پہلے بیماری کی شدت کم تھی مگر بعد میں زور پکڑ گئی۔ اور جوڑوں کا درد شروع ہو گیا۔ مولانا مودودی 27 مئی 1979ء کو لاہور سے امریکہ علاج کیلئے روانہ ہوئے۔ امریکہ کے بفیلو ہسپتال میں مولانا کا آپریشن ہوا۔ طبیعت ہشاش بشاش رہی۔ دوسرے دن دل کا دورہ ہوا۔ اس کے بعد تشویشناک صورت ختم ہو گئی۔ ادھر مسلمانان عالم میں ان کی صحت کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ ان دردمندانہ اور مخلصانہ کوششوں سے خدا کی اٹل تقدیر کو بدلا نہ جا سکا۔ اور ہونے والا سانحہ 22 ستمبر کو اپنے وقت پر ہو گیا۔ (276)

مولانا کی نماز جنازہ بفیلو (امریکہ) میں دو مرتبہ پڑھائی گئی۔ اور اسی دن نیویارک میں کینیڈی ایئر پورٹ پر بھی پڑھی گئی۔ لندن آئیر پورٹ پر پانچ نماز جنازہ پڑھائی گئی۔

25 ستمبر کو پاکستان واپس پہنچے۔ 5 اے ذیلدار پارک لاہور میں ملک کے گوشے گوشے سے آنے والے لاکھوں سوگواروں نے زیارت کی۔ 26 ستمبر کو نماز جنازہ قذافی سٹیڈیم لاہور میں پڑھائی گئی۔ جس میں انگلستان بھارت، سعودی عرب، عراق، شام، قطر اور دیگر ممالک کے نمائندوں کے علاوہ ملک کے لاکھوں آدمیوں نے شرکت کی۔ مولانا کو 5 اے ذیلدار پارک لاہور کے اسی سبز پلاٹ کے کونے میں دفن کیا گیا، جس میں ہر روز بعد نماز عصر اسلامی مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔

سیرت سرور عالم ﷺ کا تعارف:

مولانا مودودی سیرت سرور عالم ﷺ جلد دوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی پہلی جلد تمام تر ان مضامین پر مشتمل تھی جو جناب نعیم صدیقی صاحب اور جناب عبدالوکیل علوی صاحب نے رسالت اور سیرت پاک سے تعلق رکھنے والے مختلف مباحث پر میری

تحریروں سے نہایت خوبی کے ساتھ جمع اور مرتب کیے تھے اس میں مجھے کسی حذف واضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اس دوسری جلد کے لیے میرے جو مضامین انہوں نے جمع کیے تھے ان کے درمیان جگہ جگہ ایسے خلا باقی رہ گئے تھے جن کی موجودگی میں یہ کسی طرح سیرت کی کتاب نہ بن سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اس میں بکثرت اضافے کر کے اسے ایک مسلسل اور مربوط کتاب سیرت بنا دیا ہے یہ جلد ہجرت کے بیان پر ختم ہوئی ہے آگے مدنی دور شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کی طاقت اور توفیق عطا فرمائے اور اس کو اپنے بندوں کے لیے مفید بنائے۔

مولانا مودودی اپنی کتاب سرور عالم ﷺ کے مقدمے میں کیا لکھتے ہیں:

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام، دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں، جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ اور تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت ورہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا، تا کہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پورا کرنے کیلئے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم وملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجیے تو وہ ایک کشتی ہے نا خدا کے بغیر، جسے لے کر اناڑی مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزل مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور نبی کو کتاب اللہ سے الگ کر دیجئے تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لیے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں حتیٰ کہ آخر کار خود کتابوں کو بھی وہ گم کر بیٹھے عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا اور اس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو ابن اللہ، بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

پرانے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمت اسلام میسر آنے کے دو ہی ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آرہے ہیں۔ ایک خدا کا کلام، جو اب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے۔ دوسرے اسوۂ نبوت جو اب صرف محمد عربی ﷺ کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد ﷺ سے اور محمد ﷺ کو قرآن سے سمجھے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا، ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجہ ہدایت سے بھی۔

پھر قرآن اور محمد ﷺ دونوں چونکہ ایک مشن رکھتے ہیں، ایک مقصد ومدعا کو لیے ہوئے آتے ہیں، اس لیے ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد ومدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔ اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھیے تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرت پاک، واقعات وحوادث کا ایک مجموعہ ہے۔ آپ لغت و روایات اور علمی تحقیق وکاوش کی مدد سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں۔ اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر رسول ﷺ کی ذات اور آپؐ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں، مگر روح دین تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لیے قرآن اتارا گیا اور جس کی علمبرداری کے لیے محمد عربی ﷺ کو کھڑا کیا گیا۔ اس مقصد کا تصور جتنا صحیح ہوگا اتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور جتنا ناقص ہوگا اتنا ہی ان دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام دونوں ہی بحر ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد وبرکات کا احاطہ کر لے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد

تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روح دین تک رسائی پائے۔

میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا بے حد شکر گزار رہوں کہ قرآن پاک کو سمجھانے کے لئے جو کوشش میرے بس میں تھی اسے انجام دینے کیلئے اس نے مجھے "تفہیم القرآن" مکمل کرنے کی توفیق عطا فرما دی۔ اس کے بعد میری دلی تمنا تھی کہ سیرت رسول پاک ﷺ پر بھی ایک کتاب لکھوں۔ لیکن پہلے کام ہی میں عمر کے ۳۰ سال صرف ہو گئے اور اب میں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتا کہ دوسرا کام شروع کر سکوں۔ میرے دل میں اس کی حسرت ایک مستقل خلش بنی ہوئی تھی کہ یکا یک جناب نعیم صدیقی اور جناب عبدالوکیل علوی نے میری ہی مختلف کتابوں اور مضامین سے مرتب کیا ہوا مقالات سیرت کا یہ مجموعہ میرے سامنے لاکر رکھ دیا جسے دیکھ کر میں خود بھی حیران رہ گیا کہ اس عظیم الشان موضوع پر میری تحریروں میں اتنا کچھ مواد موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں حضرات کی اس محنت و جانفشانی پر بے اختیار دل سے داد بھی نکلی اور دعائے خیر بھی کہ انہوں نے جگہ جگہ بکھرے ہوئے اس مواد کا نہایت باریک بینی اور تجسس کے ساتھ جائزہ لیا اور اس کو بہترین طریقے سے مرتب کر دیا۔ اگرچہ یہ مجموعہ سیرت پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت کو تو پورا نہیں کرتا، لیکن اس میں جو مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں وہ ان شاء اللہ لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کے کارنامہ عظیم کو سمجھنے میں کافی مدد دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں درج کیا گیا ہے میری کتابوں اور تحریروں کے ناظرین کی نگاہ سے وہ یا اس کا کم و بیش اچھا خاصا حصہ پہلے ہی گزر چکا ہے، اور پڑھی ہوئی چیزوں کو دوبارہ پڑھنا ایک حد تک آدمی کو ناگوار گزرتا ہے۔ مگر پڑھنے والے جب اس کتاب کو پڑھیں گے تو خود محسوس کریں گے کہ سیرت پاک کے متعلق جو مضامین مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے، اور تیس چالیس سال کے دوران میں مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے، وہ یہاں ان کے سامنے یکجا ایک مرتب صورت میں آ گئے ہیں، اور اس مجموعی صورت میں ان کا مطالعہ اس مطالعہ کی بہ نسبت اپنا ایک جداگانہ فائدہ رکھتا ہے جو متفرق صورت میں حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

قرآن اور حضور ﷺ کے متعلق مستشرقین کی علمی خیانتیں:

اسلام قرآن اور سیرت نبی اکرم ﷺ کے متعلق مستشرقین نے جو کام کیا ہے اس میں بے شمار فضولیات اور نامعقول باتیں سامنے آتی ہیں جنہیں تحقیق کے خوبصورت نام سے علمی حقائق کی حیثیت دے کر پھیلایا گیا ہے۔ ان نام نہاد حقائق کے دائرے میں متعصب مصنفین سے لے کر منٹگمری واٹ جیسے معتدل مزاج اہل قلم تک ایسی ایسی مغالطہ انگیز باتیں اسلام اور نبی اکرم کے متعلق پائی جاتی ہیں کہ جن سے آگاہ ہو جانے والے منصف مزاج قارئین کی نگاہ میں مستشرقین کے سارے علمی کارناموں کی وقعت ختم ہو جاتی ہے ان شاندار علمی تحقیقی کارناموں کا ایک مقصد تو حروب صلیبیہ کی پیدا کردہ ذہنیت کے تحت عیسائیوں کے جہان افکار کو اسلام کی یلغار سے محفوظ کرنے کے لیے تعصبات کی دیواریں اٹھانا ہے ان کا دوسرا مقصد اسلام نا آشنا مسلمانوں کو اسلام کے متعلق مغالطوں اور شبہات میں ڈالنا بھی ہے۔ بایں ہمہ مستشرقین ہمارے جدید طبقوں کے لیے ایک صدی سے معلمین اسلام اور اساتذہ سیرت بنے ہوئے ہیں اور اسلام نا آشنا مسلمان ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسے ایسے شکوک میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایسے ایسے اعتراضات اپنے ہی دین کے خلاف خود اٹھاتے ہیں کہ ہر شناسائے حقیقت کے لئے حیرت و عبرت کا مقام پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں مشمولہ مواد کے فاضل مئولف نے بحیثیت متکلم اسلام علمی دائرے میں اسلامی علوم و معارف کی تجدید کا جو وسیع کام کیا ہے اس میں جابجا مستشرقین کی نکتہ آفرینیوں سے تعرض کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ حقائق کو مسخ کرنے والے ان محققین کا طلسم توڑے بغیر مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو اسلام کی حقیقت کے سرچشمے تک پہنچانا ممکن نہیں۔

چنانچہ سیرت نبی اکرم کے سلسلے میں اپنی جن تحریروں میں فاضل مئولف نے مستشرقین کی مغالطہ انگیزیوں سے تعرض کیا ہے ان میں

ہے جس تک ہماری نگاہ پہنچ سکی ہے ان کے ضروری اقتباسات اس باب میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس باب کے مواد کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین یہ ملحوظ رکھیں کہ مستشرقین نے اسلام اور نبی اسلام کو سمجھنے میں جو غلطیاں کی ہیں اور طرح طرح کے جو مغالطے پیدا کیے ہیں ان سب کا استقصا جناب مئولف نے نہیں کیا کیونکہ خود مستشرقین کے پورے کام کو موضوع بنا کر کسی مستقل کتاب یا مقالے کی تدوین نہیں کی گئی۔ صرف ضروری نکات پر حسب موقع بحث اٹھائی گئی ہے سیرت پاک سے متعلق مستشرقین کے دوسرے بے شمار اعتراضات کے جوابات مختلف ابواب میں شامل ہیں اگر چہ معترضین کے مقولے درج نہیں کیے گئے۔

یہاں واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس باب کے مواد کے بارے میں یہ مسئلہ ہمارے لیے الجھن کا باعث بنا کہ اسے کتاب کے کس حصے میں کس مقام پر رکھا جائے۔ غور و بحث کے بعد ہم نے اسے بھی بنیادی مباحث میں جگہ دی ہے، کیونکہ جہاں اس حصے کے دوسرے مضامین کو یہ اہمیت ہے کہ سیرت پاک کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے وہاں مستشرقین کے باب کا مطالعہ بعض ایسی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے جو سیرت نبوی کے فہم میں حائل ہوتی ہیں۔ (277)

اس باب کی فصل اول بڑی مختصر ہے مگر انتہائی جامع بھی ایک چند سطری عبارت کو ہم نے مستقل فصل اس لیے قرار دیا ہے کہ فاضل مئولف کا یہ نقطہ نظر نمایاں ہو کر سامنے آ جائے۔ (مرتبین)

مستشرقین کا طرز تحریر:

یہ بد طینت لوگ علم کے نام سے جو تحقیقات کرتے ہیں، اس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہر حال منزل من اللہ تو نہیں ماننا ہے اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد ﷺ نے اس میں پیش کیا ہے، یہ فلاں فلاں مقامات سے چرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں اس طرز تحقیق میں یہ لوگ اس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھن آنے لگتی ہے اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس علم پر اور اس تحقیق پر!

بحیرا راہب کا افسانہ:

"وقال الذین کفروا ان ھذا الا افک ن افترہ و اعانہ علیہ قوم اکرون فقد جاء و ظلماوزورا. وقالو اساطیر الولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرہ و اسیلا. قل انزلہ الزی یعلم السر فی اسموت و الا رض. انہ کان غفورًا رحیما". (278)

"جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ اے محمد ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے۔ اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے حقیقت یہ کہ وہ بڑا غفور ورحیم ہے" یہ وہی اعتراض ہے جو اس زمانے کے مستشرقین مغرب قرآن کے خلاف پیش کرتے ہیں۔

حضور کی قوم نے اعتراض کیوں نہ اٹھایا؟

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بحیرا راہب سے جب ملے تھے اس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے اس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی ربیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ اس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال ان کو معلوم

تھا۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوئے تھے، ان کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کسی سے کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سینکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ مکے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ علومات اس شخص کو بارہ تیرا برس کی عمر ہی میں بحیرا سے حاصل ہو گئی تھیں۔ تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا تھا، ہمارے ہی درمیان رہتا بستا تھا کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمازی کرتا؟ یہی وجہ ہے کہ کفار مکہ نے اتنا سفید جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کی اور اسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔

کفار مکہ کا اعتراض کیا تھا؟

وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوائے نبوت کے زمانے کے متعلق تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص ان پڑھ ہے خود مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا، چالیس برس کی عمر تک ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان سے نکل رہی ہیں، اب آخر یہ علومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سرچشمہ لامحالہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں دن کو سنا دیتا ہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہل کتاب تھے، پڑھے لکھے تھے اور مکہ میں رہتے تھے۔ یعنی عداس (حولطیب بن عبدالعزی کا آزاد کردہ غلام، یسار (علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام) اور جبر (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)۔ (279)

بظاہر بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوے کو رد کر دینے کے لئے نبی کے ماخذ علم کی نشاندہی کر دینے سے بڑھ کر اور کونسا اعتراض وزنی ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو صریح بے انصافی کی بات کر رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اٹھا رہے ہو، یہ تو اس خدا کا کلام ہے جو آسمان و زمین کے بھید جانتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سخت مخالفت کے ماحول میں ایسا زوردار اعتراض پیش کیا جائے، اور اس کو یوں حقارت سے رد کر دیا جائے؟ کیا واقعی یہ ایسا ہی پوچ اور بے وزن اعتراض تھا کہ اس کے جواب میں بس ''جھوٹ اور ظلم'' کہہ دینا کافی تھا؟ آخر وجہ کیا ہے کہ اس مختصر سے جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیلی اور واضح جواب کا مطالبہ کیا اور نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں کوئی شک پیدا ہوا اور نہ مخالفین ہی میں سے کسی کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ دیکھو، ہمارے اس وزنی اعتراض کا جواب بن نہیں پڑ رہا ہے اور محض جھوٹ اور ظلم کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟

اس گتھی کا حل ہمیں اسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفین اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا۔ (اس حل کو پا لینے کے لیے مولف نے ذیل کی تنقیحات قائم کی ہیں۔

پہلی تنقیح:

وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارتے کوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمد کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پر اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لا رکھتے جو ان کے زعم میں اس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ عین اس وقت چھاپا مار سکتے تھے جب کہ یہ کام کیا جا رہا ہو اور ایک مجمع کو دکھا سکتے تھے کہ لو دیکھو، یہ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بلال کو تپتی ریت پر گھسیٹنے والوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی آئین و ضابطہ مانع نہ تھا۔ اور ایسا کر کے وہ ہمیشہ کے لیے نبوت محمدی کے ''خطرے'' کو مٹا سکتے تھے۔ مگر وہ

بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کن قدم اٹھا کر انہوں نے نہ دکھایا۔

دوسری تنقیح:

جن لوگوں کے نام وہ اس سلسلے میں لیتے تھے وہ کہیں باہر کے نہ تھے اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ ان کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا، دیکھ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ کس پائے کی ہے کس شان کی زبان ہے کس مرتبے کا ادب ہے کیا زوردار کلام ہے کیسے بلند خیالات اور مضامین ہیں، اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمد ان سے یہ سب کچھ حاصل کر کر کے لا رہے ہیں۔ اس وجہ سے کسی نے بھی اس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے بس دل کے جلے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں ورنہ اس قول میں کسی شبہ کے قابل بھی جان نہیں ہے۔ جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے وہ بھی آخر اتنی ذرا سی بات تو سوچ سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انہوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ جلایا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تیل مہیا کرنے کی انہیں ضرورت کیا پڑی تھی؟ اور وہ بھی چپکے چپکے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا حصہ بھی ان کو نہ ملے۔

تیسری تنقیح:

وہ سب اشخاص جن کا نام اس سلسلے میں لیا جا رہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے، جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقت ور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے ولاء (یعنی سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ اب یہ ظاہر بات تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بدولت معاذ اللہ ایک جھوٹی نبوت کی دکان چلا رہے تھے تو یہ لوگ کسی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپ کے شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آخر کار ایسے شخص کے وہ مخلص رفیق کار اور سچے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انہی سے کچھ باتیں سیکھتا ہو اور دن کو دنیا بھر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے؟ اس لیے ان کی شرکت کسی لالچ اور کسی غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ مگر کون صاحب عقل و ہوش آدمی یہ غور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سرپستوں کو ناراض کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے ہوں گے؟ آخر کیا لالچ ہو سکتا تھا جس کی بنا پر وہ ساری قوم کے مغضوب اور مطعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہدف آدمی کے ساتھ مل جاتے اور اپنے سرپرستوں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی امید پر گوارا کر لیتے؟ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان کے سرپرستوں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ مار کوٹ کر ان سے سازش کا اقبال کرا لیں۔ اس موقع سے انہوں نے کیوں نہ فائدہ اٹھایا اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انہی سے یہ اعتراف کروا لیا کہ ہم سے سیکھ سیکھ کر یہ نبوت کی دکان چکائی جا رہی ہے۔

چوتھی تنقیح:

سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور اس ضرب المثل عقیدت میں شامل ہوئے جو صحابہ کرام آنحضور کی ذات اقدس سے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بناوٹی اور سازشی نبوت پر خود ہی لوگ ایمان لائیں اور گہری عقیدت کے ساتھ ایمان لائیں جنہوں نے اس کے بنانے کی سازش میں خود حصہ لیا ہو؟ اور بالفرض اگر یہ ممکن بھی تھا تو ان لوگوں کو اہل ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے عداس اور یسار اور جبر کے بل بوتے پر اور نبی کے ست راست بنیں ابو بکر اور عمر اور ابو عبیدہ۔

اسی طرح یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز تھی کہ اگر چند آدمیوں کی مدد سے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر نبوت کے اس کاروبار کا مواد تیار کیا جا رہا تھا

تو وہ زید بن حارثہ،علی بن ابی طالب ابوبکرصدیق اور دوسرے لوگوں سے کس طرح چھپ سکتا تھا جو شب وروز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے؟اس الزام میں برائے نام بھی کوئی شائبہ صداقت ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ اس قدر خلوص کے ساتھ حضور پر ایمان لاتے اور آپ کی حمایت میں ہر طرح کے خطرات اور نقصانات برداشت کرتے؟

یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو حق کی روشنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے ہیں۔(280)

قرآن کے تین قصص کی بحث:

مستشرقین نے قرآن کے تین قصص کو بھی اپنی تحقیق کے خراد پر چڑھایا ہے اور ان کے متعلق بھی یہ الزام لگایا ہے کہ نبی اکرم نے یہ قصص دوسرے ماخذ سے مستعار لے کر اپنی طرف سے پیش کر دیئے۔مستشرقین کے الزام واعتراض کو بیان کرنے سے پہلے لازم ہے کہ خود ان قصص کو سامنے رکھا جائے۔ورنہ آنے والی بحث کو سمجھنے میں دقت پیش آئے گی۔

(۱)حضرت موسیٰ کا سفر مجمع البحرین:

"واذقال موسیٰ لفتٰه لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرین او امضی حقباً".(281)

"(ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔"

اس مرحلے پر یہ قصہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بین نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنہیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا،نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرمانبرداروں پر مصائب کا ہجوم،بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی بدحالی،یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں،اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی کہنہ کو نہیں سمجھتے ان سے عام طور پر ذہنوں میں الجھنیں بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا اندھیر نگری ہے کوئی اس کا راجہ نہیں اور ہے تو چوپٹ ہے یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا رہے،کوئی پوچھنے والا نہیں۔مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت آزمائشوں کے موقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانہ مشیت کا پردہ اٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب وروز جو کچھ ہو رہا ہے کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

2۔قصہ کی تفصیلات:

حضرت موسیٰ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟اس کی کوئی تصریح قرآن نے نہیں کی ہے حدیث میں عوفی کی ایک روایت ہمیں ضرور ملتی ہے جن میں وہ ابن عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ نے مصر میں اپنی قوم کو آباد کیا تھا۔لیکن ابن عباس سے جو قوی روایات بخاری اور دوسری کتب حدیث میں منقول ہیں وہ سب اس بیان کی تائید نہیں کرتیں،اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ کبھی مصر میں رہے تھے بلکہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے کہ مصر سے خروج کے بعد ان کا سارا زمانہ سینا اور تیہ میں گزرا۔اس لیے یہ روایت تو قابل قبول نہیں ہے۔البتہ ہم خود اس قصے کی تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰ کو ان کی نبوت کے ابتدائی دور میں کرائے

گئے ہوں گے، کیونکہ آغاز نبوت ہی میں انبیا علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم وتربیت درکار ہوا کرتی ہے دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰ کو ان مشاہدات کی ضرورت اس زمانے میں پیش آئی ہوگی جبکہ مصر میں بنی اسرائیل کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آ رہا تھا جن سے مسلمان مکہ معظمہ میں دوچار تھے۔ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (واعلم عنداللہ) کہ اس واقعہ کا تعلق اس دور سے ہے جبکہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سرداران قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اوپر کوئی نہیں ہے۔ جو اس سے بازپرس کرنے والا ہو اور مکے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو کر پوچھ رہے تھے کہ خدایا ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰ یہ پکار اٹھے تھے کہ:

"ربنا انک اتیت فرعون وملاہ زینۃ واموالاً فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک"

"اے پروردگار تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان شوکت اور مال ودولت دے رکھی ہے، اے پروردگار، کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟"

مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ اگر ہمارا یہ قیاس درست ہو تو پھر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰ کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابیض اور البحر الازرق آ کر ملتی ہیں۔(282)

3۔تالمود کا بیان:

بائبل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔البتہ تلمود میں اس کا ذکر موجود ہے مگر وہ اسے حضرت موسیٰ کی بجائے ربی یہو حانان بن لاوی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان ہے کہ ربی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاس کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔(283)

ممکن ہے کہ خروج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو اور صدیوں بعد انہوں نے قصے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر جوڑ دی ہوں تلمود کی اسی روایت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہیں۔لیکن نہ تو تالمود کی ہر روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جا سکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی اور مجہول الحال موسیٰ کا ذکر اس طریقہ سے کیا گیا ہوگا۔اور پھر جبکہ معتبر احادیث میں حضرت ابی بن کعب کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصے کی تشریح فرماتے ہوئے موسیٰ پیغمبر بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے تلمود کا بیان لائق التفات نہیں۔

مستشرقین مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کے اس قصے کے بھی ماخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور تین قصوں پر انگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نقل کر کے یہ قصہ بنایا اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اوپر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔ایک داستان گلگامیش، دوسرے سکندر نامہ سریانی اور تیسرے وہ یہودی روایات جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

مستشرقین پر جرح کے لیے چار سوال:

ان کی اس متعصبانہ افترا پردازی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالب علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کرے:

(۱) اول یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے ملتا جلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً انہی کتابوں سے ماخوذ ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ مختلف زبانوں کو جتنی کتابوں کو آپ لوگوں نے قرآن مجید کے قصوں اور نہ دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دیا ہے اگر ان کی فہرست بنائی جائے تو اچھے خاصے ایک کتب خانے کی فہرست بن جائے۔ کیا ایسا کوئی کتب خانہ مکے میں اس وقت موجود تھا؟ اور کیا مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار ان دو تین سفروں پر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے کئی سال پہلے سے باہر کیے تھے، تو سوال یہ ہے کہ آخر ان تجارتی سفروں میں آنحضرت کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کرلائے تھے؟ اور اعلان نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرت کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

(۳) تیسرے یہ کہ کفار مکہ اور یہودی اور نصرانی سب آپ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنحضرت کے معاصرین کو اس سرقے کا پتہ نہ چلنے کی کیا وجہ ہے؟ انہیں تو بار بار تحدی کی جا رہی تھی کہ یہ قرآن منزل من اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے ہو تو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرت کے معاصر دشمنان اسلام کی کمر توڑ کر رکھ دی، مگر وہ ایک ماخذ کی بھی نشان دہی نہ کر سکے جس سے قرآن کے ماخوذ ہونے کا کوئی معقول آدمی یقین تو درکنار، شک ہی کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سراغرسانی میں ناکیوں ہوئے اور ہزار بارہ سو برس کے بعد آج معاندین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے۔

(۴) آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہر حال ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے انہی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی روایات سے مسخ ہوتی ہوئی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پا گئی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا اور کیوں صرف اسی ایک امکان کو بنائے بحث و تحقیق بنا لیا گیا کہ قرآن ان قصوں ہی سے ماخوذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟

مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ ان سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مستشرقین نے "علم" کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ درحقیقت کسی سنجیدہ طالب علم کے لیے قابل التفات نہیں ہے۔ (284)

(۲) فرعون کا ارادۂ قتل موسیٰ

"وقال فرعون ذرونی اقتل موسی و لیدع ربه" (285)

"ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہ چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور یہ پکار دیکھیں اپنے رب کو۔"

اس آیت ۴۵ تک جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ تاریخ بنی اسرائیل کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جسے خود بنی اسرائیل بالکل فراموش کر گئے ہیں۔ بائبل اور تلمود دونوں اس کے ذکر سے خالی ہیں اور دوسری اسرائیلی روایات میں بھی اس کا کوئی نام ونشان نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن مجید ہی کے ذریعے سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ فرعون اور موسیٰ کشمکش کے دور میں ایک وقت یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا۔

دعوت حق کے نقطۂ نظر سے قصے کی اہمیت:

اس قصے کو جو شخص بھی پڑھے گا، بشرطیکہ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف تعصب میں اندھا نہ ہو چکا ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ دعوت حق کے نقطۂ نظر سے یہ قصہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور بجائے خود یہ بات بعید از عقل و قیاس بھی نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ کی شخصیت، ان کی تبلیغ اور ان کے ہاتھوں ظہور پذیر ہونے والے حیرت انگیز معجزات سے متاثر ہو کر خود فرعون کے اعیان سلطنت میں سے کوئی

شخص دل ہی دل میں ایمان لے آیا ہو اور فرعون کو ان کے قتل پر آمادہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا ہو لیکن مغربی مستشرقین علم و تحقیق کے لمبے چوڑے دعووں کے باوجود تعصب میں اندھے ہو کر جس طرح قرآن کی روشن صداقتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مضمون موسیٰ کا مصنف اس قصے کے متعلق لکھتا ہے:۔

''قرآن کی یہ کہانی فرعون کے دربار میں ایک مومن موسیٰ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، پوری طرح واضح نہیں ہے (سورہ۔۴۰ آیت ۲۸)۔ کیا ہمیں اس کا تقابل اس قصے سے کرنا چاہیے جو ہگادا میں بیان ہوا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ تھیرو نے فرعون کے دربار میں عفو سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا؟ (286)

مدعیان کی شبہ انگیزی:

گویا ان مدعیان تحقیق کے ہاں یہ بات تو طے شدہ ہے کہ قرآن کی ہر بات میں ضرور کیڑے ہی ڈالنے ہیں۔ اب اگر اس کے کسی بیان پر حرف زنی کی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو کم از کم یہی شوشہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ قصہ پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اور چلتے چلتے یہ شک بھی پڑھنے والوں کے دل میں ڈال دیا جائے کہ ہگار میں تھیرو کا جو قصہ حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے کا بیان ہوا ہے وہ کہیں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا ہو گا اور اسے لا کر یہاں اس شکل میں بیان کر دیا ہو گا۔ یہ ہے ''علمی تحقیق'' کا وہ انداز جو ان لوگوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔ (287)

(۳) قصہ اصحاب کہف۔

غار میں مدت قیام پر اعتراض:

بعض مستشرقین نے اس قصے کو قصہ اصحاب کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن ان کے قیام غار کی مدت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس سورہ کے حاشیہ ۲۵ میں ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ آیت ۲۵ میں اصحاب کہف کے غار میں قیام کی مدت ۳ سو اور ۹ سو نو سال کی جو بیان کی گئی ہے یہ ہمارے خیال میں دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول۔ اور اس دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے (آیت ۲۶) میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

گبن کی جسارت:

مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ سریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ''جہالت'' کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے اس کے متعلق وہ خود جانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے۔ اور اتنی مدت کے انداز زبانی روایت کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایات کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے صرف ان ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ (288)

عیسائی نوشتوں سے شہادت:

اس قصے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جمیس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحاب کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دور کے مفسرین کو پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی کتا "تاریخ زوال وسقوط دولت روم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" (seven sleepers) کے عنوان کے تحت ان ماخذ سے اس قصے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحاب کہف غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے، ہمارے مفسرین اس نام دقینوس یا دقیانوس یا دمیوس بتاتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیس (decius) تھا جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنت روم پر فرمانروائی کی ہے اور مسیح علیہ السلام کے پیروں پر ظلم وستم کرنے کے معاملہ میں جس کا عہد بہت بدنام ہے جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین افس یا افسوس لکھتے ہیں اور گبن اس کا نام افسس (Ephesus) بتاتا ہے جس ایشائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیلوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا جس کے کھنڈر آج موجود ترکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۳۰۔۳۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ۱) پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحاب کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین تیذوسس لکھتے ہیں اور کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسرین یملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے ئملیخس (jamblichus) لکھتا ہے۔

دو طرفہ روایات میں یکسانیت:

مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ قصے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیروں پر سخت ظلم وستم ہو رہے تھے یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں یہ لوگ بیدار ہوئے جبکہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔ (289)

فصل ہفتم

پیر کرم شاہ الازہری بحیثیت سیرت نگار

احوال و آثار:

ذیل میں ہم پیر کرم شاہ الازہری کا تعارف پیش کرتے ہیں:

1857ء کی جنگ آزادی نے مسلمانوں کو علمی فکری معاشرتی اور معاشی لحاظ سے کمزور کر دیا اور مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔لیکن اپنی ناگفتہ بہ حالات میں ہندوستان کے ایک کونے میں ایک مرد درویش کے گھر ایسے خوش بخت اور خوش خصال بچے کی ولادت ہوئی کہ جس نے آگے جا کر مایوسی کے اندھیروں میں یقین کی شمع روشن کی اور آپ کے اقدامات سے ایسا لگا کہ جیسے صحرا میں پیاسے کو چشمہ آب نظر آ جائے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب بھی اسلام پر مشکل وقت آیا تو صوفیاء نے اسلام کی ڈوبتی نیا کو سہارا دیا اور صوفیاء نے ہی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا اور ان نفوس قدسیہ کی خدمات کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا۔(290)

حضرت پیر کرم شاہ الازہری کا سلسلہ نسب:

آپ کا سلسلہ نسب 22 واسطوں سے حضرت غوث العالمین بہاوالحق،والدین ابومحمد زکریا ملتانی سے جا ملتا ہے۔سلسلہ نسب یہ ہے:

حضرت پیر محمد کرم شاہؒ بن حضرت پیر محمد شاہ صاحبؒ بن حضرت امیر شاہ بن حضرت پیر شاہؒ بن حضرت شمس الدینؒ بن حضرت عبداللہ شاہؒ بن حضرت محمد غوثؒ بن حضرت غلام محمد حسین شاہؒ بن حضرت شیخ محمدؒ بن حضرت شیخ محمودؒ بن حضرت شیخ احمدؒ بن حضرت شیخ نظام الدینؒ بن حضرت شمس الدین لاہوری لقب کروڑیؒ بن حضرت شیخ صدرالدین بادشاہؒ بن حضرت شہراللہ صاحب سجادہؒ بن حضرت شیخ یوسفؒ بن حضرت شیخ عمادالدینؒ بن حضرت شیخ رکن الدین سمرقندیؒ بن حضرت صدرالدین حاجیؒ بن حضرت شیخ اسماعیل شہیدؒ بن حضرت مولانا صدرالدین قتال عارف باللہؒ بن حضرت بہاوالدین زکریا ملتانیؒ۔(291)

پیر کرم شاہ الازہری کی ولادت:

آپ نسبتاً ہاشمی قریشی اور مسلکاً حنفی ہیں۔ 21 رمضان المبارک 1336ھ بمطابق کیم جنوری 1918ء شب شنبہ بعد از نماز تراویح بھیرہ شریف میں آپ کی ولادت ہوئی۔(292)

پیر محمد کرم شاہ صاحب کا نام و کنیت:

پیر کھارا کوہستان کے دامن میں ایک گاؤں ہے جو حضرت پیر کرم شاہ المعروف ''ٹوپی والے'' کے فیض کی وجہ سے مرجع خلائق ہے۔

چونکہ اس جلیل القدر ہستی کے ساتھ آپ کے خانوادہ کی رشتہ داری بھی تھی۔اس لئے آپ کے جد امجد حضرت پیر امیر شاہ صاحبؒ نے انہی کی نسبت سے آپ کا نام پیر محمد کرم شاہ رکھا۔آپ کی کنیت ابوالحسنات آپ کے بڑے صاحبزادے محمد امین الحسنات شاہ صاحب جو پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ان دنوں جامع عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں زیر تعلیم ہیں کے نام سے منسوب ہے۔(293)

بیعت:

سلسلہ عالیہ چشتیہ میں بچپن میں حضرت خواجہ ضیاءالدین سیالوی کے دست اقدس پر بیعت ہوئے۔تحصیل علوم سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالویؒ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے اور خلافت سے نوازے گئے۔(294)

پیر کرم شاہ الازہری کی تعلیم قرآن:

خاندانی روایت کے مطابق آپ کی تعلیم کا آغاز قرآن کریم سے ہوا جن اساتذہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کی ان کے نام یہ ہیں:

1۔ حافظ دوست محمد صاحب

2۔ حافظ مغل صاحب

3۔ حافظ بیگ صاحب

ثقہ روایت یہ ہے کہ حافظ دوست محمد صاحب سے تعلیم کا آغاز ہوا قرآن کریم کا کچھ حصہ حافظ مغل صاحب سے اور کچھ حصہ حافظ بیگ صاحب سے پڑھا۔ختم قرآن کے بعد کچھ مدت حافظ کرم علی صاحب کو قرآن کریم سناتے رہے۔(295)

پیر کرم شاہ الازہری کی سکول کی تعلیم کا آغاز:

محمدیہ غوثیہ پرائمری سکول کا آغاز 1925ء میں ہوا۔آپ اس سکول کے پہلے طالب علم ہیں۔اس لحاظ سے سات سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز کیا۔قرین قیاس بات یہ ہے کہ آپ دربار عالیہ سے متصل درس قرآن میں بھی شامل ہوتے رہے اور ساتھ ہی سکول کی تعلیم کا بھی آغاز کر دیا۔

سکول کے اساتذہ میں سے پہلے استاد کا نام ماسٹر برخوردار تھا۔جو محمدیہ غوثیہ سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔پرائمری سکول میں اس وقت چار کلاسز ہوتی تھیں اس لحاظ سے اس سکول میں آپ کی تعلیم کا سلسلہ 1925ء سے 1929ء تک رہا۔اس کے بعد آپ نے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا اور 1936ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ہائی سکول میں تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے اکتساب فیض کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

1۔ محترم چوہدری ظفر احمد صاحب

2۔ محترم فرمان شاہ صاحب

3۔ محترم قاضی محمد صدیق صاحب

4۔ محترم شیخ خورشید احمد صاحب

یہ سب وہ اساتذہ ہیں کہ جن کے اثرات آپ کی طبیعت پر گہرے ہیں۔(296)

پیر محمد شاہ صاحب کا وصال:

24 شعبان 1376ھ، 26 مارچ 1957ء کو حضرت پیر محمد شاہ صاحب اس عالم فانی سے دار بقاء کی طرف کوچ کر گئے اور بوقت انتقال بھی آپ کی زبان پر سورۃ یٰسین اور سورۃ ملک کا ورد تھا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون (297)

پیر کرم شاہ الازہری کے قائم کردہ دینی و تعلیمی ادارے:

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کی تحریک جس کا آغاز 5 طلباء اور مسجد درگاہ حضرت امیر السالکینؒ سے متصل ایک حجرہ سے ہوا تھا۔حضرت ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ کی سرپرستی میں بے شمار تعلیمی ادارے اندرون ملک اور بیرون ملک دینی اور علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ داتا نگر بادامی باغ لاہور

2۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ خیابان کرم چک شہزاد اسلام آباد
3۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سیالکوٹ کینٹ
4۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ الفرید ٹاؤن منڈی بہاؤالدین
5۔ دارالعلوم ضیاءالقرآن سعید آباد ڈیوکن گجرات
6۔ جامعہ الکرم انگلینڈ
7۔ جامعہ اسلامیہ مجددیہ رضویہ چکسواری میرپور آزاد کشمیر
8۔ دارالعلوم قادریہ وارثیہ گوجر خاں
9۔ دارالعلوم گلزار حبیب میرپور آزاد کشمیر
10۔ جامعہ قمر العلوم مظہریہ قمر سیالوی روڈ گجرات
11۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ ملکوال
12۔ جامعہ محی الاسلام گجرات
13۔ جامعہ حیدریہ فضل العلوم جلالپور شریف
14۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ رستم آباد چک جھمرہ اسلام آباد
15۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سرگودھا
16۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ فاضل بھکر
17۔ دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانیہ پنجاب کالونی کراچی
18۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ جلپانہ تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا (298)

پیر کرم شاہ الازہری کی تصانیف کا مختصر تعارف:

حضور ضیاءالامت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اپنی ترجیحات صرف ایک تعلیمی ادارے پر ہی مرکوز نہ کیں بلکہ امت مسلمہ کو درپیش کا جائزہ لے کر تصنیف وتالیف اور صحافت کے میدان میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

آپ کی تصانیف کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ تفسیر ضیاءالقرآن — 5 جلدیں
2۔ سیرت ضیاءالنبی — 7 جلدیں
3۔ سنت خیر الانام
4۔ مقالات ضیاءالامت — 2 جلدیں
5۔ دلائل توحید
6۔ شرح قصیدہ اطیب النغم
7۔ ابر کرم
8۔ فتنہ انکار حدیث
9۔ حقیقت استمداد

10۔ علوم نبوت پیر مرید کا تعلق

11۔ رویت ہلال اور اس کا شرعی ثبوت

12۔ عزم وتوکل

13۔ تبارک الذی

14۔ پیمان سرفروشی

15۔ حقیقت شرک اور اس کا بطلان

16۔ محسن کائنات

17۔ اسلامی فلسفہ عدل وانصاف

18۔ دورہ چین کے تاثرات

19۔ حضرت امام حسین اور یزید

20۔ کمالات مصطفیٰ

21۔ غفلت کا انجام کلمہ طیبہ (299)

علالت وفات:

آپ کو کافی عرصہ ذیابطیس کا مرض تھا۔ آہستہ آہستہ اعصابی کمزوری بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بغیر سہارے کے چلنا مشکل ہوگیا۔ دسمبر 1997ء میں طبیعت میں کافی کمزوری آ گئی۔ ذیابطیس اور دماغ کی رگ پر فالج کے حملہ کے ساتھ ساتھ آپ کو ضیق النفس کے مرض کی شکایت بھی تھی۔ اس میں اگرچہ عام حالات میں شدت دیکھنے میں نہیں آئی۔ تاہم نزلہ، زکام جیسے عارضوں کے لاحق ہونے کے بعد بلغم سانس کی نالیوں اور پھیپھڑوں میں جم جاتی تھی۔ جس سے آپ کو سانس لینے میں کافی دشواری محسوس ہوتی تھی۔ امراض کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا اور یکم جنوری 1998ء کو اسلام آباد جانے کا پروگرام بنا۔ دو دن دارالعلوم میں قیام رہا۔ مختلف ڈاکٹر صاحبان سے مشاورت کا سلسلہ جاری رہا۔ تمام ٹیسٹ کروائے گئے۔

ڈاکٹر محمد طارق صاحب نیورو سرجن اسلام آباد کمپلیکس کے ایماء پر 2 جنوری تا 7 جنوری 1998ء پانچ دن ہسپتال میں رہے۔ 9 جنوری 1998ء کو سرگودھا سے چیک اپ اور ایک ٹیسٹ کروایا۔ 10 جنوری 1998 کا دن انتہائی بہتر گزرا اور سارا دن احباب سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔

دس اور گیارہ جنوری کی درمیانی رات تھی کہ حضور ضیاء الامتؒ پر غشی کی صورت طاری ہوئی۔ چنانچہ 11 جنوری سے 7 مارچ 1998ء تک اسلام آباد کمپلیکس میں قیام رہا ایک ہفتہ دارالعلوم میں گزرا پھر ہسپتال میں منتقل ہوگئے۔ بیرون ملک سے بھی وفود آئے اور زیارت کرتے رہے۔ (300)

9 ذوالحجہ کا دن آ گیا۔ ساڑھے سات بجے تک آپ کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ 8 بجے اچانک کیفیت بدلنے لگی اسی اثناء میں زوردار آندھی آئی۔ 9 بج کر 27 منٹ تھے کہ 9 ذوالحجہ 1418ھ، 1998 کو وہ روح جس نے لاکھوں مردہ دلوں کو نئی زندگی عطا کی تھی فرشتوں کی بارات میں اپنے خالق کے پاس حریم ناز میں چلی گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون (301)

پیر کرم شاہ الازہری کی تعلیمات:

پیر محمد کرم شاہ الازہری کی پوری زندگی علم وتعلیم سے آراستہ تھی۔ آپ کی حیات طیبہ کے شب وروز پیچ وتاب رازی کا عملی نمونہ تھے۔ آپ کی زندگی کی بڑی خواہش یہ تھی کہ امت مسلمہ میں کچھ ایسے بلال وصفت اور سیماب صورت لوگ تیار ہو جائیں جن کا عمل بے غرض ہو۔ نگاہ بلند ہو، عزم جواں ہو اور جن کا دل مقام مصطفیٰ ہو۔

آپ نے ان دل شکن اور مایوس کن حالات میں اپنے مشن کا آغاز کیا اور روایتی طریقہ کو ترک فرما کر ایک نیا انداز تعلیم اور مخصوص طریقہ تربیت اختیار فرمایا۔ تا کہ ان کے حلقہ تربیت میں پرورش پانے والا شخص صرف مسجد ومحراب کی زینت نہ ہو بلکہ ہر شعبہ زندگی کا شہسوار ہو۔ ان صفات عالیہ سے متصف کرنے کے لئے آپ کی نمایاں تعلیمات کے چند سلسلے یہ تھے۔

1۔ اخلاص اور اصلاح نیت

2۔ ریاکاری سے اجتناب

3۔ امانت وتدبیر

4۔ دولت استغناء

5۔ وقت کی اہمیت

6۔ محبت رسول ﷺ اور اطاعت رسول ﷺ

7۔ سیرت اور کردار سازی

8۔ خوش خلقی اور تالیف قلوب

9۔ استاد اور مرشد کی عطا (302)

ضیاء النبی کا تعارف:

20ویں صدی کے شروع میں اردو ادب میں سیرت کی دو شاہکار کتابیں (رحمۃ للعالمین، قاضی محمد سلیمان منصور پوری) اور (سیرۃ النبی ﷺ مولفین، شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی) نظر آتی ہیں اور پوری صدی میں مقبولیت کے اعتبار سے کوئی کتاب ان کی ثانی نہیں ہے۔

بالکل اسی طرح اس رواں صدی میں چمنستان سیرت میں ایک خوبصورت ومعطر گل سرسبز کا اضافہ ضیاء النبی "پیر محمد کرم شاہ الازہری" کی صورت میں ہوا ہے۔ جس کا ہر لفظ روشنی، اس کی ہر خوشبو ہے۔ سیرۃ النبی ﷺ کے مولفین کی طرح یہ بھی ایک عاشق رسول کا والہانہ لگاؤ اور اظہار عقیدت ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے حضرت محمد ﷺ کی شان میں ایک منفرد انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو پر انہیں یکساں قدرت حاصل ہے۔ مصنف نہ صرف عالم دین مفسر قرآن ہیں بلکہ قدیم اور جدید علم کے ماہر بھی ہیں اور فقہ میں بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

پانچ ضخیم جلدوں میں آپ کی معرکۃ آراء تصنیف ضیاء القرآن اہل علم سے خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ فتنۂ انکار حدیث وسنت کے رد میں آپ کی شاہکار تصنیف سنت خیر الانام بھی ایک نمایاں مقام کی حامل ہے۔ ہمارا مقصد آپ کی ہمہ گیر دینی وتصنیفی خدمات کا استقصاء مقصود نہیں بلکہ عصری ادب سیرت میں ضیاء النبی کا جائزہ لینا ہے۔

ضیاء النبی کا مقصد تالیف:

پیر کرم محمد شاہ الازہری نے ضیاء النبی ﷺ کی پہلی جلد میں مقصد تالیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سیرت طیبہ کے موضوع پر آج کل بازار میں جولٹریچر آرہا ہے ان میں بھی عام طور پر کمالات محمدی اور شمائل مصطفی کے ذکر مبین بخل سے کام لیا جانے لگا ہے۔ اس لئے عصر جدید کی کتب سیرت کا مطالعہ کرنے سے واقعات تو اپنے تاریخی تسلسل کے ساتھ ذہن نشین ہوجاتے ہیں اور ان کا ربط وضبط بھی کافی حد تک سمجھ میں آجاتا ہے۔ مخالفین کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کے معقول وجوابات پر بھی آگاہی حاصل ہوجاتی ہے لیکن عام طور پر قاری مطالعہ سیرت سے بہرہ ور رہتا ہے۔ محبت نبوی ﷺ کا جذبہ طوفان بن کر اس کے سینے میں امڈ کر نہیں آتا۔ دل بے قرار ہو کر اللہ کے رسول ﷺ کے نقوش پا کو غیر مشروط طور پر اپنا خضر راہ بنانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔

میری تمنا یہ ہے کہ میری خالق کریم، میرے معبود برحق نے کمال فیاضی سے اپنے حبیب اور ہمارے رسول ﷺ کو جو کمالات، جو خوبیاں اور جن صفات حمیدہ سے مزین کیا ہے اور اس کے اسوہ حسنہ کو جن دلاویزیوں اور رعنائیوں کا پیکر جمیل بنایا ہے۔ حتی الامکان ان کو بیان کرنے کی کوشش کروں تاکہ اس ذات قدسی صفات، اس طور تجلیات رحمانی کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے کی جسے سعادت نصیب ہو اس کا دماغ بھی اس منبع انوار کے جلوؤں سے روشن ہو اور اس کا دل بھی اس کی از حد حسین اداؤں پر فریفتہ ہو۔ (303)

ضیاء النبی ﷺ کی سات جلدوں کا ایک تحقیقی جائزہ:

ضیاء النبی ﷺ سات جلدوں پر مشتمل ہے اور ان تمام جلدوں کے عنوانات ایک نظر میں ملاحظہ فرمادیئے:

جلد اول:	قبل از اسلام کرہ ارضی کے حالات	تا	حضور اکرم ﷺ کے اسلاف کرام کا تفصیلی جائزہ
جلد دوم:	ولادت باسعادت	تا	معراج شریف
جلد سوم:	یثرب کی طرف حضور ﷺ کی ہجرت	تا	واقعہ افک
جلد چہارم:	غزوہ احزاب	تا	وصال نبوی ﷺ اور بیعت سیدنا صدیق اکبرؓ
جلد پنجم:	اخلاق وشمائل نبوی ﷺ معجزات اور فضائل درود شریف		
جلد ششم:	مستشرقین تاریخ، مقاصد، طریقہ کار اور اسلام پر اعتراضات		
جلد ہفتم:	مستشرقین کے اسلام پر اعتراضات کے جوابات		

دعا:

کتاب کے شروع ہی میں مصنف نے کتاب کی شان اور خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ''دعا'' کے عنوان سے رقم طراز ہیں۔

''الٰہی: جو شان، جو فضل و کمال، جو صدی محاسن اور معنوی خوبیاں تو نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو عطا فرمائی ہیں ان کا صحیح فرمان اور پہچان بھی نصیب فرما اور ان کو اس طرح بیان کرنے کی توفیق مرحمت فرما جس کے مطالعہ سے تاریک دل روشن ہو جائیں۔ مردہ روحیں زندہ ہو جائیں، ذوق وشوق کی دنیا آباد ہو جائے جہاں غفلت کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہاں تیرے ذکر پاک اور تیرے محبوب مکرم کی مبارک یاد کی قندیلیں فروزاں ہو جائیں''۔ (304)

ضیاء النبی ﷺ کو اہل علم کا خراج تحسین:

ضیاء النبی کو چند ہی سال میں جو قبولیت وشہرت حاصل ہوئی وہ پیر صاحب کی حضور ﷺ کی مبارکہ سے والہانہ عقیدت اور بے پناہ محبت کا نتیجہ ہے۔ ذیل میں ہم چند اہل علم کی آرا تحریر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری: (سربراہ منہاج القرآن پاکستان)

''ضیاء النبی ﷺ میں سرور کائنات ﷺ کی عالمگیر شخصیت کا کامل بیان ہے۔ یہ کتاب طالب علم کے لئے اہم دستاویز اور عام مسلمانوں کے لئے سیرۃ النبی ﷺ اور دیگر اسلامی علوم کا ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔ نیز اس کی اشاعت سے ایک سو سالہ علمی خلا پر ہو گیا ہے''۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان: (نامور معروف سائنسدان)

''میں انجینئر ہونے کے ناطے اس میدان کا آدمی نہیں تاہم مجھے جس قدر اس کتاب سے استفادہ کا موقع ملا ہے اس کی روشنی میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کتاب کے اندر بیان اور معیار تحقیق کے حوالے سے اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ بہت کم ہے۔

ضیاء النبی ﷺ حضور سرور دو عالم ﷺ کے رخ نور کی ضیاء پاشیوں سے ہماری زندگی کی تاریک راہوں کو جگمگا رہی ہے۔ وہ لوگ یقیناً خوش قسمت ہیں جو اس کے مطالعہ سے قلب و دماغ کو روشن کرتے ہیں''۔

ڈاکٹر محمد طفیل: (ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد)

''اس تصنیف لطیف کا ایک ایک صفحہ حرف حرف عشق رسول ﷺ سے عبارت ہے''۔

پروفیسر پریشان خٹک: (سابق چیئرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن)

''پیر محمد کرم شاہ نے ضیاء النبی ﷺ تصنیف فرما کر جہاں ایک طرف سیرت طیبہ کے بیان کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہاں فن تاریخ نویسی کو بھی حسن بخشا ہے''۔ (305)

اسلوب نگارش:

کتاب کا اسلوب ادبی اور انداز بیان دلکش اور منفرد ہے۔ اس نظریہ سے یہ کتاب اردو ادب کا بہترین شاہکار نظر آتا ہے۔ مثلاً مصنف نے کتاب کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔

''خیابان ہستی اجڑا پڑا تھا۔ خزاں کی چیرہ دستیوں سے گلوں کی نکہت افشانیوں اور عنادل کی نغمہ ریزیوں کی یاد تک بھی گلدستہ طاق نسیاں بن چکی تھی۔ روشیں ویران تھیں اور آب جوئیں خشک۔ جہاں کبھی سبزہ نو دمیدہ جنت نگاہ ہوا کرتا تھا۔ وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ یاس و قنوط کی ایک ہمہ گیر کیفیت طاری تھی کہ اچانک فاران کی چوٹیوں سے ایک گھنگھور گھٹا اٹھی جس ہر قطرہ بہار آفرین اور جس کا ہر چھینٹا فردوس بداماں تھا۔ یہ گھٹا برسی اور خوب دل کھول کر برسی یہاں تک کہ گلزار عالم میں پھر آثار حیات نمودار ہونے لگے۔ انسانیت کے پژمردہ چہرے پر شباب وقوت کی سرمستیاں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ (306)

کتاب کا یہ اسلوب نگارش اس لئے بھی ضروری تھا کہ مد مقابل ایسی ہی تحریریں تھیں جن میں بقول مصنف کے ''تحریروں میں بلا کی فصاحت و بلاغت تھی''۔ جن کے اسلوب واستدلال سے اردو داں طبقہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور مصنف نے یہ اسلوب اول تا آخر برقرار رکھا۔ لیکن شومئی قسمت کہ ہم میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہیں شیکسپیئر و برناڈ شاہ کے ڈراموں اور ورڈز ورتھ اور ٹینی سن کی Poetry نے فرصت ہی نہیں دی کہ وہ اپنے چشمہ حیات کی طرف بھی التفات کر سکیں۔

ہم میں ایسے قانون دان بھی ہیں جن کی ساری عمر ہر آن بدلنے والے وضعی قوانین کے مطالعہ میں گزری ہے اور اب وہ ایسے قانون کو جامد اور نا قابل سمجھتے ہیں جس میں ثبات و قرار ہو خواہ اس کا فیض سورج کی طرح پرانا اور اس کی تاثیر سورج کی پرانی کرنوں کی طرح ہر وقت حیات بخش اور روح آفریں ہو۔ اس لئے وہ یہ فرق محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔ جو انسانی تشریع میں اور اس تشریع میں ہوتا ہے جو اللہ کا رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ (307)

حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ کی تحقیقات سے درج ذیل اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں:

1۔ جن کتب سے وہ اعتراضات کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں ان کے جوابات بھی انہی کتب میں موجود ہوتے ہیں۔

2۔ مستشرقین ضعیف روایات بنیاد پر اعتراضات کا محل تیار کرتے ہیں اور مرعوب زدہ مسلم ذہن اسے غیر جانبدار تحقیق سمجھ لیتے ہیں۔

3۔ ہم مسلمات کے جواب دینے کے پابند ہیں جو نظریات ہم پر مسلط کئے گئے ان کے ذمہ دار نہیں۔ جواب دینے کے حوالے سے اسلاف کی روش یہی تھی۔

4۔ فریقین کا مئوقف دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مستشرقین اسلام کے خلاف مقدمہ خود دائر کرتے ہیں خود ہی وکالت کرتے ہوئے فیصلہ صادر کردیتے ہیں۔

5۔ حق دنیا میں ایک ہی ہے۔ اس لئے اس حق کو پاہی ہونے کے ناطے حق کا دفاع کرنا ہے۔ معذرت خواہانہ رویہ سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اپنے اصول وضوابط طے کرکے ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے نہ کہ ان کے ضوابط کو فوری تسلیم کرلیا جائے۔

6۔ ہمیں مستشرقین کو بھی چیلنج کرنا چاہیے کہ وہ اپنی مذہبی لٹریچر کی حقانیت اور مسلمہ حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے اصول وضوابط تشکیل دیں اور پھر دیکھا جائے کہ مسلمانوں کا معیار ان سے کس قدر سخت اور کڑا ہے۔ (308)

جہاں تک پیر صاحب کی عظیم کاوش جو سیرت النبی ﷺ کے حوالہ سے "ضیاء النبی" کی شکل میں موجود ہے۔ یہ آپ کی نگارش سات مجلدات میں ہے اس کتاب کی جلد نمبر 6 اور 7 تحریک استشراق کے لئے مختص ہے۔ اس میں آپ نے بڑی وضاحت سے تحریک استشراق کا تعارف، آغاز، تاریخی جائزہ، مقاصد، طریق کار اور اسلام پر ان کے حملوں کی جہتوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص انداز با مقصد اور جاندار تحریروں سے کتاب ھذا کو مزین وآراستہ کیا ہے۔ جو آپ کی ثقافتہ علمیہ اور پیغمبر اسلام وآخرالزمان نبی جناب محمد ﷺ سے عشق ومحبت کا منہ بولتا اور بین ثبوت ہے۔

تحریک استشراق پر کلام کا آغاز استشراق کی تعریف سے کیا اور ابتداء سے ہی بڑا واضح اور دوٹوک مئوقف اختیار کیا۔ جس کا ثبوت اور خوبصورت مثال لفظ استشراق کی تعریف ہے۔ شیخ نے مختلف علماء ومحققین کی تعریفات ذکر کرنے کے بعد ان پر تعلیق اس انداز سے لگائی:

"ان تعریفوں میں سے کوئی تعریف بھی ایسی نہیں جو صدیوں سے موجود استشراق کی فعال اور متحرک تحریک کے مقاصد اور عملی پہلوؤں پر صحیح روشنی ڈالتی ہیں"۔ (309)

اس کے بعد مزید تعریفات ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معایب اور محاسن بھی ذکر کئے ہیں۔ اور آخر میں مستشرقین کی عملی جدوجہد، خفیہ مقاصد اور بے شمار علمی کارناموں اور مختلف طبقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحریک استشراق کی تعریف ووضاحت اپنے مخصوص انداز واسلوب میں اس طرح کرتے ہیں:

"اہل مغرب بالعموم اور یہود ونصاریٰ بالخصوص، جو شرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیبوں وتمدن، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات، وسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لباس میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کرسکیں اور ان پر سیاسی غلبہ حاصل کرکے ان کے وسائل حیات کا استحصال کرسکیں۔ ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے وہ لوگ منسلک ہیں وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے"۔ (310)

اس کے بعد پیر صاحبؒ نے تحریک کے آغاز اور تاریخ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس کو چھ مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے جن سے قارئین مستشرقین کی تگ ودو اور ان کے کام کی نوعیت سے بخوبی آگاہ ہوسکتے ہیں۔ (311) اسی طرح شیخ نے مستشرقین کا بنظر عمیق مطالعہ اور ذکر کرنے کے بعد ان کو درج ذیل چھ طبقات میں تقسیم کیا ہے:

1۔ خالص علم کے شیدائی مستشرقین
2۔ متعصب یہودی اور عیسائی مستشرقین
3۔ ملحد مستشرقین
4۔ اپنے علم کو پیسہ بنانے والے مستشرقین
5۔ ایسے مستشرقین جن کی تحریروں میں اسلام کے متعلق انصاف کی جھلک نظر آتی ہے۔
6۔ وہ لوگ جو مستشرق تھے لیکن حق کا نور دیکھ کر اس کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ (312)

پیر صاحب نے فتنۂ استشراق کے مضر اثرات اور اس فتنہ کے اسباب وعلل پر تفصیلی بحوث قلمبند کی ہیں۔ مثال کے طور پر مستشرقین کے اسی خوفناک رویہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہے:

انسان حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ جب یہ دیکھتا ہے کہ مستشرقین قرآن حکیم کو (نعوذ باللہ) ایک لغو کتاب سمجھتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی طرف ہر ممکن نقص اور برائی کو منسوب کرتے ہیں۔ دین اسلام کو عیسائیت اور یہودیت کی بگڑی ہوئی شکل سمجھتے ہیں۔ امت مسلمہ کو غیر مہذب اور پسماندہ قوم سمجھتے ہیں۔ اقوام شرق کو پیدائشی طور پر فکری صلاحیتوں سے عاری اقوام سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام اور شرق کے متعلق اس منفی رویے کے باوجود صدیوں سے مستشرقین کے بہترین ذہن سب کچھ چھوڑ کر انہی موضوعات کی تحقیق میں اپنی زندگیاں صرف کر رہے ہیں۔ جن موضوعات کی طرف کسی خیر کو منسوب کرنا وہ مغرب کی توہین سمجھتے ہیں اور ان سے استفادے کو آسان بنانے کے لئے اشاریے اور فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔ (313)

پھر اس پر خود ہی سوال اٹھاتے ہیں، کہتے ہیں:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اتنے بڑے تضاد کی وجہ کیا ہے؟ پھر خود ہی اس سوال کا جواب بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''چاہیے تو یہ تھا کہ جب اہل مغرب اسلام کو عیسائیت کی محض بگڑی ہوئی شکل سمجھتے ہیں اور ان کی ہر مقدس شے پر مسلسل وار کر رہے ہیں''۔ (314)

پھر پیر صاحب تحریک استشراق میں مختلف مذاہب اور نظریات سے تعلق رکھنے والے جو لوگ جمع ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مقاصد ومزاعم کا ذکر کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''اختصار کے طور پر ہم مستشرقین کے متعدد مقاصد کو مندرجہ ذیل چار عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہے:

(1) دینی مقاصد (2) علمی مقاصد (3) اقتصادی مقاصد (4) سیاسی مقاصد یہ سب کچھ ذکر کرتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کا لہجہ بہت سنجیدہ اور درد سے چور ہے۔ لیکن جونہی مسلمانوں میں سے ان کا ذکر کرتے ہیں جو اس فتنۂ استشراق کو صحیح طور پر سمجھ رہے ہیں اور ان کے سامنے بند باندھنے کے لئے تیار ہو رہے تو ان کا لہجہ بہت خوشگوار ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ آپ خوش ہو کر چہکنے لگے ہوں۔

مستشرقین کے بالمقابل مسلمانوں کی حالت بہت دیگرانداز میں ذکر فرماتے ہیں اور ان کا لہجہ افسردہ محسوس ہوتا ہے اور بطور خاص ساتویں جلد جس میں مستشرقین کے تیر وتفنگ کا ہدف پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ اس کے عناوین کے ذکر سے ہی صورت حال کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس (ساتویں جلد) کے موضوعات پر غور فرمائیے:

مستشرقین اور سنت رسول ﷺ، اس کے بعد مستشرقین اور سیرت رسول ﷺ کا موضوع دیا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ کے سماجی مقام کو کم کرنے کی کوششیں پھر حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) مرگی کا مریض قرار دینے کی سازش کا ذکر، اس کے بعد اپنی رسالت پر حضور ﷺ کے ایمان کو مشکوک ثابت کرنے کی کوششیں اور اس موضوع کے بعد حضور ﷺ کے پیغام اور آپ کی کامیابیوں کی مادی توجیہات اور ان موضوعات

کے ذکر کے بعد حضور ﷺ کے اخلاق و کردار پر حملے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس کے بعد تعدد ازدواج کا مسئلہ اور مستشرقین یہ وہ موضوع ہے جو دشمنان اسلام کے لئے بہت مرغوب رہا ہے۔ پھر غزوات و سرایا کے موضوع پر قلم فرسائی فرمائی اور آخر میں وہی دشمنان اسلام کا پرانا روگ ''اسلام بزور تلوار پھیلا'' اس موضوع کو بحث کے لئے پیش کیا ہے۔ ان سارے مسائل اور ان کے حل کے لئے ایک بات جو قاری کو بار بار متوجہ کرتی ہے وہ پیر صاحب کا وہ درد اور چبھن جو مستشرقین کے رویے سے ہر دیندار اور مسلمان محسوس کرتا ہے۔ وہ پیر صاحب کے ہاں بہت واضح ہو کر اور کھل کر سامنے آتی ہے۔ لیکن اسی دوران جب جامعہ ازھر کے فضلاء کا ذکر آتا ہے تو پیر صاحب کے لہجے کی شگفتگی ہر قاری محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ حالانکہ ان تمام موضوعات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے کئی دفعہ پیر صاحب کے لہجے میں درد کی کاٹ اور دل کی چبھن عیاں نظر آتی ہے۔

جب کہ اس سے پہلے ہم نے مستشرقین کے ذکر کے وقت شبلی نعمانی کے ہاں دیکھا تھا کہ وہ بھی نقد کرتے ہوئے اس درد کو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کا انداز بہت ٹھہرا ہوا اور طریق نقد بہت معتدل سا نظر آتا ہے۔ لیکن پیر صاحب کے لہجے کی اداسی اور ان کی آواز کا گھمبیر بن کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے جب وہ اسی طرح کے قرآن حکیم پر مستشرقین کے اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں اور پھر جناب رسول مقبول ﷺ کی سیرت پر مستشرقین کے اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم زخم خوردہ اور لہوفشاں محسوس ہوتا ہے۔

''صلی اللہ علیہ وسلم وعلی الہ وأصحابہ اجمعین''

خلاصہ کلام:

''ضیاء النبی ﷺ'' پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہریؒ کے بہار آفریں قلم کا دوسرا بڑا بے نظیر شاہکار ہے جس کی چھٹی اور ساتویں جلد تحریک استشراق کی تاریخ اور اس کے رد میں ہیں۔ جو بالترتیب (648+617) 1265 صفحات پر مشتمل ہیں۔ جب کہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ میں تحریک استشراق پر جو خاکہ پیش کیا وہ نہایت مختصر ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ محسوس ہوتی ہے کہ کتاب کے آغاز میں آپ نے کتاب کی ترتیب کے متعلق وضاحت کی کہ آپ تفصیلاً کسی اور جلد میں اس اہم موضوع پر بات کریں گے۔ لیکن خدا نے انہیں مہلت نہ دی وہ ایسا نہ کر پائے۔

علامہ شبلی نعمانی کا انداز و طریق کلام مرعوبانہ ہے اور طریق نقد میں جھول سا محسوس ہوتا ہے جب کہ پیر صاحب کے لہجہ میں مرعوبیت محسوس نہیں ہوتی۔ جب وہ مستشرقین کے اعتراضات کا رد کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ آپ کا قلم زخم خوردہ اور لہوفشاں ہے۔ اس لئے کہ آپ کے اندرونی دینی احساس موجیں مار رہا ہوتا ہے اور جناب رسول مقبول ﷺ سے بے پناہ عقیدت و محبت آپ کو بے چین کئے ہوتی ہے۔ آپ نے یہ نہیں کیا کہ مستشرقین کی باتوں اور ان کے بنیادی اصولوں کو پہلے تسلیم کیا اور بعد میں جواب دیئے بلکہ آپ نے سلف صالحین کے اسلوب تحقیق پر اعتماد کیا ہے۔

مستشرقین اور سیرت رسول اللہ ﷺ:

مستشرقین نے ہر اس چیز کے خلاف اپنی فکری اور عملی، قولی اور فعلی، ذہنی اور قلبی صلاحیتیں صرف کی ہیں جس کا تعلق اسلام سے تھا۔ جو چیز تصرا اسلام کے لئے جتنی زیادہ ناگزیر تھی، وہ اسی شدت کے ساتھ مستشرقین کی فتنہ انگیزیوں کا نشانہ بنی۔ انہوں نے قرآن حکیم کے خلاف دل کھول کر اپنا زور قلم استعمال کیا، احادیث طیبہ سے ملت کے اعتماد کو متزلزل کرنے کے لئے اپنے ترکش تزویر کا ہر تیر آزمایا، تاریخ اسلام کی تابناکیوں کو شکوک و شبہات کے غبار سے آلودہ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی اور تعلیمات اسلام کو، جنہوں نے دنیا کی اجڈ ترین قوم کو تہذیب و ثقافت کا امام بنا دیا تھا، اس انداز میں پیش کیا کہ جو بھی انہیں دیکھے کراہت محسوس کرے۔

اسلام کا جو شعار مستشرقین کے حملوں کا خصوصی نشانہ بنا، وہ حضورﷺ کی سیرت طیبہ تھی۔ وہ عظیم ہستی جس کے دامن پر ان لوگوں کو کوئی دھبہ نظر نہ آیا جو ایک ہی گھر کی چار دیواری میں برسوں اس کے ساتھ رہے، جنہوں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی اور اس ہستی کی نجی زندگی کے ایک ایک شعبے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، جس ہستی کو ان لوگوں نے صادق اور امین کہا جنہوں نے آمنہ کی گود میں کھلنے والی اس کلی کو اپنی آنکھوں کے سامنے گل صد برگ بنتے دیکھا تھا، جس ہستی کے حسب ونسب کی رفعتوں کی گواہی ان لوگوں نے دی، جو اس کی شمع حیات کو گل کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے، جس ہستی کے دامن سے وابستگی کو ان لوگوں نے سعادت دارین سمجھا جن کی تلواریں مسلسل پندرہ بیس سال تک اس کے خلاف بے نیام رہی تھیں، اس ہستی کے دامن پر دھبے تلاش کرنا حماقت بھی ہے اور ظلم بھی۔

ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل، عمرو بن عاص اور خالد بن ولید جیسے لوگوں نے جب تسلیم کر لیا کہ جس ہستی کو وہ دشمن سمجھتے رہے ہیں، وہ کسی کی دشمن نہیں بلکہ ساری خدائی کی ہمدرد اور خیر خواہ ہے تو پھر کسی غیر جانبدار محقق کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس ہستی کو دشمن سمجھ کر اس کی ذات میں خامیاں تلاش کرنے کی کوشش کرے۔

ابوسفیان وغیرہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام اور ذات رسولﷺ کو اپنے آبائی دین اور اپنی قومی روایات کا دشمن سمجھا تھا۔ انہوں نے حضورﷺ کے مشن کو اپنے معاشی اور سماجی ڈھانچے کے لئے خطرہ محسوس کیا تھا۔ انہوں نے خانہ کعبہ کی مجلسوں میں حضورﷺ پر آواز کسنے سے لے کر محاصرہ مدینہ تک، حضورﷺ کے خلاف اپنی تلواروں کی دھار کو آزمایا تھا۔ انہوں نے حضورﷺ سے معاہدے بھی کئے تھے اور ان معاہدوں کے متعلق حضورﷺ کے رویے کو بھی دیکھا تھا۔ ان کے ہم مشرب اور ہمنوا حضورﷺ کے قیدی بھی بنے تھے اور انہوں نے ان قیدیوں کے ساتھ آپ کے سلوک کا بھی مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس حیران کن انقلاب کو بھی دیکھا تھا جو ان لوگوں کی زندگیوں میں رونما ہو گیا تھا جو ان کا ساتھ چھوڑ کر حضورﷺ کے دامن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ابوسفیان نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس کی بیٹی دامن رسول سے وابستہ ہو کر اپنے مشرک باپ کو ناپاک کہنے کی جرات سے بہرہ ور ہو گئی ہے۔

ان لوگوں نے اسلام اس وقت قبول کیا تھا، جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ حضورﷺ کی شخصیت ہدایت کا آفتاب ہے، جس کے سامنے کسی تاریکی کا ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے اسلام کے دامن میں پناہ اس وقت لی تھی جب انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ جس نظام کے دفاع کے لئے وہ برسوں کوشاں رہے ہیں، وہ ظلمتوں کے سوا کچھ نہیں۔ انہوں نے نعرہ حق اس وقت بلند کیا تھا جب ان کے دل، جو بت پرستی کے خوگر تھے، ان میں بت شکنی کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ عرب جو کٹ جانا چاہتے تھے لیکن جھکنا نہ جانتے تھے، ان کا حضورﷺ کے سامنے جھک جانا، آپ کی صداقت کی بھی دلیل ہے اور آپ کی عظمت کی بھی۔ یہ آپ کے کردار کی پاکیزگی کا بھی ثبوت ہے اور آپ کے اخلاق کی بلندی کا بھی۔

مستشرقین مذکورہ بالا سب حقیقتوں سے آشنا ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے بے شمار ساتھی جو ان کے شانہ بشانہ، آفتاب رسالت کی ضو کو کم کرنے کی مہم پر نکلے تھے انہوں نے اس آفتاب عالمتاب کی نورانی کرنوں سے اپنے قلب ونظر کو منور کر لیا ہے، اس کے باوجود وہ اس آفتاب کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کی نامسعود کوششوں میں مصروف ہیں۔ مستشرقین کے اس رویے کی توجیہ تعصب، ہٹ دھرمی، نانیت اور بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ آفتاب پھونکوں سے نہ پہلے بجھا ہے اور نہ آئندہ بجھے گا۔ پھونکیں مارنے والے اپنی ناکامیوں اور حسرتوں کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے اور آفتاب رسالت ہمیشہ کی طرح پوری آب وتاب کے ساتھ نصف النہار پر ضوفشاں رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کے دامن کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا ہے اور مستشرقین اس تابندہ ترین اور پاکیزہ ترین سیرت کے دامن پر دھبے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب انہیں سیرت رسول کے دامن پر کوئی دھبہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنے تخیل کی قوتوں سے کام لیتے ہیں۔ اپنے تخیل کے زور پر وہ نہ صرف سیرت رسول کے دامن پر فرضی دھبے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ سیرت رسول کے وہ

پہلو جو پوری انسانیت کے لئے سرمایہ افتخار ہیں، ان کو بگاڑ کر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانیت کے نمونہ کامل کی خوبیاں، خامیاں نظر آنے لگیں اور وہ ہستی جس کی ایک جھلک دلوں کو شکار کر لیتی ہے، اس کا نام سننے والے اس سے نفرت کرنے لگیں۔

مستشرقین نے سیرت رسول کے خلاف جو کچھ لکھا ہے جھوٹ اور فریب کے سہارے لکھا ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن تہذیب و ثقافت کی ترقی کے اس دور میں جھوٹ بولنا ایک فن بن گیا ہے۔ ابوسفیان دربار ہرقل میں حضور ﷺ کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کہہ سکا تھا جو جھوٹی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حضور ﷺ کا کٹر دشمن ہونے کے باوجود فن دروغ گوئی کا ماہر نہ تھا۔ وہ کافر ضرور تھا لیکن اس کے نزدیک جھوٹ ایک اخلاقی مرض تھا، اس لئے وہ جھوٹ نہ بول سکا۔ مستشرقین کے نزدیک جھوٹ ایک اخلاقی مرض نہیں بلکہ ایک فن ہے، اور فن کوئی بھی ہو اس میں کمال، کمال ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنے کے لئے کسی علمی بنیاد کی ضرورت نہیں ہوتی صرف ذہن کی زرخیزی درکار ہوتی ہے اور مستشرقین کے اذہان منفی کاموں کے لئے بہت زرخیز ہوتے ہیں۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کے دامن کو داغدار کرنے کے لئے مختلف انداز اختیار کئے۔ انہوں نے آپ کو اپنے ڈراموں، فلموں اور تصویری کہانیوں کے ناپسندیدہ کردار کی شکل میں پیش کیا۔ کبھی آپ کے جسد انور کو جہنم کے پست ترین درجوں میں دکھایا۔ کبھی یہ ظاہر کیا کہ حضور ﷺ کا جسد انور زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے۔ کبھی آپ کو دشمن مسیح علیہ السلام بنا کر پیش کیا۔ کبھی آپ کو ایک بت کی شکل میں پیش کیا۔ کبھی انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ حضور ﷺ نے ایک کبوتر پال رکھا تھا، جو آپ کے کانوں پر آکر بیٹھتا اور آپ لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے کہ یہ فرشتہ ہے جو وحی لے کر آیا ہے۔

مستشرقین کی سیرت نویسی کا یہ انداز قرون وسطی میں عام تھا اور آج بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ سلمان رشدی نے "Satanic Verses" اسی انداز میں لکھی ہے جس انداز میں قرون وسطی کے مستشرقین حضور ﷺ کے متعلق لکھتے رہے ہیں۔

حضور ﷺ کی عظمت اور صداقت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے دشمن آپ کے خلاف کبھی کسی ایک الزام پر متفق نہیں ہو سکے۔ ایک مستشرق نے آپ کے خلاف جو الزام تراشا، دوسرے مستشرق نے اس کی تردید کر دی۔ ایک دشمن نے حضور ﷺ کے کردار کو مجروح کرنے کے لئے کوئی شوشہ چھوڑا تو کسی دوسرے دشمن نے اس کو بے بنیاد قرار دے دیا۔ ہمیں مستشرقین کی تحریروں میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو لوگ حضور ﷺ کے خلاف لگائے جانے والے کسی الزام کی تردید کرتے ہیں، ان کے دل بھی آپ کے خلاف بغض اور کینے سے بھرے ہوتے ہیں۔ وہ ایک الزام کی تردید کرتے ہیں اور کوئی دوسرا الزام، اس پہلے سے بھی زیادہ ہولناک اور بے بنیاد تراش کر حضور ﷺ کے کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ٹارانڈرائے (Tor Andrae) نے اپنی کتاب "Muhammad the man and his faith" میں مغربی سیرت نگاروں کے، سیرت رسول کے متعلق، وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے رجحانات کی مختصر سی تاریخ لکھی ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق اہل مغرب کے رویے کو قارئین کے ذہن نشین کرانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''ٹارانڈرائے'' کے اس بیان کو یہاں درج کر دیا جائے۔ تفصیل سے بچنے کے لئے ہم یہاں ٹارانڈرائے کی عبارت کے صرف اردو ترجمے کو درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مستشرق مذکور لکھتا ہے:

''ڈانٹے (Dante) محمد ﷺ کو جہنم کے اٹھائیسویں درجے میں دکھاتا ہے۔ ان کا جسم سر سے کمر تک دولخت ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چاک کرتے نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ان (1) روحوں کے سرخیل ہیں جنہوں نے مذہب میں فرقہ بندی کو متعارف کرایا تھا۔ محمد (ﷺ) کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ایک جھوٹے مذہب کو اختیار کیا تھا۔ قرون وسطی کی ذہنیت کے مطابق ایسے مقدس الہام کے کسی دعوے کو صرف مقدس فراڈ ہی قرار دیا جا سکتا تھا، جس کی تعلیمات عیسائیت کی تعلیمات سے برتر بتائی گئی ہوں۔ آج کے سادہ لوح عیسائی حجت بازوں کی نظر میں بھی محمد ﷺ ایک جھوٹے نبی کے طور پر مشہور ہیں۔ عصر نو کے تصورات نے محمد ﷺ کی شخصیت کے متعلق زیادہ منصفانہ

آراء کے مواقع فراہم کیے۔ اس دور کے مفکرین نے اپنے ناپختہ طریق کار کے مطابق پرانے واضعین قانون اور بانیان مذاہب کی عقل اور ان کی خوبیوں کی قدر کی اور انہوں نے عیسائیت کی قیمت پر دیگر مذاہب کی معقولیت پر زور دیا اور ان کی تعریف کی۔ (315)

سیورے (Savary) کا ترجمہ قرآن جو 1752ء میں شائع ہوا، اس میں بھی اس رویہ کا اظہار کیا گیا۔ وہ محمد (ﷺ) کو ان غیر معمولی شخصیات میں سے ایک قرار دیتا ہے جو صفحات تاریخ پر کبھی کبھی نمودار ہوتی ہیں، اپنے ماحول کی تشکیل نو کرتی ہیں اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر کامیابی کی راہوں پر گامزن ہوتی ہیں۔ سیورے (Savary) کا خیال ہے کہ جو لوگ محمد (ﷺ) کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں، انہیں ان کی زندگی کے ان کارناموں پر حیرت کا اظہار کرنا چاہئے، جو موافق حالات میں بھی صرف ایسے لوگ سرانجام دیتے ہیں جو نابغہ روزگار ہوں۔ گو محمد (ﷺ) نے بت پرستی کے ماحول میں جنم لیا لیکن اس سطح سے بلند ہو کر وہ خدائے واحد کی عبادت تک پہنچے۔ انہوں نے اپنے سفروں میں مشاہدہ کیا کہ فرقوں میں بٹے ہوئے عیسائی کس طرح ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور کس طرح یہودی، جو اپنے آپ کو حزب مختار سمجھتے ہیں، وہ اپنے ضابطوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں محمد (ﷺ) نے ایک نیا عالمی مذہب قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے سادہ عقائد وضع کیے جن کو عقل تسلیم کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اس خدائے واحد پر ایمان جو نیکیوں پر ثواب اور برائیوں پر عذاب دیتا ہے۔ لیکن سیورے (Savary) کا خیال ہے کہ لوگوں کو یہ مذہب قبول کرنے پر ابھارنے کے لئے محمد (ﷺ) کے لئے ضروری تھا کہ وہ مافوق البشر طاقت کا دعویٰ کریں، اس لئے انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں خدا کا رسول تسلیم کیا جائے۔ یہ ایک مقدس فراڈ تھا جو نظریہ ضرورت کے تحت ناگزیر ہو گیا تھا۔ انہوں نے عیسائیت اور یہودیت کے ان اخلاقی ضابطوں کو قائم رکھا جو گرم علاقوں میں رہنے والی اقوام کے مزاج سے مطابقت رکھتے تھے۔ ان کی سیاسی اور عسکری اہلیت اور لوگوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت غیر معمولی تھیں۔ سیورے (Savary) ایک روشن خیال مغربی شخص تھا جس نے بجا طور پر محمد (ﷺ) کو ایک پیغمبر کہنے سے انکار کر دیا لیکن وہ کم از کم اس بات پر مجبور ہو گیا کہ وہ محمد (ﷺ) کو تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک شمار کرے۔ (316)

1742ء میں والٹیر (Voltaire) نے اپنے المیے (Mahomet) میں محمد (ﷺ) کی شخصیت کی قدر دانی کے رویے کے بالکل برعکس رویہ اختیار کیا۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچے میں ''بولان ولیرز'' اور ''سیل'' پر شدید تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر محمد (ﷺ) ایک پیدائشی شہزادے ہوتے یا رائے عامہ کی مدد سے مسند اقتدار تک پہنچے ہوتے اور انہوں نے اپنے ملک میں پرامن قوانین نافذ کیے ہوتے اور دشمن کے خلاف اپنے ملک کا دفاع کیا ہوتا، تو اس صورت میں ان کی عزت کرنا ممکن تھا۔ لیکن جب ایک اونٹ فروش بغاوت کو ہوا دے، جبرائیل علیہ السلام سے ہم کلامی کا دعویٰ کرے، ایک ایسی ناقابل فہم کتاب کے آسمان سے نازل ہونے کا دعویٰ کرے جس کا ہر صفحہ عقل سے متصادم ہو، جب وہ اس کتاب پر ایمان لانے کے لئے مردوں کو قتل اور عورتوں کو اغوا کرے تو اس رویے کے دفاع کے لئے کوئی شخص اسی وقت کھڑا ہو سکتا ہے جب کہ یا تو وہ ''ترک'' پیدا ہوا ہو اور یا اوہام پرستی نے اس کے باطن میں فطری روشنی کی ہر لہر کو بجھا دیا ہو۔ (317)

''والٹیر'' تسلیم کرتا ہے کہ اس نے اپنے ڈرامے میں جن برائیوں کو محمد (ﷺ) کی طرف منسوب کیا ہے، ان برائیوں کا ارتکاب انہوں نے جان بوجھ کر نہیں کیا لیکن ایک آدمی جو اپنی ہی قوم کے خلاف تلوار اٹھاتا ہے اور وہ یہ کام خدا کے نام پر کرنے کی جسارت کرتا ہے کیا وہ اس قابل نہیں کہ اس کے خلاف کچھ بھی کہا جا سکے؟ ''والٹیر'' نے اپنی بعد کی ایک تصنیف "Essai Surles Moeurs" میں محمد (ﷺ) کے متعلق قدرے نرم رویہ اختیار کیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں ان کی عظمت اور اہلیت کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن اس نرم رویے کے باوجود محمد (ﷺ) کو ظالم اور متشدد قرار دینے میں وہ اپنے سابقہ رویے پر برقرار رہا اور اس نے اس بات پر زور دیا کہ محمد (ﷺ) کے مذہب میں کوئی بات نئی نہیں، سوائے اس دعویٰ کے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔

8 مارچ 1840ء، بروز جمعہ، جب کارلائل نے ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' پر اپنے دوسرے لیکچر میں محمد (ﷺ) کی شخصیت کا بیان شروع کیا تو اس نے کہا:

''عام خیال یہ ہے کہ محمد (ﷺ) ایک مکار اور مجسم جھوٹ تھے اور آپ کا مذہب بہروپیا پن اور حماقت کا امتزاج تھا لیکن (کارلائل کے خیال میں) اس قسم کے خیالات ہمارے اپنے کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔ 18 کروڑ انسان، اسلام کو سچا مذہب تسلیم کرتے ہیں۔ لاتعداد انسانوں کی زندگیوں کے لئے محمد (ﷺ) کے اقوال، روشنی کے ستاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کی مخلوق میں سے اتنی کثیر تعداد میں لوگ ایک ایسی چیز کی خاطر جئے اور مرے ہوں جو مقدس فراڈ قرار دیئے جانے کے قابل ہے؟ اگر بہروپیے پن کو انسانی اذہان پر اتنی ہی قدرت حاصل ہے تو پھر ہمیں اس دنیا کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہیے؟ یہ مفروضہ اس دور تشکیک کی پیداوار ہے اور ذہنی معذوری اور روحانی موت کی غمازی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ بے خدا نظریہ کبھی پیش نہیں کیا گیا۔ (318)

کارلائل کے خیال میں محمد (ﷺ) مخلص تھے جیسے کہ ہر عظیم انسان مخلص ہوتا ہے کیونکہ ان کے لئے مخلص ہونا ضروری تھا۔ خلوص کی کمی کے شدید احساس کے باوجود وہ مخلص تھے۔ عالم وجود کی عظیم سچائیوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے رکھا تھا اور وہ ان سے دامن نہ بچا سکتے تھے۔ دوسرے لوگ حقیقت سے چشم پوشی کر سکتے ہیں اور خود فریبی میں زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن ان کی نظروں میں حقیقت ایک حیران کن چیز تھی، جو ایک چمکدار روشنی کی شکل میں ان کی نظروں کے سامنے رہتی تھی۔ اس قسم کا انسان، عظیم انسان ہوتا ہے۔ (319)

سطور بالا میں ہم نے ''نا رانڈ رائے'' کے الفاظ میں قارئین کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مستشرقین حضور ﷺ کی مقدس شخصیت کے متعلق کس قسم کے مفروضے گھڑتے اور انہیں پھیلاتے رہے ہیں۔ سیرت طیبہ کے متعلق بعض مستشرقین کی تحریروں کو پڑھنے والا صاحب دل مسلمان کبھی بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے آقا و مولیٰ کی نعت پڑھ رہا ہے جو ایک کافر کے قلم سے نکلی ہے۔ اس قسم کی چیزیں پڑھ کر مسلمان ان مستشرقین کی صاف دلی اور عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں جن کے قلم سے حضور ﷺ کی تعریف نکلی ہو۔ لیکن جو آدمی صرف ان چند جملوں تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا اور حضور ﷺ کی تعریف کرنے والے مستشرقین کی تحریروں کو بالاستیعاب پڑھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ بہت جلد اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ مستشرق جو بظاہر منصف نظر آتے ہیں، انہوں نے بھی اسلام کے متعلق مستشرقین کے روایتی رویے سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ انہوں نے صرف طریق کار بدلا ہے۔ تھامس کارلائل نے، مذکورہ بالا اقتباس میں، حضور ﷺ کے خلاف لکھنے والے مستشرقین کی خوب خبر لی ہے لیکن جب ہم کارلائل کے اسی لیکچر میں قرآن کے متعلق اس کے خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو کارلائل کے متعلق ساری غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ''منٹگمری واٹ'' کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کے بارے میں نرم رویہ اختیار کیا ہے لیکن اس کی تصنیفات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے سیرت طیبہ کی ہر خوبی کو خامی بنا کر پیش کرنے کے لئے اپنا پورا زور قلم صرف کیا ہے۔

حضور ﷺ کی ذات ایک آئینہ ہے جس میں صدیق اکبر کو اپنا چہرہ نظر آتا ہے اور ابوجہل کو اس آئینے میں اپنے وجود کی کراہتیں عیاں نظر آتی ہیں۔ اس آئینے میں مستشرقین کو بھی اپنی ہی شکلیں نظر آتی ہیں اور انہوں نے حضور ﷺ کی سیرت کی عکاسی کرتے وقت دراصل اپنے اپنے کردار کا عکس پیش کیا ہے۔ یہی بات کارلائل کے قلم سے نکل گئی کہ حضور ﷺ کو ایک مذموم کردار کی شکل میں دیکھنا ہمارے اپنے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ جس مستشرق کے باطن میں جتنا زیادہ خبث جمع تھا، اس نے اتنی ہی سفاکی سے حضور ﷺ کی شخصیت پر وار کئے ہیں اور جن کے ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی انہوں نے حضور ﷺ کے کردار میں کبھی کبھی روشنی کی کوئی کرن دیکھی ہے، وہ ان کے قلم پر بھی آئی ہے لیکن پھر تعصب اور مصلحت کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ گئی ہے۔ کچھ خوش نصیب مستشرقین ایسے بھی ہیں جنہوں نے سیرت رسول ﷺ سے اٹھنے والی نور کی کرن سے اپنے دلوں کو منور کیا ہے اور دشمنان رسول سے ناطہ توڑ کر غلامان رسول کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔

جو مسلمان ان الزامات کی تردید کرنا چاہتا ہو جو مستشرقین کی طرف سے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ پر لگائے گئے ہیں، اسے سب سے پہلے جس مشکل سے واسطہ پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ مستشرقین حضور ﷺ کے خلاف الزام تراشی میں کسی ایک نکتے پر متفق نہیں ہوتے بلکہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ مثلاً پورا عالم یہودیت و نصرانیت حضور ﷺ کے سر پر تاج نبوت سجنے کی وجہ سے، پوری نسل اسماعیل کا دشمن ہے اور اس دشمنی کے اظہار کے لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی لونڈی کی اولاد ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دوسری طرف استشراق کا لبادہ اوڑھنے والے کچھ یہودی اور عیسائی وہ ہیں جو حضور ﷺ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی نسل سے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کچھ مستشرق کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے دولت، شہرت اور اقتدار کے حصول کے لئے ایک نیا مذہب گھڑا تھا اور اس مذہب کے ذریعے دھوکے سے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا تھا لیکن کچھ وہ ہیں جو حضور ﷺ کے لئے دھوکے باز کا لفظ استعمال کرنے کی جرات نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے تھے، اس کی صحت و صداقت پر آپ کو کامل یقین تھا لیکن آپ اپنے اس عقیدے میں غلطی پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کے خیالات کی تردید کے لئے ان کے متضاد دعووں کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کی سیرت پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ عربوں کے ہاں خاندانی وجاہت ایک بہت بڑا انسانی کمال شمار ہوتا تھا، مستشرقین حضور ﷺ کی خاندانی وجاہت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدید مادیت زدہ دور میں دولت کو انسانی عظمت کی کسوٹی سمجھا جاتا ہے، مستشرقین اس کسوٹی کو حضور ﷺ پر لاگو کر کے آپ کا مقام گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بیسویں صدی عیسوی کی مادی اقدار کو ساتویں صدی عیسوی کے عربوں پر منطبق کر کے مکہ کی مارکیٹ میں ایسے طاقتور اجارہ داروں کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں جو کمزور قبائل کو تجارت کے میدان میں سر اٹھانے کی مہلت نہ دیتے تھے۔ حضور ﷺ کو دھوکے باز ثابت کرنے کے لئے وہ پورا زور لگاتے ہیں تاکہ یہ ثابت کریں کہ حضور ﷺ نے یہودیت اور عیسائیت سے تعلیمات اخذ کیں، ان کی بنیاد پر ایک دین وضع کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ دین الہامی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ وہ حضور ﷺ کے اخلاق پر حملہ کرتے ہیں۔ آپ کو شہوت پرست اور ظالم قرار دیتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ کسی اصول کے پابند نہ تھے بلکہ جب ضرورت پڑتی تھی، اصولوں کو توڑ دیتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ انہیں وحی کے ذریعے اس غلط اصول کو توڑنے کا حکم ملا ہے۔

مستشرقین اپنے دعووں کو ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کی مصدقہ تاریخ کا انکار کرتے ہیں، قرآنی آیات کی من مانی تشریح کرتے ہیں اور ہر زعم باطل کو ثابت کرنے کے لئے اپنے تخیل کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہیں۔

حضور ﷺ کا دامن اتنا شفاف ہے کہ مستشرقین کی ذریت نہ اسے پہلے آلودہ کر سکی ہے اور نہ آئندہ کر سکے گی۔ آپ کا مقام اتنا بلند ہے کہ اسے گھٹانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ بات شیطان کو بھی معلوم ہے اور اس کی ساری ذریت کو بھی کہ جس ہستی کو عظمتیں عطا کرنے والا خود رب کائنات ہے اس کی عظمتوں کے محل کو مسمار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں لیکن شیطان اور اس کی ذریت کے حملے دراصل اس ذات ستودہ صفات کے مقام کو گھٹانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ یہ حملے ان لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہوتے ہیں جو اس ہستی کو وجہ تخلیق کائنات سمجھتے ہیں، جو اس ہستی کے دامن کے ساتھ وابستگی کو سعادت دارین سمجھتے ہیں، جنہیں وہ ہستی رحمۃ للعالمین نظر آتی ہے، جنہیں اس ہستی کے کردار میں شبنم کی لطافت اور پھولوں کی پاکیزگی نظر آتی ہے۔ کئی سادہ لوح انسان شیطان اور اس کی ذریت کے وسوسوں میں آ کر اس ہستی سے ناطہ توڑ لیتے ہیں اور ایمان کی دولت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کے گرد شکوک و شبہات کے جو جال بننے کی کوشش کی ہے، ہم ان کے تاروں کو توڑ کر سیرت طیبہ کو اس کی اصلی اور نورانی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ اس ہستی سے اپنی نسبت پر فخر کریں اور کوئی دشمن انسانیت ان کے ایمان پر ڈاکہ نہ ڈال سکے۔

حضورﷺ کو خاندانی وجاہت سے محروم ثابت کرنے کی تدبیریں:

مستشرقین نے حضورﷺ کی خاندانی وجاہت کو گھٹانے کے لئے مختلف مفروضے قائم کئے ہیں۔ ان مفروضوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ حضورﷺ کا حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تعلق، آپ کے پیروکاروں کی خوش اعتقادی کی اختراع ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہونا کوئی فخر کی بات نہیں کیونکہ وہ خود ایک لونڈی کی اولاد تھے۔ تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ مکہ کے قبائل میں خاندان بنو ہاشم کی حیثیت معمولی تھی۔ مکہ میں دیگر قبائل معاشی اور سیاسی طور پر بڑے طاقت ور تھے اور ان کے مقابلے میں خاندان بنو ہاشم کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ہم یہاں ایک ایک کر کے ان تمام مفروضوں کی قلعی کھولتے ہیں تا کہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے اور مستشرقین کے مفروضے کسی کو دھوکا نہ دے سکیں۔

حضورﷺ کا نسل اسماعیل سے ہونا:

عربوں کی زندگی میں بے شمار خامیاں تھیں۔ وہ جہالت، بربریت، بدکاری اور نخوت وتکبر کی دلدل میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے لیکن ان انگنت خامیوں کے باوجود ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں جو انہیں پوری انسانی تاریخ میں ایک خصوصی مقام عطا کرتی ہیں۔ یہ

قوم جرات اور بہادری میں بے مثال تھی۔ ان کو قدرت کی طرف سے حافظہ کی بے پناہ قوت ودیعت ہوئی تھی اور اپنے خیالات کے اظہار پر انہیں وہ قدرت حاصل تھی جو صرف ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کے سماجی اجتماعات میں ان ہی چیزوں کے مقابلے ہوتے تھے اور ان ہی خوبیوں میں کمال کی بنا پر معاشرے میں کسی آدمی یا اس کے خاندان کی قیمت متعین ہوتی تھی۔

انہوں نے اپنی خداداد قوت حافظہ کو اپنے نسب نامے حفظ کرنے کے لئے دل کھول کر استعمال کیا تھا۔ ہر قبیلے کا رکن صرف اپنے قبیلے کے نسب ناموں ہی کو یاد نہ کرتا تھا بلکہ ان تمام قبائل کے نسب ناموں کو یاد رکھنا بھی ان کے لئے ضروری تھا جن کے ساتھ کسی میدان میں ان کے تصادم کا امکان ہوتا۔ وہ اپنے اجداد کے کارناموں اور اپنے مخالفین کے نسب ناموں کی کمزوریوں کو یاد رکھتے تھے تا کہ وقت آنے پر مخالفین کے مقابلے میں اپنے نسب کو بلند ثابت کر سکیں۔

خاندانی وقار کی حفاظت کے لئے مختلف قبائل کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف بے نیام ہوتیں اور دونوں طرف سے بہادر جنگجو اپنی بہادری اور جنگی مہارت کے جوہر دکھاتے۔ بہادری کے یہ کارنامے پھر ان کی روایت کا حصہ بن جاتے اور آئندہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کی بہادری کے کارناموں کو نظم اور نثر کی شکل میں بڑے فخر سے لوگوں کے سامنے پیش کرتیں۔

ان حالات میں کسی شخص کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ کسی روایت کو توڑ مروڑ کر پیش کرے کیونکہ یہ روایتیں ان کے دشمنوں کو بھی ازبر ہوتی تھیں اور یہ سوچنا محال تھا کہ کوئی شخص اس قسم کی غلط بیانی کرے اور پکڑا نہ جائے۔

عرب واقعی برائیوں کی دلدل میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے لیکن اس حقیقت کے باوجود وہ جھوٹ سے نفرت کرتے تھے اور اس بات کو گوارا نہ کر سکتے تھے کہ لوگوں میں وہ جھوٹے مشہور ہوں، اس لئے وہ جھوٹ بولنے سے ڈرتے تھے۔ ابوسفیان اسی خوف کی وجہ سے، خواہش کے باوجود، دربار ہرقل میں حضورﷺ کے خلاف کوئی جھوٹی بات نہ کہہ سکا تھا۔

عرب کی یہ روایتیں، جو کسی بھی تاریخی روایت سے زیادہ مستند قرار دی جا سکتی ہیں، ان روایات کے مطابق خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا۔ عربوں کی ایک قسم جو ''عرب مستعربہ'' کہلاتی تھی وہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی نسل سے تھی۔ قریش اس عربی نسل کا ایک قابل احترام قبیلہ تھا جس کی ایک معزز شاخ بنو ہاشم تھی۔

سارے عرب قبیلہ قریش کا احترام کرتے تھے اور اس احترام کی وجہ یہ تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی اور خادم تھے جو حضرت ابراہیم و

اسماعیل علیہما السلام نے بنایا تھا۔ جس دور میں کوئی کارواں محفوظ نہ رہتا تھا، اس دور میں قریش کے تجارتی قافلے بلاخوف وخطر شام اور یمن کے چکر لگاتے تھے۔ کسی کو قریش کے نسل اسماعیل میں سے ہونے کے بارے میں شک نہ تھا کہ اچانک کچھ مستشرقین کے تخیل نے انگڑائی لی اور انہوں نے یہ انکشاف کیا:

''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر (ﷺ) کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ثابت کئے جائیں، آنحضور (ﷺ) کو اپنی زندگی میں پیدا ہوئی......اور اس کے لئے آپ کے ابراہیمی نسب نامے کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے، نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے''۔(320)

یہ عجیب وغریب انکشاف کرنے والا مشہور مستشرق ولیم میور ہے جس نے اپنی کتاب ''حیات محمد'' (Life of Muhammad) کے مقدمے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مستشرق موصوف یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ عربوں کی روایت میں حضرت محمد ﷺ اور قبیلہ قریش کا نسل ابراہیم واسماعیل سے ہونا مشہور نہ تھا، حضور ﷺ کے دل میں نسبی وجاہت اور خاندانی عظمت کی آرزو پیدا ہوئی اور آپ نے اپنے سلسلہ نسب کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جوڑنے کی تدبیریں کیں۔ اس مقصد کے لئے ایسے قصے گھڑے گئے جن سے حضرت محمد ﷺ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی تعلق ثابت ہو سکے۔(321)

ولیم میور نے جو مفروضہ گھڑا ہے، اس مفروضے کو ایک اور مستشرق منٹگمری واٹ نے زیادہ زور سے اچھالا ہے۔ منٹگمری واٹ اپنے خیال بلکہ مفروضے کی تائید کے لئے قرآن حکیم کی اس نزولی تاریخ کو استعمال کرتا ہے جو بعض مستشرقین نے محض اپنے منفی مقاصد کے تحت وضع کی ہے۔ ''واٹ'' کہتا ہے کہ قرآن حکیم کی وہ آیات جو حضور ﷺ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلق ثابت کرتی ہیں، وہ مدنی دور کی ہیں۔ مکہ مکرمہ میں قرآن حکیم کا جو حصہ نازل ہوا وہ اس سلسلے میں خاموش ہے۔ منٹگمری واٹ نے اس سلسلے میں کئی مفروضے تراشے ہیں۔ اس مستشرق کا ایک طویل اقتباس پیش خدمت ہے تاکہ قارئین سمجھ سکیں کہ مستشرقین کس طرح کسی بے بنیاد بات کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ مستشرق مذکور لکھتا ہے:

"In the polemics of the Quran against the Jews a prominent place is taken by the conception of the religion of Abraham. This is an idea which is not found in the Meccan revelations and is presumably not based on pre-Islamic Arab legends. During the Meccan Period more prominence was given to Moses than to Abraham among the Prophets as a forerunner of Muhammad. Abraham is simply one of many prophets, and the people to whom he is sent are not specified; indeed, it seems to be implied that he was not sent to the Arabs, since Muhammad is said to be sent to a people who had never had a warner. Likewize there is no mention of any connexion of Abraham and Ishmael with the Kabah; Ishmael is named in lists of Prophets, but no details are given

about him. The presumption is that at first the Muslims did not know about the connexion of Ishmael with Abraham and (according to the Old Testament) with the Arabs. At Medinah, however, in closer contact with the Jews they gained knowledge of such matters".(322)

''قرآن حکیم میں یہودیوں کے خلاف جو باتیں ہیں، ان میں دین ابراہیم کے تصور کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو مکی قرآن میں نظر نہیں آتا۔ اس لئے یہ بات فرض کی جا سکتی ہے کہ یہ تصور عربوں کی قبل از اسلام روایات پر مبنی نہیں ہے۔ مکی دور میں پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محمد (ﷺ) کے پیش رو کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ بہت سے پیغمبروں میں سے ایک ہیں اور جس قوم کی طرف آپ مبعوث ہوئے تھے اس کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے کیونکہ حضرت محمد (ﷺ) کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جن کے پاس پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا۔ اسی طرح ابراہیم واسماعیل (علیہما السلام) کے کعبہ کے ساتھ تعلق کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ خیال یہ ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کو علم نہ تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلق کیا ہے اور وہ اس بات کو بھی نہیں جانتے تھے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا عربوں سے تعلق کیا ہے۔ مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ رابطے کی وجہ سے ان کو ان چیزوں کا علم ہوا''۔

''منٹگمری واٹ'' نے اس طویل عبارت میں حقائق کو مسخ کرنے کے لئے کئی پینترے بدلے ہیں۔ وہ سب سے پہلے یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ عربوں کے ہاں ابتدا میں دین ابراہیمی کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس لئے اسلامی ادب میں ہمیں دین ابراہیمی کا جو تصور ملتا ہے وہ عربوں کی روایات پر مبنی نہیں ہے۔ پھر یہ مستشرق یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ ابتدا میں مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ منٹگمری واٹ اس جملے سے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو زیادہ اہمیت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنی نسبی رشتے کا علم نہ تھا ورنہ وہ فطری طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زیادہ اہمیت دیتے۔ منٹگمری واٹ یہ کہہ کر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ ان کا عربوں سے تعلق نہ تھا ورنہ ان کی امت دعوت قوم عرب ہی ہوتی۔ پھر ''واٹ'' یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ تعمیر کعبہ کا ابراہیم واسماعیل کے ہاتھوں انجام پانا، عربوں کے علم میں نہ تھا کیونکہ مکی قرآن میں اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ پھر وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمانوں اور عربوں کو معلوم نہ تھا کہ حضرت سماعیل علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یا عربوں سے کیا تعلق ہے۔

ولیم میور تو کھلے الفاظ میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی خاندانی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنا تعلق جوڑا تھا اور پھر اس رشتے کو ثابت کرنے کے لئے مختلف افسانے تراشے گئے تھے۔ گویا عربوں کا ابراہیم واسماعیل علیہما السلام سے نہ کوئی تعلق تھا اور نہ انہیں اس تعلق کا علم تھا، یہ تعلق تو حضور ﷺ کی خواہش کی پیداوار ہے۔ (323)

''منٹگمری واٹ'' اس رشتے کا انکار تو نہیں کرتا لیکن وہ کہتا ہے کہ عربوں کو حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے ساتھ اپنے تعلق کا علم نہ تھا اور مسلمانوں کو بھی ہجرت سے پہلے ان چیزوں کے متعلق معلومات حاصل نہ تھیں۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کا یہودیوں سے رابطہ ہوا تو انہیں پتہ چلا کہ وہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہی سچا دین تھا، حضرت اسماعیل

علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ارجمند تھے اوران دونوں نے مل کرخانہ کعبہ کو تعمیر کرنے کی سعادت حاصل کی تھی۔

''منگمری واٹ'' بھی دراصل وہی بات کہنا چاہتا ہے جو ولیم میور نے کہی ہے لیکن اس نے یہ بات کہنے کے لئے ایک شاطرانہ چال چلی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ عربوں کو اپنے حافظے پر ناز تھا، اپنے نسب نامے یاد کرنا اور انہیں فخر سے پیش کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اگر وہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہوتے تو لازماً یہ بات ان کی قومی روایات میں موجود ہوتی۔ ان کی قومی روایات میں حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا ذکر نہ ہونا اور قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں ان کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق کا تذکرہ نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے پاس ان ہستیوں کے ساتھ اپنے تعلق کو ثابت کرنے کا کوئی ثبوت نہیں کیونکہ انہوں نے یہ باتیں یہودیوں سے سیکھی ہیں اور یہودیوں اوران کی کتابوں کو مسلمان قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

ولیم میور اور منگمری واٹ کے یہ سارے مفروضے بے بنیاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی اولاد سمجھتے تھے، انہیں ان عظیم ہستیوں کی اولاد ہونے پر فخر بھی تھا، انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ خانہ کعبہ کو انہی نفوس قدسیہ نے تعمیر کیا تھا اور جس دین پر وہ کاربند تھے، ان کے خیال میں وہ دین ابراہیم ہی تھا اور بزعم خویش وہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کررہے ہیں۔(324)

عرب روایات اور خلیل واسماعیل علیہم السلام:

عربی روایات میں حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا ذکر نہ ہونے کا دعویٰ وہی شخص کرسکتا ہے جو یا تو عربوں کی تاریخ سے کلیۃً ناآشنا ہو اور یا پھر حسد، بغض اور تنگ نظری کی وجہ سے دن کو رات کہنے پر مصر ہو۔ عرب جو مذہبی زندگی گزار رہے تھے، اس کا مرکز ہی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھتے تھے۔ خانہ کعبہ کا احترام وہ اسی وجہ سے کرتے تھے کہ وہ ان کے آبا کا تعمیر کردہ خانہ خدا ہے۔ حج کی عبادت وہ اس لئے کرتے تھے کہ اس عبادت کو حضرت ابراہیم علیہ اسلام نے متعارف کرایا تھا۔ خانہ کعبہ کا طواف، صفا اور مروہ کے درمیان سعی منیٰ اور عرفات کی رسومات، وہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی پیروی ہی میں ادا کرتے تھے۔ وہ اپنے مردوں کو غسل بھی دیتے تھے، کفن بھی پہناتے تھے اور قبروں میں دفن بھی کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ یہ سب کام دین ابراہیمی کی پیروی میں کررہے ہیں۔ حرمت والے مہینوں کی تعظیم اور سرزمین حرم کا احترام بھی وہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی پیروی میں کرتے تھے اور غالباً صرف یہی وہ چیزیں تھیں جن پر جزیرہ عرب کے مکینوں کی اکثریت متفق تھی۔

ان کی تمام دینی اور مذہبی رسومات دین ابراہیم کے نام پر تھیں، یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس خالص دین توحید کی عبادات کو مشرکانہ رسموں میں بدل لیا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کا طواف تو کرتے لیکن حالت برہنگی میں طواف کی رسم ایجاد کر کے انہوں نے طواف بیت اللہ کی روح کو قتل کردیا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کا احترام تو کرتے تھے اور اسے خانہ خدا بھی سمجھتے تھے لیکن اس مرکز توحید میں تین سو ساٹھ بتوں کو سجا کر انہوں نے عملاً خانہ کعبہ کے تقدس کو پامال کردیا تھا۔ وہ میت کی الوداعی تقریبات میں دین ابراہیمی کی اصطلاحات تو استعمال کرتے لیکن ان کے جنازے میں نہ حمد خدا ہوتی تھی اور نہ میت کے لئے دعا۔ وہ میت کو بنا سنوار کر رکھتے اور پھر اس کی تعریفوں میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے اور اپنی ان بے مقصد رسومات کو جنازہ کا نام دیتے۔ وہ حرمت والے مہینوں کا احترام تو کرتے لیکن اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق سال میں ان مہینوں کو اپنے مقام سے آگے پیچھے بھی کرتے رہتے۔ مختصر یہ کہ ان کے ہاں دین ابراہیمی کا نام تو پوری آب وتاب کے ساتھ موجود تھا لیکن اس دین کی روح رخصت ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرب میں بت پرستی عروج پر تھی، اس زمانے میں بھی صحرائے عرب میں خال خال نفوس ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ عرب دین ابراہیمی کے نام پر جو کچھ کررہے ہیں وہ ابراہیمی دین نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان لوگوں نے عربوں کے مذہب سے بیزار ہو کر حقیقی دین ابراہیم کو تلاش کرنے کی کوششیں بھی کی تھیں۔ انہوں نے دین ابراہیم کی روشنی

کو یہودیت اور نصرانیت میں تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن جس متاع گم گشتہ کی انہیں تلاش تھی وہ انہیں نہ یہودیت میں مل سکی اور نہ عیسائیت میں۔ کوئی الہامی راہنمائی ان کے پاس موجود نہ تھی لیکن وہ اپنے ضمیر کی روشنی کے زور پر اپنی قوم کو بتوں کی پوجا سے روکتے تھے شراب نوشی سے منع کرتے تھے، بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی بیہودہ رسم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ قس بن ساعدہ الایادی، زید بن عمرو بن نفیل، امیہ بن ابی صلت، اسعد ابوکرب الحمیری، سیف بن ذی یزن اور ورقہ بن نوفل کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے شرک و بت پرستی کی شب دیجور میں اپنے سینوں میں توحید کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو تاریخ حنفاء کے نام سے یاد کرتی ہے۔ حنفاء حنیف کی جمع ہے اور حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکاروں کا لقب ہے۔ وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دین سے تعلق ہی کی وجہ سے حنفا کہلاتے تھے۔

یہ تمام باتیں عربوں کی روایات میں موجود ہیں۔ ولیم میور اور منٹگمری واٹ کو ان حقائق کا بخوبی علم ہے۔ لیکن ان حقائق کو تسلیم کرنا ان کے لئے مشکل اس وجہ سے ہے کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو ہر قسم کی عظمتوں سے معری ثابت کرنا چاہتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ان کے اپنے بھی جد امجد ہیں، ان کے ساتھ پیغمبر اسلام کی نسبت ان کو گوارا نہیں۔ اس لئے وہ کبھی جھوٹ اور کبھی فریب کے سہارے تاریخ کی ان روشن حقیقتوں کے گرد شکوک و شبہات کے جال بننا چاہتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی حقیقتیں کسی کے چھپانے سے نہیں چھپتیں اور بدخواہوں کی انتھک کاوشوں کے باوجود پوری آب و تاب کے ساتھ صفحۂ ہستی پر جلوہ گر رہتی ہیں۔(325)

عربوں میں پیغمبر کا نہ آنا:

قرآن حکیم کی بعض آیات میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ سے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے آپ کو اس قوم کی طرف مبعوث فرمایا ہے جس کی طرف پہلے نذیر نہیں آیا۔ جیسے:

"لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ أُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ "(326)

''تاکہ آپ ڈرا سکیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو (طویل عرصہ سے) نہیں ڈرایا گیا، اس لئے وہ غافل ہیں''۔

"بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ"(327)

''بلکہ وہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو نہیں آیا جن کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے تاکہ وہ ہدایت پائیں''۔

اس مفہوم کی آیات کریمہ سے ''منٹگمری واٹ'' نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے کیونکہ حضور ﷺ نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں جس قوم کی طرف پہلے کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ چونکہ حضور ﷺ عربوں کے لئے نذیر بن کر آئے تھے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ ان سے پہلے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام بھی عربوں کی طرف مبعوث ہوئے ہوں۔

''منٹگمری واٹ'' یہ شوشہ عربوں کے ساتھ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے تعلق کو مشکوک بنانے کے لئے چھوڑ رہا ہے ورنہ اسے معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جو بابل میں تھی اور آپ نے اس مقام پر اپنا فریضہ نبوت ادا کرتے ہوئے اپنی قوم کی بت پرستی پر شدید ضربیں لگائی تھیں اور پھر مسکراتے ہوئے نار نمرود میں کود گئے تھے۔ قدرت خداوندی سے وہ نار آپ کے لئے گلزار بن گئی تھی اور پھر آپ راہ خدا میں اپنے وطن سے ہجرت کر گئے تھے۔ آپ نے مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں اپنی عفت مآب اہلیہ اور اپنے جگر گوشے کو آباد کیا تھا اور پھر ان کے اس جگر گوشے کی پشت سے جو نسل چلی تھی، اسے تاریخ میں عرب مستعربہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عربوں سے تعلق یہ نہ تھا کہ آپ ان کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے بلکہ عربوں سے ان کا تعلق یہ تھا کہ وہ ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے۔ آپ کے یہ فرزند ارجمند بھی خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ وہ بھی دین ابراہیم ہی کے مشعل بردار تھے اوران کو جس قوم کی طرف مبعوث فرمایا گیا تھا وہ عرب قوم ہی تھی۔ اس طرح عربوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی رشتہ بھی تھا اور دینی رشتہ بھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام جن قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے وہ قومیں بھی عرب اقوام ہی تھیں لیکن یہ تمام انبیائے کرام جو عرب اقوام کی طرف مبعوث ہوئے، ان کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف توراۃ نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اس طویل عرصہ میں عربوں کی طرف کوئی نبی اور رسول مبعوث نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس الہامی روشنی سے محروم ہو چکے تھے جو انہیں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی وساطت سے عطا ہوئی تھی۔ اس زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنو اسرائیل میں بے شمار انبیائے کرام مبعوث ہوئے تھے لیکن اس زمانے میں عربوں کی طرف کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اپنے حبیب کو اس قوم کی طرف مبعوث فرمایا ہے جو

مدتوں سے ہدایت کی روشنی سے محروم تھی۔ قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ سے یہ مطلب نکالنا کہ جن اقوام پر عرب کا لفظ صادق آتا ہے، ان کے پاس حضور ﷺ سے پہلے کوئی نبی آیا ہی نہ تھا، جہالت بھی ہے اور تاریخ کے حقائق کو مسخ کرنے کی ایک نامسعود کوشش بھی۔ (328)

''منگمری واٹ'' نے ایک شوشہ یہ بھی چھوڑا ہے کہ مکی دور میں مسلمانوں کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے ساتھ اپنے رشتے

کا علم نہ تھا، بعد میں یہودیوں کے ساتھ رابطے سے ان کو اس رشتے کا علم ہوا۔ منگمری واٹ کا یہ شوشہ یہودیوں کو ہمہ دان اور عربوں کو اپنی تاریخ سے نا آشنا ثابت کرنے کی کوشش ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں ان میں سے اکثر کو تو مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ یہودیوں نے تو انہیں بتایا تھا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام لونڈی زادہ تھے لیکن مسلمان حضرت ہاجرہ کو شاہ مصر کی شاہزادی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا محبوب فرزند سمجھتے تھے۔ یہودیوں نے تو انہیں بتایا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ کو اپنے فرزند سمیت گھر سے نکال دیا تھا، لیکن مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اپنے رب کے حکم پر اپنی اہلیہ اور اپنے فرزند ارجمند کو مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں آباد کیا تھا اور ان کو اپنے رب کے سپرد کر کے واپس آئے تھے۔ یہودیوں نے تو مسلمانوں کو بتایا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ تسلیم و وفا کی داستان کا یہ باب خلیل اللہ علیہ السلام نے منیٰ کے مقام پر رقم کیا تھا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مسکن تھا نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی قربانی کی یاد میں عرب صدیوں سے قربانی کی رسم ادا کر رہے تھے اور وہ حج کی تمام رسومات کا تعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سمجھتے تھے۔ یہودیوں نے تو مسلمانوں کو بتایا تھا کہ بنو اسرائیل خدا کی لاڈلی مخلوق ہیں اور باقی قوموں سے خدا کی خدائی کا تعلق ''نعوذ باللہ'' برائے نام ہے لیکن مسلمان اللہ تعالیٰ کو رب العالمین مانتے تھے اور انہوں نے یہودیوں کی اس خود فریبی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ (329)

حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے متعلق جو معلومات تھیں ان کا مصدر یا تو عرب روایات تھیں اور یا ان کے اس معظم رسول کے ارشادات جو ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ''(330)

''اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے، نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے'' کی شان کے ساتھ ان کے درمیان جلوہ گر تھا۔ مسلمانوں کو آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے بھی، اپنی قومی روایات کے ذریعے، اس بات کا علم تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام

کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تعاون سے تعمیر کیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہی سچا دین تھا۔ ان باتوں میں سے کوئی بات ایسی نہ تھی جو مسلمانوں کو ہجرت سے پہلے معلوم نہ ہو۔ یہ تمام باتیں عرب معاشرے کے مسلمہ حقائق تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جو بقول ولیم میور، حضور ﷺ کے نسب نامے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے گھڑی گئی تھی۔ ولیم میور نے منٹگمری واٹ نے عربوں کے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ رشتے کو مشکوک ثابت کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، ان کی تردید بے شمار دوسرے مستشرقین نے کی ہے۔ یہاں ہم صرف نمونے کے لئے چند حوالے ذکر کرتے ہیں۔ (331)

عربوں کے نسل اسماعیل سے ہونے پر مستشرقین کی شہادت:

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (Encyclopaedia of religion and ethics) کا مقالہ نگار "Chronicle of Sebeos" کے حوالے سے لکھتا ہے:

> "He was an Ishmaelite, who taught his country men to return to the religion of Abraham and claim the promises made to the descendants of Ishmael."(332)

''حضرت محمد (ﷺ) ایک اسماعیلی تھے جنہوں نے اپنے ہم وطن لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ دین ابراہیمی کی طرف رجوع کریں اور ان خدائی وعدوں سے بہرہ یاب ہوں جو نسل اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ کئے گئے ہیں''۔

گبن (Gibbon) وہ مورخ ہے جسے سارا مغرب قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ بھی دیگر مستشرقین کی طرح اسلام کے متعلق معاندانہ جذبات رکھتا ہے لیکن حضور ﷺ کے سلسلہ نسب کو مشکوک بنانے کی جو کوشش کئی دوسرے مستشرقین نے کی ہے، وہ اس پر شدید الفاظ میں تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے:

> "The base and plebeian origin of Muhammad is an unskilful calumny of the christians who exalt instead of degrading the merit of their adversary."(333)

''محمد (ﷺ) کی اصل کو حقیر اور عامیانہ ثابت کرنے کی کوشش عیسائیوں کی ایک غیر دانشمندانہ تہمت ہے جس سے ان کے مخالف کا مقام بجائے گھٹنے کے مزید بڑھ جاتا ہے''۔

"Gibbon" کے اس جملے سے ہمیں مستشرقین کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک غیر جانبدار مورخ ہونے کا دعویدار ہے لیکن اس کی غیر جانبداری کا اندازہ دیکھئے کہ وہ عیسائیوں کو حضور ﷺ کے نسب نامے کو بگاڑنے کی کوششوں پر کوس رہا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ انہوں نے تاریخی حقائق کا خون کیا ہے بلکہ اس لئے کہ ان کی اس غیر ماہرانہ تہمت کے ذریعے حضور ﷺ کے مقام اور مرتبہ میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا ہے۔ ''گبن'' کی اس عبارت کے بعد سرسید احمد خان نے ''سیرت محمدی'' کے صفحہ 246 پر اور محمد احسان الحق سلیمانی نے ''رسول مبین'' کے صفحہ نمبر 107 پر یہ الفاظ بھی لکھے ہیں: ''آپ کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہونا ایک تسلیم شدہ امر ہے اور عرب کی روایات سے ثابت ہے'' لیکن ''گبن'' کی کتاب کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ (334)

گبن گو (کتاب کے اس نسخے کے مطابق) خود تو دوٹوک الفاظ میں حضور ﷺ کی نسل اسماعیل میں سے ہونے کا اقرار نہیں کر رہا لیکن وہ اپنی کتاب کے فٹ نوٹ میں بتا رہا ہے کہ:

"Theophanes the most ancient of the Greeks. confesses that Muhammad was of the race of Ismael." (335)

''تھیوفینز'' جو پرانے زمانے کے یونانیوں میں سے ہے، وہ تسلیم کرتا ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) نسل اسماعیل میں سے تھے''۔

گبن اپنی کتاب کے فٹ نوٹ میں یہ بھی لکھتا ہے کہ ابوالفداء اور گیگنر (Gagnier) نے اپنی اپنی کتابوں میں محمد (ﷺ) کا وہ نسب نامہ درج کیا ہے جو مستند ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی نسب نامے ہیں جو حضور ﷺ کو نسل اسماعیل سے ثابت کرتے ہیں۔ مسٹر فاسٹر نے بھی اس حقیقت کی گواہی دی ہے، وہ لکھتا ہے:

''اب تک ہم نے قیدار کا سراغ قدیم جغرافیہ سے لگایا ہے۔ اب اس بات کا دیکھنا باقی ہے کہ قدیم روایتوں کو عربوں کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایت جس کی تائید میں اور کوئی ثبوت نہ ہو گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہو، مگر روایت کی جانچ پڑتال کے جو قوانین مسلمہ ہیں، ان کے مطابق، ان پر غور کرنے سے اس بات کا انکار ناممکن ہے کہ وہ روایت مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح کی تاریخ کے طابق ہے۔ خاص عرب کے لوگوں کی یہ قدیمی روایت ہے کہ:

قیدار اور اس کی اولاد ابتدا میں حجاز میں آباد ہوئی تھی۔ چنانچہ قوم قریش اور خصوصاً مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ اس بزرگ کی نسل میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور خاص حضرت محمد (ﷺ) نے اسی بنیاد پر کہ اسماعیل کی نسل اور قیدار کی اولاد ہیں، اپنی قوم کی دینی اور دنیوی عظمتوں کے استحقاق کی تائید کی ہے''۔(336)

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ولیم میور اور منٹگمری واٹ نے حضور ﷺ کے اسماعیلی النسل ہونے کی حقیقت کو مشکوک کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ عربی روایتوں کے خلاف ہے بلکہ خود مغربی مورخین اور مستشرقین کی تحقیقات کے بھی خلاف ہے۔ مستشرقین ہزار کوششیں کریں وہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کو جھٹلا نہیں سکتے: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

'قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم انّ الله اصطفىٰ من وُلْدِ ابراهيم اسماعيل وَاصطفىٰ كِنَانَةَ مِنْ بني اسماعيل و اصطفىٰ من بني كِنَانَةَ قُرَيشًا و اصطفىٰ من قُرَيشٍ بني هاشمٍ و اصطفاني من بني هاشم".(337)

''حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم سے اسماعیل کو چنا، اولاد اسماعیل سے کنانہ کو چنا، بنی کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم سے مجھے چنا''۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقام کو گھٹانے کی کوششیں:

حضور ﷺ کے نسل اسماعیل سے ہونے کو تو اکثر مستشرقین تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبی عظمت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہودی اپنے آپ کو خدا کی لاڈلی مخلوق سمجھتے ہیں اور دیگر کسی قوم کو باعزت مقام دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہودیوں نے حضور ﷺ کی نبوت کا انکار ہی محض اس بنا پر کیا تھا کہ وہ نبوت جیسی عظیم نعمت کو بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور قوم میں دیکھنے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ انہوں نے اپنے اس زعم باطل پر اپنی مذہبی کتابوں اور اپنے رسولوں کی تعلیمات کو قربان کر دیا اور حضور ﷺ کو پہچان لینے کے باوجود آپ کی نبوت و رسالت کا انکار کر دیا۔

بنو اسرائیل کو دیگر اقوام سے بہتر سمجھنے کی بیماری یہودیوں تک محدود نہ تھی بلکہ یہ بیماری عیسائیوں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ بنو اسماعیل ان کے چچیرے بھائی تھے۔ انہیں یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آنی چاہئے تھی کہ حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں

اپنے والد ماجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبی عظمتوں کے وارث ہیں اور جس طرح حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنے نسبی رشتے پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بھی خلیل اللہ علیہ السلام کی اولاد ہونے پر بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ لیکن تعصب اور خود فریبی نے انہیں اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کی اجازت نہ دی۔ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نسب پر باپ کی طرف سے تو کوئی اعتراض کر نہ سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں ان کی اپنی خاندانی عظمت بھی خاک میں ملتی تھی اس لئے انہوں نے ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کی طرف سے ان کے مقام کو گھٹانے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے حضرت ہاجرہ کو لونڈی ثابت کرنے کے لئے حضرت سارہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے جو کتاب پیدائش، باب 21 آیات نو اور دس میں درج ہے۔ بائیبل کے الفاظ یہ ہیں:

"And Sarah kept noticing the son of Hagar the Egyptian, whom she had borne to Abraham, Poking fun. She began to say to Abraham, "Drive out this slave girl and her son, for the son of this slave girl, is not going to be an heir with my son, with Isaac".(338)

''سارہ دیکھ رہی تھیں کہ ہاجرہ مصریہ کا بیٹا، جسے اس نے ابراہیم سے جنم دیا تھا، ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابراہیم سے کہنا شروع کردیا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو، کیونکہ ایک لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے یعنی اسحاق کے ساتھ وارث نہیں بن سکتا''۔

یہود و نصاریٰ نے اپنی الہامی کتابوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس کے پیش نظر یہ یقین سے کہنا ممکن نہیں کہ مذکورہ بالا الفاظ واقعی حضرت سارہ کی زبان سے نکلے تھے یا نہیں۔ لیکن اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ واقعی حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ کے متعلق یہ الفاظ استعمال کئے تھے تو بھی عبارت کا سیاق و سباق یہ بتاتا ہے کہ یہ الفاظ وہ ہیں جو شدت جذبات میں ایک سوکن کے لئے دوسری سوکن کی زبان سے نکلے ہیں۔ یہ کتنی بدذوقی ہوگی کہ ایک سوکن نے غصے میں دوسری سوکن کے لئے جو الفاظ استعمال کئے، انہیں تاریخی حقیقت سمجھ لیا جائے اور اس کے مقابلے میں مسلمہ تاریخی حقائق کو مسترد کردیا جائے۔ ہمارے اس موقف کی حمایت بائیبل کی دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں حضرت ہاجرہ کے لئے خادمہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں لونڈی کے نہیں۔ کتاب پیدائش، باب 16، آیت نمبر 1 کے الفاظ یہ ہیں:

"Now Sarai, Abraham's wife, had borne him no children; but she had an Egyptian maid servant and her name was Hagar".(339)

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سارہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی لیکن ان کی ایک مصری خادمہ تھی جس کا نام ہاجرہ تھا''۔

اسی باب کی آیت نمبر 5 اور 6 کے الفاظ یہ ہیں:

"At this Sarai said to Abraham." The violence done me be upon you. I myself gave my maidservant over to your bosom, and she became aware that she was pregnant, and I began to be despised in her eyes. May Jehovah judge between me and you. So Abraham said to Sarai". Look! Your maidservant is at your disposal. Do to her what is good in your eyes. "Then Sarai began to humiliate her so that she ran away from her".(340)

''اس پر سارہ نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا: مجھ پر جو زیادتی ہوئی ہے اس کا اثر آپ پر بھی پڑے۔ میں نے خود اپنی خادمہ تمہارے حوالے کی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ حاملہ ہے اور اس کی نظروں میں میری عزت کم ہو گئی ہے۔ خدا ہی میرے اور آپ کے درمیان فیصلہ فرمائے۔ اس پر ابراہیم علیہ السلام نے سارہ سے کہا: دیکھو! تمہاری خادمہ کا معاملہ تمہاری صوابدید پر ہے۔ تم جو مناسب سمجھو، اس کے ساتھ سلوک کرو۔ تب سارہ نے اس کی توہین کرنا شروع کر دی اور وہ اس کے پاس سے چلی گئی''۔

کتاب پیدائش، باب 25، آیت نمبر 12 کے الفاظ یہ ہیں:

"And this is the history of Ishmael the son of Abraham whomHagar the Egyptian the maidservant of Sarah bore to Abraham".(341)

''یہ تاریخ ہے اسماعیل بن ابراہیم کی جنہیں ہاجرہ مصریہ، سارہ کی خادمہ نے جنم دیا تھا''۔

سینٹ پال نے گلاتیوں کے نام جو خط لکھا، اس کے باب 4 کی آیت نمبر 22 میں بھی اس نے حضرت ہاجرہ کو خادمہ کہا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"For example, it is written that Abraham acquired two sons, One by the servant girl and one by the free woman".(342)

''مثال کے طور پر، لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو دو بیٹے عطا ہوئے، ایک خادمہ کے بطن سے تھا اور دوسرا آزاد عورت کے بطن سے''۔

بائیبل کے بیان کو اگر صحیح مان لیا جائے تو بھی اس میں حضرت ہاجرہ کے لئے خادمہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور خادمہ کا لفظ بھی اس لئے استعمال ہوا ہے کہ فرعون نے جب اپنی لخت جگر کو حضرت سارہ کے حوالے کیا تھا تو کہا تھا: ''میری بیٹی کا اس گھر میں خادمہ ہو کر رہنا، دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے''۔(343)

یہ اظہار عقیدت کا مشرقی انداز ہے، جس کی مستشرقین کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اہل مشرق خدا کے ان پاکباز بندوں کا غلام اور خادم کہلانے پر فخر کرتے ہیں جن پر ان کے خالق کا خصوصی کرم ہوتا ہے۔ مدنی تاجدار ﷺ نے عربوں کو حریت کا درس دیا تھا اور حریت کی اسی تعلیم کی برکت سے انہوں نے غلامی کے ہر طوق کو اتار پھینکا دیا تھا، لیکن غلامی رسول کا رشتہ انہیں اتنا عزیز تھا کہ وہ کسی قیمت پر، اس کو ختم کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے آزاد ہو کر اپنے باپ کے ساتھ جانے کے بجائے حضور ﷺ کی غلامی کو ترجیح دی تھی۔ یہ ایسی غلامی تھی جس پر ہزار آزادیاں قربان کی جا سکتی تھیں۔

خدا کے خلیل اور ان کی پاکباز اہلیہ کی خادمہ کہلانا حضرت ہاجرہ کے لئے باعث عار نہ تھا بلکہ سرمایہ افتخار تھا۔ شاہ مصر نے اسی اعزاز کی خاطر اپنی بیٹی کے لئے خادمہ کا لفظ استعمال کیا تھا، ورنہ ایک معمولی عقل وسمجھ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ بادشاہ ایک برگزیدہ جوڑے کی روحانی عظمتوں سے متاثر ہو کر، ان کی خدمت میں ہدیے اور تحفے پیش کر رہا تھا اور یہ تحائف پیش کرنے میں وہ اس حد تک نکل گیا تھا کہ اپنی شاہزادی بھی ان کے ہمراہ کر دی تھی۔ یقیناً بادشاہ نے اپنی شاہزادی کی خدمت کے لئے بھی لونڈیاں اور غلام ساتھ کئے ہوں گے۔ اس لئے ہاجرہ خانوادہ ابراہیم میں صرف خادمہ ہی نہیں بلکہ مخدومہ بھی تھی لیکن خادمہ خلیل ہونے کا اعزاز مخدومہ ہونے سے کہیں بڑا تھا۔ اس لئے وہی ان کے نام کے ساتھ مشہور ہو گیا۔

حضرت ہاجرہ کا تعارف مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مختصر الفاظ میں خوب کرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"His mother Hajira (Hagar), a princess of royal blood, a daughter of the reigning pharaoh of Egypt, was an embodiment of piety and virtue".(344)

''ان (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کی والدہ ہاجرہ، ایک شہزادی تھیں جن کی رگوں میں شاہی خون گردش کرتا تھا۔ وہ مصر کے اس فرعون کی بیٹی تھیں جو حاکم وقت تھا۔ یہ خاتون نیکی اور پارسائی کا نمونہ تھیں''۔

اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریا آبادی ''جیوش انسائیکلو پیڈیا'' کے حوالے سے حضرت ہاجرہ کے بارے میں یہودی علماء کی آراء نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "Observe the unwilling admission of the Jews:- Hagar is held up as an example of the high degree of godliness prevalent in Abraham's time, for ... Hagar was not frightened by the sight of the divine messenger. Her fidelity is praised for even after Abraham sent her away ske kept the marriage vow ... Another explanation of the same name is, to adorn, because she was adorned with piety and good deeds. It was Isaac who, after the death of Sarah, went to bring back Hagar to the house of his father... As a token of his love for Sarah the king deeded his entire property to her, and gave her the land of Goshen as her hereditary possession... He gave her also his own daughter as slave".(345)

''یہودیوں نے بادل نخواستہ جو اعتراضات کئے ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے: ہاجرہ کو اس تقویٰ اور پارسائی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں متعارف تھی کیونکہ حضرت ہاجرہ مقدس فرشتے کو دیکھ کر بھی نہیں گھبراتیں۔ ان کی عفت مآبی کو اس بناء پر سراہا جاتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے انہیں گھر سے باہر بھیج دیا تو بھی انہوں نے ازدواجی وفاداری میں فرق نہ آنے دیا ان کے نام کا ایک مطلب ''آراستہ'' بھی ہے اور یہ اس لئے کہ آپ نیکی اور تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھیں۔ وہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہی تھے جو حضرت سارہ کے انتقال کے بعد حضرت ہاجرہ کو اپنے باپ کے گھر واپس لانے کے لئے گئے تھے بادشاہ کے دل میں حضرت سارہ کے لئے عقیدت کے جو جذبات پیدا ہو گئے تھے، ان کے اظہار کے لئے اس نے اپنی ساری جائیداد حضرت سارہ کے نام کر دی تھی اور ''گوشن'' کی سرزمین ان کے قبضے میں دے دی تھی۔ اس نے اپنی لڑکی بھی کنیز کے طور پر ان کے حوالے کی دی تھی''۔

مندرجہ بالا اقتباس میں یہودیوں نے تسلیم کیا ہے کہ شاہ مصر نے خود اپنی بیٹی کو حضرت سارہ کے حوالے کیا تھا اور اس کے علاوہ آپ کو بے شمار تحائف بھی دیئے تھے۔ کیا تاریخ انسانی میں کبھی اس طریقے سے لونڈی غلام بنانے کا رواج رہا ہے کہ ایک وقت کے بادشاہ تو کیا کسی آزاد اور باحیثیت آدمی نے خود اپنی بیٹی یا بیٹے کو کسی کے حوالے کیا ہو اور اس کی حیثیت غلام اور لونڈی کی بن گئی ہو۔

لونڈی یا غلام یا تو وہ ہوتے ہیں جن کو لڑائی میں قیدی بنایا گیا ہو یا وہ ہوتے ہیں جو زرخرید ہوں اور یا وہ لوگ لونڈی یا غلام بنتے ہیں جو کسی لونڈی یا غلام سے پیدا ہوئے ہوں۔ توراۃ میں بھی ان تینوں قسموں کے لونڈی غلاموں کے لئے مختلف اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ پہلی قسم کے لونڈی غلاموں کے لئے عبرانی میں ''شیلبوث حرب''، دوسری قسم کے لونڈی غلاموں کے لئے ''مقنت کسف'' اور تیسری قسم کے لونڈی غلاموں کے لئے ''یلید بایث'' کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ (346)

حضرت ہاجرہ کو نہ تو مذکورہ طریقوں میں سے کسی طریقے سے لونڈی بنایا گیا اور نہ ہی توراۃ میں حضرت ہاجرہ کے بارے میں مذکورہ

بالا اصطلاحات میں سے کوئی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔عبرانی توراۃ میں حضرت ہاجرہ کے لئے ''امتی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی ''امۃ'' کا ہم معنی ہے۔اس لفظ کا معنی خادمہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن توراۃ کے مختلف زمانوں میں ترجمے کرنے والوں نے حضرت ہاجرہ کی تاریخ کو مدنظر رکھے بغیر ان الفاظ کو ایسے معانی پہنائے ہیں جن سے حضرت ہاجرہ کی تنقیص کا پہلو نکل سکے۔انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں نے اسے "Slave girl" بنا دیا اور اردو میں ترجمہ کرنے والوں نے اس کا معنی ''لونڈی'' کر دیا۔

مسلمان ہر اس ہستی کو اپنے سر کا تاج سمجھتے ہیں جس کا کسی نبی یا رسول سے تعلق ہو۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تو مسلمانوں کا ایک خصوصی تعلق ہے اور اس تعلق کی وجہ سے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اہل بیت میں سے ہر ایک کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کو سعادت سمجھتے ہیں۔لیکن اگر یہودی اور عیسائی حضرت ہاجرہ کی تاریخ کو سمجھتے ہوئے بھی ان کو لونڈی قرار دینے پر مصر ہوں اور اس تعلق کی وجہ سے نسل اسماعیل کی خاندانی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کریں تو پھر خانوادہ بنو اسرائیل کی عظمت بھی برقرار نہیں رہ سکتی۔

بنو اسرائیل کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے بنو اسرائیل کہا جاتا ہے اور وہ سب اس نسب پر بڑا فخر کرتے ہیں۔حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے اور انہی سے بنو اسرائیل کی بارہ شاخیں نکلی ہیں۔بنو اسرائیل ان تمام قبائل کو برابر عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔توراۃ کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ان کی چار بیویوں کی اولاد ہیں: لیاہ، راخیل، زلفہ اور بلہہ۔(347)

راخیل اور لیاہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی لڑکیاں ہیں، جو ان کے نکاح میں آئیں لیکن زلفہ اور بلہہ کو ان کے سسر نے اپنی بیٹیوں کو خادمہ کے طور پر عنایت کیا تھا۔کتاب پیدائش، باب 29، آیۃ 24 میں ہے:

"Moreover, Laban gave to her Zilpah his maidservant, even to Leah his daughter, as a maidservant".(348)

''لابان'' نے اپنی خادمہ زلفہ کو بطور خادمہ اپنی بیٹی ''لیاہ'' کے سپرد کیا''۔

اسی باب کی آیت نمبر 29 میں ہے:

"Besides, Laban gave Bilhah his maidservant to Rachel his daughter as her maidservant".(349)

''اس کے علاوہ ''لابان'' نے اپنی خادمہ ''بلہہ'' کو بطور خادمہ اپنی بیٹی راخیل کے حوالے کیا'۔

یہ دو خواتین جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے سسرال سے ان کی بیویوں کے ساتھ بطور خادمہ آئی تھیں، بعد میں اپنی ازواج کی خواہش پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان سے بھی نکاح کر لیا تھا۔بالکل اسی طرح جس طرح حضرت سارہ کی خواہش کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کیا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے چار بیٹے ان دو خواتین کے بطن سے ہیں، جن کو تورات خادمائیں کہتی ہے۔اب اگر حضرت ہاجرہ کے خادمہ ہونے کی وجہ سے ان کے بیٹے کی نسل کا مقام گھٹتا ہے تو زلفہ اور بلہہ کے خادمائیں ہونے کی وجہ سے، ان کی نسل کا مقام کیسے برقرار رہے گا؟ جبکہ دونوں قسم کی خاداؤں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔حضرت ہاجرہ، حضرت سارہ کی خادمہ کہلانے سے پہلے مصر کی شاہزادی تھیں، جبکہ زلفہ اور بلہہ تورات کے مطابق راخیل اور لیاہ کی خادمائیں بننے سے پہلے ان کے باپ ''لابان'' کی خادمائیں تھیں۔شاہ مصر نے اپنی شاہزادی بطور عقیدت حضرت سارہ کے حوالے کی تھی اور ''لابان'' نے اپنی بیٹیوں کی خدمت کے لئے اپنی خادمائیں ان کے حوالے کی تھیں۔

بنو اسرائیل سے گزارش ہے کہ اگر وہ حضرت ہاجرہ کو زلفہ اور بلہہ سے بلند مقام دینے کے لئے تیار نہیں تو وہ ان کو کم از کم ان کے برابر مقام تو دیں اور پھر جو حکم زلفہ اور بلہہ کی اولاد پر لگائیں، وہی حضرت ہاجرہ کی اولاد پر بھی لگا دیں۔اگر مستشرقین اور یہود و نصاریٰ

صرف اس بنا پر حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہنے پر مصر ہیں کہ حضرت سارہ نے ان کے لئے یہ لفظ استعمال کیا تھا، یا بائبل میں کہیں ان کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے تو اس قاعدے کے مطابق انہیں حضرت راخیل اور لیاہ کو جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی بیٹیاں تھیں، انہیں بھی لونڈی قرار دینا پڑے گا کیونکہ ان کے متعلق لونڈی کا لفظ کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے لونڈی ہونے کا اقرار کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کے والد نے انہیں فروخت کیا ہے اور تورات اس بات پر گواہ ہے۔ کتاب پیدائش، باب 31 کی آیات 14 اور 15 کے الفاظ یہ ہیں:

> "At this Rachel and Leah answered and said to him"L Is there a share of inheritance for us anymore in the house of our father? Are we not realy considered as foreigners to him since he has sold us, so that he keeps eating continually even from the money given for us?"(350)

''اس کے جواب میں راخیل اور لیاہ نے آپ سے کہا: کیا ہمارے باپ کے گھر میں ہمارا کوئی حق وراثت باقی رہ گیا ہے؟ کیا درحقیقت ہم اپنے باپ کے لئے اجنبی نہیں ہو گئیں کیونکہ اس نے ہمیں فروخت کر دیا ہے اور ہمارے بدلے اسے جو رقم ملی ہے، اسے مسلسل کھا رہا ہے؟''

اس بیان میں تو معزز خواتین یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ ان کے باپ نے انہیں فروخت کر دیا ہے اور ان کے بدلے اسے جو رقم ملی ہے اسے کھا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان خواتین سے حضرت ہاجرہ کا مقام بلند ہے جنہیں ان کے باپ نے فروخت نہیں کیا تھا بلکہ حضرت سارہ جیسی عظیم خاتون کی معیت کو اپنی بیٹی کے لئے سعادت سمجھا تھا اور نہ صرف اپنی بیٹی حضرت سارہ کے سپرد کی تھی بلکہ اس کے ساتھ بے شمار تحائف بھی ان کی نذر کیے تھے۔ حضرت ہاجرہ کے آزاد خاتون ہونے اور لونڈی نہ ہونے پر بائبل میں ایک زبردست شہادت موجود ہے۔ اسرائیلی قانون میں لونڈی کی اولاد کبھی جائداد کی وارث نہیں بن سکتی۔ (351)

اگر حضرت ہاجرہ لونڈی ہوتیں تو حضرت سارہ کے ذہن میں کبھی یہ بات نہ کھٹکتی کہ ہاجرہ کا بیٹا، ان کے اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے باپ کا وارث بنے گا۔ لیکن بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت سارہ نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا اور حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو گھر سے نکلوانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں اسحاق کے ساتھ اسماعیل بھی اپنے باپ کا وارث قرار نہ پائے۔ کتاب پیدائش، باب 21 کی آیت نمبر 10 ہمیں بتاتی ہے:

> "So she began to say to Abraham, Drive out this slave girl and his son, for the son of the slave girl is not going to be an heir with my son, with Isaac".(352)

''اس لئے اس (سارہ) نے ابراہیم سے کہنا شروع کر دیا: اس کنیز اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو کیونکہ اس کنیز کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وراثت کا حصہ دار نہیں بن سکتا''۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے علمائے یہود کے حوالے سے جو بات لکھی ہے کہ حضرت سارہ کے انتقال کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام خود حضرت ہاجرہ کو لینے کے لئے گئے تھے تاکہ وہ ان کے والد کے گھر میں قیام فرمائیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نظر میں حضرت ہاجرہ کا وہی مقام تھا جو ایک بیٹے کے دل میں اپنی مادر محترمہ کا ہوتا ہے۔ ان کی والدہ حضرت سارہ انتقال کر گئی تھیں اور وہ گھر جو کبھی اپنی والدہ کے دم سے انہیں رشک ارم دکھائی دیتا تھا، وہ اب انہیں سونا سونا محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کے خیال میں حضرت سارہ کے انتقال

سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے صرف حضرت ہاجرہ ہی پر کر سکتی تھیں۔ اس لئے آپ خود حضرت ہاجرہ کو لینے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ کے دلوں میں کوئی جذبات رقابت تھے بھی تو وہ جلد ختم ہو گئے تھے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نظر میں حضرت ہاجرہ ان کی والدہ کی سوکن اور ان کی مخالف نہ تھیں بلکہ ان کی نظر میں ان کا مقام ایک ماں کا تھا کیونکہ وہ ان کے والد محترم کی زوجہ مطہرہ اور ان کے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ محترمہ تھیں۔

اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے اپنے گھر کے افراد اور انتہائی قابل احترام تھے، انہیں ان کی اولاد نے لونڈی اور لونڈی زادہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کی روحانی عظمت:

سینٹ پال جو موجودہ عیسائیت کا بانی ہے اس نے ''گلتیون'' کے نام اپنے خط میں حضرت ہاجرہ کی اولاد کو بڑے عجیب انداز میں ہر قسم کی عظمتوں سے محروم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے یہاں بنو اسرائیل کو اعلیٰ اور بنو اسماعیل کو ادنیٰ ثابت کرنے کے لئے کسی تاریخی حقیقت کا نہیں بلکہ تمثیل کا سہارا لیا ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

> "But the one by the servant girl was actually born in the manner of flesh, the other by the free woman through a Promise".(353)

''لیکن وہ بیٹا جو خادمہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا، وہ در حقیقت جسمانی طور پر پیدا ہوا تھا اور دوسرا جو آزاد عورت کے بطن سے تھا وہ وعدہ کے طور پر پیدا ہوا تھا''۔

اس کے بعد سینٹ پال نے عجیب و غریب منطق جھاڑی ہے۔ وہ حضرت ہاجرہ اور حضرت سارہ کو تمثیل کے انداز میں پہلے دو عہد اور پھر دو پہاڑیاں قرار دیتا ہے۔ وہ حضرت ہاجرہ کو کوہ سینا اور حضرت سارہ کو یوروشلم قرار دیتا ہے اور پھر دعویٰ کرتا ہے کہ سینا جو عرب کا پہاڑ ہے اس کی مثال اس ماں کی سی ہے جو غلاموں کو جنم دیتی ہے اور یوروشلم ایسی ماں ہے جس کے فرزند آزاد ہوتے ہیں۔ (354)

سینٹ پال اپنے اس ڈرامے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ روحانی عظمتیں حضرت سارہ کی اولاد کے لئے خاص ہیں اور حضرت ہاجرہ کی اولاد کو ان میں سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی ولادت جسمانی طور پر ہوئی تھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت روحانی طور پر۔ پھر وہ اپنے اسی خیال کو ترقی دے کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسرائیلی سرداری کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اسماعیلی غلامی کرنے کے لئے۔ اس قسم کے خیالات اسی بیمار ذہن میں جنم لے سکتے ہیں جو مقام آدمیت سے قطعاً نا آشنا ہو اور جو اللہ تعالیٰ کو ''رب العالمین'' سمجھنے کے بجائے صرف بنو اسرائیل کا رب سمجھتا ہو۔ اس قسم کی خام خیالی سینٹ پال تک محدود نہیں بلکہ بہت سے مستشرقین جو سینٹ پال کی روحانی اولاد ہیں، وہ بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل تھے اور انہیں خاندانی اور روحانی عظمتیں اپنے عظیم باپ سے ورثے میں ملی تھیں۔ اس بات کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ بائبل جس کے لکھنے والوں نے نسل اسماعیل کے مقام کو گھٹانے کے لئے کئی صدیاں سر توڑ کوششیں کی ہیں، اس بائبل میں ان گنت تحریفات کے باوجود آج بھی ایسی آیات موجود ہیں جن سے ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور ان کے فرزند ارجمند کی عظمت جھلکتی ہے۔ بائبل میں جو عظمتیں حضرت سارہ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے بیان ہوئی ہیں، انہیں عظمتوں کا حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی حامل قرار دیا گیا ہے۔ بائبل کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت سارہ کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام خود رکھا تھا تو اس نے حضرت ہاجرہ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام بھی خود رکھا۔ کتاب پیدائش، باب 17، آیت نمبر 19 میں اللہ تعالیٰ

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرما رہا ہے:

"Sarah your wife is indeed bearing you a son, and you must call his name Isaac".(355)

''تمہاری اہلیہ سارہ تمہارے ایک بچے کو جنم دیں گی، تم اس بچے کا نام اسحق رکھنا''۔

جب کہ کتاب پیدائش، باب 16، آیت نمبر 11 میں خدا کا فرشتہ براہ راست حضرت ہاجرہ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

"Here you are Pregnant, and you shall give birth to a son and must call his name Ishmael; for Jehovah has heard your affliction".(356)

''دیکھو! تم حاملہ ہو۔تم ایک بچے کو جنم دو گی، تمہیں اس کا نام اسماعیل رکھنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دردوغم کو سن لیا ہے''۔

بائبل کی مندرجہ بالا عبارتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ ان دونوں عظیم خواتین کے عظیم فرزندوں کے نام بارگاہ خداوندی نے خود تجویز کئے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ حضرت سارہ کو ان کا دردوغم سنے جانے، بیٹا عطا ہونے اور اس بیٹے کے نام کی بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کی وساطت سے دی جا رہی ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے خلیل سے مخاطب ہے اور ان سے خطاب کے دوران حضرت سارہ کو ان کی وساطت سے خوش خبری دے رہا ہے، جب کہ حضرت ہاجرہ سے خدا کا مقدس فرشتہ مخاطب ہے۔فرشتہ انہیں بتا رہا ہے کہ خدا نے تمہارا دردوغم سن لیا ہے، وہ تمہیں بیٹا عطا فرمائے گا اور اس نے تمہارے اس بیٹے کا نام اسماعیل رکھ دیا ہے۔اب یہ فیصلہ سینٹ پال اور اس کی روحانی ذریت ہی بہتر کر سکتی ہے کہ روحانیت کے ساتھ اس کا تعلق زیادہ ہے جس کے ساتھ خدا کا مقدس فرشتہ ہم کلام ہے یا جس کو یہ خوش خبری خدا کے رسول کی وساطت سے مل رہی ہے۔

کتاب پیدائش، باب 17، آیت نمبر 16 میں حضرت سارہ کے متعلق بیان ہوا ہے:

"And I will bless her and also give you a son from her; and I will bless her and she shall become nations; Kings of people will come from her".(357)

''اور میں اس کو برکت دوں گا اور تمہیں اس سے ایک بیٹا دوں گا۔میں اس کو برکت دوں گا اور اس کی اولاد سے کئی قومیں بنیں گی۔ اس کی اولاد میں سے قوموں کے بادشاہ ہوں گے''۔

یہی بات اسی باب کی آیت نمبر 20 میں حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کے متعلق بھی کہی گئی ہے:

"But as regards Ishmael I have heard you. Look! I will bless him and will make him fruitful and will multiply him very very much. e will certainly broduce twelve chieftains, and I will make him become a great nation".(358)

''لیکن جہاں تک اسماعیل کا تعلق ہے، اس کے متعلق میں نے تمہاری التجا سن لی ہے۔دیکھو! میں اسے برکت دوں گا۔میں اسے صاحب اولاد بناؤں گا اور اس کی نسل میں بہت زیادہ اضافہ کروں گا۔اس کی نسل سے یقیناً بارہ عظیم سردار جنم لیں گے اور میں اسے ایک بہت بڑی قوم بناؤں گا''۔

بائبل جس طرح خدا کی معیت کو حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے ثابت کر رہی ہے، اسی طرح وہ اس اعزاز کو حضرت اسماعیل

علیہ السلام کے لئے بھی ثابت کر رہی ہے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق کتاب پیدائش، باب 26، آیت نمبر 24 میں ہے:

"And Jehovah Proceeded to appear to him during that night and say:" I am the God of Abraham your father. Do not be afraid, because I am with you, and I will bless you and multiply your seed on account of Abraham my servant".(359)

''اس رات خدا اس کے سامنے ظاہر ہوا اور فرمایا: میں تمہارے باپ ابراہیم کا خدا ہوں۔ ڈرو مت، کیونکہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں برکت دوں گا اور اپنے بندے ابراہیم کی وجہ سے تمہاری نسل میں اضافہ کروں گا''۔

خدا کی یہی معیت حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی حاصل ہے۔ ان کے متعلق کتاب پیدائش، باب 21، آیت نمبر 20 میں ہے:

"And God continued to be with the boy, and he kept growing and dewlling in the wilderness; and he became an archer".(360)

''اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس لڑکے کے ساتھ تھا۔ ویرانے میں رہتے ہوئے وہ نشو ونما پاتا رہا اور ایک تیر انداز بن گیا''۔

بائبل یہود و نصاریٰ کی ان گنت تحریفات کے باوجود حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے بھی وہی روحانی عظمتیں ثابت کر رہی ہے جو حضرت سارہ اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لئے کر رہی ہے۔ بائبل میں حضرت ہاجرہ یا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف میں کسی ایک جملے کا بھی مل جانا، ان کی عظمت کا ناقابل تردید ثبوت ہے کیونکہ حاملان بائبل نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کے مقام کو گھٹانے کے لئے اپنی الہامی کتابوں پر بھی کتمان و تحریف کے بے شمار حربے آزمائے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی ان گنت تحریفات کے باوجود بائبل میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی روحانی عظمتوں کا اشارہ مل جانا، اس ذات کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے سبط اسماعیل علیہ السلام کے سر پر "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ"۔ (361)

''اور ہم نے بلند کر دیا آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو''۔

کا تاج سجایا ہے اور جو یہ گوارا نہیں کرتا کہ پھونکیں مارنے والے شمع حق کو بجھانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خاندان بنو ہاشم کا مقام گھٹانے اور مسلمانوں کو حقیر ثابت کرنے کی کوششیں:

یورپ کے لوگ ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب ان ممالک نے اپنے شہریوں کی شخصی دستاویزات سے ولدیت کا خانہ ہی ختم کر دیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک نہ خاندانی نظام کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی کسی نسل سے ہونے کو وہ انسان کے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ خاندان کا اس طرح حلیہ بگاڑنے کے باوجود بنو اسرائیل اپنے نسبی تفوق پر اتراتے ہیں، گوری چمڑے والے اپنے آپ کو رنگدار لوگوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور جب کسی مسلمان ہستی کے بارے میں لکھنے پر آتے ہیں تو اس کے نسب نامے میں خامیاں تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ جس شخص کی ولدیت کا ہی کوئی مستند ریکارڈ نہیں، اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اس کے نسب نامے کی وجہ سے حقیر سمجھے؟ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے۔ خصوصاً حضور ﷺ کے متعلق لکھتے وقت اہل مغرب نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

انہوں نے پہلے تو حضور ﷺ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رشتہ منقطع کرنے کی کوشش کی۔ اس میں کامیاب نہ ہوئے تو آپ کو حضرت ہاجرہ کے حوالے سے لونڈی کی اولاد ثابت کرنے کی سعی نامسعود کی۔ جب یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی تو آپ کی اہمیت کو کم کرنے

کے لئے یہ اسلوب اپنایا کہ قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کو اپنے تخیل کے زور پر دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک طرف قبیلہ کی وہ شاخیں تھیں جن کے ہاتھوں میں مکہ کا اقتدار تھا۔ مکہ اور طائف کی تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ اپنی دولت اور طاقت کے بل بوتے پر وہ جو چاہتے، کرتے تھے۔ دوسری طرف اس قبیلے کی کچھ شاخیں وہ تھیں جو کمزور تھیں۔ یہ قبیلے اس قابل نہ تھے کہ وہ شام یا یمن کی طرف تجارتی قافلے بھیج سکتے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قبیلہ بنو ہاشم کا شمار انہی کمزور قبائل میں ہوتا تھا اور مکہ کی طاقت ور اور دولت مند قبائل کے مقابلے میں قبیلہ بنو ہاشم کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

ہم مستشرقین کی تحریروں سے چند اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ خاندان بنو ہاشم کی اہمیت کو کم ثابت کرنے کے لئے، مستشرقین کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ ولیم میور اپنی کتاب ''محمد اینڈ اسلام'' میں لکھتا ہے:

"The bereavement told the more, because the sons of Abd al Muttalib, unable to maintain his dignity, had to relinquish some of the offices of state which had been held by him, and descend to a lower condition of life".(362)

''اس صدمے نے آپ پر اور بھی سخت اثر ڈالا کیونکہ عبدالمطلب کے بیٹے، اپنے باپ کے وقار کو برقرار نہ رکھ سکے تھے اور انہوں نے بعض ان عہدوں سے دست برداری اختیار کر لی تھی جن پر ان کے والد فائز تھے۔ اس طرح وہ نسبتاً پست معیار زندگی پر قانع ہو گئے تھے''۔

ولیم میور نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت عبدالمطلب کے بیٹے کن کن عہدوں سے دستبردار ہوئے تھے اور نہ اس نے یہ بتایا ہے کہ اس نے یہ بات کس حوالے سے لکھی ہے۔ ولیم میور کو یہ بات لکھنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے تھا کہ قریش کے جن قبائل نے حجر اسود کو اپنے مقام پر رکھنے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے تلواریں نکال لی تھیں، ان میں سے کسی قبیلے کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس اعزاز سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہو جاتا جو اسے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا تھا۔ اگر بنو ہاشم نے اس قسم کی کسی کمزوری کا مظاہرہ کیا ہوتا تو مکہ میں سر اٹھا کر چلنا ان کے لئے ممکن ہی نہ رہتا۔

''منٹگمری واٹ'' نے حضور ﷺ کے بچپن میں قبیلہ بنو ہاشم کی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

"Muhammad's guardians say what he did not starve to death, but it was difficult for them to do more for him, especially as the fortunes of the clan of Hashim seems to have been declining at this time. An orphan, with no able bodied man to give special attention to his interests, had a poor start in commercial career; and that was really the only career open to him".(363)

''محمد (ﷺ) کے سرپرست صرف یہ احتیاط کرتے کہ وہ بھوک سے مر نہ جائیں۔ اس سے زیادہ وہ ان کے لئے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ خصوصاً جب کہ اس زمانے میں بنو ہاشم کی مالی حالت گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک یتیم، جس کے مفادات کی دیکھ بھال کے لئے، جسمانی طور پر اہل، کوئی آدمی موجود نہ تھا اس نے اپنی کاروباری زندگی کا آغاز انتہائی کمزور طریقے سے کیا اور یقیناً اس کے علاوہ ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا''۔

''منٹگمری واٹ'' قبیلہ بنو ہاشم کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے یہ شوشہ بھی چھوڑتا ہے کہ قبیلہ بنو ہاشم نے حلف الفضول میں بہت اہم کردار

ادا کیا تھا۔ یہ تنظیم ان قبائل نے بنائی تھی جو مکہ کے اجارہ دار قبائل کے خلاف تھے اور خود وہ قبائل بہت کمزور تھے۔
ان قبائل کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"The clans which formed it seem to have been those which were themselves incapable to sending carvans to yemen, or which had specialized in trade between Mecca and Syria".(364)

''جن قبائل نے حلف الفضول کا معاہدہ کیا تھا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ قبائل تھے جو یمن کی طرف تجارتی قافلے بھیجنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا وہ قبیلے تھے جو شام اور مکہ کے درمیان ہونے والی تجارت میں ہی خصوصی مہارت رکھتے تھے''۔

''منٹگمری واٹ'' بنو ہاشم قبیلہ کے تمام افراد کو غریب اور دوسرے درجے کا شہری ثابت کرنے کے لئے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:

"As a banker and financier, doubtless in a small way, and purveyor of water for the pilgrims, he had little importance in the affair of Mecca, and life there cannot have been very comfortable for him,"(365)

''ایک چھوٹے پیانے کا بنکار ہونے اور حاجیوں کو پانی پلانے کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس میں شک نہیں کہ مکہ کے معاملات میں عباس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ وہاں پر سکون زندگی بسر کر رہے ہوں گے''۔

مستشرقین نے ایک طرف تو قبیلہ بنو ہاشم کے مقام کو گھٹانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور دوسری طرف انہوں نے قریش کے دیگر قبائل کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ساتویں صدی عیسوی کے مکہ کی بات نہ کر رہے ہوں بلکہ بیسویں صدی عیسوی کے یورپ یا امریکہ کی بات کر رہے ہوں۔ مستشرقین ان عربوں کے حالات لکھتے ہوئے ایسے ایسے الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جن کا نام عربوں نے صدیوں تک نہ سنا ہوگا۔ ''منٹگمری واٹ'' ان مستشرقین میں سرفہرست ہے جو قبیلہ بنو ہاشم کے مقام کو گھٹا کر اور ان کے مقابلے میں دیگر قبائل کو با اثر اور طاقت ور ثابت کر کے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مکہ کئی طبقوں میں تقسیم تھا۔ ایک طرف وہ دولت مند تاجر تھے جن کا مکہ کی مارکیٹ پر اجارہ دارانہ کنٹرول تھا اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو غریب اور کمزور ہونے کی وجہ سے کاروباری میدان میں اجارہ داروں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور اس طرح احساس محرومی کا شکار تھے۔ ''منٹگمری واٹ'' اپنے تخیل کے زور پر ساتویں صدی عیسوی کے مکہ کی معاشی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

"By the time Muhammad had begun to preach, the growing commercial prosperity of Mecca may be said to have produced a new topmost stratum of society, namely, the leading, richest and most powerful merchants. These were at the same time the heads of the strongest clans or had great influence within them, and they also seem to have been securing a monopolistic grip on the most lucrative forms of trade.... This stratum was almost solidly opposed

to Muhammad".(366)

''جس زمانے میں محمد (ﷺ) نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کی، اس زمانے کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مکہ کی بڑھتی ہوئی تجارتی خوش حالی نے ایک نیا اعلیٰ طبقہ مکی سوسائٹی میں پیدا کر دیا تھا۔ یعنی انتہائی امیر اور انتہائی طاقت ور تاجروں کا طبقہ۔ یہ لوگ اپنی اس حیثیت کے ساتھ ساتھ انتہائی طاقت ور قبائل کے سردار بھی تھے یا ان قبائل میں ان کا زبردست اثر تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکہ کی تجارت کے انتہائی منافع بخش شعبوں پر ان لوگوں کو اجارہ دارانہ کنٹرول حاصل تھا۔ یہ طبقہ تقریباً سارے کا سارا محمد (ﷺ) کا مخالف تھا''۔

''منٹگمری واٹ'' نے قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کی عسکری اور سماجی حیثیت متعین کرنے کے لئے ایک عجیب وغریب فارمولا وضع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنگ احد کے لئے جو عورتیں لشکر کفار کے ساتھ گئی تھیں، ہم ان سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قریش کا کون سا قبیلہ زیادہ طاقت ور تھا اور اس قبیلے کا سردار کون تھا۔ مستشرق موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"Alwaqidi's list of women taken with them by the Meccans on the expedition of Uhud appears to give an indication of the leading men and tribes. These women, with two exceptions, were wives of chiefs of clans, and the fact that Abu Sufyan and Safwan b. Umayyah took two each suggests that these were now the leaders of the rival factions. Abu Jahl's son, Ikrimah was apparently not yet on a level with safwan".(367)

''الواقدی نے ان عورتوں کی جو فہرست دی ہے جن کو قریش مکہ احد کی مہم پر لشکر کے ساتھ لے گئے تھے، اس فہرست سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اس وقت قریش کے سربرآوردہ افراد اور قبیلے کون سے تھے۔ دو کے علاوہ یہ سب عورتیں قبائل کے سرداروں کی بیویاں تھیں۔ یہ حقیقت کہ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ دونوں دو دو بیویاں ساتھ لے گئے تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دونوں اپنے اپنے دھڑوں کے سردار تھے۔ بظاہر اس وقت عکرمہ بن ابی جہل ابھی صفوان کا ہم پلہ نہ تھا''۔

مستشرقین کی کتابوں میں اس قسم کی تحریریں جابجا ملتی ہیں۔ اس قسم کی تاریخ نویسی سے مستشرقین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کو طبقاتی کشمکش سے جنم لینے والی ایک تحریک قرار دے سکیں اور یہ ثابت کر سکیں کہ مکہ والوں نے حضور ﷺ کی جو مخالفت کی تھی، اس کی وجہ مذہبی اور نظریاتی اختلاف نہ تھا بلکہ مکہ کے امیر اور غریب طبقے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے۔ بااثر تاجروں کا طاقت ور طبقہ کسی کمزور کو تجارت کے میدان میں آگے بڑھتے نہ دیکھنا چاہتا تھا اور غریب طبقہ سرمایہ داروں کی پالیسیوں سے تنگ تھا اور ان کے خلاف کاروائی کے لئے موقعہ کی تلاش میں تھا۔

مستشرقین ان خیالی افسانوں کے ذریعے اسلام پر دو طریقوں سے حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام جو اس سرعت سے پھیلا کہ چند سالوں میں پورے جزیرۂ عرب کو اپنے کنٹرول میں لے لیا، اس کی وجہ اسلام کی تعلیمات کی کشش اور پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے کردار کی پختگی نہ تھی بلکہ یہ تو ایک ایسا انقلاب تھا جس کے لئے حالات انتہائی سازگار تھے۔ معاشرہ طبقوں میں بٹ چکا تھا۔ امیر، امیر تر ہو رہے تھے اور غریبوں کی حالت دن بدن ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ طاقت ور طاقت کے نشے میں مست تھے اور کمزور ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ ان حالات میں کمزور طبقے میں ایک باصلاحیت آدمی اٹھا۔ طاقت ور لوگوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے سب لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اس نے ان مغلوب طبقوں کی مدد سے پورے جزیرہ عرب میں انقلاب برپا کر دیا۔ دوسری طرف وہ

اس قسم کی تحریروں کے ذریعے حضور ﷺ کا سماجی مقام گھٹانے کے لئے، آپ کو ایک کو ایک کمزور قبیلے کا فرد ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ پر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس شخص کے آباؤ اجداد میں قصی، عبد مناف، ہاشم اور عبدالمطلب جیسے تاریخ ساز سرداروں کے نام آتے ہوں، اسے اس کی اپنی قوم میں ایک معمولی خاندان کا فرد ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیالی تاریخ نویسی کے خلاف مغرب کے مستند اور مشہور مورخ ''گبن'' کی شہادت ملاحظہ فرمایئے، وہ لکھتا ہے:

> "His descent from Ismael was a national privilege or fable, but if the first steps of the pedigree are dark and doubtful, he could produce many generations of pure and genuine nobility, he sprung from the trible of koreish and the family of Hashism, the most illustrious of the Arabs, the princes of Mecca, and the hereditary guardians of the Caaba. The grandfather of Mohammad was Abdol Motalleb, the son of Hashim, a wealthy and generous citizen, who relieved the distress of famine with the supplies of commerce. Mecca which had been fed by the liberality of the father, was saved by the courage of the son".(368)

''آپ کا اسماعیلی النسل ہونا قومی اعزاز تھا یا افسانہ، لیکن اگر ان کے نسب نامے کی ابتدائی کڑیاں تاریک اور مشکوک ہوں تو بھی وہ اپنے نسب نامے کی کئی نسلوں میں ایسے عظیم لوگ پیش کر سکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں شریف اور عظیم تھے۔ انہوں نے قریش کے قبیلے اور ہاشم کے خاندان میں جنم لیا تھا جو معزز ترین عرب تھے، مکہ کے بادشاہ تھے اور خانہ کعبہ کے موروثی پاسبان تھے۔ محمد (ﷺ) کے دادا عبدالمطلب تھے جو ہاشم کے بیٹے تھے۔ وہ ہاشم جو مالدار اور سخی شہری تھے۔ انہوں نے قحط کی سختیوں کو اپنے مال تجارت کے ذریعے کم کیا تھا۔ مکہ، جسے باپ کی کشادہ دلی نے (حالت قحط) میں کھانا کھلایا تھا، اس مکہ کو اسی باپ کے بیٹے کی بہادری نے بچایا تھا''۔

کیا کوئی ذی ہوش شخص ولیم میور اور منٹگمری واٹ کے ان مفروضوں کو تسلیم کر سکتا ہے کہ وہ بنو ہاشم جو عربوں کے لئے مایہ ناز بھی تھے، مکہ کے سردار بھی تھے اور خانہ کعبہ کے خادم بھی تھے، وہ حضرت عبدالمطلب تک تو اس حیثیت پر برقرار رہے اور آپ کے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی بنو ہاشم کی عظمتوں کا محل زمین بوس ہو گیا۔ اور بنو ہاشم کے مقام میں یہ انقلاب اس وقت آیا جب حضرت عبدالمطلب کے دس سے زیادہ بیٹے زندہ تھے جن میں ابو طالب، حمزہ، عباس اور زبیر جیسی ہستیاں موجود تھیں۔ اگر قبیلہ بنو ہاشم اتنا ہی کمزور ہوتا جتنا مستشرقین کو نظر آتا ہے اور دیگر قبائل قریش اتنے ہی طاقتور ہوتے جتنا طاقتور مستشرقین انہیں دکھانا چاہتے ہیں تو وہ حضور ﷺ کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو سلوک وہ کمزور مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔

جو چیزیں عربوں کے نزدیک قابل فخر تھیں، ان میں بنو ہاشم کسی سے کم نہ تھے۔ ان کے ہاں بنک بیلنس مایہ افتخار نہ تھا بلکہ ان کے ہاں عظیم وہ تھا جو دوسروں کی نسبت زیادہ سخاوت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ان کے وقار کا امتحان ان کی جرأت اور بہادری سے ہوتا تھا۔ مستشرقین ابو جہل کو قریش کے طاقتور اور مضبوط ترین قبیلے کا سردار مانتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہے کہ ایک مرتبہ جب ابو جہل نے حضور ﷺ کی توہین کی تھی اور آپ کے چچا حمزہ کو، جو ابھی حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے، ابو جہل کی اس جسارت کا علم ہوا تھا تو انہوں نے سب کے سامنے ابو جہل کی مرمت کی تھی اور مکہ کے امیر ترین، بہت ہی طاقتور اور بہت ہی با اثر لوگوں میں سے کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ حمزہ کے ہاتھ کو روک

سکے۔منٹگمری واٹ نے خود اس واقعہ کو اپنی کتاب ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین'' کے صفحہ نمبر 57 پر لکھا ہے۔

عربوں کا دستور تھا کہ وہ اپنی بہادری، جرأت اور عظمت کا فیصلہ میدان جنگ میں کرتے تھے۔ وہ جنگ کا بازار گرم ہونے سے پہلے مبارزت طلبی کرتے تھے اور اپنے مقابلے میں اسی کو آنے کی اجازت دیتے تھے جسے وہ اپنا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ جنگ بدر میں بھی عام لڑائی سے پہلے یہ انفرادی معرکہ آرائی ہوئی تھی جس کی تفصیل خود ولیم میور نے ان الفاظ میں لکھی ہے:

> "Sheyba and obta two leaders of the Coreish, and welid son of otba, still smarting under the taunts of Abu Jahl, advanced into the open field and defied three champions from the Medina force to meet them singly. Many upstarted at the call, but Mahomet checked them, and turning to his kinsmen said: "Ye sons of Hashim! arise and fight, according to your right". Obeida, Hamza and Aly, the uncle and cousins of Mahomet, stepped forth. Their features being concealed by their helmets, Otba asked their names. "Speak", he said "and if ye be our equals we shall fight with you". Hamza answered, with a play on his name": I am the lion of God and of his prophet; I am the son of Abdal Mottalib".
>
> "Worthy foe," replied otba; "but who are these?" Hamza gave their names. "Meet foes every one", repleid otba, and then they arose to fight".(369)

''شیبہ اور عتبہ، دو قریشی سردار اور ولید بن عتبہ جو ابھی تک ابوجہل کے طعنوں کی ٹیسیں محسوس کر رہے تھے، وہ میدان میں آئے اور لشکر مدینہ سے تین مبارز طلب کیے۔ کئی لوگ آگے بڑھے لیکن محمد ﷺ نے انہیں روک دیا اور اپنے اہل خاندان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: بنو ہاشم! اٹھو اور مقابلہ کرو کیونکہ یہ تمہارا ہی حق ہے۔ عبیدہ، حمزہ اور علی، ایک محمد ﷺ کے چچا اور دو چچیرے بھائی، آگے بڑھے۔ ان کے چہرے خودوں میں چھپے ہوئے تھے اس لئے عتبہ نے ان سے ان کے نام پوچھے۔ اس نے کہا: تم بولو، اگر تم ہمارے مقابلے کے ہوئے تو ہم تم سے لڑیں گے۔ حمزہ نے رزمیہ انداز میں اپنا نام بتایا۔ میں خدا اور خدا کے رسول کا شیر ہوں، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔ عتبہ نے جواب دیا: تم واقعی ہمارے مد مقابل آنے کے قابل ہو۔ لیکن یہ تمہارے ساتھ کون ہیں؟ حمزہ نے ان کے نام دیئے۔ عتبہ نے کہا: اٹھو اور اپنے اپنے غنیم کا مقابلہ کرو۔ اس طرح وہ مقابلے کے لئے آگے بڑھے''۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ شیبہ وغیرہ ان ہاشمیوں کو اپنا ہم پلہ سمجھتے تھے''۔

قریش مکہ نے ہجرت کے وقت حضور ﷺ کی شمع حیات کو گل کرنے کے لئے تمام قبائل سے ایک ایک جوان اس لئے چنا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان میں سے کسی ایک قبیلے میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ یہ حرکت کرے اور پھر انتقام میں کھولتے ہوئے ہاشمی خون کا مقابلہ کر سکے۔

حضرت ابوطالب کے پاس قریش کے وفود جاتے تھے اور آپ سے کہتے تھے کہ آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے خداؤں کی توہین سے باز رکھیں یا راستے سے ہٹ جائیں، لیکن جب حضرت ابوطالب نے انہیں دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے بھتیجے کا دفاع کریں گے تو کسی مائی کے لعل میں یہ جرأت نہ تھی کہ ان کی زندگی میں حضور ﷺ پر دست درازی کر سکے۔

ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں حضور ﷺ کی خاندانی عظمت کی شہادت دی تھی۔ ابوجہل جیسا دشمن بنو ہاشم کو اپنے پلے کا قبیلہ قرار دیتا ہے۔ ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق تینوں اسلام کے کٹر دشمن تھے اور اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ لیکن اس دشمنی کے باوجود قرآن حکیم کی کشش انہیں مجبور کر دیتی تھی کہ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر حضور ﷺ کی زبان پاک سے قرآن حکیم کی تلاوت سنیں۔ وہ ایک دوسرے کو قرآن سننے سے منع کرتے، ایک دوسرے سے وعدہ کرتے کہ وہ آئندہ قرآن سننے کی کوشش نہیں کریں گے، لیکن اگلی رات پھر لوگوں کی نظروں سے بچ کر تلاوت قرآن سننے پہنچ جاتے۔ تیسری صبح اخنس بن شریق نے پہلے قرآن حکیم کے متعلق ابوسفیان سے اس کے تاثرات پوچھے اور پھر ابوجہل کے پاس پہنچا۔ اس نے ابوجہل سے کہا:

"يَا اَبَا الْحَكَمِ! مَا رَأْيُكَ فِيمَا سَمِعْتَ مِن مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"

"اے ابوالحکم تم نے (محمد ﷺ) کی زبان سے جو کچھ سنا ہے اس کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے؟ ابوجہل نے کہا:

"مَاذَا سَمِعْتُ؟ تَنَازَعْنَا نَحْنُ وَبَنُو عَبْدِ مَنَافِ الشَّرَفَ اَطْعَمُوا فَاَطْعَمْنَا وَحَمَلُوا فَحَمَلْنَا وَاَعْطَوْا فَاَعْطَيْنَا حَتّٰى اِذَا تَجَاذَيْنَا عَلَى الرُّكَبِ وَكُنَّا كَفَرَسَيْ رِهَانٍ قَالُوْا مِنَّا نَبِيٌّ يَأْتِيْهِ الْوَحْيُ مِنَ السَّمَآءِ فَمَتٰى نُدْرِكُ مِثْلَ هٰذِهٖ وَاللّٰهِ لَا نُؤْمِنُ بِهٖ اَبَدًا وَلَا نُصَدِّقُهٗ"(370)

"میں نے کیا خاک سنا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اور بنو عبد مناف کا جھگڑا اس بات پر تھا کہ قوم کا سردار کون ہے۔ اس شرف کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بھی اپنے دسترخوان کو وسیع کیا اور ہر غریب و مسکین کو کھانا کھلایا اور ہم نے بھی ان سے بازی لے جانے کے لئے دسترخوان کو وسعت دی اور ہر غریب و مسکین کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ انہوں نے بھی لوگوں کے بوجھ اٹھائے اور ہم نے بھی بوجھ اٹھائے۔ انہوں نے بھی اپنی فیاضی سے مانگنے والوں کی جھولیاں بھریں اور ہم نے بھی اس بات میں ان سے سبقت لے جانے کی کوشش میں اپنی سخاوت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور جب ہم مقابلے کے دو گھوڑوں کی مانند ہو گئے تو انہوں نے اچانک اعلان کر دیا کہ ہم میں سے ایک شخص کو نبوت ملی ہے اور اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟ بخدا ہم تو اس پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے"۔

ابوجہل کی یہ تقریر دو چیزوں کی وضاحت کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ ساتویں صدی عیسوی کے مکہ میں شرف و عزت کی نشانیاں کون کون سی تھیں اور دوسری یہ کہ وہ بنو ہاشم کو شرف و سیادت کے میدان میں اپنے قبیلے کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ ابوجہل نے شرف و افتخار کے کسی میدان میں اپنے قبیلے کو بنو ہاشم سے برتر قرار نہیں دیا۔ نہ جانے مستشرقین نے یہ تصور کیسے کر لیا کہ بنو ہاشم ایک کمزور قبیلہ تھا اور اس کے مقابلے میں بنو مخزوم وغیرہ قبائل بہت طاقتور اور بااثر تھے۔

"منٹگمری واٹ" نے اپنے اس مفروضے کی تردید خود ہی ایک دوسرے مقام پر کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"The distinction between Patricians and plebeians does not fit Meccan society, or at least that section of it with which we are chiefly concerned. There is a distinction between Qurayash of the centre, and "quaraysh of the outskirts, but nearly all the people who are mentioned in the sources belong to "Quraysh of centre", whether they are friends or enemies of Muhammad. There were no clear distinctions between noble and ignoble ancestry that

could be regarded as parallel to the distinction between Muslim and pagan. All the clans reckoned as "Quraysh of the centre, had a common ancestry".(371)

''اعلیٰ طبقہ اور پست طبقہ کی اصطلاحیں مکی معاشرہ پر منطبق نہیں ہو سکتیں یا کم از کم اس معاشرے کے ان عناصر کے لئے موزوں نہیں جو زیادہ تر ہمارا موضوع بحث ہیں۔ مرکز کے قریش اور مضافات کے قریش میں امتیاز موجود تھا لیکن وہ تمام لوگ جن کا مصادر میں ذکر ہے تقریباً وہ تمام مرکز کے قریش سے تعلق رکھتے تھے خواہ ان کا تعلق محمد (ﷺ) کے دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے۔ وہاں اعلیٰ اور ادنیٰ نسل کا کوئی امتیاز نہ تھا، جس کو اس امتیاز کے برابر قرار دیا جا سکے جو ایک مسلم اور ایک کافر میں تھا۔ مرکز کے قریش کے تمام قبائل ایک ہی نسل سے تھے'۔

وہ باتیں جن میں عرب قبائل باہم مفاخرت کیا کرتے تھے، ان میں قریش کے تمام قبائل ہم پلہ تھے اور ان میں اگر کوئی قبیلہ دوسروں پر فوقیت رکھتا تھا تو وہ قبیلہ بنو ہاشم ہی تھا کیونکہ قصی کے بعد قریش میں کوئی سردار ایسا نہیں جسے ہاشم اور عبدالمطلب کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔ سونے اور چاندی کی قلت و کثرت کے ذریعے انسان کی قیمت متعین کرنے کی تاروئی سوچ سے عرب آشنا نہ تھے اور نہ ہی وہاں قبائل کی مالی حالت میں اتنا فرق تھا جتنا ''منٹگمری واٹ'' وغیرہ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''ٹارانڈرائے'' نے مکہ کی معاشی اور سماجی حالت کے بارے میں یہ فیصلہ دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"The little town in the lava mountains was no Arabian Babylon, and the rich merchants were certainly not completely divorced in their habits and the circumstances of their life from the remaining populace".(372)

''لاوہ کی پہاڑیوں کا یہ چھوٹا سا قصبہ عرب کا بابل نہ تھا اور نہ ہی امیر تاجر اپنی عادات اور زندگی کے دیگر حالات میں دوسری آبادی سے کلیۃً مختلف تھے''۔

''منٹگمری واٹ'' وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلامی تحریک مکہ اور عرب کی معاشی ناہمواریوں کا ناگزیر نتیجہ تھی، مکہ کو طبقات میں تقسیم کیا ہے اور اسلامی مسئلے کو قبائلی مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے حالانکہ حضور ﷺ کی تحریک خاندانی تحریک نہ تھی۔ آپ کا اپنا چچا ''ابولہب'' آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ لوگ جو خون کے رشتے کی وجہ سے آپ کا تحفظ کر رہے تھے ان کی اکثریت نے بھی ابتدا میں اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف آپ کے پیروکاروں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ ان میں غلام بھی تھے، غریب اور کمزور بھی اور آپ کے پیروکاروں میں ان قبائل کے چشم و چراغ بھی تھے جن کے ہاتھوں میں، بقول مستشرقین، مکہ کی زمام اقتدار تھی، اور جو ان کی نظروں میں بڑے طاقتور اور بااثر تھے۔ ''منٹگمری واٹ'' نے خود اس حقیقت کو بیان کیا ہے وہ مسلمانوں کو ان کی معاشی اور سماجی حیثیت سے تین طبقوں میں تقسیم کرتا ہے اور ان میں سے پہلے طبقے کے متعلق لکھتا ہے:

"Firstly there were a number of young men from the most influential families of the most influential clans. These were closely related to the men who actually wielded power in Mecca and were foremost in opposing Muhammad. At the battle of Badr in 624 between Muslims and the pagan Meccans there were instances of

brothers, or father and son, or uncle and nephew, being on opposite sides. The most notable representative of this class was Khalid ibn said of the clan of Umayyah (or Abd--Shams); his father said also known as Abu--Uhayhah, was in his later years one of the two or three strongest and richest men in Mecca". (373)

''اولاً کچھ ایسے نوجوان تھے جن کا تعلق بہت ہی بااثر قبیلوں کے بہت ہی بااثر خاندانوں سے تھا۔ یہ ان لوگوں کے قریبی رشتہ دار تھے جن کے ہاتھوں میں مکہ کا اقتدار تھا اور جو محمد (ﷺ) کے سخت مخالف تھے۔ جنگ بدر میں ایسے واقعات پیش آئے جب بھائی بھائی کے، باپ بیٹے کے، چچا بھتیجے کے اور ماموں بھانجے کے مخالف تھا۔ اس طبقے کا سب سے زیادہ اہم نمائندہ خالد بن سعید تھا جس کا تعلق بنو امیہ (یا عبدشمس) سے تھا۔ اس کا باپ اپنی آخری عمر میں مکہ کے دو یا تین طاقت ور ترین اور امیر ترین آدمیوں میں سے تھا''۔

یہی مستشرق ایک اور مقام پر حضرت ارقم کے متعلق لکھتا ہے:

"He belonged to the clan of Makhzum, the clan of some of the wealthiest and most powerful men in Mecca. He must have been wealthy himself, since he owned a large house near the centre of Mecca".(374)

''اس کا تعلق قبیلہ بنو مخزوم سے تھا جو مکہ کے انتہائی دولت مند اور انتہائی طاقت ور لوگوں کا قبیلہ تھا۔ وہ خود بھی امیر ہوگا کیونکہ مرکز مکہ میں اس کا ایک بہت بڑا مکان تھا''۔

یہ گتھی صرف مستشرقین ہی سلجھا سکتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ ایک کمزور قبیلے کا ایک کمزور فرد ہونے کی وجہ سے غریبوں اور کمزوروں کو ساتھ لے کر امیروں اور طاقت وروں کے خلاف اٹھے تھے تو پھر خالد بن سعید اور ارقم جیسے لوگوں کا طبقہ آپ کے ساتھ کیسے شامل ہو گیا تھا اور وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے جنگ بدر میں بھائی کو بھائی، باپ کو بیٹے، چچا کو بھتیجے اور ماموں کو بھانجے کے مد مقابل لا کھڑا کیا تھا۔

مستشرقین جس زاویے سے اسلام کے آغاز اور ارتقا کی تاریخ کو لکھتے ہیں اس زاویے سے دیکھنے والے کو کسی باحیثیت آدمی کا مسلمانوں کی صفوں میں موجود ہونا کھٹکتا ہے کیونکہ اس طرح ان کے قصر استدلال کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے ایک معزز، متمول اور قابل احترام تاجر تھے۔ ان کے پائے کے جو لوگ کافروں کی صفوں میں تھے وہ مستشرقین کو انتہائی طاقت ور اور انتہائی مالدار نظر آتے ہیں لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دولت منٹگمری واٹ کو معمولی نظر آتی ہے۔ وہ ان کے متعلق لکھتا ہے:

"Like most of the leading Meccans he made a living by commerce, but the fact that his frotune, even before he began to stpend it in ransoming Muslim slaves, was only 40,000 dirhams shows that his business was on a small scale".(375)

''مکہ کے اکثر سربرآوردہ لوگوں کی طرح ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا، لیکن یہ حقیقت، کہ مسلمان غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے پر اپنی دولت خرچ کرنے کا آغاز کرنے سے پہلے ان کی کل دولت چالیس ہزار درہم تھی، اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کا کاروبار چھوٹی سطح پر تھا''۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چالیس ہزار درہم کی رقم اس مستشرق کو تھوڑی نظر آتی ہے لیکن اسے ابوسفیان کے تجارتی

قافلے کا سرمایہ بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ جس میں مکہ کے تمام لوگ حصہ دار تھے اور جس کی کل مالیت پچاس ہزار دینار تھی۔
مستشرق موصوف اس قافلے کے متعلق لکھتا ہے:

"The merchandise was later said to be worth 50,000 dinars. All the leading Meccan merchants and financiers had an interest in it: indeed, nearly everyone in Mecca was concerned for its safe return, perhaps several smaller caravans- some of them having been the object of Muslim attentions on their way north had joined together for greater saefty".(376)

''بعد میں اس قافلے کے مال تجارت کی مالیت پچاس ہزار دینار بتائی گئی۔ مکہ کے تمام سربرآوردہ تاجروں اور سرمایہ کاروں کا اس میں مفاد تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے کاروان جو شمال کی جانب سفر کرتے ہوئے مسلمانوں کی توجہات کا مرکز تھے، وہ بہتر حفاظتی اقدامات کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے''۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دولت 40ہزار درہم بتائی گئی ہے اور اس تجارتی قافلے کی کل مالیت پچاس ہزار دینار بتائی جا رہی ہے جس میں تمام اہل مکہ حصہ دار ہیں۔ منٹگمری واٹ کے اپنے الفاظ میں ایک دینار دس درہم کے برابر تھا۔ گویا تجارتی قافلے کے مال تجارت کی کل مالیت پانچ لاکھ درہم تھی۔ مکہ کے امیر ترین تاجروں اور شہر کے ہر طبقے کے لوگوں نے مل کر جو سرمایہ کاری مجموعی طور پر کی تھی وہ اکیلے ابوبکر کے فرمائے سے صرف بارہ گنا زیادہ تھی۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھنے کے باوجود مستشرقین کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کاروبار معمولی اور نچلی سطح کا تھا اور ان کے مقابلے میں وہ تاجر بہت ہی امیر اور بااثر تھے جنہوں نے سارے اہل شہر کے ساتھ مل کر صرف پچاس ہزار دینار کی سرمایہ کاری کی تھی۔

منٹگمری واٹ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چالیس ہزار درہم کا مقابلہ بیسویں صدی عیسوی کے ارب پتیوں سے کرتا ہے اور اس طرح ان کی دولت کو معمولی قرار دیتا ہے اور قریش کے پچاس ہزار دینار کا مقابلہ ساتویں صدی عیسوی کے عام عربوں سے کرتا ہے اور اس طرح اسے بہت بڑی دولت قرار دیتا ہے۔ مستشرقین کو اپنے مفروضے ثابت کرنے کے لئے اسی قسم کے اعداد و شمار اور موازنوں کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ حق یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے کامیاب ترین اور مقبول ترین تاجروں میں سے ایک تھے اور مکی سوسائٹی میں ان کو ایک بلند مقام حاصل تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے منٹگمری واٹ نے ایک اور شوشہ یہ بھی چھوڑا ہے کہ ان کا تعلق ایک کمزور قبیلے سے تھا اور وہ مسلمان جو طاقتور قبائل سے تعلق رکھتے تھے وہ اپنی جماعت میں ان کی کلیدی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مستشرق مذکور نے اپنے اس مفروضے کو تقویت دینے کے لئے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہما کے درمیان مخاصمت کا افسانہ بھی تراشا ہے۔ لیکن مستشرق موصوف کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ابوبکر صدیق جن کو وہ بے اثر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے یہ وہی ہیں جن کی دعوت پر ان لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا جن کے نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ جلی حروف سے لکھے جاتے رہے ہیں۔

مستشرقین نے اسلامی تحریک کو ایک طبقاتی تحریک ثابت کرنے کے لئے خاندان بنو ہاشم کا مقام گھٹانے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دولت مندوں کے مظالم سے تنگ آیا ہوا طبقہ سرمایہ داروں کے خلاف محمد ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اس مفروضہ کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں جبکہ یہ دعوت وہ تھی جس پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے خدیجۃ الکبریٰ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ

عنہما تھے جن کا معاشی مقام مکہ کے کسی سردار سے کم نہ تھا۔ اس دعوت کو قبول کرنے والوں میں غلام بھی تھے، کمزور بھی تھے اور وہ بھی تھے جنہوں نے ان گھرانوں میں جنم لیا تھا جنہیں مستشرقین بہت ہی دولت مند اور بہت ہی طاقت ور قرار دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ والد نے آپ کے لئے ورثے میں کوئی بڑی جائداد نہیں چھوڑی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت ابوطالب کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود حضرت ابوطالب مکہ کے معزز ترین انسان تھے اور قریش نے ان کے اثر کی وجہ سے ہی حضور ﷺ کے خلاف راست اقدام کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔

مستشرقین کی خاندان بنو ہاشم کے مقام کو گھٹانے کی کوششیں اسی نوعیت کی ہیں جس نوعیت کی کوششیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چھوٹے پیانے کا تاجر ثابت کرنے کی ہیں۔ یہ تمام تردد کرنے کی ضرورت انہیں اس لئے پیش آئی ہے کہ وہ تحریک اسلام کے آغاز و ارتقاء کو جس انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں، اسے اسی انداز میں دیکھ سکیں۔ تاریخ، دعوت اسلامی کے متعلق ان کے اس نظریے کی بھی تکذیب کرتی ہے اور اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بنو ہاشم کے سماجی مقام کو گھٹانے، ان کی سیاسی حیثیت کو کم کرنے اور تمام مسلمانوں کو بے اثر اور بے بس ظاہر کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، اس کو بھی جھلاتی ہے۔ حق وہی ہے جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

"اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللهِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ اِنَّ اللهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ فِرْقَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَیْنِ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ فِرْقَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَآئِلَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ قَبِیْلَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُیُوْتًا فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ بَیْتًا وَخَیْرِهِمْ نَفْسًا". (377)

"میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے مخلوق کے بہترین طبقے میں رکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دو گروہ بنائے اور مجھے بہترین گروہ میں رکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو قبائل میں تقسیم کیا اور مجھے بہترین قبیلے میں رکھا، پھر ان کو خاندانوں میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین خاندان میں رکھا۔ میں اپنے خاندان اور اپنی ذات دونوں لحاظ سے مخلوقات میں افضل ہوں"۔

فصل ہشتم:

مولانا ظفر علی قریشی

تعارف:

اب تک پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کے ہر پہلو کو اتنی عرق ریزی اور محنت سے محفوظ کر لیا گیا ہے اور اس پر اتنا وسیع لٹریچر موجود ہے کہ اگر کوئی شخص سیرت طیبہ پر کوئی نئی کتاب تصنیف کرنا چاہے تو وہ دستیاب وسیع لٹریچر کے بحر بیکراں میں خود کو گمشدہ سمجھنے لگتا ہے اور یہ صورت حال اسے شدید گومگو کی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے کہ وہ کہاں سے اور کیسے ابتدا کرے۔

اسلامیہ کالج لاہور کے شعبہ علوم اسلامیہ کے سابق اسسٹنٹ پروفیسر ظفر علی قریشی کی معرکۃ الآرا انگریزی تصانیف:

i. Prophet Muhammad and his Western Critics Vol 1,2

ii. Prophet Muhammad's Wives and Orientalists

روحانی اور علمی پیش نظر کی ان کی یہ تحریریں حیات پیغمبر ﷺ کے متعلق علم میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی یہ تحریریں امت مسلمہ کے ہر فرد پر سرکار دوعالم ﷺ کی حیات طیبہ کے متعلق عامۃ الناس کے اذہان میں ابھرنے والے استفسار کے جواب کے لئے منطقی دلائل سے مزین ہیں۔

مخالف مستشرقین حد درجہ متعصب ہونے کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ سے متعلق کم علمی کا شکار بھی تھے۔ ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ارتداد ان تصانیف کا مقصد ہے۔ مصنف نے سرکار دوعالم ﷺ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو انتہائی دانشمندی سے بطور موضوع منتخب کیا ہے۔ گستاخی رسول ﷺ اور شر پسندی کے موجودہ دور میں اس موضوع پر اتنی مدلل بحث اور تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔

اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف مغرب کا معاندانہ رویہ

اپنے مقالہ تحقیق "اسلام ان ماڈرن ہسٹری (Islam in Modern History) میں ڈبلیو کانٹ ویل سمتھ W. Cant well smith یوں لکھتا ہے:

"روز اول سے ہی مغرب کے تعلقات دنیائے اسلام سے بمقابلہ کسی دیگر تہذیب کے بنیادی طور پر مخالفانہ رہے ہیں۔ ان کے درمیان تسلسل سے اکثر و بیشتر کھلے عام مخاصمت کی صورت حال برقرار رہی۔ یورپ نے تیرہ صدیوں کے دوران اسلام کو اپنے لئے دشمن اور خطرہ گردانے رکھا۔ چنانچہ یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ جناب محمد ﷺ کی تشہیر کسی دوسرے عظیم مذہبی رہنما کے مقابلے میں مغرب میں نسبتاً کم ہوئی۔ مغرب میں اسلام دیگر عقائد کے برعکس ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ (378)

کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت کے عروج تک پہنچنے سے پہلے صرف پیغمبر ﷺ نے تہذیب مغرب کو اس کی تاریخ میں پہلی بار ایک تحریک کے ذریعہ چیلنج کیا"۔ (379)

ریورنڈ ڈبلیو منٹگمری واٹ (REverend W.Montgomry Watt) اپنی تصنیف "وٹ از اسلام" (What is Islam) میں لکھتا ہے:۔

"مشکل یہ ہے کہ ہمیں اسلام کے خلاف گہرا تعصب وراثت میں ملا ہے۔ جس کے ڈانڈے قرون اولیٰ کے جنگی پراپیگنڈہ سے جا ملتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس حقیقت کو وسیع القلبی سے تسلیم کر لیا جائے۔ تقریباً آٹھویں صدی سے مسیحی یورپ اسلام سے روحانی اور فوجی طور پر شدید خائف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خوف زدہ مسیحی دنیا کے متزلزل اعتماد کو صرف اسی طرح مستحکم کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مخالف کو ممکنہ

انسانی حد تک غیر موزوں انداز میں یوں پیش کیا جائے کہ پیش بر حقیقت محسوس ہو۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں اسلام کے مخالف ابھرنے والا تصور مسلسل یورپین انداز فکر پر مسلط رہا۔ تا آنکہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف تک اس کا اثر گھٹ کر برائے نام رہ گیا۔'' (380)

ایک اور جگہ ڈاکٹر واٹ (Doctor Watt) کہتا ہے:

''بارہویں صدی سے چودہویں صدی تک مغربی مسیحی دانشور اپنے ہم مذہبوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے لیکن اس انداز میں کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ کو بالاتر سمجھیں۔ قرونِ اولیٰ کے مسیحی دانشوروں نے اسلام کی تصویر کو مسخ کر کے پیش کیا اور حقائق کو نظر انداز کر دیا۔

مشاہیر تاریخ عالم میں سے کسی کو بھی یورپ میں محمد ﷺ سے کمتر انداز میں نہیں پرکھا گیا۔ بیشتر مغربی مورخین نے جناب محمد ﷺ کے رتبے کا غلط ادراک کیا اور جہاں کہیں بھی کسی امر کی قابل اعتراض تشریح ممکن ہو سکی اسے حقیقت کا مصنوعی لبادہ پہنا کر تسلیم کرانے کی بھرپور سعی کی گئی''۔ (381)

ڈاکٹر واٹ (Doctor Watt) تلخیص مطالب بیان کرتے ہوئے یوں وضاحت کرتا ہے:

''چونکہ ہم اب بھی کسی حد تک قرونِ اولیٰ کے متعلق جنگی پراپیگنڈہ سے متاثر ہیں۔ اس لئے اسلام کی نسبت ہمارا انداز فکر مجموعی طور پر غیر جانبدارانہ نہیں ہے۔'' (382)

پیغمبر اسلام ﷺ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بنیادی مسیحی عقائد کی شدت سے نفی کرتے ہیں اور غالباً یہ اسلام کے خلاف مسیحی نفرت کی مضبوط ترین وجوہات میں سے ایک ہے۔

''دی ڈکشنری آف اسلام'' (The Dictionary of Islam) کا مصنف ریورنڈ۔ ٹی۔ پی۔ ہیوجیس (Rev.T.P. Hughes) یوں لکھتا ہے۔

''جناب محمد ﷺ کے پیغمبرانہ دلائل و خصائل کا اندازہ لگانے کے لئے یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ انہوں ﷺ نے اپنے آپ کو کسی نئے مذہب کے بانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا بلکہ اسے محض عہد نامۂ جدید قرار دیا۔ آپ ﷺ رب العزت کے آخری اور افضل ترین پیغمبر تھے۔ آپ ﷺ کو دنیا میں اس سچے مذہب کی جانب راغب کرنے کے لئے مبعوث کیا گیا جسے نافذ کرنے کے لئے رسول مقبول ﷺ کی کی دنیا میں آمد سے قبل پانچ عظیم مقننین کو بھیجا گیا۔ آدم علیہ السلام۔ نوح علیہ السلام۔ ابراہیم علیہ السلام۔ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ہمارے موقف کی بنیاد یہی ہے۔ ہم جناب محمد ﷺ کے سر سہرا باندھتے ہیں کہ وہ غیر معمولی، جنگجو، مقنن، شاعر اور ذہانت کے حامل انسان تھے۔ انہوں نے شدید مخالفت کے باوجود اپنے آپ کو شہرت اور نیک نامی کے بام عروج پر متمکن کرلیا۔ ہم یہ بھی بلا ردوکد تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا نے ان جیسا عظیم ہیرو کبھی نہیں دیکھا۔ ان تمام اعترافات کے باوجود ہم ان کے اس دعویٰ پر صرف نظر کرتے ہیں کہ وہ آسمانی باپ یسوع مسیح کے مشن کی تنسیخ کرنے کیلئے آئے تھے۔ بالخصوص اس کی یہ بنیادی سچائیاں کہ یسوع آسمانی نجات دہندہ اور جنت کی آسائش فراہم کرنے والے تھے''۔ (383)

فلپ کے ہٹی (Philip K Hitti) اپنی تصنیف ''اسلام اینڈ ویسٹ'' (Islam and West) میں رقمطراز ہے۔

''ماضی کی صلیبی جنگ و جدل کی یادیں آنے والی نسلوں کو مزید جنگوں کی وعید دیتی رہیں۔ اجرام فلکی کی پرستش کرنے والے، بدھ ازم اور دیگر کم ترقی یافتہ مذاہب و ادیان کو اس طرح طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ بنیادی طور پر عناد و مخاصمت اور تعصب نے افکار مغرب اور اس کے رویہ کو اسلام دشمنی پر محمول کیا۔ اسلامی عقائد کو دشمنوں کے عقائد گردانا گیا جن کو اگر یکسر غلط نہیں تو مشکوک ضرور تصور کیا جاتا تھا''۔ (384)

جے۔ جے۔ سانڈر (J.J.Saunder) اپنی کتاب ''اے ہسٹری آف میڈیاول اسلام'' (A history of medieval Islam) میں لکھتا ہے۔

''تاہم اس بات کا انکار کرنا بے سود ہوگا کہ عیسائیوں کے دل میں عربی پیغمبر ﷺ کے لئے کوئی ہمدردی یا نرم گوشہ موجود تھا ان کے نزدیک حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شخصیت متوازن اور پاکیزہ تر تھی۔ مسیحی دنیا کو اسلام سے زک اٹھانا پڑی۔ صلیبی جنگوں کے دوران کئے گئے پراپیگنڈہ کی وجہ سے غیر جانبدارانہ فیصلہ کرنا ناممکن تھا۔ اس کے بعد طویل عرصے سے بلکہ ابھی تک جناب محمد ﷺ کی شخصیت کا عکاسی نزاعی ادب میں طویل عرصہ سے بے سروپا حکایتوں کی صورت میں اشاعت پذیر ہے''۔ (385) کسی حد تک اعتدال معنف سر ہملٹن گب (Sir Hamilton Gibb) تسلیم کرتا ہے۔

''یہ قریباً ناممکن ہے کہ پیغمبر آخر الزمان ﷺ اور ان کی تعلیمات کو غیر حقیقت پسندانہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا جا سکے۔ نتیجتاً ایسا ہے کہ جناب محمد ﷺ کے بارے میں اتنے ہی نظریات ہیں جتنے کہ سوانح نگار۔ مثال کے طور پر انہیں ایک مصروع، ایک معاشرتی مصلح اور پروٹومارمن (Proto Mormon) کے طور پر پیش کیا گیا اگرچہ ایسے تمام غیر حقیقت پسندانہ نظریا کو عمومی طور پر دانشوروں کی مستند جماعت نے یکسر مسترد کردیا ہے۔ تاہم یہ ناممکن ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی اور ان کی تبلیغ کے بارے میں معاندانہ عنصر کے کارفرما ہونے کو نظر انداز کیا جا سکے''۔ (386)

قابل ذکر امریکی مؤرخ ایس پی سکاٹ (S.P Scott) شدومد سے ان عیسائی مصنفین اور نزاعی شخصیات کی بلاخوف مذمت کرتا ہے، جنہوں نے جان بوجھ کر نبی اکرم ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا۔ وہ یوں گویا ہے۔

''ہر مذہب کے عقائد موروثی تعصبات کی بنا پر دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے نزدیک جھوٹ پر مبنی اور لغو ہیں۔ دیگر تمام دینی اعتقادات کے مقابلے میں اسلام کم فہمی اور بے انصافی کا زیادہ نشانہ بنا ہے اور اس کے بانی کا نام تیرہ صدیوں تک خود پسند کے طور پر لیا جاتا رہا (نقل کفر کفر نہ باشد)۔ نہ صرف یہ کہ ان ﷺ کے محرکات کو زیر اعتراض رکھا گیا بلکہ ان ﷺ کے خلوص کی نفی کی گئی۔ آنحضور ﷺ کے کردار پر ہر اس گناہ کی چھاپ لگائی گئی جس سے بنی نوع انسان کی تحقیر اور ایذا رسانی مقصود، آپ ﷺ کی تعلیمات کو انتہائی مہمل اور غیر فطری انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔ (387)

کارلائل اس حقیقت کا معترف ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ناقابل بیان ذہانت، مذہبی جوش وجذبہ اور پروقار ذہانت سے باہمی دشمن قبائل کو ایک قوم بنا دیا۔ تاریخ میں ان کے نام کو دوام حاصل رہے گا۔'' (388)

دانتے (Dante) نے اپنی تصنیف ''ڈیوائن کامیڈی'' (Divine Comedy) میں جناب محمد ﷺ کی شان میں ناقابل بیان گستاخانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انیسویں صدی کے عیسائی مصنفین بھی جناب پیغمبر ﷺ کے متعلق اسی قسم کی دریدہ دہنی کے مرتکب نظر آتے ہیں۔'' (389)

ہاکچم ڈی جاٹ (Hicham DJaut) عیسائیت کی اسلام دشمنی کے متعلق اس طرح بیانی ہے:

''اپنے مسلک اور سائنسی کامیابیوں کی وجہ سے اسلام کو تاریخ افکار کا بنیادی مدومعاون مانا گیا ہے۔ اس کی عظمت کو اگر ایک طرف تسلیم کیا گیا تو کچھ لوگوں نے اسے بطور مذہب اور ضابطۂ حیات مسترد کر دیا۔ حالانکہ اس کے تمام پہلو واشگاف تھے۔ اس طرح مغرب نے عرب مفکرین کی کامرانیوں کو اسلام کے متعلق رائے قائم کرتے وقت نظر انداز کر دیا۔''

اس صورتحال نے بارہویں صدی میں جنم لیا۔ یہ تیرہویں اور چودھویں صدی میں مزید وسعت پذیر ہوئی۔ اٹھارہویں صدی تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ اس کے کچھ اثرات تو نوآبادیاتی دور تک موجود رہے جس کی بنیادی وجہ پیغمبر اسلام ﷺ پر شدید غم وغصہ تھا کہ ان کی مبینہ جھوٹی نبوت (عیاذ باللہ) نے انسانیت کو عیسائیت کے ہمہ گیر اور آفاقی ارتقاء کی طرف گامزن ہونے سے روک دیا''۔ (390)

سر ڈینی سن راس (Sir Denison Ross) اپنی کتاب ''سیل کا ترجمہ قرآن پاک'' (Sales Translation of Tthe Holy Quran) کے تعارفی کلمات میں لکھتا ہے:

''کئی صدیوں تک یورپی اقوام کی محمڈن ازم کے بارے میں رائے کی بنیاد زیادہ تر متشدد عیسائیوں کی گمراہ کن نظریات پر مبنی تھی جس کی وجہ سے شدید اتہام طرازیوں نے جنم لیا۔ محمڈن ازم کو خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور اہل مغرب کی نظر میں اس کے مبینہ برے پہلوؤں کو بڑھا چڑھا کر اور غلط انداز میں پیش کیا گیا''۔(391)

''کیمبرج میڈیاول ہسٹری'' (Cambridge Medeival History) میں پروفیسر بی وان (Professor Bevan) کے بیان سے پیغمبر ﷺ کے متعلق تنقید کی حقیقت کا اندازہ اس کی ذیل کی تحریر سے لگایا جا سکتا ہے۔

''انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں شائع ہونے والے لاتعداد مجلوں میں مندرج الزامات کو یکسر نظر انداز کر دینا چاہیئے''۔(392)

''شیپنگ آف عربس'' (Shaping of Arabs) کا مصنف جوئل کارمیکائیل (Joel Carmichael) لکھتا ہے:

''مغربی دانش منڈی میں خاصا تکنیکی تعصب کارفرما رہا ہے۔ گو اس سے متاثر شدہ سکالرز یہ امر تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ لہذا پرزور ذہنی کاوش کی ضرورت ہے تاکہ عالمانہ تحریروں کی تہہ میں چھپے ہوئے عناد پر مبنی افکار سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے''۔(393)

واٹ۔ ریو۔ منٹگمری (Watt.Rev.Montgomery) اپنی ''دی کیور آف ہیومن الز'' (The cure of human ills) میں رقمطراز ہے:

''جس طرح کوئی لادینی معاشرہ اپنے مخالفین کو جنگی پراپیگنڈہ کے ذریعہ کمزور گردانتے ہوئے ان کے تمام افعال کو رسوا کرتا ہے اسی طرح عیسائی بھی اپنے مذہبی مخالفین کے ساتھ توہین آمیز سلوک روا رکھتے ہیں''۔(394)

ایک سے زائد مصنفین کے مطابق جب اہل یورپ کے لئے ترکوں کا خطرہ ٹل گیا تو پھر مسیحی نگارشات میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے ایک حد تک متوازن مذہبی سوچ نے جنم لیا۔

ہٹی (Hitti) اپنی تصنیف ''اسلام اینڈ دی ویسٹ'' (Islam and the west) میں لکھتا ہے:

''ایک نسبتاً قابل برداشت دینی نقطہ نظر نے اٹھارہویں صدی میں جنم لیا اس وقت تک مغرب کے عربی دانوں نے مسافروں اور تجار کے ذریعہ قابل اعتماد خبری ذرائع تلاش کر لئے تھے۔ سفارت کار اور مشنری حضرات نے بھی حقیقت احوال کو واضح کرنے میں کردار ادا کیا لیکن عیسائی مبلغین نے اپنے عقائد کی پشت پناہی کے لئے اسلام کے بارے میں مزید منفی انداز فکر اپنا لیا۔ چنانچہ علماء کرام بھی موروثی تعصب کی برفانی سلوں کو نہ پگھلا سکے''۔(395)

گوئٹے (Geoth) نے جدید سوچ اور بین الاقوامی نقطہ نظر کی پیشگوئی کی۔ یہ مذہبی سکالر محمد ﷺ کو جھوٹا دعویدار نبوت نہیں گردانتا۔ انیسویں صدی کے وسط میں اسلامی تہذیب وثقافت کے بارے میں عالمانہ نقطہ نظر میں تبدیلی کھل کر سامنے آ گئی۔ کارلائل (Carlyle) نے جناب محمد ﷺ کو بطور پیغمبر ایک ہیرو کے طور پر منتخب کیا۔ اس کے انداز فکر میں کسی ناگواری کا شائبہ نہیں۔(396)

چنانچہ آر۔ ڈبلیو سوتھرن (R.W. Southern) اسی طور پر لکھتا ہے۔

''1120ء سے اہل مغرب کے ذہن میں اسلام اور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ایک واضح تصویر موجود تھی۔ لیکن یہ علم کی بنیاد پر نہ تھی اور اس کی تفاصیل بھی محض حادثاتی طور پر درست تھیں۔ اس دور کے مصنفین اپنی کم فہمی کی وجہ سے بزعم خود خوش تھے۔''(397)

''ایٹ سنڈری ٹائمز'' (At Sundry Times) میں زاہنر (Zaehner) لکھتا ہے۔

''عیسائیت کے پیروکاروں کے علاوہ کوئی بھی اس کی حمایت میں آدھے راستے سے آگے جانے کو تیار نہ ہے کیونکہ قرآن ہی وہ کتاب ہے جو جناب عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا پیغمبر بھی لیکن خدا ان کا بیٹا ہرگز نہیں کیونکہ نہ اللہ کو کسی نے جنا ہے نہ ہی اللہ نے کسی کو جنا۔ محمد ﷺ کے پیروکار حضرت عیسیٰ کی ازحد تعظیم کرتے ہیں۔ جب کوئی پیغمبر جناب محمد ﷺ کے متعلق توہین آمیز رویے کا اظہار کرے

جیسا کہ عیسائی اکثر اس کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ اس بات سے جائز طور پر جز بز ہوتے ہیں۔ اہل اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زندہ کیے جانے کے تصور کو تسلیم نہیں کرتے نہ ہی ان کے مصلوب کیے جانے کے جانے کے دعویٰ کو مبنی بر حقیقت مانتے ہیں۔ مواحد پرست محمد ﷺ سے پہلے خدا کے عظیم پیغمبر یعنی جناب عیسیٰ علیہ السلام کے اس مبینہ انجام کو انتہائی تحقیر آمیز گردانتے ہیں۔" (398)

اسلام اور جناب محمد ﷺ کے لئے مستشرقین کی مخالفت کی وجوہات:

مستشرقین کے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں تعصب اور مخالفت اور مخالفت کی جڑیں تاریخ میں بہت گہری ہیں۔ فی الواقعی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ مستشرقین نے جب بھی جب محمد ﷺ کی زندگی پر قلم اٹھایا تو بدنیتی کی بنا پر۔ انہوں نے ہمیشہ ان کی ازدواجی زندگی کو غیر منصفانہ اور خلاف حقائق تنقید کا نشانہ بنایا۔ پیغمبر محمد ﷺ واقعتاً بنی نوع انسان کے عظیم ترین بہی خواہ اور محسن تھے۔ مغربی دنیا جب جہالت کی تاریکیوں میں گم تھی تو ایسے میں پیغمبر اسلام ﷺ نے بنی نوع انسان کو قرآن پاک جو ان پر آسمان سے نازل ہوا، تحفے کے طور پر پیش کیا آپ ﷺ کی مکمل حیات بنی نوع انسان کے لئے تا ابد معیاری اور مثالی مشعل راہ ثابت ہوئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو رسوا کرنے کے ارادے سے مستشرقین نے یا تو تاریخی پس منظر کو مسخ کیا یا پھر اخفائے حقائق کیا۔ آنے والے صفحات میں یہ امر واضح ہو جائے گا کہ مدینہ منورہ سے ظہور پذیر ہونے والی محدود برکات نے نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ جدید یورپ کو بھی بہرہ مند کیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ سے متعلق مستشرقین کے بغض و کینہ پر مبنی اعتراضات کو حقائق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ ان کی ذات کا بنی نوع انسان کی مادی و روحانی زندگی میں جاری و ساری برکات کا کتنا احسان ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ نبی پاک ﷺ کی مثالی ازواجی زندگی پر اعتراضات اور حملے یکسر غیر منصفانہ تھے۔ (399)

عربوں کی تعریف و توصیف بطور نجات دہندہ:

جارج سیل (George Sale) قرآن کریم کے انگریزی ترجمے کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ آخر کیوں عیسائی مصنفین ارادتاً پیغمبر اسلام ﷺ کو رسوا کرتے ہیں:

"کیسائے مشرق اس وقت انتہائی پرشکوہ انداز میں پنپ رہا تھا۔ اس کی تباہی "محمڈن ازم" کے اچانک وسعت پذیر ہونے سے ہوئی۔ اس عظیم کامیابی نے فطری طور پر مسیحی دنیا کے دل میں اسلام کے متعلق خوف پیدا کیا۔ بالخصوص ان لوگوں کے دلوں میں جن کے لئے اس کا تصور ہی مہلک تھا اس لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ وہ نبی مکرم ﷺ کی شخصیت اور اسلام کے عقائد کو منفی انداز سے دیکھتے ہیں" سیل (sale) کے مطابق کیسائے مشرق کی تباہی کی وجہ عربوں کی ابتدائی فتوحات ہیں جو بزور شمشیر وسعت اسلام کے لئے کی گئیں۔ مغرب میں اسی امر کا چرچا کیا جاتا ہے"۔ (400)

کچھ مصنفین نے مسلمانوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے عیسائیوں پر حملے لوٹ مار اور مال غنیمت اکٹھا کرنے کے لئے کئے لیکن مشرقی کیساؤں کی تباہی کی حقیقی تاریخی وجوہات سے سیل (Sale) کی من گھڑت کہانیوں کی نفی ہوتی ہے۔ قدامت پسند کیسائے یونان کو بازنطینی حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی انہوں نے ثانوی درجے کے گرجاؤں کو غاصبانہ فرمانروائی سے اپنا مطیع فرمان بنائے رکھا تھا اور انہیں جی بھر کر نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ چنانچہ مسلسل ایذا رسانی کے شکار ان مظلوم عیسائیوں اور دوسری اقوام نے عرب فاتحین کو اپنی آزادی کے ہیروؤں کی حیثیت سے خوش آمدید کہا۔

اس موضوع پر مختصراً عرض ہے چہ جائیکہ عرب لوٹ مار کے مرتکب ہوتے درحقیقت دونوں عظیم ہمسایہ سلطنتوں کے عیسائیوں اور دیگر عامتہ الناس نے انہیں آزادی دلانے والے دیوتاؤں کی حیثیت سے خوش آمدید کہا۔ راندۂ درگاہ انسانیت نے عربوں کی فتوحات پر سکھ کا سانس لیا کیونکہ ان کی بدولت انہیں متعصب دینی پیشوائی نظام اور قابل نفرت غاصبانہ حکومت سے نجات ملی۔ (401)

سرولیم میور(Sir Willaim Muir) ان نکتہ ہائے نظر کی توثیق میں یوں لکھتا ہے کہ:

''مادروطن کے متوالے جنہیں ظلم وتشدد اور استحصال کے ذریعے دبانے کی کوشش کی گئی اپنے حکمرانوں کے خلاف ہمہ وقت بغاوت کے لئے تیار تھے۔ مقامی باشندوں کو قدامت پرستی کی طرف واپس دھکیلنے کے لئے بازنطینی حکمرانوں کی ان تھک اور لامتناہی مہم شدید نفرتوں اور تلخیوں کو جنم دے رہی تھی۔ جبکہ قبطی وحدت پرستی کے مسلک پر سختی سے کاربند تھے۔ مکافات عمل ان استحصال پسندوں کو جلد ہی گرفت میں لینے والا تھا۔ چنانچہ عرب ظلم کی چکی میں پسی ہوئی انسانیت کو تحفظ اور سنبھالا دینے کے لئے یلغار کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے''۔(402)

سی۔ایچ بیکر(C.H. Becker) تسلیم کرتا ہے کہ:

''شام میں جہاں کہیں سامی سکونت پذیر تھے، بازنطینی حکومت کو حددرجہ عمیق نفرت سے دیکھا جاتا تھا وہ عربوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کرتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہتے تھے۔ پھر عربوں کا مطالبہ خراج بھی زیادہ بوجھل نہ تھا اس کے علاوہ عربوں نے انہیں مکمل مذہبی آزادی دے دی''۔(403)

ٹی۔ڈبلیو آرنلڈ(T.W Arnold) افریقہ کا ذکر یوں کرتا ہے۔

''عرب حملہ آوروں کی سرعت رفتاری سے کامرانی زیادہ تر مقامی عیسائی باشندوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم کرنے کی مرہون منت تھی جس کی وجہ صرف ان کی بازنطینی حکمرانوں کے متشدد نظام حکومت سے نفرت نہ تھی بلکہ اس سے بڑھ کر ان سے مذہبی مخالفت کی بنا پر پیدا شدہ بغض تھا''۔(404)

پروفیسر ای۔جی۔براؤن(Prof. E.G Brown) اپنی کتاب ''لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' (Literary History of Persia) میں لکھتا ہے۔

''توحید پرست، مینچین مزدکی (Manichaen, Mazdakite) اور غیر مقلد فارسی فرقوں کے خلاف زرتشت راہبوں کے مذہبی تعصب نے ان کے خلاف گہری اور ہمہ گیر نفرت کو جنم دیا تھا۔ ظلم وتشدد کے شکار لاتعداد ایرانی باشندگان کے دلوں میں مروجہ مذہب کے خلاف حقارت کا غلبہ تھا۔ یہی جذبات حکمرانوں کے متعلق تھے۔ اس صورت حال میں عربوں کی فتوحات کو ذریعہ نجات گردانا گیا''۔(405)

محمد ﷺ اعتراف حقیقت کا تقاضا

ڈاکٹر واٹ(Dr. Watt) لکھتا ہے۔

''فی الوقت جبکہ مسیحی اور مسلمان، یورپین اور عرب، ایک دوسرے کے ساتھ یا مختصر الفاظ میں جبکہ دنیا بھر کے عیسائی اور مسلمانوں کا باہمی اختلاط اور میل جول بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسلام کے یورپ پر اثرات کا بنظر غائر دیکھا، پڑھا اور سمجھا جانا اور بھی ضروری ہوگیا ہے۔ کچھ عرصہ سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قرون وسطی یا قرون مظلمہ (Dark ages) کا مسیحی مصنف اسلام کے تشخص کی اہانت آمیز تصویر کشی کرتا رہا ہے لیکن گزشتہ صدی کے دوران دانشوروں کی کوششوں سے اسلام کے متعلق نسبتاً حقیقت پسندانہ تصور اذہان فرنگ میں نمو پارہا ہے مگر اہل مغرب یورپ کی ثقافت کو اسلام کے ممنون احسان تسلیم کرنے سے قطعی طور پر منکر ہیں۔ بعض اوقات ہم اپنے ثقافتی ورثے میں اسلامی اثرورسوخ کی اہمیت کو از حد گھٹا کر بیان کرتے ہیں اور اکثر وبیشتر اسے بالکل نظر انداز کردیتے ہیں۔ مسلمانوں اور عربوں سے بہتر تعلقات کی خاطر ہمیں کلی طور پر ان کا احسان مند ہونا چاہئے اور اس احسان مندی کو چھپانا یا اسے تسلیم نہ کرنا ایک جھوٹی انا کے سوا کچھ نہیں۔''(406)

ڈاکٹر واٹ(Dr. Watt) ایک اور جگہ رقمطراز ہے:

''میں نے عربوں کی سائنس اور فلسفے میں کامیابیوں کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ اب غیر ضروری نہیں ہے کہ مختصر پیرائے میں یونانیوں کے لئے عربوں کی اعانت کا بیان کیا جائے کہ یہ موازنہ ہو سکے کہ دونوں میں عظیم تر کون ہے۔ اگر کسی کو مکمل طور پر عربوں کے تجربات ان کی سوچ اور تحریری صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہو جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ عربوں کی اعانت کے بغیر یورپ کے لئے سائنس اور فلسفہ کے میدان میں اس قدر ترقی کا حصول ناممکن تھا۔ عرب یونانی عقائد کے مبلغ نہ تھے بلکہ وہ خود ان نظریات کے حامل تھے۔ انہوں نے علوم نے دسترس حاصل کی اور خود اس کی ترقی کا موجب بنے۔ جب یورپ کے اندازاً 1100 افراد نے اپنے دشمن مسلمانوں کی سائنس فلسفے میں سنجیدگی سے دلچسپی لینی شروع کی۔ اس وقت یہ علوم بام عروج پر تھے اور یورپی اقوام کو اس سے بہر صورت استفادہ کرنا پڑا تا کہ وہ خود ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں''۔ (407)

ڈاکٹر واٹ(Dr. Watt) ایک اور جگہ رقمطراز ہے۔

''جب کوئی قرونِ وسطیٰ کی اسلام اور مسیحیت کی مسابقت کو دیکھتا ہے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مسیحی مغرب پر اسلام کا اثر اس سے کہیں زیادہ ہے جو عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اسلام یورپ کے ساتھ مادی موضوعات میں شریک رہا یا اس کی تکنیکی دریافتوں کا محرک بنا بلکہ اس نے یورپ کو اپنا جدید تشخص قائم کرنے پر ابھارا۔ چونکہ یورپ کی اسلام کے ساتھ مخاصمت تھی۔ اس لئے اس نے عربوں کی اہمیت کو کم تر کرنے کی کوشش کی اور یونان اور روما کے ورثہ پر انحصار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ پس آج کے اہل مغرب کے لئے یہ ضروری ہے کہ بین الاقوامیت کے موجودہ دور میں اس غلط تاثر کی تلافی کریں اور عربوں اور اسلام کے احسانات کو کھلے دل کے ساتھ تسلیم کریں۔'' (408)

یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر برقرار ہے کہ اہل مغرب اسلام سے چودہ صدیاں یا اس سے زائد عرصہ میں اسلام اور نبی اکرم ﷺ کے خلاف موروثی نفرت کو فراموش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس کی وجہ عیاں ہے۔ عیسائی اور اہل اسلام خطۂ ارض کے بڑے حصے پر بعض مہلک مبازرت میں الجھے رہے اور کبھی کبھار یہ صورت حال عارضی جنگ بندی یا غیر پائدار امن کی حامل رہی۔

تعدد ازدواج اور مستشرقین

ہزاروں سال سے مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں کثیر الازواجیت کا دستور رائج رہا ہے۔ انجیل مقدس کے مقدس کثیر الازواجیت کی سب سے پہلی مثال یہ ہے۔

''اور Lameth نے دو بیویاں رکھیں ایک کا نام DAH اور دوسری کا نام Zillah تھا۔ (409)

جان ڈیون پور(John Devenport) اپنی تصنیف ''دی میسج آف قرآن''(The Message of Quran) میں لکھتا ہے۔

''قابل احترام بزرگ ابراہم کے دور سے دنیا میں کثیر الازواجیت رائج تھی۔ انجیل مقدس میں متعدد ایسی عبارات موجود ہیں جن کی رو سے کثیر الازواجیت کو گناہ نہیں گردانا گیا۔ کثیر الازواجیت کی قدیم یونانیوں میں بھی اجازت تھی اور Plutarch نے اس کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے۔ اور Uropideo اور افلاطون (Plato) نے کثیر الازواجیت کی حمایت کی ہے۔ رومیوں میں ایک شخص ماری اٹونگ (Mare Autong) کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس کی دو بیویاں تھیں۔ شہنشاہ ویلنٹینین (Velentinian) نے اپنی رعایا کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے متعدد بیویوں سے شادی کی اجازت دی اور بشپ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ فرانس کے بادشاہ Clotaire اور اس کے بیٹوں Heribartus اور Hypericus کے علاوہ Charlemagne Lothaire اور اس کے بیٹے Arnolophus-VII (A.C.888) جو جرمنی کا شہنشاہ تھا۔ Charlemangne کا ایک بیٹا فریڈرک باربروسا اور فلپ تھوڈالس (Philip

(Theodatus) شاہ فرانس بھی کی ایک سے زائد بیویاں تھیں۔ قیصر (Caesor) کے حوالے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد میں سے ایک بیوی کے بیک وقت 10/12 شوہر ہونے کا رواج بھی تھا۔ حتی کہ پوپ گریگوری نے کہا کہ ایک بیوی کی بیمار ہونے کی صورت میں دوسری شادی کی جا سکتی ہے۔ مسیحیوں میں کثیر الازواجیت کی حمایت میں بہت سی کتب لکھی گئیں۔ سولہویں صدی کے وسط میں Capuchins نے کثیر الازواجیت کی حمایت میں ایک کتاب چھاپی اور تقریباً اسی دور میں Lysarus نے Theophilus کے قلمی نام سے کثیر الازواجیت کے حق میں ایک کتاب شائع کی۔(410)

مناظراتی حملے:

یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ مغربی ناقدین نے سراسر تعصب اور بدنیتی کی بنیاد پر نبی ﷺ پر جھوٹے الزامات یوں لگائے کہ آپ ﷺ اپنے اقتدار کی ترقی اور اپنی طاقت کے بڑھنے کے بعد زیادہ پرتعیش زندگی بسر کرنے لگے۔ ہم انتہائی بوجھل دل کے ساتھ ان ہرزہ مصنفوں کے حوالے سے مندرجہ ذیل حوالہ جات درج کرتے ہیں۔

فلپ سکاف (Philip Schaff) اپنی کتاب "ہسٹری آف کرسچین چرچ" (History of Christian Church) میں بیان کرتا ہے۔

"ان کی تعدد الازواج جنسیت پرستی کے سبب تھی (معاذاللہ)۔ اور اولاد نرینہ کی خواہش میں عمر کے ساتھ ساتھ شدت آتی گئی"۔(411)

گستاف ویل (Gustav Weil) نے اپنی کتاب "ہسٹری آف اسلامک پیپلز" (History of Islamic Peoples) میں لکھا "کہ حرم سرائے پیغمبر ﷺ کا قرآن میں خصوصی ذکر ہے"۔(412)

ویل ڈیورینٹ (Will Durant) اپنی کتاب "دی ایج آف فیتھ" (The Age of faith) میں انتہائی غیر مصنفانہ طور پر پیغمبر علیہ السلام کو جنس پرست (نقل کفر کفر نہ باشد) نشان لکھا ہے۔(413)

ایک دیگر متعصب نقاد نابیا ایبٹ (Nobia abbot) نے اپنی کتاب "عائشہ محبوبہ محمد ﷺ" (Aisha the beloved of Mohammad) میں آپ ﷺ کو جنس پرست (معاذاللہ) بیان کیا ہے۔(414)

مذکورہ بالا تمام مصنفین نے نبی مکرم ﷺ اور اسلام سے اپنی نسل در نسل نفرت کے پیش نظر ان حقائق پر جو ان کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے، اپنی آنکھیں بند رکھیں اور ان تمام سیاسی، سماجی، اور اخلاقی وجوہات واسباب کو آسانی سے فراموش کر دیا جن کی بنا پر نبی اکرم ﷺ تعدد الازواج کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ یہ انتہائی اہم امر ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے تشریف لانے والے پیغمبروں نے بھی تعدد الازواج کو اپنائے رکھا مگر مستشرقین میں سے کسی نے بھی ان انبیاء کرام کے بارے میں حرف زنی کیوں نہیں کی؟ اور صرف جناب پیغمبر اسلام ﷺ کو تنقید اور تضحیک کا نشانہ بنایا۔ کوئی بھی غیر متعصب اور صاحب بصیرت شخص بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے کتنی گہری نفرت کرتے تھے۔

54 سے 60 سال کے سن مبارک کے دوران نبی ﷺ نے بہت سے شادیاں کیں مگر 60 کی عمر کے بعد اپنی رحلت تک انہوں نے کوئی نئی شادی نہیں کی۔ یہاں نبی ﷺ کی شادیوں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے سیدہ خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی وفات کے بعد سیدہ سودہ ؓ سے شادی کی جو بیوہ تھیں اور انتہائی مشکل حالات سے دوچار تھیں۔ اسی دوران ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (جو بعد میں اسلام کے خلیفہ اول کے عہدہ پر متمکن ہوئے) نے اپنی ہونہار اور ذہین بیٹی سیدہ عائشہ ؓ کا رشتہ پیغمبر اسلام ﷺ کو پیش کیا۔ جناب پیغمبر ابوبکر ؓ کے لئے خیر سگالی اور احترام کا گہرا جذبہ رکھتے تھے۔ پس سیدہ عائشہ ؓ کے ساتھ شادی کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ جناب ابوبکر ؓ جوان کے عظیم ترین حامی اور پیروکار تھے کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور بعد ازاں اس شادی

کے لئے حکم الٰہی بھی نازل ہوا۔ سیدہ عائشہؓ اور سیدہ سودہؓ کے ساتھ عقد کے بعد جناب پیغمبر ﷺ بار بار شادیاں نہ کرتے مگر سرکش قبائل کے غم وغصہ کو ٹھنڈا کرنے اور تکمیل مشن کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کی بیٹی سیدہ حفصہ بھی نبی ﷺ کی ایک اور زوجہ محترمہ غزوہ بدر کے ایک شہید (قیس بن خذافہ القرشی السہمی) کی بیوہ تھیں۔ نبی ﷺ کی ان کے ساتھ شادی کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد محترم جو ایک زبردست جنگجو مجاہد تھے اور جو حضور ﷺ کے ساتھ ازدواجی الحاق کر کے دوسرے پیروکاروں کی برابری چاہتے تھے تعلقات کو مزید مستحکم ومضبوط کر دیا۔ (415)

اس کے بعد اگلی خاتون سیدہ زینب بنت خزیمہ تھیں جو پیغمبر ﷺ کی زوجیت میں آئیں۔ پہلے خاوند سے مطلقہ تھیں ان کے دوسرے خاوند غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے، ان کے والدین جو مکہ کے رہنے والے تھے وہ غیر مسلم تھے۔ اپنے دوسرے خاوند کی شہادت کے بعد ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور سرکار دو عالم ﷺ نے جذبہ ترحم کے ساتھ انہیں اپنے حرم میں داخل کرلیا، مگر حضور ﷺ کی زوجیت میں آنے کے بعد وہ زیادہ دیر حیات نہ رہیں اور غالباً تین ماہ کے اندر رحلت فرما گئیں۔

ان کے بعد حرم نبوی میں داخل ہونے والی خاتون سیدہ ام الہند بنت سہیل (سیدہ ام سلمہ) تھیں جو مدینہ میں اپنے خاوند عبداللہ کے ساتھ رہنے کیلئے پہنچیں مگر عبداللہ جنگ احد میں شہید ہوئے اور انہیں ایک نوعمر بچی اور ایک بچے کے حمل کے ساتھ بے بسی اور بے چارگی کی حالت میں چھوڑ کر چل بسے۔ وہ اپنے والد کے پاس واپس مکہ نہ جا سکتی تھیں اور نہ ہی مدینہ میں دیگر کوئی ان کی دیکھ بھال کرنے والا تھا۔ انہوں نے اپنی زبوں حالی جب پیغمبر ﷺ کو بیان کی تو انہوں نے ان کو اپنی زوجیت میں لے کر حرم نبوی میں داخل کر لیا۔ گرچہ حرم نبوی میں جواں سال سیدہ عائشہؓ اور سیدہ حفصہؓ کے علاوہ بے سہارا ادھیڑ عمر امہات المومنین سیدہ سودہؓ اور سیدہ سلمہؓ جوان کے عقیدت مند پیروکاروں کی بیوائیں تھیں موجود تھیں مگر قبیلہ بنو مصطلق کی ایک اور بے کس خاتون سیدہ جویریہؓ کو بھی آپ نے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ وہ اسیر جنگ ہو کر ایک سپاہی کے حصے میں آئیں۔ مگر ان کی رحم کی اپیل پر پیغمبر ﷺ نے ہمدرانہ اور غمگسارانہ عمل کا اظہار کرتے ہوئے انہیں فدیہ دیکر آزاد کرا لیا اور اپنی زوجگی میں قبول کرنے کا شرف بخشا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس رشتے اور قرابت داری کو قائم کر کے حضور ﷺ نے اپنی دانشمندی سے اسلام کو مزید استحکام بخشا۔ (416)

اس کے بعد حکم الٰہی سے پیغمبر ﷺ کو ایک اور خاتون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا پڑا۔ نبی ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینب بن جحش کو جناب زید بن حارث جو آزاد غلام تھے اور حضور ﷺ کے متبنیٰ تھے کے نکاح میں دے دیا تھا اس عالی نسب خاتون نے اس آزاد غلام سے انتہائی توہین آمیز سلوک روا رکھا اور وہ نبی ﷺ کے انتباہ کے باوجود اسے طلاق دینے پر مجبور ہو گئے۔ اور پھر جب اس خاتون کو طلاق ہو گئی تو ان کی نگہداشت کی ذمہ داری حضور ﷺ پر یوں آ گئی کہ سیدہ زینبؓ کے خاندان نے ان کی شادی زید بن حارثؓ سے حضور کی یقین دہانی پر کرائی تھی۔ طلاق کے بعد کوئی اعلیٰ نسب عرب، ایسی خاتون جسے ایک سابقہ غلام نے فارغ کر دیا تھا اپنانے کے لئے تیار نہ تھا۔ پیغمبر ﷺ نے اپنا عہد اور قول نبھاتے ہوئے خود سیدہ زینب کو اپنی زوجیت میں قبول کر لیا اور رب کریم نے اس حکم کی بجا آوری کو پیغمبر ﷺ کے پسندیدہ اور بہترین دنیاوی اعمال میں گردانا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ "میری بات اللہ کے احکامات سے متصادم نہیں مگر اللہ میری بات کی تردید کر سکتا ہے"۔ واتفاقی طور پر سیدہ زینبؓ کے اس معاملے نے بالواسطہ طور پر شادی سے پہلے عورت کی مرضی اور خواہش کا خاص دھیان رکھنے کے مسلمہ اسلامی امتیازی سلوک کو مستحکم بنیادوں پر استوار کر دیا۔ زبردستی کی شادیوں کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ لہذا شادی میں ایجاب وقبول کے اصول کو غیر اہم نہیں سمجھنا چاہیے۔ اسلام میں شادی کے معاملہ میں فیصلہ کن رائے لڑکی کی ہوتی ہے۔ چونکہ سیدہ زینبؓ اور ان کے عزیز واقارب ان کی جناب زید بن حارثؓ سے شادی پر خوش نہ تھے تو خدائے قدوس نے خود سیدہ زینبؓ کی دستگیری کی۔ اس واقعہ سے فیصلہ کن طور پر کفار عرب میں مروج دستور یعنی متبنیٰ یا لے پالک بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھنے کے رواج کو خلاف عقائد اسلام قرار دے دیا گیا۔ (417)

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے سیدہ ام حبیبہؓ رملہ بنت ابوسفیان سے شادی کی جو پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلام کا ایک کٹر دشمن تھا۔ یہ شادی خالصتاً ایک رحمت ثابت ہوئی اور ابوسفیان کی جناب نبی ﷺ اور اسلام کے دشمنی آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔ اس شادی کے فوراً بعد غزوۂ خیبر کی جنگی قیدی سیدہ صفیہ جو پیدائشی طور ایک یہودی شریف زادی تھیں کو حرم نبوی میں پناہ گزین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اور نتیجتاً اس شادی سے عبرانی النسل قبائل سے سیاسی بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ اس کے بعد یہودیوں نے اسلام کی مخالفت ترک کردی کیونکہ ان کے رواج کے مطابق جن خاندانوں میں اپنی بیٹیوں کا رشتہ کردیتے ان کی عزت واحترام ان پر لازم ہوجاتی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا آخری عقد سیدہ میمونہؓ سے خالصتاً سیاسی رشتہ تھا۔ ان کے والد جناب حارث قبیلہ بنوہوازن کے طاقتور سردار تھے اور اس محترم خاتون سے آنحضرت ﷺ کی شادی سے اسلامی عقائد کو پھلنے پھولنے میں مہمیز ملی۔ آپ مسلمانوں کے عظیم جرنیل خالد بن ولید کی خالہ تھیں اور دومرتبہ بیوگی دیکھ چکی تھیں اور خالد بن ولید کو مائل بہ اسلام کرنے میں ان کی کوششیں کارگر ثابت ہوئیں۔ اس وقت پیغمبر ﷺ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ اس طرح حضور ﷺ نے یہ امر ثابت کردیا کہ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ سیدہ ماریہ قطبیہ کو مصر کے فرماں روا نے آپ کی خدمت میں پیش کیا حضور اکرم ﷺ نے ان سے آزاد کرنے کے بعد بارہویں شادی کرلی۔ فرماں روائے مصر اس پر خوش ہوا اور اس کی اسلام دشمنی ٹھنڈی پڑگئی۔

اس حقیقت کی روشنی میں کہ نبی ﷺ نے دوکنواری خواتین سیدہ عائشہ اور سیدہ ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ جتنی دیگر خواتین کو بطور ازواج مطہرات حرم نبوی میں داخل کیا یا تو وہ بیوائیں تھیں یا پھر مطلقہ۔ چنانچہ نبی ﷺ سے متعلق قائم کیا گیا جنس پرستی پرمبنی الزام یکسر مسترد ہوکر زمین بوس ہوجاتا ہے۔ کیا ایک جنس پرست انسان جو مدینہ کی نومسلم ریاست کا مختارکل اور سیاہ وسفید کا مالک ہو۔ بیواؤں اور طلاق یافتہ خواتین کو اپنے حرم پاک میں داخل کرتا۔ حالانکہ حضور ﷺ کا کسی بھی کنواری خاتون سے شادی کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔ (418)

خلاصہ:

مستشرقین مذکورہ بالا سب حقیقتوں سے آشنا ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے بے شمار ساتھی جوان کے شانہ بشانہ، آفتاب رسالت کی ضوکو کم کرنے کی مہم پر نکلے تھے، انہوں نے اس آفتاب عالمتاب کی نورانی کرنوں سے اپنے قلب ونظر کو منور کرلیا ہے، اس کے باوجود وہ اس آفتاب کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کی نامسعود کوششوں میں مصروف ہیں۔ مستشرقین کے اس رویے کی توجیہ تعصب، ہٹ دھرمی، نانیت اور بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ آفتاب پھونکوں سے نہ پہلے بجھا ہے اور نہ آئندہ بجھے گا۔ پھونکیں مارنے والے اپنی ناکامیوں اور حسرتوں کی آگ میں جل کر بھسم ہوجائیں گے اور آفتاب رسالت ہمیشہ کی طرح پوری آب وتاب کے ساتھ نصف النہار پر ضوفشاں رہے گا۔

حوالہ جات

1۔ بھٹی، عبدالجلیل، ''شبلی کا نظریہ تاریخ''، تاریخ بہاولپور، 1989ء، ص183

2۔ محمد اکرام، شیخ، ''یادگارِ شبلی''، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1971ء، ص28

3۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، مکتبہ عالیہ لاہور، سن ندارد، ص144

4۔ محمد اکرام، شیخ، ''یادگارِ شبلی''، ص143

5۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، ص30

6۔ ''شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا''، تاریخ ادب لاہور 1987ء، ص396

7۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، ص144

8۔ ''شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا''، ص396

9۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، ص147

10۔ محمد اکرم، شیخ، ''یادگارِ شبلی''، ص59

11۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، ص154

12۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، ص154

13۔ ''شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا''، ص396

14۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، ص190

15۔ محمد اکرم، شیخ، ''یادگارِ شبلی''، ص298

16۔ عثمانی محمود اصل، ''شبلی ادیبوں کی نظر میں''، صفیہ اکیڈمی کراچی 1968ء، ص22

17۔ ''شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا''، ص396

18۔ صدیقی، آفتاب احمد، ''شبلی ایک دبستان''، ص23

19۔ محمد اکرم، شیخ، ''یادگارِ شبلی''، ص132

20۔ نعمانی، شبلی، علامہ، ''مکاتیب شبلی حصہ اول معین الدین احمد انصاری'' اردو اکیڈمی سندھ کراچی 1967ء، ص4

21۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''سر سید اور ان کے رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1986ء، ص77

22۔ محمد اکرم، شیخ، ''یادگارِ شبلی''، ص132

23۔ صدیقی، آفتاب احمد، ''شبلی ایک دبستان''، مکتبہ عارفین ڈھاکہ 1970ء، ص266

24۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''طیف نثر''، لاہور اکیڈمی 1985ء، ص192-191

25۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، دانش گاہ پنجاب لاہور 1980ء، ج11، ص650

26۔ نعمانی، شبلی، علامہ، ''مکاتیب شبلی معین الدین احمد انصاری''، ص14

27۔ مفتون احمد، ''مولانا شبلی ایک مطالعہ''، مکتبہ اسلوب کراچی 1986ء، ص92

28۔ محمد اکرم، شیخ، ''موج کوثر''، ص244

29۔ مفتون احمد، ''مولانا شبلی ایک مطالعہ''، ص84

30۔ محمد اکرم، شیخ، ''موج کوثر''، ص244

31۔ مفتون احمد، ''مولانا شبلی ایک مطالعہ''، ص91

32۔ نعمانی، شبلی، مولانا: ''مکاتیب شبلی حصہ دوم''، معین الدین احمد انصاری، ص190
33۔ ندوی، سلیمان، سید: ''حیات شبلی''، ص610
34۔ نعمانی، شبلی، مولانا: ''مکاتیب شبلی جلد دوم''، معین الدین احمد انصاری، ص143
35۔ مفتون احمد: ''مولانا شبلی ایک مطالعہ''، ص110
36۔ قاسم محمود، سید: ''انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا''، شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی، 1998ء، ص594
37۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ''سرسید اور نامور رفقاء''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 1998، ص192
38۔ ایضاً، ص193
39۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ''وجہی سے عبدالحق تک''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 1996، ص101
40۔ صدیقی، آفتاب احمد، ڈاکٹر: ''شبلی ایک دبستان''، ص265
41۔ نعمانی، شبلی، علامہ: ''علم الکلام اور الکلام''، نفیس اکیڈمی کراچی، 1979، ص4
42۔ محمد اکرام، شیخ: ''یادگار شبلی''، ص325
43۔ نعمانی، شبلی، علامہ: ''علم الکلام اور الکلام''، نفیس اکیڈمی کراچی، 1979ء، ص239
44۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر: ''آج کا اردو ادب''، فیروز سنز لاہور 1970، ص90-91
45۔ صدیقی، آفتاب احمد، ڈاکٹر: ''شبلی ایک دبستان''، ص268
46۔ خواجہ، عبداللہ اختر: ''مذاہب اسلامیہ''، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1952، ص276-277
47۔ ندوی، سلیمان، سید: ''حیات شبلی''، مکتبہ عالیہ لاہور، ص9-10
48۔ صدیقی، آفتاب احمد، ڈاکٹر: ''شبلی ایک دبستان''، ص28-29
49۔ ایضاً، ص29
50۔ ندوی، سلیمان، سید: ''حیات شبلی''، ص147-148
51۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر: ''آج کا اردو ادب''، ص47
52۔ نعمانی، شبلی، علامہ: ''مکاتیب شبلی حصہ اول معین الدین احمد انصاری''، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، 1967، ص4
53۔ ایس۔ایم۔اکرم: ''یادگار شبلی''، ص100
54۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ''طیف نثر''، لاہور اکیڈمی، 1985، ص192-191
55۔ مفتون احمد: ''مولانا شبلی ایک مطالعہ''، ص92
56۔ ایضاً، ص84
57۔ نعمانی، شبلی، علامہ: ''علم الکلام اور الکلام''، ص4
58۔ صدیقی، آفتاب احمد، ڈاکٹر: ''شبلی ایک دبستان''، ص264-265
59۔ نعمانی، شبلی، علامہ: ''علم الکلام اور الکلام''، ص130
60۔ ایضاً، ص239
61۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ''سرسید اور نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1986، ص77
62۔ عبیداللہ: ''مقالات یوم شبلی''، بک فاؤنڈیشن لاہور 1961ء، ص11
63۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ''سید اور ان کے نامور رفقاء''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1986، ص140

64۔ قاموس الکتب اردو، ج اول، ص705

65۔ ندوی، سلیمان، سید، ''حیات شبلی''، ص807

66۔ الاعظمی، محمد الیاس، ڈاکٹر، ''دارالمصنفین کی تاریخی خدمات''، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 2002ء، ص139

67۔ ایضاً، ص143

68۔ ایضاً، ص145

69۔ الاعظمی، محمد الیاس، ڈاکٹر، ''دارالمصنفین کی تاریخی خدمات''، ص161

70۔ ایضاً، ص177

71۔ سحر انصاری، ''علامہ شبلی نعمانی کا اسلوب سیرت نگاری''، بحوالہ السیرۃ عالمیہ، ششماہی شمارہ آٹھ، رمضان المبارک، 1423ھ، نومبر 2002ء، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ص269

72۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''علم الکلام اور الکلام''، نفیس اکیڈمی کراچی، 1979ء، ص239

73۔ محمد اکرام، شیخ، ''یادگار شبلی''، ص325

74۔ ایضاً

75۔ صدیقی، آفتاب احمد، ڈاکٹر، ''شبلی ایک دبستان''،

76۔ سحر انصاری، ''علامہ شبلی نعمانی کا اسلوب سیرت نگاری''، ص72

77۔ محمد میاں صدیقی، ''تذکرہ ادریس کاندھلوی''، مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ، لاہور، ص۲۹

78۔ محمد میاں صدیقی ''تذکرہ ادریس کاندھلوی''، ص۱۱

79۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، ''مقدمۃ التفسیر''، سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، محمد میاں صدیقی، تذکرہ ادریس کاندھلوی۔ اختر راہی تذکرہ علماء پنجاب مشاہیر علماء دیوبند۔

80۔ محمد میاں صدیقی ''تذکرہ ادریس کاندھلوی'' اس کے علاوہ جہاں دانش اور یو۔پی کے پرانے گزیٹرز سے لئے گئے، ص۲۹۔

81۔ احسان دانش، ''جہاں دانش''، طبع لاہور ۱۹۷۳ء، ص۲۹

82۔ محمد میاں صدیقی، ''تذکرہ ادریس کاندھلوی''، ص۳۰

83۔ محمد اسماعیل ''الفاروق بین المتلاد و المارق''، ص۲۔

84۔ اختر راہی ''تذکرہ علماء پنجاب''، ص۲۰۹، تذکرہ ادریس کاندھلوی، ص۳۲

85۔ تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلہ، ص۳۱

86۔ سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص۱۳۲۴۔

87۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مقدمۃ التفسیر

88۔ اختر راہی، ''تذکرہ علماء پنجاب''، ص۲۰۹۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص۱۳۲۴۔ محمد میاں صدیقی تذکرہ مولانا ادریس کاندھلوی، ص۳۳

89۔ محمد میاں صدیقی ''تذکرہ ادریس کاندھلوی''، ص۳۳

90۔ اختر راہی، ''تذکرہ علماء پنجاب''، ص۲۰۹۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص۱۳۲۴۔

91۔ محمد میاں صدیقی، ''تذکرہ مولانا محمد کاندھلوی''، ص۳۴۔۳۵

92۔ محمد بن اسماعیل، ''الجامع الصحیح''، کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان، ص44

93۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ''سیرت المصطفیٰ'' جلد اول

94۔ میاں محمد صدیقی، ''تذکرہ ادریس کاندھلوی''، اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ص 1324

95۔ ادریس کاندھلوی، مولانا، ''سیرت مصطفی ﷺ''، ج 1، ص 56

96۔ کاندہلوی، مولانا محمد ادریس، ''سیرۃ المصطفیٰ''، لاہور 1381ء

97۔ ایضاً، ص 71

98۔ خالد، انور محمود، ڈاکٹر، ''اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ''، لاہور 1989ء

99۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، ''سیرت المصطفیٰ''، دیباچہ ا

100۔ حافظ قاری فیوض الرحمٰن، ''مشاہیر علماء دیو بند''، ص ۴۴۰

101۔ القرآن، الاحزاب: 21

102۔ القرآن، القلم: 4

103۔ ابوالکلام، قاسمی، شمسی، ''تذکرہ علمائے بہار''،

104۔ ''ماہنامہ معارف'' نمبر 5، جلد 61 مئی 1948ء

105. abdul azeem muallimazeem@yahoo.co.in

106۔ سلیمان ندوی، سید، علامہ، ''یاد رفتگاں''، ''تذکرہ علمائے بہار''، ابوالکلام، قاسمی، شمسی

107۔ ندوی، معین الدین احمد، شاہ، ''ماہنامہ معارف''، ص 391

108۔ ایضاً، ''ماہنامہ معارف'' نمبر 5، سن اشاعت 1949ء، ج 61

109۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم (مولانا) ''اصح السیر''، مقدمہ، ص 14

110۔ دانا پوری، ابوالبرکات عبدالرؤف مولانا: ''اصح السیر'' فی ہدی خیر البشر ﷺ، ص 15

111۔ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، ص 310

112۔ ایضاً، ص، 26

113۔ غازی، محمود احمد (ڈاکٹر) ''محاضرات سیرت''، الفیصل ناشران وتاجر کتب لاہور 2004، صفحہ 532 تا 534

114۔ ایضاً

115۔ ندوی، شاہ معین الدین احمد، ندوی، سلیمان، سید، ''ماہنامہ معارف'' نمبر 5 جلد 61، ص 390

116۔ پھلواری، شاہ محمد جعفر، پیغمبر انسانیت، ص 35

117۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم، مولانا: ''اصح السیر''، ص 18 تا 31

118۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم، مولانا: ''اصح السیر''، ص، 4

119۔ ایضاً ص، 5

120۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، ''محاضرات سیرت''، ص 532 تا 534

121۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم، مولانا: ''اصح السیر''، ص 25

122۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، ''محاضرات سیرت''، ص 532 تا 534

123۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، ''محاضرات سیرت''، ص 680۔681

124۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، ''محاضرات سیرت''، ص 531۔532

125۔ حدیث بخاری، باب الایمان

126۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم، مولانا: ''اصح السیر''، مقدمہ، ص24
127۔ ایضاً، ص، 25
128۔ القرآن، النجم: 53:3، 4
129۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم، مولانا، ''اصح السیر''، ص27
130۔ حدیث بخاری، باب الایمان
131۔ ایضاً
132۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم، مولانا: ''اصح السیر''، ص، 28
133۔ القرآن، المائدہ: 5: 2
134۔ القرآن، بنی اسرائیل: 17:81
135۔ ابوالبرکات، عبدالرؤف، حکیم، مولانا: ''اصح السیر''، ص27
136۔ القرآن، الانفال: 8:65
137۔ القرآن، الانبیاء: 21:105
138۔ تعارف از عبدالباقی، سفرنامہ حجاز، ص۲٦۲
139۔ ایضاً، ص۲٦۱
140۔ تعارف از قاضی عبدالباقی، سفرنامہ حجاز، ص۲٦۲
141۔ ایضاً، ص۲٦۳
142۔ ایضاً
143۔ ایضاً، ص۲٦۱
144۔ ایضاً، ص۲٦۱
145۔ ایضاً، ص۲۷۳
146۔ ایضاً، ص۲٦۳
147۔ ایضاً
148۔ ایضاً، ص۲۷۳
149۔ ایضاً، ص۲۷۷
150۔ ایضاً، ص۲٦۹
151۔ ایضاً، ص۲۷۷
152۔ مولانا غلام رسول مہر، سفرنامہ حجاز، ص۱۱۲
153۔ ایضاً، ص۱۱۲
154۔ ایضاً، ص۱۱۳
155۔ سید سلیمان ندوی ''رحمۃ اللعالمین''، ج۳، ص۱۹
156۔ تعارف از حکیم عبداللہ: ''اصحاب بدر''، ص۲۳
157۔ تعارف از عبدالشکور ''اصحاب بدر''، ص۱

158۔ تعارف از عبدالباقی، ''سفرنامہ حجاز''، ص۸
159۔ مرثیہ از بشارت، لباغ دہلی، ''سفرنامہ حجاز''، ص۲۹۶
160۔ عبدالشکور قریشی ''اصحاب بدر''، ص۱
161۔ قاضی محمد سلیمان ''رحمۃ اللعالمین'' ج2، ص۱۹
162۔ ایضاً، ص19
163۔ ایضاً، ج۳، ص۹
164۔ حضرت قاضی سلیمان ''رحمۃ اللعالمین''، ج2، ص۱۷۴
165۔ سلمان ندوی، سید ''حیات شبلی''، مکتبہ عالیہ لاہور،
166۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر، ''یادگار شبلی''، ص468
167۔ ایضاً، ص480
168۔ ایضاً، ج ۱، ص۲۱
169۔ ایضاً، ج3، ص۱۳
170۔ ایضاً، ج۱، ص۲۵۶
171۔ ایضاً، ج۱، ص۲۵۶
172۔ ایضاً، ج۳، ص۱۲
173۔ ایضاً، ص۱۱۶
174۔ ایضاً، ص۳۹
175۔ ایضاً، ص۱۲
176۔ ایضاً، ص۱۲
177۔ ایضاً، ص۳۱۴
178۔ ایضاً، ص۳۱۵
179۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر، ''یادگار شبلی''، ص421
180۔ ایضاً، ص422
181۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''سیرۃ النبی''، طبع اول، سطور ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ جلد اول، ج1، ص255
182۔ قاضی محمد سلیمان ''رحمۃ اللعالمین''، ج1
183۔ ایضاً، ص۱۸، ۱۹
184۔ ایضاً، ج۱، ص۲۷۴
185۔ ایضاً، ج2، ص۳۳۵
186۔ ایضاً، ص۳۳۵
187۔ ایضاً، ص۳۳۵
188۔ ایضاً، ص۱۲۶
189۔ ایضاً، ص۱۲۹۔۱۳۰

190۔ ایضاً،ص۱۳۰
191۔ ایضاً،ص۱۳۱
192۔ ایضاً،ص۱۳۱
193۔ ایضاً،ص۱۳۲
194۔ ایضاً،ص۱۳۳
195۔ ''اہل حدیث امرتسر''، 29 نومبر 1940ء،ص9
196۔ مجلہ الجامعۃ الابراہیمیہ سیالکوٹ، دسمبر 1984ء،ص43
197۔ نوشہروی، ابو یحیٰ، امام، ''ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات''،ص182
198۔ ''اہل حدیث امرتسر''، 29 نومبر 1940ء،ص10
199۔ ''مجلہ الجامعۃ الابراہیمیہ'' سیالکوٹ، اپریل 1985ء،ص18
200۔ فیروز پوری، محمد اسلم، قاضی، مولانا، ''سوانح حیات امام العصر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی''، مطبوعہ جامعہ تعلیم الاسلام، فیصل آباد، ستمبر 1994ء،ص83
201۔ نوشہروی، ابو یحیٰ، امام، ''جماعت اہل حدیث کے مدرسے''، مطبوعہ مکتبہ نذیریہ چیچہ وطنی، 1977ء،ص7
202۔ فیروز پوری، محمد اسلم، قاضی، مولانا، ''سوانح حیات امام العصر مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی''،ص87,88
203۔ سیالکوٹی، عبدالواحد، مولانا، ''احوال علمائے اہل حدیث''مطبوعہ المکتبۃ الاثریہ سانگلہ ہل، 1975ء،ص204
204۔ لکھنوی، محمد علی، ''تاریخ علمائے سیالکوٹ''،ص102
205۔ ساجد میر، پروفیسر، علامہ، ''اسلام اور اہل حدیث''، مطبوعہ جمعیت اہل حدیث خانیوال،ص4
206۔ سیالکوٹی، عبدالواحد، مولانا، ''احوال علمائے اہل حدیث''،ص178
207۔ ہفت روزہ ''اہل حدیث امرتسر''، جون 1925ء
208۔ ہفت روزہ ''توحید امرتسر'' نومبر 1926ء
209۔ ماہنامہ ''مسلمان سوہدرہ''، اپریل 1929ء،ص31
210۔ ہفت روزہ ''مسلمان امرتسر''، دسمبر 1926ء،ص6
211۔ مجلہ الجامعۃ الابراہیمیہ، سیالکوٹ، مارچ 1986ء،ص74
212۔ ماہنامہ ''مرقع قادیانی''، جون 1933ء،ص31
213۔ مجلہ الجامعۃ الابراہیمیہ، سیالکوٹ، جون 1986ء،ص75
214۔ ایضاً،ص76
215۔ القرآن، احزاب: 36
216۔ بغوی، حسین بن مسعود، امام، ''مشکوٰۃ المصابیح''، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی، ج3،ص51
217۔ قادیانی، غلام احمد، مرزا، ''ضمیمہ انجام آتھم''،ص53، طبع اول قادیان، 1920ء،ص53
218۔ القرآن، النساء: 159
219۔ مجلہ الجامعۃ الابراہیمیہ، سیالکوٹ، جون 1986ء،ص78,79
220۔ القرآن، احزاب: 40

221۔ ''کشف الحقائق''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1933ء
222۔ ماہنامہ، الہادی، سیالکوٹ، دسمبر 1934ء
223۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''ماخوذ الکواکب المضیئۃ لازالۃ شبہات الغریۃ''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1955ء
224۔ ہفت روزہ، ''الاعتصام''، لاہور، 2 مارچ 1956ء
225۔ القرآن، اسرائیل: 77
226۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''شہادۃ القرآن''، حصہ دوم، مطبوعہ مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان، 1958ء
227۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''اخلاق محمدیؐ''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1911ء
228۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''عصمت انبیاء''، ادارہ تبلیغ دین سیالکوٹ، 1910ء
229۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''عصمت النبی ﷺ''، مطبوعہ شعبہ نشر واشاعت اہل حدیث گوجرانوالہ، 1911ء
230۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''سراجاً منیرا''، مطبوعہ سبحانی اکیڈمی اردو بازار لاہور، 1964ء
231۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''زاد المتقین''، مطبوعہ مکتبہ اہل حدیث میانہ پورہ سیالکوٹ، 1952ء
232۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''سیرت المصطفیٰ ﷺ''، مطبوعہ مکتبہ اہل حدیث سیالکوٹ، 1942ء، ج1
233۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''سیرت المصطفیٰ ﷺ''، ج2
234۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''وہ نبی اور عہد کا رسول''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1946ء
235۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''ختم نبوت''، مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان، 1956ء
236۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''تاریخ نبویؐ''، مطبوعہ ادارہ تبلیغ دین سیالکوٹ، 1911ء
237۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''اصلاح عرب''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1921ء
238۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''بشارات محمدیہ''، انجمن تبلیغ اہل حدیث لائل پور، 1952ء
239۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''حبیب خداؐ''، قلمی نسخہ، ذاتی لائبریری جامعہ ابراہیمیہ سیالکوٹ
240۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''الجالیۃ الظہریۃ فی جمع الرسالۃ والبشریۃ''، مکتبہ اہل حدیث سیالکوٹ، 1939ء
241۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''اسوہ حسنہ''، انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1937ء
242۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''تردید مغالطات مرزائیہ''، مطبوعہ مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان، 1952ء
243۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''فیض خاتم النبوۃ''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1943ء
244۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا: ''سیرت محمدیہ''، مطبوعہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس، 1931ء
245۔ سید اسعد گیلانی: ''بچپن جوانی بڑھاپا''، ص ۲۶، سلیم منصور خالد، تذکرہ مودودی، ص ۶۔۷، مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص ۲۹۹،
246۔ چوہدری عبدالرحمٰن عبد: ''سید ابوالاعلیٰ مودودی''، ص ۴۷
247۔ محمد یوسف: ''مولانا مودودی''، ص ۳۱۔۳۷
248۔ عبدالرحمٰن عبد: ''سید ابوالاعلیٰ مودودی''، ص ۵۶
249۔ ثروت صولت: ''مولانا مودودی کی تقاریر''، ص ۹
250۔ اسعد گیلانی: ''بچپن جوانی بڑھاپا''، ص ۲۷
251۔ سید اسعد گیلانی: ''بچپن جوانی بڑھاپا''، ص ۲۸
252۔ ثروت صولت: ''مولانا مودودی کی تقاریر''، مقدمہ، ص ۱۰

253۔ محمد یوسف، مولانا: ''اپنی اور دوسروں کی نظر میں''، ص۳۸
254۔ عاصم نعمانی: ''سید ابوالاعلیٰ مودودی'' ج2، ص۳۳۸
255۔ سید ذاکر علی: ''جسارت کراچی''، مودودی نمبر، ص۱۳۲
256۔ ثروت صولت: ''مولانا مودودی کی تقاریر'' ج1 مقدمہ، ص۱۲
257۔ چوہدری عبدالرحمٰن عبد: ''سید ابوالاعلیٰ مودودی''، ص170، ایضاً مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص۳۰۰
258۔ اسعد گیلانی: ''بچپن جوانی بڑھاپا''، ص۵۱
259۔ جسارت کراچی، مودودی نمبر، ص۱۰۰۔ ایضاً، اسعد گیلانی، تاریخ جماعت اسلامی، ص۱۱۹
260۔ چوہدری عبدالرحمٰن عبد: ''سید ابوالاعلیٰ مودودی''، ص۸۳
261۔ اسعد گیلانی: ''تاریخ جماعت اسلامی''، ص۱۲۲
262۔ ثروت صولت: ''جسارت کراچی'' مودودی نمبر، ص۱۰۲
263۔ ایضاً ''مولانا مودودی کی تقاریر'' ج1 مقدمہ، ص۱۴
264۔ ابوطارق، ایم اے: ''مولانا مودودی کے انٹرویو''، ص۱۸۲
265۔ ابو آفاق: ''سید ابوالاعلیٰ مودودی''، ص۱۵۳
266۔ نعیم صدیقی: ''المودودی''، ص۹۹
267۔ ابو آفاق: ''سید ابوالاعلیٰ مودودی''، ص۱۹۰
268۔ مریم جمیلہ: ''اسلام ایک نظریہ ایک تحریک''، ص۳۰۰
269۔ اسعد گیلانی: ''تاریخ جماعت اسلامی''، ص۱۴۳
270۔ ہفت روزہ آئین کی اشاعت خاص، 31 مارچ، ص۱۲ نیز مولانا مودودی کی پریس کانفرنس 27 اکتوبر 1963 بحوالہ ثروت صولت ''مولانا مودودی کی تقاریر''، ص۳۱
271۔ مریم جمیلہ: ''اسلام ایک نظریہ ایک تحریک''، ص۲۵۰
272۔ سید اسعد گیلانی: ''بچپن جوانی بڑھاپا''، ص۶۷
273۔ نعیم صدیقی: ''المودودی''، ص۱۶۷
274۔ ثروت صولت، مقدمہ: ''مولانا مودودی کی تقاریر''، ص۴۵
275۔ سید اسعد گیلانی: ''بچپن جوانی بڑھاپا''، ص۱۷۱
276۔ نعیم صدیقی: ''المودودی''، ص۴۰۰
277۔ ابوالاعلیٰ، مودودی، سید: ''سیرت سرور عالم ﷺ''، ادارہ ترجمان القرآن، میٹرو پرنٹرز، لاہور، 1999ء، ج1، ص476,475
278۔ القرآن، الفرقان: ۴، ۵، ۶
279۔ ابوالاعلیٰ مودودی، سید: ''سیرت سرور عالم ﷺ''، ص479
280۔ ابوالاعلیٰ، مودودی، سید: ''تفہیم القرآن''، سورۃ فرقان، حاشیہ 12، ج3
281۔ القرآن، الکہف: 60
282۔ ابوالاعلیٰ، مودودی، سید: ''سیرت سرور عالم ﷺ''، ج1، ص483

283. H. Polano the Talmud, Selectious, By H. Polano, pp 313-16,

284۔ ابوالاعلیٰ، مودودی، سید: ''تفہیم القرآن''، سورۃ کہف، حاشیہ 57، ج3
285۔ القرآن، المومن: ۳۶
286۔ ''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام''، سورۃ4، آیت 28
287۔ ابوالاعلیٰ، مودودی، سید: ''تفہیم القرآن''، سورۃ مومن، حاشیہ 41، ج 4
288۔ مودودی، سید: ''سیرت سرور عالم ﷺ''، ج1، ص487
289۔ مودودی، سید: ''تفہیم القرآن''، سورۃ کہف، حاشیہ 9,25، ج3
290۔ سیرپل شاہین بھیرہ، دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، نمبر جون 1996ء، ص27
291۔ عمران حسین چوہدری: ''اجالوں کا نقیب''، پیر کرم شاہ الازہری، مطبوعہ لاہور 1998ء، ص15
292۔ پیر کرم شاہ الازہری: ''مقالات'' ج1، ص17
293۔ عمران حسین چوہدری: ''اجالوں کا نقیب''، پیر کرم شاہ الازہری، ص19
294۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری: ''مقالات''، ج1، ص11
295۔ ماہانہ ضیائے حرم لاہور، اپریل مئی 1999ء، ص23
296۔ ''سیرپل شاہین''، بھیرہ، دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، نمبر جون 1996ء
297۔ ''سیرپل شاہین''، بھیرہ، ص29
298۔ ''سیرپل شاہین''، بھیرہ، ص181، 241
299۔ پیر کرم شاہ الازہری: ''محسن کائنات''، مکتبہ المجاہد بھیرہ ضلع سرگودھا، ص16
300۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، اپریل مئی 1999ء، ص640
301۔ سانحہ ارتحال، اپریل مئی 1999ء، ص94
302۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور اپریل مئی 1999، ص620
303۔ پیر محمد کرم شاہ ضیاء: ''النبی ﷺ''، لاہور ضیاء القرآن، پبلی کیشنز 1994ء، ج1، ص488
304۔ پیر محمد کرم شاہ: ''ضیاء النبی ﷺ''، ج1، ص5
305۔ پیر کرم شاہ: ''ضیاء النبی''، ج7، ص588
306۔ پیر محمد کرم شاہ: ''سنت خیر الانام''، نثار آرٹ پریس لاہور، ص24
307۔ پیر محمد کرم شاہ: ''سنت خیر الانام''، ص30
308۔ : محمد ہمایوں عباس شمس، ڈاکٹر: ''تحریک استشراق کا ناقدانہ جائزہ ضیاء النبی کی روشنی میں''، مقالہ، بحوالہ جمال کرم مجلہ، دربار مارکیٹ لاہور، ج6,7، شمارہ 40-1، ص17
309۔ پیر محمد کرم شاہ: ''ضیاء النبی''، ج6، ص119
310۔ پیر محمد کرم شاہ: ''ضیاء النبی''، ج6، ص123
311۔ پیر محمد کرم شاہ: ''ضیاء النبی''، ج6، ص123-80
312۔ پیر محمد کرم شاہ: ''ضیاء النبی''، ج6، ص184-230
313۔ پیر محمد کرم شاہ: ''ضیاء النبی''، ج6، ص233-234
314۔ پیر محمد کرم شاہ: ''ضیاء النبی''، ، ج6، ص234-235

315۔ ٹا رانڈ رائے،''محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ''، جارج ایلین اینڈ الون لمیٹڈ لندن، 1956ء، ص76

316۔ سیوری(Savary)،''ترجمہ قرآن''، 1752ء

317۔ والٹیر(Voltaire)،''Mahomet''محمد ﷺ، 1742ء

318۔ کارلائل،''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ''، 8مارچ 1840ء

319۔ ٹا رانڈ رائے،''محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ''، ص173-176

320۔ محمد احسان الحق، سلیمانی،''رسول مبین''، مقبول اکیڈمی لاہور، 1993ء، ص54

321۔ William Muir, sir, "The Life of Muhammad", London, 1870

322۔ منٹگمری واٹ،''محمد ایٹ مدینہ'' ایڈنبرا یونیورسٹی، پریس 1988ء، ص204,205

323۔ محمد کرم شاہ الازہری، پیر،''ضیاء النبی''، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، ج7، ص173,174

324۔ ایضاً، ص174,175

325۔ ایضاً

326۔ القرآن، یٰسین:6

327۔ القرآن، السجدہ:3

328۔ محمد کرم شاہ الازہری، پیر،''ضیاء النبی ﷺ، ج7، ص178

329۔ ایضاً، ص179

330۔ القرآن، النجم: 3,4

331۔ کرم شاہ الازہری، پیر،''ضیاء النبی ﷺ''، ج7، ص180

332. Chronicle of Sebeos, "Encyclopaedia of religion and ethics", vol-8, p872

333۔ ایڈورڈ گبن،''دی ڈیکلائین اینڈ فال آف رومن امپائر''، ڈینٹ اینڈ سنز لندن 1962ء، ج5، ص228

334۔ سید احمد خان، سر،''سیرت محمدی''، ص246، محمد احسان الحق سلیمانی،''رسول مبین''، ص107

335۔ ایضاً

336. ایضاً، ص246

337۔ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ،''سنن الترمذی''، دار الکتب العالمیہ، بیروت، 1988ء، ج5، ص544,545

338۔ کتاب پیدائش، باب 21، آیت 9,10

339۔ کتاب پیدائش، باب 16، آیت 1

340۔ ایضاً، آیت 5,6

341۔ ''کتاب پیدائش''، باب 25، آیت 12

342۔ ''سینٹ پال گلاتیوں کے نام خط''، باب 4، آیت 22

343۔ سلیمانی، احسان الحق،''رسول مبین''، ص97، بحوالہ تفسیر توراۃ از ربی شلومو اسحٰق

344۔ عبدالماجد دریا آبادی،''ہولی قرآن انگلش ٹرانسلیشن اینڈ کمنٹری''، تاج کمپنی کراچی 1971ء، ج1، ص21

345۔ ایضاً

346۔ سلیمانی محمد احسان الحق،''رسول مبین''، ص96

347۔ ایضاً

348۔ کتاب پیدائش، باب 29، آیت 24

349۔ ایضاً، آیت 29

350۔ کتاب پیدائش، باب 31، آیات 14، 15

351۔ سلیمانی، محمد احسان الحق، ''رسول مبین''، ص96

352۔ کتاب پیدائش، باب 21، آیات 10

353۔ سینٹ پال گلتیون، باب 4، آیت 23

354۔ ایضاً، آیت 23-26

355۔ کتاب پیدائش، باب 17، آیت 19

356۔ کتاب پیدائش، باب 16، آیت 11

357۔ کتاب پیدائش، باب 17، آیت 16

358۔ ایضاً، آیت 20

359۔ کتاب پیدائش، باب 26، آیت 24

360۔ کتاب پیدائش، باب 21، آیت 20

361۔ القرآن، الم نشرح: 4

362۔ ولیم میور اپنی کتاب ''محمد اینڈ اسلام''، لندن، ص5

363۔ منٹگمری واٹ، ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن 1961ء، ص8

364۔ ایضاً، ص9

365۔ ایضاً، ص200-201

366۔ ایضاً، ص38

367۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، ص57

368۔ گبن، ''دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر''، ص229

369۔ ولیم میور، ''محمد اینڈ اسلام''، ص89,90

370۔ کرم شاہ الازہری، پیر، ''ضیاء النبی ﷺ''، ج2، ص299,300، بحوالہ ابن ہشام ''السیرۃ النبویہ''، ج1، ص337,338

371۔ منٹگمری واٹ، ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، ص37,38

372۔ ٹامس راڈ راے، ''محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ''، ص75

373۔ منٹگمری واٹ، ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، ص36

374۔ ایضاً، ص56

375۔ ایضاً، ص35

376۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، ص10

377۔ ''سنن الترمذی''، کتاب المناقب، ج5، ص545

378. Cant Well Smith, "Islam in Modern History", Europe, 1955

379. Karl Marx, "Communist Manifesto, Germany, 1848

380. Reverend W. Montgomry Watt, "What is Islam", London, 1985

381. Ibid

382. Ibid

383. Rev. T.P. Hughes, "The Dictionary of Islam", London 1885

384. Philip K Hitti, "Islam and West", Prinston University, London, 1952

385. J.J. Saunder, "A History of Medieval Islam", London, 1965

386. Hamilton A.r Gibb, "Mohammadism Historical Survey", London, 1953

387. Samul Parsons, Scott, "History of the Mahometan Empire in Europe", London, 1877

388. Thoms, carlyle, "Hero's, Hero-worship and the Heroic in History", London 1843

389. Dante, Alighieri, "Divine Comedy", Italy, 1305

390. Hichem, D. Jaut, "History of Islam", London 1994

391. Sir Denison Rose, "Translation of the Holy Quran", London 1902

392. Antony Ashley Bevan, "Combridge Medeival History", London, 1892

393. Carmichael, "Shaping of Arabs", Oxford University, 2001

394. Watt Montgomry, "The Cure of Human Ills", London, 1957

395. Philip. K. Hitti, "Islam and the West", Europe 1958

396۔ ظفر علی قریشی، ''امہات المومنین اور مستشرقین''، ضیاء القرآن پبلشرز، 2010ء، ص 21

397. Rechard William Southern, "History of Islam", London, 1954

398. Robort Charles Zaehner, "At Sundry Times", 1956

399۔ ظفر علی قریشی، ''امہات المومنین اور مستشرقین''، ص 22,23

400. George Sale, "Translation of the Holy Quran", 1723

401۔ ظفر علی قریشی، ''امہات المومنین اور مستشرقین''، ص 24

402. William Muir, "The Life of Muhamamd", Aedimbra University, 1849

403. Carl Heinrich Becker, "Christianity and Islam", Berlen, 1913

404. Thoms Walker Arnold, "The Preaching of Islam", London, 1896

405. Prof. E.G Brown, "Literary History of Percia", Cambridge University, 1894

406. W. Montgomry Watt, "What is Islam", London, 1955

407. Ibid

408. Ibid

409. Genesis, "Bible", vol 4, p.19

410. John Davenport, "The Message of Quran", London, 1879

411. Philip Schaff, "History of Christian Chuch", london, 1982

412. Gustav Weil, "History of Islamic People", Frans, 1873

413. Will Durant, "The Age of Faith", Europe, 1844

414. Nobia Abbot, "Aisha the beloved of Muhammad", London, 1943

415۔ ظفر علی قریشی، ''امہات المومنین اور مستشرقین''، ص106

416۔ ایضاً، ص107

417۔ ایضاً، ص108

418۔ ایضاً، ص109,110

باب پنجم

مستشرقین کا سیرت رسول ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر نقطہ نظر اور برصغیر کے سیرت نگاروں کا اسلوب تنقید

باب پنجم

مستشرقین کا سیرت رسول ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر نقطہ نظر اور برصغیر کے سیرت نگاروں کا اسلوب تنقید

فصل پنجم: آپ ﷺ کی عام تعلیمات

فصل اول

نبی اکرم ﷺ کے اوصاف و کردار

اس سیاسی دور میں جب کہ ہر کام اور ہر عمل کی تہ میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے۔مشترقیات اور اسلامیات کے متعلق مستشرقین کی تحقیقات کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے مستشرقین نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ انہوں نے ساری ساری عمریں اسلامیات کی تحقیق میں صرف کردیں۔اور بڑی جانکاہ محنت اور جانی ومالی قربانی برداشت کر کے مسلمانوں کے علوم وفنون اور ان کی گذشتہ عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ان کی نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلایا اور بڑی مشقت اور بڑے اخراجات برداشت کر کے انہیں حاصل کیا۔اور نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ شائع کیا۔ان پر حواشی لکھے،ان کی شرحیں کیں،مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شائع کئے۔اسلامی موضوع پر نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کیں۔اور اسلامی علوم وفنون کی ہر شاخ پر نہایت وسیع لٹریچر فراہم کردیا جو مسلمانوں سے بھی ممکن نہ تھا۔

ان کی ان اسلامی خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔اور ان کی محنت وجانفشانی کی داد نہ دینا ظلم اور احسان فراموشی ہے۔لیکن اسی کے ساتھ جہاں تک مذہب اسلام کے متعلق ان کے افکار وخیالات اور تحقیقات کا تعلق ہے۔خالص اسلامی نقطہ نظر سے ان کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے۔اس لئے کہ اسلامی مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات میں انہوں نے اب تک نیک نیتی کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔یا تو وہ مشرقی روایات،مشرقی مذاق اور اسلامی ذوق ونظر سے بے گانہ ہونے کی وجہ سے اسلامیات کے سمجھنے اور اس کے پیش کرنے میں نہایت فاش غلطیاں کرتے ہیں۔یا عمادہ اسلام کو نہایت مسخ شدہ صورت میں پیش کرتے ہیں۔(1)

بہر حال جو صورت بھی ہو ان کی یہ غلطیاں علم وفن کی خدمت اور تحقیق وریسرچ کے پردہ میں ہوتی ہے۔یہ زمانہ ریسرچ اور تحقیق کا ہے۔اس لئے ان سے خود مسلمانوں اور غیر قوموں میں اسلام کے متعلق سخت گمراہیاں پھیلتی ہیں۔بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو یانانی فلسفہ،عجمی دہریت اور ہندی خرافات،کسی سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا ان محققین کی زہر آلود تحریروں سے پہنچتا ہے۔جس کے مظاہر آئے دن آج کل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نظر آتے ہیں۔اس لئے مذہب اسلام کے متعلق ان کی تحقیقات پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے۔

ہندوستان کی طرح مصر میں بھی مستشرقین کے بارے میں 2 متضاد رائیں ہیں۔ایک جماعت ان کی علمی شہرت سے مرعوب ہو کر ان کی ہر جنبش قلم کو بلا چون وچرا مان لیتی ہے۔اور دوسری جو ان کی زہر چکانیوں سے واقف ہے۔وہ ان کی تحریروں کو ناقدانہ نظرے سے دیکھتی ہے۔(2)

حال میں مصر کے 2 ممتاز اہل قلم ڈاکٹر حسین ہراوی اور ڈاکٹر ذکی مبارک نے علی الترتیب مستشرقین کی مخالفت اور موافقت میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ یوروپین زبانوں میں عام خاص تاریخوں اور مختلف قوموں اور ان کے علمی کارناموں پر نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔میں نے یہ کتابیں دیکھی ہیں۔ان میں دیکھنے والے کو ایک خالص بات نہایت نمایاں نظر آتی ہے۔کہ جب تک وہ قدیم وجدید تاریخ مثلاً مصر قدیم اور اس کے آثار اور عراق اور اس کی گذشتہ عظمت وغیرہ پر لکھتے ہیں اس وقت تک نہایت محققانہ لکھتے ہیں۔لیکن جب اسلامی مباحث یا رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم بہک جاتا ہے۔اور وہ نہایت لغو،مہمل،ذلیل،رکیک،بلکہ جھوٹ باتیں تک لکھ جاتے ہیں۔مثلاً ان کا قلم رسول اللہ ﷺ کی یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ نعوذباللہ وہ جنگی مذہب کے بانی تھے۔اور ان کو انسانی فضائل سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خرافات بک جاتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو لیجیے جہاں تک عام تاریخ اسلام کا تعلق ہے۔ اس میں تمام چھوٹے بڑے مسائل پر نہایت تاریخی استقصاء کے ساتھ بحث ہے۔ لیکن اسی محققانہ کتاب میں رسول ﷺ کے متعلق نہایت دل شکن اور تکلیف دہ باتیں درج ذیل ہیں، اس کی کیا تاویل کی جا سکتی ہے۔

''لجنۃ العمل الغربی'' کی تقریروں کے مجموعے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمیٹی سیاسی استعمار کا ایک دام ہے۔ جس کا کام مستشرقین کے ذریعہ سے شرق میں استعمار کی جڑیں مضبوط کرنا ہے۔ چنانچہ یہ کمیٹی شرق میں اسلام کے مقابلہ کے گر بتاتی ہے۔ اور مستشرقین ان پوشیدہ تقریروں کو جن میں اسلام کے مقابلہ کی صورتیں بتائی جاتی ہیں۔ غیر ملکوں میں اپنی حکومتوں کے پاس بھیجتے ہیں۔ چونکہ اسلام استعمار کے خلاف ایک زبردست تعلیم ہے۔ اس سے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے یہ چال چلی جاتی ہے۔ کہ شمالی افریقہ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں کی مادری زبان عربی ہے۔ عربی کی اہمیت گھٹا کر وہاں کے باشندوں کو مقامی زبانوں کے زندہ کرنے کے دام میں پھنسایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ان کی طرف توجہ ہو کر عربی زبان بھول جائیں اور قرآن کے سمجھنے والے باقی نہ رہیں۔ اس وقت ان کے خیالات اور رجحانات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ جیسا کہ آج کل ہندوستان میں ہو رہا ہے اور اس کے مذموم نتائج بھی نکل رہے ہیں۔ (3)

خود حضور علیہ السلام کی زندگی خواہشات نفس کی ضد ہے۔ ہوس اور خواہش نفس ناقابل تقسیم جذبہ ہے۔ نفس کو مال کی خواہش ہوتی ہے۔ عمدہ لباس کی خواہش ہوتی ہے۔ عمدہ مکان کی، عمدہ خوراک کی، مجالس میں عمدہ نشست کی بھی، دشمنوں سے انتقام کی بھی اور بیویوں کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ عمدہ سواروں، راحت و آرام اور مقام عزت کی خواہش ہوتی ہے۔

ان چیزوں پر اگر منصفانہ نگاہ ڈالی جائے تو عین اس وقت کہ آپ کو عرب کی دس لاکھ مربع میل کی سلطنت پر اقتدار حاصل تھا کسی وقت بھی آپ کے پاس مال نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ نے ایک درہم نہیں چھوڑا۔ ایک بار نماز سے فارغ ہو کر جلدی سے گھر میں تشریف لے گئے۔ صحابہؓ حیران تھے کہ کیا بات ہے۔ واپس آ کر آپ نے بتایا کہ گھر میں کچھ مال تھا، اس کو تقسیم کرنے کا حکم فرما آئے ہیں کیونکہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ موت آئے اور گھر میں مال موجود ہو۔ آپ کا لباس غریب عوام کی طرح تھا۔ اگر کسی وقت کوئی اچھی چادر یا کپڑا کسی نے پیش کیا اور کسی کو پسند آیا یا مانگا تو فوراً اتار کر دے دیا۔ مکان کیا تھا مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواروں پر کھجور کی شاخیں ڈال کر اس کے نیچے عمر بھر سوتے رہے۔ گھر میں چراغ تک نہ تھا۔ بارش میں چھپر کے اوپر ٹاٹ ڈالا جاتا تھا۔ مجالس میں آپ کی مخصوص نشست نہ تھی۔ عام آدمی جب باہر سے آتا تو پیغمبر اور ان کے جان نثاروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا۔ خوراک کا یہ عالم تھا کہ گھر کی واقف حال بیوی حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ تین تین ماہ تک اس شاہ دو جہاںؐ کے گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی۔ پانی اور چند دانے خرما پر گزارہ تھا۔ بعض اوقات بھوک سے بے تاب ہو کر پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے کہ بھوک کا احساس نہ ہو۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کے پورے کنبے کو دو دن مسلسل کبھی پیٹ بھر کر جو کی روٹی میسر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ وصال فرما گئے۔ دشمنوں سے انتقام کا یہ حال تھا کہ اہل مکہ جیسے بدترین دشمنوں کے تیرہ سال کے مظالم سے تنگ آ کر آپ نے مکہ جیسے مقدس وطن کو چھوڑا تھا، فتح مکہ کے موقع پر وہ پابہ زنجیر قیدیوں کی صورت میں جب آپ کے سامنے پیش کیے گئے تو آپ نے فرمایا تم سب آزاد ہو۔ اور میں تم کو ملامت تک بھی نہیں کرتا کیا اس سے بڑھ کر نفس کشی اور خواہش کو پامال کرنے کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ سواری کا یہ حال تھا کہ جب اونٹ کم ہوتے تھے اور دو دو تین تین باری باری سے ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو آپ بھی خود اس میں شامل ہوتے تھے۔ جب آپ کی نوبت میں رفیق سواری عرض کرتا کہ آپ سوار ہو جائیں میں آپ کے بدلے میں پیدل چلوں گا، تو آپ یہ فرما کر سواری سے اتر کر پیادہ چلتے کہ تم مجھ سے قوی نہیں اور میں تم سے اجر و ثواب کی خواہش کم نہیں رکھتا۔ راحت طلبی نہ تھی۔ چنانچہ یہ حال تھا کہ اکثر اوقات مشغولیت کے باوجود مکان پر دربان نہ تھا۔ ہر وقت ہر کوئی مل سکتا تھا۔ دن کو اکثر روزے، رات کو خدا کی عبادت، فوجی سپہ سالار بھی خود، چیف جسٹس بھی خود، معلم اور استاد بھی خود، عزت اور وقار پرستی نہ تھی۔ چنانچہ یہ کیفیت تھی کہ صحابہؓ کے ہمراہ جب چلتے تھے تو سب سے پیچھے چلتے تھے اور جب مجلس میں آتے تھے تو کوئی صحابی تعظیم کے لئے

نہیں اٹھتا تھا، کیونکہ آپ نے منع فرمایا تھا کہ میرے لئے کوئی کھڑا نہ ہو، لہٰذا جان نثار صحابہؓ تعمیل حکم سے مجبور تھے۔ یہ سب امور ایسے ہیں کہ جس ذات میں رائی کے دانے کے برابر خواہش نفس ہو وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا۔(4)

مستشرقین کی فتنہ انگیزی:

مشرق والوں کو مستشرقین سے کسی خیر خواہی اور ہمدردی کی توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ سانچے ہی مشرق کے مفاد کے خلاف ہیں جن میں مستشرقین ڈھالے جاتے ہیں۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں خاص اغراض و مقاصد کے ماتحت طلبہ کو مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں جو طلبہ پڑھتے ہیں انہیں مشرق سے نہ کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے اور نہ مشرقی زبانوں سے کوئی محبت اور انسیت ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اجنبی طلبہ ہوتے ہیں جنہیں استعماری مشین چلانے کے لئے ان ہی اصولوں پر ڈھالا جاتا ہے جن سے وہ استعماری مشین کا پرزہ بن سکیں۔ اور اس کا خاص اہتمام رکھا جاتا ہے کہ ان کی قومی عصبیت ضائع نہ ہونے پائے تاکہ وہ مشرق میں جا کر مشرق یا اسلام کی طرف مائل نہ ہوسکیں۔ ایسی صورت میں ان سے جن میں بعض آگے چل کر مستشرقین کے زمرہ میں آجاتے ہیں یا ان کے اساتذہ سے جو بڑے بڑے مستشرقین ہوتے ہیں مشرق یا اسلام کے ساتھ انصاف کو توقع رکھنا بے کار ہے۔ مستشرقین خواہ یونیورسٹی کے احاطہ میں استاذ کے لباس میں ہوں یا با ہر مصنف کی شکل میں اپنے اصل مقصد کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکتے ہے۔

مستشرقین نے اسلام کے خلاف زہر پھیلانے کے لئے یہ عجیب فریب دہ طریقہ نکالا ہے کہ جب تک وہ اسلامی تاریخ پر بحث کریں گے اس وقت تک خالص مورخ رہیں گے۔ لیکن جب رسول ﷺ کی سیرت، مذہب اسلام یا قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمیشہ مخالفانہ لکھیں گے کہ دوسرے اس کو پڑھ کر اسلام سے خوفزدہ ہوں۔(5)

اب ہم ان کے سیرت نبوی پر بعض اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

نام حسب ونسب:

دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی و عربی میں بالخصوص مستشرقین کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت و حقیقت اپنے اور پرائے سب پر کھلتی جا رہی ہے، بلکہ پچھلے دو ایک عشروں میں تو انگریزی زبان میں بعض کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات دنیا کے ہر حصہ میں بہت کچھ بدل رہے ہیں۔ علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں اور بوڑھوں کے مقابلہ میں نوجوان نسل فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جا رہی ہے۔ انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالہ سے بعض اہم کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں مثلاً:

1۔ العقیقی، نجیب، المستشرقون، دار المعارف، مصر 64,65 (ج 1 تا 3)
2۔ احمد ابراہیم خلیل، المستشرقون والمبشرون فی العالم الاسلامی، قاہرہ 64
3۔ زکریا، ہاشم زکریا، المستشرقون والاسلام، لجنۃ التعریف بالاسلام، مصر 65
4۔ الہرادی، حسین، المستشرقون والاسلام، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ 65
5۔ البہی، محمد والمستشرقون فی موقفھم عن الاسلام، الازہر، طبع جدید
6۔ الدسوقی، محمد الاسلام والمستشرقون، قاہرہ 72
7۔ شبلی، عبد الجلیل، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ 77
8۔ صبرہ، دکتورہ عفاف، المستشرقون ومشکلات الحضارۃ، دار النہضۃ العربیہ قاہرہ 80

ان میں سے اول الذکر کتاب اہم کتاب اور مفصل ترین ہے۔ جو سر نامہ کے عین مطابق اس موضوع پر واقعی ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوری کتاب تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ (تقریباً 1200 صفحات) مصنف نے بڑی جامعیت کے ساتھ دنیائے مغرب کے تمام اہم علاقوں (فرانس، اٹلی، برطانیہ، اندلس، پرتگال، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سوئزرلینڈ، سویڈن، روس، امریکہ وغیرہ) کے تمام قابل ذکر مستشرقین (اگرچہ بعض کا ذکر چھوٹ گیا ہے مثلاً فان کریمر وغیرہ) کے حوال و آثار کو جمع کر دیا ہے۔ (6)

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا آغاز سر سید احمد خاں 1898ء اور ان کے رفقاء سے ہوا۔ اسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعہ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سر سید احمد خاں نے ہی کھولا، اور اس حقیقت کے باوجود کہ سر سید کے دینی افکار میں تجدد کا رنگ غالب تھا اور راسخ العقیدہ علماء کو ان سے حد درجہ اختلاف تھا اور سر سید نے جذبہ ایمانی اور خالص جرأت رندانہ سے کام لے کر اپنے ہم عصر مستشرق سر ولیم میور کی دل آزار تصنیف دی لائف آف محمد ﷺ (حیات محمدؐ) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا، اور ذرائع کی کمی کے باوجود، اہانت رسول ﷺ کا خاموشی بدلہ لینے کے لئے اپنا تن من دھن سب لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے، مناظرانہ رنگ سے پاک، تاریخی حقائق واسناد پر مبنی ایک جوابی کتاب ''الخطبات الاحمدیہ''فی العرب و السیرۃ المحمدیہ '' لکھی اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ یہ بڑا اہم دور تھا، یہی وہ زمانہ تھا جب مستشرقین یورپ فی الواقع سیرت رسول ﷺ کے اصل عربی مآخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے، اور پھر ان ہی کی منظم کوششوں سے بہت سے مآخذ زیور طبع سے آراستہ ہو کر مسلمانوں تک پہنچے، اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر ﷺ اسلام پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور ناقابل اعتبار روایتوں کی بطور سلاح استعمال کیا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے سیرت رسولؐ اعتبار اٹھ جائے اور پھر اس کے نتیجے میں آپ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے۔ (7)

ابتدائی جائزہ:

سر سید کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی تحرک کا آغاز ہوا تھا اسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی۔ اس سلسلہ میں اگرچہ مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا اور سیرت پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن جو شہرت اور بقائے دوام علامہ شبلی 1914ء کو حاصل ہوئی، وہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ علامہ شبلی کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انہوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی کوششوں کو ہی نشانۂ تنقید بنایا بلکہ انہوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرت رسول ﷺ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تحریک استشراق کے جواب میں علمی و تحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکتے تو سیرۃ النبی ﷺ مستشرقین کے اعتراضات و مطاعن کا بھی یادگار جواب بن جاتی، بہر حال مطبوعہ سیرۃ النبی ﷺ کے آغاز میں ہی اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی نے یورپین تصنیفات کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات ان کے اسباب و محرکات، ان کے اصول مشترکہ اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا اور پھر مشہور مستشرقین مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شامل کتاب کر دی، یہ تمام کام اپنے ابتدائی درجہ میں تنقیح طلب ہونے کے باوجود نہایت دقیع ہیں۔ (8)

علاوہ ازیں، علامہ شبلی چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبی ﷺ کو دراصل ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو معیار تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیر بحث لاتے، بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالہ سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقب تو گویا انتہائے مقصود تھا، اور ان کی زندگی کی آخری خواہش تھی غالباً اسی لئے انہوں نے سیرۃ النبی ﷺ کے مجوزہ خاکہ میں پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا جو کہ اگرچہ پورا نہ ہو سکا تاہم آنے والوں کے لئے روشنی چھوڑ گیا اور ثبوت کر گیا کہ خود مولانا شبلی مسئلہ مستشرقین کی گہرائی اور گیرائی کا بے حد غایت ادراک رکھتے تھے۔

افسوس کہ علامہ شبلیؒ کے بعد مستشرقین کے حوالہ سے سیرت رسول ﷺ کے مطالعہ وتحقیق کا کوئی بڑا اور منظم کام سامنے نہیں آیا اور نہ ہمارے ہاں کے سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی اہمیت دی، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکا دکا انفرادی واجتماعی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی مقالات ومضامین اور کتابچوں میں اس جانب کچھ نہ کچھ پیش رفت بہر حال ہو رہی ہے۔ مثلاً ایک مسلمان مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب ''حیات محمدؐ'' کا تذکرہ بے محل نہیں معلوم ہوتا، جو اگر چہ عربی میں ہے لیکن اردو ترجمہ کے بعد گویا وہ اردو ادب کا ہی سرمایہ بن گئی ہے۔ ہیکل نے اپنے بیان کے مطابق نہ صرف یہ کہ ''جامدین عن المسلمین'' کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت انداز سے جواب دینے کے لئے بھی کتاب لکھی۔ ہیکل نے متن کتاب کے علاوہ اپنے طویل مقدمہ میں اور پھر بعد میں ''المستشرقون والحضارۃ الاسلامیۃ'' کے تحت مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اوران کے علم وتحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے اور مختلف عنوانات (مثلاً اسلام اور مسیحیت کی کشمکش، مسیحی مصنفین کی نظر میں آنحضرت ﷺ کا مقام، مسلمان مصنفین اور مغربی افتراپرداز مستشرقین وغیرہ) کے تحت اصل حقائق کو نمایاں کیا ہے اور جرأت وقوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔

سرسید احمد خاں اور مستشرقین:

1857ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے برسراقتدار ہوتے ہی عیسائی مشنریوں نے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کر دیا، تو ان کے مقابلہ میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بحث ومناظرہ اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دیں، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود تو ردعیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہ تھا، ان عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پیہم حملے کر کے یورپ میں اور پھر ہندوستان میں بھی اسلام کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، دوسری جانب یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے اسرار کے انکشاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں، جن کو جدید اسلوب میں دور کرنے کی ضرورت تھی، مستشرقین بھی علمی انداز میں اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے، ان الجھنوں کو دور کرنے اور مستشرقین کے اعتراضوں کا جواب دینے کے لئے جو لوگ ہندوستان میں آگے بڑھے ان میں سرسید احمد خاں مرحوم پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے زمانہ میں سرولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی تو یہ دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عیسائی مشنریوں کی مدد کے لئے تیار کی گئی تھی، چنانچہ سرولیم میور لکھتے ہیں کہ:

''پادری فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے مباحثہ میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی، اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبرؐ کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لئے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں''۔(9)

سرولیم میور اضلاع شمال مغرب (یوپی) کے لفٹنٹ گورنر تھے، جب کہ سرسید احمد خاں بنارس میں منصفی (جج اسمال کاز کورٹ) کے منصب پر تھے، سرولیم میور اور دوسرے انگریز افسروں سے دوستانہ مراسم کے علاوہ وہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ چکے تھے، جس سے وہ بدنام ہوئے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں، انہوں نے ''احکام طعام اہل کتاب'' لکھی، جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی روابط استوار کرنے کی ترغیب دی، اس لئے وہ ''کرسٹان'' سمجھے جانے لگے تھے، اور علماء کا ایک گروہ ان سے بہت بدظن ہو چکا تھا، لیکن سرولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' شائع ہوئی تو ان کی حمیت اسلامی بھڑک اٹھی، اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی سرولیم میور کو بری، بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں، تو اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے وہ بے چین

ہو گئے، وہ اکثر کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ "اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں"۔ (10)

1857ء میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہو چکے تھے، اور سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لئے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ یہاں دستیاب نہ تھیں، اس لئے سر سید کو ولایت جانے کا خیال ہوا، چنانچہ وہ بعض سرکاری عہدیداروں کے منع کرنے کے باوجود یورپ گئے، اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال دیا، برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کی پرواہ نہیں کی، سیاسی مصلحتوں کو نظر انداز کیا، ان کے لڑکے سید محمود لندن تعلیم کے لئے بھیجے جانے والے تھے، ان کے سرکاری وظیفہ کا مسئلہ درپیش تھا، اس کا بھی خیال نہیں کیا، اور وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لئے لندن پہنچ گئے، انڈیا آفس کے کتب خانہ اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے استفادہ کے علاوہ سیر و تاریخ کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپتی تھیں، وہاں سے منگوائیں، اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں، بہت گراں قدر قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ ایسیز (Essays) یعنی خطبے لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے، اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شائع کیا۔ (11)

اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں اپنے جذبات اور مالی مشکلات کے بارے میں انگلستان سے مولوی مہدی علی خاں یعنی محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے، ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر اور بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں"۔ (12)

ایک اور خط میں یہ لکھتے ہیں کہ "مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا، ملنا جلنا سب بند ہے، آپ اس خط کے پہنچنے پر کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپے قرض لیجئے ہزار روپے بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے، اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے، خدا مدد کرے"۔

ایک اور خط میں یہ لکھا ہے کہ میں شب و روز تحریر کتاب میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئے گا"۔ (13)

خطبات احمدیہ کی جلد اول تمام ہوئی تو اس کی طباعت میں چار ہزار کے قریب لاگت آئی، کچھ روپے ان کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے روانہ کیے، اور کچھ انہوں نے دوسروں سے قرض لیے، یہاں تک کہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے پاس زاد راہ کے لئے کچھ نہ تھا، اور وہ نہایت پریشان تھے، اسی عرصہ میں ان کی صاحبزادی یعنی ہمشیرہ حامد و محمود کا انتقال ہو گیا، کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اخراجات نے اور زیادہ فکرمند بنا رکھا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا والعیاذ کربلا سے کم نہ تھا۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر (14)

وہ اس کتاب کی تالیف کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے، حصۂ اول کی تکمیل پر ایک خط میں اپنی کتاب کی غرض و غایت اس طرح بیان کرتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سرولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں، اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں''۔(15)

رد اعتراضات مستشرقین بحوالہ خطبات احمدیہ:

لاہور ڈیوٹی کالج کے پرنسپل ریورنڈ ہوپر نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ کہا کہ:

''ہمارے نزدیک جو کام سرسید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے، وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں، تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جا کر انہی کی زبان میں وعظ کہتے، اور ان ہی کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برسوں میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو''۔(16)

اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناظرہ کے مخاصمانہ طریق کے بجائے دوستانہ اور غیر متعصبانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مخاطب کو خاموش کرنے کے لئے الزامی جواب دینے کے بجائے اس کو مطمئن کرنے کی راہ اپنائی گئی ہے، اور تحقیقی جوابات دیئے گئے ہیں، چنانچہ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کے اس امتیاز کا اعتراف کیا ہے، ان کے خیال میں اس کتاب سے ''مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب'' ظاہر ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

''جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہئے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں، دین محمدی انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول دین ہے، اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے، لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے، ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنی دلی دوست سرولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کی تحریروں کی مخالفت کی ہے، اور خوب چٹکیاں لی ہیں، اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سرولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے''۔(17)

سرولیم میور سے پہلے مستشرقین، اسلام کے روحانی اور الہامی پہلو پر اپنا زور تحقیق صرف کر رہے تھے، لیکن اس نے تاریخی شہادتوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات، جدید دور کی شائستگی، تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف ہیں، اس نے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا، (خطبات احمدیہ، ص 237) یہ نکتہ چینی کا ایک نیا طریقہ تھا، جس میں غیر مستند روایتوں، کمزور تاریخی داستانوں اور رطب ویابس واقعات سے جن کے بیان کرنے والے خواہ کم رتبہ اور غیر معتبر ہوں مدد لی گئی تھی، سرسید مرحوم نے دو طویل خطبوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں اور ان کی روایتوں کی تفصیل بیان کی ہے، روایات کی تنقید کے جو اصول وقواعد محدثین نے مقرر کئے ہیں، اور جو معیار انہوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے، ان کی تشریح کی ہے، جس سے سرولیم میور کے استدلال کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات میں مانع ہو، اور مسلمانوں کے اعمال وکردار جن کے نتائج وہ آج بھگت رہے ہیں ان کے جواب دہ خود مسلمان ہیں نہ کہ اسلام، انہوں نے سرولیم میور کے مغالطوں کا نہایت معقول دلائل اور دلنشیں پیرائے میں جواب دیا ہے۔(18)

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کی سادگی، عام فہم انداز بیان اور منصفانہ طریق استدلال ہے، وہ اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے اپنی

شرافت، نرم خوئی اور ہمدردانہ لب ولہجہ کو برقرار رکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ ہی میں چند مستشرقین کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''(میں) ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مورخوں کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جنہوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت ﷺ کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے، بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں انہوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کیے ہیں، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے''۔(19)

انہوں نے اپنی کتاب میں مختلف موقعوں پر مستشرقین کے اقوال بھی اسلام کی حمایت میں نقل کئے ہیں۔

خطبات احمدیہ کی ایک اور خصوصیت جس کا مولانا الطاف حسین حالی نے بھی حیات جاوید ص 167 میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان خطبات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے، سوائے دو ایک مسئلوں کے جہاں بعض محققین نے بھی وہی لکھا ہے، جس کو سرسید احمد خاں نے ترجیح دی ہے، مثلاً معراج کے واقعہ کو جیسا کہ بعض صحابہ کا مسلک ہے، انہوں نے رویا پر محمول کیا ہے اور شق صدر اور براق کی سواری کو بھی اسی رویا میں داخل کیا ہے یا ایک آدھ بات اور، ورنہ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ تک سرسید مرحوم نے وہ بحثیں نہ کی تھیں جو ان کی تفسیر القرآن میں ملتی ہیں، اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مذہبی خیالات پر اعتراضات کئے گئے، خطبات احمدیہ میں انہوں نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علماء ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی اور اس نے اگر ایک طرف مستشرقین کے گروہ کو اور صاف ذہن عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ اور مطمئن کیا، تو دوسری طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے بارہ میں مختلف غلط فہمیوں کے دور کرنے میں مدد دی۔

حضور ﷺ کا نسل اسماعیل سے نہ ہونا:

مؤرخین نے نسلی اعتبار سے عرب اقوام کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

1۔ عرب بائدہ: یعنی وہ قدیم عرب قبائل اور قومیں جو بالکل ناپید ہو گئیں، مثلاً عاد، ثمود، طسم، جدیس، عمالقہ۔

2۔ عرب عاربہ: وہ عرب قبائل جو یعرب بن یشجب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔ انہیں قحطانی عرب کہا جاتا ہے۔

3۔ عرب مستعربہ: وہ عرب قبائل جو حضرت اسماعیل کی نسل سے ہیں انہیں عدنانی عرب کہتے ہیں۔ قریش اس عربی نسل کا نمایاں اور ممتاز قبیلہ تھا جس کی ایک معزز شاخ بنو ہاشم تھی۔(20)

سارے عرب قبائل قریش کا احترام کرتے تھے۔ اس احترام کی وجہ یہ تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور کسی کو قریش کے نسل اسماعیل میں سے ہونے کے بارے میں شک نہ تھا۔

تاہم مستشرقین میں سے ولیم میور نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا کہ آنحضور ﷺ خاندان اسماعیل سے نہ تھے۔ حضور ﷺ کو نسبی وجاہت اور خاندانی عظمت کی آرزو پیدا ہوئی تو آپ نے اپنے سلسلہ نسب کو ابراہیم کے ساتھ جوڑنے کی تدبیریں کیں۔

اس مفروضے کو واٹ نے زیادہ زور سے اچھالا ہے۔ اس کا ایک طویل اقتباس پیش خدمت ہے تاکہ سمجھا جائے کہ مستشرقین کس طرح کس بے بنیاد بات کو ثابت کرنے کے لئے افسانے تراشتے ہیں۔

"Abraham is simply one of many Prophets, and the people to whom he is sent are not specified; indeed, it seems to be implied that he was not sent to the Arabs, since Muhammad (SAW) is said

to be sent to a people who had never had a warner. Likewise there is no mention of any connexion of Abraham and Ishmael with the Ka'bah. Ishmael is named in lists of Prphets, but no details are given about him. The presumption is that at first the Muslims did not know about the connexion of Ishmael with Abraham and (according to the Old Testament) with the Arabs. At Medina, however, in closer contact with the Jews they gained knowledge of such matte".(21)

''حضرت ابراہیم کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ بہت سے پیغمبروں میں سے ایک ہیں اور جس قوم کی طرف آپ مبعوث ہوئے تھے اس کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے کیونکہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے جس کے پاس پہلے کبھی کوئی نبی نہیں آیا تھا، اسی طرح ابراہیمؑ واسماعیل کے کعبے کے ساتھ تعلق کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ خیال یہ ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کو علم نہ تھا کہ حضرت اسماعیلؑ کا حضرت ابراہیمؑ سے تعلق کیا ہے اور وہ اس بات کو بھی نہیں جانتے تھے کہ حضرت اسماعیلؑ کا عربوں سے کیا تعلق ہے۔ مدینے میں یہودیوں کے ساتھ رابطے کی وجہ سے ان کو ان چیزوں کا علم ہوا''۔

منٹ گمری یہ کہنا چاہتا ہے کہ عربوں کو اپنے حافظے پر ناز تھا۔ اپنے نسب نامے یاد کرنا اور انہیں فخر سے پیش کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اگر وہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہوتے تو لازماً یہ بات ان کی قومی روایات میں ہوتی۔ ان کی روایات میں ابراہیم واسماعیلؑ کا ذکر نہ ہونا اور مکی سورتوں میں بھی اس تعلق کا موجود نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کے پاس ان ہستیوں کے ساتھ اپنے تعلق کو ثابت کرنے کا کوئی ثبوت نہیں، کیونکہ انہوں نے یہ باتیں یہودیوں سے سیکھی ہیں اور یہودیوں اور ان کی کتابوں کو مسلمان قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

ہم واٹ کے اس اعتراض کا جواب بجائے مسلمانوں کی کتابوں کے ایک مستشرق کے حوالے سے دیتے ہیں: انسائیکلو پیڈیا آف ایتھکس اینڈ ریلیجن (Encyclopaedia of Ethics and Religion) کا مقالہ نگار Chronicle of Sebeos کے حوالے سے لکھتا ہے:

"He was an Ishmaelite, who taught his countrymen to return to the religion of Abraham and claim the Promise made to the descendants of Ishmael". (22)

''حضرت محمد ﷺ ایک اسماعیلی تھے۔ جنہوں نے اپنے ہم وطن لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ دین ابراہیمی کی طرف رجوع کریں اور ان خدائی وعدوں سے بہرہ یاب ہوں جو نسل اسماعیل سے کئے گئے ہیں''۔

منٹ گمری واٹ نے حضور ﷺ کے اسماعیلی النسل ہونے کی حقیقت کو مشکوک کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ عربی روایتوں کے خلاف ہے بلکہ خود مغربی مؤرخین کی تحقیقات کے خلاف ہے۔ مستشرقین حضور ﷺ کے اس ارشاد کو جھٹلا نہیں سکتے۔ السنن الترمذی میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

واثلہ بن اسقع بیان کرتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ ان الله اصطفى من ولد ابراهيم اسماعيل واصطفى كنانة من بنی اسماعيل

واصطفی من بنی کنانۃ قریشاً واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم (23)

''حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اولادِ ابراہیم سے اسماعیل کو چنا، اولادِ اسماعیل سے کنانہ کو چنا، بنی کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم سے مجھے چنا''۔

مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات:

سرسید مرحوم نے مستشرقین کے اعتراضات کے جو جوابات دیئے ہیں ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوشش خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہیں، انہوں نے اپنی اس کتاب میں سر ولیم میور کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے خیالات کا بھی جا بجا تجزیہ کیا ہے، مستشرقین نے سب سے پہلے تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے رسول اکرم ﷺ کی نسبی وابستگی کا انکار کیا ہے، وہ مکہ میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت سے انکار کرتے ہیں، قیدار کی عدنان سے اور عدنان کی حضرت اسماعیلؑ سے نسبت خاندانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے، اور اس بارے میں عربوں کی علم الانساب میں مہارت اور واقفیت کو مشکوک قرار دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تورات میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں، ان سے رسول اکرم ﷺ کی شخصیت مراد نہیں ہے۔ سرسید مرحوم نے بائبل کے فارسی ترجمہ سے تورات کی پیشین گوئی نقل کی ہے لیکن ہم یہاں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ 1958ء سے اردو ترجمہ درج کرتے ہیں:

''اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی، اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے، تو اس کی بات مان کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے، تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا، سو وہ چلی گئی، اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی، اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا، تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا، اور آپ اس کے مقابل پر ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی، اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی، اور چلا چلا کر رونے لگی، اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی، اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے، اس کی آواز سن لی ہے، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا، اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑا ہوا، اور بیابان میں رہنے لگا، اور تیر انداز بنا، اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی۔ (24)

مذکورہ بالا پیشین گوئی واضح طور رسول اللہ ﷺ کی خبر دے رہی ہے، اسی لئے سر ولیم میور اور بعض مستشرقین نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی ہے، اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے نہ تھے، حضرت اسماعیلؑ یا ان کی اولاد مکہ میں آباد نہیں ہوئی اور فاران سے حجاز کی وادی یا مکہ کو مراد لینا درست نہیں۔

فاران:

سرسید مرحوم نے سر ولیم میور کو جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ:

''عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے 1851ء میں بمقام لگڈنی بٹاورم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور

حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے، اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے۔ وروہ عبارت یہ ہے:

وسکن في برية فران (الحجاز) واخذت له امه امرأة من ارض مصر (عربی ترجمه توراة سامری)(25)

اس کے بعد وہ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ ''عموماً عیسائی مورخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد ہے تسلیم نہیں کرتے، اس کے تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو اس بات کو تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے بلاشبہ اس سے محمد رسول اللہ ﷺ کا نبی ہونا مراد ہے''۔ (26)

فاران سے ایک قول کے مطابق وہ وسیع قطعۂ زمین مراد ہے، جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے، اور فاران کے نام سے مشہور ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں: شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور شرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے، اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علیحدہ علیحدہ ناموں سے معروف ہیں مثلاً شور، بیرشبع، ایثام، سین، زین، عیدام وغیرہ لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں:

''اس بیان کی تردید کے لئے اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دیں، کیونکہ ان سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے، اور گردونواح کے بیابان اس میں شامل نہیں''۔

(الف) تب بنی اسرائیل دشت سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا۔ (27) (گنتی باب 10 درس 12) اس عبارت سے جن کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا، اور بیابان فاران میں مقام کیا قرار واقعی ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیحدہ اور جداگانہ بیابان تھے۔

(ب) اور چودھویں برس کدرلاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائیم کو عستارات قرنیم میں اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ سعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے۔ (28) پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے اس درس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔ (29)

مزید وضاحت کے لئے وہ توراۃ سے درج ذیل اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں:

(ج) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں، ان کے باپ دادا کے ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جوان کے ہاں کا رئیس ہو۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران سے ایسے آدمی روانہ کئے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (30)

(د) اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی اور اس ملک کا پھل ان کو دکھایا۔ (31)

(ہ) اور اس نے کہا، خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں (فارسی ترجمہ: باہزار ہزاراں) قدسیوں میں سے آیا اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔ (32)

(و) خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے۔ سلاہ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ (33)

(ز) اور وہ مدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لے کر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے۔ (34)

فاران کے بارے میں بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ تا دلیش جہاں کہ حضرت ابراہیم نے ایک کنواں بیر شبع کھودا تھا اور فاران ایک ہی جگہ ہے، سرسید مرحوم نے اس قول کی تردید میں گنتی باب 13 درس 26 (35) کے علاوہ تورات کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے:

''اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے، پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی

تا درس پہنچے اور حمایتوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے مارا''۔ (36)

وہ لکھتے ہیں کہ (مذکورۂ بالا اقتباس میں) جب تک قادیش اور فاران دو جدا گانہ اور مختلف بیابان قرار دیئے جائیں درس مذکورۂ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ (37)

فاران کے بارے میں تیسری بات مسٹر روپر وغیرہ کی بیان کردہ یہ ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے، کہ حضرت اسماعیل صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آ کر ٹھہرے تھے، اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسماعیل متوطن ہوئے تھے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسماعیل وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر تکوین (پیدائش) میں آیا ہے۔ سرسید مرحوم نے مذکورۂ بالا رائے کی بھی تردید کی ہے، اور لکھا ہے کہ ''کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت اسماعیل نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی، ریورنڈ مسٹر فارسٹر جو اس مقام کو حضرت اسماعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں، اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں، مصنف موصوف نے سفر تکوین (پیدائش) باب 25 درس 18 پر جس کی یہ عبارت ہے ''اور اس کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی''۔ سے استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ ''خدائے تعالیٰ کے وعدے ہی میں ایفا ہو گئے تھے، جبکہ اسماعیلیوں کی آبادی سور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں سرحد مصر سے لے کر دہانہائے فرات تک پھیل گئی تھی''۔ اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانہائے فرات پر قرار دیا ہے، اصل حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب 10 درس 29 میں مذکور ہے، نواح یمن میں عرض بلد شمالی 17 اور یہ 30 دقیقہ اور طول بلد شرقی 42 درجہ 36 دقیقہ پر واقع ہے، اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنے سے ہو سکتی ہے جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے، واکر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے، اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے، جن کا نقشہ رورنڈ کارٹ پی کیرے ایم، اے نے مرتب کیا ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید میں ''شور'' کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے، جہاں صحرائے ایثام واقع ہے اور یہ قطعی غلطی ہے، کیونکہ صحرائے ''شور'' سے توریت مقدس میں مراد وہ وسیع میدان ہے، جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے''۔

اس کے بعد وہ اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:

''اصل عربی توریت میں صرف دو نام ہیں شور اور اشورہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں، ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسیریا ہے، اس سے واضح ہے کہ بنی اسماعیل اس وسیع قطع میں آباد ہوئے تھے، جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے، یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے، اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے، اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی جانب عزیمت کرے، اور توریت مقدس کی اس آیت کی کما حقہ تصدیق ہوتی ہے، جہاں لکھا ہے جو کہ سامنے مصر کے ہی اگر تو اسیریا کی طرف روانہ ہو''۔ یعنی مصر کے سامنے ہے، اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسیریا تک کھینچو۔ (38)

انہوں نے کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع فاران کے بارے میں تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ کی کتب خمسہ میں ان کا کچھ بھی ذکر نہیں۔ سینا سے بنی اسرائیل کا سفر مشرق کی جانب تھا، جس میں انہوں نے پہلی منزل تبعیرہ (گنتی باب 11 درس 3) میں کی، پھر قبروت ہتاواہ آئے، اور وہاں سے حصروث پہنچے (39) (گنتی باب 11 درس 35, 34) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے (باب 12 درس 16) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے، اس لئے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰ ؑ کا

سفر شمالی اور مشرقی سمت میں تھا، یعنی تادیش کی طرف (باب 13 درس 26) اس لئے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰ ؑ نے کیا ہے، سینا کے مغربی جانب نہیں ہوسکتا، بنی اسرائیل کی صحرانوردی کے عیسائی علماء نے پانچ مختلف راستے بتائے ہیں، جن کے اختلاف کی صورت میں:

''اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا ہے جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں، بلکہ مشرقی مورخ بھی اسی کے مؤید ہیں، تب حضرت موسیٰ ؑ کے کوچ کے تمام بیان کی تطبیق ہو جاتی ہے اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے''۔ (40)

توریت (پیدائش باب 21 درس 14,15) سے یہ بات سمجھنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ہاجرہؑ بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں، اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو دیا تھا، ان کے پاس تھا، اور وہی ختم ہوگیا تھا، سرسید مرحوم کے نزدیک دو وجہ سے اس درس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں، اول اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیمؑ نے تادیش کے نزدیک کھودا تھا، اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصہ دراز تک رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنوؤں کا ہونا، حضرت ہاجرہؑ سے پوشیدہ نہ تھا، دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا، کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے بنائے ہوئے کنویں نہیں تھے، بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کیے ہوئے بھی موجود تھے۔ (41)

سرسید مرحوم کے نزدیک اس عبارت کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ:

''مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہؑ بیابان بیر شبع میں پھرتی رہیں، مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا، کیونکہ بیر شبع کے اردگرد قومیں لڑاکا اور جھگڑالو تھیں اس لئے حضرت ہاجرہؑ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا، جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی پینے کی مشکل پیش آئی ہوگی، کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت نایاب تھا جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے، تو ان کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا خانہ بدوش عرب پانی کے چشمے کو چھپا دیتے تھے جس وقت حضرت ہاجرہؑ مضطریانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا، توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، جہاں لکھا ہے،

''پھر خدا نے اس کی آنکھیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا''۔ (42)

بہرحال حضرت ہاجرہؑ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا، رہنا شروع کیا'' جب اور لوگوں کو اس چشمے کی خبر ہوئی تو بنو جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قرب وجوار میں آکر آباد ہوئے''۔ (43)

سرسید مرحوم، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی اولاد اور اولاد کی مختلف نسلوں اور ان کی متعدد شاخوں سے بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ تمام تلاش وتفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی، اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار یمن (حویلاہ) سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں، اور اس طرح پر حضرت موسیٰ ؑ کی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو سفر تکوین باب 25 درس 18 میں مندرج ہے کہ ''وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے جو سامنے مصر کے ہے جب تو اسیریا کو روانہ ہو''۔ (44)

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ:

تورات کتاب پیدائش باب 21 آیت 10 میں ہے ''تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے، کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا''۔ کئی مستشرقین نے حضرت اسماعیلؑ کے نسب نامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ ظاہر ہے، اور یہودی بھی حضرت اسماعیلؑ کی والدہ کو لونڈی کہتے تھے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسماعیلؑ کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں، اور ضد وعداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسماعیل، بنی اسرائیل کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جائیں، منسوب کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہؑ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے، جو سراپا غلط اور

تحریف کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس بحث کا نسب نامۂ نبوی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لئے سرسید مرحوم نے مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کی تحقیقات پر مشتمل ایک نفیس بحث بھی درج کتاب کی ہے چند اہم نکات یہ ہیں:

1۔ انہوں نے سفر اشعیا سے جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے یہ نقل کیا ہے کہ بابل کا ایک باشندہ رقیون تنگ دست اور مفلس تھا، جس نے مصر کی راہ لی، بادشاہ مصر نے اس کی قدر دانی کی، اعیان سلطنت میں اس کا اثر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ہو گیا، یہ پہلا شخص ہے، جس نے فرعون کا لقب اختیار کیا، پھر قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ اپنے گھر والوں کے ساتھ مصر گئے، تو اس نے حضرت سارہؓ سے نکاح کرنا چاہا، مگر پھر باز رہا، اور اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہؓ کو حضرت ابراہیمؑ کے نکاح میں دے دیا، رقیون عبرانی زبان کا لفظ ہے، اسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا اصل عبرانی نام ھاجا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ بادشاہ مصر فرعون النسب نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے قبیلہ سے نسبت رکھتا تھا چنانچہ اس کے پاس سے حضرت ابراہیمؑ بڑے اعزاز اور سامان و ہدایا کے ساتھ روانہ ہوئے''۔(45)

2۔ مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہؓ کو بادشاہ مصر کی بیٹی لکھتے ہیں، چنانچہ ربی شلومو اسحاق نے کتاب پیدائش باب 16 آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سرسید مرحوم نے اصل عبرانی تحریر اور اس کے عربی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل اردو ترجمہ بھی تحریر کیا ہے۔

''وہ فرعون کی بیٹی تھی، جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجوہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہو کر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ''۔(46)

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لونڈی میراث نہیں پاتی تھی، تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہؓ کو یہی اندیشہ تھا کہ حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ کے ساتھ میراث پائیں گے، چنانچہ انہوں نے ہاجرہؓ کو الگ کر دینے کی درخواست کی، اور انہوں نے ہاجرہؓ کو جو لونڈی کہا تو یہ غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے تھا، جس سے دیگر تصریحات کی موجودگی میں استدلال کرنا درست نہیں، تورات میں اور دوسرے مقامات پر حضرت ہاجرہؓ کے لئے شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی خادمہ اور قبیلہ کی عورت کے ہیں، تورات میں حضرت داؤدؑ کی بیوی کے بارے میں جو زوجہ شرعی تھیں، شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ اگرچہ لونڈی کیا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ آزاد تھیں، اور یہ لفظ ان کے لئے خادمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔(47)

سرسید مرحوم کے نزدیک:

''توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر جو ہم نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح پر ہوتے تھے، شرا (خریداری) سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے، جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے، اور شبوت حرب کہلاتے تھے یعنی غنیمت جنگ صیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے جو خریدے جاتے تھے، اور ان کو مقنت کشف کہتے تھے یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھے، بلید بایث ولیدا لبیت یعنی خانہ زاد، مگر حضرت ہاجرہؓ ان باتوں سے پاک تھیں، پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں، ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے''۔(48)

عربوں کا علم الانساب اور اس کی اہمیت:

حضرت ابراہیمؑ سے رسول اکرم ﷺ کے نسبی رشتہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے مستشرقین نے عربوں کے علم الانساب پر بھی اعتراضات کئے ہیں جن کو سرسید مرحوم نے ''ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے'' سے تعبیر کیا ہے، کہا گیا ہے کہ:

''اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضروری نہیں ہے کہ ان کے انساب کا علم یا روایت خود ان قوموں میں بجنسہ چلی آتی ہے یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے، کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جس کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے، ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقرار رہی ہو''۔(49)

سر سید مرحوم نے اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے بارے میں ہیں، وہ نہایت معتبر ہیں، کیونکہ ''عرب اپنے آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بدرجۂ غایت پابند تھے اور اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا جدا نام رکھتا تھا، اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلے کو بخوبی جانتا تھا، اور اپنے حسب ونسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا۔ لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کا ان کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا، انہوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی تحریر بھی پیش کی ہے، وہ اپنے جغرافیہ عرب میں لکھتے ہیں کہ:

''عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص و عام ہے تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے''۔ (50)

پھر سر سید مرحوم یہ بیان کرتے ہیں کہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے، ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل ذریعوں سے ہو سکتا ہے، میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب ونسب بہ آواز بلند بیان کرے، تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا، کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا، جب کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا، تو اس کی پاداش میں قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا، جو اب شرع میں لفظ الدیة علی العاقلہ مستعمل ہے۔ اس قسم کے رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا، اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر اعتماد قائم ہوا اور برقرار رہا، وہ اپنی طویل بحث کے اختتام (51) پر ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قول فیصل نقل کرتے ہیں کہ:

''محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مؤیدہ شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو، مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریحاً غیر ممکن ہے، خود عربوں کے ہاں زمانہ نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے، کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداءً حجاز میں آباد ہوئے تھے، اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور خود محمد (ﷺ) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے دعوؤں کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسماعیل کی اولاد وقیدار کے سلسلہ سے تھی، ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایہ کو پہنچ جاتا ہے جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے، جن سے قیدار کے اسی حصۂ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے، اور دوسری جانب اریانوس، بطلیموس، پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیڈری، درانی، کدرون تائی، یا کدیتی کی موجودگی کے غیر مشتبہ اور نا قابل اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے''۔ (52)

اسلام کے ذریعہ تکمیل دین:

اپنی کتاب کے تیسرے خطبہ میں سر سید مرحوم نے ان مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے، اور یہ بتایا ہے کہ اسلام مختلف معاملات میں کن کن مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتۃً اسلام نمودار ہوا، اور اس کو حیرت انگیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا، اور دفعتۃً جزیرۃ العرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر دیا''، اس کے بعد انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام نے عرب کے مختلف مذاہب میں کیا اصلاحات کیں، ان کی کن باتوں کو برقرار رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی، اس کے بعد عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ ''اسلام درحقیقت اصول و عقائد متفرقہ ومنتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے''۔ پیش کرنے کے بعد اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ:

''یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کے سب سے بڑی دلیل ہے، تمام چیزیں

جن کا مبدا ایک ہی غیر متناہی اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی، جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے، اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں، مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے جنہوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا۔ جنہوں نے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی، اور جنہوں نے اپنا ایمان قیمتیں کے لئے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے"۔ (53)

صدائے جنگ:

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اسلام کے محاسن بھی بیان کئے ہیں، جس پر سرسید مرحوم نے یہ لکھ کر بجا طور پر ان کی تحسین کی ہے کہ "سر ولیم میور ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں، اور جب تک علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ سر ولیم میور کے خیالات نقل کئے ہیں، لیکن اس درمیان اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی" کے جملہ پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سر ولیم کی اس تحریر پر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا، بلکہ اس سچے وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پر تاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا، اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے، اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی، اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے"۔ (54)

ایڈورڈ گبن:

سرسید احمد مرحوم نے ایڈورڈ گبن کی تحریریں بھی اپنی تائید میں بڑی فراخدلی سے نقل کی ہیں لیکن وہ ان پر گرفت بھی کرتے جاتے ہیں، ایک جگہ وہ گبن کے اس جملہ پر چونک پڑے کہ "(رسول اللہ ﷺ) نے عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں"۔ اس پر ان لفظوں میں تبصرہ کرتے ہیں:

"انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے، ان دیکھی، ان چھوئی، ان چکھی، ان سمجھی چیز کیونکر سمجھ میں آ سکتی ہے، جس چیز کے لئے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہو، وہ کیونکر بیان ہو سکتی ہے، کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتلائی جا سکتی ہے، یہ تمام امور محالات سے ہیں، پس وحی یا الہام ان کو کیونکر بیان کر سکتا ہے، سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے: "لا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر" پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے، اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی موذی چیز ہے، اور کچھ نہیں بتا سکتا، سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہو سکتا ہے نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب و موذی چیز پر، اس لئے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب و موذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان کیا ہے موسیٰ نے یہی فرمایا کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا، غلہ پیدا ہوگا، وبا نہ ہوگی، گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا، وبا پھیلے گی"۔ (55)

خاندان بنو ہاشم کا مقام گھٹانے کی کوشش:

مستشرقین نے حضور ﷺ کے خاندان کو دوسرے قریشی خاندانوں سے نیچا دکھانے کے لئے اپنے تخیل کے زور پر قریش کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک طرف قبیلے کی وہ شاخیں تھیں جن کے ہاتھوں میں مکہ کا اقتدار تھا، مکہ اور طائف کی تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ دوسری طرف اس قبیلے کی کچھ شاخیں وہ تھیں جو کمزور تھیں، یہ قبیلے اس قابل نہ تھے کہ وہ شام یا یمن کی طرف تجارتی قافلے بھیج سکتے۔ واٹ کے مطابق

قبیلہ بنو ہاشم کا شمار انہیں کمزور قبائل میں ہوتا تھا اور مکے کے طاقت ور اور دولت مند قبائل کے مقابلے میں قبیلہ بنو ہاشم کی کوئی حیثیت نہ تھی۔
واٹ نے قبیلہ بنو ہاشم کی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

> "Muhammad's guardians saw that he did not starve to death, but it was difficult for them to do more for him, especially as the fortunes of the clan of Hashim seem to have been declining at this time. An orphan, whith no able-bodied man to give speical attention to his interests, had a poor start in a commercial career; And that was really the only career open to him". (56)

''محمد کے سرپرست صرف یہ احتیاط کرتے کہ وہ بھوک سے نہ مر جائیں اس سے زیادہ وہ ان کے لئے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ خصوصاً جب کہ اس زمانے میں بنو ہاشم کی مالی حالت گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک یتیم جس کے مفادات کی دیکھ بھال کے لئے جسمانی طور پر اہل کوئی آدمی موجود نہ تھا، اس نے اپنی کاروباری زندگی کا آغاز انتہائی کمزور طریقے سے کیا اور یقیناً اس کے علاوہ ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا''۔
منٹ گمری واٹ قبیلۂ بنو ہاشم کے تمام افراد کو غریب اور دوسرے درجے کا شہری ثابت کرنے کے لئے حضرت عباس بن عبدالمطلب کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:

> "As a banker and financier, doubtless in a small way, and purveyor of water for the pilgrims, he had little importance in the affair of Mecca, and life there cannot have been very comfortable for him". (57)

''ایک چھوٹے پیمانے کا بنکار ہونے اور حاجیوں کو پانی پلانے کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس میں شک نہیں کہ مکہ کے معاملات میں عباس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں پرسکون زندگی بسر کر رہے ہوں گے''۔
واٹ ساتویں صدی عیسوی کے مکہ کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "By the time Muhammad had begun to preach, the growing commercial propserity of Mecca may be said to have produced a new topmost stratum of society, namely, the leading, richest and most powerful merchants.... This stratum was almost solidly opposed to Muhammad". (58)

''جس زمانے میں محمد ﷺ نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کی اس زمانے کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مکہ کی بڑھتی ہوئی تجارتی خوش حالی نے ایک نیا اعلیٰ طبقہ مکے کی سوسائٹی میں پیدا کر دیا تھا یعنی انتہائی امیر اور طاقتور تاجروں کا طبقہ ...... یہ تقریباً سارا طبقہ محمد ﷺ کا مخالف تھا''۔

اس قسم کی تحریروں کا مقصد یہ ہے کہ وہ (مستشرقین) تحریک اسلامی کو طبقاتی کشمکش سے جنم لینے والی تحریک قرار دے سکیں اور یہ ثابت کر سکیں کہ مکے والوں نے حضور ﷺ کی جو مخالفت کی اس کی وجہ مذہبی اور نظریاتی اختلاف نہ تھا بلکہ مکہ کے امیر اور غریب طبقے ایک دوسرے کے مخالف برسرپیکار تھے۔ اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام جو اس سرعت سے پھیلا کہ چند سالوں میں پورے جزیرۂ عرب

میں پھیل گیا اس کی وجہ اسلامی تعلیمات کی کشش اور پیغمبر اسلام ﷺ اور صحابہ کرام کے کردار کی پختگی نہ تھی بلکہ یہ تو ایک ایسا انقلاب تھا جس کے لئے حالات انتہائی سازگار تھے۔ کیونکہ معاشرہ واضح طور پر دو حصوں میں منقسم تھا، چنانچہ ایک باصلاحیت آدمی اٹھا اور کمزور اس کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور یوں انقلاب برپا ہوا۔

تاریخ پر کس قدر ظلم ہے کہ جس شخص کے آباؤ اجداد میں قصی، عبد مناف، ہاشم اور عبدالمطلب جیسے سرداروں کے نام آتے ہوں اسے اس کی اپنی قوم میں ایک معمولی خاندان کا فرد ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر قبیلہ بنو ہاشم اتنا کمزور ہوتا جتنا مستشرقین کو نظر آتا ہے اور دیگر قبائل قریش اتنے ہی طاقتور ہوتے جتنے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو حضور ﷺ کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو وہ کمزور مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔ حالانکہ صورت حال یہ تھی کہ ہجرت مدینہ کے وقت محض اس وجہ سے ہر قبیلے سے ایک آدمی حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے کے لئے آیا کیونکہ وہ بنو ہاشم کے جوابی انتقام لینے سے خوف کھاتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے والد بزرگوار کے بارے میں منٹ گمری واٹ لکھتا ہے:

> "He died at a comparatively early age at Medina on his way back from a trading expedition to Gaza. This probably happened shortly before the birth of Muhammad". (59)

یہاں حضور اکرم ﷺ کے والد ماجد کے بارے میں شاید کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے بارے میں لکھتا ہے:

> "He was probably a posthumous child". (60)

حضور ﷺ شاید یتیم تھے۔

واٹ نے اس تحریر میں شاید کا لفظ لکھ کر اپنی تحقیق کا کچھ اچھا نمونہ پیش نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں کسی کو (مشرقی مؤرخ ہو یا مغربی) شک نہیں کہ حضور ﷺ کے والد کی وفات ان کی پیدائش سے پہلے ہوگئی تھی۔ یہاں صرف اور صرف نبی ﷺ کے خاندان کے وقار کو گھٹانے کے لئے شاید کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح واٹ نے حضور ﷺ کی پیدائش 570 لکھی ہے:

> "Muhammad was born in the year of Elephant. This is usually held to be about A.D. 570". (61)

اس کے لئے اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا صرف یہ لکھا ہے کہ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے، جبکہ مولانا شبلی نعمانی نے ولادت کی تاریخ 9 ربیع الاول، دوشنبہ 20 اپریل 571 لکھی ہے۔

منٹ گمری واٹ اور دوسرے مستشرقین نے اسلامی تحریک کو طبقاتی تحریک ثابت کرنے کے لئے خاندان بنو ہاشم کا مرتبہ گھٹانے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دولت مندوں کے مظالم سے تنگ آیا ہوا طبقہ سرمایہ داروں کے خلاف محمد ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا۔ حالانکہ یہ وہ دعوت تھی جس پر لبیک کہنے والوں میں خدیجۃ الکبریٰؓ اور ابوبکر صدیقؓ جیسے لوگ تھے جن کا معاشی مرتبہ کسی قریشی سردار سے کم نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ کے والد ماجد آپ کی پیدائش سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کے لئے ورثے میں کوئی بڑی جائیداد نہ تھی، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ابو طالب کی مالی حالت اچھی نہ تھی، لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود حضرت ابو طالب مکے کے معزز افراد میں سے تھے اور ان کے اثر و رسوخ ہی کی وجہ سے قریش حضور ﷺ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گھبراتے تھے۔ یہ تمام پاپڑ اس لئے بیلے گئے کہ وہ تحریک اسلامی کے آغاز اور ارتقا کو جس انداز میں دیکھنا چاہتے تھے، اسے اسی انداز میں دیکھ سکیں،

تاہم ان کی ساری کوششیں بے اثر ہیں حقیقت وہی ہے جو حضور ﷺ نے بتائی۔

"انا محمد بن عبدالله بن عبدالمطلب ان الله خلق الخلق فجعلنی فی خیرهم فرقة ثم جعلهم فرقتین فجعلنی فی خیرهم فرقة ثم جعلهم قبائل فجعلنی فی خیرهم قبیلة ثم جعلهم بیوتا فجعلنی فی خیرهم بیتا و خیرهم نفسا" (62)

"میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے مخلوق کے بہترین طبقے میں رکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دوگروہ بنائے اور مجھے بہترین گروہ میں رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو قبائل میں تقسیم کیا اور مجھے بہترین قبیلے میں رکھا، پھر ان کو خاندانوں میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین خاندان میں رکھا۔ سو میں اپنے خاندان اور اپنی ذات دونوں لحاظ سے مخلوقات سے افضل ہوں۔

حضور ﷺ کی سماجی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش:

جس طرح واٹ اور دوسرے مستشرقین نے حضور ﷺ کو ایک معمولی خاندان سے ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اسی طرح یہ کوششیں بھی کیں کہ آپ کو ایک بے بس اور معاشرے کا ٹھکرایا ہوا انسان ثابت کیا جائے۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کو ایسا شخص قرار دے سکیں جو احساس محرومی کا شکار ہو اور اسلام کو آپ ﷺ کے احساس محرومی سے جنم لینے والی تحریک ثابت کر سکیں۔ واٹ حضور ﷺ کو رضاعی ماں کے سپرد کرنے کا سبب آپ کی یتیمی کو قرار دیتا ہے۔

"The fact that Muhammad was posthumous child may, of course, have been part of the reason for sending to a wet-nurse". (63)

یہ ایک حقیقت ہے کہ محمد ﷺ یتیم پیدا ہوئے آپ کے مرضعہ کے سپرد کرنے کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یتیم ہونا ہو سکتا ہے۔ واٹ کی یہ منطق بڑی عجیب ہے کہ وہ کسی بچے کو مرضعہ کے سپرد کرنے کو اس بچے کی غربت اور بے بسی کی دلیل قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ رضاعی ماؤں کے حوالے وہی لوگ اپنے بچے کرتے ہیں جو رضاعت کے اخراجات کو برداشت کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اور وہی بچے رضاعت کے لئے قبول کئے جاتے ہیں جن کے سرپرستوں سے انہیں بہتر اجر ملنے کی امید ہوتی ہے۔ اور یہ مکہ کے معزز گھرانوں کا معمول تھا اور یہ عمل باعث عزت تھا۔ مکہ کے متمول اور سربرآوردہ لوگ اپنے بچوں کی عمدہ پرورش اور بہتر زبان دانی کے لئے ان کو دیہاتوں میں بھیجا کرتے تھے۔

یہ مفروضہ ثابت کرنے کے لئے کہ حضور ﷺ احساس محرومی کا شکار تھے واٹ لکھتا ہے:

"The absence of a father must have produced a sence of deprivation in Muhammad, and the real experience of poverty as a young man may well have nourished the sence of deprivation".(64)

"باپ کے نہ ہونے سے محمد کے دل میں احساس محرومی نے جنم لیا ہوگا اور بچپن اور لڑکپن کے تجربات نے اس احساس کو مزید تقویت دی ہوگی"۔

جس بچے کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ ہو تو وہ احساس محرومی کا شکار ہوگا لیکن جس بچے کو اس کا عظیم دادا جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو، چچا مرحوم بھائی کی نشانی سمجھتے ہوئے، حلیمہ اور اس کے شوہر نے اپنے بچوں سے زیادہ شفقت دی ہو۔ اور جس عرب گھرانے سے وہ تعلق رکھتا تھا اس پس منظر کے حامل کے نوجوانوں کے اندر احساس محرومیت نہیں بلکہ خودداری، حریت، شجاعت اور مردانگی کے اوصاف جنم لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے ان بادیہ نشینوں کو اپنی رعایا میں شامل کرنے کی جرأت نہ قیصر میں تھی نہ کسریٰ میں۔

چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات:

سر ولیم میور نے اسلام کے چند معاشرتی مسائل پر یہ اعتراضات کئے ہیں، کہ مذہب اسلام سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، اول یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا، طلاق دے دینا اور غلام بنالینا وہ باتیں ہیں جو علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں، اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں، دوم یہ کہ مذہبی آزادی روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کر دی گئی ہے، تحمل کا نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیتا، سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور اس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے"۔(65)

سرسید مرحوم کے خیال میں عیسائی مصنفین، مسلمانوں کی مخالفت میں سنجیدگی اور نیک نیتی کو برقرار نہیں رکھ سکے، اپنے عیب چینی کے مصمم ارادہ کی وجہ سے وہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے سکے کہ آب وہوا، مرد و عورت کی تعداد اور مختلف طبعی اسباب کا گہرا اثر معاشرتی حالات پر پڑتا ہے۔

حضور ﷺ کے اسم گرامی پر رکیک حملے:

یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا نام نامی اسم گرامی "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں تھا بلکہ ماہومت (Mahomet) تھا بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں کے ساتھ "ماہونڈ" (Mahound) یعنی بقول ان کے "شہزادہ تاریکی" کا نام تجویز کیا، اور بعض کے نزدیک "بافومٹ" (Baphomet) اور "بافم" (Bafum) تھا۔ نیچ ذات (Low birth) تھے (العیاذ باللہ)(66)

اس الزام کو خاص طور پر مارگولیتھ نے بڑی شدومد کے ساتھ اپنی کتاب "محمد اینڈ دی رائز آف اسلام" مطبوعہ لندن، ص 47 میں پیش کیا۔ اس الزام کو نہ صرف یہ کہ دوسرے مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم میور نے (لائف آف محمدؐ ایڈنبرا 1923ء، ص cxiv,cxv) ہی مسترد کر دیا بلکہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی شریف النسب تھے، عرب کے شریف ترین گھرانے کے فرزند تھے، آپ ﷺ کے جد امجد ہاشم تھے جن کے ذمہ شہری مملکت مکہ میں "افادہ" کی ذمہ داری تھی۔ اور وہ اس پائے کے آدمی تھے کہ رومی امراء اور غسانی شہزادے ان سے معاہدہ کیا کرتے تھے۔(67)

محمد دراصل خود ایک مسیحی پادری (Cardiual) تھے، خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں، یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً روم کیسا سے تعلق منقطع کر لیا اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب "اسلام" کو ایجاد کر لیا، اور اپنے آپ کو مخالف پوپ قرار دے لیا۔ دنیائے مسیحیت میں نئے فرقہ کے بانی تھے، مخالف مسیح (anti-christ) اور روشن عیسائیت تھے۔ ترکوں کے پیغمبر تھے، بت پرست تھے (نعوذ باللہ)۔ خود اپنے آپ کو مرکز پرستش قرار دے لیا تھا، آپ بقول ایک مصنف عرب منافق و ناپاک تھے۔ جین برڈ (Genebrard) کے نزدیک (خدانخواستہ) آپ ﷺ حیوان (Beast) تھے، اور صرف حیوانی زبان یعنی عربی جانتے تھے جو ان کے حیوانی ماحول کے لئے مناسب تھی۔ آپ حاشا اللہ شہوت پرست Lescirous تھے۔ خود بھی ملوث تھے، اپنے پیروکاروں کو بھی ملوث کیا، دھوکہ باز، مکار، کاذب، جھوٹے، خوفناک حد تک بے شرم تھے (استغفر اللہ)۔ وہ ایک ہنر مند، مکمل سیاست داں تھے۔(68)

مشہور پروفیسر مارگولیتھ جو یورپ میں اسلامیات کے امام فن مانے جاتے ہیں۔ اور آکسفورڈ میں اسلامیات کا درس دیتے ہیں اپنی کتاب تاریخ العالم میں یہ نادر تحقیق پیش کرتے ہیں کہ محمد ﷺ عبداللہؓ کے بیٹے ہیں اور عبداللہ عرب میں اس لڑکے کو کہا جاتا تھا۔ جس کا باپ لامعلوم ہو بہت ممکن ہے کہ محمد ﷺ کے باپ کا نام عبداللہ بھی اسی وجہ سے پڑا ہو۔ اگر کوئی معمولی مستشرق اس قسم کی بیہودہ بات کہتا، تو قابل درگذر تھا۔ لیکن یہ اس شخص کی تحقیق ہے جو یورپ میں عربی کا سب سے بڑا ماہر ہے۔(69)

آپ ﷺ پر بحیثیت آدمی کے الزامات:

مستشرقین کی جانب سے آنحضرت ﷺ پر مختلف نوعیت کی تہمتیں لگائی گئی ہیں۔ سب سے پہلے آدمی کی حیثیت سے آپ ﷺ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

الف۔ پُرخوری کا الزام:

لامانس کہتا ہے" آپ بڑے پُرخور تھے۔ آپ کا جسم لذیذ اور مرغوب کھانوں کی وجہ سے بھاری اور موٹا ہوگیا تھا"۔ (70)

مگر کھانے کے بارہ میں آپ کے جو عام اور مشہور آداب بیان کئے گئے ہیں اور جو مورخین کے نزدیک بھی ثابت و تسلیم شدہ ہیں۔ یہ قول ان کے بالکل برعکس ہے۔ آپ ﷺ کی حالت تو یہ تھی کہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے مگر کبھی جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی، پانی اور روٹی ہی اکثر آپ ﷺ کی غذا ہوتی تھی۔ انہیں آپ اسودین کہتے تھے۔ حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں۔ کھانے میں آپ ﷺ کا معمول اور عادت مبارکہ یہی تی کہ موجود کو مسترد نہ کرتے اور غیر موجود کے لئے زحمت نہ دیتے۔ جو میسر ہوتا اسے تناول فرماتے ورنہ صبر کرتے، بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے مہینوں گزر جاتے اور آپ ﷺ کے گھر میں آگ بھی نہ جلتی، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے مقدام بن معدی کرب کی یہ روایت نقل کی ہے اور اسے حسن بتایا ہے۔ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے لئے پیٹ بھرنے سے زیادہ خراب کوئی اور برتن بھرانہیں ہے۔ اس کے لئے چند لقمے کافی ہیں۔ جو اس کی پیٹھ کو سیدھی رکھیں۔ اگر کوئی شخص اپنے نفس سے مغلوب ہو جائے تو ایک تہائی پیٹ میں کھانا کھائے ایک تہائی میں پانی پئے اور ایک تہائی پیٹ خالی رہنے دے۔ امام بخاری کی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جن کے سامنے بھونی بکری تھی۔ لوگوں نے ان سے کھانے کی فرمائش کی مگر انہوں نے انکار کردیا۔ اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور کبھی انہوں نے شکم سیر ہو کر جو کی روٹی نہیں کھائی۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد آل محمد ﷺ نے کبھی مسلسل تین رات گیہوں نہیں کھایا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

اس سے قطع نظر معترض نے رسول اللہ ﷺ کے ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ آپ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی روزے رکھتے تھے۔ اور پیر اور جمعرات کو تو عموماً روزے سے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی روزے رکھنے پر آتے تو لوگوں کو خیال ہوتا کہ آپ افطار نہ کریں گے۔ اسی طرح رمضان میں صوم وصال کا اہتمام فرماتے تھے۔ یعنی دو یا کئی کئی دنوں تک مسلسل روزے رکھتے اور شب میں بھی کھانا پینا ترک کر دیتے تاکہ رات و دن کے بیشتر اوقات عبادت میں گزاریں۔ مگر صحابہ کرامؓ کو اس سے منع کرتے۔ انہوں نے عرض کیا آپ تو ایسا کرتے ہیں، فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میرا خداوند مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو علوم و معارف کی غذا عطا کی جاتی ہے۔ اور آپ ﷺ کے دل پر مناجات کی لذتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ سے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مہینہ کے بعض حصوں میں افطار سے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ آپ روزہ ہی نہ رکھیں گے۔ اور روزہ رکھنے لگتے تو خیال ہوتا تھا کہ اب آپ افطار سے نہ ہوں گے۔ اسی طرح شعبان میں بھی اکثر روزے سے رہتے تھے اس کے بعد پرخوری کا الزام کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ (71)

سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ" جب کسی روایت میں محمد صاحب ﷺ کی تحقیر کے کلمات ہوں، مثلاً بعد ہجرت اگر ان کے تبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو، یا کار خیری میں ناکام ہونا، یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشائے اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے تو اس کے تسلیم کرنے کی دلیلیں قوی ہیں، کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی

روایتیں ایجاد کر لی جائیں یا ایجاد ہو کر محمد صاحب ﷺ کے تبعین میں رواج پا سکیں"۔ (72)

مگر سر سید کے خیال میں "درحقیقت کسی روایت کی صحت کو ثابت کرنے کا یہ ایک عجیب طرز ہے"۔ وہ فرماتے ہیں کہ "کیا ہم کو ان تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیے جن کو مخالفین اسلام نے وضع کیا، یا اسلام کے نام پر گھڑ لیا تھا اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کی تردید کریں، اور ان کو موضوع اور بے اصلی ثابت کریں، یا وہ کسی کی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں، اور جن کی نسبت علمائے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں۔ دراصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بیہودہ روایتیں اور قصے آنحضرت ﷺ کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سے کہ نئے مذہب اور اس کے بانی پر عیب لگائیں، اختراع کر لی تھیں، اس لئے ان تذکرہ بالا وجوہ سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا ان کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتی، تعجب ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ "قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایات بنائی جائیں۔ یا گڑھ لیے جانے کے بعد تبعین محمد صاحب ﷺ میں رواج پا سکیں"۔ ان کی یہی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی ایجاد کردہ ہیں۔ (73)

سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں اختراع اور جعل سازی ثابت کرنے کے لئے مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سے ایک کا نام انہوں نے تلون آمیز اختراع رکھا ہے اور پھر اس کی مثالیں بھی ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ان ہی کے بقول بیس گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب ﷺ خضاب کیا کرتے تھے۔ اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتاتے ہیں۔ بعض صرف اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے بچشم خود اس امر کو پیغمبر صاحب کی زندگی میں دیکھا تھا، بلکہ انہوں نے آپ کی وفات کے بعد وہ بال جن پر رنگ محسوس ہوتا تھا دکھلایا تھا۔ اور بیس گواہ جن کو واقفیت کے یہی ذرائع حاصل تھے، بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا، اور ان کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آ سکتے تھے"۔ (74)

لیکن خضاب کے بارے میں راویوں کے اس اختلاف سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ بیان واقعہ میں کسی جعل سے کام لیا گیا ہے۔ جب کہ معمولی غور و فکر سے اختلاف کی اصل وجہ اور واقعہ کی اصلیت سمجھ میں آ سکتی ہے۔

چنانچہ سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ:

"اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا ﷺ کے سفید بال نہایت تھوڑے تھے (بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق حضور ﷺ کی داڑھی اور سر مبارک میں صرف ستر ہ بال سفید تھے) آنحضرت ﷺ نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں لگایا جو لوگ ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے ان کا یہی بیان ہے اور چونکہ بال سفید ہونے سے پہلے اکثر بھورے ہو جاتے ہیں اس لئے جن لوگوں نے ان بھورے بالوں کو دیکھا تو یہ خیال کیا کہ خضاب کیے ہوئے اور ان ہی بھورے بالوں سے استدلال کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کا خضاب کرنا بیان کیا، خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے۔ بلکہ اس چیز کا ذکر ہے جس کو پیغمبر صاحب نے غسل کے وقت اپنے سر پر مل لیتے تھے۔ پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف مذکورہ بالا سبب سے قدرتی طور پر خود بخود ہو گیا، اس کو دیدہ دانستہ عیارانہ بناوٹ نہیں کہا جا سکتا، ان کو یا اسی قسم کی اور روایتوں کو جن کو ذکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے متناقض یا بناوٹی روایتیں نہیں کہا جا سکتا"۔ (75)

رسول اکرم ﷺ کی انگشتری مبارک کے بارے میں بھی سر ولیم میور نے یہی طریق استدلال اختیار کیا ہے، ان کے خیال میں خاتم نبوی کے باب میں عقیدہ یا خاندان کا کوئی مفاد ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے جانبداری کے رجحانات پیدا ہوتے لیکن پھر بھی اس سے متعلق روایتوں میں جو تناقض ہے، سر ولیم میور کے نزدیک وہ صرف جعل اور اختراع کا نتیجہ ہے۔ "ایک فریق یہ کہتا ہے کہ پیغمبر صاحب ﷺ نے اپنے مراسات پر مہر لگانے کی ضرورت کی وجہ سے خالص چاندی کی ایک انگوٹھی جس پر چاندی کا خود چڑھا ہوا تھا بنوائی اور محمد صاحب ﷺ نے اس

انگوٹھی کو پسند کر کے اپنے پاس رہنے دیا ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس انگشتری کو عمرو بن سعد حبش سے لائے تھے۔ چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ بن جبلؓ نے اس مہر کو اپنے لئے یمن میں کھدوایا تھا۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ محمد صاحب ﷺ اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے، اور کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ الٹے ہاتھ میں، کچھ روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رہتا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف رکھتے تھے۔ بعض روایتوں سے پتا بت ہوتا ہے کہ اس مہر پر ''صدق اللہ'' نقش تھا اور دوسری روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''محمد رسول اللہ'' نقش تھا، سر ولیم کے بقول'' یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ متواتر بیان کیا گیا ہے کہ محمد ﷺ صاحب کی وفات کے بعد اسی انگشتری کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے بھی زیب انگشت کیا تھا۔ اور عثمانؓ کے ہاتھ سے چاہ عریس میں گر پڑی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ پیغمبر ﷺ صاحب یا ان کے خلفائے راشدین نے کوئی بھی انگشتری نہیں پہنی تھی۔ (76)

سر ولیم میور نے روایات میں تضاد ثابت کر کے جس پرفریب طریقے سے اصل حقیقت ہی کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے اس سے ان کی زنگ خوردہ طبیعت کا راز فاش ہو جاتا ہے جس پر سر سید احمد خان یہ تبصرہ کرتے ہیں:

(سر ولیم میور نے) جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے وہ نہایت افسوس کے قابل ہے۔ یہ بیان سر ولیم میور کا کہ'' یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں'' محض غلط ہے اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے وہ اس بھی زیادہ غلط ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کیا ہو، یا چاندی کی انگوٹھی علیٰحدہ ہو اور خول والی انگوٹھی علیٰحدہ ہو، کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذؓ بن جبل والی انگوٹھی پر ''صدق اللہ'' اور جناب پیغمبر خدا ﷺ کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ ہو؟۔ کبھی آنحضرت ﷺ نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو، اور کبھی الٹے ہاتھ میں، اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف اس اس انگوٹھی کو آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے۔ جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی۔ سر ولیم میور نے چونکہ غلطی سے یا دانستہ ان سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری سے متعلق خیال کیا ہے۔ اس لئے اپنی دلیل میں کس تفصیل کے بغیر یہ بیان کرتے ہیں کہ وہی انگشتری صحابہ تک پہنچی تھی۔ حالانکہ وہ صرف وہی انگشتری تھی جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا۔ پس ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے فرضی خیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ جس سے وہ حجت و برہان کی صراط مستقیم سے منحرف ہو گئے اور اسلام سے متعلق ہر چیز کو جو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو وہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہو گئے اور ان کو وہ جعل سازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ کہہ کر بدنام کرتے ہیں۔ سر ولیم میور نے کو ان کی تجربہ کاری کی وجہ سے اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے تھا کہ وہ بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل وثبوت نہ ہو، ہمیشہ اسی مقصد کی خرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ جس کی حمایت کی (ان کے پادریوں کی جانب سے) ان سے توقع کی گئی ہو''۔ (77)

''اندور کے جناب عبدالحمید صاحب نے دارالعلوم ندوہ کے سیمینار میں یہ مقالہ پڑھا، اس کی تلخیص ذیل میں درج ہے''۔

ایک عرصہ سے مستشرقین اسلام اور اس کے متعلقات پر لکھتے رہے ہیں۔ انہوں نے اسلامی لٹریچر میں بڑا اضافہ بھی کیا ہے۔ ان کی تحریریں عموماً انگریزی زبان میں ہوتی ہیں لیکن ان کی ان کاوشوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اسلام کی نشر واشاعت کم اور اس پر تنقید واعتراض زیادہ ہے۔

حال میں ایک اردو روزنامہ سے یہ اطلاع ملی کہ گزشتہ دہائی میں صرف امریکہ میں اسلام سے متعلق تقریباً تیس ہزار کتابیں شائع ہوئیں، اور ان کے علاوہ رسائل وجرائد میں مضامین اور کتابچے شائع ہوئے اور ریڈیو اور ٹی وی پر مضامین پیش کئے گئے۔

اسلام پر اس خاص توجہ کی یقیناً کوئی جذبہ اور محرک ہے، جو ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں اصل اس عہد کی ایک علمی صلیبی جنگ ہے۔ جس میں بجائے سیف وسنان کے قلم وقرطاس مصروف پیکار ہیں آئندہ سطور میں بغیر کسی ترتیب کے صرف چند مستشرقین کی کتابوں کے کچھ

اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں جن سے ان کا مقصد تاریخ اسلام سے ان کی ناواقفیت اور ان کی علمی و جعل وفریب کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔(78)
ایک مستشرقین ڈبلیو منٹگمری واٹ اپنی کتاب ''محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین'' میں لکھا ہے:

اس کا قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ نماز کے پانچ اوقات کا تعین (حضرت) محمد ﷺ کے زمانہ حیات میں ہو بلکہ بعد کی چیز ہے (حضرت) محمد ﷺ (حضرت) زیدؓ سے ملاقات کی نیت سے تشریف لے گئے، وہاں زید موجود نہیں تھے، لیکن آپ کی نگاہ ان کی بیوی زینبؓ پر پڑی جو ناکافی لباس میں تھیں۔ نظر پڑتے ہی آپ ان پر فریفتہ ہوگئے (حضرت) خدیجہؓ کے سوا آپ کی تمام ازواج نوجوان تھیں، اور اکثر تو نو عمر تھیں اس کے بھی شواہد نہیں ملتے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کی اس عیش کوشی اور شہوت رانی کو ناپسند کرتے ہیں۔(ص 156،158) دوسری جگہوں کی طرح عرب میں بھی یہ تصور تھا کہ اگر مرد و عورت کہیں تنہا رہ گئے تو اس کا نتیجہ جنسی تعلق ہی ہوگا۔ آخر کار (حضرت) محمد ﷺ نے اس معاملہ کا فیصلہ (حضرت) عائشہؓ کے حق میں کیا، ان کے خلاف کوئی مضبوط شہادت نہ تھی۔ اس درمیان میں زیادہ وقت گزر گیا جس سے یہ یقین ہوا کہ وہ حاملہ نہیں ہیں۔(79)

قصہ غرانیق:

ان مستشرقین نے ایک اور بے اصل قصہ کو خوب خوب ہوا دی ہے، جو کسی معتبر سند کے بغیر ایک کتاب مواہب لدنیہ میں درج ہوگیا مگر مستشرقین کو روایت کے معیار یا اس کی صحت کے امکان سے کچھ بحث نہیں ہوتی۔ وہ اپنے تعصب کی وجہ سے ایسی روایت کو کسی تحقیق اور چھان بین کے بغیر ہی اچک لیتے ہیں۔ اور سادہ لوح عوام کو فریب دینے کی کوشش شروع کردیتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر اسپرنگر سورۃ والنجم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ ''محمد ﷺ نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی اور ان کو تسلیم کرلیا۔ اور جب وہ سجدہ میں گئے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا''۔ اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ نے منسوب کرتے ہیں۔ سرولیم میور نے اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''بظاہر ایک خوب معتبر قصہ موجود ہے جس سے محمد ﷺ کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے''۔ وہ اس کے لئے واقدی اور طبری کا حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ کے مؤلف نے اس ''مضمون'' سے متعلق تمام مختلف روایتوں اور علماء کے خیالات کو یکجا جمع کردیا ہے۔ جس کو سرسید نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس روایت کا خاص اور اہم جزء یہ ہے کہ رسول ﷺ کی زبان سے بتوں کی تعریف میں ''تلک الغرانیق العُلیٰ و ان شفاعتھن لتُرجیٰ'' کا فقرہ منسوب کیا گیا ہے۔ اور یہ روایت خود صاحب مواہب لدنیہ کے الفاظ میں تین سندوں سے مروی ہے جن کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہیں پہنچتا۔ پھر مواہب لدنیہ کے مؤلف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''جب شرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا ﷺ نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی''۔(80)

مواہب لدنیہ کے مؤلف کو بھی اس روایت کے کئی سلسلوں کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کا خیال یہ ہے کہ ''جو لوگ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچا ہو صحیح تصور نہیں کرتے، وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب اس کو تسلیم کرلیں گے۔ مگر سرسید نے مواہب لدنیہ کی مذکورۂ بالا تصریحات کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بیان اس کا محض غلط ہے جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں اور جو خود اس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف روایتوں کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے متعدد سلسلے ہیں اور مرسل روایتیں یعنی جن کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچا ہو۔ گو اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو، سند اور اعتبار کے قابل نہیں جب تک کہ اس کی تائید کے لئے کوئی روایت مستند موجود نہ ہو۔ مزید یہ کہ وہ روایت قرآن مجید کی مخالف نہ ہو، لیکن جب کوئی روایت مذکورۂ بالا روایت کی طرح قرآن مجید کے احکام کے خلاف ہو، اور جب کہ وہ جناب پیغمبر ﷺ کے ان تمام حالات کے خلاف ہو، جو شرک کے مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں۔ اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی

اصولوں سے اتفاق نہ رکھتی ہو، پھر ایسی مشتبہ اور مختلف ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے، اور کہنے والا بھی واضح نہ ہوا ہو، تو ایسی روایت از روئے عقل وانصاف کس طرح ان قواعد میں داخل ہو سکتی ہے۔ جن میں اس روایت کو داخل کرنے کی مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے، وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے''۔ (81)

اصل واقعہ جیسا کہ سرسید نے وضاحت کی ہے یہ ہے کہ ''جناب پیغمبر ﷺ کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گزرا ہے جب آپ مکہ میں تشریف رکھتے تھے۔ کفار مکہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے۔ اور اپنے وحشیانہ بغض سے ہر نئے ڈھنگ سے آنحضرت ﷺ کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے۔ وہ جناب پیغمبر خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے، اور جب آپ خدائے واحد کی حمد وثناء بیان فرماتے تھے تو مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ پس مذکورہ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سورہ نجم پڑھ رہے تھے تو کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی اور یہ کہا ''تلک الغرانیق العُلیٰ وان شفا عتھن لترجی ''اور جب پیغمبر ﷺ خدا نے سجدہ کیا مشرکین نے بھی اپنے بتوں کو سجدہ کیا، مشرکین میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا، کچھ تعجب نہیں کہ مشرکین یہ سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا۔ مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبر خدا نے وہ جملہ نہیں کہا۔ (جیسا کہ خود صاحب مواہب لدنیہ نے نقل کیا ہے) اور اس لئے مشرکین آنحضرت ﷺ سے اور زیادہ دشمنی پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت کے مسلمان ہرگز یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت نے وہ جملہ فرمایا ہو اور کہنے والا بھی متعین اور واضح نہیں ہوا۔ اس لئے انہوں نے کہا یہ بات شیطان نے کہی تھی اس کے بعد جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت آئی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا۔ جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلتا ہوا معلوم ہو، انہوں نے کہا کہ پیغمبر ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیے تھے۔ مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر خدا نے وہ لفظ کہے تھے۔ بایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب رسول ﷺ خدا کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی طرح پر بھی پیغمبر ﷺ خدا کی زبان مبارک سے نکلنا نہیں خیال کیا۔ کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو۔ بلکہ کسی نے صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے اس کو بیان کیا ہے۔ یہی بے سر و پا روایتیں ہیں جن کا ذکر طبری، واقدی اور ابن اسحاق نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ (82)

فصل دوم

رسول کی عائلی زندگی اور تعدد ازدواج

مستشرقین نے تعدد نکاح نبوی کو ہدف طعن بنایا اور اس کو نفسانیت کا رنگ دیا۔ ان کے اس اعتراض کے تین اجزاء ہیں۔

1۔ نفس قانون تعدد پر اعتراض۔

2۔ نیت نبوی پر اعتراض کہ اس نکاح کو محرک ہوائے نفس تھی۔

3۔ تعداد زوجات، امت کے حق میں چار تک ہے۔ لیکن حضور علیہ السلام نے نو یا گیارہ تک نکاح کئے، اس فرق پر اعتراض۔ (83)

عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت صلعم پر بابت کثرت ازواج اور اسلام پر بابت اجازت تعدد ازواج اور اجازت طلاق کے ہے اس کی تردید میں ہمارے علماء نے بالکل الزامی جوابوں کے کام لیا ہے اور بلا شبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند ہوں تو یہ جواب ان کے لئے کافی و وافی ہیں مثلاً ازالۃ الاوہام میں توریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیم کے تین نکاح، حضرت یعقوب کے چار نکاح، حضرت موسیٰ کے دو نکاح، حضرت داؤد کی نوے سے زیادہ بیویاں جن میں بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ تھیں اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیویاں اور بعض اور انبیاء کی کثرت ازواج کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح طلاق کی طعن پر توریت سے جس کے احکام کو عیسائی منسوخ نہیں مانتے، ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جواز طلاق کا حکم دیا ہے کتاب استفسار میں بھی اول اسی قسم کے الزامی جواب دیئے ہیں اور آخر میں جواب تحقیقی یہ لکھا ہے کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت و انجیل سے بھی اس بات پر قائم نہیں ہے کہ جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہو سکتا یا خدا تعالیٰ کسی نبی کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دی گئی ہے اور عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں، ناسخ و منسوخ نہیں۔

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علماء نے دیئے ہیں مسلمانوں کی تسلی کے لئے اور عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں تو ان کے ساکت کرنے کے کافی ہیں مگر عیسائی، باوجودیکہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر منسوخ جانتے ہیں، نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے حوالوں پر کان دھرتے ہیں۔ نیز عیسائی انبیاء کو مثل اہل اسلام کے معصوم نہیں سمجھتے یہاں تک کہ ان میں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب کرتے ہیں۔ پس تاوقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے ان کی زبان بند نہیں کی جا سکتی۔ اس کے سوا الزامی جوابات ان لوگوں کے لئے جو توریت و انجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں جب تک اس زمانہ کی مسلمات کے موافق ان کا جواب نہ دیا جائے۔ مسئلہ تعدد ازواج اور جواز طلاق کی بحث خطبات احمدیہ میں بھی آ گئی ہے، اس میں سرسید نے اول سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ تعدد ازواج اور طلاق کا حکم عام اخلاق کی بیخ کنی کرتا ہے، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے اور حسن معاشرت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ (84)

اس کے جواب میں سرسید نے اول تعدد ازواج پر لمبی بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ''اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے۔ اول قانون قدرت کے لحاظ سے، سو ہم قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روحوں کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک مادہ اور ایک نر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ جن ذی روحوں کی متعدد مادائیں ہونی مقصود تھیں، ان کے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر و مادہ کی تعداد و تناسب نہیں ہوتی۔ اس قانون کے بموجب، جیسا کہ ظاہر ہے انسان دوسری قسم میں داخل ہے۔ مگر چونکہ رتبہ میں بوجہ اس بیش بہا قوت کے جو مدرک کلیات و جزئیات ہے وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے قدرت نے اس کو عطا

کیے ہیں اُن کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبیعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ممالک مختلفہ کی آب و ہوا کے کام میں لائے ورنہ اُس میں اور دیگر حیوانات میں جو اُس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ پس جس طرح کثرت ازواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے۔(85)

اس کے بعد سرسید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ''جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اُس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اپنی مجالست سے اُس کی خوشی کو بڑھادے، اپنی محبت بھری ہمدردی سے اُس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ ''بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو'' مدد دے۔ مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرائض کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اُس دانشمند حکیم خالقِ زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں جوروئیں رکھنے کی اجازت ہو اور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہئے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اُس کو حاصل ہے۔ سیاست مُدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے لیکن عورت کو اول قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہئے''۔

''اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اس کے سبب سے حُسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ تعلیم و تربیت سے اس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے، پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اُس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کے لئے سم قاتل ہیں''۔(86)

اس کے بعد وہ ڈیون پورٹ کی کتاب سے مانٹیگیو کی رائے تعدد ازواج کی تائید میں نقل کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ ''گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بڑھیا ہو جاتی ہیں ضرور ہے کہ تعدد ازواج کا قاعدہ جاری کیا جائے''۔(87)

پھر مسٹر ہگنز کی رائے لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ''علم قوائے انسانی اور علم طبیعیات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسی دریافت کی ہیں جو کثرت ازواج کے واسطے بطور ایک عذر کے متصور ہو سکتی ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے مینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتیں، مگر بنی اسمٰعیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں، متعلق ہو سکتی ہیں''۔ اس کے بعد مسٹر ہگنز نے سر ڈبلیو اوسلی صاحب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ''ایشیا کے گرم ملکوں کے تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یوروپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں۔ مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانیٔ اسلام کے لئے اس بات کی اُنہوں نے متعدد جوروؤں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ ایک کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسٰی نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کے آئین پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہوگی وہ یوروپ کے واسطے نامناسب ہوگی''۔(88)

ان دونوں مذکورہ بالا رایوں پر سرسید یہ ریمارک کرتے ہیں ''افسوس کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازواج پر صرف امورات طبیعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی تلخیوں کے واسطے اور مقاصد تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اُس کے قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے''۔(89)

اس کے بعد سرسید اُن اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب اور اُس کے گردونواح کے ملکوں میں ازواج کے متعلق تھیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''ایران میں قوانین نکاح بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے یہاں تک کہ بیٹے کو اُس کی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اُس کی بیٹی اور بھائی کو اُس کی بہن۔ یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشۂ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعدد ازواج کی رسم بلا کسی قید اور حد کے بے روک ٹوک جاری تھی۔ عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعدد ازواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔ عیسائیوں کا حال ان سب کے برخلاف تھا، اُن کے ہاں ایک جورو بھی کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ رہبانیت اور تجرد محض کی عام ہدایت تھی اور مرد و عورت دونوں کے لئے وہی نیک گنی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں جبکہ عقل اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ گئی تھی بانیٔ اسلام نے ایک ایسا عمدہ قانون جاری کیا جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقل کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لئے اُس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے''۔ (90)

اس کے بعد انہوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازواج کو روکا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اُس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے یہودیوں کے ہاں بکثرت اور بلا تعین حد ازدواج موجود ہے۔ عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازواج کی کہیں ممانعت نہیں کی۔ چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ ''میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی نظیر پر جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لئے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی اُن بیس انجیلوں میں سے جن کو اُن کے معتقدوں نے اُن کے احکام قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی، جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے''۔ (91)

اس کے بعد سرسید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم جان ملٹن جو تعدد ازواج کا ایک مشہور حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کی ہیں اُس کی تقریر نقل کی ہے جس میں تعدد ازواج کے جواز پر ایک لطیف و دقیق استدلال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ حال تو تعدد ازواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا، اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اُس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا ایسا ہوگا جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہوسکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنےٰ میں اجازت ہو۔ اور وہ یہی مسئلہ بحیثیت اسلام کا ہے۔ (92)

قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے:

''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً''۔ (93)

''یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کرسکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے''

اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہو کہ ''اس آیت کے اگر وہی معنی لئے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علما نے لئے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد زوج کو گویا بالکل روک دیا ہے کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازواج کی جو ایسی سخت شرط

کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کے بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے کیونکہ یہ نہیں کہا تھا کہ اِنْ لَّمْ تَعْدِلُوْا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا''۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لئے مستثنےٰ صورتوں کے سوا اس کو متعدد جوروئیں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی اور وہ یہ آیت ہے:

''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ'' (94)

''یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو) اس کے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے''
بیان کر کے لکھتے ہیں۔

''ہاں بلاشبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا منشا ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے ایک حیلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عملدرآمد کرنے سے وہ لوگ اُس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کے محرم راز ہے اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہو گی''۔ (95)

اس کے بعد سرسید نے طلاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ اول حسنِ معاشرت کی نظر سے اس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسنِ معاشرت و تمدن کا طلاق ہے۔ جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کیساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں ''لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد و عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے اور وہ علاج طلاق ہے کیونکہ اس سے مرد و عورت کو آزادی ہو جاتی ہے جن کے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ باایں ہمہ اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ ان بد اخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیز اس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اسی حالت میں اس کی جانب رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے جبکہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں اور ایسے تردداتِ و تفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والے اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن و طعن و جوتی پیزار میں رکھنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں۔ اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے اسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسنِ معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے''۔ (96)

اس کے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی و عیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ''یہودیوں کے ہاں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط حالت کے مرد کے اختیار میں تھا جب وہ چاہتا تھا طلاق نامہ لکھ کر جورو کو دے دیتا تھا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا۔ لیکن اگر فی الواقع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کی امتناع سے حضرت عیسیٰؑ کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے معتقدوں نے ان سے کہا کہ اگر جورو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں۔ اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں تو حسنِ معاشرت کے لئے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج دہ امور زن و شوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراضِ تزوج برباد ہو جاتے ہیں۔ اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لئے اور

بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے"۔(97)

اس کے بعد سرسید نے یورپ کے مشہور و نامور عیسائی عالم جان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رائے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق رکھتے ہیں نقل کی ہے اور بائبل کی جن آیتوں سے انہوں نے جواز طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں جس سے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ نے جو یہ فرمایا تھا کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں جو اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں" اس سے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے ورسوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لا علاج کا علاج ہے"۔

جان ملٹن کی تقریر نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اب دیکھنا چاہئے کہ اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اس نے طلاق کو بطور ایک مرض لا علاج کے جائز و مباح بتایا ہے مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا معاملہ ہے کہ جو اس میں بیماری پیدا ہو سوائے انہیں دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے بانی اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر، بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لئے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار کے پیدا ہوئی تھی"۔

"اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے"۔(98)

بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیرووں کو بتایا کہ:

"ما خلق الله شيئا على وجه الارض ابغض اليه من الطلاق"(99)

"یعنی کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو"۔

"پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ ابغض الحلال الى الله الطلاق (یعنی خدا کے نزدیک مباح چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے)"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا:

"ايما امرأةٌ سَالَتْ زوجَهَا طلاقاً في غير ما بأس فحرام عليها رائحة الجنة"

"یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے اس پر جنت کی بو تک حرام ہے"۔

پھر لکھتے ہیں کہ "پیغمبر خدا صلعم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعۃً قطعی طلاق دے دے وہ قتل ہونے کے لائق ہے چنانچہ نسائی نے روایت کی کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعۃً تین طلاقیں دے دیں۔ یہ سن کر آنحضرت صلعم غصہ میں بھرے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا اس نے خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے؟ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس کو قتل نہ کر ڈالوں؟ یعنی وہ شخص آنحضرتؐ کی شدت غضب سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کئے جانے کے لائق کام کیا ہے"۔(100)

اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "بانی اسلام نے طلاق کے روکنے میں انہیں تہدیدوں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ نکاح اور ملاپ قائم رکھنے کے لئے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دی جائے زن و شوہر میں پوری تفریق نہ ہوا اور دفعۃً تین

طلاقیں دینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب مناسب فاصلہ سے طلاق دی جائے کہ ہر ایک میں تقریباً پچیس روز کا فاصل ہوتا ہے، تا کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے تو بدستور زن وشوہر میں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرط مصالحت کے اسی طرح ملاپ ہو جائے لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائی تفریق ہو جائے''۔

''علاوہ ان ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور ان کے ساتھ مہربانی اور خاطر داری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں''۔

''اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن وشوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعہ سے حالتِ زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور بغیر اس کے حالتِ معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن وشوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسنِ معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے، پس ان کے افعال کی نفریں انہیں پر ہونی چاہئے۔ نہ مذہب اسلام پر۔ ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لئے اس کا جوڑا پیدا کیا تا کہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو''۔ (101)

مستشرقین کا تعدد ازدواج پر اعتراض کے تین اجزاء:

1۔ نفس قانون تعدد پر اعتراض

2۔ سنت نبوی پر اعتراض کہ اس نکاح کی محرک ہوائے نفس تھی

3۔ تعدد ازدواج امت کے حق میں چار تک لیکن حضور ﷺ نے تو نو یا گیارہ نکاح کئے۔ اس فرق پر اعتراض۔ (102)

ظاہر ہے کہ انبیا علیہم السلام کا قانون یورپ کے خود ساختہ قانون کا پابند نہیں۔ ہم اس سوال کا جواب دو طرح دیتے ہیں۔

1۔ نقلی یعنی یہود اور نصاریٰ کی مسلم کتاب بائبل سے۔ پہلا حوالہ ابوالانبیا حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے۔ بائبل پیدائش نمبر 16/4 میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں بیک وقت تھیں۔ سارہ، ہاجرہ، قطورا۔ (103)

2۔ پیدائش نمبر 29/24 میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیک وقت چار بیویاں تھیں۔ لیا، زلفہ، راخل، بلہہ۔ (104)

3۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے تعداد زوجات یعنی بیویاں تھیں۔ (105)

4۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی انیس بیویاں تھیں۔ (106)

5۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار عورتیں تھیں۔ (107)

یہ سب بائبل کے مستند پانچ انبیاء علیہ السلام کی متعدد زوجات کے حوالے ہیں۔ اگر ان پر مستشرقین کو اعتراض نہیں ہے تو تعدد نکاح نبوی پر اعتراض کس منہ سے کرتے ہیں۔ یہ تو قانون تعدد نکاح کی نقلی دلیل عیسائیوں کی بائبل سے دی گئی۔ اب عقلی دلیل تعدد نکاح کی دیکھتے ہیں۔

عقلی دلائل:

1۔ اگر یورپ کے قانون کے مطابق ایک مرد کے لئے صرف ایک بیوی کے ساتھ نکاح مختص ہو تو پھر فطرت اور قدرت کے لئے یہ ضروری تھا کہ ولادت میں ذکور واناث میں مساوات رکھی جاتی۔ یعنی لڑکے اور لڑکیاں کل عالم میں اور ہر جگہ مساوی تعداد میں پیدا ہوتے۔

تا کہ لڑکیوں کی تعداد بڑھنے نہ پائے، اگر لڑکیوں کی تعداد پیدائش لڑکوں سے ایک فی ہزار بھی زائد ہو جاتی تو تین ارب انسانی آبادی میں ایک لاکھ لڑکوں کی پیدائش کے مقابلہ میں ایک لاکھ ایک سو، اور ایک کروڑ لڑکوں کے مقابلہ میں دس ہزار لڑکیاں زائد ہوں گی، اور ایک ارب کے مقابلہ میں دس لاکھ عورتیں فالتو ہوں گی۔ علی ہذا القیاس۔

اب سوال ہوگا کہ یہ فالتو عورتیں جنسی فطری خواہش کی تکمیل کے لئے یا خلاف فطرت تجرد پر مجبور کی جائیں گی۔ جو ہر دور میں اور بالخصوص اس دور میں ناممکن ہے۔ یا زنا کے ذریعہ ناجائز طریقہ سے اپنی خواہش پوری کریں گی۔ جو انسانی معاشرے کی تباہی کا موجب ہوگا۔ لہذا قانون تعدد نکاح کی صورت میں جو بشرط عدل اسلام میں موجود ہے ان کی فطری ضرورت کی تکمیل کی قانونی صورت پیدا ہوگی۔ بالخصوص آج کل جو عموماً عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے ان کی کھپت کے لئے اسلام کے فطری قانون تعدد نکاح کے سوا اور جائز راہ نہیں۔

2۔ تعداد اموات میں بھی قدرت کے لئے مرد اور عورتوں کی مساوات ضروری تھی۔ موت کی صورت میں اگر یک زوجگی کا یورپی قانون فطری اور قدرتی ہوتا تو قدرت کا فرض تھا، کہ مردوں اور عورتوں کی قبض روح اور موت میں یکسانیت رکھتی۔ تا کہ توازن پورا رہے۔ ورنہ اگر مرد زیادہ مر جائیں اور عورتیں کم مریں تو اگر دونوں کی ولادتی تعداد برابر بھی ہو، تب بھی بڑی تعداد عورتوں کی بچ رہے گی۔ جن کے کھپانے کے لئے یورپی قانون میں جائز صورت کوئی نہ ہوگی۔ بہر حال یورپی قانون یک زوجگی کے تحت کارخانہ قدرت کا فرض تھا کہ وہ شرح پیدائش و اموات کے دفاتر بذریعہ ملائکہ پورے ملک اور صوبوں اور ضلعوں تک میں قائم کرتی۔ تا کہ یورپی قانون زوجگی کا توازن برقرار رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا جس سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی قانون منشا ءقدرت وفطرت کی ضد ہے اور واجب الترک ہے۔

3۔ جنگ بھی فطرت انسانی میں داخل ہے۔ انسانی افراد و اقوام قوت شہوت ز دعیہ (یعنی حب الوطنی) کے تحت فوائد ملک پر قبضہ کرنے کے لئے آلات حرب کے ذریعہ دوسرے ملک پر حملہ کرتے ہیں۔ اور جس ملک پر حملہ ہوتا ہے، وہ مدافعت کے لئے جنگ کرنے پر مجبور ہوتا ہے جس کی وجہ سے دونوں قوموں کی فوجیں قوت غضبیہ کا مظاہرہ کرتی ہیں اور لاکھوں، کروڑوں آدمی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں یا بیکار ہو جاتے ہیں۔

جنگ اول میں ایسے مقتولین و بیکار لوگوں کی تعداد چار کروڑ تھی۔ اور جنگ عظیم ثانی میں چھ کروڑ تعداد تھی۔ ایسی صورت میں اکثر مرد کام آ جاتے ہیں۔ اور عورتیں بچ جاتی ہیں۔ فوج میں اکثر مرد ہیں، عورتیں نہ ہونے کے برابر۔ تو گویا گذشتہ دونوں جنگوں میں جو دس کروڑ آدمی ضائع ہوئے ان کے بالمقابل جو عورتوں کی تعداد بچ گئی اس کو کہاں کھپایا جائے۔ جائز راستہ (تعدد نکاح) تو مغربی قانون میں بند ہے۔ یہ دقت اس صورت میں بھی باقی رہے گی، اگر قبل از جنگ مرد و زن کی تعداد برابر فرض کر لی جائے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ متعدد بیویوں میں بے انصافی ہوتی ہے، تو بے انصافی ایک بیوی کے ساتھ بھی کی جاتی ہے۔ لہذا ایک کی بھی بندش ہونی چاہیے۔

4۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلی بیوی بیمار رہتی ہے، اور مرض ممتد ہوتا ہے۔ یا حیض ونفاس کی صورت ہوتی ہے یا بانجھ پن ہوتا ہے اور شوہر کو فرزند اور جانشین کی فکر ہوتی ہے۔ اس صورت میں جنسی جذبہ کی ضرورت بھی اس بیوی سے پوری نہیں ہوتی۔ کیا ایسی صورت میں عقل کا تقاضا یہ نہیں کہ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لئے دوسری بیوی کو نکاح میں لانے کی قانونی گنجائش موجود ہو۔ یا پھر یہی مناسب ہوگا کہ ان ضرورتوں کو کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے۔ اسلام نے جو دین فطرت ہے نے گذشتہ حالات کو پیش نظر رکھ کر بشرط عدل دوسری بیوی یا زیادہ کی چار بیویوں تک اجازت دی۔ اور سابق اقوام و ادیان کی لاتعداد زوجات کو عدل کی شرط پر چار میں محدود کیا۔ یورپ میں آج کل شوہروں کی سپلائی کے لئے انجمنیں قائم ہیں۔ اور عورتیں پریشان پھرتی ہیں۔ شوہر نایاب ہوتا جا رہا ہے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے، اگر محمدی قانون پر عمل ہوتا۔ جیسا کہ مسیح نے حالات سے مجبور ہو کر مسیحی قانون کو ترک کر کے طلاق میں محمدی قانون پر عمل کر کے مشکلات کو حل کیا۔ اور نبی امی کی صداقت ماننے پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح امریکہ نے بھی میڈیکل بورڈ کی تحقیقی رپورٹ کے بعد شراب کی صحتی، نفسیاتی، حیاتیاتی مضرات پر مطلع ہو کر 1937ء میں تحریم و بندش شراب کا قانون امریکہ میں نافذ کیا تھا۔ لیکن ڈوبے لگام معاشرہ کو پابند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اب قانون تعدد زوجات پر اعتراض کا جواب ختم ہوا۔ (108) اعتراض کا دوسرا جزء کہ نیت پر اعتراض۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے۔

تعدد ازدواجات پر پیغمبر اسلام علیہ السلام کی نیت پر اعتراض:

مستشرقین سے مراد وہ یورپی متفکرین ہیں، جو علوم شرقیہ بالخصوص علوم اسلامیہ کا مطالعہ اس خیال سے کرتے ہیں کہ اپنی تصنیف کو بنام تحقیق علمی شائع کریں۔ ان کی تصنیفات میں ایک بات تعصب پر پردہ ڈالنے کی غرض سے قرآن، صاحب قرآن اور اسلام کی تعریف میں بھی لکھ دی جاتی ہے۔ اور بہت سی اسلامی کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے جاتے ہیں تاکہ مضمون مسلمان ناظرین کی نگاہ میں مقبول ہو جائے۔ لیکن ساتھ ساتھ ایسی باتیں اور زہر شامل کر دیئے جاتے ہیں کہ مسلمان اگر عیسائی نہ ہو تو کم از کم مسلمان بھی نہ رہے۔ یعنی قرآن اور صاحب قرآن علیہ السلام اور اسلام کے متعلق ان میں تشکک اور تردد پیدا ہو اور عقیدہ کی پختگی زائل ہو۔ بلاشبہ اسلام کے خلاف مسیحی یورپ کا قلمی جہاد ہے۔ کیونکہ تلوار کے جہاد سے وہ کامیابی نہیں ہو سکتی جو اس قلمی جہاد سے ہو سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود مسلمان برائے نام اسلام کا نام برقرار رکھ کر اسلام کو مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ یہی نسخۂ اکسیر ہے جو شرقی پاکستان کے ہندو استادوں اور پروفیسروں نے وہاں سکولوں اور کالجوں میں استعمال کیا۔ اور اظہار ہمدردی کے لئے مرچ مصالحہ بھی شامل کیا کہ مغربی پاکستان والے بنگالیوں کو لوٹ رہے ہیں۔ بنگالیت کے جذبہ کو ابھارا اور اسلامیت سے نفرت دلائی یا بدظن کیا گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہمارے سامنے ہے لیکن مغربی پاکستان میں نصاب تعلیم اور اساتذۂ تعلیم پر اب تک تجربے کے بعد بھی ہماری احتسابی نظر نہیں ہوئی۔ ہم انہیں لایعنی جھگڑوں کے شکار ہیں۔ مستشرقین کی یہ ساری دشمنی اسلام سے ہے یا دیگر مذاہب شرق سے۔ یہی حال روسی سوشلزم کا ہے کہ اس کا نشانہ تیر بھی صرف اسلام ہے، نہ مذہب نہ بدھ، نہ مجوسیت، نہ مسیحیت۔ اس کے چند وجوہ ہیں۔

1۔ اسلام کو وہ جاندار مذہب سمجھتے ہیں کہ اگر کسی وقت وہ زندہ ہوا تو بہت بڑی طاقت بن جائے گا جس کا مقابلہ مشکل ہے۔

2۔ اس میں عالمی مسائل کو حل کرنے کی وہ قوت و کشش موجود ہے، جو دیگر مذاہب میں نہیں۔ وہ مذاہب مردہ ہیں۔ اس لئے اسلام کے شیر کو مارا تو نہیں جا سکتا، سلا دینا ضروری ہے۔

3۔ صلیبی جنگوں سے مسیحی اقوام کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے۔ جو ان سے جدا نہیں ہو سکتی، ان سب باتوں کے باوجود بعض مستشرقین حضور علیہ السلام کے متعلق بعض غلط بیانیوں کے انکار اور اصل حقیقت کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضور علیہ السلام نے جو متعدد شادیاں کیں، نفسانی جذبہ کی وجہ سے کیں، یا دیگر مصالح کی وجہ سے ہم چند مؤرخین یورپ کے حوالوں پر اکتفاء کرتے ہیں، جنہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ نکاح نفسانیت کی غرض سے نہیں ہوئے۔ (109)

1۔ ڈی۔ ایس مارگولیتھ: یہ بڑا تنگ نظر اور متعصب نکتہ چین ہے۔ لیکن وہ اپنی کتاب ''محمد اینڈ دی رائز آف اسلام'' میں لکھتا ہے کہ بہت سے مصنفین یورپ کے نزدیک خدیجہؓ کے بعد محمد (ﷺ) کی متعدد شادیاں نفسانی خواہشات کے تحت تھیں، مگر وہ اس قسم کی نہ تھیں، کئی شادیاں سیاسی مصلحت کی بنا پر کی گئی تھیں۔ پیغمبر اپنے معتقدین کو اپنے قریب ترین کرنا چاہتے تھے۔ یہ وجہ ابوبکر و عمر کی لڑکیوں عائشہ و حفصہ سے شادی کرنے کی تھی، سیاسی مخالفین یا مغلوب دشمنوں کی لڑکیوں سے شادیاں سیاسی مقصد کے تحت دوسری نوعیت کی تھیں۔ باقی شادیوں کی وجہ یہ تھی کہ کوئی لڑکا نہ تھا۔ (110)

2۔ آربا سوتھ سمتھ کے چار لیکچر 1874ء میں جو ''محمد اینڈ محمڈزم'' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، کہتا ہے کہ دوسرے مقاصد کے علاوہ محمد کے اکثر و بیشتر شادیوں کے مقاصد بے سہارا افراد پر ترس کھانا تھا۔ تقریباً سب ہی بیوائیں تھیں، جو نہ خوبصورت تھیں نہ دولت مند خدیجہؓ کے وقت رحلت تک خود پچاس سال کی عمر کے تھے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ زینب کی کہانی میں رنگ آمیزی کی گئی زینبؓ پیغمبر کی پھوپھی کی بیٹی تھی اور بجائے آزاد غلام سے ان کی شادی کر دینے کے خود ان کے ساتھ شادی کرنے میں رکاوٹ کوئی نہ تھی جب وہ اور یہ دونوں جوان تھے۔ (111)

3۔ ''ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ'' میں یورپ کا مشہور مصنف کارلائل لکھتا ہے: ''محمد نفس پرست انسان نہ تھے۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہو گی کہ اس شخص کو ایک عام بندۂ ہوس تصور کریں۔ یہ شخص کیف اور حظِ نفس پر گرنے والے نہ تھے،ان کے گھر کا ساز و سامان بادشاہی حاصل ہونے کے باوجود غریبانہ تھا۔ان کی خوراک جَو کا آٹا اور پانی تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ مہینوں ان کے گھر آگ نہیں جلی،وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتے تھے اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگاتے تھے،ایک غریب محنتی،مستغنی انسان ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن پر عام سطح کے آدمی مرتے رہتے ہیں۔اس قسم کا آدمی برا نہیں ہو سکتا۔اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں۔اگر وہ ایسے ہوتے تو وحشی عرب جو 23 سال اس کے اشاروں پر جان پر کھیلتے رہے اور عمر بھر اسے قریب سے دیکھتے رہے،اس کی تعظیم نہ کرتے،وہ بات بات پر کٹ مرنے والے وحشی تھے۔ایسے لوگوں سے اپنی جماعت کرانا کسی عام آدمی کا کام نہ تھا۔وہ انہیں رسول کہتے تھے۔اس لئے ان کی ساری زندگی ان کے سامنے بے نقاب تھی۔ اس میں کوئی راز نہ تھا،سیدھی سادھی زندگی کبھی وہ ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہیں،کبھی مشاورت میں،کہیں ان میں کھڑے ان سے اطاعت کرا رہے ہیں،انہیں انہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کے انسان ہیں۔اس لئے وہ ان کو پیغمبر کہتے تھے۔کوئی شہنشاہ اپنی خلعت فاخرہ میں ملبوس ہو کر لوگوں سے اس قسم کی اطاعت نہیں کرا سکتے جس قسم کی اس انسان نے کرائی۔(112)

4۔ لین پول ''لائف آف محمد'' میں لکھتے ہیں: یہ کہنا کہ محمد بندۂ ہوس تھے،غلط ہے۔ان کی روزمرہ کی زندگی ان کا تخت بوریا جس پر وہ سوتے تھے،ان کی معمولی غذا،کمتر سے کمتر کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا،ظاہر کرتا ہے کہ وہ نفسانی خواہشوں سے بلند و بالا تھے۔ان کی متعدد شادیاں ان بیواؤں سے ہوئیں جن کے شوہروں نے میدان جنگ میں اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ محمد کی کشادہ دلی سے اپنی حفاظت و پناہ کا حق رکھتی تھیں۔باقی شادیاں مصلحت کی بناء پر کی گئیں۔مخالفین کے سرداروں کو مسخر کرنے کے لیے سب سے بڑا سبب بیٹے کی تمنا تھی،جوان کے قدم بقدم چلے۔سب سے پہلا ثبوت ان کی پہلی بیوی خدیجہؓ کے ساتھ ان کی وفا شعاری ہے کہ شروع سے آخر تک اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ہلکی سی بھی لغزش نہ ہوئی۔خدیجہؓ کے بعد اگرچہ انہوں نے متعدد شادیاں کیں لیکن انہیں کبھی نہ بھولے اور آخر وقت تک یاد رکھا۔ یہ محبت بھری یاد ایک شریف الطبع انسان ہی میں ہو سکتی ہے نہ ایک بندۂ ہوس میں۔(113)

جدید دشمنوں کا اقرار:

یہ حوالجات ان مخالفین اسلام مورخین یورپ کے ہیں جو پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زندگی پر سخت سے سخت تر تنقید کے عادی ہیں، انہوں نے بھی تاریخی واقعات سے مجبور ہو کر حضور علیہ السلام کی ذات کو ہوا و ہوس و عام خواہشات کی دنیا سے بلند مقام عطا کیا۔ یہ تو جدید دشمنوں کا اقرار ہے۔

قدیم دشمنوں کا اقرار:

قدیم دشمنان پیغمبر اسلام جن کی تمام کوششیں اور جان و مال کی ساری قربانیاں صرف اس لئے تھیں کہ آپ کو نا کام کر کے لوگوں کی نظروں میں غیر مقبول بنائیں۔لیکن ان دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن نے بھی حضور علیہ السلام کے متعلق ہوا و ہوس یا خواہش پرستی کا ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔ ورنہ مستشرقین کے لئے صرف وہی حرف نقل کر دینا اثبات مقصد کے لئے کافی تھا۔اور اپنی طرف سے الزام تراشنے کی ضرورت نہ تھی۔اس سلسلے میں بدترین دشمن ابوسفیان اور اس کے قریشی ساتھیوں کا مجمع عام میں وہ بیان جس سے آپ کی عزت مآبی اور امانت داری کا واضح ثبوت ملتا ہے شہادت کے لئے کافی ہے۔(114)

تعدد زوجات:

چنانچہ تعدد زوجات پر ہم دو طرح بحث کرتے ہیں،ایک بحیثیت مجموعی دوم انفرادی حیثیت سے مجموعی حیثیت سے یہ تحقیق کرنا ہے کہ جب دلائل سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضور علیہ السلام کے تعدد زوجات میں قطعاً شائبہ نفسانیت شامل نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی پوری زندگی

نفسانی خواہش کے خلاف جہاد کا نمونہ تھی، اور اس وجہ سے بھی اگر تعدد زوجات میں نفسانی خواہش کا دخل ہوتا تو آپ نو جوان حسیناؤں کا انتخاب کرتے۔لیکن آپ کی جملہ زوجات بجز ایک کے سن رسیدہ اور بیوائیں تھیں۔اس کے علاوہ نفسانی جوش کا زمانہ جوانی کا ہوتا ہے۔لیکن جوانی سے لے کر باون سال کی عمر تک آپ نے ایک بوڑھی بیوہ عورت کے نکاح پر اکتفا کیا۔اس کے بعد کے بڑھاپے اور قریب الوصال وقت میں تعدد کی نوبت آئی۔

تعدد زوجات کا اصل سبب تنظیم دین تھا:

سبب اول: اس تعدد زوجات کا منشا لازماً کوئی اور تھا۔اور وہ یہ تھا کہ حضور علیہ السلام کا قول و عمل امت کے لئے ہدایت کا سامان اور نمونۂ عمل تھا، بلکہ تمام عالم انسانی کے لئے بین الاقوامی تھا۔اور دروازۂ نبوت کی بندش کی وجہ سے آپ کے ایک ایک قول و عمل اور اندرون خانہ زندگی کا کردار اور ازواج مطہرات سے آپ کا طرز معاشرت ادا حقوق اور اخلاقی زندگی کا پورا نقشہ امت کے مرد اور عورتوں، شوہروں اور بیویوں دونوں کے لئے نمونہ تھا۔اور اسی نمونہ کے قالب میں اپنی زندگی کو ڈھالنا لازمی تھا۔

"لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة"(115)

یقیناً تمہارے لئے حضور علیہ السلام کے قول و عمل اور طرز زندگی میں انسانیت کاملہ کا بہتر نمونہ ہے۔اس وجہ سے ایک ایسے ادارہ کا قیام ضروری تھا جو اس داخلی زندگی کی تعلیم کے لئے ازواج کے ذریعہ وجود میں آیا، کیونکہ اسلام کے قانون حجاب کے تحت پیغمبر اسلام علیہ السلام سے امت کی اجنبی عورت نہ بے حجابا نہ مل سکتی تھی اور نہ پابندیٔ قانون پردہ کے تحت حضرۃ علیہ السلام اجنبی عورتوں سے مل سکتے تھے۔اور نہ ہی اندرون خانہ زندگی رسالت کے مشاہدہ کی صورت ہو سکتی تھی۔اس لئے تکمیل تعلیم دین کے لئے منشاء الٰہی نے یہ انتظام کیا کہ ایسی عورتوں کا مختلف طبقات میں سے انتخاب ہو کہ وہ نفس، پاکیزگی قلب اور فہم دین میں امتیازی شان رکھتی ہوں تا کہ وہ حضور علیہ السلام سے اور اسوہ نبویہ بالخصوص مستورات سے متعلقہ مسائل کو حاصل کر سکیں اور صحیح سمجھ سکیں اور امت کو عموماً اور مستورات امت کو خصوصاً ان کی تعلیم دے سکیں۔ تا کہ حضور علیہ السلام کی تعلیم کو مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر پہنچانے اور ابلاغ میں آسانی ہو۔اور گھر کے اندر کے احوال اور زوجات کے حقوق اور حسن معاشرہ کا صحیح نمونہ امت کو معلوم ہو سکے۔یہی وجہ ہے کہ خدیجہؓ کے بعد ازواج مطہرات کا انتخاب بھی حضور اکرم ﷺ نے خود نہیں کیا بلکہ وحی الٰہی سے ہوا کہ اس کام کی صحیح اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا تھا۔حضرت خدیجہؓ اور زینبؓ بنت خزیمہ نے حضور علیہ السلام کی زندگی میں وفات پائی اور نو بیویاں حضور علیہ السلام کی وفات کے وقت تھیں۔

یہ حدیث ملاحظہ ہو:

> "عن ابي سعيد الخدري قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما تزوجت شيئًا من نسائي ولا زوجت شيئًا من بناتي الا بوحي جاء ني به جبريل عن ربي عز وجل. اخرجه عبدالمالك ابن محمد"، (116)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ زمانۂ نبوت کی ازواج مطہرات کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔آپ کی خواہش نفس کو اس میں دخل نہیں تھا۔اس لئے بجز ایک حضرت عائشہؓ کے سب عمر رسیدہ اور بیوہ منتخب ہوئیں۔کہ کار تبلیغ و تعلیم دین کی پوری اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا ہے۔جیسے نبی کا انتخاب خدا کرتا ہے زوجیت نبی کا انتخاب بھی خدا نے کیا کیونکہ مقصد نبوت کی اہلیت اور مقصد زوجیت نبوت کا صحیح علم صرف خدا کو ہے۔اس ادارۂ ازواج کا فائدہ یہ ہوا کہ نبوت محمدی کے بہت سے علوم ازواج مطہرات کے ذریعہ امت کو پہنچے ورنہ امت ان علوم سے محروم ہوتی۔(117)

سبب دوم: پھر ان ازواج مطہرات کی ذوات قدسیہ میں شدت تعلق کی وجہ سے جو اخلاق زکیہ وفضائل ومحاسن حضور علیہ السلام سے منتقل ہوئے وہ پوری امت اور امت کی مستورات کے لئے نمونۂ عمل ہیں۔ کتب سیر و رجال میں ان ازواج مطہرات کی عبادت، روزے، تلاوت قرآن، ذکر اللہ، سخاوت، ترک محبت مال، قناعت، فکر آخرت اتباع شریعت کے جو احوال درج ہیں ان کو دیکھ کر ایمان قوی ہو جاتا ہے۔ اس لئے قرآن پاک نے فرمایا وازواجہ امھاتھم کہ حضور علیہ السلام کی بیویاں امت کی مائیں ہیں۔ جیسے حضور ﷺ امت کے باپ ہیں یعنی جیسے ایمان کی تازگی وحیات میں احوال نبی کو دخل ہے۔ اقوال زوجات نبی کو بھی دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لستن کاحد من النساء۔ تم (زوجات پیغمبر) دیگر عورتوں کی طرح نہیں ہو بلکہ تمہارا مقام بہت بلند ہے۔

سبب سوم: دین حق وعدل الٰہی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کینہ پرور عربوں کے انتقامی جذبات کا فطری جوش تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ تعلیم امت کے لئے دائرۂ زوجیت میں جن مستورات کا انتخاب ہو اُن سے مقصد تعلیم امت کے علاوہ ان زخموں کی بھی مرہم پٹی کی جائے جو مقابلہ دین حق میں ان کے خاندانوں کو پہنچ چکے ہیں۔ اور ان کا سبب اگرچہ ان کے اپنے کئے ہوئے جرائم واعمال ہی تھے مگر ان با اثر وقوی خاندانوں کی وجہ سے جو اشاعت حق کی راہ میں ایک تاریخی عداوت اور انتقام کیشی کی فضا پیدا ہو چکی تھی، جس کا دور کرنا ضروری تھا۔ (118)

جویریہؓ:

اس سلسلۂ انتخاب میں حضرت جویریہؓ بنت حارث آتی ہیں جن کا پہلا نکاح سافع بن صفوان سے ہوا تھا جو غزوہ میں مارا گیا تھا۔ یہ ایک طاقتور قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں۔ قید ہو کر آئیں اور ثابت بن قیس کے حصہ غنیمت میں آ گئیں۔ انہوں نے اس سے مکاتبت کر لی۔ یعنی یہ کہ آپ اتنی رقم ادا کر دیں، تو آپ آزاد ہو جائیں گی۔ یہ رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئیں، آپ نے فرمایا اگر رقم میں ادا کر دوں اور آزاد کر دوں اور پھر میں خود تم سے نکاح کر لوں تو نکاح پر تم راضی ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں راضی ہوں (ابوداؤد، کتاب العتاق) اتفاق سے ان کے باپ حارث آئے انہوں نے کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں رہ سکتی۔ آزاد کر دیں۔ آپ نے فرمایا میں اس کو جویریہ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ جویریہ نے فرمایا میں اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ (119)

ام حبیبہؓ:

تیسری زوجہ مطہرہ ام المومنین ام حبیبہؓ ہیں جو اسلام کے خلاف اکثر لڑائیوں کے کمانڈنگ افسر اور قریش کے سردار ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ان کی ماں حضرت عثمانؓ کی پھوپھی صفیہؓ بنت ابی العاص تھیں۔ ان کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ حضرت ام حبیبہؓ خود بھی مسلمان ہوئیں اور ان کی تبلیغ سے ان کے شوہر بھی مسلمان ہوئے۔ اس وقت ان کے باپ ابوسفیان اور بھائی معاویہ جو اسلام کے دشمن تھے، دونوں ان کو اسلام لانے پر ستاتے رہے، تنگ آ کر دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں کچھ مدت کے بعد شوہر عبید اللہ بن جحش نصرانی ہو گیا، لیکن ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں۔ حضور ﷺ کو اطلاع ہوئی آپ نے متاثر ہو کر سوچا تو آپ کو ان کی اس استقامت کا خیال آیا کہ انہوں نے اپنے سردار باپ کی دشمنی مول لے کر افریقہ کے ملک میں پناہ لی۔ پھر شوہر اس عیسائی ملک میں مرتد ہو کر مر گیا۔ لیکن ام حبیبہؓ کی ایمانی استقامت میں فرق نہ آیا، یہ دونوں امور ایسے ہیں کہ اس صورت میں بے سہارا مستورہ کو سہارا ملنا چاہئے۔

دوم یہ کہ اس طرح ان کے باپ اور خاندان کی اسلام دشمنی میں کمی بھی آ جائے گی۔ یہ دو اہم سبب ہوئے کہ آپ نے ام حبیبہ کو شرف زوجیت نبوی سے نوازا۔ حبشہ کے بادشاہ کو جو مسلمان ہو چکے تھے، حضور ﷺ نے اپنے قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ ام حبیبہؓ کو میری طرف سے پیغام نکاح پہنچا دو۔ چنانچہ یہ پیغام پہنچا دیا گیا۔ یہ بشارت سن کر بادشاہ کی اس باندی ابرہہ کو جس نے یہ پیغام پہنچایا تھا، ام حبیبہؓ نے اپنے ہاتھوں کے دو کنگن اور پاؤں کے پازیب اور انگلیوں کے چھلے انعام میں دئے اور نکاح ہو گیا۔ مہر نکاح چار سو پونڈ بادشاہ نے حضور علیہ السلام کی طرف سے مہر میں دے دئے۔ اور سامان بھی دیا۔ (120)

صفیہؓ:

چوتھی بیوی صفیہؓ بنت حیی بن اخطب ہیں۔ اس سلسلہ میں صفیہؓ بھی شرف زوجیت سے مشرف ہوئیں، جو بنی نضیر کے یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں، جن کا پہلا نکاح سلام سے ہوا تھا۔ اس نے طلاق دی۔ اس کے بعد دوسرا نکاح کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا۔ وہ غزوۂ خیبر میں مقتول ہوا۔ صفیہ قید ہو کر آئیں، حضور ﷺ نے آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ صفیہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں۔ اس نکاح سے بے سہارا صفیہ کی دلجوئی بھی ہوئی اور اس کا اظہار بھی مقصود تھا کہ حضور ﷺ کو یہود سے ذاتی عداوت نہیں تا کہ عداوت یہود میں کمی آجائے۔(121)

زینبؓ:

پانچویں بیوی زینبؓ بنت جحش تھیں۔ یہ حضور ﷺ کی پھوپھی امیہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ عرب کا دستور تھا کہ متبنیٰ یعنی لے پالک بیٹے کو اصلی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے اور اس کی بیوی سے بصورت موت یا طلاق بعد از عدت بھی نکاح حرام جانتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر کسی پر غاصبانہ وظالمانہ طریق پر غلامی کا داغ لگ جاتا تھا تو آزادی کے بعد بھی کسی شریف عورت کو اس کے نکاح میں دینے کو عار سمجھا جاتا تھا۔ ان دو رسموں کو عملی طور پر توڑنے کے لئے منشاء الٰہی کے تحت حضور علیہ السلام نے ان کا نکاح اپنے متبنیٰ لے پالک زید بن حارث سے کرنا چاہا لیکن چونکہ ایسا کرنا رواج عرب کے خلاف تھا۔ زینبؓ شریف خاندان سے تھیں اور حضور ﷺ کی پھوپھی زاد تھیں۔ زینب اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحش جو دونوں مسلمان تھے، ان سے جب حضور اکرم ﷺ نے تذکرہ کیا تو انہوں نے زید بن حارث آزاد کردہ غلام سے نکاح زینبؓ کو گوارا نہیں کیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

> "وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله و رسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله و رسوله فقد ضل ضلالا مبينا"۔(122)

اس آیت میں مومن اور مومنہ زینبؓ اور ان کے بھائی مراد ہیں۔ یعنی مومن مرد یا عورت کے لئے درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو وہ اس پر راضی نہ ہو۔ اور جو کوئی اللہ ورسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا۔ اس آیت کے نزول پر زینبؓ اور ان کے بھائی نکاح پر راضی ہو گئے اور نکاح ہو گیا۔ لیکن خاندانی برتری کا تصور چونکہ باقی تھا، دونوں میں موافقت نہ ہوسکی۔ حضرت زید جب شکایت حضور ﷺ کے پاس لے جاتے اور طلاق کا ارادہ ظاہر کرتے، تو حضور ﷺ اس خفگی پر صبر کی تلقین کرتے اور طلاق دینے سے منع فرماتے۔ یہ خیال تھا کہ ایک تو آزاد کردہ غلام سے نکاح کے عار کو برداشت کیا۔ اب اگر طلاق دی گئی تو طلاق کا عار بھی لگ جائے گا تو زیادہ ناراضگی پیدا ہوگی پھر جب موافقت ناممکن ہوگئی تو زید نے طلاق دے دی۔ طلاق کی عدت جب گزری اور اللہ کا منشاء ایک دوسری رسم جاہلیت کے ازالے کا ہوا کہ خود حضور ﷺ کے عمل سے اس رسم جاہلیت کو منہدم کیا جائے تو حضور ﷺ کو اگرچہ منشاء الٰہی کی تکمیل سے عذر نہ تھا لیکن یہ خیال رہا کہ عرب میں بدنامی ہوگی کہ وہ لوگ منہ بولے بیٹے کی جورو کو حرام کہتے تھے اور حضور ﷺ خود منہ بولے بیٹے کی جورو کو گھر میں رکھ لیں۔ پھر حضور ﷺ کے دل میں خیال آیا کہ حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان کو رواج عرب کے مطابق دو قسم کی رسوائی ہوئی۔

ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح کی، دوم طلاق کی۔ لیکن منشاء الٰہی تھا کہ اس زخم رسوائی کا مداوا ہو، جس کے لئے بہترین مرہم صرف یہ ہوسکتا تھا کہ حضور علیہ السلام خود زینبؓ کو اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔ لیکن ساتھ ہی عرب کی اس رسوائی کا ڈر تھا کہ یہ طعن دیا جائے گا، کہ آپ نے (لے پالک) بیٹے کی جورو سے نکاح کیا۔ کیونکہ عرب لوگ متبنیٰ کو بیٹا ہی سمجھتے تھے۔ لیکن منشاء الٰہی کے تحت آپ نے عمل فرمایا اور اس جاہلانہ قدیم رسم کا انقطاع فرما دیا۔ حضور ﷺ کے اس نکاح سے معاشرتی نظاموں کی اصلاح ہوئی۔ اور مساوات بشری کی ایک عمدہ نظیر بھی

قائم کی گئی۔لیکن عجیب بات ہے کہ مستشرقین نے صلیبی جنگوں کی موروثی عداوت سے جھوٹے اور بے سند اضافے کر کے اس کو عشقیہ داستان بنایا، گویا آپ اس نکاح کے لئے بیتاب تھے۔اس متعصبانہ غلط الزام تراشی کی تردید کے لئے صرف یہ کافی ہے کہ حضرت زینب حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں بچپن کے زمانے سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے حضور علیہ السلام نے خود ہی ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارث سے کرایا۔ جوان کو ناگوار بھی گزرا لیکن پھر خدا اور رسول کے حکم کی مجبوری سے نکاح پر راضی ہوئیں، میں کہتا ہوں کہ اگر حضور علیہ السلام اس نکاح کے لئے بے قرار تھے تو مکہ معظمہ میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد خود ان سے نکاح کر لیتے۔یا بعد از ہجرت جب آپ نے ان کا 4ھ میں زیدؓ سے نکاح کرانا چاہا تو زیدؓ بن حارث کی بجائے خود ان سے نکاح کر لیتے۔وہ کم نسبی کی وجہ سے زیدؓ کے نکاح سے راضی نہیں تھیں تو خود ان سے نکاح کر لینے میں کیا رکاوٹ تھی،اور اب بیوہ ہونے کے بعد نکاح میں کیا کشش تھی۔معلوم ہوا کہ یہ مسیحی استشراق کی غلط داستان ہے جو سراسر عقل کے خلاف ہے۔(123)

آپ کے حق میں چار سے زائد نکاح اور امت کے حق میں چار نکاح کے فرق پر اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہر مذہب میں:

1۔ سپیشل قانون موجود ہے۔ چنانچہ بائیبل کے بموجب حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب کہ وہ حضرت مریمؑ سے بلا باپ پیدا ہوئے ہیں۔یہ نسب خود آپ کے حق میں درست اور ثابت ہے۔اور عام ضابطہ میں دیگر انسانوں کے لئے یہ قانون نہیں ،گویا یہ قانون صرف حضرت مسیح سے مختص ہے۔حضرت مسیح کی ولادت بلا باپ ہوئی تو ابا پ موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی و اسرائیلی کو باہم دست و گریباں دیکھا تو قبطی کو مکہ مار کر ہلاک کیا۔(124)

کیا یہ قتل روا تھا یا نا روا؟ اگر جائز ہے،تو بائبل سے ثابت کرو۔اگر نا روا ہے تو کیا حضرت موسیٰ کی نبوت اس سے داغدار نہیں ہوئی۔اگر نہیں ہوئی تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت اور حضرت موسیٰ کا قتل استثنائی اور اسپیشل قانون تھا۔اسی طرح چار سے زائد بیویوں کا حضور علیہ السلام کے حق میں کیونکر استثنائی قانون نہیں ہوسکتا اور اس پر اعتراض کیوں ہے۔

2۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ چار بیویوں میں بشرط عدل انحصار کا قانون 8ھ میں آیا ہے۔جیسے محمد حسین ہیکل نے حیات محمد میں اس کی تصریح کی ہے۔اور حضور علیہ السلام کی بیویوں کا نکاح آٹھ ہجری سے قبل یعنی قانون مثنیٰ وثلث ورباع سے پہلے وجود میں آیا ہے۔قانون اربعہ سے قبل امت کے لئے بھی چار سے زائد کی اجازت کہ قانون اربعہ کے نزول سے قبل فرق ہی نہ تھا۔نبی اور امتی سب کے لئے چار سے زائد کی بندش نہ تھی۔

اس پر اگر یہ اشکال کیا جائے کہ نزول قانون اربعہ کے بعد زائد بیویوں کو الگ کر دیا گیا ہے سے ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔تو حضور علیہ السلام بھی امت کی طرح چار بیویاں جن کا نکاح مقدم تھا ان کو چھوڑ کر باقی کو الگ کر دیتے،تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ اس میں نبی اور امتی میں فرق کیا گیا۔کیونکہ امہات المؤمنین شرف زوجیت کی وجہ سے اگر الگ کر دی جاتیں تو ان کے ساتھ نکاح کسی اور کا حرام ہوتا۔(125)

فصل سوم

رسول اکرم ﷺ بطور سربراہ مملکت

مستشرقین کی کتابوں میں یہ بات عام ہے کہ وہ مسلمانوں کی حیرت انگیز کامیابیوں کی تابناکی کو کم کرنے کے لئے یہ تصور دیتے ہیں کہ یہ محض اتفاق تھا کہ حضور ﷺ اس دور میں پیدا ہوئے جب اہل عرب اپنی قدیم مذہبی قدروں سے بے زار ہو چکے تھے اور ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ چونکہ ماحول اس قسم کی تبدیلیوں کے لئے پہلے ہی تیار تھا اس لئے حضور ﷺ کا پیغام حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پھیلا۔ واٹ لکھتا ہے:

"It is axiomatic that the new religious movement of Islam must somehow or other have risen ou of the conditions in Mecca in Muhammad's time. A new religion cannot come into being without a sufficient motive". (126)

''یہ بات واضح ہے کہ اسلام کی نئی مذہبی تحریک حضرت محمد ﷺ کے زمانے کے مکہ کے حالات سے ابھری ہوگی ایک نیا مذہب اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک اس کے لئے کافی عوامل موجود نہ ہوں''۔

اسی طرح واٹ عرب میں توحید کا بیج بونے پر اسلام کو خراج تحسین پیش کرنے پر تیار نہیں بلکہ وہ اس کی اصل کہیں اور ڈھونڈتا ہے۔

"In other words, the Meccans, under Judaeo-Christian influence, must have been moving towards monotheism". (127)

''دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مکہ والے یہودیت اور نصرانیت کے زیر اثر توحید کی طرف رواں دواں تھے''۔

واٹ نے اپنی کتابوں میں بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ عربوں کا معاشرہ جن سماجی، معاشی اور روحانی قدروں پر قائم تھا، وہ قدریں بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں، نئے حالات کے لئے نئی قدروں کی ضرورت تھی، حضور ﷺ نے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھا، معاشرے کے حقیقی مرض کا سراغ لگایا اور معاشرہ جس قسم کی قدروں کے لئے تشنگی محسوس کر رہا تھا، آپ ﷺ نے کچھ اپنے تخیل کے زور سے اور کچھ دیگر ادیان کی نقل کر کے، چند قدریں وضع کیں اور انہیں قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ عرب ایسی قدروں کے لئے پہلے ہی چشم براہ تھے۔ انہوں نے فوراً ان کو قبول کر لیا۔ واٹ اپنے اس مفروضے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"During the years just before he received the call to prophethood Muhammad must have been increasingly aware of the unsatisfactory social conditions in Mecca. This was something he could observe for himself and did not require to be shown by revelation. The fundamental source of the trouble was that the traditional values of nomadic society (which was that of the recent ancestors of the Meccans) were proving inadequate in the prosperous mercantile economy of Mecca, and were also the

leading men of the calns were neglective the traditional duty of carring for the needy adn unfortune among their kinsmen Muhammad may well have come to see the root of the troubles as the secular, materialistic outlook of the very wealthy, and may even have decided that this could only be got rid of by some form of religious belief". (128)

''آغاز بعثت سے پہلے زندگی کے آخری سالوں میں محمد (ﷺ) مکہ کی مضطرب سماجی زندگی سے ضرور اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن کا محمد (ﷺ) خود مشاہدہ کر سکتے تھے اور ان سے آگاہ ہونے کے لئے آپ کو وحی کی ضرورت نہ تھی۔ ساری پریشانی کا راز اس حقیقت میں مضمر تھا کہ زندگی کی بدویانہ قدریں جو مکے والوں کے آباؤ اجداد کی سماجی قدریں تھیں، وہ مکہ کی خوشحال تجارتی زندگی کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں اور اسی وجہ سے ماند پڑ سکتی تھیں۔ امیر تاجر اپنے اپنے قبیلوں کے سردار بھی تھے، وہ اپنے قبیلوں کے کمزور اور غریب افراد کی کفالت کے روایتی فریضے کو نظر انداز کر رہے تھے.... محمد (ﷺ) نے اس بات کا اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تمام مسائل کا اصل سبب امیر ترین افراد کا لادینی اور مادہ پرستانہ رویہ ہے اور آپ نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہوگا کہ ان مسائل کا حل صرف کسی مذہبی نظریے کے ذریعے ہی ممکن ہے''۔

واٹ نے مذکورہ بالا جملے لکھتے وقت قرآن و حدیث کے ان بیانات کو پیش نظر رکھا ہے، جن میں مکہ والوں کو دولت پر اترانے اور غریبوں کی مدد نہ کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اگر اسلام نے مکہ والوں کو صرف دولت کے بارے میں ہی ان کے رویے پر تنبیہ کی ہوتی تو واٹ کی بات میں کچھ وزن ہوتا لیکن اسلام نے تو سب سے پہلے ان کے مذہب پر حملہ کیا۔ ان کو بتایا کہ پتھر کے بت جنہیں تم خدا سمجھتے ہو، یہ تو اپنے چہرے سے مکھی اڑانے کے بھی قابل نہیں۔ اسلام نے انہیں پتھروں کی پوجا چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلایا، ان کو آخرت کی زندگی اور جزا و سزا کا تصور دیا، انہیں بتایا کہ ان کا رحمن و رحیم اللہ جس طرح ہمیشہ انسانیت کی راہنمائی کے لئے رسول اور کتابیں بھیجتا رہا ہے، اسی طرح اس نے ان کی راہنمائی کے لئے اپنے حبیب ﷺ کو اپنی آخری الہامی کتاب دے کر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ مذہبی نظریات جو حضور ﷺ نے ان کے سامنے پیش کئے تھے، یہ ان کے روایتی مذہبی نظریات سے ٹکراتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حضور ﷺ کی مخالفت شروع کر دی۔

واٹ حضور ﷺ کی رسالت کی ایک اور توجیہ یہ کرتا ہے کہ مکہ کی معاشی عدم مساوات نے حضور ﷺ کی نفسیاتی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ آپ انتہائی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہونے کے باوجود معاشرے میں کوئی اہم مقام حاصل نہیں کر سکے۔ اسی طرح اور بھی بے شمار باصلاحیت لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اور چند نااہل لوگ، دولت کے زور پر، سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ ان جذبات نے حضور ﷺ کو بے چین کر دیا آخر کار آپ کے جذبات دعویٰ رسالت و نبوت کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

واٹ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"Yet he felt that his gifts were not being used to the full. He had a talent for administration that would have enable him to handle the biggest operations then carried out in Mecca, but the great merchants excluded him from there inner circle. His own dissatisfation made him more aware of the unsatisfactory aspects of life in Mecca. In these, hidden years, he must have brooded over such matters. Eventually what had been maturing in the inner depths was brought to light". (129)

''تاہم ان (محمد) کو احساس تھا کہ آپ ﷺ کی صلاحیتیں مکمل طور پر استعمال نہیں ہو رہی ہیں۔ آپ ﷺ اپنی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے بل بوتے پر، اس وقت مکہ کے کسی بڑے سے بڑے کاروباری عمل کو کنٹرول کر سکتے تھے لیکن بڑے تاجروں نے آپ ﷺ کو کاروباری مرکز سے دور رکھا۔ آپ کی ذاتی بے اطمینانی نے آپ ﷺ کو مکی زندگی کے بے اطمینانی کے پہلوؤں کا احساس دلایا ہوگا۔ ان غیر معروف سالوں میں آپ ﷺ نے بارہا ان معاملات پر غور کیا ہوگا۔ آخر کار جذبات جو باطن کی گہرائیوں میں پک رہے تھے، وہ منظر عام پر آ گئے''۔

منٹگمری واٹ کی اس تقریر کی بنیاد اسی مفروضے پر ہے کہ حضور ﷺ کو کاروباری میدان میں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع نہیں ملا، لیکن یہ مفروضہ تاریخ سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ کو کاروباری میدان میں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع بھی ملا تھا اور آپ نے اس میدان میں حیرت انگیز فتوحات بھی حاصل کی تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ پہلی دفعہ آپ ﷺ کی انہیں صلاحیتوں اور کاروباری کامیابیوں کی وجہ سے آپ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں اور انہوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ جب آپ کی روحانی عظمتوں کا، مشاہدہ کیا تھا تو اپنا سب کچھ آپ ﷺ کے قدموں پر نثار کر دیا تھا۔

دورِ نبوت کے اہلِ کفر کے بارے میں:

مکہ کے دورِ نبوت، بلکہ فتح مکہ سے پہلے تک کے زمانہ نبوت کو بھی سرولیم نے اپنے قیاس و تخمین کا نشانہ بنایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کے کفار یا تو ایمان لا چکے تھے یا وہاں سے نکال دیے گئے تھے۔ اور اب کوئی شخص وہاں نہ رہا تھا جو ان کے بارے میں یک طرفہ بیانات، بے بنیاد اتہامات اور مبالغہ آمیز الزامات کی تردید کرتا۔ اور چونکہ کو رسول اکرم ﷺ ان پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرأت ہوتی، اور اسی وجہ سے اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے۔ اور مورخین ہمیشہ اس شہادت پر جو ان کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے رہتے تھے۔ لیکن سرولیم کا یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بادہوائی ہے بلکہ اس سے خود ان کے مسلمہ عقائد اور اصولوں کی بھی مخالفت لازم آتی ہے۔

بقول سرسید:

''صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیاء السلام اور ان کے تبعین پر بھی صادق آتا ہے۔ خصوصاً اس زمانے پر جب کہ حضرت موسیٰ نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست و نابود کر دیا تھا اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ مگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں۔ اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی، ایمانداری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاقی کا مادہ ہیں لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یکلخت محو ہو گئے ہوں۔ اور وہ سب یک دل ایک زمانہ ہو کر بدترین افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں۔ یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں اور جن کو ان سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو یہی امر یعنی ان واقعات کے گواہان معائنہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات میں غلط بیانی کے عدم امکان کا ثبوت ہے۔ (130)

ہوسِ مادی کا الزام:

سرولیم اپنے تعصب اور جوش میں عجیب و غریب باتیں تراشتے چلے گئے ہیں۔ وہ یہ لکھتے ہیں کہ ''محمد ﷺ صاحب کی صحبت میں راوی کی ہوس نے بار پایا'' کیونکہ پیغمبر ﷺ کے نام کے ساتھ شرافت و حرمت وابستہ تھی، اور ان کی دوستی حصول مدارج اور عزت کا سبب تھی۔ ''اور اس ہوس نے محمد ﷺ کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے تعلق پیدا کرنے اور وحی میں مذکور ہونے کی سب سے بڑی ممکن الحصول عزت کا امکان پیدا کر دیا تھا جو خلاف فطرت واقعات کے ایجاد یا مبالغے کا باعث ہوئی۔ اور روایات میں غلط بیانی کا سبب بنی'' اس موقع پر سرسید کا

جواب پڑھنے کا لائق ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل طرفدار بن جائے تو اس میں کچھ چارہ نہیں، یہ کس طرح خیال میں آسکتا ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں۔ اور جن کے دلوں کے مخفی سے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبر ﷺ خدا کی سنت کی پیروی ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ راستہ ہے۔ اور ان کے احکام سے سرتابی کرنا ابدی گمراہی کا موجب ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب کے سب اپنے نبی کے فرمائے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی، فریب دہی اور ریاکاری میں یکلخت مبتلا ہو گئے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ہر طرح کی بد اعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں۔ بطور مثال کسی مذہب کو لو، ہندو مذہب کو، بدھ مذہب کو، دیگر مشرک مذاہب کو، یہودی مذہب کو، عیسوی مذہب کو اور اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک، پروٹسٹنٹ، یونی ٹیرین ٹرین، ٹرینٹیرین، ویزولینز، بپٹسٹ، جمپرز، مورمنز، وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی، صداقت، ایمانداری، راست بازی، سرگرمی، راسخ الاعتقادی اور جان نثاری کی بو پاؤ گے۔ اور اپنے نبی کے حکام اور اپنے مذہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پاؤ گے۔ ہم کو اپنے اس بیان کی تائید اور تصدیق کے لئے ہزاروں مثالوں میں سے صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ جب زید بن ثابتؓ سے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کے منتشر اجزاء کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے فرمایا تو کچھ عرصہ تک زید بن ثابتؓ خوف کے مارے مین عالم سکوت میں رہے۔ اور پھر جب ہوش وحواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکر سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے جوش میں سوال کیا کہ ایسے کام کی جو خود پیغمبر خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا۔ آپ کیونکر جسارت کرتے ہیں۔ اس طرح کی ہزاروں مثالوں کی موجودگی میں یہ بات کس طرح ذہن میں آسکتی ہے کہ لوگوں نے جو پیغمبر خدا سے اس قدر خوف اور ان کی اس قدر تعظیم کرتے تھے۔ اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو نہیں جانتے تھے۔ فوراً ہی (سرولیم کی بیان کردہ) برائیوں کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل وخوار کر دیا ہو اور ایسے ایسے گناہ عظیم ان سے سرزد ہوئے ہوں۔ (131)

موںٹگمری واٹ نے اپنی کتاب میں اسی طرح جابجا رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی ہیں اور آپ اور آپ کے صحابہ کرام کی طرف غلط باتیں منسوب کی ہیں۔

جس طرح مکی دور میں آپ ﷺ کی حیثیت اور رتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ایسی ہی کوشش مدینے میں بھی کی گئی۔

چنانچہ واٹ لکھتا ہے:

"His powers under the constitution are so slight that they cannot have been much less at the beginning of his residence in Medina". (132)

''میثاق مدینہ کے تحت آپ کے اختیارات اتنے معمولی تھے کہ آپ ﷺ کے مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں اس سے کم اختیارات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا''۔

آگے لکھتا ہے:

"Muhammad as chief of the Emigrants was on a level with the chiefs of the various clans".

''محمد ﷺ مدنی قبائل کے سرداروں کے برابر ایک سردار تھے''۔

مزید لکھتا ہے:

"He is very far, however, from being autocratic ruler of Medina. He is merely one among a number of important Men". (133)

''آپ مدینہ کے خودمختار حکمران ہونے سے کوسوں دور تھے۔ آپ متعدد اہم آدمیوں میں سے ایک تھے''۔

حضور کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ تمام معاملات کے فیصلے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے کرتے تھے۔ لیکن واٹ اسے آپ کی کمزوری گردانتا ہے۔

"Muhammad is seen to be the chief of one of several co-operating groups, with little to mark him but from the others". (134)

''محمد ﷺ بہت سارے اتحادی گروہوں میں سے ایک گروہ کے سردار ہیں اور کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرے''۔ آپ ﷺ کے رتبے کو کم کرنے کے لئے منت گری ایک اور وار کرتا ہے:

"To begin with, however, the message was more important than the messenger. The essential thing was the relation of the community or the individual to God. This implied some one to convey the message to the person or persons involved, but the messenger had no function beyond that of conveying the message. Later, however, the function of the messenger was seen to be more that this". (135)

''ابتدا میں پیغام، پیغمبر سے زیادہ اہم تھا۔ اصل چیز فرد یا جماعت کا خدا کے ساتھ تعلق تھا۔ اس لئے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو متعلقہ شخص یا اشخاص تک پیغام کو پہنچادے لیکن پیغام پہنچا دینے سے آگے پیغمبر کا کوئی کام نہ تھا۔ تاہم بعد میں پیغمبر کا کام اس سے زیادہ قرار دے دیا گیا''۔

مدینے میں حضور ﷺ کے مرتبے کے متعلق اس قسم کی بے سروپا باتیں صرف وہی بدنصیب کرسکتا ہے جو تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے واضح حقائق سے صرف نظر کرے۔ واٹ نے اول تو حضور ﷺ کی حیثیت کو کم کرنے کے لئے کئی تخیلاتی مفروضے قائم کئے، ان سے بات نہ بنی تو پیغام اور پیغام بر کو ایک دوسرے کے مدمقابل قرار دینے کی کوشش کی۔ حالانکہ مسلمانوں کے نزدیک پیغام اور پیغام بر مختلف چیزیں نہ تھیں جو پیغام کتاب کی شکل میں اترا تھا اس پیغام کو عملی تفسیر پیغامبر کی ذات تھی۔

غرض یہ کہ حضور ﷺ کو مدینے میں ایک عام شہری ثابت کرنے اور پیغام اور پیغامبر کو ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن آخر کار وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگیا کہ:

"So long as Muhammad lived, his personal influence must have seemed to contemporaries to be the cement which held the structure together". (136)

''محمد ﷺ جب تک زندہ رہے یقیناً آپ کے ہم عصر یہی سمجھتے ہوں گے کہ محمد کی ذات قصر اسلام کو قائم رکھنے کے لئے سیمنٹ کی حیثیت رکھتی ہے''۔

مستشرقین نے بہت زیادہ کوششیں کیں کہ آپ ﷺ کی شخصیت کو گہنا دیا جائے اور آپ کو جعل ساز ثابت کیا جائے۔ باوجود ان تمام کوششوں کے حضور ﷺ کی شخصیت آج کروڑوں انسانوں کے لئے چراغ منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور آپ ﷺ کا ذکر پورے عالم میں بام عروج پر ہے۔

"وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ "(137)

''اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا''۔

"وَلَلْآخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی '' (138)

''اور یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لئے پہلی سے بہتر ہے''۔

حضور ﷺ پر تشدد پسندی کا الزام:

واٹ نے اپنی مختلف تحریروں میں زور و شور سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کا کوئی معقول ذریعہ معاش نہ تھا، اس لئے انہوں نے عربوں کے دستور کے مطابق تجارتی کاروانوں کو لوٹنے اور مختلف قبائل پر ڈاکے ڈالنے کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وہ لکھتا ہے:

"As these expenditions, even that to Badr, were razzias, where the aim was to capture booty without undue danger to oneself". (139)

''بدر کی مہم سمیت یہ مہمیں ڈاکے تھے، اور ان کا مقصد یہ تھا کہ غیر ضروری خطرات مول لئے بغیر مال غنیمت اکٹھا کیا جائے''۔

یہی مستشرق ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

"When one looks at all alternatives, however, it seems clear that even before he left Mecca Muhammad must have looked on raids on Meccan carvans as a possibility, even a probability. In the raids the Muslims were taking the offensive. Muhammad cannot have failed to realize that, even if the raids were only slightly successful, the Meccans were bound to attempt reprisals. In these little raids, then, he was deliberately challenging and provoking the Meccans. In our peace-conscious age it is difficult to understand how a religious leader could thus engage in offensive war and become almost an aggressor". (140

''جب انسان ان تمام معاشی امکانات کا جائزہ لیتا ہے جو محمد (ﷺ) کے پیش نظر تھے تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ محمد (ﷺ) نے ہجرت سے پہلے ہی مکی کاروانوں پر حملوں کے امکان بلکہ غالب امکان پر غور کیا ہوگا۔ ان حملوں میں مسلمانوں کا رویہ جارحانہ تھا۔ محمد (ﷺ) اس بات کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے کہ گو ان حملوں میں ان کو معمولی کامیابی حاصل ہو، لیکن مکہ والے انتقامی کاروائی ضرور کریں گے۔ ان چھوٹے حملوں میں محمد (ﷺ) مکہ والوں کو چیلنج کر رہے تھے بلکہ ان کو اشتعال دلا رہے تھے۔ ہمارے امن پسند زمانے میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک مذہبی راہنما کیونکر جارحانہ جنگوں میں مشغول ہو کر ایک جارح بن سکتا ہے''۔

غزوات کو ڈاکے ثابت کرنے کی کوشش میں واٹ ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"Thus whether Muhammad incited his followers to action and then used their wrongs to justify it, or whether he yielded to pressure from them to allow such action, the normal Arab practice of the razzia was taken over by the Islamic community. In being taken over, however, it was transformed. It became an activity to believers against unbelievers, and therefore took place within religious context". (140)

''خواہ محمد (ﷺ) نے اپنے پیروکاروں کو جارحیت پر ابھارا ہو اور پھر ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو اس عمل کو جواز مہیا کرنے کے لئے استعمال کیا ہو یا انہوں نے اپنے پیروکاروں کی طرف سے اس عمل کی اجازت دینے کے مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں، دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ تھا کہ عربوں کے ہاں معروف ڈاکہ زنی کے عمل کو امت مسلمہ نے اپنا لیا اور اس عمل کو اپنا لینے کے بعد انہوں نے اس کی ہیئت میں تبدیلی کر دی۔ اس طرح یہ ایک ایسا عمل بن گیا جو مومن کافروں کے خلاف سرانجام دیتے تھے اور (ڈاکہ زنی کا) یہ عمل مذہبی دائرے کے اندر سرانجام پاتا تھا''۔ پھر مستشرق مذکور اس تبدیلی کی نوعیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"The change from the razzia to the Jihad may seem to be no more than a change of name, the giving of an aura of religion to what was essentially the same activity". (141)

''ڈاکے اور جہاد میں فرق صرف نام کی تبدیلی کا تھا۔ اس طرح وہ کام جو دراصل ڈاکہ ہی تھا اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی''۔

واٹ اسلامی جہاد کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Another point was doubtless present in Muhammad's mind. He forbade fighting and raiding between Muslims, and consequently, if a large number of Arab tribes accepted Islam or even merely accepted Muhammad's leadership, he would have to find an alternative outlet for their energies. Looking ahead, Muhammad probably realized that it would be necessary to direct the predatory impulses of the Arabs outwards, towards the settled communities adjacent to Arabia, and he was probably conscious to some extent of the development of the route to Syria as a preparation for expansion". (142)

''بلاشک وشبہ ایک اور نکتہ بھی محمد (ﷺ) کے ذہن میں تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو باہم لڑائی کرنے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اگر عرب کے قبائل کثرت سے اسلام قبول کر لیتے یا محض محمد (ﷺ) کی قیادت کو تسلیم کر لیتے تو آپ کے لئے ضروری تھا کہ

آپ عربوں کی قوت کے اظہار کے لئے کوئی متبادل راستہ تلاش کرتے۔ غالباً مستقبل کے متعلق سوچتے ہوئے، آپ نے یہ محسوس کیا کہ عربوں کے غارت گرانہ رجحانات کا رخ خارج کی طرف موڑنا ضروری ہوگا، ان پرامن علاقوں کی طرف جو عرب سے ملحق تھے۔ اور غالباً اپنی مملکت کی حدود کو وسیع کرنے کی خاطر، شام کے راستے پر آپ کی خصوصی نظر ہوگی"۔

اسلام نے جنگ کے ایسے اصول مقرر فرمائے کہ ان اصولوں کی وجہ سے اسلامی جہاد ان جنگوں سے ممتاز ہو جاتا ہے جو تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں انسانوں نے توسیع پسندی اور دیگر قوموں کے استیصال کے لئے دوسروں پر مسلط کی تھیں۔ للہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا:

"وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ "(143)

''اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا۔ بے شک اللہ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو"۔ ایک دوسری آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا:

"وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ "(144)

''اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر"۔

جنگ کے اصولوں کی مزید تشریح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ "(145)

''تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرلو (لیکن) اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے۔ اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاں دشمنان دین کے خلاف جہاد کی تیاریوں اور عملاً جہاد کرنے کا حکم دیا ہے وہاں ساتھ ہی یہ ارشاد بھی فرمایا ہے:

"وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللهِ ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ "(146)

''اور اگر کفار مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جایئے اس کی طرف اور بھروسہ کیجئے اللہ پر۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے"۔

مندرجہ بالا آیات کریمہ میں جہاد اسلامی کے اصول وضوابط کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کے حکم جہاد کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل تین چیزوں پر خصوصی غور کرنا ضروری ہے۔

1۔ جنگ کس مقصد کے لئے ہو۔

2۔ جنگ کس کے خلاف لڑی جائے۔

3۔ جنگ میں کن کن شرائط اور قیود کی پابندی ضروری ہے۔

مندرجہ بالا آیات کریمہ وضاحت سے بتا رہی ہیں کہ اسلامی جنگیں نہ آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے لڑی جاتی ہیں، نہ کسی قوم کی نسلی برتری کو ثابت کرنے کے لئے اور نہ صنعتی اور تجارتی مفادات کی خاطر بلکہ یہ جنگیں صرف حق کی بلندی کی خاطر لڑی جاتی ہیں۔ یہ جنگیں ان لوگوں کے خلاف لڑی جاتی ہیں جو تمہارے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ان شرائط کے ساتھ کہ کسی پر زیادتی مت کرو۔

قرآن کریم نے جہاد کے جو اصول پیش کئے تھے حضور ﷺ نے اپنے فرامین میں ان کی تفصیل فرما دی۔ آپ نے مختلف لشکروں کے مہموں پر روانہ فرماتے وقت مختلف ہدایات دیں۔ ایک لشکر کو الوداع کہتے ہوئے حضور ﷺ نے انہیں یہ وصیت فرمائی۔

"انطلقوا باسم الله وعلى بركاته الله لا تقتلوا شيخا فانيا ولا طفلا ولا امرأة ولا تغلوا فضموا غنائمكم واصلحوا واحسنوا ان الله تعالىٰ يحب المحسنين"(147)

''اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اور اس کے نام کی برکت کے ساتھ سفر جہاد پر روانہ ہو جاؤ۔ کسی بوڑھے شخص کو، کسی بچے یا کسی عورت کو ہرگز قتل نہ کرنا اور خیانت نہ کرنا۔ غنائم اکٹھا کرنا اور حالات کو درست کرنے کی کوشش کرنا۔ دشمن کے ساتھ بھی احسان کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

مسلمانوں کو جہاد کے بارے میں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان کے تناظر میں مستشرقین کے الزامات کو دیکھا جائے تو ان کی تنگ نظر ظاہر ہوتی ہے۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے الزامات حقیقت سے کوسوں دور اور محض ذہنی تسکین کے لئے ہیں۔ نیز مستشرقین کی طرف سے حضور ﷺ کی شخصیت پر لگائے گئے الزامات اور اعتراضات کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مستشرقین ان تمام حقائق سے آشنا ہونے کے باوجود محض روایتی تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر آپ ﷺ کے دامن کو داغ دار کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے۔ قرآن نے سچ ہی کہا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (148)

ایک کتاب دی اسٹڈی آف ریلیجز (مطالعہ مذاہب) ایچ ڈی لیوس اور رابرٹ لاس سیلٹری کے مصنف ہیں۔ وہ اسلام کی غزوات کے بارے میں لکھتے ہیں:

انہوں نے ایک ہی قسم کا رویہ اختیار کیا، قافلوں کو روکنا، ان کو لوٹ لینا بدوؤں کو قتل یا پھر قید کر لینا، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لینا، لیکن ان حملوں کے بعد وہاں کی مجلسوں میں (حضرت) محمد ﷺ کی گفتگو سنی جاتی تو مشاہدوں کا معاملہ دوسرے ہی رنگ میں نظر آتا۔

اپنی رسالت کے زمانہ میں موسیٰ نوح، یوحنا اور عیسیٰ کے عظیم سلسلہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ان کا پیام وہی ہے جو ان پیغمبروں کا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قصوں کو انہوں نے یہودی ماخذ سے لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے دعویٰ کیا گیا ہے یا پھر ان کا ماخذ شامی عیسائی ہیں جیسا کہ اب کہا جاتا ہے۔

یہ (حضرت عمرؓ) تھے، جو مدینہ کی ہجرت میں آپ کے رفیق تھے۔ مکہ میں (حضرت) محمد ﷺ کی حیثیت ایک پیغمبر کی تھی، مدینہ میں وہ ایسے منصوبہ ساز سیاست دان ہو گئے جہاں وہ مسلمانوں کی مدافعت کرنے اور ان کو ایک نئی کمیونٹی بنانے میں مشغول رہے۔ مدینہ میں کافی ضروریات پیدا ہوتی گئیں، جس سے اس کی صورت حال نازک ہوتی گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا نخلستان تھا، مسلمانوں کی روز افزوں آبادی کے پیش نظر غذا کی فراہمی ایک ضرورت تھی۔ اس لئے مکہ جانے والے قافلوں پر حملے کئے گئے۔ اور ریگستانوں میں ان کو لوٹا گیا۔ بعد کے ناقدین کا یہ الزام ہے کہ انہوں نے اپنی تحریک کے لئے وحی والہام کو اپنی سہولتوں کی خاطر گھڑ کر پیش کیا۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ گوشہر حرم (عارضی صلح کے مہینوں) میں جنگ قابل ملامت ہے۔ لیکن خدا کی راہ میں جنگ نہ کرنا اس سے بھی بڑھ کر لائق ملامت ہے۔ مکہ کے پیغمبر اپنے متبعین کو تو صراط مستقیم کی سختی سے تاکید کرتے تھے لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ خود عیاش شخص تھے۔ (149)

ایک دوسری کتاب دی سوشل اسٹرکچر آف اسلام مولفہ ریوبن لیوی، کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہوئی ہے اس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

اب تک یہ سوال حل طلب ہی کہ آپ اپنے پیغام کو اپنی سرزمین تک محدود رکھنا چاہتے تھے، یا اس سے باہر بھی اس کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی وحی والہام میں کثرت سے انجیل کی ان ناقص اور گنجلک روایتوں کو بیان کرتے جو انہوں نے یہودیوں یا عیسائیوں سے سنی

تھیں۔اور وہ اس سے اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتے تھے۔

جیسے ہی ان کے پاس اسلحہ فراہم ہو گئے تو وہ جذبۂ انتقام میں مکہ کے کفار کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھے اور اپنے پیغمبر پیروؤں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ یہ خدا کی راہ میں جنگ ہے۔مکہ کی روایتی اور مقدس جگہ پر قبضہ کرنا،ان کے لئے ذاتی وقار کی بھی بات تھی۔ جہاں تک اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومتوں کی وسعت کا تعلق ہے شروع میں یہ نظر انداز کرنے کے لائق تھا۔کیونکہ عرب،ترکوں کی طرح لوٹ مار کر کے مطمئن ہو جاتے،اُن کو اپنی فکر مستقل طور پر رہی۔

جب(حضرت)محمد ﷺ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو وہ قبیلہ قریش کے باضابطہ فرد تھے۔لیکن وہ ادنیٰ درجہ کی نسل سے تھے،ان کا پیشہ اونٹ چرانا تھا،اس لئے ان کو کامیابی حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹیں رہیں۔اس کے بعد آپ سے رشتہ داری،شرافت ونجابت کے لئے کسوٹی مانی جانے لگی،حتیٰ کہ آپ سے معمولی درجہ کی قربت بھی قبیلہ قریش میں شامل ہونے کا ذریعہ بن گئی۔اور اعلیٰ امتیاز کی نشانی سمجھی جانے لگی۔محمد ﷺ کو زید کی بیوی میں دلکشی نظر آئی،انہوں نے زید کو ترغیب دی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیں تاکہ وہ اس سے نکاح کر سکیں۔(150)

اسی مصنف نے قرآن کی آیات (8:17)(116:11)(239:2) نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نماز کے صرف تین مقررہ اوقات ہیں۔اور یہ کہ گرچہ قرآن نے متعدد جگہوں پر زکوۃ دینے کی ترغیب دی ہے لیکن یہ رقم کتنی ہو،کیا ہو،اور کس کو دی جائے،اس کی صراحت کہیں نہیں لکھی۔

ان نام نہاد مستشرقین کی تقریباً اکثر کتابوں میں اس قسم کی تحریفات،الزامات اور دروغ گوئیوں کے نمونے ملتے ہیں۔مستشرقین کی ان الزام تراشیوں کے رد میں میرے علم میں کوئی قابلِ ذکر انفرادی یا اجتماعی کوشش نہیں کی گئی۔معلوم نہیں کیوں اس کی طرف اب تک توجہ نہیں دی گئی۔میری رائے ہے کہ اس مقصد کے لئے کم از کم چند علماء اور محققین پر مشتمل ایک ادارہ قائم ہو اور ماہانہ نہ سہی تو ایک سہ ماہی مجلہ شائع کیا جائے تاکہ مستشرقین کی یاوہ گوئیوں کا ازالہ ہوتا رہے۔

جب ہم یوروپین زبانوں کی کسی ایسی تالیف پر نظر ڈالتے ہیں جس میں مشرق یا اسلام کے اجتماعی یا عمرانی موضوع پر مباحث ہوں تو ہم کو بہت سی خلاف عقل وقیاس باتیں نظر آتی ہیں۔خصوصاً ان کتابوں میں جو مذہب اسلام پر ہیں۔ان میں نہ صرف خلافِ حقیقت اور خلاف عقل وقیاس باتیں ہوتی ہیں۔بلکہ ان میں اسلام کی ایسی عجیب وغریب اور بھیانک تصویر پیش کی جاتی ہے۔جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا ہے۔مشرقی آدمی اس کی یہ تاویل کر لیتا ہے کہ یہ غلطی مشرق کے حالات اور یہاں کے عادات وخصائل سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اور مسلمان اسلام کی بھیانک تصویر دیکھ کر پیچ وتاب کھا کر رہ جاتا ہے۔جب ہم مغربی مصنفین کی تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ لکھنے والے کو عموماً مشرق اور خصوصاً اسلام کی حقیقت سے مطلق واقفیت نہیں ہے۔مثلاً مارشل اپنی کتاب شادی میں لکھتا ہے کہ مصر میں اسلامی پردہ کا یہ اثر ہے کہ وہاں چودہ سال کی عمر کے بعد ماں بھی اپنی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی یا اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر یہ لکھا ہے کہ ریفی مصری لڑکی اپنے چہرہ کے علاوہ باقی جسم کے تمام حصوں کو مردوں کے سامنے عریاں کرسکتی ہے۔چنانچہ اسلام نے پردہ اور تعدد ازدواج کے حکم سے تمدن پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔اسی کتاب میں ایک اور مقام پر ہے کہ نعوذباللہ محمد ﷺ محض ایک زن پرست آدمی تھے۔ان خیالات اور علمی ریسرچ سے لکھنے والے کی نسبت صاف ظاہر ہے کہ وہ حق وانصاف کو پامال کر کے محض اسلام کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔

یوروپین مصنفات کی یہ خوبی ہے کہ اس میں ماخذوں کے حوالے بھی دے دیے جاتے ہیں جب میں اصل ماخذ کی طرف رجوع کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کا ماخذ محض مستشرقین کے دماغ ہیں۔سفیروں اور قاصدوں کے بارے میں اس دور میں کسی عظمت کا تصور نہ تھا۔(151)

ٹائن بی کے خیال میں آنحضرت ﷺ محض قیصر عرب تھے،ایک سیاسی لیڈر تھے،جے سی آرچر کے نزدیک محمد ﷺ محض ایک صوفی اور مجذوب تھے،آپ ﷺ (نعوذباللہ) رہزنوں،قزاقوں کے سردار (Robber Chief) تھے۔اسلام ایک بدقسمت تاریخی حادثہ تھا اور محمد

ﷺ مرگی میں مبتلا ہو کر مر گئے جو شدت بھوک کا نتیجہ تھا۔ اسلام ایک اشتراکی رجحان تھا اور محمد ﷺ صرف ایک معاشرتی سماجی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر، وہ ایک موقع پرست، مفاد پرست تھے، کثرت ازدواج اور میل الی النساء۔ (152)

عورتوں کے دوست، سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن، بہت شادیاں کرنے والے۔ آنحضرت ﷺ اور قرآن، تہذیب وتمدن، حریت وآزادی اور سچائی کے بدترین مخالف اور ضدی وسرکش دشمن تھے، کہ ان جیسا دشمن صفحۂ ہستی پر نمودار نہیں ہوا۔ لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا، داستان غرانیق، شیطانی آیات، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک دفعہ حرم میں نماز ادا کی اور قرآن کی بھی تلاوت کی، اس وقت وہاں کفار بھی موجود تھے، جب آپ نے سورۂ نجم کی یہ آیت پڑھی ''ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ'' تو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترجیٰ (یعنی یہ بت معظم ومحترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے) اس شیطانی آیت کے بارے میں واقعہ کو مستشرقین بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں۔ (153)

واقعہ حضرت زیدؓ وزینبؓ، حضور ﷺ نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ حضرت زیدؓ بن حارثہ کا نکاح کر دیا تھا، لیکن پھر تعلقات قائم نہ رہ سکے اور شکر رنجی بڑھ گئی، آخر کار حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی، حضور ﷺ نے رسم جاہلیت منانے کے لئے اور حضرت زینبؓ کی دلجوئی کے لئے خود نکاح کر لیا، حضرت زینبؓ کا انتقال 20ھ میں ہوا، مستشرقین کے نزدیک یہ صریحاً بوالہوسی تھی، ان کا آہنی تابوت خانہ کعبہ میں دوستونوں کے درمیان معلق رہا۔ ابتدا میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لئے تمام انبیائے بنی اسرائیل کو تسلیم کیا۔ لیکن جب قوت واقتدار مل گیا تو سب سے بڑے نبی خود بن بیٹھے اور سلسلۂ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا، بانی اسلام نے معجزات کی نسبت محض انبیائے ماسبق کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لئے قائم کی گئی۔ ایک نیا اور جھوٹا مذہب جاری کیا، حالانکہ یہ ان کا خود ساختہ تھا۔

مستشرقین چونکہ مسیحی استعماری قوتوں کے ہراول دستے ہیں جو مشنریوں کی طرح اسلامی ملکوں میں سامراجیت کے لئے راہ صاف کرتے ہیں اس راہ کی بڑی رکاوٹ ان کے نزدیک مسلمانوں کا جذبہ جہاد ہے لہٰذا انہوں نے سارا زور قلم جہاد پر صرف کیا اور جہاد کو اسلام کی جبری اشاعت کا ذریعہ ٹھہرایا۔ اور اس کو فساد اور وحشیانہ عمل قرار دیا حالانکہ یہ دونوں الزام مسلمانوں کے مذہبی مقدس کتاب قرآن حکیم کے خلاف ہے۔ (154) خود قرآن کا حکم ہے:

''لا اکراہ فی الدین''۔ (155)

اسلام کے لئے جبر اور فساد کا الزام:

دین اسلام کے لئے جبر اور اکراہ منع ہے۔ اس صریح اور واضح حکم کی موجودگی میں قرآن اور صاحب قرآن پر جبر کا الزام قطعاً غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید استعماری مستشرقین کے علاوہ گذشتہ دور میں یہ الزام یہود ونصاریٰ ومشرکین میں سے کسی نے بھی قرآن اور صاحب قرآن پر نہیں لگایا۔ اگر کسی مسلمان بادشاہ کا شاذ ونادر کوئی واقعہ ایسا گزرا ہو تو وہ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی عمل سند نہیں۔ ابن جریر نے ابن عباس سے اس آیت کا سبب نزول یہ نقل کیا ہے کہ حصین نامی انصاری کے دو بیٹے نصرانی تھے اور باپ مسلمان تھا۔ باپ نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ میں بیٹوں کو اسلام پر مجبور کر سکتا ہوں۔ جس پر یہ آیت اتری جس میں اسلام پر مجبور کرنے کی ممانعت کی گئی۔ کیونکہ ایمان وہ معتبر ہے جو دل کے اختیار سے ہو اور اخلاص پر مبنی ہو۔ جیسے:

''لیبلوکم ایکم احسن عملاً''۔ (156)

پہلی آیت میں امتحان مقصود ہے کہ اللہ لوگوں پر یہ ظاہر کر دے کہ دل اور بدن کے عمل میں اپنے اختیار سے کون اچھا ہے۔ اور دوسری آیت میں ہے کہ عبادت وہ مطلوب ہے جس میں اخلاص ہو اور اخلاص دل سے قبول کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی جہاد میں فوجی خدمات کے عوض معمولی جزیہ غیر مسلم ادا کرنے سے اپنے دین پر رہ کر اسلامی مملکت کے تمام حقوق شہریت حاصل کر سکتا ہے۔ جیسے:

"حتی یعطوا الجزیۃ عن یدوھم صاغرون"۔(157)

یعنی اس وقت جنگ ختم ہوگی جب جزیہ دے کر تابعداری مملکت اسلامی اختیار کرے۔تفسیر مظہری ج 1، ص 336 مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی میں ہے کہ یہ آیت یعنی منع اکراہ اور قبول جزیہ اہل کتاب سے خاص نہیں بلکہ مشرقین کو بھی شامل ہے۔اگر چہ نزول کا سبب واقعہ اہل الکتاب میں فرماتے ہیں قلت تخصیص الورد لا یقتضی تخصیص النص وھو۔ عام سبب نزول ومورد کے خاص ہونے سے نص کی تخصیص نہیں ہوگی بلکہ نص عام ہے۔اسی طرح لااکراہ کی آیت منسوخ بھی نہیں جیسے بعض کا خیال کہ یہ اقتلوا المشرکین کافۃ سے منسوخ ہے۔صاحب مظہری کہتے ہیں نسخ کے لئے تعارض ضروری ہے اور یہاں تعارض نہیں۔کیونکہ قتال دین پر جبر کے لئے نہیں بلکہ دفع فساد کے لئے ہے۔مقصد جہاد دین پر جبر نہیں دفع فساد ہے:

جہاد کا مقصد خود قرآن نے بیان کیا:

"الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر"(158)

اگر تم جہاد نہ کرو گے تو خدا کی زمین میں بڑے فتنے اور فساد برپا ہوں گے۔یعنی جہاد کا مقصد فتنہ اور فساد کو ہٹانا ہے۔ لہٰذا مستشرقین کا خود جہاد کو فساد کہنا کس قدر غلط ہے۔یہی وجہ ہے کہ کفار کے جن افراد سے فتنے اور فساد کا قوی اندیشہ نہ ہو عین جنگ میں بھی اسلام نے ان کے قتل سے منع فرمایا ہے۔مثلاً نابالغ بچے، عورتیں، مشائخ یعنی بوڑھے اور رہبان عبادت گزار درویش، اندھے، لنگڑے۔

یہ تحقیقی جواب ہے کہ مذہب اسلام خود دین میں جبر کے خلاف ہے۔اور جہاد فساد نہیں فساد کش عمل ہے۔جیسے ایک مملکت کے باغی افراد بھی قتل وخونریزی کرتے ہیں اور قانون عدل کی خلاف ورزی کرتے ہیں لیکن قانون عدل کی محافظ فوج جو ان باغیوں سے لڑتی ہے اس کی شکل بھی قتل کی ہے۔لیکن باغیوں کا قتل فساد اور وحشیانہ عمل ہے اور قانون عدل کی محافظ فوج کا قتل ایک مقدس فعل ہے جو دفعہ فساد اور اقامتِ عدل و دفع ظلم کے لئے ہے۔قرآن نے صاف اعلان کیا کہ دین میں جبر نہیں اور سنت نبویؐ میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے۔جیسے ذکر ہوا اس کے علاوہ قرآن نے مستشرقین کی غلط الزام تراشی کی تردید کے لئے بار بار اس کا اعلان کیا کہ شبہ نہ رہے۔

سورۂ کہف میں فرمایا:

"قل الحق من ربکم فمن شاء فلیو من و من شاء فلیکفر"۔(159)

"کہدے کہ یہ حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو جو چاہے قبول کرے جو چاہے انکار کرے"۔

سورۂ یونس میں فرمایا:

"ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی تکونوا مومنین"۔(160)

"اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے کیا اے پیغمبر تو لوگوں پر اس لئے زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں"۔

سورۂ توبہ میں قرآن کا ارشاد ہے:

"وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مأمنہ ذٰلک بانھم قوم لا یعلمون"(161)

اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے۔یہاں تک کہ کلام اللہ سن لے۔پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بےخوف ہو۔یہ اس لئے کہ یہ بےعلم لوگ ہیں۔اس میں یہ نہیں فرمایا کہ جب تک مسلمان نہ ہو تو اس کو پناہ نہ دو۔بلکہ یہ فرمایا کہ پناہ دے کر بےخوف جگہ میں پہنچا دو۔تاکہ جو کلام اللہ اس نے سنا ہے اس میں غور کر کے صحیح رائے قائم کرے۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ خدا کے قرآن کا

منشاء یہ ہے کہ ایمان کا محرک تلوار نہ ہو بلکہ پرامن حالت میں غور وخوض ہو ایسی بہت آیتیں ہیں لیکن مصنف کے لئے یہ کافی ہے۔
اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان واضح تصریحات کے باوجود مستشرقین کو یہ غلط فہمی کہاں سے پیدا ہوئی کہ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اگر مستشرقین نے قصداً و دیدہ دانستہ سیاسی مقصد برآری کے لئے ایسا کیا اور کچھ نے صاف اقرار کیا کہ اسلام صرف تبلیغ سے پھیلا ہے نہ جبر سے اور جبر کا ایک واقعہ بھی خیر القرون میں نہیں مل سکتا۔(162)

جیسے اسی مقصد کے لئے مسٹر آرنلڈ نے ''دی پریچنگ آف اسلام'' کتاب لکھی ہے۔اور یہ دعویٰ اس نے پوری کتاب میں ثابت کیا کہ اسلام جہاں جہاں پھیلا تبلیغ کے اثر سے پھیلا لیکن ایک گروہ غلط فہمی کا شکار ہوا جس کے اسباب غلطی حسب ذیل امور ہیں:۔

1۔ دور اول میں عرب میں تبلیغی جماعتیں جہاں جاتی تھیں مسلح ہو کر جاتی تھیں۔اس مسلح جانے سے ان خود غرض مستشرقین نے یہ سمجھا کہ یہ مسلح مبلغین تلوار کے زور سے تبلیغ اسلام کر رہے ہیں۔حالانکہ ایسا قطعاً نہ تھا، بلکہ ایسے واقعات عرب کے ملک میں پیش آئے کہ وہاں کوئی منظم حکومت نہ تھی، مختلف قبائل عرب اپنے اپنے سرداروں کی قیادت میں الگ الگ ریاستیں قائم کر چکے تھے۔لوٹ کھسوٹ ان کا ذریعہ معاش تھا، راستے میں بھی ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا تھا اس کے علاوہ مبلغین حضرات جو مختلف قبائل کے افراد ہوتے تھے وہ جن قبائل سے گزرتے تھے یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ مبلغین کے قبائل کے ساتھ ان کی عداوت ہو اور وہ ان سے انتقام لینے کا قصد کرے۔ان سب کے علاوہ عرب کی عام عادت یہ تھی کہ حفاظت خود اختیاری کے لئے مسلح سفر کرتے تھے۔لہٰذا اس اسلحہ بندی کو جبر دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔اکثر اوقات مبلغین کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور جس قبیلے میں مبلغین جاتے تھے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اگر مقصود اسلام پر مجبور کرنا ہوتا تو اس کے لئے مبلغین کی یہ قلیل تعداد کیونکر کافی ہو سکتی تھی۔

2۔ غلط فہمی کی دوسری بڑی وجہ میدان جنگ کا وہ پیغام امن ہے جس سے خونریزی ٹل جائے اور امن اور مصالحت قائم ہو حضور علیہ السلام سرداران فوج کو یہ حکم دیتے تھے کہ جب تم مشرکوں اور دشمنوں سے مقابل ہو تو ان کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دو۔ان میں جو بات بھی وہ مان لے تو ان کی لڑائی سے رک جاؤ۔اول اسلام کی دعوت دو۔اگر وہ قبول کرے تو پھر اس سے رک جاؤ پھر ان سے خواہش کرو کہ مسلمانوں کے ملک میں آ جائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے۔اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی۔قانون ان پر مسلمانوں کا جاری ہوگا۔لیکن غنیمت اور میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے اگر اسلام قبول نہ کرے اس کو جزیہ دے کر ذمہ بننے کو کہہ دو اگر اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ اگر وہ اس کو نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ کر لڑائی شروع کر دو۔مسلم کتاب الجہاد والسیر۔یہ میدان جنگ کی دعوت ہے، اسلام پر جبر سے اس کا تعلق نہیں۔(162)

3۔ سوم غلط فہمی اس حدیث کے عدم فہم سے واقع ہوئی جس میں ارشاد ہے:

''امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فاذا قالوا ھا عصموا دمائھم واموالھم''(163)

میں مامور ہوں کہ لوگوں سے لڑوں اس وقت تک کہ توحید کا اعتراف کرے جب یہ اعتراف کرے تو اس کی جان و مال محفوظ ہوئے۔اس سے مستشرقین نے یہ غلط نظریہ جمایا کہ مسلمان تلوار ہاتھ میں لے کر گھماتا ہے۔اور کافر سے یہ کہتا ہے کہ اسلام لاؤ۔ورنہ تمہارے لئے تلوار ہے۔ہم آیات وحدیث سے اس کی تردید کر چکے ہیں۔حدیث مذکور کا تعلق میدان جنگ سے ہے کہ جب بھی دوران جنگ میں کوئی کافر لا الہ الا اللہ کہہ دے تو رک جاؤ اور اس سے مت لڑو اگر چہ جان بچانے کے لئے کہا اور دل سے نہ کہے، حضرت اسامہؓ نے جب ایک شخص کے قتل کے متعلق یہ عذر پیش کیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تو نے اس کا دل چیرا تھا، ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مستشرقین یہ متعصبانہ بلکہ مجنونانہ الزام درست ہوتا تو بدر کے قیدی جب گرفتار ہو کر آئے تو ان سے یہ کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار۔اور قرآن نے یہ حکم کیوں نازل کیا کہ فاما منا بعد و اما فداء یعنی قیدیوں پر احسان رکھ کر مفت چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ و یہ نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار۔(164)

فتح مکہ میں جو تقریباً دس ہزار کفار قیدی پیش ہوئے تو یہ فرمایا گیا:

''لا تثریب علیکم الیوم''۔(165)

میں تمہارے اعمال پر تم کو ملامت بھی نہیں کرتا۔ بلکہ تم آزاد ہو اور یہ کیوں نہ کہا گیا۔ یا اسلام یا تلوار۔ ثمامہ جب قید ہو کر آیا تو اس کو رہا کیا گیا۔ اس نے خود غسل کر کے اسلام لیا اور حضور ﷺ نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ اسلام یا تلوار۔ خدا کا یہ ارشاد:

''وان جنحوا للسلم فاجنح لها''(166)

(انفال) اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھک جائے تو تو بھی جھک جا۔ اور یہ کیوں نہ فرمایا گیا کہ اسلام یا تلوار۔

''لا ینهکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروا الیهم وتقسطوا الیهم ان الله یحب المقسطین''۔(167)

تم کو اللہ ان کفار کے متعلق جو تم سے دین کی وجہ سے نہیں لڑے اور نہ تم کو ملک سے نکالا اس سے نہیں روکتا کہ ان کفار سے تم احسان کرو اور ان سے منصفانہ سلوک کرو اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کافروں سے ایسا کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام لاؤ ورنہ تلوار ہے۔ سورۂ نساء میں خدا کا یہ حکم قرآنی ہے

''فان اعتزلوا کم ولم یقاتلوا کم والقوا الیکم السلم فما جعل الله لکم علیهم سبیلا''۔(168)

اگر وہ کفار تم سے کنارہ کریں پھر نہ لڑیں اور وہ تمہارے سامنے صلح کا پیغام ڈالیں تو اللہ تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہ دی ہے۔ قرآن حکیم اس قسم کے مضامین سے پُر ہے۔ جس ...... یورپ کے اس مجنونانہ متعصبانہ غلط الزام کی تردید کرتی ہے۔ عاقل کے لئے اس قدر کافی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یورپ والے اسلام کے ان احکام کو دیکھ کر اس کا احسان مانتے کہ اسلام کے رحیمانہ اور مہذبانہ قانون میں عین جنگ کے شعلوں کے دوران دشمنوں کی یہ رعایتیں دی گئی ہیں جن کی کسی مذہب اور خاص کر بائبل میں نظیر نہیں مثلاً دوران جنگ سول آبادی میں بوڑھی عورتیں تارک الدنیا درویش افراد پر ہاتھ اٹھانا اور ان سے لڑنا منع ہے۔ عین جنگ میں صلح کی پیشکش اگر دشمن کر دے تو جنگ رک جائے گی۔ آتشی آلات سے مارنا منع ہے۔ لاتعذبوا بعذاب اللہ۔ آگ کے عذاب سے کسی کو عذاب نہ دو۔

4۔ چہارم سبب جہاد اسلامی کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے میں مسیحی یورپ کی غلط فہمی ہے جہاد عربی لفظ ہے جس کے معنی لفظ کسی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے کے ہیں۔ اسلام قرآن اور سنت کی اصطلاح میں مالی وجانی وقولی جدوجہد کا نام جو سبیل اللہ میں ہو۔ سبیل النفس یا سبیل القوم یا سبیل الوطن کی آمیزش سے پاک ہو جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت نے جہاد کو اکثر مواضع میں جوڑ کر دیا ہے۔ تو سبیل اللہ کے ساتھ ملا کر دیا ہے۔

''وجاهدوا فی سبیل الله حق جهاده''۔(169)

پوری کوشش کرو اللہ کی راہ میں جیسے اس کا تقاضا ہے۔ ابوداؤد کی حدیث ہے:

''وجاهدوا بانفسکم و اموالکم والسنتکم''۔(170)

خدا کی راہ میں نفس مال اور زبان سے کوشش کرو۔ اب یہ معلوم کرنا چاہئے کہ سبیل اللہ کیا چیز ہے وہ نام ہے اللہ کے اس بین الاقوامی اور انسانی قانون عادلانہ کا ہے جو خالص انصاف پر مبنی ہے اور جس میں کسی قوم اور ملک اور خاص نسل اور رنگ والے لوگوں کی طرف داری نہیں اور ہر جانبداری سے پاک ہے۔ اور سب عالم کے لئے یکساں مفید ہے۔(171)

''وما ارسلنک الا رحمة للعالمین''۔(172)

ہم نے آپ کو وہ قانون دے کر بھیجا جو کل عالم کے لئے رحمت ہے۔

''الحمد لله الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا''۔(173)

(فرقان) ساری تعریف اس خدا کو ہے جس نے قرآن اتارا اپنے خاص بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تا کہ تمام عالم کو ظلم کے نتائج سے ڈرائے۔ یہی انسانی عمومی مفاد مقصد جہاد ہے۔ اللہ نے جہاد کا مقصد یہ بتلایا ہے۔

"وجعل كلمة الذين كفروا السفلى و كلمة الله هي العلياء"۔(174)

جہاد کے ذریعہ اللہ نے کافرانہ قانون کو پست کر دیا۔ اور اللہ کا قانون عادلانہ بلندی کے لائق ہے۔ حضور علیہ السلام والصلوٰۃ نے جہاد کرنے والے کی یہ تعریف کی ہے۔ من قاتل لتكون كلمة الله هي العلياء۔ جو اس لئے لڑے کہ اللہ کا قانون انصاف بلند و بالا رہے۔ ظاہر ہے ایسے عالمگیر قانون انصاف جس میں اللہ انسان اور حیوانات تک کے حقوق محفوظ ہوں۔ اس کی آزادی کے ساتھ اشاعت کی راہ میں ظالمانہ قوتیں حائل ہو جاتی ہیں اور اشاعت حق کی آزادی سلب کرتی ہے۔ ان کو دور کرنے کی صورت میں حق و باطل عدل و ظلم کا معرکہ کارزار بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اور قتال تک نوبت پہنچتی ہے۔ ایسی صورت میں کبھی اہل باطل حق کچلنے کے لئے حملہ کرتے ہیں۔ عہد نبوی کے غزوات میں اکثر ایسا ہوا۔ بدر احد خندق اس کی مثالیں ہیں، کبھی اہل باطل حق کی تباہی کے لئے تیاری کرتے ہیں۔ تو اہل حق کو قبل از وقت مدافعت کرنی پڑتی ہے۔ غزوہ موتہ و تبوک میں ایسا ہوا۔ اور کبھی راہ حق کی اشاعت کی رکاوٹ پیدا کرنے والی طاقتوں کو راہ سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ تا کہ حق کو آزادی نصیب ہو، ایسی صورت میں ابتدائی سرکوبی زیادہ موثر ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے سرایا میں اکثر ایسا ہوا۔ اس کو آپ ابتدائی نظام سے موسوم کر سکتے ہیں لیکن مقصد وہی ہے جو عرض کیا گیا۔

سورۂ انفال کے آخر میں ہے:

"والذين كفروا بعضهم اولياء بعض الا تفعلوه تكن فتنة في الارض و فساد كبير"۔(175)

سب کفار قومیں اللہ کے قانون عدل کے خلاف متحدہ محاذ کی صورت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم حق وعدل الٰہی کے لئے جہاد نہ کرو گے تو ساری زمین الٰہی حقوق کی بربادی یعنی فتنہ کی صورت میں پُر ہوگی۔ اور عقیدہ و عمل کی شخصی آزادی ختم ہو جائے گی۔ انسانی حقوق ظلم کے ہاتھوں پامال ہو کر بڑا فساد برپا ہوگا۔ یہ فرق ہے دنیوی جنگوں میں اور جہاد میں۔ دنیوی جنگ تخریبی عمل ہے۔ جیسے ڈاکو کسی کا ہاتھ کاٹ دیتا ہے اور جہاد اصلاحی عمل ہے۔ جیسے سرجن زہریلے پھوڑے کی وجہ سے مریض کا ہاتھ کاٹتا ہے کہ اس کا بدن محفوظ ہو جائے۔ افسوس کہ مستشرقین نے مسیحی اقوام کی تباہ کن آلات جنگ اور ایٹمی آلات سے گذشتہ دو جنگوں میں اور موجودہ وقت میں ویٹ کانگ میں جو بم برسائے اور انسان حیوانات، نباتات، عمارات تک کو تباہ کر دیا۔ اور وہ بھی صرف شیطانی مقصد کے لئے کہ قومی مفاد یا برتری ثابت ہو۔ اس پر اعتراض سے خاموش ہے۔ اگر اعتراض ہے تو اسلام کے اصلاحی معمولی عمل پر جس میں انسانیت کا عظیم تر مقصد پنہاں ہے۔ اگر اسلام میں دینی جبر ت ہوتی تو ہزار سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک عراق، مصر، شام اور ہندوستان میں اسلام نے حکومت کی۔ لیکن چاروں ملکوں میں بدستور عیسائی، یہودی، ہندو موجود ہے اور بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اور ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کوئی مسلمان تلوار لے کر اٹھا ہوا اور اس نے کسی یہودی عیسائی یا ہندو سے کہا ہو کہ یا اسلام یا تلوار۔

برخلاف عیسائیوں کے سپین اور سسلی میں مسلمانوں کی آٹھ سو سال حکومت رہی لیکن جب مسیحی اقتدار آیا تو انہوں نے مسلمانوں کا نام و نشان بلکہ قبروں تک مٹا دیا۔ یہی حال موجودہ ہندوستان کا ہے کہ انہوں نے اقتدار کے چند سالوں میں بیس لاکھ مسلمان قتل کئے۔ ایک کروڑ جلاوطن کئے، اور ہر روز ان کے فنا کرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن پاکستان، افغانستان، ایران میں کسی ہندو یا سکھ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ یہ اس دور انحطاط میں بھی اسلامی تعلیم کا اثر ہے جو مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔(176)

اب ہم بائبل سے جبر و اکراہ اور مذہبی جنگوں کے متعلق مختصر حوالہ جات پیش کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ جہاد اسلام سے مختص نہیں بلکہ بائبل کا جہاد اسلام کے جہاد سے سخت ہے۔

1۔ تورات کتاب استثناء باب 20: حضرت موسیٰ کو خطاب ہے کہ جب تم کسی شہر میں داخل ہو یا اس کے قریب ہو تو ان کو صلح کی طرف بلاؤ اگر قبول کر دے تو اس کے سب رہنے والے تمہارے غلام ہوں گے۔ تم کو جزیہ دیں گے اور اگر صلح قبول نہ کریں تو تمام مردوں کو قتل کر دو اور عورتوں و بچوں کو اور مویشیوں کو اور جو کچھ شہر میں ہے خاص اپنے لئے غنیمت بناؤ۔(177)

2۔ تورات کی کتاب عدد باب 33 میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے جب تم اردن سے گزرو اور تم کنعان میں داخل ہو تو وہاں کے تمام باشندوں کو ہلاک کرو۔ اور تباہ کرو ان کی مسجدوں کو۔(178)

3۔ تورات کتاب استثناء باب 7: جس شہر پر جہاد کرو تو مار وان کو یہاں تک کہ ان میں سے کوئی نہ بچے۔ اور ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کرو اور نہ ان پر رحم کرو۔(179)

فصل چہارم

استحقاق نبوت

مستشرقین نے اسلام کے خلاف زہر پھیلانے کے لئے یہ عجیب فریب وہ طریقہ نکالا ہے کہ جب تک وہ اسلامی تاریخ پر بحث کریں گے اس وقت تک خالص مورخ رہیں گے۔ لیکن جب رسول ﷺ کی سیرت، مذہب اسلام یا قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمیشہ مخالفانہ لکھیں گے کہ دوسرے اس کو پڑھ کر اسلام سے خوفزدہ ہوں۔ اسلامی مباحث پر لکھنے میں وہ علمی دیانت اور تحقیقی اصول کو بھول جاتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے زہن میں ایک نظریہ یا ایک خیال فرض کرتے ہیں اس کے بعد اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں۔ اگر قرآن میں کوئی ایسی شے مل گئی جو ان کے خیال میں ان کے مفید مطلب ہے یا اسے کھینچ تان کر اپنے مقصد کے مطابق بناسکتے ہیں تو فوراً اسے لے لیتے ہیں اور اگر قرآن ان کے مقصد کے معارض پڑتا ہے تو اسے نظرانداز کر کے کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے ہی نہیں۔ یہ تنہا میرا سوئے ظن نہیں ہے بلکہ اس کے ثبوت میں واقعات موجود ہیں۔ اس موقع پر مشتے نمونہ از خروارے 2 واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) مرگی کا مریض قرار دینے کی سازشیں:

مستشرقین حضور ﷺ کی شخصیت کے وقار کو مجروح کرنے اور دنیا کی نظروں میں آپ کو بدنام کرنے کے لئے ہر دور میں سازشیں کرتے رہے ہیں اور بہت سے بے بنیاد الزام ان کی جانب سے دہرائے جاتے رہے ہیں۔ ان میں ایک الزام یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ مرگی کے مریض تھے۔

مستشرقین نے جن واقعات سے حضور ﷺ کے مرگی کے مرض میں مبتلا ہونے کا سراغ لگایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ حضور ﷺ کی ولادت سے پہلے آپ کی والدہ کا فرشتوں کو دیکھنا۔

2۔ حضرت حلیمہ سعدیہ کی روایت کے مطابق فرشتوں کا آپ ﷺ کے سینے کو چاک کرنا۔

3۔ حالت وحی میں رسول اللہ ﷺ کی حالت کا متغیر ہونا۔

4۔ کفار مکہ کا آپ ﷺ کو مجنون کہنا۔

5۔ حضرت حلیمہ سعدیہ کا آپ ﷺ کے سر پر بادل کو سایہ کرتے دیکھنا۔

مندرجہ بالا واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ حضور ﷺ مرگی کے مریض تھے۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مستشرقین نے عملاً ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ تاہم منٹ گمری واٹ حضور ﷺ کے مرگی کے مرض میں مبتلا ہونے کی پرزور الفاظ میں تردید کرتا ہے۔

> "On some occasions at least there were physical accompaniments. He would be gripped by a feeling of pain, and in his ear's there would be a noise like the reverberation of a bell. Even on a very cold day the bystanders would see geat pearls of sweet on his forehead as the revelation descended upon him. Such accounts led some Western critics to suggest that he had epilepsy, but there are no real grounds for such a view. Epilepsy leads to physical and mental degeneration, and there are no signs of that in Muhammad, on the contrary he was clearly in full possession of his faculties to the very end of his life". (180)

''نزول وحی کے وقت کچھ جسمانی عوارض بھی پیش آتے تھے۔ آپ کو شدید درد کا احساس ہوتا، کانوں میں گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی، جب وحی کا نزول ہوتا تو پاس کھڑے ہوئے لوگ شدید سردی کے عالم میں بھی آپ کے چہرے پر پسینے کے موتی دیکھتے اس قسم کی چیزوں سے بعض مغربی نقادوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ مرگی کے مریض تھے۔ لیکن اس خیال کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں۔ مرگی انسان کو ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور کر دیتی ہے لیکن محمد ﷺ کی ذات میں اس قسم کے آثار نظر نہیں آتے۔ اس کے برعکس آخر تک آپ ﷺ ذہنی اور جسمانی طور پر صحیح اور سلامت تھے''۔

مختصر یہ کہ کوئی ایسا واضح اور ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ جس کے تحت حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دیا جائے اور بے شمار مستشرقین آپ ﷺ کے مخالف ہونے کے باوجود اس الزام کی تردید کرتے ہیں۔

اپنی رسالت پر حضور ﷺ کے ایمان کو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش:

مستشرقین نے اس بات کو ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ ابتدا میں حضور ﷺ کو نہ تو یقین تھا کہ آپ کے پاس جو کلام آتا ہے وہ خدا کا کلام ہے اور نہ ہی آپ کو یہ پتہ تھا کہ یہ کلام لانے والا خدا کا فرشتہ جبریل امینؑ ہے اور نہ آپ ﷺ کو یہ علم تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، بلکہ ابتدا میں آپ اللہ کے تصور سے بھی ناآشنا تھے اور یہ چیزیں آپ ﷺ پر وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ منکشف ہوئیں۔ واٹ ایک مقام پر لکھتا ہے:

> "It is not surprising that Muhammad is reported to have been assailed by fears and doubts. There is evidence for this in the Quran as well as in the narratives of his life, though it is not certain that at what period he received the Quranic assurances that God had not forsaken him". (181)

''اس بیان میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں کہ محمد ﷺ خوف اور شکوک میں مبتلا ہوئے اس بات کا ثبوت قرآن میں بھی موجود ہے اور سیرت کی کتابوں میں بھی، اگرچہ یقین کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ قرآن کے ذریعے آپ کو یہ یقین دہانی کس موقع پر کرائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑا نہیں''۔

یہی مستشرقین نزول وحی کے ابتدائی دور میں حضور ﷺ کی بے یقینی کو ان الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

> "Soon after the first revelation, he is said to have been encouraged to believe in his vocation by his wife Khadija and, more particularly by her cousin Warqah". (182)

''ابتدائی وحی نازل ہونے کے بعد خدیجہؓ نے یقین دلایا کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں اور خدیجہ سے بھی زیادہ یہ یقین دہانی آپ کو ورقہ بن نوفل نے کرائی''۔

جب یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ حضور ﷺ کو ابتدا میں اپنے نبی ہونے کا یقین نہ تھا اور نہ ہی آپ کو یقین تھا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے تو مستشرقین کا کام مکمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اسلام کو الہامی دین ماننے اور حضور ﷺ کو خدا کا سچا نبی ماننے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، جب ایک نبی کو اپنے نبی ہونے کا یقین دوسروں کے بتانے سے آئے تو اس کی صداقت کو دوسرے لوگ کیسے تسلیم کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقانیت اسلام صبح روشن کی طرح واضح ہے اس لئے تمام تر دشنام طرازیوں کے باوجود واٹ اس حقیقت کا

اعتراف کرتا ہے کہ کٹھن مشن کے لئے یقین کامل لازمی ہے۔

"To carry on in the face of persecution and hostility would have been impossible for him unless he was fully persuaded that God had sent him; and the receiving of revelations was included in his divine mission". (183)

''اگر محمد ﷺ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ پر وحی نازل ہوتی ہے تو اذیتوں اور مخالفتوں کے طوفان میں آپ ﷺ کے لئے اپنے مشن کو جاری رکھنا ممکن نہ رہتا''۔

حق تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے ایمان کی بار بار گواہی دی ہے تو پھر کسی کی سازشوں سے ایمان رسول مشکوک نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ'' (184)

نبوت ورسالت:

مستشرقین کے خیال میں نبوت نتیجہ تھی ان کی طویل خودخیالی (auto suggestion) یا خودالیعاذی اور القائے نفس کا، وہ خواب بہت دیکھا کرتے تھے، وحی بھی بطور خواب دیکھا کرتے تھے، وہ بزعم خود اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا، بہرحال دوسروں کو یہ یقین دلانے کے لئے ان پر وحی اترتی ہے، محمد ﷺ نے ایک سفید دودھیا رنگ کے کبوتر یا فاختہ کو سدھار رکھا تھا، جو ان کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور وقفہ وقفہ سے چونچ مار مار کر ان کے کان میں سے دانے چگا کرتا تھا، اور اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ فرشتہ ربانی (جبرئیل) ان پر وحی نازل کر رہا ہے اور انہیں املا کرا رہا ہے۔ (185)

انہیں (نعوذ باللہ) اعصابی مرض لاحق تھا اور وہ توہمات، فریب حسی میں مبتلا تھے۔ نزول وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی ضرور تھے، کیونکہ وہ غیر متوازن اعصابی مزاج والے آدمی تھے۔ اعصابی دورے پڑتے تھے اور وہم ہو جاتا تھا کہ تابع الہام ہیں۔ یہ نولد یکی کے ذہن کا اختراع اور بوالعجبی ہے۔ اپنے الہامی اور الہیاتی مشن کے بارے میں خود مشکوک ومتذبذب تھے۔ میور کے نزدیک ابتداءً انہیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ ہیں۔ البتہ ایک طویل عرصہ تک شک وتذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر آمادہ بہ تبلیغ ہوئے۔ (186)

یہ الزام سراسر واقعات کے خلاف ہے، اور تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے۔ اگر ذرا بھی تذبذب ہوتا تو اپنی زوجہ محترمہ خدیجہؓ کو، اپنے بھائی علیؓ کو اپنے جگری دوست ابوبکرؓ کو کیونکر مطمئن کرتے، مذہبیت اور الہیات کی تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل تھا۔ ان کو بائبل کی تعلیمات کا علم تھا۔ نبوت کا تسلسل برقرار نہیں رہا، یہ منٹگمری واٹ کا مفروضہ ہے، اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ یہود مدینہ سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی ورسول کی حیثیت سے تسلیم کرلیں۔ (187)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کے لغو خیال میں نبی کاذب تھے۔ وہ (نعوذ باللہ) مکار، دغاباز، مدعی کاذب تھے، شیطان کے آلۂ کار، اور اس کے توہین آمیز جاسوس تھے، ترویج واشاعت مذہب کے لئے تشدد کا سہارا لیا، اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا۔ حِتّی (Hitti) کے خیال میں حضور ﷺ کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا اور لامنس کے نزدیک ان کی مکی زندگی کے حالات محض افسانہ (fiction) ہیں، اصل استفادہ عیسائیت سے کیا، چنانچہ مسیحی نسطوری راہب بحیرہ سے خاص ملاقات رہی، مستشرقین کے نزدیک ایک مقبول عام وزنی الزام یہ ہے کہ

آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ تک پیغمبرانہ رہی، لیکن مدینہ جا کر بادشاہی میں بدل گئی، اور وہاں لشکر کشی انتقام خونریزی کا بازار گرم کر دیا۔

کار ہائے نبوت ورسالت، واقعات سیرت:

دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی اختیار کی۔ میور لکھتا ہے: ''کار نبوت کی ابتدا میں تو ایمانداری سے یہودی اور عیسائی طور طریقوں اور نظام کو اپنایا گیا اور اپنے مذہب کی انہیں بنیاد بنایا گیا، لیکن جب مطلب حاصل ہو گیا اور اقتدار حاصل ہو گیا، تو ان سے برأت ظاہر کی اور پھر انہیں بالکل مردود قرار دیدیا''۔ اسلام کو یہودیت سے بدلنے کی کوشش کی۔ (188)

واٹ لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جا کر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہب قدیم ''یہودیت'' سے بدل دیا جائے۔ تحویل قبلہ، ایک خاص وقت کے بعد یہودیت وعیسائیت سے بیزاری کی کوشش ہے۔ شاید اسلام یہودیت کا ایک حصہ یا فرقہ بن جائے۔ محمد ﷺ نے مسلمانوں کو اپنے آپ کی پرستش کی دعوت دی۔ منشور مدینہ (Charter of Madinah) میں حضور ﷺ کا مقام ومرتبہ غیر معین تھا۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے قریش مکہ بڑے خوش ہوئے۔ (189)

مارگولیتھ لکھتا ہے کہ ''عین ممکن ہے کہ قریشی سردار (محمد ﷺ کی ہجرت کے بعد) آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہوں کہ وہ اپنے ایک تکلیف دہ ہم وطن سے بغیر کسی خون خرابے کے نجات پا گئے''۔ (190)

مارگولیتھ کی یہ خیال آفرینی بھی تاریخی واقعات کے بالکل خلاف اور لغو ہے۔ محمد ﷺ نے قریش مکہ کو (بلاوجہ) اپنے خلاف بھڑکایا، غزوات محض لوٹ مار کی مہمیں تھیں، اور عربوں کی غربت وتنگدستی دور کرنے کا ذریعہ، بعض یورپی مصنفین کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ کا لایا ہوا انقلاب اور مذہبی اصلاحات اس لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہاں کا ماحول دراصل ان کے موافق اور مناسب تھا، اور اہل عرب مذہبی معاشرتی تبدیلی کے متلاشی اور پیاسے تھے۔ جنگ موتہ اس جنگ کا مقصد متعین کرنا مشکل ہے۔ (191)

وحی پر اعتراض:

مستشرقین کا یہ کہنا کہ کیفیت وحی مرگی کی بیماری تھی قطعاً نامعقول ہے بوجوہات ذیل کہ:

1۔ صرع یا مرگی کی بیماری میں مرض کے دورے کے قوت جو واردات ہوتے ہیں مریض کو فاقہ کی حالت میں اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا کہ اس پر کیا وارد ہوا اور کس طرح وارد ہوا۔ اس حقیقت پر قدیم اطباء اور جدید ڈاکٹر متفق ہیں جس کو محمد حسین ہیکل مصری نے حیات محمد میں نقل کیا ہے۔ لیکن وحی نبوی کی حالت اس کے خلاف تھی۔ وحی کے دوران کے تمام الفاظ وحی زوال کیفیت وحی کے بعد آپ کو یاد رہتے تھے اور وحی کی پوری کیفیت آپ کے حافظے میں ہوتی تھی۔ لہٰذا مرگی کا تخیل صرف الزام تراشی ہے۔

2۔ دوم یہ کہ مرگی کے ساتھ زمین پر گر پڑنا، منہ میں سے جھاگ نکلنا، انگلیوں کا سکڑ جانا لازمی ہے لیکن یہاں ان میں سے کوئی چیز نہیں۔

3۔ سوم یہ کہ وحی کی حالت میں جو پیغام آپ کو دیا گیا، جس کا نام قرآن ہے، اور جس کی لفظی اور معنوی حیرت انگیز معجزانہ خوبیوں سے دنیا بھر کے حکماء اور عقلاء عاجز ہیں اور جس کی اصلاحی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ بہت کم عرصہ میں اس نے عرب اور ماوراء عرب کے ان انسانوں کو جن کی زندگی سیاہ اور پر از معاصی تھی اور ناقابل اصلاح تھی ایسے درندہ صفت انسانوں کو حضرت نے ایسی پاکیزہ زندگی عطا کی کہ تاریخ انسانیت میں اس کی نظیر نہیں۔ وہ عبادت الٰہی خشیۃ اللہ اخلاق میں بے مثال حسن معاملات جہاں بانی جہانداری، عدل وانصاف میں یکتا بن گئے۔ کیا کسی مرگی والے کی بات میں بھی اس قسم کا اثر ممکن ہے۔

4۔ چہارم یہ کہ نبوت کا زمانہ تیئیس سال سے زیادہ ہے۔ اگر اتنی طویل مدت تک کوئی اس موذی مرض کا شکار رہو تو ضرور اس کی صحت خراب ہو جاتی ہے لیکن پیغمبر اسلام علیہ السلام کی صحت کا یہ حال تھا کہ تریسٹھ سال کی عمر تک جسمانی اور دماغی قوت آپ کی بے نظیر

تھی اور سر اور داڑھی مبارک دونوں میں بہ مشکل بیس بال سفید ہوئے ہوں گے۔ جو انتہائی صحت کی نشانی ہے۔

5۔ پنجم یہ کہ تیرہ سو سال بعد کے دشمنوں نے آپ کے متعلق یہ فرضی جھوٹ تراشا لیکن جو دشمن آپ کے زمانے میں موجود تھے اور آپ کی حالت کا دن رات مشاہدہ کرتے تھے جن میں مشرکین یہود اور نصاریٰ تھے، ان میں کسی ایک فرد نے بھی آپ کی ذات کی نسبت مرض مرگی کا الزام نہیں لگایا، حالانکہ ان دشمنوں کو اس الزام تراشی کی زیادہ ضرورت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ باحیاء اور کسی قدر انسانی شرافت اور راست گوئی کی اہمیت کے قائل تھے اور اہل استشراق اس سے محروم ہیں۔ (192)

فصل پنجم

تعلیمات

اسلام میں آزادی رائے:

سر ولیم میور کے نزدیک ''اسلام میں مذہب کے بارے میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے۔ بلکہ بالکل معدوم کر دی گئی ہے۔ مگر سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ سر ولیم میور کی اس رائے کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادی رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے۔ اور دوسرے مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے جو اس آزادی کی اجازت دیتی ہے۔

یہودی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر لفظ اپنے تاریخی مضامین سمیت باوجود اس کے کہ ان کے مصنف بھی معلوم نہیں وحی آسانی ہیں۔ اور اس لئے سہو و خطا و غلطی سے بالاتر ہیں اور ہر ایک انسان کو کسی تامل، یا کسی حجت یا اپنے عقلیہ کا استعمال کیے بغیر ان کے حق ہونے پر یقین کرنا چاہیے۔(193)

کتب مقدسہ کے بارے میں عیسائیوں کے دو فرقے ہیں ایک وہ جو کتاب مقدس کے تمام و کمال وحی ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور دوسرا وہ جو صرف اس کے ایک حصہ کو جو مسائل و احکام سے متعلق ہے۔ وحی سمجھتا ہے اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا۔ مگر اس اختلاف سے قطع نظر ان سب کے لئے دو بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے۔ جن کی وجہ سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور پر نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اس لئے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں، وہ دو مسئلے یہ ہیں:

ایک مسئلہ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا ہے یہ ایک عجیب مسئلہ ہے جس کی نسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے۔ خدا کے تین مقدس جسموں کے اظہار کے لئے تثلیث کا لفظ دوسری صدی عیسوی تک (جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اس کو ایجاد کیا) جاری نہیں ہوا تھا۔ اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل نائس یا نائسیا میں بھی طے نہیں ہوا تھا۔ اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے۔ یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی ہے جس سے خاص اس مسئلہ میں استدلال کیا جاتا ہے۔ پس اگر نہایت عجیب و مشکل اور خلاف عقل مسائل پر یقین کر لینے ہی کو اعتقاد کی خوبی قرار دیا جائے تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا۔ اور کسی کے لئے عیسائی کہلانے اور خدا کی بارگاہ میں عیسائیوں کی طرح حقوق حاصل کرنے سے پہلے اس عجیب و غریب مسئلہ پر پختہ یقین کرنا لازمی ہوگا۔(194)

بقول سرسید احمد خان:

''تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگر چہ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل کے بالکل برخلاف ہے تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار و معطل چھوڑ کر نہایت اصرار و تعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے۔ دلیل و عقل کو اس میں دخل دینا ہرگز جائز نہیں ہے''۔(195)

دوسرا مسئلہ فدیہ کا، یعنی حضرت عیسیٰ کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آئندہ گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے۔ اور یہ بات قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے۔ جس سے معاملات مذہبی میں آزادی رائے بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا۔ اس کے لئے بدی اور بداخلاقی کے دروازے کھل جاتے ہیں کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا۔ بہر حال یہودی اور عیسائی مذاہب میں آزادی رائے کے معدوم ہونے بلکہ خلاف عقل عقیدہ رکھنے کی کسی قدر تفصیل کے بعد سرسید مرحوم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ:

''مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیک اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بے نظیر ہے۔ اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں۔ ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب خصوصاً مذہب عیسائی کے فیاض اور دانشمند، بے تعصب معتقدوں کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔ مشہور و معروف فرانسیسی عالم ایم ڈی سینٹ ہلیر نے لکھا ہے کہ '' اسلام میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور عجوبہ کے نہیں ہے۔ مذہب اسلام خود اس بات کا مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے۔ اور اگر اب تک اس میں چند شہادت موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے کیونکہ وہ ابتداء ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے''(196)

انہوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ دین محمدی کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت، راویوں اور روایت کے مضمون کی نسبت آزادانہ تحقیقات اور بے تعصبانہ رائے اور تحقیق کے بعد معتبر ٹھہرانے کا ہر شخص کا کلیتہً اختیار ہے۔ جو روایتیں کہ غور و فکر اور نہایت تحمل اور بردباری سے تحقیق کے بعد عقل اور قدرت کے خلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں۔ یا جو روایتیں اور حدیثیں بے حد ہوں ان سب کو رد کر دینے کا کلیتہً مجاز ہے۔ قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ ہم نے قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی اس کی سچائی ثابت ہونے ہی پر مانا ہے۔ مذہب اسلام کی رو سے ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اس میں پاوے اس پر عمل کرے۔ اسلام میں ایسی قوت کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے۔ مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت نہیں کہ اس کا جو سب بڑا اصول ہے یعنی خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت، وہ بھی عقل کی مداخلت کے بغیر اندھا دھند اعتقاد اور بے سمجھے غلامانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ خود قرآن مجید اس بڑے مسئلہ کو جبر و سختی و ناسمجھی سے نہیں بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے۔ قرآن مجید میں سب سے پہلے خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس لازوال ہستی او ہمہ راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے۔ پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقے پر بیان کی ہیں۔ پس امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ (197)

تلوار کی کاٹ:

اسلام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کو قبول کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے۔ مگر جیسا کے سر سید مرحوم فرماتے ہیں:

(یہ اعتراض) منجملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر کیے ہیں۔ یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں یا وہ حق پوشی کی نظر سے دیدہ دانستہ باندھے ہیں۔ اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے۔ دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا یہ خیال کہ اسلام زبردستی اور تلوار سے پھیلایا جاتا ہے قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے بالکل برخلاف ہے۔ جہاں خدا نے فرمایا کہ:

''دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے کیونکہ راہ گمراہی سے علانیہ کھل گئی ہے''۔(198)

جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا۔ اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے اس وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے۔ مگر اسی وقت تک جہاں تک یہ مقصد حاصل ہو جائے تاکہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ و تلقین خدائے واحد کا جلال لوگوں کے دل میں بٹھا دیں۔ ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی

جاتی ہے۔ نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے۔ وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ تنہا اسی مقصد کے حاصل ہوتے ہی تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے۔ گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو۔ جس اصول پر حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثناء کے قتل و غارت و نیست و نابود کردیں۔ اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا۔ اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا"۔ (199)

دوسرے مذہبوں کے لئے آزادی:

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کو آزادی نہیں دی گئی ہے۔ چنانچہ سرسید یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کا استعمال محدود مقاصد کے لئے تھا۔ اور وہ یہ کہ مسلمان امن سے رہیں۔ خدائے واحد کی پرستش کیا کریں، خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں۔ اور اپنے چال چلن اور عادت و عبادت و محبت رہی۔ وہی سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلادیں۔ اور اس کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

ایک ہی مذہب ہو جائے اور لوگ مسلمان ہو جائیں، جیسا کہ مدینہ میں ہوا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صلح رہے کفار فرائض مذہبی کی ادائیگی پر معترض نہ ہوں جیسا کہ ابتداءً مکہ میں تھا۔ یا جس طرح کہ مسلمان حبشہ میں ہجرت کے بعد امن سے رہے یا کسی جنگ کی صورت میں کفار صلح کے طور پر یہ تسلیم کرلیں کہ مسلمانوں کہ ملک میں رہنے، آمد و رفت رکھنے، ان کی جان و مال کی حفاظت اور فرائض مذہبی کی ادائیگی میں ان پر معترض نہ ہوں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ملک فتح ہو جائے اور فرائض مذہبی کی ادائیگی اور اعلائے کلمۃ اللہ پر مسلمانوں سے تعرض کرنے کی کسی میں کوئی طاقت ہی باقی نہ رہے۔ اس کے بعد جیسا کہ سرسید مرحوم نے تصریح کی ہے:

"ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے۔ گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو۔ اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو آزادی حاصل رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہنچائے۔ اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے"۔ (200)

سرسید اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ "مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کردیا" مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں۔ اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہوگی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے۔ مگر وہ مسلمان فتح مندوں جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے۔ دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے۔ اور اپنی تمام رعایا کو ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے۔ چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرفدار ہو۔ اسپین کے علم و تاریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے۔ جس میں یہ ہے کہ:

"اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات بیان کے قابل ہے۔ کیونکہ اس سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانے تک ان کے بادشاہوں میں بڑی خوبی پائی جاتی ہے۔ یعنی ان کا عام طور سے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی دینا"۔ (201)

مذکورہ بالا اعتراض کے جواب میں سرسیدؒ نے ایک مسیح عالم گاڈفری ہیگنز کی یہ رائے بھی درج کی ہے کہ "کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زیادتی مذہب اسلام کی مذمت، یہ عجیب زعم اور محض ریاکاری ہے وہ کون تھا (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے اس لئے جلا وطن کردیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب نہیں قبول کرتے تھے۔ اور وہ کون تھے (عیسائی) جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا۔ اور ان سب کو بطور غلام کے دیدیا تھا۔ اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے۔ مسلمانوں نے اس کے برخلاف یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور ان کے مذہب، ان کے پادریوں، ان

کے بشپ، ان کے بزرگوں، ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔ جولڑائی بالفعل (یعنی مسٹر ہیگنز کی اس تحریر کے زمانہ میں) یونانیوں اور ترکیوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں دیمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی۔ کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے۔ یونانی اور حبشی اپنے فتح مندوں کی اطاعت سے آزاد ہونا چاہتے ہیں اور ان کا ایسا کرنا واجب ہے۔ جب کبھی خلیفہ فتحیاب ہوتے تھے اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے۔ تو فوراً ان کا رتبہ بالکل فتح مندوں کے برابر ہو جاتا تھا۔ (202)

ایک نہایت دانشمند عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ''وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے، اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش وخرم تھے''۔ گاڈفری ہیگنز نے اسپین سے مور مسلمانوں کے جلاوطن کیے جانے کے بارے میں ایک دلچسپ مگر حقیقت پسندانہ بات یہ بھی لکھی ہے کہ:

''اگر چہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلاوطن کئے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے۔ مگر مجھ کو گمان ہے کہ اس کا سبب اور ہی تھا، یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے۔ اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی، وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے، وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی، ایرانی، اسپین، خواہ ہندو قتل نہیں کیے جاتے تھے، جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے، بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب بہ امن وامان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیے جاتے تھے۔ اور اس پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا۔ خلفاء کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ عیسائیوں میں مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا۔ اور نہ کوئی مثال بھی ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے سبب جلا گیا ہو۔ نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمانہ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا''۔ (203)

جزیہ کے بارے میں ہیگنز کے خیال کی تردید:

ابھی مذکورہ بالا اقتباس میں گاڈفری ہیگنز کا ایک فقرہ یہ تھا کہ (مفتوح قوم کے غیر مسلم) حق کی بابت ایک محصول دیتے، اس جملہ سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم رعایا کو اپنے مذہب پر باقی رہنے کی وجہ سے اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ حالانکہ جزیہ کی یہ توجیہ درست نہیں۔ چنانچہ سرسید مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مسٹر ہیگنز نے یہاں غلطی کی ہے، کافروں میں جو مفتوح ہو جاتے ہیں، اس معاوضہ میں کہ ان کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جزیہ نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بے تنخواہ یا قلیل تنخواہ پر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کئے جاتے اور حکومت اسلامی کے قائم رکھنے اور امن وامان کے بحال رہنے کے گورنمنٹ کے مقصد اور غرض میں کوئی خدمت بجا نہیں لاتے بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ وامن کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کے معاوضہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے، بلکہ خلیفہ کو ملکی مصلحت کے پیش نظر بالکل اختیار ہے۔ چاہے لے، چاہے نہ لے، پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے۔ نہ مذہب سے، مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول ہے، یعنی ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا''۔ (204)

اسلام کی دی ہوئی مذہبی آزادی اور عیسائیوں کا طرز عمل:

اسلام میں دوسرے مذہبوں کو آزادی دی گئی ہے۔ لیکن اس کے خلاف عیسائیوں کا طرز عمل بڑا افسوس ناک ہے۔ چنانچہ جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب ''اپالوجی'' میں لکھا ہے کہ ''نائیسا کی کونسل میں کانسٹنٹائن نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس سے

نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے۔ یعنی خون ریزی اور بربادی۔ ان احمقانہ جہادوں کی عیسائیوں نے تقریباً دوسو برس تک ترکوں پر کئے تھے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔ ان لوگوں کا قتل جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ انسان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے۔ لوتھر کے پیروؤں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا۔ وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی نے دیا۔ فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا اور چالیس برس تک اور دوسری بہت سی خون ریزیوں کا ہونا۔ فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک، عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جواب تک قابل نظیر ہے۔ کیونکہ وہ عدالت کے حکم سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری بے انتہاء بدعتوں اور ان تیس برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے۔ زہر دے کر یا دوسرے طریقوں سے قتل کی وارداتیں، تیرہ، چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعوے جو ہر قسم کے گناہ، عیب اور بدکاری میں ایک نیرو یا ایک گیلکیولا سے بڑھ کر تھے۔ اور آخرکار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لئے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لئے قتل ہونا۔ ایک ایسا مکروہ اور تقریباً ایک غیر منقطع مذہبی لڑائیوں کا سلسلہ جس کے بارے میں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ چودہ سو برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا۔ اور جن قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بناء پر نہیں بہایا۔ (205)

لیکن عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں کا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا اس کے بارے میں سرسید نے مشہور مورخ گبن کا یہ اعتراف درج کیا ہے کہ:

''آنحضرت ﷺ نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں ان سے خلفاء نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی۔ ملک عرب میں جو حضرت محمد ﷺ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا، بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والے اور بت پرست جو ان کو نہ مانتے تھے شرعاً نیست و نابود کئے جا سکتے تھے۔ مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی۔ ہندوستان کے مسلمان فتح مندوں نے اس آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا''۔ (206)

وہ ایک دوسرے آرٹیکل سے جو ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباس بھی پیش کرتے ہیں کہ:

''اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی۔ کوئی مذہبی عدالت، مخالف مذہب والوں کو سزا دینے کے لئے قائم نہیں کی، اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا مقصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کو جاری کرنا چاہا مگر ان کو بزور جاری نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتح مندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے۔ اور مفتوحہ سلطنتیں ان شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں، جو ہر ایک فتح مند نے ابتداء سے حضرت محمد ﷺ کے زمانے تک ہمیشہ قرار دی تھیں''۔ یہی مصنف مزید یہ بھی لکھتا ہے کہ ''فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں''۔ اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں''۔

مندرجہ بالا اقتباسات پیش کرنے کے بعد سرسید فرماتے ہیں کہ:

''اب دیکھو کہ بہت سے ناطرفدار، فیاض طبع، عیسائی مصنفوں کی یہ رائیں سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں، کتنی مختلف ہیں''۔

سرسید نے مذکورہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ان وسیع تر فائدوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اسلام کی وجہ سے دوسرے مذاہب کو پہنچے۔ اس نے دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جو ناقص اور نامکمل پہلو رہ گئے تھے ان کی تکمیل کی، اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاکیزہ لوگوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ کو منسوب کرتے تھے۔ جن کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اسلام نے ان

خدا پرست لوگوں او پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا اور ان کے معصوم اور بیگناہ ہونے کا اعلان کیا۔(207)

ار عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کیا۔حضرت ابراہیمؑ،حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹیوں،حضرت اسحاقؑ،حضرت یہوذا، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹیوں، اور ہارونؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ وغیرہ کی ان کے ہاں باوجود نبی ماننے، مذہبی رہنما تسلیم کرنے اور مقدس جاننے کے ایسی تصویر پیش کی جاتی تھی جیسے کہ وہ مجرم جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں۔یا ان کے گناہوں کی سزا کے لئے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔یہ صرف اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے۔یہود، عیسائیوں کے مقدس بزرگوں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کے منکر،مخالف اور دشمن تھے۔جن کی طرف سے اسلام نے صفائی پیش کی، جو عیسائیوں پر ایک بڑا احسان ہے۔اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات سے نجات دی اور عیسائیوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔ورنہ آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے، جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیں۔درحقیقت لوتھر نے اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی جس پر اس کے مخالف اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔تاہم اس نے اپنی کوششوں کو نہیں چھوڑا اور آخر کار وہ عظیم الشان اصلاح کرنے پر قادر ہوا۔جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے آزاد کر دیا۔ہم کو یقین ہے کہ اگر ''لوتھر مقدس'' اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے۔اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو در حقیقت حضرت عیسیٰؑ نے بھی تلقین کیا تھا۔لوگوں میں پھیلاتے، اور آخر اس نبی آخر الزمان ﷺ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا۔پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے۔(208)

غلامی:

سر ولیم میور کا ایک اعتراض اسلام میں غلامی کے مسئلہ پر بھی ہے۔جس کے جواب میں سر سید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

''اگر اس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جائے تو یہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اس کی سبت کچھ اعتراض کریں، کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جس میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰؑ کا یا اس زمانے کے رسم ورواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو''۔(209)

عیسائیوں کے یہاں غلامی کا رواج اس قدر تھا کہ بقول گاڈفری ہیگنز انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے۔مثلاً اس میں جہاں کہیں لفظ 'سروس' یا ''دولوس' 'پایا جاتا ہے اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے۔وہاں اس کا ترجمہ ''غلام'' ہونا چاہیے۔لفظ ''سروس'' کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہے۔اور ''فرید ہٹیس'' ہمارے اجورہ دار اور خدمت گار کے ہم معنی ہے۔لیکن اگر بد قسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دے جائے تو اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے۔جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا۔اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے۔(210)

گاڈفری ہیگنز یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مگر حضرت محمد ﷺ (جنہوں نے غلامی کے مٹانے کے لئے نہایت عمدہ ترکیبیں کیں) وہ تھے جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے بیانوں میں کھڑے ہوئے تھے۔حضرت محمد ﷺ تو فرماتے ہیں کہ ایسے غلاموں کو جو تم سے اس مضمون کی ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کر دیں تاکہ اپنے آپ کو آزاد کر لیں تو ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھ دو۔اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے ان کو دو''۔گاڈفری ہیگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔(211)

لیکن سر سید مرحوم کا خیال ہے کہ:

''جو لوگ تقلید کی تاریکی میں اندھے پھر رہے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مرضی اور خوشی غلاموں

کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے۔(ایضاً، ص 267) اسلام لانے سے غلامی ساقط ہو جانے پر جو استدلال گاڈفری ہیگنز نے کیا ہے ہم کو دل سے اس پر اتفاق ہے۔ خدائے تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں صاف فرمایا ہے کہ (انما المومنون اخوۃ) سب ایمان لانے والے آپس میں بھائی ہیں۔ اور اس لئے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ یہی اخوت اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مر جاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لئے چلا جاتا ہے۔ کتابت کا جو ذکر گاڈفری ہیگنز صاحب نے کیا ہے وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو۔ بلکہ اس کا کرنا واجب تھا اور انکار کرنا قابل سزا کے تھا۔ چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے جب حضرت انسؓ سے کتابت کی درخواست کی تو انہوں نے انکار کیا۔ ابن سیرین نے وہ مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت عمرؓ نے خط آزادی بمعاوضہ حضرت انسؓ سے لکھوا دیا۔(212)

سر سید غلاموں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے بخاری کی یہ روایت بھی درج ذیل کرتے ہیں کہ:

آنحضرت ﷺ نے غلاموں کے حق میں فرمایا ہے کہ:

وہ تمہارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمہاری خدمت کرتے ہیں تمہارے کاموں کو سنوارتے ہیں۔ اللہ نے ان کو تمہارا تابع کر دیا ہے۔ پس جو شخص کہ اس کا بھائی اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اس کو کھلادے اور جو آپ پہنتا ہے اس میں سے اس کو پہنادے اور ان سے ایسی تکلیف کے کام نہ لے جو ان کو تھکادیں۔ اور اگر ایسی تکلیف کا کام ان کو دیا جائے جو ان کو تھکادے تو خود ان کی مدد کرے۔ (213)

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ:

''اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانے میں اپنے غلاموں کو ایسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے۔ اور ایک خوان پر ساتھ وہی کھانا اور ان کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے۔ اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سے سوار ہوتے تھے۔ اور باری باری نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے۔ خلیفہ عمرؓ اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں اپنی باری میں اس وقت اونٹ کی لہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا۔ عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلتی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو گھسیٹتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے۔ فاطمہؓ پیغمبر ﷺ کی بیٹی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں کبھی ان کا دست مبارک ہتے کو نیچے سے تھامتا تھا اور کبھی لونڈی کا تا کہ دونوں کو برابر محنت پڑے۔ پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کا بتر بنانے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے۔ ایسی غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زائد از حد ترقی متصور ہے۔ پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں عروج تھی، قیاس کرنا محض غلطی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا بلکہ ان کی نسبت لونڈی و غلام کے لفظ کے استعمال کو بھی حسن سے ان کی حقارت نکلتی تھی منع فرمایا، اور نہایت شائستہ، مہذب و شفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی۔ علاوہ اس کے آنحضرت ﷺ نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں ہے''۔(214)

جو لوگ قدیم رسم جاہلیت کے مطابق غلام ہو چکے تھے، زر معاوضہ لئے بغیر ان کو بطور احسان کے آزاد کرنے کا حکم اسلام نے نہیں دیا۔ وہ بدستور ان لوگوں کی ملک میں رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ سر سید مرحوم اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اگر کوئی نہ سمجھ یہ الزام مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعتہً کیوں نہ آزاد کر دیا، تو اس کی اس نا سمجھی کا ہمارے پاس کچھ علاج

نہیں ہے۔ مگر اس نا سمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں اس قدر تو ضرور تسلی ہوگی کہ ان بدنصیبوں کی بھی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے۔ اور ایسا رحم و شفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے مثل و بے نظیر ہے۔ اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں۔ ہاں بلاشبہ جو سمجھ دار و اور دانشور لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے۔ ان کی آزادی کا دفعتہً حکم دے دینا محالات عملی سے تھا۔ اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آئندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جائے۔ اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے۔ پس یہی کام اسلام نے کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے''۔ (215)

قرآن مجید کی آیت: ''فاذا لقیتم الذین کفروا........ فاما منا بعد و اما فداء'' (216)

کی تفسیر میں علماء نے دو مختلف راہیں اختیار کی ہیں، اہل کفر سے مقابلہ میں اگر کچھ قیدی ہاتھ آ جائیں تو بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کو صرف اسی وقت چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہو کر مسلمان کے ملک میں رہنا قبول کریں اور بعضوں کی یہ رائے ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے اور کوئی شرط ان پر نہ لگائی جائے اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں رہیں یا اگر چاہیں تو اپنے ملک چلے جائیں۔ سرسید مرحوم کے خیال میں یہی رائے بظاہر معقول اور زیادہ مستند، معتبر اور صحیح ہے کہ قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینے میں کوئی قید اور شرط نہیں لگائی گئی۔ (217)

وہ سر ولیم میور کو یہ جواب دیتے ہیں کہ:

''بقول مسٹر ہیگنز کے گو حضرت مسیحؑ نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو، مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد ﷺ نے غلامی کا بالکل موقوف کر دیا۔ تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا۔ اور جو قدیم زمانے کی بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی۔ اور جن رسموں کو اس بڑے مقدس مقنن موسیٰ نے بھی بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا۔ اور جن کو حضرت مسیحؑ نے بھی نہیں توڑا تھا۔ اور جن کو حضرت مسیحؑ کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا۔ دفعتہً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسموں اور مطول قانونوں کو ایک دو لفظ کے فرمانے سے کہ ''اما منا بعد و اما فداء'' مٹا دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست	کتب خانہ چند ملت بشست

(قرآن مجید میں) کافروں کے مغلوب ہو جانے پر ان کے قید کرنے کے حکم کا مقصد ان کی جان بچانا ہے۔ اور قید کرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے۔ ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے ان سے فدیہ لے کر چھوڑنے میں جب دو حکم دیے جاتے ہیں تو دونوں میں سے ایک کا بجالانا واجب ہوتا ہے۔ یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں۔ پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عمل درآمد کرنا واجب ہے۔ ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے دیے۔ رقیت یعنی قیدیوں کا لونڈی اور غلام بنانا بالکل نیست و نابود ہو گیا ہے۔ ہاں یہ بات ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو اس وقت تک اس کو قید رکھے۔ مگر وہ قیدی بدستور ایک قیدی ہوگا اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا تو درحقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی۔ اور اسی لئے اس پہلے حکم کی تعمیل واجب ہوگی۔ (218)

عیسائی قوموں میں غلامی کا رواج پہلے بھی تھا اور اس وقت بھی بعض ملکوں میں ان کے یہاں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے۔ سرسید مرحوم کے زمانہ میں کچھ پس ماندہ مسلم ریاستوں میں بھی اس ''رواج'' کی خبریں ملا کرتی تھیں۔ چنانچہ وہ اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جس نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (اور بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا

ہے۔اس کو دیکھ کر ہم اس خطبے کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے۔وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے۔اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا۔خواہ مکہ میں جاکر یہ کام کرے یا مدینے میں''۔(219)

قانون طلاق پر اعتراض:

مستشرقین قبل ازیں اسلام کے قانون طلاق پر بھی اعتراض کرتے تھے۔زمانہ کے عائلی ضرورتوں نے جب ان کو سبق سکھایا تو اسلام کے قانون فطری کی طرف رجوع کیا۔

شراب نوشی:

مستشرقین پہلے تحریم شراب پر اعتراض کرتے تھے لیکن اب قائل تحریم ہیں۔

ا۔ شراب اسلامی قانون کی نظر میں:

"رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم ترحمون''۔(220)

(قرآن، مائدہ) شراب ناپاک اور شیطانی کاموں کا سرچشمہ ہے۔اس سے دور رہو۔اس میں شراب کی ناپاکی کو بیان کیا کہ شراب اور پاخانہ نجاست میں برابر ہے۔لہٰذا شراب کا پیٹ میں جانا ایسا ہے جیسا پاخانہ پیٹ میں داخل کیا جائے۔دوم یہ کہ اس کے پینے سے شیطانی اعمال و کردار کا دروازہ کھل جاتا ہے،اور انسانی صورت میں شیطانی اعمال کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔سوم یہ کہ شراب سے الگ ہونے میں دین و دنیا کی کامیابی ہے۔ورنہ دونوں جہانوں کی ناکامی یقینی ہے۔روح المعانی سورۂ بقرہ کی تفسیر جلد اول میں حضرت علی سے روایت ہے کہ اگر کسی کنویں میں ایک قطرہ شراب ڈالا جائے اور اس کنویں پر منارہ تعمیر کیا جائے تو اس منارے پر اذان نہ دی جائے۔گویا شراب کی نحوست سے اذان جیسی مقدس چیز بھی آلودہ ہو جائے گی۔

2۔ شراب اور صحت بدنی:

ڈاکٹروں کا تحقیقی ادارہ سوئٹزرلینڈ میں قائم کیا گیا۔پوری تحقیق کے بعد شراب کی مضرات پر اس نے رپورٹ میں دلائل اور تجربات سے ثابت کیا کہ شراب سے عمر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ہاضمہ کا فعل ضعیف ہو جاتا ہے۔دل سخت کمزور ہو جاتا ہے اور اسی طرح بیشمار نقصان لکھ دیئے جس کے اثر سے امریکہ نے 1937ء میں ان نقصانات کو نشر کر کے شراب کی بندش کی۔لیکن جب برائی پھیل جاتی ہے تو اس کا ازالہ ایمانی قوت سے ہوتا ہے۔اس لئے کامیابی نہ ہو سکی۔ڈاکٹر احمد بک نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے کتاب اعلام الباحث بقبح ام الخبائث جس میں یورپ کے ماہرین کے اقوال سے اس نے بیشمار بدنی اور جسمانی مضرات شراب نوشی کے ثابت کئے ہیں۔تحریر کیا ہے کہ شراب نوشی اول میں چستی لاتی ہے۔بعد ازاں سستی۔اس لئے جو مزدور و عمال شراب نوش ہیں، مسلسل کام نہیں کر سکتے۔بخلاف غیر شرابیوں کے کہ وہ مسلسل محنت برداشت کرنے کی اہلیت و قوت رکھتے ہیں۔(221)

روحانی اخلاق کا زوال اور شراب نوشی:

1۔ شراب نوش زوال نشہ کے بعد بزدل ہوتے ہیں کہ ان کے دل پر ایک غلاف پیدا ہو جاتا ہے جس سے دوران خون میں رکاوٹ ہوتی ہے۔

2۔ شراب نوش میں ضد زیادہ اور رحمت و شفقت انسانی کم ہوتی ہے۔

3۔ شراب نوشی صبر و استقلال کو ختم کرتی ہے اور اس کے کردار اور گفتار میں تضاد واقع ہوتا ہے اور ناقابل اعتماد ہو جاتا ہے۔

4۔ مشکل کام کی ہمت شراب نوش میں کم ہو جاتی ہے اور معمولی دباؤ سے متاثر ہوتا ہے۔

5۔ زنا اور عیاشی کی طرف میلان بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین نے ہر نشہ بند کیا۔

6۔ روحانی اخلاق کے لئے بنیادی اساس عقل سلیم ہے۔ یہ شرف انسانی کا اصل جوہر ہے اور تمام کمالات وفضائل کا سر چشمہ ہے۔ شراب نوشی میں بار بار ازالہ عقل کی وجہ سے جوہر عقل انسانی کا انحلاء ختم ہو جاتا ہے اور عقل اپنے اصلی کام خوف خدا اور خوف آخرت کے یقین وجزم اور اس کے مطابق عمل سے محروم ہو جاتی ہے۔

7۔ اندرون انسان میں سب سے بڑی اخلاقی حس حیاء ہے۔ جو صرف تمام حیوانات میں انسان کے ساتھ مختص ہے۔ حیاء کی وجہ سے انسان ان فواحش ومنکرات سے بچتا ہے۔ جو حیاء کے مقتضی کے خلاف ہے۔ جن اقوام یا افراد میں شراب نوشی پھیل جاتی ہے، تو ان میں وصف حیاء کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور برے سے برے کام میں وہ قوم شرم محسوس نہیں کرتی۔ موجودہ مغربی اقوام کی تاریخ اور کردار سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔ سان فرانسسکو میں جاپان کے ہتھیار ڈالنے پر فوجیوں نے شراب پی کر ہزاروں دوشیزاؤں کی عصمت دری کی اور برسر بازار ان کو ننگا کر دیا۔ برطانیہ میں برائے اظہار بے حیائی مستقل ننگوں کی تعداد چھ لاکھ ہے۔ (222)

1944ء کی جنگ میں امریکی فوجوں نے جاپانی ماؤں سے بیس لاکھ حرامی بچے پیدا کئے علاوہ خفیہ اور اسقاط کی صورتوں میں لیکن اسلامی فوجوں نے دنیا کا اکثر حصہ فتح کیا۔ لیکن زنا کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ (223)

امریکہ میں ہیرائن نام نوجوان کے ساتھ تین دوشیزاؤں نے سات مرتبہ زنا بالجبر کیا اور پچاس ڈالر بھی چھین لئے۔ (224)

شراب نوشی کا مالی نقصان:

امریکہ کی سرکاری رپورٹ کے مطابق وہاں شرابیوں کی تعداد 8 کروڑ ہے جن میں ساٹھ لاکھ افراد سالانہ اپنی زندگیاں اس ام الخبائث کی وجہ سے ختم کر رہے ہیں۔ اور امریکہ شراب نوشی پر سالانہ تیس ارب بیس کروڑ ڈالر خرچ کرتا ہے۔

بہ تفصیل ذیل:

1۔ عدم کارکردگی کے ضمن میں سالانہ دو سو کروڑ۔

2۔ شراب کی وجہ سے بیماریوں پر چار سو کروڑ سالانہ ڈالر۔ فساد و جرائم کی وجہ سے پچھتر کروڑ ڈالر۔

3۔ قیدخانے کے انتظام کے لئے چار سو کروڑ۔ میزان 19 ارب بیس کروڑ ڈالر۔ (225)

ڈاکٹر احمد بک حسین نے فتح ام الخبائث میں ص 75 تا آخر یورپ کے مختلف ممالک کے حوالجات سے ثابت کیا ہے کہ بیمہ انشورنس کمپنیاں بہت ملکوں میں شراب نوشوں کو بیمہ نہیں کراتی۔ کیونکہ شراب نوشی سے جلد اور اچانک موت واقع ہوتی ہے اور بعض ملکوں میں بیمہ کرائی جاتی ہیں لیکن شرابی اور غیر شرابیوں کے رجسٹر اور شرحیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ تاکہ کمپنیوں کو نقصان نہ ہو۔ (226)

پاکستانی رقبہ میں انگریزی دور سے بتدریج شراب کا زیادہ استعمال ہونے لگا اور جنگ 1965ء کی نسبت میں جنگ دسمبر 1971ء میں فوج میں شراب نوشی زیادہ ہوئی، جو شکست کا سبب بنی۔ گذشتہ جنگ میں جنرل ڈیگال نے صاف اعلان کیا تھا کہ ہماری فوج تعداد میں جرمن فوج سے زیادہ تھی لیکن ہم کو جرمن فوج نے نہیں بلکہ شراب نوشی نے شکست دی۔ پھر پاکستان جیسا غریب ملک جس میں عوام بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں، زرمبادلہ اور دولت کو شراب اور سگریٹ جیسی مضر صحت چیزوں میں صرف کرنا ملک کو تباہی کی طرف لے جانا ہے جبکہ چین اور بھارت جیسے لامذہب ملکوں میں شراب بند ہے۔ ویٹ کانگ میں امریکی فوج کی ناکامیابی باوجود ان کے پاس بے پناہ سامان جنگ کے اور ویٹ کانگ والوں کی بے سروسامانی کے صرف امریکی فوج کی عیاشی اور شراب نوشی کا نتیجہ ہے جس کی پاکستان جیسی مفلس اور غریب قوم نقل اتار رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو بدل دیں تاکہ اللہ راضی اور ملک مستحکم ومضبوط ہو۔ پاکستان میں ترقی شراب ملاحظہ ہو۔

قیام پاکستان کے بعد اس رقبہ میں انگریزی دور سے شراب نوشی میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1947ء

میں پاکستان میں ایک لاکھ 24 ہزار 600 گیلن بیئر شراب استعمال کی جاتی تھی لیکن 1960ء میں تین لاکھ 45 ہزار 394 گیلن تک پہنچی۔ پہلے دوسری شراب پاکستان میں کشید نہیں ہوتی تھی مگراب ایک لاکھ 17 ہزار 705 گیلن کشیدہ وہ بھی کشید کی جاتی ہے۔

درآمد شراب بیرونی ممالک سے بذریعہ زرمبادلہ: 1947ء میں پاکستانی رقبہ میں شراب کی کل درآمد 2 ہزار 6 سو ساٹھ گیلن تھی۔ مگراب 92 ہزار ایک سو دس گیلن ہے۔ جو درآمد کی جاتی ہے۔ ناجائز طریقوں سے درآمد کردہ شراب اس کے علاوہ ہے۔ (227)

سگریٹ کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ صرف ملتان شہر میں یومیہ چھ لاکھ سگریٹ استعمال ہوتے ہیں جس کی قیمت یومیہ تیس ہزار روپے ہے۔ یعنی ماہوار تقریباً تین لاکھ روپے اور سالانہ دو لاکھ روپے صرف ایک شہر ملتان کا خرچ سگریٹ ہے۔ پورے پاکستان میں غیر ملکی کمپنیاں پورا سال پونے دو کروڑ روپے رائلٹی وصول کرتی ہیں۔ (228)

اعترافات

اگر چہ گذشتہ فصل کی روشنی میں مستشرقین کا انتہائی بے باکانہ، گستاخانہ اور معاندانہ رویہ بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے تاہم یہ اُن کے مطالعۂ سیرت کا صرف ایک رخ ہے، جو اول تا آخر کذب و افترا سے عبارت ہے۔ ایک دوسرا رخ وہ ہے جس میں مستشرقین کے بعض سرکردہ افراد اپنے تعصب و تظلم کا برملا اعتراف کرتے ہیں، اور جب ذرا انصاف و اعتدال سے کام لیتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ ذات رسالت مآب ﷺ ہر عیب سے منزہ ہر الزام سے مبرا، خَلق و خُلق کی تمام خوبیوں سے مرصّع دنیائے انسانیت کا حاصل تھی اور اُن کی کامیابیوں، کامرانیوں اور کارناموں کی بنا پر اُن کا کوئی مثیل نہیں ہے، اس موضوع پر اگر چہ دفتر کے دفتر نقل کئے جا سکتے ہیں، لیکن ہم یہاں صرف چند نمونوں پر اکتفا کر رہے ہیں۔

1۔ اثر انگیز شخصیت:

جسٹینین کی وفات کے چار سال بعد 569ء میں مکہ میں وہ آدمی پیدا ہوا، جس نے انسانیت پر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ (229)

2۔ ناقابل فراموش:

اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج ان تین باتوں کو انسانی تعقل و تفکر کا معیار بلند مانا جائے، تو کون ہے، جو تاریخ کی کسی قدیم یا جدید شخصیت کو محمد (ﷺ) کو مقابل لانے کی ہمت کر سکے، لوگوں کی شہرت ہوئی کہ انہوں نے فوجیں بنا ڈالیں، قوانین وضع کر دکھائے اور سلطنتیں قائم کر ڈالیں، لیکن غور طلب یہ ہے کہ انہوں نے حاصل کیا کیا؟ صرف مادی قوتوں کی جمع پونجی؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی، بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے جس نے یہی نہیں کہ فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کئے اور مملکتیں، سلطنتیں قائم کیں بلکہ اس کی نظیر کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دیئے جو اس وقت کی معلوم دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے قربان گاہوں کو، خداؤں کو، دین و مذہب کے پیروکاروں کو، خیالات و افکار کو، عقائد و نظریات کو، بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا۔ پھر صرف ایک کتاب کی بنیاد پر، جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا، ایک ایسی روحانی امت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا، وہ ہمارے سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابل فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے خدا سے محبت اور ہر معبود باطل سے نفرت۔ (230)

3۔ جامعیت کبریٰ:

عالم الٰہیات، فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار، رسول (بانی مذہب) آئین و قانون ساز (شارع)، سپہ سالار، فاتح اصول و نظریات، معقول عقائد کو جلا بخشنے والے، بلاتصویر مذہب کے مبلغ، بیسیوں علاقائی سلطنتوں کے معمار، دینی و روحانی حکومت کے مؤسس، یہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ (جن کے سامنے پوری انسانیت کی عظمتیں ہیچ ہیں) اور انسانی عظمت کے ہر پیمانے کو سامنے رکھ کر ہم پوچھ سکتے ہیں، ہے کوئی جو اُن سے زیادہ بڑا، اُن سے بڑھ کر عظیم ہو؟ (231)

4۔ بے مثال کارنامہ:

کسی انسان نے اتنے قلیل ترین وسائل کے ساتھ، اتنا جلیل ترین کارنامہ انجام نہیں دیا، جو انسانی ہمت و طاقت سے اس قدر ماوراء تھا۔ محمد (ﷺ) اپنی فکر کے ہر دائرے اور اپنے عمل کے ہر نقشہ میں، جس بڑے منصوبہ کو روبعمل لائے، اُس کی صورت گری بجز ان کے، کسی کی مرہون منت نہ تھی، اور مٹھی بھر صحرائیوں کے سوا اُن کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا، اور آخر کار ایک اتنے بڑے مگر دیرپا انقلاب کو برپا کر دیا جو اس دنیا میں کسی انسان سے ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ اپنے ظہور سے لے کر اگلی دو صدیوں سے بھی کم عرصہ میں اسلام، فکر و عقیدہ اور طاقت

واسطہ دونوں اعتبار سے سارے عرب پر، اور پھر ایک اللہ کا پرچم بلند کرتے ہوئے، فارس، خراسان، ماوراء النہر، مغربی ہند، شام، مصر، حبشہ، شمالی افریقہ کے تمام معلوم علاقوں پر، بحر متوسط کے جزیروں پر اور اندلس کے ایک حصہ پر بھی چھا گیا۔ (232)

5۔ تاریخ کی پوری روشنی میں:

یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیاتِ مسیح ؑ کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں، لیکن اُن تیس برسوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو انہوں نے (نبوت سے پہلے) گزارے۔ تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے، کتنی قریب ہے کتنی دور! کتنی ممکن ہے اور کتنی ناممکن! ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ ہم اُن کی ماں کے بارے میں، اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان کے ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے میں اور اس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسند نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پاکر یکدم، خدائی مشن کے حامل بن گئے؟ بہر حال کتنے ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں سے اکثر کے ذہنوں سے ٹکراتے ہیں، مگر وہ بس سوالات ہیں، جواب کے بغیر! البتہ محمد (ﷺ) کے معاملہ میں صورت یکسر مختلف ہے۔ یہاں ہمارے پاس اندھیروں کے بجائے تاریخ کی روشنی ہے۔ ہم محمد (ﷺ) کے بارے میں جانتے ہیں جتنا کہ لوتھر اور ملٹن کے بارے میں، یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس، تخمین وظن، ماورائے فطرت روایات اور فسانہ وافسوں سے آلودہ ہونے کے بجائے، حقائق سے آراستہ ہے، اور ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل وفریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو، یہاں ہر چیز دن کی روشنی میں جگمگا رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ اُن کی شخصیت کے بہت سے پرت ہیں اور اُن میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے، تاہم محمد (ﷺ) کی زندگی کے متعلق ہم ہر چیز جانتے ہیں، اُن کی جوانی، اُن کی اٹھان، اُن کے تعلقات، ان کی عادتیں، ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحہ بہ لمحہ سفر اور ارتقاء وغیرہ، نیز ان کی داخلی اور باطنی زندگی کے متعلق بھی، اور یہ کہ جب اعلان نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں، جو اپنی ابتدائی، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز ومنفرد ہے، اور اب تک ایسی کوئی معقول ومستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے۔ (233)

6۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب:

بہر حال مختصراً عرب کے یہ معاشرتی اور مذہبی حالات تھے جن میں اگر ہمیں والٹیر کی زبان کے استعمال کی اجازت دی جائے، عرب کا رخ بدل گیا، انقلاب آ گیا، انقلاب بھی کیسا؟ ایسا انقلاب کہ آج تک سرزمین پر نہیں آیا، مکمل ترین، اچانک ترین اور سرتا سر غیر معمولی انقلاب! (234)

7۔ منفرد مقام:

تاریخ مذہب وادیان میں محمد (ﷺ) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ نہ ولی تھے نہ فرشتہ۔ اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کر دکھایا، اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی، اور اُن کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو عام حالات میں ان کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز وممیز کر سکے۔ (235)

8۔ سب سے بڑا انسان:

دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت، ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی، لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود اُمی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر! اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی

پورا کر دیا۔ اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے۔(236)

9۔ عظیم و مخلص:

عظیم۔محض اس لئے نہیں کہ وہ ایک روحانی پیشوا تھے، انہوں نے ایک عظیم ملت کو جنم دیا، اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی۔ بلکہ ان سب سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا۔ مزید برآں اس لئے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص و وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص تھے، اور اپنے اللہ سے بھی مخلص و وفادار تھے، ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک کامل، سچا مذہب ہے، جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔(237)

10۔ مقام و مرتبہ:

محمد (ﷺ) ایک رسول تھے نہ کہ صوفی، یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ کوئی کہہ کر بھی شرمندہ ہو جائے۔ وہ لوگ جو ان کے گرد جمع ہوئے اور جو ملت اسلامیہ کے اولین ارکان تھے۔ وہ قانون کی اطاعت پر، توحید الٰہی پر راضی تھے، اور محمد (ﷺ) کی تعلیمات اور ان کے اسوہ کی پیروی پر اکتفا کرنے والے تھے۔ وہ مطمئن تھے کہ وہ ایک سیدھے سادے اور مضبوط دین کے پیرو ہیں، جو مختصر عبادات اور چند مراسم پر مشتمل تھا۔(238)

☆ محمد (ﷺ) نے از خود کبھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ ایک موقع پر تو ایسی وحی نازل ہوئی جس میں انہیں تنبیہ کی گئی کہ انہوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے میں ایک فقیر سے منہ کیوں موڑا؟ پھر انہوں نے اُس وحی کو شائع بھی کیا، یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک مدعی کاذب تھے جیسا کہ معصوم مسیحی اُس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔(239)

☆ محمد (ﷺ) نے اپنا جو مذہبی نظام قائم فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے ہم شہریوں کے فہم و ادراک کے مطابق تھا، اور اس ملک میں پائے جانے والے رسوم و رواج اور ان کے ساتھیوں کے جذبات سے ہم آہنگ تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ عام انسانی حالات و نظریات سے بھی ایسی مناسبت و ہم آہنگی رکھتا تھا کہ جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی نے اسے قبول کیا اور یہ سب کچھ چالیس سال سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا۔(240)

11۔ روشنی:

پس وہ روشنی آ گئی، عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لئے، ایک ایسی تاریکی میں جو موت کی نقیب تھی، چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی زندگی اور آسمانوں کا جاہ و جلال لئے ہوئے، اُس نے اُسے ''وحی'' کہا، اور لانے والا فرشتہ کو جبرئیل۔ اور ہم ابھی تک سوچ رہے ہیں کہ اسے کیا نام دیں؟ یہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے اشارہ ہے، ہمارے سمجھنے کے لئے، کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی کوشش، دراصل ایک روحانی عمل ہے جس کے بارے میں ہر منطق اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے بقول نوالی، ایک خدا پر اعتقاد کا اعلان، کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد (ﷺ) کا وجود کامل، جسم و روح، اسی حقیقت اور سچائی کے نور سے مستنیر تھا۔(241)

12۔ نور ہی نور:

عرب قوم کو یہی نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا، عرب کو اسی کے ذریعہ پہلے پہل زندگی ملی، بھیڑوں بکریوں کے چرانے والے لوگ، جو ازل سے، صحراؤں میں بے کھٹکے، بے روک ٹوک گھومتے پھرتے تھے کہ ایک ''ہیرو پیغمبر'' ان کی طرف بھیجا گیا، ایک پیغام کے ساتھ جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے، اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابل اعتنا نہ تھے، دنیا بھر کے لئے قابل ذکر بن گئے۔(242)

13۔ عظیم فاتح:

فتح مکہ کے اس موقع پر یہ بات ان کے حق میں جائے گی اور وہ قابل تعریف ٹھہریں گے، کہ اس وقت جب کہ اہل مکہ کے ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انہیں جتنا بھی طیش آتا کم تھا، اور ان کے آتش انتقام کو بھڑکانے کے لئے کافی تھا، مگر انہوں نے اپنے لشکر وسپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے سے روکا، اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی وعبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکرانہ بجالائے، صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے جنہیں پہلے سے ہی ان کے وحشیانہ رویہ کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا، اور ان میں سے بھی صرف چار کو قتل کیا گیا، لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال وحرکات کے مقابلہ میں، اسے بہر حال انتہا درجہ کی شرافت وانسانیت سے تعبیر کیا جائے گا (مثال کے طور پر صلیبیوں کے مظالم، کہ 1099ء میں فتح یروشلم کے موقع پر انہوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا، یا وہ انگریز فوج جس نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے 1874ء میں افریقہ کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذر آتش کر ڈالا) محمد (ﷺ) کی فتح درحقیقت دین کی فتح تھی، سیاست کی فتح تھی، انہوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پس پشت ڈالا اور کروفر شاہی کے ہر نشان کو مسترد کر دیا، اور جب قریش کے مغرور ومتکبر سرداران کے سامنے سرنگوں ہو کر آئے تو محمد (ﷺ) نے ان سے پوچھا کہ ''تمہیں مجھ سے کیا توقع ہے''؟ رحم! اے سخی وفیاض برادر، رحم! وہ بولے۔ ''جاؤ تم سب آزاد ہو'' انہوں نے فرمایا''۔ (243)

14۔ صاحب خلق عظیم:

اخلاق وعادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے، البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت محتاط تھے، ان کا کھانا پینا، ان کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولی درجہ کا تھا اور ہمیشہ وہی رہا جبکہ وہ اپنی طاقت وحکومت کی معراج تک پہنچے، انہیں تخیل وتصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں، ان کا ذہن رسا تھا اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیا، عفت مآب اور شرمیلے تھے، اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اڑایا جائے، ان کے خادم انسؓ کہتے ہیں کہ میں دس سال تک ان کی خدمت میں رہا لیکن انہوں نے کبھی اف تک نہ کہا، انہیں بچوں سے بہت محبت تھی، وہ انہیں راستے میں روک لیتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، انہوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا، اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلودہ ہو، جب ان سے کسی کے بارے میں بد دعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے میں بد دعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو انسانیت کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ وہ بیماروں کی عیادت کرتے، کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے، غلام کی دعوت کو بھی قبول کر لیتے، اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے اور دوسروں کا ہمہ تن انتظار کر لیتے، وہ اپنی ازواج کے ساتھ ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے تھے، وہ آگ خود جلا لیتے، فرش کی جھاڑو دے لیتے، تھوڑا بہت کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا، اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے، ان کے گھر کے باہر ایک چھپر (صفہ) تھا، جہاں ایسے متعدد غریب افراد موجود رہتے، جن کی زندگی بسر کا تمام تر انحصار انہی کی فیاضی پر منحصر تھا۔ (244)

15۔ سنجیدگی، اخلاص، وفاداری:

محمد ﷺ پر کارلائل کے خطبات کے بعد سے مغرب کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ محمد ﷺ کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں، اپنے ایمان وعقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا، ان پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق وکردار، اور ان کی طرف امام وپیشوا کی حیثیت سے دیکھنا، پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں یہ سب دلیل ہیں، ان کے اخلاص کامل کی، اس لئے محمد ﷺ کو

ایک مدعی کاذب (Imposter) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے، بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں، مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر رگم سرا ہا گیا ہو جتنا کہ محمد ﷺ کو اس لئے اگر ہم محمد ﷺ کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم محمد ﷺ کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں اور مقصد سے ان کے خلوص اور وابستگی کے قائل ہو جائیں، اگر ہم اُن غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ میں اُن کے خلوص اور دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا جب تک کہ کوئی الزام اُن کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہو جائے۔(245)

یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض ومفاد پرستی سے کلیۃً خالی تھی، مزید یہ کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اپنی نگاہوں کے سامنے دین کے مکمل قیام واستحکام اور لامحدود اختیارات حاصل ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ذات اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا، بلکہ آخر وقت تک اُس سادہ طرز وانداز کو برقرار رکھا جو اول دن سے اُن کی بود وباش سے نمایاں تھا۔(246)

16۔ مشن کی سچائی:

محمد ﷺ کو بلا شک وشبہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا، وہ اس پر مطمئن تھے کہ اللہ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملک کی تعمیر واصلاح کی ہے، ان کا اپنا مشن نہ تو نیا تھا، اور نہ فریب دہی، جھوٹ وافترا پر مبنی تھا، بلکہ اپنے مشن کی تعلیم وتبلیغ کرنے میں نہ کسی لالچ یا دھمکی کا اثر قبول کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کے راہ کی رکاوٹیں بن سکیں، وہ سچائی کی تبلیغ مسلسل کرتے رہے۔(247)

17۔ سچے رسول:

جہالت! جس کا مظاہرہ اکثر وبیشتر مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، افسوسناک امر ہے محمد (ﷺ) اُس وقت کے اقوام میں، ایک خدا پر یقین رکھتے تھے، اور دوسرے خداؤں کی نفی کرتے تھے، انہوں نے بتا کید راست بازی اور دینداری کو کردار کا سرچشمہ قرار دیا، اور بدرجۂ فرض متعدد نمازوں کی، جی وقیوم خدا کے لئے ادائیگی، تمام انسانوں کی عزت واحترام، اور سب کے ساتھ رحم وشفقت برتنے پر زور دیا، ہر قسم کی نشہ آور چیزوں سے پرہیز، ہر معاملہ میں عدل وتوازن، اور ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین، اُن کے دین ومذہب کا حصہ تھی، لہٰذا محمد (ﷺ) ایک نفس روحانی کے مالک اور ایک سچے رسول تھے، مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ خدا سے ہمکلام ہوتے تھے اور سرچشمۂ روحانی سے ان پر وحی اترتی تھی۔(248)

18۔ امتحانِ سخت سے گزرے:

ان سے پہلے کوئی پیغمبر اتنے سخت امتحان سے نہ گزرا تھا جیسا کہ محمد ﷺ کیونکہ منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا جو انہیں سب سے زیادہ جانتے تھے اور جو ان کی بشری کمزوریوں سے بھی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے تھے، لیکن دوسرے پیغمبروں کا معاملہ برعکس رہا کہ وہ سب جگہ، سب کے نزدیک معزز ومحترم ٹھہرے لا یہ کہ جو انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔(249)

19۔ آسمانوں کی بادشاہت زمین پر:

اسلام کے ذریعہ محمد ﷺ نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، مزاج وانتشار کو، رقابت وعداوت کو نکال پھینکا، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سود خواری، شراب خوری، قتل وغارت گری، دختر کشی کی رسومات قبیحہ کا استیصال کیا، اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات وتوہمات اور مادیت واشیا پرستی سے نجات دلائی، پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اُس بادشاہت کو انہوں نے عملاً اس زمین پر قائم کردیا، جس کی بشارت بڑے ذوق وشوق سے جناب مسیحؑ نے دی تھی۔(250)

20۔ ہمہ گیر اصلاح:

ممکن ہے یہ سوچا جائے کہ وہ آدمی، جس نے اتنی بہت سی اور تا دیر قائم رہنے والی اصلاحات کیں، انواع واقسام کی بت پرستی کے بدلے، جس میں لوگ مدتوں سے مبتلا تھے، ایک خدا کی عبادت کا داعی بنا، جس نے دختر کشی کی رسم قبیح کو مٹایا، شراب اور دوسری نشہ آور اشیا کو حرام ٹھہرایا، جوئے کی ممانعت کی، نسبتاً ایک دائرہ میں رہتے ہوئے تعدد ازواج کو محدود کیا، وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اُس کا خدائی مشن اس کے ذہن کی محض اختراع تھی؟ اور کیا وہ جھوٹ کو جانتے بوجھتے نبھاتا رہا؟ نہیں، ہرگز نہیں! محمد ﷺ کو درحقیقت سچے مذہبی ادراکات اور روحانی احساسات حاصل تھے، جن کے سبب انہوں نے اپنے مشن کو انتہائی مستقل مزاجی، پامردی واستقلال سے آگے بڑھایا اور نہ اُس کے جھٹلائے جانے کی پرواہ کی، نہ اس کی راہ میں مصائب ومشکلات کی۔ یہ سچائی، یہ حق کی معرفت انہیں ابتدا سے انتہا تک حاصل رہی یعنی حضرت خدیجہؓ کے سامنے پہلی وحی کے نزول سے لے کر حضرت عائشہؓ کی باہوں میں آخری سانس لینے تک۔ (251)

21۔ عظمتوں کے نشان:

حالات، مواقع اور وقت سب نے محمد ﷺ کا ساتھ دیا، اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی زندگی میں کامیابیوں کی اور ان کے بعد اسلام کی توسیع وترقی کی راہ ہموار کی۔ محمد ﷺ کی ذات میں صفات وکمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا، اُس کی تین جہتیں تھیں۔ ایک نبوت کا فیضان، دوسرے سیاست وحکمرانی میں اُن کی بصیرت، اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مہارت وحذاقت اور تمام مناصب پر اہل ترین افراد کا انتخاب۔ جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمد ﷺ پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے وہ اُسی حد تک ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر حیران وششدر رہ جاتا ہے، حالات نے انہیں کس درجہ سازگاری عطا کی، اس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذونادر حاصل ہوتے ہیں، بالکل وقت کی آواز بن کر، ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انہیں اگر حاصل نہ ہوتیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انہیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا اور اگر وہ اس یقین محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ انسانیت کا ایک اہم اور قابل ذکر باب رقم ہونے سے رہ جاتا۔ (252)

22۔ صدق وصفا:

یہ محمد ﷺ کے صدق کی دلیل قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ، اُن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ اُن کے اسرار ورموز سے پوری طرح واقف تھے، اور اگر انہیں اُن کی صداقت میں ذرہ برابر بھی شبہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔ (253)

23۔ اتمام واکمال:

محمد ﷺ کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ﷺ ایک سلطنت کی، جس کا ایک سیاسی ومذہبی دارالسلطنت مقرر تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ ﷺ نے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔ (254)

خلاصہ:

عیسائی مشنریاں کھل کر مسلمانوں پر اثر انداز ہونے کے درپے ہیں۔ اسی لئے وہ کانفرنس اور اجتماعی ادبی اور اجلاس کرتے ہیں۔ لیکن مستشرقین کے اغراض ومقاصد علم ومعرفت کے غلاف میں لپٹے ہوتے ہیں۔ ان کا نشانہ اسلام اور اسلامی تعلیمات اور احکام ومسائل ہوتے ہیں۔ مستشرقین نے ہر اس چیز کے خلاف اپنی فکری اور عملی، قولی اور فعلی، ذہنی اور قلبی صلاحیتیں صرف کی ہیں جس کا تعلق اسلام سے تھا۔ جو چیز جتنی اسلام کے لئے جتنی زیادہ ناگزیر تھی، وہ اسی شدت کے ساتھ مستشرقین کی فتنہ انگیزیوں کا نشانہ بنی۔ انہوں نے قرآن حکیم کے خلاف

دل کھول کر اپنا زور قلم استعمال کیا، احادیث طیبہ سے ملت کے اعتماد کو متزلزل کرنے کے لئے اپنے ترکش تزویر کا ہر تیر آزمایا، تاریخ اسلام کی تابنا کیوں کو شکوک وشبہات کے غبار سے آلودہ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی اور تعلیمات اسلام کو، جنہوں نے دنیا کی اجڑ ترین قوم کو تہذیب و ثقافت کا امام بنا دیا تھا، اس انداز میں پیش کیا کہ جو بھی انہیں دیکھے کراہت محسوس کرے۔

حوالہ جات

1۔ شاہ معین الدین، ندوی، مولانا، ''مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائے''، مقالات، ج136، اکتوبر 1985ء، عدد 4، ص245

2۔ ایضاً، ص247

3۔ قاسم محمود سید، ''انسائیکلو پیڈیا آف اسلام''، ص1348

4۔ شمس الحق، مولوی، علامہ، ''سیرت النبوی اور مستشرقین''، ماہنامہ الحق، شمارہ 9، ص 30,31

5۔ شاہ معین الدین، مولانا، ''مستشرقین کے متعلق دو متضاد آراء''، بحوالہ، اسلام اور مستشرقین، ص172,173

6۔ نثار احمد، ڈاکٹر، ''مطالعہ سیرت اور مستشرقین''، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ہند، ج3، ص66

7۔ ایضاً، ص62

8۔ نثار احمد، ڈاکٹر، ''مطالعہ سیرت اور مستشرقین''، ج3، ص62

9۔ ولیم میور، سر، ''دی لائف آف محمدؐ''، لندن 1877ء

10۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، ''حیات جاوید''، لاہور آرٹ پریس، 1971ء، ج2، ص120

11۔ ایضاً، ص120

12۔ ایضاً، ص121

13۔ ایضاً، ص121

14۔ ایضاً، ص122

15۔ ایضاً، ص123

16۔ ایضاً، ص124

17۔ ایضاً، ص126

18۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص292

19۔ ایضاً، ص20

20۔ صفی الرحمٰن، مبارک پوری، ''الرحیق المختوم''، ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور، 1986ء، ص34

21۔ ''محمد ایٹ مدینہ''، منٹگمری واٹ، ص204,205

22۔ ''انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس''، ج8، ص872

23۔ باب فضائل نبی، ج3

24۔ بحوالہ، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، لاہور، 158

25۔ سید احمد، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص112

26۔ ایضاً، ص112

27۔ گنتی باب 10 درس 12

28۔ پیدائش باب 14، درس 5 تا 7

29۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص115

30۔ گنتی باب 13 درس 1 تا 3

31۔ گنتی باب 13 درس 26

32۔ استثنا باب 33 درس 2

33۔ حبقوق باب 3 درس 2

34۔ سلاطین اول باب 11 درس 18

35۔ گنتی باب 13 درس 26

36۔ پیدائش باب 14 درس 7,8

37۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص116

38۔ ایضاً، ص119

39۔ گنتی باب 11 درس 34,35

40۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص125

41۔ پیدائش باب 26 درس 18 تا 22

42۔ پیدائش باب 21 درس 19

43۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص129

44۔ ایضاً، ص141

45۔ پیدائش باب 13 درس 1-6

46۔ دو بی شلو و اسحاق کتاب پیدائش باب 16 آیت

47۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''175-163

48۔ ایضاً، ص167

49۔ ایضاً، ص38

50۔ ایضاً، ص36

51۔ ایضاً، ص137

52۔ ظل قدر، بہادر جنگ، ''جغرافیائی تاریخ''، مقبول اکیڈمی لاہور، 1992ء، ج1، ص248

53۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص223

54۔ ایضاً، ص226

55۔ ایضاً، ص229

56۔ منٹگمری واٹ، ''محمد پرافٹ آف سٹیٹسمین''، آکسفورڈ یونیورسٹی، پریس لندن 1961ء، ص8

57۔ ایضاً، ص1,2

58۔ ایضاً، ص38

59۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مکہ''، ص32

60۔ ایضاً، ص33

61۔ ایضاً، ص33

62۔ سنن ترمذی، کتاب المناقب، ج5، ص540

63۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مکہ''، ص47

64۔ ایضاً، ص50,51

65۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص237

66۔ ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ، ''محمد اینڈ دی لائز آف اسلام''، لندن، ص47

67۔ میور ولیم، سر، ''دی لائف آف محمد''، لندن 1877ء، ص CXV،

68۔ ایضاً، ص Cxiv

69۔ Margoliouth D-S, "History of the World", New York 1905

70۔ لامانس، پے ایچ، ''اخلاص محمد''، روم، 1911ء

71۔ ضیاء الدین، اصلاحی، مولانا، ''مستشرقین کے اعتراضات کی نشر و اشاعت کس طرح ہوتی ہے''، ''اسلام اور مستشرقین''، ج7، ص212,213

72۔ ولیم میور، سر، ''دی لائف آف محمد''، لندن، 1877ء

73۔ ادارہ دعوت القرقان، لاہور، 1877ء، ص399

74۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص400

75۔ ایضاً، ص401

76۔ ایضاً، ص402

77۔ ایضاً، ص403

78۔ اندور کے عبدالحمید صاحب کا مقالہ، از سیمینار دارالعلوم ندوۃ، ج128 صفر 1402، بمطابق دسمبر 1981ء، عدد6

79. Watt, W, Muntgoumry,"Muhammad Prophet and Status Man", London 1961, p.100,158,156,164,165

80۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص395-96

81۔ ایضاً، ص395

82۔ ایضاً، ص396-98

83۔ شمس الحق، افغانی، علامہ، ''سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین''، الحق ماہنامہ، شمارہ8، اکوڑہ خٹک، مئی 1972ء، ج7، ص25

84۔ سید احمد خان، سر، ''سیرت محمدی''، مقدمہ، 1997ء، ص24,25

85۔ ایضاً، ص26

86۔ ایضاً، ص27

87. Davenport, John, "Apology for Muhammad and Quran", p.240

88. HigginsGodfray, "An Apology for the Life and character of thecelebrated of Arabia", called Muhammad or the Illustrious,London, 1829, p.187

89۔ سید احمد خان، سر، ''سیرت محمدی ﷺ''، ص28

90۔ ایضاً، ص29

91۔ Higgins Godfray, "An Apology for the Life and character of the celebrated of Arabia", called Muhammad or the Illustrious, London 1829,p.189

92۔ سید احمد خان، سر، ''سیرت محمدی ﷺ''، ص 31

93۔ القرآن، النساء: 3

94۔ القرآن، النساء: 129

95۔ سید احمد خان، سر، ''سیرت محمدی ﷺ''، ص 31

96۔ ایضاً، ص 32

97۔ ایضاً، ص 33

98۔ ایضاً، ص 34

99۔ السنن الترمذی، ''کتاب الطلاق''، ج 2

100۔ سید احمد خان، سر، ''سیرت محمدی ﷺ''، ص 34

101۔ ایضاً، ص 35,36

102۔ شمس الحق، افغانی، علامہ، ''سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین''، الحق ماہنامہ، شمارہ 8، اکوڑہ خٹک، مئی 1972ء، ج 7، ص 25، قانون تعدد نکاح پر اعتراض

103۔ بائبل، پیدائش، باب 4، آیت 16

104۔ بائبل، پیدائش، باب 24، آیت 29

105۔ استثنا نمبر 15، باب 10، آیت 21

106۔ شموئیل، باب 23، آیت 16

107۔ سلاطین باب 3، آیت 11

108۔ شمس الحق، مولانا، علامہ، ''سیرت نبوی ﷺ اور مستشرقین''، ماہنامہ، الحق، شمارہ 9، اکوڑہ خٹک، جون 1972ء، ص 27-25

109۔ ایضاً، ص 27

110. Margoliouth D.S, "Mohammad and the Rise of Islam", New York 1905

111. Smith, Bosworth, "Muhammad and Mohammadism", London, 1874

112. Carlyle Thomas, "The Hero as Prophet Mahomet", New York 1902

113. Lane-Pool Stainley, "The Speeches and Table talk of the Prophet Mohammad", London, 1882

114۔ شمس الحق، مولانا، علامہ، ''سیرت النبوی ﷺ اور مستشرقین''، ماہنامہ، الحق، شمارہ 9، ص 30

115۔ القرآن، الاحزاب: 22

116۔ عیون لاثر سعد، ج 2، ص 300، زرقانی، ج 3، ص 219

117۔ شمس الحق مولانا، علامہ، ''سیرت النبوی ﷺ اور مستشرقین'' ماہنامہ الحق، شمارہ 9، ص 33

118۔ ایضاً، ص 33

119۔ ابن المنذر، مسند صحیح، ج 4، ص 365

120۔ شمس الحق، افغانی، مولانا، علامہ، ''سیرت نبوی ﷺ اور مستشرقین''، ماہنامہ الحق، مئی 1972، ج 7، شمارہ 8، ص 34

121۔ ایضاً، ص 35

122۔ القرآن، الاحزاب: 36
123۔ شمس الحق مولانا، علامہ، ''سیرت النبوی ﷺ اور مستشرقین'' ماہنامہ الحق، شمارہ 9، ص، 35,36
124۔ کتاب استثناء، باب 21
125۔ شمس الحق مولانا، علامہ، ''سیرت النبوی ﷺ اور مستشرقین'' ماہنامہ الحق، شمارہ 9، ص، 37
126۔ ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، ص 14
127۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، ص 310
128۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مکہ''، ص 51
129۔ ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، ص 13
130۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص 379
131۔ ایضاً، ص 381
132۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، ص 228
133۔ ایضاً، ص 229
134۔ ایضاً
135۔ واٹ، ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، ص 33
136۔ واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، ص 229
137۔ القرآن، الانشراح: 4
138۔ القرآن، الضحیٰ: 4
139۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، ص 231
140۔ منٹگمری واٹ، ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، ص 105
140۔ ایضاً، ص 108
141۔ ایضاً، ص 108
142۔ منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، ص 45
143۔ القرآن، البقرۃ: 190
144۔ القرآن، البقرۃ: 193
145۔ القرآن، البقرۃ: 194
146۔ القرآن، الانفال: 61
147۔ جامع ترمذی، کتاب المغازی
148۔ القرآن، البقرۃ: 7
149۔ رابرٹ لاس، سیلنر، ڈاکٹر، ''دی سٹڈی آف ریلجن''، ہاورڈ یونیورسٹی، ج 2، ص 214
150۔ ریوبن لیوی، ''دی سوشل سٹرکچر آف اسلام''، کیمبرج یونیورسٹی، ص 155
151۔ شاہ معین الدین، مولانا، ''مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائے''، تلخیص وتبصرہ، بحوالہ ''اسلام اور مستشرقین''، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ج 7، ص 171

152۔ شبلی نعمانی: ''سیرت النبی ﷺ''، ج 1، ص 114

153۔ ایضاً، ص 326-328

154۔ ایضاً، ص 328,329

155۔ القرآن، البقرۃ: 256

156۔ القرآن، سورۃ الملک: 2

157۔ القرآن، سورۃ توبہ: 29

158. القرآن، سورۃ انفال: 73

159۔ القرآن، الکہف: 29

160۔ القرآن، یونس: 99

161۔ القرآن، التوبہ: 6

162۔ شمس الحق، مولانا، علامہ: ''سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین''، ماہنامہ الحق، شمارہ 10، ص 42

162۔ ایضاً، ص 43

163۔ بخاری کتاب الایمان

164۔ ایضاً، شمارہ 11,12، اگست، ستمبر، 1972ء، ص 38

165۔ القرآن، الیوسف: 92

166۔ القرآن، انفال: 60

167۔ القرآن، الممتحنہ: 28

168۔ القرآن، النساء: 90

169۔ القرآن، الانبیاء: 107

170۔ سنن ابی داؤد: ''کتاب الجہاد''

171۔ شمس الحق مولانا، علامہ: ''سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین''، ماہنامہ الحق، شمارہ 11,12، ص 39

172۔ القرآن، سورۃ انبیاء: 107

173۔ القرآن، الفرقان: 1

174۔ القرآن، سورۃ توبہ: 40

175۔ القرآن، الانفال: 73

176۔ شمس الحق مولانا، علامہ: ''سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین''، ماہنامہ الحق، شمارہ 110، ص 41

177۔ تورات کتاب استثناء باب 20

178۔ تورات کتاب عدد باب 33

179۔ تورات کتاب استثناء باب 7

180۔ منٹگمری واٹ: ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، ص 191

181۔ ایضاً، ص 21

182۔ ایضاً

183۔ ایضاً،ص17

184۔ القرآن،البقرۃ:285

185۔ منٹگمری واٹ،''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''،ص 19

186۔ میور،''لائف آف محمدؐ''،1923ء،ص46,47

187۔ مظہر الدین صدیقی کا مضمون:''اسلامک اسٹڈیز''،اسلام آباد،ج9،نمبر3

188۔ ولیم میور،''لائف آف محمدؐ''،ص135

189۔ واٹ منٹگمری،''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''،ص 20

190۔ مارگولیتھ،ڈی ایس،''محمدؐ اینڈ دی رائز آف اسلام''،ص49

191۔ صدیقی مظہر الدین،ص148 تا 150

192۔ شمس الحق مولانا،علامہ،''سیرت النبوی ﷺ اور مستشرقین''،ماہنامہ الحق،شمارہ10،جولائی،1972ء،ص39

193۔ عبید اللہ،کوثر،ندوی،''سر سید احمد خان اور مستشرقین''،مقالات عدد4،اپریل 1985ء،ج135،ص250

194۔ ایضاً،ص251

195۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص277

196۔ ایضاً،ص279

197۔ ایضاً،ص280

198۔ القرآن،بقرہ:257

199۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص288-90

200۔ ایضاً،ص291

201۔ چیمبرانسائیکلوپیڈیا،''آرٹیکل علم تواریخ''لندن،ص367

202. Higgins, Godfray, "An Apology for the Life and character of the celebrated Prophet Arabia", called Mohammad or the Illustrious, London, 1829

203. Ibid

204۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص294

205. Devon Port, "Apology for the Muhammad and the Quran", London, 1879, reprint Lahore, 1975

206. Gibbous, Edwerd, "Life of Mohamet" New York, 1879

207۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص299,300

208۔ ایضاً،ص301

209۔ سید احمد خان،سر،''خطبات احمدیہ''،ص246

210۔ ایضاً،ص265

211۔ ایضاً ،ص267

212۔ ایضاً،ص269

213۔ بخاری باب قول النبی ﷺ اخوانکم، ص346

214 سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ایضاً، ص269-71

215۔ ایضاً، ص272

216۔ القرآن، محمد:4

217۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''، ص274

218۔ ایضاً، ص273-4

219۔ ایضاً، ص275

220۔ القرآن، المائدہ:12

221۔ احمد بک، ڈاکٹر، ''اعلام الباحث فتح ام الخبائث''، یورپ 1937ء، ص70

222۔ پاسبان 20 اگست 1952ء

223۔ نوائے وقت لاہور، 10 اکتوبر 1952ء

224۔ پاسبان کوئٹہ، 4 مئی 1952ء

225۔ امریکہ رپورٹ مندرجہ پاسبان کوئٹہ، 2 ستمبر 1952ء

226۔ ڈاکٹر احمد بک حسین نے فتح ام الخبائث میں ص75 تا آخر

227۔ ہفت روزہ المنبر، لائل پور، 24 اگست 19

228۔ کوہستان، 17 فروری 1968ء

229. Hower Hut, "The Hundreds A Ranking of the most Heflucut Alpetsons in History", 1978, P.33

230. Larmartine, A.N, "Histoire dela Turqui", Paris, 1854, Vol 2, P.276-277

231۔ Ibid

232۔ Ibid

233۔ باسورتھ اسمتھ، ''محمد اینڈ محمڈنزم''، سندھ ساگر اکادمی لاہور، ص11-12

234۔ ایضاً، ص72

235. Bodley, R.V.C, "The Messenger or The Life of Mohammad", London, 1946, P. 338

236۔ سلیمان ندوی، سید، مولانا، ''سیرۃ النبی''، مطبع معارف، اعظم گڑھ، 1951ء، ج4، ص400

237. Leonard, Arthur G. "Islam her Moral and Spiritual value", London, 1927, P. 20,21

238. Gaudefroy De Monbynes, "Muslim Institution", London, 1950, P.20

239. Leither G.W "Muhammadism", Lahoe, 1889, P.4

240. Caunt D. Boulain Villiess, "Historces Arabs Aved Laviece Mahomet", Amesterdom, 1731, P. 143,144

241. Carlyle Thomes "The Hero as Prophet Mahomet", New York, 1902

242_ Ibid

243. Gilman Arthor "The Saraceus", London, 1887, P. 184,185

244. Lain-Pool Stainley, "The Speeches and the table talk of the Prophet Mohammad", London, 1882, P. 27-29

245. Montgomry Watt, "Muhammad At Mecca", Oxford University, 1953, P.52

246. Davenport John, "Apology for Mohammad and the Quran", London, 1879, P.133,134

247_ Ibid

248_ لنڈ سے مضمون، مطبوعہ ٹوورلڈ، مانچسٹر، 10 اگست 1940ء

249_ گبن، ایڈورڈ، ''زوال سلطنت روما''، نیویارک 1879ء، ص108

250_ گبن، ایضاً، ص69,70

251. Davonport John, "Apology for Mohammad and the Quran", P. 138

252_ منٹگمری، واٹ، ''محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین''، آکسفورڈ پریس، 1961ء، ص236,237

253. Wels Gustav, "Mohammad da Prophet Seinleban and scine Lehre", Stuttgast, 1843, p.270

254. Margoliouth D.S "Mohammad and the Rise of Islam", New York, 1905, P.399

خلاصہ بحث

برصغیر پاک و ہند میں فن سیرت نگاری کے آغاز کے محرکات، خارجی عوامل تھے۔ تاہم اسے عروج ودوام داخلی کوششوں کے نتیجے میں حاصل ہوا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس اور کردار و کارناموں کے خلاف عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کی مذموم سرگرمیوں کو خارجی عوامل ہی کہا جا سکتا ہے جس کے مقابلے میں مسلم علماء و دانشوروں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے خلاف کذب و افترا کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ حضور اکرم ﷺ کی سیرت و کردار کے مختلف پہلوؤں کا اجاگر کیا۔ اس ضمن میں سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء مولوی چراغ علی، سید امیر علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب سیرت نگاری میں مختلف رجحانات کے ساتھ مختلف مکاتب فکر بھی وجود میں آئے۔ یہ صحیح ہے کہ سر سید احمد خان اور انکے رفقاء کی سیرت نگاری پر اس وقت کے مخصوص سیاسی و تہذیبی غلبہ کے اثرات نمایاں ہیں اور روایتی اصول و نظریات کے مقابلے میں جدیدیت اور عقلیت پسندی کا رجحان غالب ہے۔ تاہم اس دور میں بھی روایت پسندی نمایاں نہ سہی لیکن اس کا وجود ضرور موجود تھا۔ سیرت نگاری میں مولود ناموں کا وجود اس کا ایک ثبوت ہے اگرچہ مولود نامے اور منظوم سیرت نگاری اپنی ضعیف و وضعی روایت کی وجہ سے تنقید نشانہ رہی۔ لیکن عوام الناس میں اس کی مقبولیت کسی بھی درجہ میں کم نہیں ہوئی۔

1857ء سے 1897ء کے دوران سیرت نگاری میں جو رجحانات سامنے آئے میں نے اسے اپنے مطالعہ تحقیق کا موضوع بنایا اور اس عہد کی نمائندہ کتب سیرت کا تنقیدی مطالعہ کیا۔

میں نے اپنے مطالعہ تحقیق میں اس بات پر مسلسل نظر رکھی کہ سیرت نگاری پر کون سے خارجی و داخلی عوامل اثر انداز ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ایک جانب اگر میں نے تحریک استشراق کے خارجی اثرات کی نشاندہی کی ہے تو دوسری جانب تحریک سیرت نگاری کے اثرات و نتائج کو بھی پیش نظر رکھا۔ خارجی و داخلی کشمکش کا نتیجہ سیرت نگاری کے ارتقاء پذیری کے عمل کا ذریعہ بنا۔ سیرت نگاری میں جدیدیت و عقلیت پسندانہ رجحان کی متوازی روایت پسندی کے احیاء کا عمل بھی جاری رہا اس حوالے سے قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ العالمین'' روایت پسندی کے احیاء کی نمائندہ تصنیف بھی سامنے آئی۔

سیرت نگاری میں جدیت اور روایت پسندی کی دو انتہاؤں کے درمیان ''دارالمصنفین'' کا کردار ایک معتدل اور متوازن علمی تحریک کے روپ میں سامنے آیا اور اس نے سیرت نگاری کو دینی، علمی، تاریخی اور تہذیبی رجحان سے روشناس کرایا۔ اس حوالے سے علامہ شبلی نعمانی کی سات جلدوں میں ''سیرت النبی ﷺ'' فن سیرت نگاری میں رجحان ساز تصنیف ہے۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کو جن جدید دینی و علمی اور تاریخی و تہذیبی اصولوں اور مقاصد کے پیش نظر رکھا اس نے سیرت نگاری کے فن کو معراج کی بلندیوں پر پہنچایا۔ 1919ء سے 1947ء کے درمیان سیرت کی کئی معرکتہ الآراء تصانیف منظر عام پر آئیں اس عہد کی تصانیف میں مولانا حکیم الامت ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کی ''اصح السیر'' پر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی ''سیرت المصطفیٰ ﷺ'' سمیت بیسیوں کتب سیرت نے سیرت نگاری میں ایک انقلاب برپا کیا۔ زیر نظر عہد میں محض کتب سیرت میں ہی اضافہ نہیں ہوا بلکہ سیرت کو مختلف مقاصد اور زاویوں سے قلمبند کیا گیا جس کے نتیجے میں سیرت نگاری میں علمی، تاریخی، دعوتی اور اصلاحی رجحانات بھی سامنے آئے۔ میں نے اپنے مطالعہ تحقیق میں اس عہد کی کتب سیرت میں ان رجحانات کی نشاندہی کی ہے یہ امر ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مذکورہ عہد میں اس عہد کے سیرت نگاروں کی دینی علمی و فکری وسعت مطالعہ کے نتیجے میں سیرت نگاری کو جو عروج حاصل ہوا وہ انتہائی قابل قدر ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت کے عصری مسائل اور تقاضوں کے پیش نظر نہایت رفیع الشان قرار دیا جا سکتا ہے۔

آزادی کے بعد سیرت نگاری میں مقصدیت کا اصول نظر یا ایک نئی جہت کے ساتھ سامنے آیا جس کے نتیجے میں سیرت نگاری میں دعوتی و اصلاحی رجحان تحریکی و انقلابی رجحان کے ساتھ ساتھ عوامی رجحان کا بھی اضافہ ہوا۔ آزادی کے بعد سیرت نگاری کے مذکورہ رجحانات نے سیرت کی مقصدیت و اہمیت کو جس طرح نمایاں کیا اسے سیرت نگاری کا حاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔

نوعیت مسئلہ:

یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی تحریک استشراق کا صحیح جواب، اردو زبان و ادب میں اب تک نہیں دیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا اور جسے مولانا شبلیؒ نے موثر بنانے کی کوشش کی تھی، اس کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور اس کا آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر مغربی اور یورپی مستشرقین کی سرگرمیاں تو لب ولہجہ کے فرق کے ساتھ حال جاری وساری ہیں اور ان کے عزائم و مقاصد میں بھی فرق نہیں آیا۔ لیکن ادھر ہماری طرف سے انتظام صفر ہے۔ مولانا شبلیؒ وغیرہ نے مستشرقین کی علمی تحقیقات اور ان کے معیار کی جونشان دہی کی تھی اور ان کی تصانیف کو جس طرح کذب وافتراء کا دفتر قرار دیا تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا اور تمام علوم اسلامیہ میں بالعموم اور سیرت رسول ﷺ کے باب میں بالخصوص واقفیت تامہ حاصل کر کے ان کی غلطیوں، بد دیانتی اور تحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا اور اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظم کام کا نقشہ بنایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوسکا، بلکہ المیہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت وشدت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا نہ ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلیٰ سطح پر علم وتحقیق کی سرپرستی کر سکیں اور ان کوششوں کو منظم کر سکیں جو انفرادی و اجتماعی اور نجی و سرکاری مختلف پیمانوں پر کی جاتی ہیں۔

ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اس معیار کی علمی وفنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کا طرہ امتیاز ہے۔ مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے اسی تیاری کی ضرورت ہے جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی (مثلاً علم وتحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب وثقافت کا گہرا مطالعہ، ضروری علوم وفنون سے دلچسپی، مشنری جذبہ، متعین مقاصد اور انتھک محنت وریاضت وغیرہ)۔

مستشرقین کی تحریک کو ایک گنا تقویت خود ان مسلمان محققین وعلماء کے رویہ سے مل رہی ہے جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصول تعلیم وتحقیق کے لئے جاتے ہیں اور وہاں کے احوال ومناظر سے اس درجہ متاثر ومرعوب ہوجاتے ہیں کہ انہی کے ہم آواز ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا جائے اور مرحلہ اول میں مسئلہ مستشرقین کی نوعیت وحقیقت کو سمجھ لیا جائے اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق و مستشرقین کی تحریک، اس کے مقاصد، اسباب ومحرکات عہد بہ عہد ارتقاء اور اعلام ومشاہیر کی عام صورت کیا ہے۔ زیر نظر مقالہ کا مدعا یہی ہے۔

1۔ مستشرقین کا سیرت رسول ﷺ پر نقطہ نظر:

ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اعتدال پسند مستشرقین کے ایک گروہ نے سیرت نبوی ﷺ کے قدیم واولین ماخذ کی ترتیب واشاعت کا کام بھی انجام دیا ہے اس سلسلہ میں ابن ہشام کی سیرت، واقدی کی کتاب المغازی، ابن اثیر کی ''الکامل'' اور ''طبری کی تاریخ'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مستشرقین نے ان پر حواشی لکھ کر اور ان کی متعدد فہرستیں مرتب کر کے دوسروں کو مزید کاوش سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انہوں نے اکثر کتابوں کے اپنے ملکی زبانوں میں ترجمے بھی کر دیئے ہیں۔ تاکہ بحث وتحقیق کرنے والوں کو ان سے مدد مل سکے اور وہ ان کی جانب رجوع کر سکیں۔

بہر حال اس گروہ نے تاریخی سرمایہ اور خاص طور پر سیرت نبوی ﷺ سے متعلق کتابوں کی نشر و اشاعت میں ان تھک محنت کی ہے۔ اور محنت کے علاوہ اپنا خطیر سرمایہ بھی لگا دیا ہے کئی کئی افراد مل کر ایک کتاب کو متعدد جلدوں میں مرتب کرتے ہیں اکثر محققین علمائے اسلام ان کی ان کاوشوں کے مداح اور شکر گذار ہیں۔ اس جماعت کی کاوشوں سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ جب سیرت نبوی ﷺ کے اولین ماخذ مکمل صورت میں چھپے اور ان کے محققانہ نسخے دوسرے مستشرقین کے ہاتھوں میں پہنچے تو سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ و تحقیق اچھے اور بہتر انداز میں کیا جانے لگا اور اس کے مفید نتائج بھی سامنے آئے۔

یہ گروہ ایسا ہے جو بحث و مطالعہ کا صحیح رخ متعین کر کے اصل تاریخی حقائق تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن عام اور بڑی جماعت کی عصبیت و جانبداری کا وہی حال ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مستشرقین کے اعتراضات و الزامات استعمار پسندوں اور عیسائی مشنریوں اور مبلغین کے مضبوط باہمی تعاون کے نتیجے میں وجود میں آئے اور پروان چڑھے ہیں ان کا مشترک پروگرام اور مقصد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور خاص کر آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس اور سیرت مبارکہ کو مغربی افکار کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔

2۔ شکوک و الزامات کی نوعیت:

گو مستشرقین کے تمام شبہات و اعتراضات کی نوعیت متعین ہے تاہم آسانی کے لئے انہیں حسب ذیل صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فکری:

انہیں مندرجہ ذیل وجوہ سے فکری کہا جا سکتا ہے:

الف: یہ انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کی بنیاد ذہنی وسائل پر ہے۔

ب: ان میں انسانی نفسیات کے خواص کی بحث و کرید اور ان کے طول و عرض کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ان پر عائد ہونے والے اشکالات کا ازالہ کیا جائے۔

ج۔ یہ اسلامی فکر کو متزلزل کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی اس سیرت و شخصیت کو مسخ کرتے اور بگاڑتے ہیں۔ جو منصب نبوت پر فائز اور قیادت و سعادت کے لحاظ سے بہترین نمونہ تھی۔

د۔ رسول ﷺ کے بارہ میں عربی و غیر عربی افکار میں تردد اور شکوک پیدا کرتے اور ان کی جانب سے لوگوں کو متنفر اور بیزار کرتے ہیں۔

ہ۔ ایک طرف حق کی تائید و حمایت کرنے والے جذبات و افکار کو مضمحل اور پست کرتے ہیں اور دوسری جانب ناپاک اور خود غرضی پر مبنی افکار کے ذریعہ شبہات کے دائرہ کو وسعت و قوت بخشتے ہیں۔

و۔ اس اعتبار سے بھی ان کو فکری کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اصل اور تمام تر بنیاد فکر پر ہے اور اس فکر اور ذہنی مفہوم کی رسول ﷺ نے اپنی دعوت و جہاد کے ذریعہ آبیاری کی ہے۔ اس بناء پر آپ کی ذات، شخصیت، سیرت اور سنت کے بارے میں جو بھی طعن و تشنیع کیا جائے گا وہ اسلامی فکر ہی کے بارے میں سمجھا جائے گا۔

دینی:

یہ شبہات ان حیثیتوں سے دینی دائرہ میں آتے ہیں:

الف: ان کا خاص تعلق احادیث نبوی ﷺ سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل، تقریر و ارشاد کا مجموعہ اور اسلام کا دوسرا اہم ماخذ و مصدر ہے۔

ب۔ احادیث کے بارے میں یہ وہم اور غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ ان میں بیان کئے گئے آنحضرت ﷺ کے افکار و اعمال آسمانی کتابوں یا انسانی سرچشموں سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔

ج۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی ایسی غلط اور مادی تفسیر و تعبیر کرتے ہیں جس سے شجاعت، ذہانت اور آزادی فکر کو اس کی جانب منسوب کیا جا سکے مگر وہ وہبی و ربانی کمالات سے تمام تر عاری ہو۔

د۔ کبھی اسلام میں تضاد اور کبھی اس میں تطبیق دے کر لوگوں کے دلوں میں شک و تذبذب پیدا کرتے اور رسالت پر عقیدہ و ایمان کو متزلزل کرتے ہیں۔ جب کہ اسلام کا جیتا اور جاگتا نمونہ خود نبی اکرم ﷺ کی زندگی اور ذات ہے۔

ہ۔ وحی و نبوت پر مستشرقین کے طعن و تشنیع کا خاص سبب یہ ہے کہ یہ رسول ﷺ کے اوصاف و کمالات میں سب سے نمایاں اور اہم وصف ہے۔ اگر اسی کو مشکوک اور مشتبہ کر دیا جائے تو دوسرے تمام اوصاف و کمالات خود بخود بے حقیقت ہو جائیں گے۔

و۔ اعتراضات کا تعلق دین کے سب سے اہم بالشان مسائل سے ہے کیونکہ یہ آپ ﷺ کے عقیدہ و فکر یا طرز زندگی اور جہاد وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ان میں شبہ واقع ہونے کے بعد خود مسلمان بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

تاریخ:

ان اعتراضات کی نوعیت تاریخی بھی ہے کیونکہ:

۱۔ یہ ان تاریخی واقعات سے پیوستہ ہیں جن کا تعلق اسلام سے قبل و بعد رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے ہے بلکہ تاریخ کی ابتداء و انتہا سے بھی۔

۲۔ یہ تاریخ کو اس کے اصلی موضوع سے ہٹا دیتے ہیں اور ان سے تاریخ کے علمی و واقعاتی رجحان کی بجائے ذاتی رجحان و مطالعہ کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ یہ الزامات چند مفروضوں اور تاریخی شکوک کے ارد گرد گردش کرتے ہیں۔ حالانکہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت سے وفات تک کی پوری زندگی نہایت واضح اور روشن ہے۔

۴۔ ان شبہات نے بعض تاریخی حقائق کو بھی جھوٹ اور گمراہی میں مخلوط کر دیا ہے۔ اس بناء پر حقائق و غیر حقائق، تحلیل و اعتراض اور تاریخ و افسانہ میں حد فاصل قائم کرنا اور امتیاز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

۵۔ تاریخ کا مقصد اللہ کی جانب سے انسانیت کی رہنمائی ہے۔ جیسا کہ آرنلڈ ٹوئین نے اپنی مشہور کتاب "نظریہ تاریخ" میں لکھا ہے اس لئے اگر رسول اللہ ﷺ ہی کی تاریخ مطعون کر دی جائے تو رہنمائی کی کون سی راہ باقی ہو سکتی ہے۔

۶۔ ول ڈیورانٹ نے "تمدن کی کہانی" میں لکھا ہے کہ "تاریخ انسانی تمدن کے کمال و زوال اور جائزہ و مطالعہ کا نام ہے" اس بناء پر اگر اسلامی تمدن ہی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ اور اسے دفن کر دیا گیا تو تمدن کی اس سے بڑھ کر اور کیا تحقیر ہو گی۔ مستشرقین کے اعتراض و الزام کی ایک نوعیت یہ بھی ہے:

۷۔ مسلمانوں کی اعتقادی، فکری اور اخلاقی زندگی کو ڈھانے اور اکھاڑنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ یہ ایسے بہادروں اور لیڈروں کی زندگی کو محبوب بنا کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے جن کے اصول و ضوابط اور طور و طریق کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

۸۔ یہ موجودہ دنیائے اسلام کا اس کے ماضی سے فکری، شعوری اور تاریخی رشتہ کاٹ کر اسے بہت حقیر و گھٹیا بنا کر پیش کرتا ہے۔ حالانکہ مستشرقین کو معلوم ہے کہ جدید اسلامی فکر اس اسلامی فکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کی بنیاد قرآن اور رسول ﷺ کی تعلیمات نے رکھی ہے۔

۹۔ یہ انسانی زندگی کے اس روحانی پہلو کو مسمار کر دیتا ہے۔ جس کا سب سے اعلیٰ اور مکمل نمونہ مسلمانوں کے رہنما اور پیغمبر کی زندگی میں تھا۔ اور اسے تاریخ کے خوبصورت فریم اور چوکھٹے میں منجمد کر دیتا ہے۔

۱۰۔ وہ جہاد اور احکام اسلامی کو ناقابل عمل اور مشکل بتاتا ہے۔ اس بناء پر فکری و عملی زندگی کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کا نعرہ بلند کر کے

مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

۱۱۔ وہ ایسے رہنماؤں اور قائدوں کو نمایاں اور ممتاز قرار دیتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے قائدانہ اوصاف اختیار کرنے کے بجائے فکری، اعتقادی اور اجتماعی حیثیت سے مغربی قائدین کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

۱۲۔ انور جندی نیان نے خطرناک شبہات کی خصوصیت کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ مغرب کا سب سے خطرناک ارادہ اور منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا دل و دماغ توحید، اخلاق، روحانیت، اور ایمان سے عاری ہو کر اس تیز و تند ہوا کے سامنے آجائے جو تعلیم، صحافت، ادب، فلم اور لباس کے راستہ سے زہر بکھیر رہی ہے۔ ان چیزوں کے مسموم اثرات سے ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جو تخریب اور بربادی کی طرف اس کو ترقی و تمدن کا نام دے کر چلی جا رہی ہے اور اسلامی تاریخ و تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کو مسخ کر کے مستشرقین و مبلغین کی پیروی کر رہی ہے اور ان ہی کی طرح اس دور کو حقیر اور کمتر خیال کر رہی ہے۔

3۔ اسلام پر الزام تراشی کے اغراض و مقاصد:

عیسائی مشنریاں اور استعمار پسند کھل کر مسلمانوں پر اثر انداز اور حاوی ہونے کے درپے ہیں۔ اس لئے وہ کانفرنس اور اجتماعی، ادبی اور علمی اجلاس کرتے ہیں۔ لیکن مستشرقین کے اغراض و مقاصد علم و معرفت کے غلاف میں لپٹے ہوتے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ان کی غرض و غایت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا نشانہ اسلام کے تمام احکام و مسائل اور اس کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ جن میں سرفہرست خود آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک ہے۔ اسلام کے خلاف طعن و تشنیع اور جھوٹ کے پیچھے جو جذبات و مقاصد کارفرما ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

(i) نصرانی قبائل اور اسلام کے درمیان حائل ہونا:

اسلام کو مسخ کرنے اور اس کے محاسن پر پردہ ڈالنے سے ان کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں نظام حیات بننے کی صلاحیت نہیں۔ صلیبی جنگوں کے بعد ہی سے یہ بات دہرائی جا رہی ہے۔ قرآن مجید کے ترجمے بھی یہی ثابت کرنے اور اس کے اندر نقص نکالنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ اہل یورپ کے اندر عثمانیوں کے یورپ پر چھا جانے کے بعد اسلام کے خلاف کراہیت، نفرت اور ذہنی جنگ کی مستقل فضاء پیدا کر دی گئی ہے اور اسلام کے نافذ العمل ہونے کے بارہ میں انہیں شکوک و شبہات میں ڈال دیا گیا ہے۔

(ii) مسلم ممالک کو نوآبادیات بنانے کی سازش:

دوسری غرض یہ تھی کہ جہاد کی تاویل و توجیہ کر کے مسلمانوں کو اس کی جانب سے غافل کر دیا جائے اور انہیں عافیت و آرام پسندی کا درس دیا جائے۔ تاکہ اسلام کی قوت مقابلہ پاش پاش ہو جائے اور جنگ و جہاد کی خوگر قوم کو عبادت و ریاضت میں مشغول کر کے یہ باور کرایا جائے کہ جہاد اکبر یہی ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ اور اسلامی سلطنتوں کے حصے کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کی سوسائٹی سے معاشرت و سیاست کے اسلامی قوانین معطل کر دئے گئے اور مغرب کا مکمل تسلط قائم کرنے کے لئے اسلام کے قانونی، سیاسی اور ترمیمی نظام میں خلل ڈال دیا گیا۔

(iii) مسلمانوں کو ان کی اصل بنیادوں اور سرچشموں سے دور کر دینا:

اسلام کے اصول تبدیل کر کے مسلمانوں کو ان کے سرچشموں سے دور کر کے اور ان کی انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی اور عقلی خصوصیات ختم کر کے انہیں استعماری فکر و تہذیب کے سامنے سرنگوں کر دیا گیا۔ اس طرح مسیحی تبلیغ و دعوت کو ان کے عقائد و نفوس میں پیوست کرنے کا دروازہ کھل گیا اور بہت سے کمزور عقیدہ کے لوگ اس میں مبتلا ہو گئے۔

(iv) دنیائے اسلام کو کمزور اور پسماندہ بنانے کی اسکیم:

مستشرقین عالم عرب اور دنیائے اسلام کو پس ماندگی اور بدحالی سے ہمکنار کر کے اس پر اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ اور پھر

مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ان کی پس ماندگی کا سبب اسلام کی پیروی اور محمد ﷺ کی اتباع ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اسلام، اسلامی اصول وقوانین اور اس کے تصور عبادت، نظام اور تاریخ کے بارے میں بے شمار شبہات والزامات گڑھے ہیں۔ استعمار پسندوں کا یہ دعویٰ بالکل کھوکھلا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے تنزل وانحطاط کی وجہ اسلام ہے۔ علم وتاریخ کو میزان اور کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اس کا کھوٹ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے صحیح تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر عربوں اور مسلمانوں کا انحطاط اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے اگر اسلام کے درست نظریے اور بنیادی اصول کو وہ اختیار کئے ہوتے تو اس مشکل میں نہ پھنستے۔

ایک طرف تو یہ حال ہے اور دوسری طرف اکثر اہل مغرب مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور فکری ومادی قوت کے دوبارہ آنے سے خائف ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اسلام اور اس کے امتیازی اصول مغربی دنیا کا استیصال کر دیں گے۔ اور مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ دور دراز گوشوں تک وسیع ہو جائے گا۔ لارنس براون کہتے ہیں ''مغربی استعمار کے لئے اصل خطرہ اسلام اور اسلامی نظام کے احیاء میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ اس کے اندر چھا جانے اور سب کو سرنگوں کر دینے کی صلاحیت موجود ہے''۔ انور جندی لکھتے ہیں ''یہ کہنا بجا ہے کہ اگر ہم اسلام کے اصول ومناہج کو مضبوطی سے اختیار کر لیں اور اپنی قدر وقیمت کو پہچان لیں اور اپنے امتیاز وتشخص کو برقرار رکھیں تو ہم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ ہمارہ وجود استعماری اور نو آبادیاتی دور میں اور اس کے بعد بھی صرف عمدہ فریم میں بند رہا اور موثر اور موزوں نہ بن سکا۔

(v) سنت نبوی ﷺ کو عضو معطل کر دینا:

مستشرقین کی یہ کوشش بھی ہے اور وہ اسے لوگوں کی نظر میں صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اعمال وتوجیہات اور آپ کی قیادت ورہنمائی دور جاہلیت کی برائیوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے تو موزوں اور مناسب تھی۔ لیکن اب یہ مرحلہ ختم ہو چکا ہے۔ دور حاضر کی اخلاقی واجتماعی قیادت اور اعتقادی اصلاح کے لئے اسلام کو گھسیٹنا درست نہیں۔ کیونکہ دونوں زمانے میں بڑا فرق ہے وہ احادیث کے خلاف جھوٹ بول کے مسلمانوں اور عربوں کو بھی ان کی جانب سے بدگمان کر دیتے ہیں۔ جونبل احادیث کو ہدف بنا کر ان کے متناقض کے متعلق لکھتا ہے۔ ''زمانہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مرویات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنی تائید کے لئے احادیث گڑھتا رہا۔ اس طرح ہر شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی رائے کو کسی نہ کسی حدیث کے موافق ثابت کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع ومتناقض حدیثوں کی کثرت ہے اور آنحضرت ﷺ کی ایک ہی سنت کے بارہ میں سخت متضاد احادیث پائی جاتی ہیں''۔

احمد شاکر مرحوم نے اس اعتراض کا بہت طویل جواب دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ رضاعین وکذابین کی وضع وافتراء سے انکار نہیں۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ سچے راویوں کی بعض حدیثوں میں غلطیاں موجود ہیں۔ خود علمائے فن اور محدثین نے ان کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے احادیث کی جو یہ تصویر پیش کی ہے کہ حلال وحرام اور طہارت ونظامت کے تمام مسائل ہی موضوع حدیثوں پر مبنی ہیں۔ اس سے تو اس کا سارا ذخیرہ ہی باطل اور مردود قرار پاتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ کچھ فرمایا اور نہ کچھ کیا''۔

احادیث پر ان کی بہتان تراشی کے نمونے یہ بھی ہیں کہ بعض حدیثیں انجیل کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے آباؤ اجداد کے طور طریقے بدل کر کچھ نئے طور طریقے جاری کر دیئے۔ اس طرح انہوں نے آپ کی نبوت میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لئے آپ کے ان اقوال کو بہت نمایاں کیا ہے۔ جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ انہیں طعن وتشنیع کا نشانہ بنائیں۔ لیکن ہمارے علمائے محققین نے مدلل طور پر ان جھوٹوں کا جواب دیا ہے اور علمی انداز میں مستشرقین کے باطل خیالات کی تردید کی ہے۔

4۔ شبہات واعتراضات کا محور ومرکز:

مستشرقین کے سارے الزام کا محور دو چیزیں ہیں 1۔محمد نبی ﷺ اور رسول نہیں تھے بلکہ محض ایک انسان تھے 2۔اسلام انسانی نتیجہ فکر اور ذہنی اختراع ہے۔ وحی الٰہی نہیں ہے۔

اس معاملہ میں سب مستشرقین برابر اور یکساں ہیں۔ خواہ وہ آپ ﷺ کو ایک اجتماعی مصلح، منفرد و عبقری، بے مثال بہادر اور انسانیت کا قائد و رہنما سمجھتے ہوں یا آپ کو (نعوذ باللہ) گھناؤنی عادتوں مکر وفریب، پُرخوری، ہوس رانی، شہوت، بزدلی، سنگ دلی سفاکی اور خون ریزی سے متہم کرتے ہوں اور یہ کہتے ہوں کہ آپ ﷺ گذشتہ آسمانی کتابوں کی پیروی کرتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو ایجابی یا سلبی نظر سے دیکھنے والے مستشرقین بھی برابر ہیں۔ نیز جو آپ کی شخصیت کو اعتدال وانصاف کے میزان میں تولتے ہیں اور جو جھوٹے اور مذموم اغراض کے میزان میں تولتے ہیں سب ہی برابر ہیں۔ کیونکہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ جزیرہ عرب کے ایک فرد تھے۔ اور جس طرح دوسرے اور آخری گروہ سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کی طرح آپ پر ایمان لائے گا۔ آپ کو نبی و رسول تسلیم کرے گا۔ اور اسلامی فکر کا حامل ہوگا۔ اسی طرح پہلے گروہ سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ البتہ مستشرقین کی ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی حق گوئی، اعتراف حقیقت اور انصاف پسندی نے اسے اسلام قبول کرنے اور اسے قولاً وعملاً اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر تمام فکری دائروں میں اسلام اور نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دینے لگے۔

مستشرقین کے بعض اعتراضات کے شروع میں نبوت کے دفاع کا ذکر ہوتا ہے پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے نام اور آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے اور بعد کی زندگی کو زیر بحث لا کر اسی پہلے محور کے گرد پہنچ جاتے ہیں۔ ابتداء میں تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کو تسلیم کرلیں گے اور آپ ﷺ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بحث کر کے اس کی گوناگوں خوبیاں اور کمالات واضح کریں گے۔ مگر اس کے بعد بھی وہ اس امر کا اقرار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ﷺ پر بھی اسی طرح وحی نازل ہوئی تھی۔ جس طرح گذشتہ انبیاء حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر اتری تھی۔ جن کی نبوت کے یہ لوگ بھی قائل ہیں۔ بے شک اسی کا نام عصبیت اور جانبداری ہے۔

ان کا دوسرا محور یہ ہے کہ اسلام کسی مصلح یا عبقری شخص کے ذہن کی پیداوار ہے حالانکہ نامور مستشرقین اور قانون کے ماہرین شناخت وغیرہ کو اعتراف ہے کہ قانونی حیثیت سے اسلام کو رومن لاء پر فوقیت حاصل ہے۔ اور وہ اکثر جدید قوانین سے بھی افضل و برتر ہے۔ اسی طرح دین و مذہب کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اسلام کا عقیدہ توحید واقعیت وحقیقت کے اعتبار سے کسی بھی دوسرے آسمانی عقیدہ و تصور سے ممتاز ہے۔ اسلامی عبادات کے بعض اعمال کو بعض لوگوں کی نظر میں جاہلیت کی یادگار ہیں۔ اور وہ انہیں قدیم شرقی مذاہب سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مانتے ہیں کہ ان کا خاص مقصد انفرادی واجتماعی اصلاح ہے۔ رہے اخلاق ومعاملات تو بعض لوگ انہی کو اصل اور تمام اسلام قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے اندر انسانیت کی بنیادی یہی قدر وقیمت کی ضمانت ہے۔ جیسے آزادی عظمت وکرامت، احساس وذمہ داری اور زندگی کی مخالفت وغیرہ۔ ان حیثیتوں سے اسلام دوسرے مذاہب میں منفرد ہے۔ اسی طرح اسلام کے اقتصادی، سیاسی، خاندانی اور اجتماعی نظام، قانون اور نظم مملکت سے بھی اس کا بہت روشن پہلو سامنے آتا ہے۔ اور اسلام اپنے اسی تمدن وشائستگی کی وجہ سے گذشتہ زمانہ میں زمین پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔ اور اب بھی اس میں زندگی اور نمو کی صلاحیت رکھنے والی ایسی قدریں ہیں۔ جن کی بدولت وہ از سر نو زمین پر حکومت وفرمانروائی کرے گا۔

یہی وہ محور ومرکز ہیں جہاں سے پھر الزامات کا رخ سیرت نبوی ﷺ کی جانب ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہم مستشرقین کے ان دونوں گروہوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ جو اسلام کے اوصاف ومحاسن بیان کرتے ہیں یا اس کے معائب ومثالب کی کرید کرتے ہیں اور اس پر آزادی اور کھلی چھوٹ دینے، غلامی کی داغ بیل ڈالنے، عورتوں کے حقوق غصب کرنے، رحم وشفقت سے عاری ہونے اور اسی نوعیت کے بہت سارے اسلام کے اصول وقوانین سے میل ومطابقت نہ رکھنے والے الزامات عائد کرتے ہیں۔

نتائج تحقیق

میں نے اپنی تحقیق میں جو بنیادی سوال قائم کیا تھا، اس کے جواب کی تلاش میں میں نے تقریباً سات مفروضہ جات قائم کیے تھے۔ اور جب میں نے اپنی تحقیق کو مکمل کیا تو ان میں سے تین مفروضہ جات تحقیقی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکے جن میں سے ایک یہ تھا کہ:

1۔ ''مسلم سیرت نگاروں کی زیادہ کتابیں اپنے طور پر مقدس جذبے کے تحت لکھی گئیں۔''

2۔ ''مسلم سیرت نگاروں نے زیادہ کتابیں مستشرقین سے متاثر ہو کر لکھیں۔''

3۔ ''مسلم سیرت نگاروں کا مستشرقین کے حوالے سے رویہ بہت نرم ہے۔''

جب کہ میرے متعین کردہ دیگر مفروضہ جات حقائق پر پورے اترے اور میری تحقیق انہی کی وضاحت پر مشتمل ہے۔

مثلاً یہ کہ:

1۔ ''مسلم سیرت نگاروں نے مستشرقین کے جواب میں اکثر کتابیں لکھیں''۔

2۔ ''مستشرقین کا سیرت کی کتب لکھتے وقت رویہ بہت سخت یعنی یکطرفہ اور متعصبانہ رہا ہے''۔

جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ:

3۔ ''مسلم سیرت نگاروں کا مستشرقین کے حوالے سے رویہ بہت سخت ہے''۔

اس حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض مسلم سیرت نگاروں کا رویہ جوابی طور پر بہت سخت رہا ہے اور وہ حُبِ نبوی کے زیر اثر نظر آتا ہے اور کچھ معتدل رہے کہ ان کی نظر میں اعتراضات کی علمی نوعیت کو دلائل کے ساتھ واضح کرنا تھا۔

نیز یہ بات بھی تحقیقی طور پر درست ہے کہ:

4۔ ''مسلم سیرت نگاروں نے سیرت النبی ﷺ پر عمدہ تحقیقی کام کیا جو مسلم اور مستشرقین دونوں کے لئے علمی حوالہ سے بہت مفید ہے۔''

میرے اس مقالہ کے جو نتائج تحقیق ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

1۔ مقالہ کا پہلے باب کا عنوان ''سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء'' ہے۔ میں نے اس باب میں فنِ سیرت نگاری اور سیرت نگاری کے اُصول وضوابط کا مفصل ذکر کرتے ہوئے سیرت کی حدود وقیود کی وضاحت کی اور برصغیر پاک و ہند میں سیرت پر ہونے والے کام کا مفصل جائزہ لیا۔

2۔ اس مقالے کے باب دوم میں تحریک استشراق اور استشراق کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا۔ تاریخ استشراق میں مستشرقین کے مختلف گروہ سامنے آئے جن میں متعصب مستشرقین، ملحد مستشرقین، خالص علم کے شیدائی مستشرقین اور اپنے علم کو پیشہ بنانے والے مستشرقین قابل ذکر ہیں۔

3۔ دوسرے باب میں یہ بات بھی واضح ہوئی کہ عیسائی مشنریوں کا مستشرقین کے اعتراضات کی نشر واشاعت میں بہت کردار رہا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اپنے اعتراضات میں اضافہ کر کے انہیں بہت دلفریب اور خوشنما بنا دیا۔ عیسائی مشنریوں کے منصوبے بہت منظم اور وسیع ہوتے ہیں اور وہ مشرق میں اپنے منصوبوں کی اشاعت کے لئے مبلغین بھیجتے رہتے ہیں تا ہم اسلام کا جو اصل نظریہ ہے اس کو مسخ کیا جا سکے۔

4۔ اس باب کی چوتھی فصل میں مستشرقین کی جن تصانیف کا ذکر ہے ان تصانیف کو لکھنے کے چند بنیادی اسباب سامنے آتے ہیں مثلاً:

i۔ مستشرقین آپ ﷺ کی مدنی زندگی کو بادشاہانہ تصور کرتے ہیں۔

ii۔ آپ ﷺ کا کثرتِ ازواج کا بنیادی سبب میل الی النساء تھا۔

iii۔ آپ ﷺ نے جبر اور زور و طاقت پر مذہب کی اشاعت کی۔

iv۔ آپ ﷺ نے لونڈی اور غلام بنانے کی اجازت دی اور خود بھی عمل کر کے دکھایا۔

v۔ آپ ﷺ نے دنیاداروں کی سی حکمتِ عملی اختیار کی۔

5۔ تیسرے باب میں سر سید احمد خان کے حوالے سے جو گفتگو ہوئی اس میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ سر سید احمد خان وہ پہلے سیرت نگار ہیں جنہوں نے مستشرقین کی جانب سے سیرت رسول ﷺ پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے قلم اٹھایا۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دفاع سیرت النبی ﷺ میں سر سید احمد خان کا بنیادی کردار ہے جس کی وضاحت ہم خطبات احمدیہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

6۔ اسی باب میں جسٹس امیر علی مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے غلامی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اسلام میں آج کا غلام کل کا وزیر اعظم ہو سکتا ہے۔ وہ بغیر تعامل یا نا گواری کے اپنے آقا کی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے اور خاندان کا سربراہ بن سکتا ہے۔ کیا عیسائیت کوئی ایسی مثال قائم کر سکتی ہے؟ اسلامی تعلیمات میں رنگ و نسل کے کسی فرد کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

7۔ اس مقالے کے باب چہارم میں مستشرقین کے افکار کے ناقدین سیرت نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک مولانا شبلی نعمانی بھی ہیں۔ یہ پہلے سیرت نگار ہیں جنہوں نے مستشرقین کے اعتراضات کے جواب کے ساتھ ساتھ سیرت النبی ﷺ کا منہج و اسلوب سیرت نگاری کو واضح انداز میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی کتب سیرۃ میں ہمیں سیرت نگاری کے نمایاں رجحانات ملتے ہیں۔

8۔ اسی باب میں مولانا عبدالرؤف دانا پوری کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مولانا نے نقلی اور عقلی علوم سے استفادہ کیا اور بالخصوص نقلی علوم میں دانا پوری کا منہج سیرت نگاری بہت واضح ہے۔ مولانا دانا پوری کی کتاب ''اصح السیر ۃ'' کا اسلوب بہت سادہ اور عام فہم ہے اور مولانا نے اپنی کتاب میں ردِ استشراق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت و سیرت سے متعلق مستشرقین کے جو غلط بیانات ہیں ان کا ابطال کیا جائے اور خاص طور پر انہوں نے اس بات کی طرف توجہ دی ہے کہ ذاتِ نبوی ﷺ سے متعلق مستشرقین نے مسلم نوجوان کے ذہنوں میں جو شکوک وشبہات پیدا کیے ہیں اُن کا ازالہ کیا جائے اس لئے اسلامی تاریخ اور نقلی علوم قرآن و حدیث کی طرف خاص توجہ دی۔

9۔ چوتھے باب کی ساتویں فصل میں جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پیر کرم شاہ الازہری مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے مقاصد کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ دینی، علمی، اقتصادی اور سیاسی مقاصد وغیرہ۔ پیر کرم شاہ لکھتے ہیں کہ مستشرقین مذہب کے حوالے سے جو گفتگو کرتے ہیں اُس کو دیکھنے کے بعد انسان حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ دنیا اسلام کو عیسائیت اور یہودیت کی بگڑی ہوئی شکل سمجھتے ہیں اُمتِ مسلمہ کو غیر مہذب اور پسماندہ قوم سمجھتے ہیں۔ پیر کرم شاہ الازہری نے اپنی کتاب ''ضیاء النبی ﷺ'' میں ان اعتراضات کا مفصل اور مدلل جواب دیا ہے اور ضیاء النبی ﷺ کی دو جلدیں استشراق کے لئے مختص کی ہیں۔ مستشرقین کے حوالہ سے پیر کرم شاہ الازہری کا سیرت نگاری پر کام بہت وقیع ہے۔

10۔ مستشرقین کے استحقاقِ نبوت کے حوالے سے اعتراضات کا بغور جائزہ لینے کے بعد جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات محض ایک انسان ہی نہیں بلکہ اللہ کے نبی اور رسول بھی تھے اور دوسری بات جو وحی آپ ﷺ پر نازل ہوئی تھی وہ کسی انسانی ذہن کی اختراع نہیں بلکہ کلام اللہ ہوتا تھا۔

برصغیر کے جتنے بھی سیرت نگار ہیں جن میں مشہور نام سر سید احمد خاں (1817ء)، امیر علی (1849ء)، شبلی نعمانی (1857ء)، عبدالرؤف دانا پوری (1874ء) اور پیر کرم شاہ الازہری (1918ء) نے اس بات کی وضاحت کی اور مدلل جوابات دیئے کہ محمد ﷺ کی ذات محض انسان ہی نہیں بلکہ اللہ کے نبی اور رسول بھی ہیں اور جو کلام جبرائیل امین لے کر آتے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔

11۔ باب پنجم میں مستشرقین کے تعدد ازدواج پر اعتراضات کا جو برصغیر کے سیرت نگاروں نے جواب دیا ہے اُس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ تعدد ازدواج صرف آپ ﷺ کے ساتھ منسوب نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی بہت سے انبیاء تعدد ازدواج کرتے تھے اور ساتھ یہ اعتراض لگایا کہ آپ ﷺ کی ذات خواہشاتِ نفس کی تابع تھی آپ ﷺ نے جتنی بھی شادیاں کی وہ خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لئے کیں یہ تمام اعتراضات سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔ کیونکہ یہ بات سامنے آئی ہے کہ آپ ﷺ کی ذات خواہشاتِ نفسانی سے بلند و بالا تھی اور آپ ﷺ نے بہت سی شادیاں مصلحت کی بنیاد پر کیں۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ آپ ﷺ نے جتنی بھی شادیاں کیں وہ محض نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کیں تو آپ ﷺ شادی کے لئے نوجوان حسیناؤں کا انتخاب کرتے مگر آپ ﷺ کی بہت سی ازواج سن رسیدہ اور بیوہ تھیں۔ اس لئے یہ سب من گھڑت کہانیاں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

سفارشات

1۔ برصغیر میں مستشرقین کے ساتھ ساتھ ہندو مصنفین نے بھی آنحضورﷺ کی ذات اقدس پر اعتراضات کیے ہیں۔اس تناظر میں دونوں طرح کے مخالف مصنفین کے اعتراضات کا عقلی وتاریخی تجزیہ کرنا چاہیے۔

2۔ تحقیق وتجزیہ کے ساتھ ان کے منہج استدلال کا تنقیدی جائزہ تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے اور حضورﷺ پر ان کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات اور پیدا کیے گئے شبہات کا مدلل تحقیقی جواب دینا چاہیے۔

3۔ مخالف یورپی اور ہندو مستشرقین جس قسم کے سوالات حضورﷺ کی سیرت کے بارے میں اٹھاتے ہیں ویسے ہی سوالات ہندو مذہب کے بانی اور عیسائی مذہبی لٹریچر پر بھی اٹھائے جا سکتے ہیں لیکن اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ان کے بانیان مذاہب کی شان میں کوئی نازیبا کلمات استعمال نہ ہوں بلکہ تحقیق اعتراضات کے لئے نہیں حقائق کو ثابت کرنے کے لئے کی جانی چاہیے۔

4۔ عصر حاضر میں مکالمہ بین المذاہب کا جو ماحول قائم ہو چکا ہے اس کے صحت مندانہ اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آج کے دور کے سیرت نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان میں بھی مہارت پیدا کرے۔جس طرح سے حضورﷺ نے حضرت زید بن ثابت کو یہودیوں کی عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔اس طرح برصغیر کے سیرت نگاروں کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہندی، سنسکرت زبانوں کا فہم اور ادراک حاصل کریں۔

5۔ عیسائی مشنریز مصنفین نے برصغیر کی مقامی زبانوں میں بھی سیرت نبویﷺ کے متعلق جو گمراہ کن لٹریچر پھیلایا ہے اس کا محاسبہ بھی برصغیر کے سیرت نگاروں کا فریضہ ہے۔اس لئے مقالہ ہذا کے تحقیقی نتائج میں یہ پُرزور سفارش کی جاتی ہے کہ برصغیر کے مقامی سیرت نگاروں پر مشتمل ایک ایسا سیرت بورڈ تشکیل دیا جائے جو سابقہ مروجہ اور آئندہ سیرت پر ہونے والے اعتراضات کو تسلی بخش طور پر رفع کر سکے۔

6۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر سیمینارز اور کانفرنسز منعقد کروائی جائیں تاکہ لوگوں کو مستشرقین کے افکار کا اندازہ ہو سکے۔

7۔ اس مضمون کو بی اے اور ایم اے کی سطح پر رائج کیا جائے تاکہ طلبہ مستشرقین کے افکار اور نظریات کو پوری طرح سے سمجھ کر ان کے اعتراضات کا تجزیہ کر سکیں۔

8۔ اسلامی تحقیقی اداروں میں مجلات میں ایک مستقل کالم مستشرقین کے افکار و اعتراضات کے حوالے سے شائع ہونا چاہیے جس میں مستشرقین کے افکار اور اہداف کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

9۔ مغربی میڈیا کے لئے ایسے پروگرام مرتب کیے جائیں جن سے ان کے ذہن کی آبیاری ہو اور ان کے تصورات اسلام کے بارے میں واضح ہوں۔کیونکہ مستشرقین کی ایک کثیر تعداد اسلام کی بنیادی تعلیمات پر عبور نہیں رکھتی۔

10۔ شعبہ علوم اسلامیہ کا ایک خاصہ جہاں یہ ہے کہ وہ دور جدید کے تقاضوں کے عین مطابق کام کرواتے ہیں اسی طرح مستشرقین کے اعتراضات پر کام شروع کیا گیا مگر اس کو خاطر خواہ طریقے سے آگے نہ بڑھایا جا سکا۔اس لئے اس میدان میں مزید طبع آزمائی کی کافی گنجائش موجود ہے۔

مصادر مراجع

مصادرمراجع

عربی کتب:

1. القرآن کریم
2. ابن اثیر ، عذالدین، ابو الحسن،''الکامل فی التاریخ''، دارالمعارف، بیروت، (س ن)
3. ابن اثیر ، عذالدین، ابو الحسن،''اسد الغابه فی معرفة الصحابة''، المکتبه الاسلامیه، ریاض
4. ابن الجوزی، عبدالرحمن بن علی،''الوفا باحوال المصطفیٰ''، مکتبه نوریه، لاهور 1977ء
5. ابـن جریر، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری،''جامع البیان عن تاویل القرآن المعروف به تفسیر الطبری''، تحقیق و تخریج صدقی جمیل العطار، دارالفکر، بیروت 1415ھ، 1995ء
6. ابن حزم، علی بن احمد،''جوامع السیرة''، دار التشر الکتب الاسلامیه، لاهور 1985ء
7. ابن الزبیر ، عروه،''مغازی رسول الله''، الطبعة الاولی، ریاض 1981ء
8. ابن اسحاق ، محمد،''امغازی''، تحقیق، ڈاکٹر حمیدالله، مراکش
9. ابن السعد الکاتب، محمد،''الطبقات الکبری''، دار الصادر، بیروت (س ن)
10. ابن سید الناس، فتح الدین،''عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل و السیر''، دار المعارفة، بیروت
11. ابـن فـرج، ابـو عبـدالـلـه مـحـمـد،''اقضیة رسول الله''، تحقیق، محمد ضیاء الرحمن الاعظمی، ڈاکٹر، بیروت 1982ء
12. ابن القیم الجوزیة،''زاد المعاد فی هدی خیر العباد''، بیروت 1979ء
13. ابن کثیر ، عمادالدین اسماعیل بن عمر، ''الهدایة و النهایة''، القاهره 1966ء
14. ابن کثیر، ''السیرة النبویة''، دار المعارفة، بیروت 1971ء
15. ابن هشام، عبدالملک،''السیرة النبویة''، مکتبه، مصر 1934ء
16. ابوزهره، محمد،''خاتم النبیینﷺ''، دار الفکر العربی، بیروت 1979ء
17. ابو عبیده قاسم بن سلام، امام،''کتاب الاموال''، مطبوعه، قاهره 1979ء
18. احمد ابراهیم خلیل،''المستشرقون والمبشرون فی العالم الاسلامی''، قاهره 1964ء
19. ابهی، محمد،''المبشرون و المبشرون فی العالم الاسلامی''، الازهر، طبع جدید،
20. احمد التاجی،''سیرت النبی العربی''، مصطفیٰ البابی الحلبی 1978ء
21. احمد علی بن حسین علی،''مکاتیب الرسول''، مصر ،
22. الاصبهانی، ابونعیم، احمد بن عبدالله، ''معرفة الصحابة''، مکتبه الدار المدینة المنوره 1988ء
23. ابراهیم الشریف محمد،''مکه و المدینه فی الجاهلیة و عصر الرسول''، القاهره 1965ء

24. احمد بن حنبل، امام ابو عبداللہ احمد بن حنبل،"مسند الاما احمد"، دار الفکر، بیروت، سن تدارو،
25. الابراشي، محمد مطبه،''عظمت الرسول ﷺ''، القاهره 1965ء
26. الآلوسی، ابوالفضل شهاب الدین، سید محمود الآلوسی،''روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع الثانی''، دارالفکر، بیروت، سن تدارد،
27. البوطی، محمد سعید رمضان، الدکتور،"فقه السیرة"، درالفکر، بیروت 1985ء
28. البیهقی، ابوبکر احمد بن حسین،"دلائل النبوة و معرفة احوال صاحب الشریعة"، درالکتب العلمیه، بیروت،
29. البخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراهیم بن المعتیره بن بردبه،"صحیح البخاری"، دارالکتب العلمیة، بیروت، طبع اول 1412ھ، 1992ء
30. البیضاوی، ناصرالدین عبداللہ بن عمر بن محمد الشیرازی،"انوار التنزیل و اسرار التاویل المعروف بہ تفسیر البیضاوی''، موسسة الاعلمی للمطبوعات، بیروت، طبع اول 1410ھ، 1990ء
31. باشمیل، احمد، محمد،''غزوه احد''، مطبوعه ریاض 1964ء
32. جمال الدین سردار محمد،''قیام الدولة العربیه فی حیاة محمد''، القاهره 1966ء
33. جاد المولیٰ، محمد،"محمد المثل الکامل"، القاهره، یار چهارم 1951ء
34. الجصاص، ابوبکر احمد بن علی الرازی،''احکام القرآن''، سهیل اکیڈمی لاهور، سن تدارد
35. الحلبی، علی بن برهان الدین،''السیرة الجلیبة فی سیرة الامین المامون داستان العیون''، دارالمعارف، بیروت 1980ء
36. حمیداللہ، محمد ڈاکٹر،''مجموعة الوثائق السیاسیة''، مکتبه، لجنة التالیف، قاهره 1951ء
37. حقانی، ابو محمد عبدالحق حقانی،''تفسیر فتح المنان المشهور بہ تفسیر حقانی''، الفیصل ناشران کتب لاهور، سن تدارد
38. المخصری بک محمد،"نوراليقين"، سبحانی اکیڈمی، لاهور 1977ء
39. ایتن ڈینیه،''استشراق کمایراه الغرب'' (مشرق، مغرب کی نظر میں)، طبع1890ء
40. المسوقی، محمد،"الاسلام والمستشرقون"، قاهره 1972ء
41. دریا، آبادی، عبدالماجد، مولانا،"تفسیر ماجدی"، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاهور، کراچی ندارو
42. رشید رضا علامه،"تفسیر القرآن الحکیم الشهر بتفسیر المنار"، دارالمعرفة، بیروت 1993ء، 1414ھ
43. زکریا، هاشم زکریا،''المستشرقون والمبشرون فی العالم الاسلامی''، قاهره 1964ء
44. السیوطی، جلال الدین امام،''الخصائص الکبری''، دارالکتب العلمیه، بیروت،
45. السیوطی، جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر،''الدر المنشور فی التفسیر الماثور''، دارالکتب العلمیه، بیروت، طبع اول 1990ء، 1414ھ

46. السیوطی، جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر،''لباب النقول فی اسباب النزول علی ہامش تفسیر الجلالین''، دار المعروف، بیروت، طبع دوم، 1984ء، 1404ھ
47. الشافی، شمس الدین الصالحی،''سبل الهدیٰ و الرشاد فی سیدۃ خیر العباد''،القاهره 1990ء
48. شلبی، عبدالجلیل، ''الاسلام والمستشرقون''، قاهره 1977ء
49. شلبی، رئوف، الدکتور،''الدعوۃ الاسلامیه فی عهد ها المکی''، در القلم، الکویت، 1983ء
50. شلبی، رئوف، الدکتور،''الدعوۃ الاسلامیه فی عهدها المدنی''،دار القلم،1985ء
51. صدیق حسن خان، نواب ابو الطیب صدیق بن حسن بن علی الحسین القنوجی، ''فتح البیان فی مقاصد القرآن''، المکتبه العصریه، بیروت 1992ء، 1412ھ
52. صبره دکتور عفاف،''المستشرقون و مشکلات الحضارۃ، دار النفتۃ العربیه''، قاهره 1980ء
53. العقیقی، نجیب،''المستشرقون''، دار المعارف، مصر 65-1964ء، (ج اتاس)
54. العسقلانی، ابن حجر، امام،''الاصابة فی تمیز الصحابة''، داراحیاء التراث العربی، بیروت 1338ھ
55. العقاد، عباس محمود،''عبقریه محمد''، القاهره 1978ء
56. علی احمد، محمد،''من اسرار البیان النبویﷺ''، دار الصحوۃ، القاهره 1985ء
57. عبدالحلیم، محمود،''القرآن و النبیﷺ''، دار المعارف، القاهره،
58. الغزالی، محمد،''فقه السیرۃ''، داراحیاء العربی 1986ء
59. فواد عبدالباقی، محمد،''المعجم المفهوس لألفاظ القرآن الکریم''، دار المعرقه و ادار الفکر، بیروت، طبع دوم، 1992ء، 1412ھ
60. القسطلانی، احمد بن محمد،''المواهب الدنیة''، المکتب اسلامی، بیروت 1991ء
61. القیروانی، عبدالله بن زید،''کتاب الجامع فی سنن و الاداب و المغازی و التاریخ''، بیروت 1982ء
62. کاندهلوی، محمد یوسف،''حیات صحابة''، دار المعارف، بیروت1971 ء
63. المسعودی، علی بن حسین بن علی،''مروج الذهب''، مصر 1964ء
64. محمد شفیع، مفتی،''معارف القرآن''، ادارۃ المعارف کراچی 1993ء، 1414ھ
65. نجاتی، عثمان علی، ڈاکٹر،''الحدیث النبوی و علم النفس''، دار القلم، کویت 1988ء
66. نجاتی، عثمان علی،ڈاکٹر،''القرآن و علم النفس''، دار القلم، کویت 1985ء
67. الهندی، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین،''کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال''، تحقیق شیخ بکری حیاتی و شیخ صفرۃ السفاء موسسة الرسالة، بیروت، طبع پنجم 1995ء، 1405ھ
68. الهراوی حسین،''المستشرقون و الاسلام''، المجلس الاعلی للشئون الاسلامیه،
69. دکتور محمد احمد دیاب، ''اضواء علی الاستشراق و المستشرقین''، قاهره،1989ء،

70. دکتور محمد ابرهیم الفیومی، "الاستشراق رسالته الاستعمار"، قاهره 1993ء،
71. دکتور احمد عبدالحمید غراب، "رویة اسلامیه للاستشراق"، ریاض، 1988ء،
72. ذهبی، محمد بن احمد، ابوعبداللہ (م 748ھ)، "سیر اعلام النبلاء"، بیروت، موسسة الرسالة، 1413ھ،
73. زکریا هاشم زکریا، "المستشرقین و الاسلام"، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیه، 1968ء،
74. طیب حسن هواری"المستشرقون و الاسلام"،عربی،البحث الاسلامی، (لکھنئو)1983ء،

اردو کتب:

75۔ ابن منظور، الافریقی المصری، ''لسان العرب''نشر ادب الحوزۃ، ایران 1985ء
76۔ الزبیدی، محمد مرتضیٰ، السید، تاج العروس منشورات دارمکتبہ بیروت، لبنان،
77۔ الزمخشری، جاراللہ محمود بن عمر، ''اساس البلاغۃ''طبع القاہرۃ، 1382ھ،
78۔ الفیروزآبادی، محمد بن یعقوب، ''القاموس المحیط''، دارالمعرفۃ بیروت،
79۔ انورمحمود خالد، ڈاکٹر، ''کاروان قمر''قمر الاسلام سلیمانیہ، کراچی 2003ء
80۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، دانش گاہ پنجاب لاہور 1975ء،
81۔ احمد بن حنبل، امام، ''مسند احمد بن حنبل''، مکتبہ اسلامی، بیروت 1398ھ،
82۔ ابن حجر العسقلانی، ''فتح الباری''، بیروت، دارالمعرفہ،
83۔ الف، ی، ونسنک، ڈاکٹر۔ ''المعجم المفہرس الالفاظ الحدیث النبوی المغازی''، مکتبہ بریل، لندن 1955،
84۔ العسقلانی، ابن حجر، ''تہذیب التہذیب''، بیروت، دارالفکر، 1984ء،
85۔ الذہبی، شمس الدین محمد بن احمد الکاشف، ''موسسۃ علوم القرآن'' جدہ، 1413ھ،
86۔ اسپرنگر، ڈاکٹر، ''سیرت محمد ﷺ'' جرمنی، 1851ء،
87۔ اے۔ گوئلیوم، دی ٹریڈیشن آف اسلام، آکسفورڈ، 1924ء،
88۔ احسان دانش، ''جہاد دانش''، طبع، لاہور 1973ء
89۔ اختر راہی، ''تذکرہ علماء پنجاب''، مکتبہ رحمانی اردو بازار لاہور،
90۔ افتخار حسین شاہ سید، ''ارمغان حق''، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
91۔ اصلاحی، امین احسن مولانا، ''دعوت دین اور اس کا طریق کار''، مکتبہ فاران، لاہور
92۔ احمد بک، ڈاکٹر، ''اعلام الباحث فتیح ام الخبائث''، یورپ 1937ء،
93۔ آرنلڈ، ''دی پریچنگ آف اسلام''، لندن 1896ء
94۔ آصف قدوائی، ڈاکٹر، ''مقالہ سیرت''، مجلس نشریات اسلام 1، کے، 3، ناظم آباد، کراچی
95۔ برہان الدین حلبی، ''سیرت حلبی''، بیروت، دارامعارف،

96۔ باسورتھ آدم سمتھ، ''محمد اینڈ محمدزم''، ایم اے، شیکا گو 1900ء،

97۔ بغوی، حسین بن مسعود، امام، ''مشکوٰۃ المصابیح'' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی،

98۔ بھٹی، عبدالجلیل، ''شبلی کا نظریہ تاریخ''، تاریخ بہاولپور، 1989ء،

99۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ''ضیاء النبی''، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، 1418ھ،

100۔ پانی پتی، محمد اسماعیل، مولانا، مکتوبات سر سید، مجلس ترقی ادب لاہور، 1959ء،

101۔ پھلواری، محمد جعفر، ''پیغمبر انسانیت''، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور 1982ء

102۔ تارانڈ رائے، ''محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ''، جارج ایلن اینڈ انون لمیٹڈ لندن، 1956ء،

103۔ جوزف ہوروٹس، ''سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مولفین'' مترجمہ نثار احمد فاروقی،

104۔ جانس، ''ملی ٹینٹ اسلام''، لندن طبع 79ء،

105۔ جمال الدین الافغانی اور محمد عبدہٗ، الدھریون فی الہند، در: العروۃ الوثقیٰ والتراث التحریریۃ، الکبریٰ طبع نو، قاہرہ: دار العرب، 1957ء،

106۔ چراغ علی، مولوی، دی پروپوزڈ پولیٹیکل کلل، لیگل اینڈ سوشل ریفارمز ان دی آٹومن ایمپائر اینڈ محمڈن اسٹیٹس بمبئی، 1883ء،

107۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، حیات جاوید، لاہور آرٹ پریس، 1971ء،

108۔ حمید اللہ، ڈاکٹر، ''رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی''، دار الاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی 1978ء

109۔ حمید اللہ، ڈاکٹر، ''عہد نبوی کا نظام حکمرانی''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی 1982ء

110۔ حمید اللہ، ڈاکٹر، ''خطبات بہاولپور''، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، 19ء

111۔ داناپوری، حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف، ''اصح السیر''، نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی، 1957ء

112۔ سباعی، مصطفیٰ، ڈاکٹر، الاستشراق والمستشرقون مالھم وما علیھم''، المکتبہ الاسلامی، بیروت 1985ء،

113۔ دریاآبادی، عبدالماجد، مولانا، ''سیرت نبوی قرآنی''، مکتبہ بکس لاہور 1981ء

114۔ رابرٹ لاس، ہیلیئر، ڈاکٹر، ''دی سٹڈی آف ریلیجن''، ہاورڈ یونیورسٹی، ج2،

115۔ ریوبن لیوی، ''دی سوشل سٹرکچر آف اسلام''، کیمبرج یونیورسٹی،

116۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''فن سیرت نگاری پر ایک نظر''، ماہنامہ فکر و نظر، اپریل 1976ء،

117۔ سید احمد خان، سر، ''خطبات احمدیہ''،

118۔ سید احمد خان، سر، ''سیرۃ محمدی''، مقدمہ، مقبول اکیڈمی، انارکلی، لاہور، 1957ء،

119۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''ماخوذ الکواکب المضیئۃ لازالۃ شبہات الشیعۃ'' مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1955ء

120۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''شہادۃ القرآن''، حصہ دوم، مطبوعہ مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان، 1958ء

121۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''اخلاق محمدی ﷺ''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1911ء

122۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''عصمت انبیاء''، ادارہ تبلیغ دین سیالکوٹ، 1910ء

123۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''عصمت النبی ﷺ''، مطبوعہ شعبہ نشر و اشاعت اہل حدیث گوجرانوالہ، 1911ء

124۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''سراجاً منیرا''، مطبوعہ سبحانی اکیڈمی اردو بازار لاہور، 1964ء

125۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''زاد المتقین''، مطبوعہ مکتبہ اہل حدیث میانہ پورہ سیالکوٹ، 1952ء

126۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''سیرت المصطفیٰ ﷺ''، مطبوعہ مکتبہ اہل حدیث سیالکوٹ، 1942ء

127۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''وہ نبی اور عہد کا رسول''، مطبوعہ انجمن اہل حدیث سیالکوٹ، 1946ء

128۔ سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، ''ختم نبوت''، مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان، 1956ء

129۔ شاہجہانپوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب کراچی، 1986ء

130۔ شاہد مختار، نظریات سرسید، شاہد پبلشرز نظامی پریس لاہور، 1992ء

131۔ شبلی نعمانی، مولانا، ''سیرت النبی''، مقدمہ نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ستمبر 1981ء

132۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''سیرت النبی ﷺ''، نظامی پریس لاہور،

133۔ شاہ معین الدین، ندوی، مولانا، ''مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائے''، مقالات، ج 136، اکتوبر 1985ء

134۔ شمس الحق، مولوی، علامہ، ''سیرت النبوی اور مستشرقین''، ماہنامہ الحق، شمارہ 9،

135۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، سید، ''اسلام اور مستشرقین''، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ہند،

136۔ صدیقی، آفتاب احمد، ڈاکٹر، ''شبلی ایک دبستان''،

137۔ صفی الرحمٰن، مبارک پوری، ''الرحیق المختوم''، ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور، 1986ء

138۔ ظفر علی قریشی، ''امہات المومنین اور مستشرقین''، ضیاء القرآن پبلشرز، 2010ء،

139۔ ظل قدر، بہادر جنگ، ''جغرافیائی تاریخ''، مقبول اکیڈمی لاہور، 1992ء،

140۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، ''فکر و نظر''، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ اپریل 1976ء

141۔ عبدالحق مولوی، سرسید احمد خان حالات و افکار، انجمن ترقی اردو کراچی، 1975ء

142۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''سرسید اور نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1986ء

143۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''وجہی سے عبدالحق تک''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 1996ء

144۔ عینی، بدر الدین محمود بن احمد، ''عمدۃ القاری''، شرح بخاری، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ،

145۔ عبدالحفیظ مولانا، ''مصباح اللغات'' قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی 1950ء،

146۔ عبدالغنی فاروق، ''ہم کیوں مسلمان ہوئے''، لاہور 1987ء

147۔ عبدالقادر جیلانی، ڈاکٹر، ''مقالہ، اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر''، ناشر بیت الحکمت، لاہور، تقسیم کار کتاب سرائے اردو بازار، لاہور

148۔ عنایت اللہ، ڈاکٹر، شیخ، ''رسول اکرم ﷺ کے سیرت نگار''، اسلام آباد، 1976ء

149۔ فاضل لکھنوی مرتضیٰ حسین سید، ''نسیم اللغات''، (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1984ء،

150۔ فیروز پوری، محمد اسلم، قاضی، مولانا، ’’سوانح حیات امام العصر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی‘‘، مطبوعہ جامعہ تعلیم الاسلام، فیصل آباد، ستمبر 1994ء۔

151۔ فیوض الرحمان قاری، ’’مشاہیر علماء دیوبند‘‘، المکتبہ العزیزیہ، اردو بازار لاہور۔

152۔ قادیانی، غلام احمد، مرزا، ’’ضمیمہ انجام آتھم‘‘ ص 53 طبع اول قادیان، 1920ء۔

153۔ قاسم محمود، سید، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور۔

154۔ کاشمیری، شورش، ابوالکلام آزاد، الفیصل ناشران وتاجران لاہور، 1994ء۔

155۔ کارلائل، ’’ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ‘‘، 8 مارچ 1840ء

156۔ کشفی، سید ابوالخیر، ’’نقش سیرت‘‘، کراچی 1968ء

157۔ گلوور، ڈاکٹر، ’’تقدم التبشیر العالمی‘‘، (عالمی مشنریوں کی ترقی)، نیویارک طبع 1960ء

158۔ لوئس معلوف، ’’المنجد فی اللغۃ‘‘، المطبعۃ الکاثولیکیہ، بیروت، 1937ء۔

159۔ محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، 1997ء۔

160۔ محمد بن سعد، ’’الطبقات الکبریٰ‘‘، بیروت، دار المعرفہ۔

161۔ محمود احمد غازی، ڈاکٹر، ’’محاضرات سیرت‘‘، الفیصل، لاہور، 2007ء۔

162۔ محمد قاسم، سید، ’’اسلامی شاہکار‘‘، اردو انسائیکلوپیڈیا، الفیصل مارکیٹ، اردو بازار لاہور طبع 2001ء۔

163۔ محمد علی الفاروقی، ’’کشاف اصطلاحات الفنون‘‘، طبع کلکتہ۔

164۔ محمد طفیل، ’’نقوش، رسول نمبر‘‘، ادارہ فروغ اردو، لاہور، شمارہ 130، دسمبر 1982ء۔

165۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، ’’تفہیم القرآن‘‘، مکتبہ تعمیر، انسانیت، لاہور، 1981ء۔

166۔ مانینس، علامہ، ’’کنز اللغات وشرفیہ‘‘، وائنا دار السلطنت، اٹلی، 1680

167۔ محمد محمد الدحان، ’’قوی التبشیر المتحالفہ ومواقفھا من الاسلام والمسلمین‘‘، قاہرہ 1988ء۔

168۔ محمد البہی، ڈاکٹر ’’المبشرون والمستشرقین فی موقفھم عن الاسلام‘‘ عربی، الازہر طبع جدید

169۔ مارگولیتھ، ’’دی محمد ﷺ‘‘، دیباچہ، انگلینڈ، 1905ء۔

170۔ محمد احمد دیاب، دکتور، ’’اضواء علی الاستشراق والمستشرقین‘‘، دار المینار، قاہرہ، 1989ء۔

171۔ میٹگمری واٹ، ’’محمد ایٹ مکہ‘‘، عربی ترجمہ از شعبان، برکات مطبوعہ المکتبہ العصریہ، بیروت۔

172۔ منٹگمری واٹ، ’’محمد ایٹ مکہ‘‘، لندن، 1953ء

173۔ معلوف، لوئس، اب، ’’المنجد فی الاعلام‘‘، دار الشرق بیروت، 1976ء۔

174۔ منٹگمری واٹ، ’’محمد ایٹ مدینہ‘‘ ایڈنبرا یونیورسٹی، پریس 1988ء۔

175۔ محمد کرم شاہ الازہری، پیر، ’’ضیاء النبی‘‘، ضیاء القرآن پبلی کیشن لاہور۔

176۔ محمد احسان الحق، سلیمانی، ’’رسول مبین‘‘، مقبول اکیڈمی لاہور، 1993ء۔

177۔ منٹگمری واٹ،''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین''، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،لندن 1961ء،

178۔ محمد اکرام، شیخ،''یادگار شبلی''، ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور 1971ء

189۔ محمد ادریس کاندھلوی،''سیرت مصطفیٰ ﷺ''، مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ، فیروزپورہ روڈ لاہور،

180۔ محمد ادریس کاندھلوی،''بشائر النبیین''، کتب خانہ جمیلی دارالعلوم اسلامیہ کامران بلاک اقبال ٹاؤن، لاہور

181۔ محمد ادریس کاندھلوی،''کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ''، کتب خانہ جمیلی دارالعلوم اسلامیہ کامران بلاک اقبال ٹاؤن، لاہور

182۔ محمد ادریس کاندھلوی،''عالم برزخ''، کتب خانہ جمیلی دارالعلوم اسلامیہ کامران بلاک اقبال ٹاؤن، لاہور

183۔ محمد سلیمان سلمان، منصورپوری،''رحمۃ اللعالمین''، شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، پبلیشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی،

184۔ محمد طفیل،''نقوش رسول نمبر''، ادارہ فروغ اردو لاہور، مودودی، ابوالاعلیٰ، سیرت سرور دو عالم، ادارہ ترجمان القرآن 1978ء

185۔ مناظر احسن گیلانی،''النبی الخاتم''، لاہور سنگ میل، پبلی کیشنز لاہور

186۔ نثار احمد، ڈاکٹر،''مطالعہ سیرت اور مستشرقین''، مقالات، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، جون 1984ء،

187 نوررومان، پروفیسر، اقبال اور مغربی استعمار، بزم اقبال لاہور، 1989ء،

188۔ ندوی، سلیمان، سید،''حیات شبلی''، مکتبہ عالیہ لاہور، سن ندارد،

189۔ نعمانی، شبلی، علامہ،''علم الکلام اور الکلام''، نفیس اکیڈمی کراچی، 1979،

190۔ نعیم صدیقی،''محسن انسانیت''، اسلامک پبلی کیشنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، 13 ای شاہ عالم سپر مارکیٹ، لاہور

191۔ نواب علی سید،''سیرت رسول اللہ''، مکتبہ افکار کراچی، 1965 تا 1966ء

192۔ والٹیر (Voltaire)،''Mahomet''،''محمد ﷺ''، 1742ء

193۔ ہمایوں کبیر، مرتبہ آزادیٔ ہند ابوالکلام آزاد، ارشد بک سیلرز آزاد کشمیر، 1994ء،

194۔ ہمایوں کبیر، مرتبہ آزادیٔ ہند ابوالکلام آزاد، ارشد بک سیلرز آزاد کشمیر، 1994ء،

195۔ ہاشمی، عبدالقدوس،''کمال انسانیت''، فکر و نظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ اپریل 1975ء

196۔ ہفت روزہ،''مسلمان امرتسر''، دسمبر 1926ء

رسائل وجرائد:

197۔ ہفت روزہ،''اہل حدیث امرتسر''، جون 1925ء

198۔ ہفت روزہ،''توحید امرتسر''، نومبر 1926ء

199۔ ماہنامہ،''مسلمان سوہدرہ''، اپریل 1929ء

200۔ ماہنامہ،''مرقع قادیانی''، جون 1933ء

201۔ مجلّہ، الجامعۃ الابراہیمیہ، سیالکوٹ، مارچ 1986ء

انگریزی کتب:

202. Hower Hut, "The Hundreds A Ranking of the most Heflucut Alpetsons in History", 1978,

203. Larmartine, A.N, "Histoire dela Turqui", Paris, 1854, Vol 2,

204. Rodon son, "The western Image and western studies of Islam, published in the Legacy of Islam, edited by C.E. Bosworth. Joseph schcht, oxford University, press, second edition 1979,

205. "Oxford English Dictionary", Edited by Catherine Soans Angus Sterenson, oxford University press, 2006, 11th Edition,

206. Tayn B, "A study of history, oxford, 1956,

207. Rodon son, "A critical survey of modern studies on Muhammad, published in studies on Islam, Translated and edited by Merlin L. Swarty oxford University, press, 1981,

208. Rodon son, "The western Image and western studies of Islam, published in the Legacy of Islam, edited by C.E. Bosworth. Joseph schcht, oxford University, press, second edition 1979,

209. Maxeem Rodon son, "The Mohammad, Translated by Anne carter, Pantagon press, England, 1983,

210. Siddiqi, Mazheruddin, "The Holy Prophet and the Orientalists", Islamic studies (Islamabad). 1982

211. D.N. Banner Jea: India's Nations Builders, London: Headley, 1919, Indian Nation Builders, Madras: Ganesh, 1918,

212. Hubert, Grimme, "Mohammad, Des Leban Nachden Quellen (Minister 1892-95)

213. William Muir, Sir, "The Life of Mohamamd", Pom original sourca, London, 1877

214. Forster Charles, "Mahomtani SM Unveiled", London 1829

215. Gibbon, Edward, "LIfe of Mahomet", New York1879

216. Higgins, Godfray, "An Apology for the Life and character of the celebrated Prophet of Arabia", called Mohammad or the illustraious, London, 1829
217. Davenport, John, "Apology for Mohammad and the Quran", Lodon, 1879, reprint Lahore, 1975
218. Johns, "Militent Islam", London, 79,
219. Lomartine A. M. , "Mohamet in les Crand, Bmmes-De Orient, paris, 1889
220. Dollinger, The Gentile the Jew, Encyclopedia Universal art,
221. Mariage,Dollinger, The Gentile and the Jew,
222. L' Influence des Croisades sur, L, Etat dest Europe, peuples de L, by Maxime de Choiseul D' Aillecourt, Paris, 1809
223. William Muir, sir, "The Life of Muhammad", London, 1870
324. Chronicle of Sebeos, "Encyclopaedia of religion and ethics",
225. Cant Well Smith, "Islam in Modern History", Europe, 1955
226. Karl Marx, "Communist Manifesto, Germany, 1848
227. Reverend W. Montgomry Watt, "What is Islam", London, 1985
228. Rev. T.P. Hughes, "The Dictionary of Islam", London 1885
229. Philip K Hitti, "Islam and West", Prinston University, London, 1952
230. J.J. Saunder, "A History of Medieval Islam", London, 1965
231. Hamilton A.r Gibb, "Mohammadism Historical Survey", London, 1953
232. Samul Parsons, Scott, "History of the Mahometan Empire in Europe", London, 1877
233. Thoms, carlyle, "Hero's, Hero-worship and the Heroic in History", London 1843
234. Dante, Alighieri, "Divine Comedy", Italy, 1305
235. Hichem, D. Jaut, "History of Islam", London 1994
236. Sir Denison Rose, "Translation of the Holy Quran", London 1902

237. Antony Ashley Bevan, "Combridge Medeival History", London, 1892
238. Carmichael, "Shaping of Arabs", Oxford University, 2001
239. Rechard William Southern, "History of Islam", London, 1954
240. Robort Charles Zaehner, "At Sundry Times", 1956
241. George Sale, "Translation of the Holy Quran", 1723
242. Carl Heinrich Becker, "Christianity and Islam", Berlen, 1913
243. Prof. E.G Brown, "Literary History of Percia", Cambridge University, 1894
244. John Davenport, "The Message of Quran", London, 1879
245. Philip Schaff, "History of Christian Chuch", london, 1982
246. Gustav Weil, "History of Islamic People", Frans, 1873
247. Will Durant, "The Age of Faith", Europe, 1844
248. Nobia Abbot, "Aisha the beloved of Muhammad", London, 1943
249. Adams, Isaac, "Mohammad and Mohammad anism", Chicago 1900
250. Addison Lancelat, "The Life and Death of Mohammad", The author of the Turkish Religion, London, 1679
251. Addler, Fellx. M. Mohammed, Philladelphie 1901
252. Ahren, Karl, Mohammadals Religion Stiffer, Leipzig 1935
253. Arnold, J.M. "Islami: Its history, character and relation to christianity", London 1974
254. Ahsan M.M, "A select bibliography", No. 4 London 1981, P.51
255. Justic Syyed, Ameer Ali, "Acritical Examination of the life and teacing of Mohammad", London 1873
256. Abdul Hasan Ali Nadvi, Maulana, "Islam and Westernorientalists", Karachi p.21,22
257. Arther Gillman, "The Saraceus", London 1887
258. Aiton, John, "The Land of the Messian", Mohomet and the Pope,

London 1854

259. Arnold T.W. "The Preaching of Islam", London 1896

260. Bacon A.S. "Mohammad and Islam", A comparison with orthodox christianity, New York 1911

261. Bedwell W. "Mohammedis Impos Turae", London, 1615

262. Bernfeld. Simon, "Mohammad his Biography and the beginning of the Religion of Islam", Warsw, 1914

263. Bodley RVC. "The Messenger. The Life of Mohammad", London 1946

264. Brown D.A. "The way of the Prophet: An Introduction to Islam", London 1962

265. Bursh George, "The Life of Mohammad: Founder of the Religion of Islam and the Empire of the Saracens", New York 1830

266. Carlyle Thomas, "The Hero as Prophet. Mohomet", New york 1902

267. Ducati, Bruno, Moometton, 1931ء1929،سیرت الرسول،فلورنس

268. Edward. W. Saeed. Orientalism Routledge kegam Paul, London 1978

269. Forster Charles, Mahometanism Unveiled, London 1829

270. Gabrieli, Francesco, "Muhamma and the Conquests of Islam", New York 1968

271. Gibb. H.A.R. "Mohammedanism and History Survey", London 1953

272. Goldziher, 1gance "Mohammed and Islam", Tr Yale 1971

273. Hurgronje, C.S, "Muhammad in Selected Works (ed)", Leiden, 1957

274. Dr. Henry Stuble, "An account of the rise and Progress of Mohametanism", London 1911

275. Jaffery, Arthur, "Islam Mohammad and his Religion", New York 1958

276. Johnston. P. Lacy de, "Mohammad and his Power", New York 1901

277. Lew. Che. F1, "The Arabin Prophet a Life of Mohammad from Chinese and Arabic Source", Shanghai 1921

278. Munir, Sir William, "The Life of Mohomet from Original Source", London 77

اشاریہ

اشاریہ

آیات قرآنی:

احادیث:

اعلام

(الف)

(پ)

(ث)

(ج)

(چ)

(ح)

(ش)

(ص)

(غ)

(ف)

(ق)

(م)

(ی ے)

اماکن

(الف)

(ب)

(س)

(ش)

(ط)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ق)

(گ)

(ل)

(م)